اودھ

آئینۂ ایّام میں



مُرتّب

سیّد امجد حسین

شائع کردہ

محکمہ اِطّلاعات و رابطۂ عامّہ اترّپردیش لکھنؤ

پہلا کتابی ایڈیشن

• مارچ سنہ ۱۹۹۶ء

اودھ آئینہ ایام میں

مرتب:

• سید امجد حسین

ایڈیٹر ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ

ناشر:

• رومت نندن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش، لکھنؤ

کتابت و تزئین:

• حسن مختصر

مطبوعہ:

• یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس

۶۰، گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ

اودھ آئینہ ایام میں

فہرست

تاریخ

روحانی مراکز

اودھ آئینۂ ایام میں

علم و ادب

فنون

اودھ
آئینۂ ایام میں

تہذیب و معاشرت

بلاد و امصار

یادوں کے جھروکے سے

حرفِ آغاز

ادب میں تہذیب کی مکمل جلوہ گری ہوتی ہے اور تہذیب سے ہی کسی عہد کو اور اس عہد میں کسی علاقے کو پہچانا جا سکتا ہے۔ عام طور سے خیال ہے کہ اُردو ادب صرف جمالیاتی تصوّرات یا حُسن و عشق کی داستانوں کا دوسرا نام ہے لیکن یہ محض غلط فہمی ہے۔ اس ادب میں زندگی کے خط و خال پوری طرح سے ملتے ہیں۔ چنانچہ شجاعت و بہادری کے قصّے، ہنسی مذاق کے واقعات، رحم، ہمدردی، غیظ و غضب ——— غرضیکہ سنسکرت شاعری کے جتنے رس ہیں ان سب کو اُردو ادب میں دکھا جا سکتا ہے ——— اس کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے۔

انسانی اقدار ہر طرح سے فنونِ لطیفہ میں نظر آتے ہیں جسے ہم صناعی یا فن کہتے ہیں اسے سنگ تراشی، مصوّری، مجسمہ سازی اور رقص و موسیقی میں بھی تلاش کیا جاتا تھا ——— لیکن ہندوستان کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ اس نے روزمرّہ کے استعمال کی اشیاء میں ایسی حُسن کاری دکھائی کہ آج بھی لکھنؤ کی چکن، جامدانی، زری کا کام یا لکھنؤ کے انواع و اقسام کے کھانے ذوقِ لطیف اور صناعی کا بہترین نمونہ نظر آتے ہیں۔

ہندستان کی بات کرتے ہوئے میں لکھنؤ پر اسلیے آ گیا کہ لکھنؤ میں ڈیڑھ سو برس میں جو تہذیب پروان چڑھی تھی وہ بھی ہندستانی تہذیب کا ہی ایک پہلو تھا۔ تہذیب دراصل اکائی کا نام ہے سورج کی طرح اب اس کی کرن جہاں اور جس طرح پڑتی ہے وہاں اسی طرح کی روشنی کا رنگ اُبھرتا ہے۔ کہیں چمپئی، کہیں کاسنی، کہیں سبز، کہیں زعفرانی ۔ چنانچہ اودھ کے علاقے میں بھی ہندستانی تہذیب کا ایک حسین پیکر اُبھرا تھا۔ اس پیکر میں جلوۂ صد رنگ کی کیفیت تھی اسلیے کہ اس تہذیب کی اساس محبت، باہمی احترام، رواداری اور وسیع النظری پر تھی۔ یہ وہ اقدار تھے جسے ہندستانی تہذیب نے اپنی ہزاروں برس کی تاریخ میں سجا کر اور سنوار کر بڑی حفاظت سے اپنے وجود کا جز بنا کر رکھا تھا۔

یہی سبب ہے کہ اودھ کی تہذیب پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اس تہذیب کو ایک زمانے میں انگریزوں کے اشارے پر تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا رہا لیکن جیسے جیسے علم و آگہی کی روشنی پھیلتی گئی یہ احساس ہوتا گیا کہ اودھ کی اس تہذیب میں صرف اپنے عہد کی ترجمانی ہی نہیں تھی بلکہ ایسی شعاعیں بھی تھیں جو مستقبل کیلئے نشانِ راہ ثابت ہو سکتی تھیں اور ہوئیں۔

ماہنامہ نیا دور کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس نے اودھ کی تہذیب کی بازیافت کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ چنانچہ پہلا اودھ نمبر فروری، مارچ ۱۹۹۴ء میں نکلا لیکن اس کی بے پناہ مقبولیت اور اہلِ علم کے اصرار پر اس کا دوسرا حصہ اسی سال یعنی اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

کسی ادارے کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے ماہنامہ میں شائع شدہ مضامین مستقل ادبی عظمتوں کے حامل قرار دیے جائیں اور انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں نمبر، ضمیمہ اور ایک طرح سے ان سب کا عطر کھینچ کر کتابی صورت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ عزت مآب موتی لال ووہرا گورنر اترپردیش نے ازراہِ لطفِ خاص نیا دور کے نصف صدی نمبر کی جگمگاتی اور رنگا رنگ یادگار تاریخی تقریب میں ۲۱ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو مجھے یہ ہدایت کی کہ ۳۱ مارچ تک اودھ کے سلسلے کے بہترین مضامین کتابی شکل میں شائع کر دیے جائیں اور مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ میں نے عزت مآب کے سامنے دانشوروں کے اس مجمع میں اعلان کیا اور اب اس وعدہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔

میں اس موقع پر ادارۂ نیا دور کے کارکنوں اور ان کے سربراہ ایڈیٹر سید امجد حسین کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ انتھک محنت اور لگن نیز پُرخلوص کوشش کے ساتھ اودھ نمبر اور اس کے ضمیمہ میں شائع شدہ مضامین میں جو ایک باطنی احساس اور اندرونی لہر کارفرما تھی جو پیغام چھپا ہوا تھا اس پیغام کی اشاعت کے لیے گراں قدر اور قابلِ ستائش کارنامہ انجام دیا گیا ہے ۔ اس کتاب میں مجھے یہ دو خون دل سے روشن کیے ہوئے علم و آگہی کے وہ چراغ ہیں جنھیں آپ ہر صفحہ پر دیکھیں گے ۔

اگر یہ کتاب آنے والی نسلوں کو اپنے ماضی کی شاندار وراثت سے روشنی لے کر راستہ دکھا سکے تو یقیناً ہم سبھی مشکور ہوں گے ۔

نُوہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات

پیش لفظ

کسی بھی ماہنامے کے لیے یہ اعلیٰ ترین اعزاز ہے کہ اس میں شائع شدہ مضامین کتابی شکل میں پیش کیے جائیں۔ نیا دور کو یہ اعزاز ادبی حلقوں نے عطا کیا اور اس کے لیے امتنان تشکر کے سارے الفاظ بہت ہی سبک معلوم ہوتے ہیں۔

اودھ نمبر حصہ دوم کی اشاعت کے بعد پروفیسر گیان چند نے اس طرف متوجہ کیا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اس مشورے پر عمل نہ ہو سکا کہ منتخب مضامین کتابی شکل میں پیش کیے جا سکتے لیکن نصف صدی نمبر کی تقریب کے سلسلے میں (۲۱ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو) پروفیسر گیان چند نے جلسے ہی میں اپنی اس تجویز کا اعادہ کیا اور عزت مآب گورنر موتی لال ووراصاحب نے ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات جناب روہت نندن کی وساطت سے اس کا اعلان بھی کر دیا کہ یہ مجموعہ ۳۱ر مارچ ۱۹۹۶ء تک شائع کر دیا جائے۔

اور اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اودھ نمبر اور اس کے ضمیمہ میں شائع شدہ مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے یہ پہلو پیش نظر رہا کہ افادیت کو بھی معیار بنایا جائے اس لیے کہ سارے مضامین انتہائی معیاری اور وقیع تھے، اس لیے جو نسبتاً کم افادیت رکھنے والے مضامین منتخب نہیں کیے جا سکے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صفحات کا تعین کر دیا گیا تھا اور اسی مقید حدود میں انتخاب کرنا تھا۔

اب اس انتخاب میں مختلف عنوانات کے تحت موضوعات کی زمرہ بندی کر کے ترتیب دی گئی ہے اور اس طرح وقت کے آئینہ میں اودھ کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اودھ کی تہذیب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسی کو اس پیش لفظ کا حصہ بناتے ہوئے اپنی بات کو ختم کر رہا ہوں یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جن اہل علم کی نگارشات سے یہ مزین ہے اس کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عہد ساز کارنامے تحقیق کرنے والوں اور اہل علم کے درمیان صدیوں تک اپنی اہمیت و افادیت کی تابندگی برقرار رکھے گا۔

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی کس حد تک اس میں اخذ و قبول کی صلاحیت تھی، اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزارہا برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج بھی ہندستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا، جسے ہندستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے، مگر بہر حال وہ ایک ہوتا ہے۔

وقت کے افق میں تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں اور تاریخ ان کے کھنڈرے کو گمنامی کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ بس صرف یہ یاد رہ جاتا ہے کہ کلدانی یا سیموریں یا یونان کی تہذیبیں بڑی حسین و خوبصورت تھیں۔ آج بھی ان کے آثار نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن یہ وہ تہذیبی اصنام ہیں جو دیکھنے میں تو اچھے لگتے ہیں مگر جن میں نہ حرکت ہے نہ عمل، نہ انسانی تہذیبی تاریخ کو کوئی سمت دینے کا حوصلہ یا ولولہ یا شعور! اس کا سبب یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی بنیاد بہت کمزور تھی، ان کے پاس اعلا انسانی اقدار کا

اودھ آئینۂ ایام میں

تصور نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اقبال نے کہا تھا ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے

اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس کا مفہوم یہی ہے کہ بہت ساری عظیم الشان تہذیبوں کے قصر منہدم ہوگئے لیکن ہندستانی تہذیب اپنی روایات کے تسلسل کے ساتھ آج بھی دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسلیے کہ ہندستانی تہذیب کی بنیاد کچھ آفاقی اقدار پر تھی، ایسی اقدار جن میں رواداری، وسیع النظری، عدم تشدد، مظاہر فطرت کا احترام اور خاکساری جیسی قدریں تھیں۔ ہندستانی تہذیب کے جو مظاہر نظر آتے ہیں چاہے وہ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، آج بھی ان سے اُنھیں اقدار پر روشنی پڑتی ہے اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندستانی تہذیب صرف ایک خطۂ ارض تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ ساری دُنیا کے لیے ایک پیغام تھی۔

اس ہندستانی تہذیب کے آب و گل سے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اودھ تہذیب کی کونپلیں پھوٹی تھیں۔ یہ تہذیب کہنے کو تو ایک علاقے تک مخصوص کی گئی تھی۔ ۱۷۲۲ء میں محمد امین نیشاپوری جب اودھ کے علاقے میں آئے تو اس وقت علاقائی تہذیب کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ پچاس سال بعد اودھ میں بنگلہ (فیض آباد) سے جو شعاعیں پھیلنا شروع ہوئیں، وہ آفتاب بن کر لکھنؤ کے اُفق سے چمکیں اور پھر خاک اودھ کے ذرے ذرے کو روشن اور منور کر گئیں۔ وہ خاک جس کا مقدر ریزہ ریزہ ہونا تھا، وہ خاک جو اٹھی تو اس نے شام کو دھندلایا نہیں بلکہ اسے اتنا حسین بنا دیا کہ آج شامِ اودھ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ادب کا استعارہ بن گئی ہے۔ یہاں سے وہ غواص معانی اٹھے جنھوں نے ہر بحر پُر آشوب کو پایاب بنا دیا۔ یہاں کی زری کی شام و سحر تختۂ گل جیسی چکن اور کہکشاں کی رہ گزر کی طرح کی چاندانی خود تو حسین تھی ہی ساری دُنیا کو حسین بنا گئی۔

یہ اسی تہذیب کی کرامت ہے کہ اُردو صحافت کی تاریخ میں یہ یادگار واقعہ بھی پیش آیا کہ ایک سال کے اندر ایک موضوع پر دو خاص نمبر اور دو عام شمارے پیش کیے گئے۔ اس بار بھی جو ہماری روایات رہی ہیں ان کی پاسداری کرتے ہوئے جن ممتاز ماہرین علم و ادب کی جو تخلیص تھی اس پر اضافہ زحمت نگارش دی گئی، ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علماء و ادیبوں کا تعاون ہمیں حاصل رہا، ادارہ ان کا بے حد ممنون ہے۔

اس تہذیبی داستان کے کتنے رنگ اور کتنے رُخ تھے اس پر پہلے سے لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ شرر، نجم الغنی، آشیر وادی لال سریواستوا اور دوسرے دور حاضر کے مورخین نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اودھ کی علاقائی تہذیب کو پیش کیا، لیکن یہ عرض کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ شاید اس تہذیب کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا کسی ایک رُخ کو ابھار کر اور اسے پوری تہذیبی اکائی کا تصور کر کے نمونے لگا دیئے گئے۔ اسی احساس کے تحت اپنے محدود وسائل کے ساتھ ہم نے بھی کوشش کی کہ اس عظیم الشان اور سُنہری تہذیب کے ان نقوش کو اُبھار سکیں جن پر بہت سارے اسباب نے وقت کی گرد ڈال رکھی ہے۔

اسلئے اودھ سے متعلق تہذیبی دستاویز پیش کرتے ہوئے فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس کے محدود وقفے میں ایک چھوٹے سے خطۂ ارض پر علم و فضل و دانش و تفکر کے ساتھ موسیقی، رقص، خطاطی، سپہ گری اور دیگر علوم و فنون کی جو شمع روشن ہوئی تھی آج اس سے ہم اکتساب نور کر رہے ہیں۔

تہذیبی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اودھ کی تہذیب کے مظاہر بدل گئے ہیں لیکن اس کی بنیادیں جو اعلا انسانی اقدار تھیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور آنے والے کل میں بھی محفوظ رہیں گی۔

——————— سید امجد حسین

مُقدّمہ

ثنا، رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے ۔۔۔ وہ بے شک لکھنؤ کی سر زمیں ہے — مرزا سرور

گر ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ ۔۔۔ چونک میں اٹھتا ہوں اس پر کہہ کے ہائے لکھنؤ — سرور

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ ۔۔۔ لکھنؤ اہلِ ہنر کے لیے ٹکسال ہے آج — رند

ع رضواں بھی ہے جہاں میں ثنا خوانِ لکھنؤ — انیس

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں ۔۔۔ رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں — امیر

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے ۔۔۔ اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے؟ — امیر

ع رشکِ موجِ آبِ کوثر ہے زبانِ لکھنؤ — امیر اللہ تسلیم

وہ سمجھتے ہیں جو ہیں منصف مزاج و نکتہ رس ۔۔۔ ہے زبانِ گلستانِ لکھنؤ بے خار و خس — صفی

مستند ہے اور معیاری زبانِ لکھنؤ ۔۔۔ رشکِ ہر کام و دہاں، کام و زبانِ لکھنؤ — باقر شمس[1]

کیا دل داری ہے شہر لکھنؤ میں کہ وہاں کے باسی اس دل سوزی کے ساتھ اس پر دل باختہ ہیں۔ یہ نعرۂ فخر، یہ نعرۂ رجز، یہ طنطنہ کسی اور شہر کے باشندوں نے اس شدت کے ساتھ بلند نہ کیا ہوگا۔ حسنِ اتفاق سے آخری وقت میں میں بھی لکھنؤ میں آبسا ہوں لیکن لکھنوی ہونے کا دعوائے فخر نہیں کر سکتا، مندرجہ بالا اشعار ہر حال میں نہیں آ سکتا۔ یہ اشعار اجمال ہیں اس تفصیل کے جس کا نام "گزشتہ لکھنؤ" ہے، اور جس کے خالق مولانا عبد الحلیم شرر ہیں۔ لکھنؤ کی زبان اور تہذیب پر نخوت کا ایک حصہ پورے اودھ کے مردم خیز قصبوں اور شہروں کو بھی ملا ہے۔ کہتے ہیں کہ گلاب کے پودے کی گل زمیں میں بھی گل سرخ کی خوشبو رچ بس جاتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو لکھنؤ کی ثقافت و زبان وادب کی دل آویزی اس کی قلمرو کے قصبوں کاکوری، ملیح آباد، سندیلہ، سیتاپور، خیر آباد، رُدولی، بلرام پور، محمود آباد، بلہرہ، فیض آباد اور رائے بریلی وغیرہ میں بھی کیوں نہ پھوٹ آئے۔

ضرورت محسوس ہوئی کہ لکھنؤ سے آگے بڑھ کر اودھ کے تمام بلاد کو اس حرفِ وحکایت فخر میں شریک کر لیا جائے۔ کچھ ایسا منصوبہ ذہن میں رکھ کر رسالہ نیا دور کے جواں سال اور جواں ہمت مدیر سید امجد حسین نے رسالے کا اودھ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے صلائے عام کا خواص تحریر نے اتنا پُر جوش جواب دیا کہ وہ ایک شمارے کے باندھ توڑ کر نکل گیا۔ اودھ نمبر کے بعد اودھ نمبر حصہ دوم اور پھر جنوری ۱۹۹۵ء کا شمارہ جو ایک قسم کا ضمیمہ ہے نکالنے پڑے۔ آس پاس کے دیگر شماروں میں بھی کچھ قابلِ قدر مضامین کو جگہ دی گئی۔ انھیں دیکھ کر مجھے سوجھا کہ رسالہ آنی و عارضی ہوتا ہے، کتاب مستقل دیرپا ہوتی ہے کیوں نہ ان خصوصی شماروں کے مضامین کو موضوعی گروہ بندی کے ساتھ کتابی شکل دے دی جائے۔ میں نے اپنی تجویز سابق ڈائرکٹر اطلاعات اکمل صاحب کو لکھ بھیجی۔ انھوں نے صاد کر دیا۔ لیکن

---

[1] مندرجہ بالا بیشتر اشعار مولانا باقر شمس لکھنوی کی کتاب "لکھنؤ کی زبان" (دہلی ۱۹۹۹ء) سے لیے گئے ہیں۔

اس تجویز پر عمل درآمد سے قبل ہی ان کا تبادلہ ہوگیا اور بات کھٹائی میں پڑ گئی۔

امجد حسین خصوصی نمبروں کے ماہر خصوصی ہوتے جارہے ہیں۔ انھوں نے نیا دور کا نصف صدی نمبر نکالا اور ۱۹۹۰ء کے اوائل میں اس کی شان دار رسم اجرا عزت مآب گورنر صاحب کے ہاتھوں سے کرائی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ وہاں میں نے پھر اپنا مطالبہ داغ دیا کہ اودھ نمبر کے مضامین کو کتابی صورت میں شیرازہ بند کردیا جائے۔ نئے ڈائرکٹر اطلاعات روہت نندن صاحب نے گورنر صاحب سے مشورہ کرکے اسی وقت اعلان کردیا اور عزت مآب نے تجویز منظور کرلی ہے اور خواہش کی ہے کہ یہ کام مارچ کے اختتام سے پہلے مکمل کرلیا جائے میں بشاش اور سرشار ہوگیا۔

شاعروں کی طرح مقالہ نگاروں سے کچھ لکھوانا بھی کارے دارد۔ ان کے بھی بڑے نخرے ہوتے ہیں۔ جس کا شملۂ علم جتنا بھاری ہوتا ہے، لیت ولعل میں بھی وہ اتنا ہی رسیدہ ہوتا ہے۔ مُدیر امجد حسین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے معتبر اہلِ قلم کا انتخاب کیا۔ ان کے لیے موضوعات چُنے اور پھر اُن پر اپنے ذاتی تعلقات کے سہارے اتنے تقاضے کیے کہ انھیں ماننے ہی بنی۔ وقتِ مقررہ کے اندر اتنے مضامین حاصل کرلیے کہ ایک شمارہ بھرپور ہوگیا۔ "باقیات الصالحات" دوسرے شمارے کے حصے میں آئے۔

بہر حال!

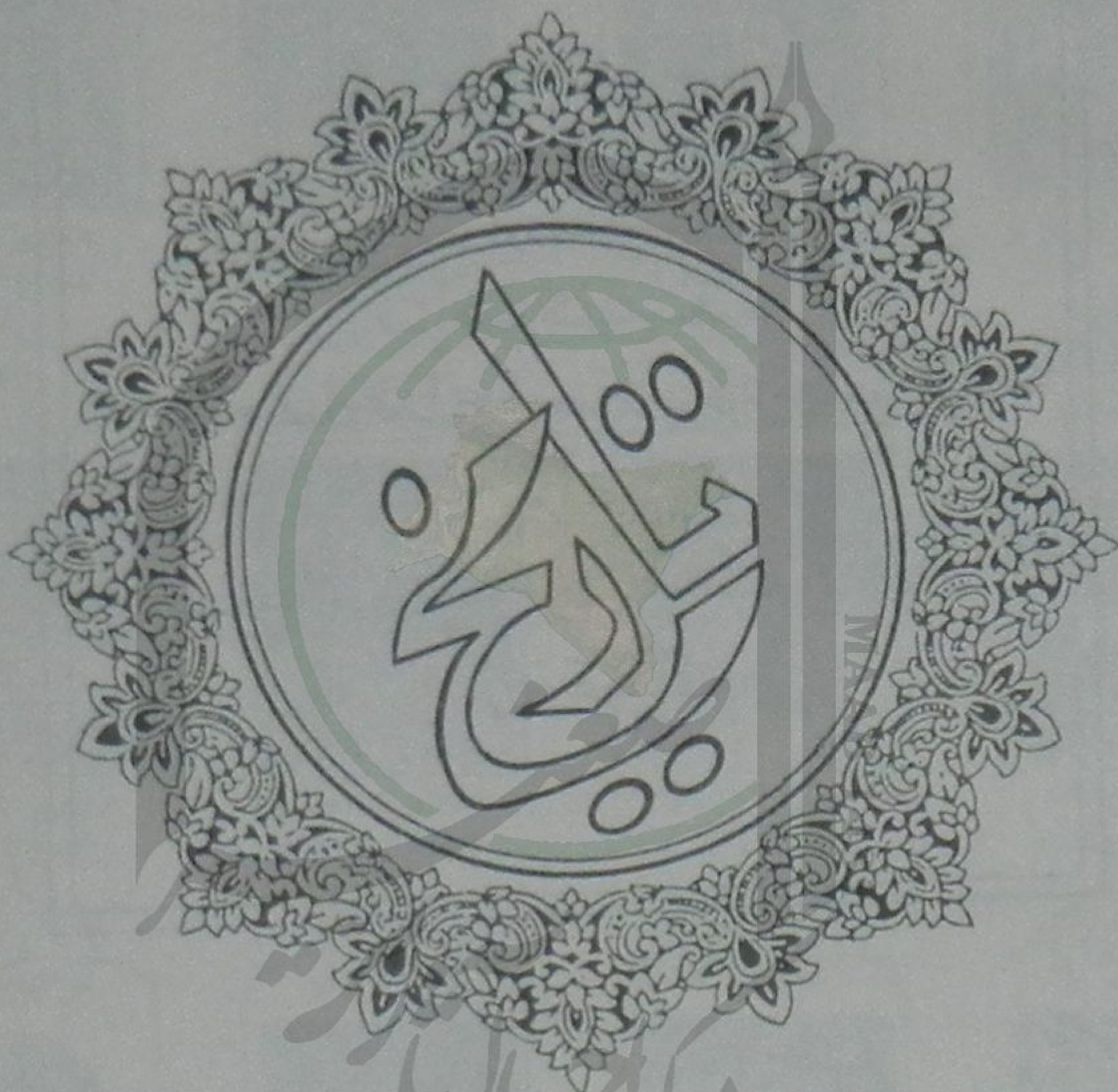
میں یہ کہے بغیر نہ رہوں گا کہ اس مجموعے کے متعدد مضامین علم و فضل کے اعلیٰ معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ منشور کی "گزشتہ لکھنؤ" ایک شاہکار ہے جس میں لکھنؤ کی چابک دست کاریوں اور فن کاریوں کے بلوریں دریا اپنی شفافی کی چھوٹ چھوڑ رہے ہیں "اودھ آئینۂ ایام میں" اس کا ایک تکملہ ہے جو کسی طرح اس کی مساوات کا مدعی نہیں۔ کہاں ایک عالم کی وحدتِ موضوع والی کتاب اور کہاں متفرق قلم کاروں کی متفرق نگارشات، جن کے بارے میں اصلاً یہ منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ کسی کتاب کے ابواب ہوں گے۔ بہر حال جو کچھ ہے وہ اہلِ نظر کے سامنے ہے۔ مجھے یہ مجموعہ پسند ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام بھی میرے ہم خیال ہوں گے اور اس کے مُرتب سید امجد حسین کو کلمۂ خیر سے یاد رکھیں گے۔

(پروفیسر) **گیان چند**

۸ر فروری ۱۹۹۰ء

۹/۲۵- اندرانگر

لکھنؤ ۶


تاریخ

تاریخ ماضی کا کھنڈر نہیں

بلکہ

حال کی شناخت اور مستقبل کے لئے روشنی

فراہم کرتی ہے

اودھ نے اپنی تاریخ اپنے زریں کارناموں سے لکھی

اور اُسے

ہندوستانی روایات کا امین بناکر ہمیشہ باقی رہنے والی

سُرخی عطا کی۔

امجد حسین

سلطنتِ اودھ کا توقیت نامہ

برہان الملک
سعادت خان



۱۱۳۲ھ تا ۱۱۵۱ھ [1]
۱۷۱۹ء تا ۱۷۳۸ء

صفدر جنگ



۱۱۵۱ھ تا ۱۱۶۶ھ
۱۷۳۸ء تا ۱۷۵۳ء

شجاع الدولہ



۱۱۶۶ھ تا ۱۱۸۸ھ
۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء

آصف الدولہ



۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ
۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء

وزیر علی خان



۱۷۹۷ء تا ۱۷۹۸ء
(مدتِ حکومت چار مہینے)

سعادت علی خان



۱۲۱۳ھ تا ۱۲۲۹ھ
۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء

غازی الدین حیدر



۱۲۲۹ھ تا ۱۲۴۳ھ
۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

نصیر الدین حیدر



۱۲۴۳ھ تا ۱۲۵۳ھ
۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء

محمد علی شاہ



۱۲۵۳ھ تا ۱۲۵۸ھ
۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء

امجد علی شاہ



۱۲۵۸ھ تا ۱۲۶۳ھ
۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

واجد علی شاہ



۱۲۶۳ھ تا ۱۲۷۲ھ
۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

برجیس قدر



۱۲۷۳ھ تا ۱۲۷۴ھ
۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء

---

[1] برہان الملک کی وفات اور صفدر جنگ کی مسند نشینی کے سنہ یقین کے ساتھ نہیں معلوم

اودھ آئینۂ ایام میں

پروفیسر محمود الحسن



جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اودھ کو اپنی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی حیثیت سے دورِ قدیم سے ہی ایک امتیاز حاصل رہا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہاں سے جو تہذیبی و فکری قدریں ابھریں اس نے ملک کے مختلف گوشوں کو متاثر کیا اور خود اس میں بھی بہت سی قدروں کا اشتراک ہوتا گیا۔ امتدادِ زمانہ اور سیاسی و تاریخی انقلابات و نشیب و فراز اس کے جغرافیائی حدود میں تبدیلیاں ضرور پیدا کرتے رہے لیکن اس کے مرکزی علاقہ میں جو مخصوص روایات نشو و نما پاچکی تھیں ان کے نقوش ہر دور میں برقرار رہے اور اس کی اہمیت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی قائم ہے۔

مؤرخین میں اس بات پر پوری طرح اتفاق نہیں پایا جاتا کہ اودھ کی وجہ تسمیہ کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ لفظ "ایودھیہ" کا اپ بھرنش ہے عام بول چال میں "ایودھیہ" سے "اودھ" بن گیا۔ فارسی رسم الخط کے لحاظ سے بھی اس کا تلفظ "اودھ" ہی رائج ہو گیا اسی لئے سولھویں صدی عیسوی تک (مغلوں کے اثرات سے پہلے) کسی جگہ "اودھ" نہیں بلکہ "ایودھیا" ہی پایا جاتا ہے۔ "ایودھیا" کا یہ نام کیوں پڑا اس سلسلے میں بھی کوئی قطعی رائے نہیں پائی جاتی۔ بعض اس کی مناسبت ''अज-युद'' یعنی ब्रह्मा की अपराजेय नगरी سے دیتے ہیں اور بعضوں کے خیال میں اس لفظ کا تعلق ''अ + युध'' یعنی अजेय नगरी سے ہے۔ یہاں کے جنگجو اور بہادر باشندوں کے کارناموں کی بنیاد پر ڈاکٹر WILSON نے یہ بھی پیش کیا ہے کہ اس کا تعلق لفظ ''युद्ध'' سے زیادہ مناسب ہے یعنی (جنگجو چھتریوں کا شہر) ''युद्ध वीर क्षत्रियों का नगर'' عوام میں ایک روایت یہ بھی مقبول ہے کہ جب شری رام چندر جی بن باس کی مدت ختم کرکے واپس آئے تو اسی अवधि کی بنا پر اس کا نام "ایودھیا" پڑ گیا۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ اس بات پر بھی مؤرخین متفق ہیں کہ "ایودھیا" نام رام چندر جی کے بن باس سے پہلے بھی رائج تھا بلکہ والمیک نے رامائن میں تو یہ لکھا ہے کہ "ایودھیا" کی بنیاد "منو" نے ڈالی تھی، باب ۵، اشلوک ۶ میں وہ لکھتے ہیں:-

> ''अयोध्या नाम नगरी तत्रासील्लोक विश्रुता
> मनुना मानवेन्द्रेण या पुरी निर्मिता स्वयम'' [2]

بہرحال قبل تاریخ کے ایودھیا کے حدود اربعہ کی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع مفقود ہونے کی وجہ سے اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی نہ اس کی تحقیق پیشِ نظر ہے لیکن تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہندوستان کا وسطی علاقہ چار ریاستوں (کوشل، کاشی، مگدھ اور ویدیہ (विदेह) پر مشتمل تھا جس میں کوشل راج کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اسی کی راجدھانی "ایودھیا" تھی۔ ڈاکٹر سرجو پرشاد اگروال لکھتے ہیں کہ "مہا پران کے انوسار اس میں سات لاکھ گاؤں بنائے گئے ہیں" [3] اس کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل تھا اور ڈاکٹر رائے چودھری کے مطابق "کوشل کا علاقہ تقریباً موجودہ اودھ کے برابر تھا جو پورب میں ویدیہ راج، پچھم میں پنچال، دکھن میں سئی ندی اور شمال میں نیپال کے پہاڑی علاقے تک پھیلا ہوا تھا" اور یہی وہ حدود ہیں جو اس علاقہ کے تقریباً برابر ہیں جسے موجودہ اودھ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ کوشل کے دار السلطنت کی حیثیت سے سیاسی طور پر تو ایودھیا کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ہی جہاں مان دھاتا، ہریش چند، سگر، دلیپ، رگھو، اج، اور دشرتھ وغیرہ عظیم راجاؤں کے علاوہ رام چندر جی ایسے ایشور کے اوتار گذرے ہیں، ساتھ ہی

ساتھ ہندو مذہب کا بیز تقو استحقان ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ سے عقیدت و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے، اس دور کا ذکر کرتے ہوئے Samuel Lucas لکھتا ہے کہ:۔

"Before we knew of its existence, Oude was a country of ancient traditions and the scene of India's earliest romance. In the first great Sanscrit epic "The Ramayan" it is the residence of a splendid king and an heroic people and its capital Ayodhya, or OUde, is filled with gorgeous accessories."* شہ

چنانچہ انھیں روایات کا اثر تھا کہ بہت سے سیاسی انقلابات و انتشار کا سامنا کرنے کے باوجود ساتویں صدی تک جبکہ یہ چندر گپت وکرمادتیہ کا پایہ تخت تھا، اس کی اہمیت اور مرکزیت میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ جب ساتویں صدی میں ہرش اس علاقہ پر قابض ہوا تو اس نے اپنا پایۂ تخت ایودھیا سے تبدیل کر کے قنوج بنا دیا اور اس کے بعد ہی ملک میں ہر طرف ایسی بے اطمینانی، ہیجان اور غیر یقینی حالت تھی کہ کسی حکومت کو زیادہ عرصہ تک استحکام حاصل نہیں رہا، مختلف طاقتوں کا تصادم، حکمرانوں کی لڑائیاں، سلطنتوں کے نشیب و فراز یہ ساری کشمکش ایسی برپا تھی کہ کوئی جگہ مرکزی حیثیت نہ حاصل کر سکی، کہیں راجپوت طاقت پکڑ رہے تھے کہیں ان کے مخالفین اور یہ سلسلہ تقریباً بارھویں صدی عیسوی تک چلتا رہا جبکہ مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنی طاقت مضبوط کر کے حکومتیں قائم کر لیں چنانچہ اس درمیان میں تقریباً پانچ سو سال تک اجودھیا کی تاریخ پر بھی تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے Carnegi نے Oudh Gazetters میں لکھا ہے کہ:۔

"The History of Ajodhya, however, as of nearly all Hindu Kingdoms between the 7th & 11th centuries, is a mystry." ے

البتہ اس علاقے میں کچھ ایسی ہی جاذبیت و اہمیت تھی کہ جیسے ہی سیاسی نظام کو مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ استحکام حاصل ہوا، اس کی مرکزی حیثیت دوبارہ ابھرنے لگی۔

مذہبی اعتقاد کی رُو سے تو مسلمان ایودھیا سے اپنا تعلق ابتدائے آفرینش ہی سے قائم کرتے ہیں چنانچہ یہ روایت آج تک مشہور ہے کہ جناب یعقوبؑ، جناب شیثؑ اور حضرت نوحؑ کی قبریں اسی مقام پر ہیں۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

دراں شہر دو قبر بزرگ ساختہ اند، شش و هفت گزی۔ برخوانند خواب گاہِ شیث و ایوب پندارند و زواخت ہا برخوانند" ثہ

لیکن ان خیالات سے قطع نظر سیاسی طور پر یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں بارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں اس وقت آیا جب محمد غوری نے (۱۱۷۵ء میں) شمالی ہند کے راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر دہلی پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ محمد غوری سلطنت کی باگ ڈور قطب الدین کے ہاتھوں میں سونپ کر خود واپس چلا گیا اور یہی پہلی منزل تھی جب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مرکزی حکومت کی جانب سے جاگیرداروں کی حیثیت سے حاکم بنا کر بھیجے گئے چنانچہ ایودھیا کے علاقہ میں بختیار خلجی نے صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا لیکن جس طرح اس وقت کے بادشاہوں کی حکومتوں میں پے در پے تبدیلیاں ہو رہی تھیں اسی طرح یہ صوبہ دار بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکتے تھے چنانچہ یہاں کبھی التمش کا بیٹا نصیر الدین محمد شاہ (۱۲۲۵ء میں) صوبہ دار رہا کبھی قمر الدین قرآن، کبھی بلبن کی طرف سے فرحت خاں جاگیردار بنایا گیا کبھی اسے معزول کر کے خواجہ جہاں کو۔ خواجہ جہاں، یوں تو محمد تغلق کی طرف سے مشرقی علاقوں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جبکہ ایک طرف تیمور کے حملہ نے دہلی کی حکومت کو کمزور و تباہ کر دیا تھا دوسری طرف مختلف علاقوں کی بغاوت اور انتشار سے ہر طرف بےچینی پھیلی ہوئی تھی، ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جونپور کو پایۂ تخت بنا کر بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ جن علاقوں کا حاکم تھا ان میں کڑا، قنوج، لکھنؤ، سندیلہ، بہرائچ، بہار اور جونپور اضلاع شامل تھے" لیکن اس کی حکومت کو بھی "اودھ" ہی کا علاقہ مانا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مشرقی حصہ کے ان اضلاع میں جس بادشاہ کی حکومت بھی رہی اس نے اس کے انتظام کی طرف خاص طور پر دھیان دیا

اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی علاقہ کے نظم و نسق پر غالباً مختلف حصّوں کے نظام کا انحصار تھا جس کو مضبوط کئے بغیر حکومت کا استحکام ممکن نہ تھا غالباً اسی پہلو کے پیش نظر جب تغلق عہد میں قنوج سے بنگال تک ہر جگہ فوجی لوٹ مار اور انتشار و ابتری پھیلی ہوئی تھی تو فیروز شاہ تغلق (۱۳۲۴ء اور ۱۳۳۸ء میں) دوبار اودھیا آیا۔

مغل دور میں جہاں سیاسی حیثیت سے سارے ملک کو اتحاد و استحکام حاصل ہوا وہاں اودھ میں بھی اسی منزل سے ایک باقاعدہ نظام کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ ۱۵۲۶ء میں بابر کے تخت نشین ہوتے ہی اس علاقہ پر خاص توجہ کی گئی یہاں تک کہ ۱۵۲۸ء میں اپنی فوج کے ساتھ وہ خود اودھیا آیا اور رفتہ رفتہ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہمایوں کے سیاسی نشیب و فراز نے تو اسے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ حکومت کو استقلال حاصل ہوتا کہ اسی عرصہ میں شیر شاہ سوری نے قبضہ کر کے سارے ملک کو منظم و مضبوط کرنے پر توجہ دی۔ اس وقت تک جو صوبے قائم تھے شیر شاہ نے ان کی از سر نو تنظیم و تقسیم کر کے انھیں مختلف سرکاروں اور پرگنوں کی شکل دی۔ اس طرح اودھ کا علاقہ بھی کئی سرکاروں میں بٹ گیا تھا لیکن جب اکبر نے مغل شہنشاہ کی حیثیت سے زمام سلطنت سنبھالی تو سارے ملک میں نئی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ہر شعبۂ حکومت میں ایسی تبدیلیوں پر توجہ کی گئی جس سے نہ صرف انتظام سلطنت بہتر اور مضبوط ہو بلکہ سماجی و انفرادی زندگی میں بھی ترقی و بلندی کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ انھیں تبدیلیوں میں ایک اہم تبدیلی یہ بھی تھی کہ مختلف علاقوں سے جاگیرداری کا نظام ختم کر کے اس نے سارے ملک کو ۱۲ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبہ کے حاکموں کو سپہ سالار کہا جاتا تھا جو اپنے علاقوں میں سارے اختیارات کے مالک ہوتے تھے البتہ وہ پوری طرح مرکزی حکومت کے مطیع اور اس کے احکام کے پابند ہوتے تھے۔ انھیں صوبوں میں اودھ بھی ایک اہم صوبہ تھا۔ اس کی علاقائی شکل اس طرح قائم ہوئی تھی کہ اس کے ایک طرف گورکھپور سرکار تھی۔ (جس میں موجودہ گورکھپور اور بستی کے اضلاع شامل ہیں۔) دوسری طرف موجودہ فیض آباد ضلع کا نصف مشرقی علاقہ۔ اس تقسیم سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے اودھ میں ضلع سلطانپور کا جنوبی و مشرقی علاقہ اور رائے بریلی ضلع کا جنوبی حصّے شامل نہ تھے بلکہ ان کا تعلق صوبۂ الٰہ آباد سے تھا۔ اکبر کے دور سے لے کر محمد شاہ تک اودھ کا صوبہ اپنی اسی شکل میں رہا لیکن ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے الفاظ میں "دارالحکومت سے دور ہونے اور ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں کی وجہ سے ان صوبوں پر بادشاہوں کا اثر پوری طرح نہ رہ پاتا تھا"[۵] دوسرے جیسے جیسے مغل حکومت میں زوال و انحطاط بڑھتا رہا، جیسے جیسے ملک میں سیاسی انتشار شدّت اختیار کرتے رہے، جیسے جیسے ملک کی اندرونی بغاوتوں اور باہری حملوں سے مرکزی حکومت مجبور و محدود ہوتی گئی اسی طرح مختلف حصّوں میں نیم خود مختار ریاستیں قائم ہوتی گئیں یہاں تک کہ Macaulay کے الفاظ میں "بعض صوبہ دار اتنی بڑی تعداد کی رعایا پر حکومت کرتے تھے جو جرمنی اور فرانس کے بادشاہوں کے برابر تھی اور محمد شاہ کے عہد تک آتے آتے صوبہ داروں کا تعلق دہلی سے اسی حد تک رہ گیا تھا کہ:

> "They might occasionally send to their titular soverign a complimentary present or solicit from him a title of honour. In truth, however, they were no longer lieutenants, removable at pleasure, but independent hereditary princes." [۱۰]

چنانچہ یہی حالات جن میں سعادت خاں نے ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا فیض آباد دارالسلطنت بنا اور ایک نئی اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ نئی تہذیبی زندگی، نئی معاشرت اور شعر و ادب کی نئی روایت کی بنیاد پڑی جس کے خطوط چاہے ابتدا میں واضح نہ رہے ہوں لیکن جلد ہی ان میں روشنی اور تابندگی پھیل گئی۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرفی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ:

> "Its geographical situation, equable climate and fertility of soil gave it an unique place among the provinces of Mughal India. While its multifarious products filled the coffers of the emperors, its hardy and martial population swelled the ranks of the imperial forces. It continued virtually to be a province of the decaying Empire till 1722 when Saadat Khan, the new governor laid the foundation, infact, if not in name, of an independent Muslim Dynasty under whose rule Lucknow, its capital, prospered to rival Delhi in wealth, magnificence and culture." [۱۱]

اودھ کے ان حکمرانوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں اور انتظامی تجربات سے اس سلطنت کو کس طرح ترقی دی اس کا مختصراً جائزہ لینا بھی ضروری ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس پس منظر کو نہیں سمجھا جا سکتا جس سے اسے مرکزی اور امتیازی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔

سعادت خاں

یہ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ جس دَور میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر تھی تقریباً وہی زمانہ ایران میں صفوی بادشاہوں کی عظمت کا بھی تھا، دونوں حکومتوں میں اہلِ علم و اہلِ فن کو قدر و منزلت حاصل تھی اور ان میں ایسے دوستانہ تعلقات تھے کہ وقت پڑنے پر ہمایوں کو شاہ طہماسپ سے فوجی امداد بھی حاصل ہوئی اور سلطنت کی تعمیر و ترقی اور عظمت کے لیے اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں نے بڑے بڑے ماہرین اور فنکار بھی وہاں سے بلا کر جمع کر لیے۔ یہ قربت یہاں تک بڑھی کہ صفوی حکومت کے زوال کے بعد ایران کے اعلیٰ خاندان کے افراد ہندوستان میں تلاش روزگار کے سلسلہ میں بھی آنے لگے بلکہ مغل سلطنت کے انحطاط کے دور میں تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ مقامی حکام کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان ایرانی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ نظام میں ابتری و کشمکش پیدا نہ ہونے پائے۔ انھیں حالات میں شاہ عباس صفوی (دوم) کے وزیر رضا قلی بیگ کے داماد محمد نصیر بھی اپنے بڑے بیٹے محمد باقر کے ساتھ ہندوستان آئے اور پٹنہ میں مرشد قلی خاں جاگیردار سے "مددِ معاش" حاصل رہی۔ محمد نصیر کے دوسرے بیٹے محمد امین بھی کچھ دنوں بعد پٹنہ آ گئے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو چکا تھا اور جب وہاں کوئی ذریعۂ روزگار نہ مل سکا تو ۱۷۰۹ء میں دہلی آ گئے اور یہیں سے ان کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوتا ہے جس میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے وہ پہلے "سعادت خان" اور بعد میں "برہان الملک" ایسے خطابات سے شہرت پا گئے۔

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں جہاں مغل شہنشاہ کو آئے دن بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑتا رہتا تھا، جہاں راجاؤں اور فوجیوں کی سرکشی معمولات بن چکے تھے۔ وہاں کامیابی اور ترقی حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ فوجی حکمت عملی، بہادری اور حوصلہ مندی ہی ہو سکتی تھی۔

محمد امین میں ذہانت و ہوشمندی کے ساتھ ساتھ یہ صفات پوری طرح موجود تھیں جس کے نتیجہ میں (کڑا مانک پور کے فوجدار سربلند خاں کے) معمولی فوجی سردار سے بڑھتے بڑھتے وہ ایک اہم حکومت کے مالک بن گئے۔ سربلند خاں کی ملازمت انھوں نے ناراض ہو کر چھوڑی تھی اور دہلی اس لیے واپس گئے تھے کہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کریں یہاں خوش قسمتی ان کے قدم چومنے کی منتظر تھی اور فرخ سیر کی فوج میں ملازمت حاصل کرتے ہی ۱۷۱۳ء میں "ہفت ہزاری" کا اعزاز حاصل کر لیا۔ محمد شاہ کی نظر انتخاب زیادہ تیز اور قدر شناس تھی اس نے تخت پر بیٹھتے ہی محمد امین کے سر کئی اہم ذمہ داریاں سونپ دیں اور کسی منزل پر ان کی طرف سے اسے مایوسی نہ ہوئی۔ کبھی صوبۂ آگرہ کے بیانہ اور ہنڈوان اضلاع کی بغاوت ختم کر کے فوجدار بن گئے، کبھی صوبۂ الٰہ آباد کے گورنر راجہ گردھر بہادر کی سرکشی مٹا کر کمانڈر کا عہدہ حاصل کیا اور ایک منزل وہ بھی آئی کہ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے اپنے محسن و ہمدرد "سید برادران" کے گروہ کے اہم رکن حسین علی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے سے بھی دریغ نہ کیا اور اس کارنامہ کے انجام دینے پر ان کو "سعادت خاں بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اور "ڈاکٹر اشرف الدین لال سریواستوا کے الفاظ میں "اس طرح بیانہ اور ہنڈوانہ کی سرداری حاصل کرنے کے سال ہی بھر بعد سعادت خاں "پنج ہزاری" کے مرتبہ پر پہنچ گئے"[12]۔ اب وہ محمد شاہ کے معتمد ترین افسروں میں شامل ہو چکے تھے اور "ہفت ہزاری" کا منصب دے کر ۱۵ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو آگرہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں "۱۲ جنوری ۱۷۲۱ء کو ان کو داروغہ خواصان" Captain of the Imperial Body guards کا اعزاز بھی ملا"[13]

اس زمانے میں اودھ میں بھی شدید بدنظمی پھیلتی جا رہی تھی اور جب لمبے عرصہ تک دبایا نہ جا سکا تو اس کے لیے بھی سعادت خاں ہی کا انتخاب ہوا اس طرح وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پوری طرح سے ایک نئی حکومت کی بنیادیں قائم ہو گئیں۔ محمد امین کے ابتدائی حالات سے لے کر اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے تک کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کنور درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ:-

"..... بعد قطع منازل و مراحل بہ دار الخلافت دہلی رسید

رفتہ رفتہ بار ابو رتن چند، دیوان عبداللہ خاں قطب الملک وزیر فرخ سیر طرح تالف و تعارف انگندہ از قدر دانی و مردم شناسی او علومت ہندوکن بیانہ حاصل نمود، مدتے بعد حکومت دراں سرزمین، بکو لاں در آورد، ہنگامیکہ حضرت محمد شاہ تمکن سریر سلطنت شدند، و امیر الامراء حسین علی خاں برادر عبداللہ خاں قطب الملک بایماء اعتماد الدولہ، محمد امین خاں از دست حیدر علی خاں کشتہ گردید، عزت خاں ہمشیر زادۂ امیر الامراء بافوج کثیرہ جمعیت ساداتِ بارہہ بر حضرت بادشاہ یورش نمود، دراں وقت سعادت خاں باپانچ ہزار سوار خنجر گداز خود را بموکبِ سلطانی رسانیدہ تردداتِ نمایاں بجا آورد، بظہور ایں خدمتِ شائستہ، و ایں کار بایستہ از پیشگاہ حضرت بادشاہ بخطاب سعادت خاں بہادر مخاطب گردید، بعد چندے بہ صوبہ داریٔ اکبر آباد امتیاز یافت، مقارن ایں حال کیفیتِ بد نظمیٔ صوبہ اودھ معروضِ عاکفانِ پایۂ سریر خلافت گردید، آنحضرت درخور ایں خدمت سعادت خاں بہادر را شناختہ بہ صوبہ داریٔ اودھ امتیاز بخشیدند، سعادت خاں بافواجِ جرار و سپاہ خنجر گذار بہ اودھ آمد۔[۱۲]

اور ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ بھی سنبھالا اور ساتھ ہی ساتھ گورکھپور کی فوجداری بھی سونپی گئی۔ اودھ کا علاقہ اکبر ہی کے عہد میں ایک اہم صوبہ بن چکا تھا اور اس وقت سے لے کر سعادت خاں کی صوبہ داری حاصل کرنے تک اس میں خیر آباد، فیض آباد، گورکھپور، بہرائچ اور لکھنؤ، پانچ اضلاع شامل تھے۔ اس کے محل وقوع اور حدود اربعہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر آشروادی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ:۔

"شمال میں ہمالیہ کی پوربی چوٹیاں، مشرق میں بہار، جنوب میں (صوبۂ الہ آباد کے) مانک پور رنگ در مغرب میں قنوج تک۔ گورکھپور کے مشرقی حصہ سے قنوج تک تقریباً ۲۷۰ میل لمبائی اور شمالی پہاڑی سے لے کر مانکپور ریاست کے شمالی حدود تک ۲۳۰ میل چوڑائی تھی، ان سب کا رقبہ ایک کروڑ ایک لاکھ اکہتر ہزار اسّی بیگہ تھا۔"[۱۵]

اس سارے علاقے میں مختلف راجاؤں، جاگیرداروں اور زمینداروں نے اورنگ زیب ہی کے وقت سے بد نظمی و انتشار پھیلا رکھا تھا، خاص کر لکھنؤ کے شیخ زادے ایسے شورہ پشت تھے کہ ان کو قابو میں کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے ان کی طاقت و دبدبہ کو سعادت خاں نے لکھنؤ میں قدم رکھتے ہی اس طرح مٹا دیا کہ "شیخ زادوں" کے پھاٹک پر جو ننگی تلوار اس لیے لٹکتی رہتی تھی کہ ہر آنے والا اس کی تعظیم کرے اس تلوار کو گرا دیا اور شیخ زادوں کو شکست دے کر شیخ عبدالرحیم کے "پنج محلہ" کو اپنی رہائش کے لیے خالی کرا لیا۔ اور بعد میں تلوئی، پرتاب گڑھ، گونڈہ، رسول پور، بلرام پور اور اناؤ (بیواڑہ) کے راجاؤں اور جاگیرداروں نے جو انتشار و ہیجان پھیلا رکھا تھا اس پر قابو کر کے امن و سکون کی فضا قائم کی اور اجودھیا کے قریب اپنا "بنگلہ" قائم کر کے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں فیض آباد کے نام سے نئی حکومت کا دارالسلطنت بنا۔ اب انھوں نے ساری توجہ اس بات پر صرف کرنی شروع کر دی کہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو سکے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے ذرائع بھی بڑھتے رہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو بندوبست کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی علاقہ جس کی آمدنی پہلے کبھی ستر لاکھ روپیہ سے زیادہ نہ تھی اسی سے "سعادت خاں در سالِ اول یک کرور ہفت لک روپیہ تحصیل فرمود و در سالِ دوم و سوم جمع دو کرور روپیہ تشخیص نمود"[۱۶] اس کامیابی سے محمد شاہ کی نظر میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی اور انھیں "برہان الملک" کا خطاب دے کر ان کارناموں کو سراہا گیا۔ بعض انگریز مورخین، جن کی نظر میں اودھ کے سبھی حکمراں، نااہل اور رعایا کی بہبود و انتظام حکومت سے غافل تھے، وہ بھی سعادت خاں کی ان صلاحیتوں کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ H.C. IRWIN نے اپنی کتاب The Garden of India میں لکھا ہے کہ:۔

Saadat Khan's policy in Oudh seems to have been to cherish the peasantry, and to keep in check the encroachments of the larger

land holders and he was probably the first to make the power ofacomprativelv strong central govt. felt throughout the Province. [17]

ان انتظامات سے محمد شاہ اتنا متاثر اور مطمئن تھا کہ کسی طرح کا دخل دینا مناسب نہ سمجھتا تھا چنانچہ ایک خود مختار حکمراں کی طرح وہ حکومت کی وسعت بڑھانے پر متوجہ ہوئے اور ۱۷۲۸ء میں مرتضیٰ خاں جاگیردار سے بنارس، جونپور، غازی پور اور چنار کی سرکار پٹہ پر حاصل کر لی، ان اضلاع کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ

As these dists. lay on the eastern boundry of Awadh, Saadat Khan found his eastern frontier automatically pushed to the limit of the modern U.P. in that direction. [18]

سعادت خاں معمولی فوجی افسر سے اتنی بڑی حکومت کے مالک بنے تھے اس لیے انھیں ان درباری سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی تجربہ تھا جو ملک کے مختلف حکمرانوں کے خلاف سر اٹھاتی رہتی تھیں، محمد شاہ کے بعض مشیروں اور خاص کر امیر الامرا خانِ دوراں کی طرف سے بھی غافل نہ تھے، انھیں باتوں کے پیشِ نظر اودھ میں وہ اپنے ساتھ کسی ایسے شخص کو رکھنا چاہتے تھے جس پر پوری طرح اعتماد بھی کر سکیں اور جو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے پوری طرح ان سے قریب بھی ہو۔ چنانچہ انھوں نے اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے کے دوسرے ہی سال نیشاپور سے اپنے بھانجے محمد مقیم کو بلا کر اپنی بڑی بیٹی سے شادی کر دی، محمد شاہ کی طرف سے ان کے لیے نائب صوبہ داری کا عہدہ حاصل کر کے "ابو المنصور" کا خطاب دلا دیا۔ اس طرح اپنا جانشین بنا کر بہت سی فوجی و CIVIL ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور خود انھیں یہ موقع بھی مل گیا کہ مرکزی دار السلطنت میں قیام کر کے ملکی معاملات میں اپنا دخل واقتدار قائم رکھ سکیں۔ دہلی کی سیاست میں ایرانی و تورانی گروہ بندی جس کے باہمی مناقشات نے بقول ڈاکٹر محمد حسن "مستقل آویزش کی شکل اختیار کر لی تھی" [19] اس کے نشیب و فراز سے بھی انھیں پوری واقفیت رکھنا ضروری تھی کیونکہ یہ خطرہ لاحق تھا کہ ذرا سی غفلت ان کے ایرانی گروہ کے اثر واقتدار کو برباد کر سکتی ہے۔ لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے بعد بھی آخر سعادت خاںؒ تورانی گروہ کی سازشوں کا شکار ہو ہی گئے اور ۱۷۳۶ء میں محمد شاہ کی خاطر دکن کے مرہٹہ سردار پیشوا باجی راؤ کو شکست دینے کے باوجود بادشاہ کی نظر میں ان کی یہ جنگ مناسب نہ تھی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبِ بوستانِ اودھ لکھتے ہیں:

"۱۷۳۶ء میں دکن کا پیشوا باجی راؤ، چوتھ کی رقم وصول کرنے دہلی کی طرف چلا، اس نے دہلی پہنچ کر قتل و غارت گری شروع کر دی۔ بادشاہ کے پاس چار لاکھ سے کم فوج نہ تھی، پھر بھی مقابلہ نہ کر سکا اور باجی راؤ کے شرائط ماننا پڑے۔ اس کامیابی سے باجی راؤ کا دماغ چڑھ گیا اور برابر بدامنی پھیلاتا رہا۔ سعادت خاں کی شجاعت اسے برداشت نہ کر سکی اور یکایک اس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے باجی راؤ گھبرا کر مصالحت پر تیار ہو گیا، اسی عرصہ میں خانِ دوراں جو امیر الامرا تھے وہ سعادت خاں کی فتح سے حسد کرنے اور بادشاہ کو ان کے خلاف بھڑکا دیا، بادشاہ نے (سعادت خاں کو) لکھا کہ اسے ہمارے معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے، آخر کار سعادت خاں نے باجی راؤ سے صلح کر لی اور لکھنؤ آگئے" [20]

ان سیاسی مناقشات نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ کے وقت ایسی شدت اختیار کر لی کہ دہلی کو قتل و غارت گری کے لرزہ خیز حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور یہاں تک کہ سعادت خاں ایسے حوصلہ مند اور باعزم حکمراں کو موت کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ نادر شاہ جب دہلی کی طرف بڑھا تو سعادت خاں اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو کروڑ روپیہ لے کر واپس چلا جائے۔ ابھی یہ شرط پوری نہ ہوئی تھی کہ تورانی گروہ کی طرف اس صلح کی کامیابی کا سہرہ آصف جاہ کے سر باندھ دیا گیا اور یہ بات مشہور ہو گئی کہ یہ معاملات اسی کی وجہ سے طے ہوئے ہیں۔ خود محمد شاہ بھی حقائق سے واقف تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اس کارگزاری پر آصف جاہ کو "امیر الامرا" کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر سعادت خاں نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور نادر شاہ کو سب باتوں سے آگاہ کر کے

ہوئے اطلاع دے دی کہ ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نادر شاہ کا ظلم و جلال اسے برداشت نہ کر سکا اور آصف جاہ کو قید کر کے دہلی میں قتل و خون اور تباہی و بربادی کا بازار ایسا گرم ہوا جس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ابھی یہ ہنگامہ پوری طرح مٹا بھی نہیں تھا کہ عام مورخین کے مطابق سعادت خاں نے زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی، بعض مورخین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو ان کی موت اچانک واقع ہو گئی۔ بہرحال اپنے سترہ سالہ دورِ صوبہ داری میں ایک سلطنت کی بنیاد سے لے کر اسے ترقی و خوشحالی کی جس منزل تک پہنچا دیا یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی موت کے وقت اودھ میں ۲۲ ہزار فوج اور پچاس توپیں تھیں اور "خزانہ میں کئی کروڑ روپیہ موجود تھا۔"[۲۱]

صفدر جنگ

ابھی دہلی پر نادر شاہ ہی کی حکمرانی تھی کہ اودھ کی صوبہ داری کا مسئلہ پیش آیا، ایک طرف سعادت خاں کے بھتیجے شیر جنگ کو شاں تھے۔ دوسری طرف ابو المنصور محمد مقیم جو نہ صرف سعادت خاں کے داماد بلکہ ان کے بیٹے کی طرح تھے اور جو ان کے جانشین اور نائب کی حیثیت سے تقریباً ۱۸ سال تک سیاسی پیچ و خم کے تجربات بھی حاصل کر چکے تھے اور فوجی و ملکی انتظام کی پوری مہارت بھی۔ ظاہر ہے عام حالات میں تو محمد مقیم کے علاوہ کسی دوسرے پر نظرِ انتخاب کا سوال ہی نہ تھا، لیکن نادر شاہ کو نہ ان حقائق سے کوئی سروکار تھا نہ وہ ابو المنصور کے وکیل راجہ لچھمی نرائن کی عرضداشت کے ان جملوں سے متاثر ہو سکتا تھا کہ "وہ ایماندار، قابلِ اعتماد اور خدا ترس انسان ہیں، انتظامِ حکومت کی فطری صلاحیت ہے اور سعادت خاں کے فوجیوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔" البتہ اس کے نفسیاتی تقاضوں کو جس چیز سے تسکین مل سکتی تھی لچھمی نرائن نے اس کا اظہار بھی اس طرح کر دیا تھا کہ تقرری کے بعد دو کروڑ روپے نذر کے طور پر بھی پیش کیے جائیں گے اور حقیقتاً اسی پر فیصلہ کا انحصار تھا۔ نادر شاہ نے لچھمی نرائن کے ساتھ دو سو قزلباش بھی اودھ بھیجے تاکہ وہ رقم لے جائیں۔ اودھ سے ایک کروڑ اسی لاکھ کا انتظام ہو سکا اور بقیہ ۲۰ لاکھ روپیہ محمد مقیم ابو المنصور نے سعادت خاں کے دہلی کی رہائش گاہ سے حاصل کی اور اس طرح دو کروڑ روپے کو کر کے "بہت سے قیمتی تحائف اور ایک ہاتھی نادر شاہ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے" چنانچہ اس طرح "ابو المنصور محمد مقیم" کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا اور محمد شاہ کی طرف سے "صفدر جنگ" کا خطاب ملا۔

انتظامِ حکومت سنبھالتے ہی صفدر جنگ کو بھی انھیں تمام مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس سے سعادت خاں ہمیشہ الجھے رہے۔ دہلی کی درباری سازشیں، مختلف راجاؤں کی سرکشی اور ساتھ ہی ساتھ فوج اور رعایا کی بہبود و خوشحالی، وہ کسی طرف سے غفلت نہیں برت سکتے تھے اور یہ ان کی غیر معمولی صلاحیت اور ہوشمندی کا نتیجہ تھا کہ شدید سے شدید ہیجانی و انتشاری حالات میں بھی ہر شعبہ میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے اسی "ایرانی گروہ" کی جدوجہد بھی شامل ہے جس کے وہ اہم رکن تھے اور راجہ نول رائے، راجیندر گیر گوشائیں، راجہ لچھمی نرائن اور راجہ رام نرائن ایسے مخلص، وفادار اور بے لوث افراد کی کارگزاریاں بھی جو اس دور کے بہت کم حکمرانوں کو میسر تھیں۔ ان مختلف عناصر کے اشتراک سے صفدر جنگ نے بہت سے باغی راجاؤں روہیلوں اور بنگشوں کی سرکشی مٹا کر اودھ میں پوری طرح امن و سکون بھی پیدا کر دیا اور محمد شاہ کا اعتماد حاصل کر کے "میر آتش" کا مرتبہ بھی حاصل کر لیا اور کشمیر کی صوبہ داری بھی۔ محمد شاہ پر ان کا اتنا گہرا اثر قائم ہو چکا تھا کہ حکومت کا سارا نظام ایک طرح سے صفدر جنگ ہی کے سہارے چل رہا تھا، خود ان کا تجمل اور شاہانہ اقتدار کی مثال کے لیے ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کی شان و شوکت کا ذکر کافی ہے جس میں "چہل و شش لکھ روپیہ بمصرف در آمدہ بود" اور جس کی "رسم ساچق" کا ذکر کرتے ہوئے اشرداوی لال لکھتے ہیں:-

"شاہی قلعہ سے کوٹلہ فیروز شاہ تک پھلوں، مٹھائیوں، جوڑوں، زیوروں اور عطر کی شیشیوں سے بھری ہوئی کشتیوں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ منقش برتنوں، پیالوں اور پلیٹوں کا شمار ممکن نہ تھا اور اسی کے ساتھ چاندی اور سونے کے لاتعداد برتن ایسے نظر آتے تھے جن میں کوئی بھی سو روپیہ سے کم قیمت کا نہ رہا ہوگا۔"[۲۲]

دولت ونشاط کی یہ فراوانی اسی لئے تھی کہ صفدر جنگ کے حصولِ اقتدار کے پانچ چھ برسوں میں اودھ کی سیاسی حالت بھی مستحکم ہو چکی تھی اور معاشی واقتصادی حیثیت سے پوری طرح خوشحال بھی بن چکا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت کی دہلی کی تہذیبی عظمت و تابناکی، قوت و زندگی اور عیش ونشاط کے عناصر، جو کشمکش و سراسیمگی میں چراغ سحری کی طرح بجھنے سے پہلے بھڑک رہے تھے اسے اودھ میں روشنی پھیلانے کا موقع مل گیا۔

درحقیقت صفدر جنگ پر اودھ کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے ملکی و بیرونی بھی خطرات و ہیجانات سے تحفظ کی ذمہ داری آپڑی تھی اور یہی سبب تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کے لئے بھی وہی گئے۔

محمد شاہ کے آخری دور اور ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ملکی خانہ جنگی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے نے بادشاہ، امراء اور عوام کو اتنا مجبور و بے بس بنا دیا تھا کہ انھیں سکون کی سانس لینا بھی ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں ہر ایک کی نظر صفدر جنگ ہی پر تھی، وہی خطرات کا مقابلہ کر کے سہارا دے سکتے ہیں۔ احمد شاہ نے نہ صرف ان کو اپنا وزیر بنا دیا بلکہ "منتظم غسل خانہ" کا عہدہ دے کر اندرونی و ملکی ساری ذمہ داریاں سونپ دیں، اودھ کے علاوہ اجمیر کے صوبہ دار بھی بنا دیے گئے۔ نرنول کے فوجدار بھی ہو گئے، ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کو "شجاع الدولہ" کا خطاب دے کر SUPDT. OF IMPERIAL ARMY بنا دیا گیا اور بعد میں "بخشی" اور بہت سے دوسرے عہدے بھی مل گئے۔

یہاں ان خیالات سے بحث مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ اپنی مجبوری و کمزوری کے احساس کے تحت صفدر جنگ کو سارے اختیارات دیتا جا رہا تھا یا اسے ان سے بہتر منتظم و باصلاحیت شخصیت مل نہ سکتی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ سلطنت کے سارے اختیارات صفدر جنگ ہی کو حاصل ہو چکے تھے جو ایک ذمہ دار اور حوصلہ مند حاکم کی طرح اپنے فرائض بھی نبھا رہے تھے اور اودھ کی اس حکومت کی ترقی و عظمت کی طرف بھی متوجہ رہے جسے وہ اپنی ذاتی اور خاندانی ملکیت سمجھتے تھے۔

جس طرح صفدر جنگ کو اودھ کی صوبہ داری ایک طرح سے جانشینی کے طور پر ملی تھی، اسی طرح ایرانی اور تورانی گروہ کے منافرت بھی سعادت خاں سے ورثہ میں ملے اور آخری ۵، ۶ برسوں میں ان کے نشیب و فراز میں بُری طرح الجھے رہے۔ جب تک باہمی اختلافات محض ایک دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے تک محدود رہے اس وقت تک تو صفدر جنگ بادشاہ یا تورانی امراء سے براہ راست ٹکر لینے سے گریز کرتے ہوئے سارے فرائض پوری طرح نبھاتے رہے لیکن جب سازشوں کا حصار ایسا پست بن گیا کہ ادھم بائی رقاصہ اور اس کے بیٹے جاوید خاں خواجہ سرا کے زیر اثر احمد شاہ خود بھی ملک کے مفاد اور وقار کو نظر انداز کر کے صفدر جنگ کو الگ کر دینے کے درپے ہو گیا تو ان کے لیے برداشت سے باہر تھا۔ ادھم بائی کو شاہی حرم میں داخل کر کے بہت سے خطابات سے سرفراز فرمایا گیا تھا"[۲۳] اور "تمام شاہی اختیارات جاوید خاں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جس نے حرم کو عورتوں سے بھر دیا تھا۔ محل سے ایک ایک کوس تک چاروں طرف خوبصورت عورتیں نظر آتی تھیں، خود بادشاہ (احمد شاہ) کے گرد اوباشوں کا ہجوم تھا"[۲۴]

ڈاکٹر محمد حسن کے یہ جملے اور دوسرے مؤرخین و ماہرین کی دربار کے غیر سنجیدہ ماحول کی عکاسی، اس بات کا پوری طرح احساس دلا دیتی ہے کہ حالات ایسے بدتر ہو چکے تھے کہ ان میں بہتری پیدا کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی دور کے ایک مؤرخ نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ:

"راقم حروف گوید کہ باین نازک مزاجی و آسائش شہر جہان آباد ویران و سلطنت ہندوستان خراب وابتر گشت"[۲۵]

صفدر جنگ کی شجاعت و حوصلہ مندی اپنے اوپر قاتلانہ حملوں کو تو نظر انداز کر گئی تھی لیکن ان کی حمیت و خودداری سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ دربار کی عظیم روایات اور اس کے وقار کو بدنام ہوتے دیکھ سکیں، چنانچہ ۱۷۵۳ء میں انھوں نے جاوید خاں کو قتل کرا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صفدر جنگ اور احمد شاہ میں کھل کر مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقابلہ محض سیاسی نہ رہ گیا بلکہ فوجی صف آرائی بھی شروع ہو گئی اور بادشاہ کی شہ پا کر عماد الملک نے پوری کوشش کی کہ صفدر جنگ اور ان کے گروہ کو مٹا دیا جائے لیکن احمد شاہ کے فوجیوں کی جو حالت

تھی ان میں یہ بھی نہ ہو سکا تو وہ مصالحت کی گفتگو پر رضامند ہو گیا۔ صفدر جنگ بھی دہلی کی ہنگامی زندگی سے بیزار ہو چکے تھے چنانچہ وہاں کے عہدوں سے الگ ہو جانا ہی بہتر سمجھا اور اس طرح دسمبر ۱۷۵۳ء میں اودھ واپس آ گئے۔ اب ان کے پیشِ نظر محض ایک مقصد رہ گیا تھا کہ اس سلطنت میں امن و سکون، قانون و انصاف کی مستحکم فضا قائم کر کے اس ریاست کو اتنا خوشحال و دلکش بنا دیں کہ دہلی اور دوسری ریاستوں کے لیے قابلِ رشک بن سکے اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہوئے اور جب اکتوبر ۱۷۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت جہاں دوسرے صوبوں میں بدامنی، انتشار و ہیجان اور انحطاط کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں وہاں اودھ میں قانونی و انتظامی استحکام نے ڈاکٹر اشرواوی لال کے الفاظ میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ

"Which kept the strong and unruly in check and created a feeling of security of life and property, gave an impetus for the development of liberal art and profitable industries and made Awadh evolve a distinct type of culture.. "

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عہدِ اکبر سے لے کر برہان الملک سعادت خاں کے ابتدائی دور تک اودھ کے علاقائی حدود تقریباً ایک ہی شکل میں قائم تھے، سعادت خاں نے بھدوہی کی ریاست اور صوبہ الہ آباد کے بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ، بلیا کے اضلاع اور ضلع مرزاپور کا مشرقی حصہ شامل کر کے اس کی وسعت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا اور ۱۷۴۳ء میں صفدر جنگ نے اپنی حکمتِ عملی سے پورا الہ آباد کا صوبہ اپنی حکومت میں شامل کر کے اودھ کو مشرق میں بہار جنوب میں مدھیہ پردیش اور مغرب میں مغل دور کے صوبہ آگرہ تک پھیلا دیا۔ صفدر جنگ کے بعد واقع ہونے والے سیاسی نشیب و فراز کے زیرِ اثر یہ علاقہ محدود و منقسم ضرور ہوتا گیا لیکن اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہو گی کہ صفدر جنگ نے کتنی عریض و وسیع حکومت کو نہایت مختصر مدت میں استحکام و خوشحالی بخشی اور یہ ان کی صلاحیتوں کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ انھوں نے فوجیوں میں اپنا اثر اس طرح قائم کیا تھا کہ "معائنہ کے وقت جس سوار پر خصوصی نظر پڑ جاتی تھی اس کی تنخواہ میں دس روپیہ اور جس پیادے پر توجہ ہو جاتی تھی اس کی تنخواہ میں ۲ روپیہ ماہوار اضافہ ہو جاتا تھا" امراء اور عوام میں اس طرح مقبولیت حاصل کی کہ "جب کبھی کوئی نادار انسان ان سے سوال کرتا تو اس کا کلام منقطع ہوتے ہی اسے پچاس اشرفیاں دیدیتے اور بہت سے نادار سیدوں کی وہ جاگیریں بھی واپس کر دیں جو مقامی عاملوں نے ضبط کر لی تھیں" اور علماء، شعراء اور فنکاروں کو انعام و اکرام سے ہمت افزائی کر کے علمی و تہذیبی عظمت پر توجہ دی، غرضیکہ ترقی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہ کیا جس کا ایک خوشگوار نتیجہ ڈاکٹر محمد تقی احمد کے الفاظ میں "یہ بھی ہوا کہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں دہلی کی اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن کو سلطنت کی تباہی سے ایسا سخت صدمہ نہیں اٹھانا پڑا جیسا کہ قدرتاً امید کی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ نئی سلطنت اس بارِ عظیم کو اٹھانے کے لیے تیار ہو گئی"۔

صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ نے دہلی کی مرکزی سلطنت کی تباہی و زوال کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اس لیے انھوں نے وہاں کی سیاست سے کنارہ کشی کر کے خود اپنی حکومت کی عظمت و شان و شوکت پر توجہ مرکوز کی۔ اب اودھ کی حکومت اتنی مضبوط اور ممتاز ہو چکی تھی کہ دوسری ریاستوں کے حکمراں خود اس سے امداد کے طالب رہتے تھے۔ انھوں نے اقتصادی اور معاشی حیثیت سے ساری ریاست کو اتنا خوشحال بنا دیا تھا کہ روساء اور امراء کے علاوہ عوام میں بھی عیش و عشرت اور نشاط و آسائش کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں، سارے ماحول میں زندہ دلی، سکون اور اطمینان کی لہر پھیل رہی تھی، سماجی زندگی میں اربابِ نشاط اور ماہرینِ فن کی قدر کی جانے لگی تھی اور یہی حالات تھے جن میں دہلی اور دوسری جگہوں کے مایوس و پریشان حال امراء اور فنکاروں کو اپنے لیے ایک جائے پناہ نظر آئی جہاں وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتے تھے چنانچہ سب اسی مرکز کی طرف رجوع ہو گئے۔

اب اودھ کو کسی ہندوستانی راجہ یا مہاراجہ سے خطرہ تو نہیں تھا لیکن ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں غیر ملکی طاقت کا جو اثر پھیلتا جا رہا تھا اسے زائل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور شجاع الدولہ ایسے ماہر اور ہوشمند سیاست داں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس خطرہ سے وہ

بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے ۱۷۶۴ء میں میر قاسم کی مدد کے طور پر بکسر کے مقام پر انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ طاقت ان کے اندازے سے زیادہ منظم اور مضبوط نکلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو شکست اٹھانی پڑی۔ پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے اور کوڑہ جہان آباد میں مرہٹوں کی مدد لے کر دوبارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اور پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کے لیے سوائے صلح کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کے الہ آباد کے شرائط نامہ کے سارے پہلوان کو قبول کرنا پڑے اور یہیں سے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ڈاکٹر ہاف مین (Dr. - Haffman -) کے الفاظ میں:

"How from 1765 till the annexation of Oude, The East India Co. heaped Wrong after wrong upon that country and its princes." ۲۹

بظاہر اس صلح کے شرائط بہت معمولی تھے کہ اودھ کے سارے علاقہ میں سے دو اضلاع کوڑہ اور الہ آباد کے اضلاع کمپنی کو مل جائیں گے جو شاہ عالم کی زیر حکومت رہیں گے، پچاس لاکھ روپیہ کی رقم اودھ کی جانب سے کمپنی کو تاوان جنگ کے طور پر ادا کرنی پڑے گی اور انگریزوں کو اودھ کے سارے علاقے میں تجارت کی آزادی حاصل ہوگی، کمپنی اور نواب کے مساوی مرتبے کا احساس دلاتے ہوئے اس میں ایک نکتہ یہ بھی شامل تھا کہ دوسری طاقتوں سے مقابلہ کے وقت دونوں ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ لیکن دراصل یہ بہت گہری سازش کی ابتدا تھی جس کا جال برابر پھیلتا رہا۔ شجاع الدولہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ پوری مستعدی سے فوجی اور اقتصادی انتظام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے سارے علاقہ کا دورہ کر کے مسائل کا جائزہ لیا اور تعمیری، ترقیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فوجی تنظیم پر خاص طور سے زور دیا ــــ اسلحہ اور توپیں ڈھالنے کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، جگہ جگہ چھاونیاں بنائی گئیں ہوشیار اور وفادار افسروں کا تقرر کیا گیا اور خبر رسانی اور ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا گیا، اس طرح دن رات اسی مقصد میں مصروف ہو گئے کہ آئندہ اُن کو اِن حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جس نے ان کے اقتدار کو ضرب لگائی تھی۔ یہ عظیمی طاقت انگریزوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ کمپنی کے لیے ان پر روک لگانا ضروری تھا۔ تین ہی سال میں انھوں نے اپنی فوج کو ایسا منظم کر لیا تھا کہ اس وقت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر انچیف جنرل بارکر نے ان حالات سے آگاہ کرتے ہوئے ۱۷ فروری ۱۷۶۸ء کو ایک خط میں کمپنی کی Select Committee کو لکھا تھا کہ:

"شجاع الدولہ نے اس عرصہ میں جو فوجی ترقی کی ہے وہ تصور سے بالاتر ہے، اس وقت ان کے پاس سترہ بٹالین تیار ہیں جن میں سے پانچ یورپ کے بنے ہوئے ہتھیاروں اور سامانوں سے مسلح ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار تربیت یافتہ سوار بھی موجود ہیں، گھوڑے خریدنے کے لیے تین لاکھ روپے گجرات بھیجے گئے ہیں، انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ایک ماہر افسر عمر خاں کو بھی ملازمت کی دعوت دی ہے۔ اور رشیدی بلوچ کو پانچ ہزار بلوچ بھرتی کرنے کے لیے کہا ہے۔ ایک سکھ سردار کو بھی دو ہزار سپاہی لانے کے لیے لکھا ہے۔"

یہ اطلاعات کمپنی کے لیے اتنی تشویشناک تھیں کہ اس کے لیے نئی پابندیاں عائد کرنے کے علاوہ کوئی بس نہ تھا چنانچہ ۱۷۶۸ء میں گذشتہ (۱۷۶۵ء والے) معاہدہ میں ایک شرط کا اضافہ کر دیا گیا کہ نواب کی فوج کی تعداد ۳۵ ہزار سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہو سکتی ــــ شجاع الدولہ کو مرہٹوں اور بعض دوسری طاقتوں کی طرف سے خطرے کا احساس تھا اس لیے وہ اس بندش کے باوجود انگریزوں سے مخالفت مول نہیں لے سکتے تھے، چنانچہ ان حالات میں بھی انھوں نے روہیلوں کی مدد سے مرہٹوں کو شکست دی اور سلطنت کی ترقی اور رعایا کی بہبودی و خوشحالی کی طرف متوجہ رہے۔

۱۷۷۳ء میں جب گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بنارس آیا تو شجاع الدولہ نے اس کے سامنے بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور بعد میں ایک نئے معاہدہ کی شکل میں یہ طے پایا کہ اودھ کے دو اضلاع (کوڑہ اور الہ آباد) جو ۱۷۶۵ء میں کمپنی نے لے لیے تھے وہ پچاس لاکھ روپے

دے کر واپس مل جائیں گے، فوجی امداد کے موقع پر دورانِ جنگ کمپنی کو فی بریگیڈ دو لاکھ دس ہزار روپیہ ماہانہ ملا کرے گا اور کمپنی کی طرف سے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک Resident مقرر کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ کے بعد واپس آتے ہی انھوں نے مرہٹوں کی سرکشی دور کرنے کی غرض سے دوآبہ کی طرف فوج کشی شروع کر دی اور تقریباً پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ مرہٹوں کی تمام چھاؤنیاں ختم کر دیں۔ روہیلوں کی طاقت کو بھی زائل کرنا ان کے لیے ضروری تھا چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو بابل نالہ کی جنگ میں حافظ رحمت خاں کی فوج کو شکست دے کر روہیل کھنڈ کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن ابھی ان علاقوں کے انتظامات کی طرف سے پوری طرح فراغت بھی نہ مل پائی تھی کہ ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو محض ۴۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو نہ صرف اودھ کی آنے والی تاریخ دوسری شکل میں ہوتی بلکہ سارے ہندستان کے سیاسی حالات دوسرا رُخ اختیار کر لیتے۔

شجاع الدولہ کے معاصر اور بعد کے مورخین کبھی نے اس وقت کے عہد کی درباری شان و شوکت اور عوام کی خوشحالی و پرسکون زندگی کی تعریف کی ہے۔ اگر شاہی محل میں ارباب نشاط کیزوں اور حسیناؤں کی رنگ رلیاں چھائی رہتی تھیں، اگر شجاع الدولہ کے سفر میں ان کے خیموں کے ساتھ طوائفوں کے ڈیرے بھی پہلے ہی سے موجود ہوتے تھے تو رعایا میں بھی رقص و موسیقی، حسن و شاہد سے دلچسپی عام تھی اور بازی گری، مرغوں اور کبوتروں کی لڑائیاں اور پتنگ بازی وغیرہ کے رواج نے ہر طرف چہل پہل اور نئی زندگی بھر دی تھی۔ یہ کیفیت بعض امراء و روساء کی سوسائٹی تک محدود نہ تھی بلکہ ہر فرد کے مذاق اور اس کی تفریح کا سامان موجود تھا۔ اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے فیض بخش نے خود چشم دید حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ:

"جب میں اپنے وطن سے پہلی مرتبہ ممتاز نگر پہنچا جو شہر فیض آباد کے مغربی دروازہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے تو یہاں ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان، مٹھائیاں، شربت، کباب، پراٹھے، بھنا ہوا گوشت، پانی کے بتاشے، فالودہ اور نان خطائیاں وغیرہ نظر آتی تھیں اور مسافر خریدنے میں سبقت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ ضرور چوک بازار یہی ہے لیکن مجھے کسی نے بتایا کہ ابھی تو شہر پناہ کے دروازہ میں بھی داخل نہیں ہوا۔ بالآخر جب میں شہر میں پہنچا تو میں نے ہر طرف ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے جنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروبِ آفتاب سے طلوعِ سحر تک فوجوں کے ڈھول اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں، گھڑیالوں کی صداؤں اور نوبت کی آوازوں سے کان بھرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے گاڑی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل، بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں شمار سے باہر تھیں۔ لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے شرفائے دہلی کے نوجوان، رشتہ دار، اطبائے ملک کے گانے بجانے اور ناچنے والے مرد و زن سب بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے اور ہر چھوٹے بڑے کی جیبیں سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیں۔ مفلسی اور فلاکت کا کسی کو وہم بھی نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق پر خاص طور پر متوجہ تھے[31]۔"

یہ حالات ۱۷۶۹ء کی زندگی پر مشتمل ہیں جبکہ انگریزی اثرات بھی گہرے ہوتے جا رہے تھے اور شجاع الدولہ اپنا وقار بحال کرنے کے لیے بھی کوشاں تھے لیکن پھر بھی عوام کی پُرمسرت زندگی اور شہر کی رونق پر اثر نہ پڑنے پایا بلکہ "ناچنے اور گانے والے طائفوں" کے ساتھ ہی فوجوں کے ڈھول باجے اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں" اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت کے ماحول میں بھی سلطنت کی طرف سے غافل نہ رہتے تھے۔ اسی شان و شوکت کا احساس تھا جس کے تحت نئی نئی عمارتیں بنوائی گئیں، خوبصورت باغات کی تشکیل ہوئی، نہروں اور ریلوں کی بنیادیں پڑیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علوم و فنون کے

ایسے مراکز قائم ہو گئے جس کی مثالیں دوسری جگہ مشکل سے ملیں گی۔ اہل حرفہ اور ماہرینِ فن ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر جمع ہو گئے عالموں کی قدر و منزلت نے علوم کو مقبولیت بخشی اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد امنڈ پڑی کہ یہیں سے نئی روایت اور نئے مرکز کی بنیاد پڑ گئی۔ خود شجاع الدولہ اتنا باذوق تھا کہ بعض ماہرینِ شعر و فن کو اپنی طرف سے اعزاز و اکرام کے ساتھ اصرار کر کے بلاتا اور یہاں آکر ان فنکاروں کو شاہی قربت بھی حاصل رہتی اور عوام کی مقبولیت و شہرت بھی۔

آصف الدولہ

شجاع الدولہ کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ کے معاملات میں اتنی حاوی ہو چکی تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر جائز و قانونی وارث بھی نیا حکمراں نہیں بن سکتا تھا چنانچہ شجاع الدولہ کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں یہ مسئلہ طے کر ڈالنا مناسب سمجھا اور بہو بیگم کی مرضی کے مطابق ایک خط کے ذریعہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کے بعد آصف الدولہ کو اودھ کا نواب مقرر کیا جائے جو کمپنی سے پوری طرح وفاداری اور تعاون کرتے رہیں گے۔ اس خط کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا لیکن اس کی بنیاد پر حالات کا جائزہ لیکر ۴ مارچ ۱۷۷۵ء کو آصف الدولہ کو "نواب" کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ آصف الدولہ کے والدین نے کمپنی سے ان کی خیر خواہی کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن شاید ان کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس حکومت کے تاج میں اذیت ناک کانٹے بھرے ہوں گے جن سے کسی لمحہ سکون نہ مل سکے گا۔

آصف الدولہ کو حکومت تو مل گئی لیکن مختلف معاہدوں اور کمپنی اور اودھ میں (— "Universal peace , firm friendship & perfect union" -) کے نام پر معاشی، علاقائی اور فوجی پابندیوں کا حصار تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ ۲۱ مئی ۱۷۷۵ء کو یہ کہہ کر نئے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی کہ شجاع الدولہ کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ ان کے ساتھ ختم ہو گئے۔ چنانچہ اس TREATY سے اس دور کی ابتدا ہو گئی کہ اقتصادی اور معاشی طور پر اودھ کا خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور نواب محض محکوم بن کر رہ گیا۔ سب سے پہلا دھکا یہ لگا کہ بنارس اور اس کے قرب و جوار میں غازی پور اور جون پور کے اضلاع (جو علاقہ راجہ چیت سنگھ کے تعلقہ میں تھا) کمپنی نے اودھ سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیے اور دوسری شرط یہ ماننی پڑی کہ شجاع الدولہ تک اودھ کی طرف سے کمپنی کو فوجی اخراجات کے لیے فی بریگیڈ ۲ لاکھ ۱ ہزار ماہانہ دینا پڑتا تھا اب اس میں پچاس ہزار کا اضافہ کر کے دو لاکھ ساٹھ ہزار کر دیے گئے۔ اور تیسری چیز یہ تھی کہ ایک Temp. Brigade بھی قائم کر دیا گیا اور اس کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی اودھ ہی کے خزانہ پر پڑا۔ محض اتنا ہی نہیں اودھ کے فوج کے افسران کی حیثیت سے بھی انگریزوں ہی کا تقرر کرنا پڑا، Resident اور اس کے عملہ کے مصارف بھی اسی کے ذمہ تھے اور ان سب باتوں کے باوجود اس پر اصرار تھا کہ انتظام حکومت اور رعایا کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ آصف الدولہ کو سوائے کمپنی کی ہر ہدایت کے ماننے کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کیونکہ بار بار اس خطرہ کا احساس دلا دیا جاتا تھا کہ اگر ان کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہیں ہیں تو سعادت علی خاں (ان کے بھائی) کو حکومت سونپ دی جائے گی جس کے لیے وہ تیار نہ تھے لیکن پھر بھی جب حالات نے یہ شکل اختیار کر لی کہ:

"The pay of the Nawab's Servants and the allowances of members of his family were heavily in arrears. The ladies of the harem were in absolute want of food." [۳۲]

تو بار بار انھوں نے وارن ہیسٹنگز کو اپنی بے بسی کی طرف متوجہ کیا۔ ہیسٹنگز نے خود ان چیزوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"The number, influence and enormous amount of the Salaries, pensions & emoluments of the co.s Service, civil & military, in the Vazir's serviceshave become an intolerable burden upon the revenue and authority of His Excellency and exposes to the envy and resentment of the whole country." [۳۳]

معاشی ہیجان و انتشار کا یہ سلسلہ محض دربار اودھ یا آصف الدولہ تک محدود نہیں رہا بلکہ جب اودھ کا خزانہ خالی ہو گیا تو ہیسٹنگز کی حرص و ہوس کی نظر بہو بیگم کی جاگیر اور ان کے خزانے کی طرف گئی اور آصف الدولہ کے وزیر مختار الدولہ (مرتضیٰ علی خاں) کی سازش سے بیگم [illegible]

پر طرح طرح کے مظالم ڈھا کر ساری دولت لوٹ لی گئی۔ آصف الدولہ کے دار السلطنت کی تبدیلی کے بعد بھی یہ فیض آباد ہی میں مقیم رہیں اور ان کی جاگیر اتنی سیر حاصل اور خزانہ اتنا معمور تھا کہ اس سے ہزاروں شریف اور آبرودار آدمی حرمت اور امارت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔[۲۳] تاریخ فرح بخش کا مصنف فیض بخش لکھتا ہے کہ یوں تو صاحبزادے (آصف الدولہ) آئے دن ماں سے مطالبہ کر کے کئی کئی لاکھ روپے اڑا لے جاتے تھے۔ لیکن پانچویں بار جو لوٹ ہوئی اس میں مختار الدولہ اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر جان برسٹو بھی شریک تھے۔ اس بار چوبیس لاکھ روپے نقد اور چھتیس لاکھ روپے کا سامان وصول کیا گیا جس میں زر و جواہر کے علاوہ ستر ہاتھی، آٹھ سو بیل گاڑیاں، ستر ہزار کا ایک ہیچوان، سترہ ہزار کی طلائی زین، جواہرات جڑے ہوئے چالیس سرپوش اور اطلس، زربفت، کمخواب اور کاشانی مخملوں کے بیشمار تھان بھی شامل تھے۔ اس کے بعد چھٹی اور آخری لوٹ ۱۷۸۲ء میں اس وقت ہوئی جب حیدر بیگ خاں نائب سلطنت اور مڈلٹن ریذیڈنٹ بہادر تھے۔ یہ لوٹ گورنر جنرل کے اشارے پر ہوئی اس میں بہو بیگم کے دو خواجہ سراؤں یعنی جواہر علی خاں اور بہادر علی خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ کے مقام پر چھاؤنی میں رکھا گیا جہاں ان پر سخت مظالم کیے گئے اور اس طرح پچپن لاکھ روپیہ کا سامان حاصل کر لیا گیا۔[۲۴]

یہ ساری لرزہ خیز داستان اس چیز کی بہت بڑی مثال ہے کہ آصف الدولہ کے معمولی افسر سے لے کر نائب سلطنت تک کبھی کسی نہ کسی شکل میں اپنے مفادات کے پیش نظر کمپنی اور اس کے حاکموں کے خیر خواہ بن چکے تھے، اول تو مختلف عہدوں پر انھیں افراد کا تقرر ہوتا تھا جو انگریزوں سے اعتماد حاصل کر سکے، نواب کے خلاف سازشوں میں شریک ہوتے رہیں دوسرے ہر اس افسر کو اس کے عہدوں سے ہٹا دینا عام دستور بن گیا تھا جس کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہو کہ نواب کے قریب اور ان کا وفادار ہے، کبھی نائب سلطنت مختار الدولہ کو کمانڈر نیف بسنت خاں کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا، کبھی جھاؤ لال ایسے ماہر، ہمدرد اور بے لوث دیوان کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا اور اسی سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی جب حیدر بیگ خاں کے انتقال کے بعد آصف الدولہ کی خواہش کے خلاف نواب تفضل حسین خاں کو نائب سلطنت بنا دیا گیا۔ آصف الدولہ اس عہدہ پر الماس علی خاں کا تقرر چاہتے تھے جن کی صلاحیتوں کا اعتراف (Sleeman) ایسے انگریز افسر نے بھی کیا ہے جس نے اودھ کے حکمراں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے ہیں، وہ لکھتا ہے:-

"Miyan Almas was the greatest and best man of any note that Oudh has produced. He held for about 40 years, districts yielding to the Oudh Govt. an annual revenue of about 80 lakhs of rupees. During all this time he kept the people secure in life & property and as happy as people in such a state of society can be; and the whole country under his charge was, during his life time a garden." [۲۵]

لیکن ایسے با صلاحیت شخص کے مقابلہ میں نواب تفضل حسین خاں کو ترجیح دی گئی جو ایک دانشور اور عالم تو ضرور تھے لیکن انتظامی معاملات میں امتیاز حاصل نہ تھا، آصف الدولہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ سعادت علی خاں کے استاد بھی اور گورنر جنرل اور کمپنی کے خیر خواہ بھی۔ چنانچہ اب ان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ حکومت کے کسی شعبہ پر ان کا اختیار و عمل قائم نہیں رہ سکتا اور آخر میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ حالات کی بے بسی و مجبوری سے بیمار رہنے لگے، دوا علاج پر بھی توجہ نہ دی اور مایوسی کی یہ شدت ہو چکی تھی کہ یہ کہا کرتے تھے کہ "جو دل غم و آلام سے ٹوٹ چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے" اور انھیں حالات میں ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کر گئے۔

تفضل حسین خاں کی طرف سے آصف الدولہ کے شکوک غلط نہیں تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد وزیر علی خاں کی تخت نشینی پر انھوں نے جو رول ادا کیا اسے کسی شکل میں سراہا نہیں جا سکتا۔ یہاں مورخوں کے ان متضاد نظریات سے بحث نہیں ہے کہ ان کی جانشینی کا اعلان غلط تھا یا صحیح لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت کی رعایا کی نظر میں ان کی معزولی ایک منظم منصوبہ کے تحت عمل میں آئی تھی جس میں بہت سی اعلیٰ شخصیتوں کا ہاتھ بھی تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ شعر زبان زد عوام تھا کہ ؎

سات حرفوں نے کیا خانہ خراب   تین ت اور دو الف یک ح و ب

(یعنی نواب تفضل حسین خاں، نواب تحسین علی خاں، مہاراجہ ٹکیت رائے، اشرف علی خاں، نواب حسن رضا خاں اور بہو بیگم) ان سب نے ایک محضر پر دستخط کر کے گورنر جنرل کو ان کی معزولی کی ترغیب دی تھی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "عوام میں بڑا تلاطم مچ گیا، تمام لوگ تفضل حسین خاں، سرفراز الدولہ، ٹکیت رائے اور الماس علی خاں کو غلیظ گالیاں دے رہے تھے"[37] اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بدنامی تفضل حسین خاں ہی کو اٹھانی پڑی جو بہر حال انگریزی اثرات کے بہت بڑے نمائندے بھی تھے اور جنھیں (اپنے پرانے شاگرد) سعادت علی خاں سے زیادہ ہمدردی کی امید تھی۔[38] حقیقت یہ ہے کہ اگر آصف الدولہ تفضل حسین خاں کی تقرری رکوا سکتے تو بعد میں وزیر علی خاں کے خلاف سازشوں کا یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا اور نوجوانی کے جوش و ولولہ کے ساتھ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ کی لہر پیدا ہوئی اس کے پیش نظر اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ اودھ کی تاریخ کسی اور شکل میں ہوتی۔

آصف الدولہ کی زندگی اور ان کے بعد رونما ہونے والے ان واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں درباری اور بیرونی سازشوں کے اس جال میں حکومت کا انتظام کتنا دشوار مرحلہ تھا لیکن حقائق شاہد ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور سلطنت کی ترقی و شوکت و عظمت کے لیے ان کے دور حکومت میں جو کام ہوئے وہ بعد میں بہت کم انجام پا سکے۔ فیض آباد سے دار السلطنت تبدیل کر کے لکھنؤ میں بارونق محلوں، شاندار عمارتوں اور خوبصورت باغوں کی تعمیر کر کے زندگی بخش دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے پیچھے بھی محض اظہار شان و شوکت کا جذبہ پوشیدہ نہ تھا بلکہ اس سے ہزاروں مفلس و غریب عوام کو روزگار بھی میسر ہو جاتا تھا، کاریگروں اور صناعوں کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی اور ہزاروں افراد کی رہائش و قیام گاہ کا انتظام بھی ہو جاتا تھا چنانچہ امام باڑہ، اس کا رومی گیٹ، بیبیا پور کوٹھی، چنہٹ کوٹھی، ریزیڈنسی اور لکھنؤ کی بہت سی اہم عمارات اسی دور کی صناعی اور عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبوں کے فنکاروں کی قدر و منزلت بھی کی گئی، مصوری، موسیقی، نجوم، طب، غرضیکہ ہر فن کے ماہرین لکھنؤ میں جمع ہو گئے اور خاص کر شعری و ادبی زندگی کا جو دور یہاں سے پھیلا اس کی گونج آج تک اپنی روایات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ مختلف علوم کی ترقی پر ایسی توجہ دی جاتی تھی کہ علما کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ کتبخانہ میں نادر کتابوں کی فراہمی بھی ضروری جز تھا اور اسی سلسلہ میں سید عبد اللطیف شوستری لکھتے ہیں کہ:-

"ان کے کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سو کتاب پر ایک گماشتہ مقرر تھا، مختلف فنون و اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوشنما قطعات جو اولین و آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے"[39]

آصف الدولہ کے حسن انتظام اور ترقی سلطنت کے جذبہ کا ایک پہلو یہ بھی قابل قدر ہے کہ اودھ کے گذشتہ حکمرانوں کی طرح انھوں نے بھی کسی معاملہ میں مذہبی امتیاز نہیں برتا بلکہ مساویانہ سلوک کرتے رہے۔ اگر ان کے یہاں اعلیٰ عہدوں پر مسلمان تھے تو ہندوؤں کو بھی پورا اعزاز ملتا تھا بلکہ بعض عہدوں پر تو ان کو مسلمان افسروں سے زیادہ ہندو افسران پر اعتماد تھا۔ اسی طرح اگر وہ محرم اور عید کے سلسلہ میں لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے تو ہولی میں بھی حکومت کی طرف سے ۵ لاکھ خرچ کیے جاتے تھے اور وہ خود جشن میں شریک ہو کر عوام کی خوشیوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ چاہے خزانہ خالی رہا ہو لیکن انھوں نے عوام میں مایوسی اور بددلی نہ پھیلنے دی اور اپنے کو عوام میں اتنا مقبول بنا لیا کہ یہ محاورہ مشہور ہو گیا کہ ؏

جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ

ان کی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کی داستانیں آج بھی یاد کی جاتی ہیں اور کسی طرح عوام کے یہ بات قرین قیاس نہیں آسکتی کہ ایسا بخشنے

اور عظیم دربار اقتصادی کساد بازاری کا شکار رہا ہو۔ اسی منزل سے دربار میں ایرانی علماء و دانشوروں کا اثر و اقتدار بھی بڑھنے لگا اور مقامی تہذیب میں ایرانی کلچر کے اثرات، اس کی لطافت و شائستگی کے امتزاج سے تہذیبی زندگی کا نیا مزاج ابھر کر باقاعدہ سامنے آگیا۔

سعادت علی خاں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وزیر علی خاں جو آصف الدولہ کے بعد "نواب" کی مسند حاصل کر چکے تھے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن سکتے تھے اور یہی احساس تھا جس کے تحت ان کو ہٹانے کے لیے طرح طرح کے دلائل تلاش کیے گئے اور سعادت علی خاں سے کمپنی کی اطاعت اور اس کے احکام کی پابندی کا وعدہ لے کر ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو ان کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ سعادت علی خاں کے لیے یہ حکومت نعمت غیر مترقبہ کے طور پر ملی تھی اس لیے انھوں نے حکومت سنبھالنے سے پہلے ہی انگریزوں کی طرف سے پیش کی گئی TREATY کو بخوشی منظور کر لیا جس کی رُو سے کمپنی کو ملنے والی ۵۶ لاکھ کی رقم میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ کر کے ۷۶ لاکھ سالانہ دینے پر راضی ہو گئے، ان کی جانشینی کے لیے کمپنی کے حکام کو جو کارنامے انجام دینے پڑے تھے اس کے اخراجات کے سلسلہ میں ۱۲ لاکھ کی رقم ادا کی اور الہ آباد اور فتح گڑھ کے قلعوں کو کمپنی کے حوالے کر کے ان کی مرمت کے لیے بالترتیب ۸ اور ۳ لاکھ دینا منظور کر لیے۔ دراصل سعادت علی خاں کو جو اعلانیہ مل رہا تھا اس کے پیش نظر وہ اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کسی قسم کی رد و قدح کر سکتے۔ محض اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اودھ کی فوج (جو آصف الدولہ تک تقریباً ۸۰ ہزار تھی) کم کر دی جائے اور اس کی جگہ کمپنی کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس طرح حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے تین ہی سال میں ان کے اختیارات کم تر ہوتے گئے، کمپنی کی بندشیں زیادہ سے زیادہ مانع ہوتی گئیں، حکومت کی آمدنی کے ذرائع محدود ہو کر رہ گئے۔ اور نوبت یہاں تک آگئی کہ عاجز آکر سعادت علی خاں نے حکومت سے کنارہ کشی کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا" اور گورنر جنرل سے کمپنی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی معذوری بھی ظاہر کی لیکن ان مسائل پر توجہ دینے کے بجائے گورنر جنرل نے ۲۸ اپریل ۱۸۰۱ء کو لکھنؤ کے Resident کو یہ لکھ بھیجا کہ اودھ کی سلطنت کا آدھا علاقہ سعادت علی خاں سے لے کر کمپنی اپنے زیر انتظام کر لے اور "اگر وزیر اس کے لیے بخوشی راضی نہ ہوں تو ان علاقوں پر جبری قبضہ حاصل کر لیا جائے" سعادت علی خاں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر یہی حالات رہے تو بہت وقت نہیں لگے گا کہ اودھ کا بقیہ علاقہ بھی کمپنی کے اختیار میں چلا جائے گا لیکن ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا چنانچہ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کے ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ اودھ کے آدھے علاقے سے دستبردار ہو گئے۔ اس معاہدے کی رُو سے جو اضلاع کمپنی کو ملے ان میں روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور شامل تھے اور جس سے اودھ کے خزانہ کو ۳ کروڑ سالانہ کی آمدنی تھی۔ اس واقعہ کو ایک شاعر نے قطعۂ تاریخ کی شکل میں یوں نظم کیا کہ

خود بخود ایں دور دورنگی گرفت
ملک ز نواب — فرنگی گرفت (۱۲۱۶ھ)

چنانچہ اس تقسیم سے نواب اور رعایا کے دلوں پر جو اثرات ہوئے ہوں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نصف علاقہ پر قناعت کر کے سعادت علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام اور غیر معمولی صلاحیتوں سے اودھ میں ایسی خوشحالی اور شان و شوکت بھر دی کہ عوام اس کی کمی محسوس نہ کر سکے۔

اس تقسیم نے اگر سیاسی طور سے اودھ کو تبدیل کر دیا تھا تو سعادت علی خاں کی ذاتی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کر دیا اور وہی شخص جو سیر و شکار، شاہد و شراب اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا ایسا ذمہ دار حکمراں بن گیا کہ اس معاہدہ کے بعد اپنے آخری لمحات تک بڑی سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنے کے باوجود کسی طرح کی غفلت نہ برتی۔ یہاں تک کہ معاشی لحاظ سے بھی سلطنت کو تنگی و مفلسی کا احساس نہ ہونے دیا، اور مال گذاری کا ایسا بندوبست کیا کہ حکومت کی آمدنی بھی بڑھتی رہے اور رعایا کو پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ ایک انگریز مؤرخ بھی ان کے حُسنِ انتظام کا اعتراف کرتے

ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"The result of his administration was that the people became contented and prosperous,...... At his death S. Ali left behind him the name of the friend of the ryot, and a full treasury." [43]

اور انھیں تمام خصوصیات کی بنیاد پر H.C. IRWIN نے ان کو اس سلطنت کے تمام حکمرانوں میں "سب سے زیادہ عظیم، سب سے زیادہ ہوشمند اور مضبوط ترین منتظم" [44] قرار دیتے ہوئے اس چیز پر اظہارِ افسوس کیا ہے:

"He (Lord Wellesley, Governor General) had before him perhaps the ablest and most enlightened native ruler then living, and failed to recognise him." [45]

ان کی صلاحیتوں کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور سے فنکاروں، صنّاعوں اور شعراء کی قدر و منزلت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا انھوں نے اسے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ کر کے درباری فضا کو زیادہ بارونق اور پُرشکوہ بنا دیا اور عوام میں بھی شعری و فنّی ذوق تیزی سے پھیل گیا۔ انشا کا یہ جملہ سعادت علی خاں اور ان کی رعایا دونوں کے رجحان کا پتہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:-

"پیرومرشد کے عہد میں نثر اور نفیس فیشن کی تعمیر دل، الفاظ کی تحقیق، فصاحت کی جانچ، بلاغت کا لحاظ، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، تقریر کی شستگی اور نئی چیزوں کی ایجاد کے چرچے بہت زیادہ ہیں اور قابل اور فصیح بلیغ شخصوں کے علاوہ کسی کی صحبت حضورِ والا کو پسند نہیں، ہر بات اور لطیفہ کے مغز کو پہنچتے ہیں" [46]

اس دور کی زباں دانی، شعراء کے گروہ اور ان کے معرکے اور عوام کے فنّی ذوق کی بلندیوں کے تذکرے آبِ حیات اور دوسری ادبی تاریخوں سے آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں محض ان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، اسی طرح دوسرے فنون کے ماہرین بھی عوام میں مقبولیت حاصل کیے ہوئے تھے اور فنِ تعمیر کو بھی ایسی بلندی ملی تھی کہ دلآرام، دلکشا، حیات بخش، موتی باغ، نور بخش، خاص بازار کی کوٹھیاں اور حضرت عباس کی درگاہ آج بھی اس کا موجودہ ثبوت ہیں۔ بازاروں کی چہل پہل، جشن اور تقاریب کی رونق اور مذہبی رسوم ہر چیز سے شاہی عظمت کا احساس ہوتا تھا اور یہ ایسے حکمراں کے دور کی کیفیت ہے جو سیاسی اور انتظامی طور پر نہ معلوم کتنی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انھوں نے عوام کو خوشحالی بھی بخشی، سلطنت کو مضبوط و شاداب بھی بنایا، شاہی عظمت کو برقرار بھی رکھا اور اس طرح ایک کامیاب اور ہر دلعزیز حکمراں کی زندگی گزار کر ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو انتقال کر گئے۔

غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر نے مسندِ حکومت سنبھالی اور ان کو اس شرط کے ساتھ حکمراں بنایا گیا کہ وہ سابق معاہدوں کی پابندی کرتے رہیں گے اور ایک ایسے خود مختار (Independent — prince —) حکمراں ہوں گے جن کے لیے حکومتِ برطانیہ کی اطاعت لازمی ہوگی (must be Subservient to the British Govt.)۔ کمپنی کی جانب سے نواب کی اس تجویز کو بھی قبول کر لیا گیا تھا کہ ان کے علاقہ میں آئندہ کسی قسم کی کمی نہ کی جائے گی البتہ کبھی انتظامِ سلطنت کو بہتر بنانے کے لیے، کبھی نیپال و برما کی جنگ کے موقع پر اور کبھی دوسرے مواقع تلاش کر کے ادھر سے کروڑوں روپیہ اعانت یا قرض کے طور پر لیے جاتے رہے اور غازی الدین حیدر کو بخوشی دینا پڑتا یہاں تک کہ اسی عرصہ میں بہو بیگم کے انتقال کے بعد ان کی مال و دولت اور ان کا سارا خزانہ جس کے جائز وارث غازی الدین حیدر ہی تھے اس کو بھی کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ان تمام عطیات کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ گورنر جنرل اور کمپنی کے دوسرے اعلیٰ حکام سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے اور اسی اظہارِ تعاون کا اثر یہ ہوا کہ ان کو ۱۸۱۹ء سے "بادشاہ" کا مرتبہ دے دیا گیا۔ اس اعلان سے جہاں عوام کی نظر میں غازی الدین حیدر کا مرتبہ بڑھ گیا وہاں بادشاہ کو اپنی شاہی عظمت کا احساس بھی ہو گیا اور بہت سے ایسے طریقے اختیار کیے گئے کہ دربار میں شہرت بھی بڑھے اور دہلی کی بادشاہت

کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ زراعتی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ تھی، صنعت و حرفت کو ترقی حاصل ہو چکی تھی، مختلف فنونِ لطیفہ کی ہمت افزائی کی جا رہی تھی اور سب سے بڑھ کر شعر و ادب نے اسی منزل سے غیر معمولی ترقی کی۔ بادشاہ کو مشرقی فلسفہ اور علم لسانیات کے مطالعہ سے خود بھی گہری دلچسپی تھی، شعراء کے کلام پر گہری نظر تھی، بڑے بڑے اساتذہ کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا اور یہی دور تھا جب پریس قائم کر کے مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں چھاپنے کی ابتدا ہوئی۔ یہاں ان چیزوں کا تفصیلی ذکر کرنا مقصود نہیں ہے کہ نثر و نظم کے ارتقا میں دورِ غازی الدین میں کیا اہم کام انجام دیے گئے، البتہ اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان کا دور انتشار و بےچینی سے بہت حد تک پاک رہا اور شاہی سرپرستی کے تحت عوام میں مختلف فنون اور علمی و ادبی شعبوں سے دلچسپی کا رجحان شدت سے بڑھتا رہا۔ غازی الدین حیدر کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا اور اودھ کے تہذیبی عناصر ان کے دورِ حکومت میں زیادہ واضح طور پر ابھر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر

نصیر الدین حیدر کے دور سے ہی یہ خبریں گشت کرنے لگیں تھیں کہ ان کے ہاتھ سے حکومت لے کر کسی دوسرے فرد کو سونپی جائے گی، ان کی عیاشی، بدانتظامی اور انتشار و ہیجان کی کیفیت تیزی سے پھیلائی جا رہی تھی۔ اس وقت کے Resident کرنل (Low) نے پرزور سفارش کی تھی کہ ان کو ہٹا دیا جائے۔ خود اپنے وزیر معتمد الدولہ آغا میر پر بادشاہ کو اعتماد نہ تھا، ان کو شہر بدر کر کے کبھی مہدی علی خاں کو وزیر بنایا گیا کبھی روشن الدولہ کو لیکن کمپنی کے حکام کو کسی طرح اطمینان نہ ہوا، وہ انگریزی تہذیب، ان کے لباس، وضع قطع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، درباری زندگی پر بھی انگریزوں کا گہرا اثر تھا اور یہ اثرات یہاں تک بڑھے کہ وہی لوگ بادشاہ کے حرم میں پوری طرح دخیل ہو گئے اور ان کو موقع مل گیا کہ درباری سازشوں میں شریک ہو کر بادشاہ کو بدنام کر سکیں۔ خود بادشاہ کو اپنی بیگمات اور اپنے امراء پر کسی طرح کا اعتماد نہ تھا۔

ہر طرف سے خطرات گھیرے ہوئے تھے لیکن ان حالات میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کام نہ کیے گئے ہوں۔ ان کے دور کی تہذیبی زندگی کا نقشہ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عبرت میں تفصیل سے مل جاتا ہے اور اگرچہ انگریز مورخ نے (Private Life of an Estern King) میں ان کی عیاشیوں اور نفسیاتی کجروی کی مبالغہ آمیز داستانیں بیان کی ہیں تو فسانۂ عبرت سے درباری شان و شوکت اور علمی و تہذیبی بلندی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے غریبوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد پر ہمیشہ توجہ کی اور ایک بڑی رقم اس کام کے لیے جمع کر دی کہ اس سے ان لوگوں کو روزی ملتی رہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے حکومت کی طرف سے لکھنؤ کے علمی مراکز میں حصولِ علم کے لیے وظیفہ بھی مقرر کیا، غریب و نادار مریضوں کے لیے شفا خانے کھلوائے اور سب سے بڑھ کر بردہ فروشی کی اس رسم پر بھی پابندی عائد کی جو اس زمانے میں رائج تھی۔ رعایا کے تحفظ کے طور پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے مظالم کو روکا اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں علم و ادب اور شعر و فن کو کافی وسعت بخشی۔ ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کے انتقال کے بعد درباری ریشہ دوانیوں اور ریزیڈنٹ کی سازشوں سے جو قتل و غارت گری ہوئی اس کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ رعایا اور عوام میں ان کی موت سے جو مایوسی اور صدمہ ظاہر ہوا وہ ان کی مقبولیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

محمد علی شاہ

محمد علی شاہ بڑے ہنگامہ خیز حالات میں تختِ سلطنت پر بیٹھے تھے، نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کی والدہ "بادشاہ بیگم" نے منا جان (مرحوم بادشاہ کے بیٹے اور وارث) کو تخت و تاج کا مالک قرار دے کر ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، کمپنی اس کے لیے تیار نہ تھی اور اس کشمکش نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ پہلی بار اودھ اور کمپنی کی فوجوں میں مقابلہ ہوا اور بادشاہ بیگم اور منا جان کی گرفتاری کے بعد محمد علی شاہ (سعادت علی

خاں کے بیٹے (نصیر الدین حیدر کے چچا) کو حکومت سونپنے کا فیصلہ کیا گیا ـــــ البتہ ان سے ریزیڈنٹ نے اس اقرار نامہ پر دستخط لے لیے تھے کہ "بادشاہت ملنے کے بعد گورنر جنرل کی طرف سے جو نیا معاہدہ بھی پیش کیا جائے گا اسے بخوشی منظور کر لیں گے"۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں بعض مورخین کا یہ خیال صحیح ہو کہ "ان کو خود بھی یہ احساس تھا کہ اس شرط کے ذریعہ یہ سلطنت ان کے خاندان والوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی[4]" لیکن موجودہ حالات میں وہ اس سلطنت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے انتظامی اور فوجی و معاشی امور کے نظام میں بادشاہ کے اختیارات برائے نام ہی رہ گئے تھے، پھر بھی امرا، رؤسا اور عوام کی معاشرتی اور تہذیبی روایات میں کسی طرح کا انحطاط پیدا نہ ہونے پایا۔ انھوں نے بہت سی بدعنوانیوں کو دور کر کے بہتر طرزِ حکومت پر توجہ دی، زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا، پولیس، قانون اور مال کے محکموں کے نظام میں سدھار ہوا، اور تجارت وصنعت وحرفت میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ان کے دورِ حکومت میں رعایا کی بہبود کے لیے بڑے بڑے کام کیے گئے۔ نہریں جاری کی گئیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے گئے، مسافروں کے لیے سرائیں بنوائی گئیں اور امام باڑہ حسین آباد، حسین آباد کا تالاب، جامع مسجد اور بہت سی دوسری عمارتیں بادشاہ[5] کے ذوقِ تعمیر کا احساس دلاتی ہیں۔ شعر و ادب کی روایات اپنی امتیازی خصوصیات کے تحت بڑھتی رہیں اور ہر شعبۂ فن ترقی کرتا رہا۔ انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب بوستانِ اودھ لکھتے ہیں کہ :-

"ہر امرے کہ ازیں بادشاہ بہ ظہور رسید صد ہزار تحسین است۔ در عہدِ دولتش ہمہ مردم فارغ البال و آسودہ حال بودند۔ ہیچ کس آزارے بر دل نداشت ابواب معدلت بر روئے خلائق باز و دست تظلم و تعدی کوتاہ بود۔ باوجود ضعفِ پیری از کارہائے سلطنت خود را معذور نمی داشتند و برامور کلی و جزوی می رسیدند[6]"

محمد علی شاہ نے محض پانچ سال حکومت کر کے، مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا لیکن اس مختصر دور میں بھی انتظام سلطنت کو جو استحکام بخشا اس سے ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کو امن و سکون اور خوشحالی حاصل رہی یہاں تک کہ انگریزوں کو بھی کسی قسم کی بدنظمی کی شکایت کا موقع نہ مل سکا۔

امجد علی شاہ

امجد علی شاہ اپنی ہمدردی و شرافت کے لیے بھی مشہور تھے اور سخاوت و فیاضی کے لیے بھی۔ رعایا کی عام خوشحالی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے گومتی پر لوہے کا پل تعمیر کرا کے اور لکھنؤ سے کانپور تک پختہ سڑک بنوا کر ذرائع آمد و رفت کی بڑی دشواری دور کرا دی۔ صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ان کے دور میں علوم مشرقیہ کے ارتقار پر خاص توجہ کی گئی۔ فلسفہ، منطق اور مذہبی و دینی علوم کا معیار بلند کرنے کے لیے مدرسۂ سلطانی کا قیام عمل میں آیا اور نامور علمار و ماہرین کو اعزاز و اکرام کے علاوہ وظائف دے کر طلبار کی ہمت افزائی کی گئی، امجد علی شاہ خود مہذب شائستہ قسم کے انسان تھے اور انھوں نے اودھ کی وضعداری اور تہذیبی امتیاز کو آگے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے دور تک اردو نثر و نظم کا بڑا سرمایہ سامنے آچکا تھا اور شعرا و ادبا سکون و اطمنان سے فنی اقدار کے ارتقار پر متوجہ تھے۔

واجد علی شاہ

امجد علی شاہ کے دور تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی فوجی اور سیاسی حیثیت سے اودھ کے معاملات میں اتنا حاوی ہو چکی تھی کہ اب وہ محض یہ موقع تلاش کر رہی تھی کہ اس حکومت کو کس طرح قبضہ میں کر لیا جائے۔ ابھی تک پنجاب اور افغانستان سے تصادم کی وجہ سے وہ ادھر متوجہ نہ ہو سکی تھی لیکن واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد ان کے خلاف بدنظمی، ہیجان، انتشار اور ان کی نااہلی اور عیاشی کے ایسے ایسے الزامات تراش لیے گئے جس کا علاج ان کی معزولی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان کی تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد لارڈ ہارڈنگ نے نومبر ۱۸۴۷ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر سلطنت کے حالات میں سدھار نہ ہوا تو کمپنی اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں لے لے

گی۔ دراصل یہ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی تھی لیکن ۱۸۴۹ء میں جب کرنل سلیمن کو رزیڈنٹ بنا کر لکھنؤ بھیجا گیا تو اس کو دراصل اسی مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ بظاہر اس نے تین مہینے تک (یکم دسمبر ۱۸۴۹ء سے ۲۸ فروری ۱۸۵۰ء تک) پوری ریاست کا دورہ کرنے کے بعد رعایا کی تباہ حالی، حکام کی سرکشی، لاقانونیت اور قتل و لوٹ مار کی کیفیات رپورٹ کی شکل میں مرتب کی تھیں لیکن (Samuel Lucas) کے الفاظ میں:۔

"...The character of his report was determined for him before he entered oude. He professed to examine but he was under orders to sentence; he pretended to try, but he was instructed simply to condemn." ۲۹

چنانچہ انھیں 'ہدایات' کا اثر تھا کہ بادشاہ کے اختیارات پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد ہوتی رہیں۔ 'فوجی'، 'اقتصادی'، 'درباری' یہاں تک کہ محل کے اندرونی معاملات میں بھی اس کے احکام کے خلاف دخل اندازی کر کے بے بس و مجبور کر دیا اور حالات نے ایسی سنگین شکل اختیار کر لی کہ معمولی افسران اور عاملوں سے لے کر وزرا کی تقرری تک رزیڈنٹ کی مرضی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ بحیثیت جن ملزمان کو بے قصور ٹھہراتے تھے ان کو سزا دی جاتی [illegible] جو واقعی میں فتنہ و فساد اور سرکشی کے مرتکب ہوتے ان کو رزیڈنٹ کی پشت پناہی حاصل ہوتی۔ اودھ کی ہر تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، یہاں اس کے تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں البتہ صاحب سیرالمتاخرین نے جس واقعہ کو پیش کیا ہے اس سے اس کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دربار لکھنؤ کا شاہی تخت، جسے غازی الدین حیدر نے کئی کروڑ روپیہ میں تیار کرایا تھا، واجد علی شاہ نے اسے کوٹھی 'فرح بخش' سے قیصر باغ میں منتقل کرنا چاہا لیکن رزیڈنٹ کی اجازت حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اتنا معمولی سا کام بھی بادشاہ سے ممکن نہ ہو سکا۔" ۳۰

ان چیزوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا اور عوام کی نظر میں بادشاہ کی حیثیت کم ہوتی رہے۔ وہ رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرتا رہے، اور انتشار و کساد بازاری پیدا کر کے ہر قسم کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار بادشاہ کو قرار دیا جا سکے۔ فیض احمد فیض کے یہ اشعار اس دور کی کیفیت پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں:

سچ ہے ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

حق ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے

ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی

ہاں ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

دراصل انگریزی حکام اس نظریہ پر پوری طرح عامل تھے کہ اگر دروغ بیانی کی اشاعت پوری شدت سے کی جائے تو کچھ عرصہ بعد لوگوں کو اس کی سچائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ واجد علی شاہ کی صلاحیتوں اور ان کے حسنِ انتظام سے متنفر کرنے کے لیے یہی طریقہ اپنایا گیا اور کمپنی کے (Directors) کی طرف سے جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس پر کرنل سلیمن پوری طرح عامل تھا اور اس کے بعد جب نومبر ۱۸۵۴ء میں (Gen. Outram) نے ریزیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا تو اس نے بھی اسی مقصد کی تکمیل ضروری سمجھی۔ چنانچہ واجد علی شاہ اور ان کے دربار میں ۹ سال سے مایوسی اور کشمکش کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو شدید طوفان کی شکل میں امنڈ پڑے جس دن کہ انھیں رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ ان کو معزول کر کے اودھ کا انتظام کمپنی نے اپنے اختیار میں کر لیا ہے۔

انصاف پسند محققین و مورخین نے واجد علی شاہ کی شخصیت اور ان کے انتظامِ سلطنت اور اس دور کے معاشرتی و سماجی حالات کے سلسلہ میں جو خیالات پیش کیے ہیں اس سے بہت سے حقائق پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔ تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی انھوں نے رعایا کی خوشحالی، درباری شان و شوکت اور مملکت کی ترقی کے لیے ہر شعبہ کی اصلاح پر توجہ کی۔ خاص کر فوج کی تنظیم و تربیت اور اس کے استحکام پر زیادہ زور دیا" بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے ان کو وردی اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا تھا...... اکثر بادشاہ بہ نفسِ نفیس میدانِ پریڈ میں جا کر ان کے قواعد اور نیزہ بازی اور شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی کی مشق

ملاحظہ فرماتے اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہو کر دھوپ میں کھڑے رہتے تھے اور کبھی کبھی خوش ہو کر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے۔[۵۱] رعایا سے ایسی ہمدردی و شفقت تھی کہ کسی پر ظلم و جبر برداشت نہیں کر سکتے تھے اور عدل و انصاف سے ذرا بھی انحراف نہیں پایا جاتا۔ اسی کے پیش نظر ان کی سواری کے ساتھ ایک ایسا صندوقچہ رکھا رہتا تھا کہ اگر کسی کو داد و فریاد کرنی ہے تو وہ اس صندوقچہ میں اپنی عرضی ڈال سکتا ہے' بادشاہ اِن درخواستوں کو بذاتِ خود پڑھ کر ان پر احکام صادر کرتے تھے۔" ہر گاؤں میں مسافروں کے لیے سرائے قائم کی گئی تھیں اور ان کے تحفظ کے لیے شاہی خرچ سے چوکیدار مقرر تھے' زراعتی پیداوار میں اضافہ کے لیے جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے گئے تھے' نہریں تعمیر ہوئی تھیں اور تجارت کی ترقی پر خاص طور سے دھیان دیا گیا تھا، انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا ایک ہمعصر مورخ و دانشور مسیح الدین لکھتا ہے کہ:۔

"Wajid Ali Shah is much beloved and respected by his subjects, for the highest to the lowest, from the rajah to the ryot, and this the more so, as he has ever discharged the duties of his high office with justice tempered by mercy."[۵۲]

اس کے ساتھ ان میں علم و فن کے لیے جو فطری رجحان تھا اس نے اودھ کی ادبی زندگی کو سنوارنے، سدھارنے اور اسے ترقی دینے میں خاص طور سے مدد کی۔ حکومت کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر و ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جو وسعت بخشی اس کی مثال کہیں اور بڑی مشکل سے ملے گی۔ اس دور میں موسیقی، رہس اور ڈراما کا فن بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے خود تقریباً پچاس کتابوں کی تصنیف کی، شعراء کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ شیخ تصدق حسین کے الفاظ میں "ان کے عہد میں اتنے شاعر لکھنؤ میں تھے جتنے سارے ہندوستان میں تھے..... شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضعداری بن گیا تھا، جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔" شاہی دربار میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے اس کے لیے خاص اہتمام کیے جاتے تھے، اس کی کیفیت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے اس طرح بیان کی ہے کہ:۔

"لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل و فوارہ کی ہوتی تھی، کمرے میں تمام سامانِ عیش تیار ہوتا تھا، درپچیاں سبز، سُرخ کاشانی مخمل کی مسندیں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی' چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے' جھاڑ' جھاب' کنول' فانوس' شام سے روشن ہو گئے..... مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی خاص امراء بادشاہ مدعو ہوتے تھے..... خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری پلکے گوٹے کے ہار' الائچیاں، چکنی ڈلیاں، عطر کے کنٹر رکھے ہوئے، مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے، اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔"[۵۳]

غرضیکہ شعر و ادب تہذیبی زندگی میں اس طرح چھا گیا تھا کہ لوگ ادب بولتے تھے، شاعری میں باتیں کرتے تھے اور ساری فضا میں شعر و ادب کا ذوق گونجتا رہتا تھا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا کہ ہر فرد مطمئن و خوشحال بھی تھا اور اس کا فنی و ادبی مذاق بھی نازک سے نازک اور باریک سے باریک پہلوؤں کی تلاش میں لگا رہتا تھا، صنعت عامہ، علم و ہنر اور فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں صفائی و نفاست پر توجہ دی جاتی تھی اور دستکاروں کو ایسی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کی بنائی ہوئی اشیاء ملک کے ہر گوشہ میں نعمت سمجھی جاتی تھیں۔ عیش و نشاط کے تقاضوں نے تکمیلِ ذوق کے لیے مختلف فنون میں نئے نئے گوشے بھی پیدا کرائے اور انھیں کی ضروریات کے تحت اعلیٰ اور نفیس سامان بھی تیار ہونے لگے اس طرح صنعت و حرفت کو بھی ترقی ہوئی اور تجارت و دولت میں بھی، انھیں چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واجد علی شاہ کا ہمعصر مؤرخ خواجہ محمد بشیر لکھتا ہے کہ

"باعتبار تعمیم بذل و احسان و تخصیص فراوانی زخارِ زرد گوہر نمایاں و تکلفات استعمال لباسہائے پاکیزہ و موزوں و تصرفات در ترکیبات اطعمۂ لذیذہ لطافت مشحون از ملکِ سبز و سا بیخواست و بہ اعتبار جلوہ آرائیہائے حسنِ خورشید طلعتاں نازک ادا و خوب رویانِ دلربا از مصرِ کنعان خراج میگرفت و باعتبار جمیعتِ اربابِ فضل و براعت و مجمع دانشمندان مستوعبِ مقدمات جلائل صناعت بر یونان تفوق می جیست" [۴]

واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب اودھ پوری طرح انگریزی عملداری میں آگیا اس کے بعد جہاں سیاسی زندگی میں انقلابات رونما ہونے لگے وہیں صناعی و فنکاری کی ان اعلیٰ قدروں پر بھی تباہی آگئی، اس کی دولت بھی مٹ گئی اور شان و شوکت بھی۔

ایک انگریز مورخ H. C. IRWIN جس نے واجد علی شاہ کی عیاشی و نااہلی اور انتظام حکومت کے انتشار و ہیجان کا مبالغہ آمیز نقشہ پیش کرتے ہوئے ان کی معزولی کو حق بہ جانب قرار دیا ہے وہ بھی ضبطی حکومت کے تقریباً بیس سال کے بعد بھی (۱۸۸۰ء میں) اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ:

"With the traders & artisans of Lucknow annexation could hardly be otherwise than unpopular, and the decay of these classes during the last 20 years, has been pitiful in the extreme. [۵]

اس طرح واجد علی شاہ کے دورِ حکومت نے بے پناہ دشواریوں اور سنگین پابندیوں کے باوجود اودھ کی اس تہذیبی اور ثقافتی میراث کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی، جس کی بنیاد ان کے آبا و اجداد نے تقریباً ایک سو پینتیس سال پہلے قائم کی تھی۔

یہ تہذیب جو ہند آریائی عناصر کی پروردہ تھی، اس میں ایرانی لطافت و شائستگی کے امتزاج سے ایک ایسی امتیازی حیثیت پیدا ہوگئی جو کسی دوسری جگہ نہ ہو سکی اور اس کے یہ نقوش آج بھی کسی نہ کسی طور پر برقرار ہیں البتہ اشپنگلر کا یہ خیال اس پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ "انسانی تہذیب ایک زندہ نظام ہے جو ہر جاندار کی طرح نشو و نما پا کر جوان ہوتی ہے اور پھر بوڑھی ہو کر مر جاتی ہے" چنانچہ اس کے عناصر بھی اب انحطاط و ضعف کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں جس کی توانائی مفقود ہو چکی ہے اور آخری سانسیں آ رہی ہیں۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جس طرح سارے ملک پر براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہو گئی اسی طرح اودھ کی جغرافیائی اور علاقائی حیثیت بھی ختم کر کے اسے ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اتر پردیش) کا نام دیا گیا۔ یہیں سے ہمارے ہندوستان کے ساتھ (پہلے کے) اودھ کی تہذیب و معاشرت اور یہاں کے عوام کے شعور و افکار نے نیا سفر شروع کیا اور مشرقی تصورات میں مغربی عناصر کی شمولیت ہونے لگی، سماجی اور اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہیں سے "نئے معاشی تعلقات" نئے ادبی رجحانات، طریقۂ تعلیم اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جلد ہی نئے تقاضوں کے تحت غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ علمی سطح پر سائنس اور مغربی فلسفہ کے مطالعہ نے وسعت پیدا کی اور نئے ادبی رجحانات سے متاثر ہو کر نئی روایتوں کی بنیاد پڑی۔ □□

حواشی:- [۱] بحوالہ (Oudh Gazatters Vol. I, PP2 —

cornegi —) شمولہ "اودھ کے پرکھ کوی" بی کے مصرا۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۶۰ء- [۲] (अवध के स्थान नामों का भाषावैज्ञानिक अध्यन – PP2 –

(Political - [۳] (-Lko. University Hindi Publication, 1973

DACOITE IN — [۴] Hist. of ANCIENT india – PP64)

(— EXCELSIS Pustak Kendra, Lko. 1971

[۵] (Oudh Gazatters PP. 458, Vol. I) [۶] آئین اکبری

جلد دوم، صفحہ ۱۳۵- [۷] A short Hist. of Muslim —)

(— rule in India (Dr. Ishwari Prashad) PP5

A short Hist. of Muslim Rule in India – PP 455

۹ Quoted in Dacoittee in Excelsis (Samuel Lucas) PP 3
۱۰ (– Firt Two Nawabs of Awadh – PP30 — S.L.
The First two Nawabs ۱۱ (– Agrwal & Co. Agra 1954
The First two Nawabs of –) ۱۲ (of Awadh – PP 30
مطبع احمدی PP 37 ۱۳ بوستان اودھ (– Awadh PP 30
First two Nawabs of Awadh – PP 31-32 ۱۴ (18-92
۱۵ بوستانِ اودھ (کنور درگا پرشاد) صفحہ ۳۷ - مطبع احمدی ۱۸۹۲ء
The garden of India PP 68 Pustak Kendra, –) ۱۶
The First two Nawabs of -) ۱۷ (– Lucknow 1973
۱۸ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور (– Awadh – PP 42
تہذیبی پس منظر صفحہ ۳۰ - ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء ۔ ۱۹ بوستان
اودھ از کنور درگا پرشاد مطبع احمدی ۱۸۹۲ء ....
۲۰ First Two Nawabs of Awadh (A.L. Srivastava)
۲۱ عماد السعادت ۔ سید غلام علی صفحہ ۳۶ ۔ ۲۲ First Two -
۲۳ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور - Nawabs of Awadh
تہذیبی پس منظر صفحہ ۴۲ ۔ڈاکٹر محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء
۲۴ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۴۲ (ڈاکٹر
محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء ۔ ۲۵ حدیقۃ الاقالیم (مشمولہ
دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۴۸ (ڈاکٹر
محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء
۲۶ First Two Nawabs of Awadh pp 247
۲۷، ۲۸ عمارت السعادت ۲۹ آخری تاجدار اودھ صفحہ ۸۔
دانش محل لکھنؤ ۱۹۳۵ء ۔ ۳۰ ڈاکٹر ہاف مین جرمنی کا ایک
(Scholar) تھا جس نے ۲۴ ستمبر ۱۸۶۳ء کو واجد علی شاہ کو ایک خط میں
ان کے پٹیشن (Petition) سے متاثر ہو کر ان خیالات کا اظہار کیا تھا
یہ خط مسیح الدین کی کتاب ("Oude : Its Princes & Its Govt.
میں شامل ہے ۔ ۳۱ تاریخ فرح بخش
۳۲ Dacoitee in -) ۳۳ The Garden of India PP 78
۳۴ تاریخ اودھ جلد دوم صفحہ ۳۰ (– Excelsis – PP 17

۳۵ تاریخ فرح بخش ۔ ۳۶ بوستان اودھ، کنور درگا
پرشاد صفحہ ۶۴ - مطبع احمدی ۱۸۹۲ء ۔ ۳۷ (– The Garden of
۳۸ تحفۃ العالم (سید H. C. IRWIN صفحہ ۸۷ (- India
عبداللطیف شوستری. صفحہ ۵۳۱) مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔
۳۹) The Garden of India PP 90 ۴۰ (– Dacoitte in
۴۱ (Dacoitte in excelsis PP 35 (– excelsis PP 34
۴۲ (– Col. NAC Andrens Quoted in The Garden of
۴۳ (– India P.95 ۴۴ Garden of India P 89 – garden
۴۵ دریائے لطافت (ترجمہ) صفحہ ۱۲۴ - (- of India P 91
۴۶ (– How to make & how to break a treaty; Quted
۴۷ بوستان اودھ ۔ کنور درگا (– Dacoitte in Oudh PP 61
پرشاد صفحہ ۔ ۴۸ Dacoittee in Excelsis PP 80
۴۹ سیر المتاخرین (مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث صفحہ ۱۱۰) ۵۰ تاریخ
اودھ جلد ۵ (نجم الغنی صفحہ ۱۲۵) ۵۱ (British Aggression.
۵۲ قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۲۲...... (- In Oudh PP 72
۵۳ تذکرہ آبِ بقا ۔ ۵۴ صحیفۂ والا قدر صفحہ ۳۰
مطبع نول کشور ۱۲۸۳ھ ۔ ۵۵ (The Garden of India – Vol.
(- I P 136

"**شاعر** کے کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں عالم تصویر کے علاوہ ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے. شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے ان خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذباتِ دلی سے رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں"

—— پنڈت برج نرائن چکبست

پروین طلحہ

نیشاپوری نوابوں کے عہد میں اودھ کا انتظامیہ

اکبر کے عہد میں سلطنت مغلیہ بارہ صوبوں میں منقسم تھی۔ اودھ ان میں سے ایک تھا اودھ حکومت کے بانی سعادت خاں مغل حکومت کے امرا میں سے تھے اور ۱۷۲۲ میں اودھ کے صوبے دار مقرر کئے گئے تھے انھوں نے ہی اودھ انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی تھی جس کا سلسلہ واجد علی شاہ کے دور تک چلا۔ حالانکہ اس انتظامیہ نے مغل قوانین وضوابط کو برقرار رکھا۔ لیکن انیسویں صدی میں اس کے ڈھانچے اور اس کے ضابطوں اور قوانین میں تبدیلیاں آئیں۔ سعادت خاں اور ان کے فوراً بعد کے دو نواب زیر صوبہ اودھ میں مغل شہنشاہ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مگر ۱۷۶۵ء میں انگریزوں سے صلح کے بعد اودھ کے نواب وزیروں کے قدم خود مختاری کی طرف بڑھنے لگے۔ ابتدائی تین نواب وزیر ایک مضبوط انتظامیہ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے جو صوبہ دار کی فوری توجہ کے بغیر بھی فرائض کی بجاآوری کی صلاحیت رکھتا تھا۔

سعادت خاں نے ایک ایسا مضبوط انتظامیہ تشکیل دیا جو مکمل طور سے ان کا وفادار تھا اس وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں بھی اس صوبہ پر ان کی گرفت رہتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اپنے اعزا اقربا اور رفقا کو انتظامیہ کی کلیدی اور اہم جگہوں پر مقرر کیا یہ اسلئے بھی کیا گیا تھا کہ اودھ کو ایک آزاد مرکز کی حیثیت حاصل رہے جہاں سے پوری سلطنت پر اثر انداز ہونے کی کوششوں کا آغاز کیا جا سکے۔

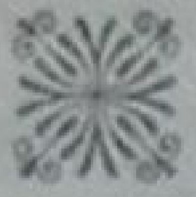
شہنشاہ اکبر نے اپنے انتظامیہ کو اس طرح تشکیل دیا تھا کہ مختلف صوبے دار مرکز سے آزادی نہ حاصل کر پائیں اس نے صوبوں کی دیوانی کے افسروں کا تقرر اپنے پاس رکھا اور اسطرح سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ صوبے دار صرف نظامت کا سربراہ ہوتا تھا مغلوں نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ صوبوں کی دیوانی اور نظامت ایک ہی فرد کے پاس نہ رہنے پائے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد کمزور شہنشاہ تخت پر بیٹھے ان کے پاس نہ سیاسی فراست تھی اور نہ انتظامیہ کے اہم نکات کو سمجھنے کی مہم۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھارویں صدی میں مغل سلطنت کے مختلف صوبوں کے علاقائی حکمرانوں نے مرکزی حکومت سے اپنے کو آزاد کر کے اپنی خاندانی حکومت قائم کر لی تھی۔ صوبائی ناظم نے خود کو مغل طرز میں ڈھال لیا تھا۔ مسلم الثبوت مغل روایات کے مطابق مختلف شعبہ جات ودفاتر میں اقتدار کے خطوط اور طریقہ کار کے بنیادی عناصر وہی رہے اسی لئے انیسویں صدی میں اس انتظامیہ نے انھیں دوسری شکل دینے کی برطانوی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اودھ کے افسروں کا تقرر مغلیہ امرا میں سے کیا جاتا تھا۔ اودھ کے انتظامیہ کے مختلف محکمے وہی تھے جو مغلوں نے بنائے تھے۔ سرکاری زمرے اور نظامت کے درمیان ایک طرح کا تناؤ رہا کرتا تھا۔ نظامت کا سربراہ صوبے دار یا گورنر ہوتا تھا۔ لیکن محکمۂ مالیات کا سربراہ دیوان کہلاتا تھا اودھ کے صوبے دار اس سے واقف تھے کہ اس طرح کے تناؤ اور اختلافات نے بنگال کے صوبے دار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بنا دیا تھا۔ شہنشاہ ہندستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی تھی۔ اس لئے اودھ میں صوبہ دار نے اختیارات کا استعمال خود کیا اور سعادت خاں کے عہدے سے دیوان اور دوسرے افسروں کا تقرر وہی کیا کرتے تھے تاکہ دیوان صوبہ دار کا ماتحت رہے حالانکہ یہ مغل انتظامیہ کے بنیادی اقدار کے مغائر تھا۔ لیکن ۱۷۲۲ سے کوئی شہنشاہ ہی نہیں رہ گیا تھا جو اودھ کے صوبے داروں کے اس اقدام کے مضمرات پر غور کر سکتا چونکہ مرکز سے کوئی اعتراض

نہیں ہوا اس لئے یہ طرز عمل جاری رہا اور صوبے دار مغل بادشاہ کے تسلط سے آزادی حاصل کرتے گئے۔ آخر کار ۱۸۱۹ سے ان لوگوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

چونکہ صوبے دار بلا شرکت غیرے صوبائی انتظامیہ کے سربراہ بن گئے تھے اس لئے وہ لوگ اپنا ایک نائب مقرر کر دیا کرتے تھے جو انکی عدم موجودگی میں شعبۂ نظامت کا نگراں ہوتا تھا۔ نائب ایسا شخص ہوتا تھا جس پر زبردست اعتماد کیا جا سکے اور صوبے دار اس پر مکمل بھروسہ کر سکے ابتدا میں نائب کے عہدے کے لئے صرف رشتے دار مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسے اودھ میں سعادت خاں کے نائب صفدر جنگ تھے۔ صفدر جنگ سعادت خاں کے بھانجے اور داماد تھے اور بعد میں اودھ کے نواب ہوئے تھے۔ نائب کے محکمے میں زیادہ تر افسران وہ ہوتے تھے جو حکمرانوں کے خاندان کے معتبر نوکر، غلام یا خواجہ سرا ہوں یا جن کی سعادت خاں کے خاندان سے قدیم وابستگی ہوتی تھی۔ حکومت کے اختتام تک نواب نے اس کا لحاظ رکھا کہ ان عہدوں پر شیعہ فرقے کا کوئی مسلمان مقرر کیا جائے۔ البتہ دیوانی کے محکمہ کے لئے نوابوں نے کائستھ اور کھتریوں کے خاندان سے منشیوں کا تقرر کیا۔ دیوان کے منصب پر کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر اسی طبقات افراد مقرر کئے جاتے تھے انھیں دو برادری کے افراد دیوانی کے مختلف محکموں پر ہر سطح پر مقرر کئے گئے نوابوں کے انتظامیہ میں ایک اور اہم بات یہ رہی کہ جو بھی دیوانی کے کسی بھی عہدے پر مقرر ہوا وہ جب تک زندہ رہا اپنے عہدہ سے ہٹایا نہیں گیا اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثا میں سے کوئی اسی عہدے پر مقرر کیا گیا۔ آتما رام لاہور کے پنجابی کھتری تھے اور سعادت خاں کی آگرہ کی صوبے داری کے زمانے سے ان کے ساتھ رہے۔ جب سعادت خاں اودھ کے صوبے دار ہوئے تو آتما رام دیوان مقرر ہوئے کئی نسلوں تک آتما رام کے ہی خاندان میں رہی نوابی انتظامیہ میں اس طرح کی سیکڑوں مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ درحقیقت کائستھ اور کھتری دیوان اس کا التزام رکھتے تھے کہ ان کے محکموں میں انھیں کے خاندان اور برادری کے افراد مقرر ہو سکیں اس دیوانی کے محکموں میں بہت سارے نقائص کے باوصف استحکام اور مضبوطی پیدا ہوئی۔

یہاں نوابوں کی انتظامیہ مغل انتظامیہ سے بالکل الگ تھی۔ اس لئے کہ مغلوں کے یہاں حکام مسلسل تبدیل ہوا کرتے تھے۔ مغل شہنشاہ پوری سلطنت کا دورہ کیا کرتے تھے۔ انتظامیہ کے مختلف محکموں پر نظر رکھتے تھے کہ ان محکموں میں کسی مخصوص خاندان یا فرد کا کوئی آدمی زیادہ بااختیار ہو کر اپنی جڑیں مضبوط نہ کرنے پائے مغل انتظامیہ کی یہی طاقت اس وقت تک رہی جب تک لائق شہنشاہ تخت نشیں ہوتے رہے

جس طرح سعادت خاں نے اپنے منصب کو خاندانی عہدہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ان کے ماتحت حکام نے بھی اپنے محکموں کو اسی طرز میں ڈھال لیا۔ کسی خاندان کی اس طرح کی اجارہ داری انتظامیہ کو کمزور بنانے کا ایک سبب بنی۔ ان خاندانوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ انتظامیہ میں دخیل ہو سکی اور صوبے پر اپنے اثرات کو مستحکم بنا سکی۔ انتظامیہ کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس ڈھانچے میں زمینداروں کا کوئی مقام نہیں رکھا گیا یہ زمیندار جنہیں انتظامیہ اور دربار سے ایک فاصلے پر رکھا گیا تھا دن بہ دن سرکش اور مختار ہوتے گئے ایک وہ بھی زمانہ آیا کہ جب اصل مالیہ کم ہوتا تھا مگر مالیہ کے بقایہ کی وصولیابی پر اصل سے زیادہ لاگت آتی تھی۔ اس طرح کے حالات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے یہ دشوار نہیں رہ گیا کہ وہ طرح طرح کے بہانے تلاش کر کے اودھ کی بادشاہت کو ختم کر دے اور انتظامیہ کا الحاق کر لے۔



لکھنؤ کے کوتوال

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کیے۔ وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مُہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔ واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو۔

—— امراؤ جان ادا۔ مرزا رسوا

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مرقّع اودھ

اودھ کے حکمرانوں کی تاریخ کا ایک نادر تصویر نامہ

والیانِ اودھ کی تاریخ نواب سعادت خاں بُرہان الملک کے شخصی اوج و عروج سے شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایران کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مہم جوئی و مُقدّر آزمائی کی غرض سے ہندستان آگئے۔ انھیں اقتدار عہد محمد شاہی میں نصیب ہوا اور نادر شاہ کے حملہ ۱۷۳۹ء کے زمانے میں انھوں نے بطور خاص شائستہ خدمات انجام دیں۔

جب ایرانی حملے اور اس کے پیدا کردہ خونی ہنگامے کی شدت فرو ہوئی تو انھیں لکھنؤ کی صوبیداری پر فائز کیا گیا۔ اودھ کے حکمرانوں کا یہ مرکزِ ریاست اس وقت شیخ زادوں کے تسلط میں تھا جنھوں نے اپنی تاب و تواں کے زعم میں اس علاقے اور اس شہر میں ایک مُفسدہ برپا کر رکھا تھا۔

نواب سعادت خاں نے اپنے حیلہ و تدبر سے مخالفین کو شکست دی اور اس تمام علاقے کو اپنے قبضہ و تصرف میں کچھ اس طرح لائے کہ آئندہ ایک صدی تک ایران کے خاندان کے لیے قلمروِ سعادت اور برہان الملک کے ورثے کی صورت اختیار کر گیا۔

بنگال اور دکن بھی اسی زمانے میں اپنے قیام و استحکام کے تاریخی مدارج طے کرتے نظر آتے ہیں لیکن بنگال میں علی وردی کے خاندان کی حکومت ایک ربع صدی کے اندر ختم ہو گئی۔ اودھ نے تقریباً ایک صدی پوری کی اور شمالی ہند کی تہذیب و تاریخ پر اپنے گہرے نقش ثبت کیے اور نظام دکن آصف جاہ اوّل کی قائم کردہ حکومت تقریباً دو صدیاں گزار کر اپنے تاریخی انجام کو پہونچی۔

اودھ کے حکمرانوں نے پہلے اپنا مسکن دولت و مرکز ریاست شہر فیض آباد کو بنایا۔ یہ ان کی حکمرانی کا پُرآشوب و پُرتحرک دور تھا۔ سعادت خاں برہان الملک کے بعد پہلے دو حکمرانوں کی تاریخ اسی گلاب باڑی کے شہر سے وابستہ ہے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اس طرح آباد اور شہری خوبیوں سے آراستہ کیا کہ پھر اودھ کی حکمرانی و جہاں بانی اسی شہرِ تہذیب کا حصہ بن کر رہ گئی۔

اودھ کے فرماں رواؤں کا زمانہ ایک صدی سے زیادہ نہیں اور اس حاکمانہ تصرف میں بھی آگے چل کر انگریز شریکِ غالب کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ باین ہمہ اودھ کی تہذیبی فتوحات میں "تارِ حریرِ دو رنگ" جیسی ادائیں نمایاں اور جلوہ فرمائیاں ملتی ہیں جو اپنی جگہ پر بہت عجیب ہیں جنھوں نے غزالانِ لکھنؤ کے اس مرغزار کو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" بنا دیا۔

زبان و ادب، تہذیب و شائستگی، شعر و سخن، فن رقص و سرود، مہارتِ تحریر و تقریر اور کمالاتِ نقش گری و تعمیر میں اس شاہی شہر اور مشرق کے تہذیبی مرکز نے جو "رسائیاں" حاصل کیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔

آصف الدولہ "لکھ لُٹ" کہلاتے تھے اور یہ مثل مشہور تھی "جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ"۔ ان کا بنایا ہوا امام باڑہ آسمان کی طرح دور تک پھیلی ہوئی اس کی "بے ستون سقف" اس کے ایک گوشے میں بنی ہوئی حسین و جمیل مسجد، رومی دروازہ، اس کی طرف گام زنی کے وقت قدم بہ قدم بڑھتی ہوئی اس کی وسعت، محمد علی شاہ کے مقبرے کا قاش و رقاش "ہوادار" گنبد، آخری دور میں فن خطاطی کے بہترین نمونے، فن داستان گوئی جو طلسم ہوش رُبا تک پہونچ گئی، مرثیہ و غزل کی طرفہ کاریاں، عطر و پان کی پیش کش کے رسوم و آداب کی نزاکتیں، شام اودھ کی جلوہ باریوں کو مشرقی تہذیب و تاریخ کے اوراقِ حضور میں

بدل دیتی ہیں ؎

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

اودھ کے حکمرانوں کو، انگریزوں کے ایما پر، عارضی بادشاہت تو بہر حال حاصل ہو گئی مگر عظیم مغلوں جیسا جاہ و جلال، لاؤ لشکر اور زر و دولت کی فراوانی ان کا مقسوم نہ بنی ان کا دربار داخلی و خارجی ریشہ دوانیوں کا ٹوٹتا جڑتا سلسلہ بنا رہا۔ ان کی تشیع پسندی اور عقائد پرستی کا تذکرہ بھی ہماری ادبی تاریخ و صحافت میں آتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کا صد سالہ دورِ حکمرانی ہماری علاقائی تہذیب کی بہترین فتوحات Achievement. میں ہے۔

یہ تصویری مرقع جس کے ساتھ اس کے والیانِ دولت کے مختصر سوانح نامے بھی شامل ہیں، اودھ کی پرشکوہ تاریخ کے "اوراقِ گل" کی سی حیثیت رکھتا ہے شاید اسی لئے اس کے مرتب منشی بلاقی داس نے اس کا نام "گلدستۂ اودھ" رکھا ہے۔

یہ گلدستہ لکھنؤ کی شہری تہذیب کی وہ خوبصورت اور منہ بولتی تصویر ہے جس کو شامِ اودھ کا ایک دیدہ زیب و نظر فریب مرقع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا تماشا اوراقِ مصوّر کی سیر سے کم نہیں۔

غالبؔ نے لکھنؤ کے حسنِ خط کی تعریف کی ہے اس کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے سرورق، ان کی گل کاری و نقاشی بہوم سازی و طغرے نویسی کے حسنِ پیش کش کا اندازہ ایک نظر میں کیا جا سکتا ہے اور اکثر اس نظر داری کا تاثر بہت خوش آیند ہوتا ہے۔

لکھنؤ کی مسندِ شاہی کو زینت بخشنے والوں کی قلمی تصاویر کا دلپذیر عکس ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ایک پرکشش مرقع کی صورت میں بگمانِ غالب موجودہ صدی کے آغاز میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ صرف چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سعادت خاں برہان الملک سے لے کر آخری فرماں روائے لکھنؤ، واجد علی شاہ تک سب ہی سریرِ سلطنت کو آراستہ کرنے والوں کی تصویریں اس میں دی گئی ہیں۔

لیتھو پر چھپی ہوئی، اتنی حسین و جمیل اور پرکشش تصویریں بہت کم کتابوں میں ملیں گی۔ ان کے ساتھ ہی شاہی شخصیتوں کے تعارف نامے بھی بہت خوش خط نستعلیق میں رقم کیے گئے ہیں۔

تصویروں کا انداز یا شبیہ نگاری کا اسلوب کچھ ایسا ہے جسے "ایرانی مو قلم" کا حسین عکس کہا جا سکتا ہے۔ یہ تصویریں یا شبیہیں اپنے خطوط جلال و جمال میں اس عہد اور زمانہ بہ زمانہ اس کی بدلتی ہوئی تصویر کا ایک ثبات آفریں عکس پیش کرتی ہیں۔

موجودہ صورت میں اس کی تقطیع ½۴ × ½۱۰ انچ ہے۔ نگارشِ متن کی جدول سہ خطی ہے۔ بعدہٗ ایک انچ کے قریب جگہ چھوڑ کر پھر یک خطی جدول زیبِ قرطاس و اوراق کی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی کچھ سادہ حاشیہ چھوڑا گیا ہے۔

بیاض کی پیشانی بھی سادہ ہے اور بغیر کسی لوح سازی کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ تحریرِ متن کے لئے بھی نسبتاً جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی ہے جو اب اپنی تاب و تواں سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

دیباچہ کے طور پر اس تصویری مرقع اور اس کے تاریخی ماخذ کے ضمن میں لکھا گیا ہے:

"شائقینِ تاریخ دوست پر مخفی نہ رہے کہ اس نالائق ردّ خلائق عقیدت اساس، بندہٗ بلاقی داس، پسر منشی جگن لال صاحب کائست سری باستو کے پاس ایک نادر و نایاب مرقعِ تصویرات قلمی شاہان اودھ، ابتدائے عہد سعادت خاں (برہان الملک) لغایت واجد علی شاہ خاص کتب خانۂ شاہی کا موجود تھا......"

مصنفِ کتاب کا بیان ہے کہ وہ اس نسخہ پر نظر ڈالتا تھا اودھ کے حکمرانوں کے شاہانہ تزک و احترام کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا اور جو شخص اسے دیکھتا تھا وہ حیرت میں پڑ جاتا تھا۔

منشی بلاقی داس نے اس تعارفی نگارش نامہ کے ساتھ ان مغل امراء بعد کے شاہانِ اودھ کے جو مختصر تاریخی کوائف سپردِ قلم کیے ہیں ان میں ایک گونہ تاریخی توازن اور اس تہذیبی تناظر کو باقی رکھا ہے جو اسلامی شاہی شخصیات پر گفتگو کے ضمن میں ضروری ہوتا ہے۔

دہلی کا مغل خاندان جس کی حکمرانی و جہاں بانی کا تصور شر

قلعۂ مبارک کی سنگین چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اودھ کے ان مسند نشینوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے ایما پر شہر شاہجہاں آباد کے صاحبانِ تاج و سریر کے مقابلہ میں ان کے آباو اجداد کی طرف سے تفویض کردہ صوبیداری اور عہدۂ وزارت کو خود مختاری اور بادشاہت میں بدل دیا تھا۔

شہر لکھنؤ کے اہلِ زبان اور اربابِ ادب نے اپنی زبان حسنِ بیان روزمرہ اور شہری محاورہ کو ایک نئی دبستانی حیثیت بخش دی تھی جس کے ردِ عمل کو ہم دہلی کے اساتذۂ سخن اور اس شہر کے انجمن نشینوں کے لب و لہجہ اور طرزِ کلام میں بھی ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ منشی بُلاقی داس کی نگاہ میں یہ پہلو اور اس کے لسانی تقاضے رہے ہوں گے لیکن ان کی زبانِ قلم ان تہذیبی تحفظات (Cultural Reservation) سے محفوظ رہی اور یہ اپنے طور پر ایک لائق توجہ اور منشی صاحب کے تئیں قابلِ تحسین بات ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے مابین دبستانی کش مکش بھی تھی اور وہ تعلق خاطر بھی جس کو حریفانہ کہا جا سکتا ہے مگر مرتب کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا۔ اس نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تاریخی تعارف ناموں میں شخصی تفاخر اور نجی تعصب کا اظہار نہ ہونا چاہیے۔ یہاں اس کے بعض تعارف ناموں سے مختصر اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جس سے اس کے سوانحی اسلوب نگارش اور مخصوص طرزِ گزارش کا کچھ حال معلوم ہو سکے

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ

"کہتے ہیں کہ یہ نواب بڑا دلیر اور صاحب تدبیر تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی نے مغل بادشاہ کے ہندوستان میں شورش برپا کی اس نے خوب دادِ شجاعت دی۔

اس نے اودھ میں راجہ نول رائے کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود شاہجہاں آباد میں بحضورِ بادشاہ موجود رہا۔ بعد چند روز کے پٹھانوں نے مُفسدہ برپا کیا۔ نول رائے اسی ہنگامے میں مارا گیا۔ نواب نے بامعانت سورج مل جاٹ وغیرہ کے پٹھانوں کا مقابلہ کیا۔"

[illegible] زمانے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندستانی قوموں

کے مابین عسکری اور سیاسی مہمات میں نامذہبی رشتوں کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ غازی الدین حیدر کی طرف سے بادشاہت کے اعلان پر مرتب نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے تذکرے سے بھی صرفِ نظر کیا ہاں ایک دوسرے موقع پر ضرور Passing Reference کے طور پر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ کی آبادی و رونق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس نواب کے عہد میں بسببِ قلتِ آمد و کثرتِ خرچ کے منجملہ چھ آنے جو محاصل صوبہ فی روپیہ خزانۂ سرکار انگریزی میں داخل ہوتے تھے دو آنے معاف ہوئے اور سوداگران انگریزی سے محصول لینے کی اجازت بھی ملی، اور یہ انتظام بھی اسی زمانے میں ہوا کہ کوئی بدون وساطت ریزیڈنٹ کے نواب سے ملاقات نہ کرنے پائے۔

۲۳ برس کئی مہینے حکمرانی کر کے ۲۰ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو اکیاون سال کی عمر میں عالمِ فانی سے ملکِ جاودانی کو چلا گیا۔"

نواب مرزا وزیر علی خاں بہادر

اس نواب کے بارے میں منشی صاحب کے بیانات کا خلاصہ بایں طور پیش کیا جاتا ہے:

مزاج میں نخوت بدرجہ کمال تھی، اراکین دولت اس کی حکومت سے نہایت بیزار اور کمال ناخوش تھے، صاحبانِ صدر نے نواب سعادت علی خاں کو متوقع اس حکومت کا کیا تھا۔ آخر عمائدِ ریاست نے ایک محضر بدیں مضمون بہ ثبت مواہر بہو بیگم و دیگر اراکین و افسرانِ فوج وغیرہ تیار کیا کہ یہ نواب آصف الدولہ کا فرزندِ صلبی نہیں ہے۔

مسٹر جان شور نے اس نواب کو نظر بند کر کے روانہ بنارس کیا اور تین لاکھ روپے اس کے مصارف کے لیے اس ریاست سے مقرر کر دیے۔ وہاں مطلق العنان رہا کیا

اور علی بہادر خاں رئیس بندیل کھنڈ، گو شائیں ہمت بہادر اور سندھیا سے خط و کتابت جاری کی اس سبب سے وہاں سے بھی اس کا اخراج عمل میں آیا۔ بعد میں اس رئیس زادے نے ایک بڑے انگریز افسر مسٹر چیری کو قتل کر ڈالا جس کی پاداش میں وہ قید کر دیا گیا اور اسی قیدِ فرنگ کی حالت میں اس نے جان دی۔"

وزیر علی خاں کے کردار کو اس سے متعلق بعض واقعات کے پس منظر میں شاید نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

منّا جان اور ان کی والدہ کا غیر مطمئن بلکہ باغیانہ کردار بھی اتنا کم مایہ نہیں جتنا انگریز بالادستی کے تناظر میں اسے دیکھا اور سمجھا گیا ہے فریدوں بخت عرف منّا جان کے تعارف میں لکھا ہے:

"بعد وفات نصیر الدین حیدر کے کرنیل جان لو صاحب ریزیڈنٹ نے مسند نشینی کے واسطے نصیر الدولہ کو تجویز کر کے ایک کاغذ اس مضمون کا اس کے پاس بھیجا کہ جو کچھ نواب، گورنر جنرل بہادر عہد نامہ جدید، تجویز فرمائیں گے ہم اس عہد نامہ پر بلا تامل دستخط کر دیں گے"۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا ادھر صاحب مُرقّع کے بیان کے مطابق صورتِ حال یہ بن گئی:

"ہنوز یہ گفتگو کرسی نشین مطلب نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم باوجود ممانعت کے مع منّا جان اپنے فرزند کے بافوجِ کثیر آئی۔ کرنیل جان لو صاحب کہ سامانِ جلوس مسند نشینی نصیر الدولہ میں مصروف تھے، بہت گھبرائے۔ بادشاہ بیگم بزورِ فیل دروازہ توڑ کر مع فوج مکان سلطانی میں در آئی اور کرنیل جان لو صاحب کو قید کر لیا اور دیگر اُمرایان کو بھی مع نصیر الدولہ کے نظر بند کر لیا اور منّا جان اپنے فرزند کو تخت پر بٹھایا۔ توپیں سلامی کی سر ہونے لگیں"۔

اس سے اودھ کے سیاسی منظر نامے کا ایک دوسرا رُخ بھی سامنے آتا ہے۔

ان تصویروں میں جن کی اصل قلمی تھی، اعلانِ بادشاہت کے بعد سب نوابوں کے سر پر مغربی انداز پر بنے ہوئے تاج رکھے ہیں، جنھوں نے مغلوں کے سر پیچ اور مالائے مروارید کی جگہ لے لی ہے۔ شاہی لبادہ بھی بہت کچھ برٹش تاجداروں کے لبادے سے مشابہ ہو گیا ہے اب اس نئے لبادہ نے شاہی عبا و قبا کی جگہ لے لی ہے۔

لانبی مونچھیں آصف الدولہ کے علاوہ ایک دو اور تصویروں میں بھی ملتی ہیں اور یہ ایک گونہ ایرانی اثرات کی نشان دہی کرنے والا Factor ہے۔ واجد علی شاہ کے سر پر تاج نہیں، یوں بھی ان کے دس سالہ دورِ حکومت کے بعد اودھ کی تاج داری کا زمانہ ختم ہو گیا۔



نوابینِ اودھ کے عہد میں لکھنؤ میں محلّے آباد کیے گئے تو اِس بات کا خیال رکھا گیا کہ ہندو اور مُسلمان ایک ہی ماحول میں رہنا سیکھیں چنانچہ حُسین آباد کے ساتھ رام گنج بسایا گیا۔ منصور نگر کے پہلو میں کشمیری محلہ۔ راجہ بازار کے ساتھ کٹڑہ ابُوتُرابُ خاں۔ گنیش گنج کے ساتھ قصائی بارہ۔ پُھول باغ کے ساتھ حُسین گنج۔ ڈھاکر گنج کے ساتھ نواب گنج اور تکیت گنج کے ساتھ مہدی گنج کی بستیاں آباد ہوئیں۔

—— یوگیش پروین

اشفاق احمد خاں

صوبہ اودھ کے سکے

صوبہ اودھ کے سکوں کے متعلق جاننے سے پہلے اودھ کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ ۱۷۱۹ء میں دہلی کے مغل بادشاہ نے اپنے وزیر سلطنت محمد امین سعادت خاں برہان الملک کو صوبہ اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ برہان الملک دہلی چھوڑ کر اودھ میں اجودھیا آئے اور اسے ہی اپنا مستقر بنایا۔ ۱۷۳۷ء میں برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے داماد منصور علی خاں صفدر جنگ اودھ کے صوبہ دار ہوئے اور ۱۷۴۷ء میں انھیں دہلی سلطنت کا وزیر بھی مقرر کیا گیا۔ اس وقت سے وہ اور ان کے کئی جانشین نواب وزیر کہے گئے۔ صفدر جنگ نے شہر فیض آباد کی بنیاد از سر نو ڈالی۔ ۱۷۵۴ء میں انکا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ ان کی جگہ اودھ کی گدی پر رونق افروز ہوئے۔

۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی بادشاہ دہلی کے عہد میں بنارس کی ٹکسال کا انتظام شجاع الدولہ کے سپرد ہوا۔ اور ۱۷۷۵ء یعنی شجاع الدولہ کی وفات تک یہ ٹکسال انھیں کے زیر انتظام رہی اور اس میں سکے بادشاہ شاہ عالم ثانی کے نام سے ڈھلتے رہے۔ نواب شجاع الدولہ نے ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء میں وفات پائی۔ بعد ازیں نواب آصف الدولہ رونق افروز تخت سلطنت ہوئے انھوں نے بجائے فیض آباد کے لکھنؤ میں ہی سکونت اختیار کرلی ان ہی کے عہد سے شہر لکھنؤ کا نام ہندوستان اور اس کے باہر بھی مشہور ہوا۔ وہ خوش نیتی اور سخاوت کے لیے بہت مشہور تھے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا جانے لگا کہ "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"۔ ان کے عہد میں مچھلی دار روپے جن پر سنہ جلوس ۴۹ لکھا ہوتا تھا بادشاہ شاہ عالم کے نام سے بنتے رہے۔ ۱۷۹۷ء آصف الدولہ کے انتقال کے بعد وزیر علی اور سعادت علی خاں تخت نشیں ہوئے مگر ان کے عہد میں کوئی خاص سکہ یا تمغہ جاری نہیں ہوا۔

۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو غازی الدین حیدر اودھ کے نواب وزیر بنے ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز کی ترغیب پر غازی الدین حیدر نے دہلی سلطنت سے اپنا تعلق ختم کرکے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بحیثیت بادشاہ اودھ اپنے نام سے سکہ جاری کیا۔ غازی الدین حیدر کی تاجپوشی لال بارہ دری میں بہت ہی جوش و خروش سے ہوئی اور اس موقع پر تاجپوشی کی یادگار میں ایک تمغہ بھی جاری کیا گیا جو اپنے میں اعلیٰ درجہ کی کاریگری کا نمونہ ہے۔ اس کے ایک طرف دائرے میں تاج و بادشاہ کی شبیہ اور باقی جگہ میں پھول اور بیلیں بنی ہیں حاشیہ پر گولائی میں ذیل کا کتبہ موجود ہے:-

سکہ زر بر سیم و زر از فضل رب ذوالمیمن
غازی الدین حیدر علی نسب شاہ زمن۔ سنہ احد

تمغے کی دوسری طرف شاہی نشان ہے۔ اس میں دو شیر ہاتھوں میں جھنڈا لیے ہوئے ہیں۔ ان جھنڈوں پر مچھلی بنی ہے۔ دونوں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹار بھی ہے۔ کٹار کے اوپر تاج اور نیچے مچھلیاں ہیں جن کی گولائی سے ایک دائرہ بن جاتا ہے۔ سب سے نیچے ایک لہردار باریک جھنڈا ہے۔ داہنے گوشہ پر حرف "ج" ہے اور کنارے حاشیہ پر گولائی میں دعائیہ شعر ہے:-

"شاہزاد سال شاہا بقائے عمر تو بادا
ہزار سال باشی تو در زمان خدا"

غازی الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے جاری کیے۔

قسم الف: یہ سکہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں شاہ عالم بادشاہ کے

نام سے جاری کیا گیا تھا اس میں مچھلی ٹکسال کے نشان کے طور پر ایک طرف بنی ہوئی ہے اور فارسی کا یہ شعر کندہ ہے :۔

"سکہ زر در ہفت کشور سایہ فضل اللہ
حامی دین محمود شاہ عالم بادشاہ"

سکہ کی دوسری طرف سلطنت اودھ کا شاہی نشان دو مچھلیوں کی شکل میں بنا ہوا ہے. مچھلیوں کے درمیان اس کا سنہ جلوس ۲۶ اور "ضرب صوبہ اودھ دار الامارۃ لکھنؤ" لکھا ہوا ہے. مچھلیوں کے اوپر کٹار اور تاج بنا ہوا ہے اور اس کے دائیں بائیں جھنڈا لیے ہوئے شیر بنے ہیں۔

قسم ب : یہ سکہ بھی بادشاہ نے اپنے نام سے ہی جاری کیا تھا اس پر بھی ۱۲۳۴ھ ہی لکھا ہوا ہے مگر اس پر سنہ جلوس ۵ لکھا ہوا ہے. کیونکہ وہ پانچ سال قبل ۱۲۲۹ھ میں اپنے والد کی جگہ پر نواب وزیر مقرر ہو چکے تھے.

قسم ج : یہ سکہ بھی انھوں نے ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں ہی اپنے نام سے جاری کیا مگر اس میں سنہ جلوس ۵ کے بجائے سنہ احد لکھا ہے کیونکہ ان کی بادشاہت کا یہ پہلا سال تھا اور اسی سال ان کی تاج پوشی باضابطہ طریقہ سے ہوئی تھی. ان سکوں پر ایک طرف یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

"سکہ زر بر سیم و زر از فضل ربّ ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن"

دوسری طرف (الف) اور (ب) کی وہی عبارت اور نشانات ہیں۔

قسم د : ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ء) میں لکھنؤ کا لقب دار الامارۃ سے دار السلطنت ہو گیا اور اب یہاں کے سکوں پر "ضرب صوبہ اودھ دار السلطنت لکھنؤ" لکھا جانے لگا.

غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں نصیر الدین حیدر دوسرے بادشاہ بنے. ان کے عہد کے پہلے دو سال کے سکوں پر ان کا نام سلیمان جاہ اور یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے.

"بر ہر سکہ شاہی زر ز لطف الٰہ
سند مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ"

تیسرے سال یہ شعر بدلا اور سکوں پر بادشاہ کا نام نصیر الدین حیدر ہوا اور شعر یہ لکھا جانے لگا.

سکہ زر بر سیم و زر از فضل حق ظل اللہ
نائب مہدی نصیر الدین حیدر بادشاہ

نصیر الدین حیدر کی وفات پر ان کے چچا محمد علی شاہ تخت شاہی پر ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں جلوہ افروز ہوئے. انھوں نے سونے اور چاندی کے سکوں پر ایک نئے قسم کا مارک ایجاد کیا. اس میں سکے کی دوسری طرف شیر کی جگہ دو عورتیں ہیں جو ان کے جلوس کے پہلے اور دوسرے سال میں ننگے سر ہیں مگر بعد میں سر پر نوکیلی پگڑی پہنے ہوئے دکھائی گئی ہیں. سکوں پر ذیل کا شعر لکھا ہوا ہے۔

بجود و کرم سکہ زر دو جہاں
محمد علی شاہ بادشاہ زماں

محمد علی شاہ کے پہلے تین سال کے سکوں پر دوسری جانب "صوبہ اودھ بیت السلطنت لکھنؤ" لکھا ہوا ہے مگر ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) سے بجائے صوبہ اودھ کے "ملک اودھ" تحریر ہے۔

۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے اس کے عہد کے سکوں پر یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے :۔

زر دو جہاں سکہ شاہی بتائید اللہ
ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

سکے کی دوسری طرف مارک اس طرح سے بنا ہوا ہے یعنی ایک گھومتی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چھتر ہے اور اس کے دائیں اور بائیں طرف کسی قدر گولائی میں دو تلواریں ہیں اور کچھ اس طرح سے لکھا ہے. "ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس"

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں واجد علی تخت نشیں ہوئے. ان کے سکوں کے پہلی طرف یہ شعر لکھا ہوا پایا جاتا ہے.

"سکہ زر بر سیم و زر از فضل اللہ
ظل حق واجد علی شاہ سلطان عالم بادشاہ

دوسری طرف شاہی نشان میں تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے. اسم بجائے

یوگیش پروین

سلطنتِ اودھ کے غیر مسلم منصب دار

قدیم بھارت اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں کائستھ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور درباروں میں اپنی فراست، ذہانت، شعری ملکہ، تحریر و تقریر میں دستگاہ اور اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہمیشہ معقولات، ادب فلسفہ، آرٹ، سائنس اور سیاست سبھی شعبوں میں معزز و محترم رہے اور اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

سنسکرت کے مشہور چھکٹکم "मृच्छकटिकम" کتاب کی تخلیق سے لیکر اودھ کے درباروں تک کائستھوں کا بول بالا رہا۔ وہ بڑی بڑی ریاستوں اور جاگیروں کے مالک بھی رہے ہیں۔ نوابین اودھ کے جدِ امجد نواب سعادت خاں برہان الملک کے وقت سے لیکر ریاست کے نظم و نسق کے لئے ہندو نائب مقرر کئے جانے لگے۔ اس روایت میں اکثر یہ پایا گیا کہ نوابوں کے بکس بٹے، خزانچی، کھتری اور نائب کائستھ رہے ہیں۔ اپنی خوش اخلاق کے باعث عہد وسطیٰ میں اقتدار میں رہنے کے باوجود کائستھوں کا اسلام قبول کرنا نہ کے برابر رہا ہے۔

اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے ساتھ کچھ کائستھوں نے بھرپور تعاون کیا ہے۔ اودھ کے پہلے نواب برہان الملک کے دور میں راجہ ہرنرائن کے بیٹے راجہ لکشمی نرائن ان کے سب سے زیادہ معتمد نائب تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد راجہ لکشمی نرائن نے نادر شاہ کو سمجھایا اور اسی کی بنا پر نواب کے داماد کو ابو المنصور خاں کا خطاب ملا اور اودھ کے صوبہ دار ہوئے بعد میں صفدر جنگ کے نام سے شہرت پائی۔

نواب سعادت خاں برہان الملک کے دیوان آتما رام تھے۔ ان کے بڑے بیٹے رام نرائن نے فیض آباد میں دلی دروازہ بنوایا۔ ان کے چھوٹے [illegible] نرائن نے لکھنؤ کو سنوارا جہاں ان کی رہائش گاہ باغ مہا نرائن کے نام سے معروف ہے۔ برہان الملک کے وقت میں حرم کے داروغہ رائے کیشو رام بھی تھے۔ نواب صفدر جنگ کے بھی نائب راجہ نول رائے کائستھ تھے جو کوڑا خورد تحصیل ملیح آباد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نواب صفدر جنگ چونکہ عام طور سے دلی ہی میں رہا کرتے تھے اس لئے اودھ کا انصرام و انتظام راجہ نول رائے ہی سے متعلق رہا۔

ان کے خاندان کی تاریخ اس طرح ہے کہ شری مہتاب رائے کوڑا خورد تحصیل ملیح آباد کے باشندے تھے اور ان کا خاندان قانون گویان کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے لڑکے نول رائے تھے۔ آج بھی کوڑا میں لوگ رائے خاندان کو عزت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ —— نول رائے کی دربار میں رسائی الماس میاں کی مہربانی سے ہوئی تھی شری نول رائے کے بیٹے گلاب رائے اپنے ننہال بانگرمئو ضلع اناؤ چلے گئے اور وہاں شروع سے ہی چکلے دار اور پھر ناظم ہوئے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ امیٹھی سے لگان وصول کریں۔ امیٹھی فیض آباد کے راجہ مان سنگھ کے علاقے میں تھی۔ جب راجہ ٹکیت رائے پہنچے تو راجہ مان سنگھ نے آکر ان کے راکھی باندھ دی۔ کیونکہ وہ برہمن تھے راکھی کے نیگ میں انھوں نے لگان کی معافی مانگ لی۔ اس کے بعد راجہ گلاب رائے کو امیٹھی بھیجا گیا۔ انھوں نے امیٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لگان وصول کر لیا اس کے ساتھ ہی ایک فرمان بھی لکھا لیا کہ اب لگان نہیں لیں گے۔ اس بات سے راجہ ددوا کے نانا راجہ مان سنگھ کے دشمن ہو گئے اور پھر انگریزی حکومت میں راجہ مان سنگھ انگریزوں کے حامی ہوئے تو انھوں نے گلاب رائے کے گھرانے سے بدلہ لے کر زبردست نقصان پہنچایا۔ راجہ نول رائے نے لکھنؤ اور موہان کے

پنچ نول گنج آباد کیا۔ ان کے بنوائے ہوئے شوالے بلیج آباد اور نول گنج میں موجود ہیں۔ راجہ صاحب نے لکھنؤ میں گومتی پر پہلا پتھر کا پل بنوانا شروع کیا تھا لیکن پل ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا کیونکہ وہ اپنی بہادری کے باعث فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کے مقابلہ کے لئے بھیجے گئے تھے جہاں وہ شہید ہو گئے۔ نواب صفدر جنگ کے دور حکومت میں راجہ بھگوان داس کو میر منشی بنا کر دلی سے بھیجا گیا تھا۔ انھیں کاکوری پرگنے کے کئی گاؤں اور موہنا جمال پور ملا تھا۔ پھر ان کے چھوٹے بھائی راجہ بشن سنگھ منشی بنے نواب سعادت علی خاں کے دور میں جن کے بیٹے دولت رائے نے آخر تک یہ عہدہ سنبھالا۔ نواب شجاع الدولہ کی فوج میں راجہ شتاب رائے کو اعزازی عہدہ حاصل تھا اسی طرح انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں راجہ بینی بہادر نائب صوبہ دار نے نواب کا ساتھ دیا تھا۔

نواب شجاع الدولہ کے ہی دور میں راجہ پورن چند کو ایک رپورٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ان کے بیٹے رائے بال کرشن اور داماد جسونت رائے بعد میں نواب آصف الدولہ کے دیوانِ وزارت میں تھے۔ نواب آصف الدولہ کے ہی دور میں مشرقی علاقہ کے منتظم رائے جینی لال کو بنایا گیا تھا۔ یہ رائے پورن چند اور رائے رگھوناتھ پرشاد کے بیٹے تھے۔

راجہ ٹکیت رائے نواب آصف الدولہ کے وزیر مال تھے۔ وہ پٹنہ کے پران ناتھ شریواستو قانون گو خاندان کے تھے جن کا خاندان پہلے ہی گنگا کے کنارے ڈلمؤ میں آباد ہو چکا تھا۔ ابتدا میں وہ بیس اڑہ کے ناظم رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں اپنے دربار میں اعزاز دینے کی غرض سے بائیس پارچے کا خلعت دیا تھا۔ راجہ صاحب نواب کے دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ اودھ دربار کے وزیر مال بھی تھے اودھ مسند کا وزارت کرنے والوں میں راجہ ٹکیت رائے کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے۔

راجہ ٹکیت رائے کے بنوائے مندر، شوالے، ٹھاکر دوارے، مسجد، تالاب، دھرم شالہ گھاٹ اور ان کے نام سے آباد محلے، قصبے بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ انھیں اس زمانے میں ہندو دھرم کا سرپرست محافظ کہا جاتا تھا۔ راجہ صاحب نے پریاگ میں دھرم شالہ اور بٹھور میں شوالہ بنوایا تھا جو قابل دید ہیں۔

راجہ صاحب کی مذہبی وسیع النظری کا ایک جیتا جاگتا نمونہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بیتوا ندی کے پاس جہاں مندر بنوائے وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اسی طرح لکھنؤ کے حیدر گنج محلہ میں راجہ ٹکیت رائے کی تعمیر کردہ مسجد قابل دید ہے۔ مسجد میں اوپر سنگ مرمر کی پٹی پر اُن کی اس تعمیر کی کہانی لکھی ہے۔ اس کے پاس ہی ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ بھی تھا۔

آصف الدولہ کے دور میں کچھ مخالفین کی کارستانی کے نتیجہ میں نواب سے ان کی ان بن ہو گئی تھی اور کچھ دنوں کے لئے اپنے عہدہ سے ہٹ گئے تھے حالانکہ بعد میں پھر اسی عہدہ پر فائز ہوئے لیکن وہ بات نہ آ سکی۔ نواب آصف الدولہ کو مرتے مرتے اس بات کا غم رہا۔

راجہ جھاؤلال نواب آصف الدولہ کے دوسرے نائب تھے۔ جھاؤلال نواب شجاع الدولہ کے وقت سے دوابہ میں کام کرتے تھے۔ اودھ کی پرانی راجدھانی میں ہی انھیں خواص و عوام دونوں ہی شفقت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب بیگم اور بہو بیگم انھیں پیار سے تلوجی کہہ کر پکارتی تھیں جو کہ ان کے گھر کا نام تھا۔ سکسینہ خاندان کے چراغ مہاراجہ جھاؤلال نے فیض آباد کے خزانہ کی پوری حفاظت کی تھی جبکہ وارین ہیسٹنگ نے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ (مہاراجہ جھاؤلال نے اجودھیا کے بیے مذہبی اداروں کا بھی تحفظ کیا۔ وہ اپنی دریادلی اور مذہبی وقار کی وجہ سے اجودھیا کے لوگوں میں راجہ رہی راج کہے جاتے تھے)

لکھنؤ بلا کر نواب آصف الدولہ نے پہلے انھیں توپخانے کا داروغہ بنوایا اور میر بخشی کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں اپنی جاگیروں کا انتظام حوالے کر دیا۔ راجہ صاحب کو دربار سے شاندار خلعت ملا تھا۔ ان کے سفر کے واسطے ہاتھی اور آٹھ کہاروں کی جھالر والی پالکی ملی تھی۔ لکھنؤ میں راجہ کی حویلی مہاراجہ جھاؤلال کا بنوایا ہوا پل اور ان کے نام کا بازار کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے بھی قومی یکجہتی کا خیال کرتے ہوئے مندروں کے ساتھ ساتھ امام باڑے و مسجدیں بنوائیں جو ٹھاکر گنج میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کی محنت کا سبب جھاؤلال کی ان سے علاحدگی تھی۔ یہ علاحدگی شک اور غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

رائے کیم نرائن رند نواب آصف الدولہ کے پاس ۵

سالانہ پر ملازم ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱ہزار اشعار کہے ہیں۔ ہیر رانجھا نل و دمینتی (فارسی) اور چہار درویش ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے دور حکومت میں ان کے دوسرے داروغہ زور آور سنگھ جی کاستھ تھے اور بینی نرائن ان کے کاتب ہوئے جنھوں نے نواب کے لیے تمام اشعار جمع کئے۔ الماس علی خاں کے دیوان لالہ روشن لال مشہور ہیں جنھوں نے دریاآباد میں کٹرا روشن لال آباد کیا۔ لکھنؤ میں روشن لال کی بارہ دری بھی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی دیوانی کچہری میں شری شیو لال جی ملازم تھے جن کے انتقال کے بعد ان کے ہی بیٹے بھگوان داس جی کو وہ جگہ دی گئی پھر بریلی کا اہلکار بنا دیا گیا جہاں ان کا قتل ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بالک رائے کو نواب آصف الدولہ نے راجہ جھاؤ لال کی سربراہی میں ملازمت دے دی۔ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں دیوانی کے عہدہ پر تھے۔

راجہ دیا کرشن بال کرشن رائے اور تلسی رام منشی بھولا ناتھ دارالانشاء کے صدر تھے۔ جو بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ اس لئے کہ نواب بہترین سواد خط کے دلدادہ تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت میں راجہ امرت لال دربار میں ملازم تھے جو بعد میں بادشاہ غازی الدین حیدر کے وقت میں داروغہ دیوان خانہ کے عہدہ پر پہنچ گئے اور انھیں راجہ کا خطاب نصیر الدین حیدر کے وقت میں ملا۔

اس کے بعد بادشاہ کچھ جلنے والوں کے بہکاوے میں آکر ان سے ناراض ہو گئے اور پھر امرت لال نے خود کٹار بھونک کر اپنی جان دیدی تھی۔ ان کے بیٹے رائے مکھن لال انگریزی حکومت کے ذریعہ ڈپٹی کلیکٹر بنائے گئے۔

گردبخش ادیب کہار تھا لیکن نواب سعادت علی خاں کا منہ لگا تھا۔ اور شعر پڑھ کر سناتا تھا۔

اودھ کے مشہور بادشاہ غازی الدین حیدر کے وزیر اعلا راجہ دیا کشن ہوئے اور پھر نصیر الدین حیدر کے مشہور دوست اور دیانت انتظام کار لالہ رام پرشاد میوہ رام ہوئے جنھیں افتخار الدولہ کے اعزاز ... راجہ الفت رائے کے بیٹے راجہ ترلوک چندر

عرف لال جی بخشی بادشاہ کے دیوان تھے جن کے ذریعہ بخشی کا تالاب بنوایا گیا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے وقت میں مہاراج نول کرشن کے بیٹے راجہ رام نائب دیوانی کے عہدہ پر تھے۔ لائق و فائق بھی تھے۔ تعمیرداری میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے بعد راجہ بال کرشن کو یہ عہدہ دیا گیا۔

محمد علی شاہ کے دور حکومت میں بھی راجہ جیا لال ان کے نائب ہوئے جو شاعر تھے گلشن تخلص تھا۔ محمد علی شاہ کی بیگم ملکہ جہاں کی جاگیر کے منتظم لکھپت رائے جی تھے۔

اس وقت امجد علی شاہ حکمراں تھے۔ محمد علی شاہ حسین آباد کی عمارتیں ادھوری چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور ان کی بیوہ بیگم ملکہ جہاں ان کے ادھورے کام پورے کر رہی تھیں۔ ملکہ جہاں صاحبہ کی دیکھ بھال حاجی بشیر نام کا حبشی نسل کا خواجہ سرا کیا کرتا تھا۔ بیگم کے خزانے کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہا کرتی تھیں حاجی بشیر نے لکھپت رائے جی کی ذہانت اور حسن انتظام کی تعریف جب ملکہ جہاں سے کی تو انھوں نے لکھپت رائے جی کو اپنا نائب دیوان بنا لیا۔ اس وقت ملکہ جہاں تحسین گنج میں جامع مسجد کی تعمیر کروا رہی تھیں جو اودھ اسکول کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ لالہ لکھپت رائے جی بعد میں بیگم صاحبہ کے دیوان بن گئے۔

۱۸۴۷ء میں حکومت اودھ میں جس وقت واجد علی شاہ کا جلوس ہوا دیوان لکھپت رائے جی گنیش گنج میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی کا کچھ حصہ آج بھی باقی ہے جس میں اس وقت کے فن تعمیر کے روشن نقوش مل جاتے ہیں۔

ملکہ جہاں ۱۸۶۰ء میں زیارت کے لئے گئیں اور وہیں سپرد خاک ہوئیں لکھپت رائے جی اسی زمانے میں اپنے بزرگوں کا "شرادھ" کرنے گیا تشریف لے گئے۔

لکھنؤ میں تیج کھیڑا مہاراجہ بال کرشن کے بیٹے مہاراج تیج کرشن نے بسایا تھا۔ راجہ تیج کرشن کی حویلی بھدیوان کے قریب تھی اور تب وہاں بجے نگر کی بستی بھی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جان عالم کی طرف سے راجہ بال کرشن انگریزوں سے لڑائی میں شہید ہوئے اس لئے انگریزوں نے اس حویلی کو برباد کر دیا تھا مہاراجہ بال کرشن عیش باغ رام لیلا کے سرپرست تھے ان کے نام سے موہان

روڈ پر مہاراج گنج قصبہ آباد ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کی یادگار بال کرشن کا چھتہ سرائے معالی خاں کے قریب تھا جو اب ایک محلہ ہے۔ منشی جوالا پرشاد، راجہ پیوارام، منشی صاحب رائے خاموش اور خیالی رام خیالی واجد علی شاہ کے درباری دانشوروں میں تھے۔

کرشن چند سکسینہ کا خاندان دلی سے آکر نوبستہ لکھنؤ میں آباد ہوا تھا وہ اردو فارسی میں دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور مرزا آغا حر میکش کے شاگرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد سب اودھ دربار سے متعلق تھے۔ اسی طرح رائے دولت رام دولت کے والد کا نام گردیال تھا۔ یہ راجہ پڈ چند کے پوتے تھے۔ دولت اودھ دربار کے خاص شاعر تھے اور فارسی کے ممتاز عالم بھگوان داس ہندی کے شاگرد تھے۔

بیگم حضرت محل کے دور حکومت میں مہاراج بال کرشن نے ہی نول گنج کے ساتھ مہاراج گنج کو آباد کیا۔ ان کی بنوائی ہوئی عالیشان عمارتیں ہیں۔ انھوں نے ہی ایک شوالہ کو تعمیر کرایا تھا جس کی خوبصورتی قابل دید ہے۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں مہاراجہ شہید ہو گئے۔ ان کی قربانی بے مثال اور یادگار ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کا ایک مکان خاص بازار میں تھا اور دوسرا بھوائی گنج میں تھا۔ ان کے بیٹے راجہ برج کرشن اور راجہ بہاری لال کو بھی دربار کی جانب سے ۲۲ پارچے کا خلعت ملا تھا۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں تو قومی ایکتا کا ستارہ اور بھی بلند ہوا۔ راجہ بال کرشن ان کے وزیر تھے اور راجہ بہاری لال ان کے اچھے دوست۔ ٹھاکر پرشاد جی واجد علی شاہ کے استاد تھے اور انھیں کتھک سکھاتے تھے۔ جب ان کے وزیر علی نقی نے ایک ہندو بیوہ کی زمین ٹھاکر گنج میں ضبط کرلی تو انھوں نے اس کی زمین واپس دلا کر اس غریب کو ایک مندر بنانے کے لئے روپے دئے۔ واجد علی شاہ قیصر باغ میں جوگیانہ میلہ، اندر سبھا اور رام لیلا بھی رچاتے تھے۔ جن کی بنیاد معتقدات و رسوم پر تھی۔ ان کی لکھی ہوئی ہولیاں، بابل اور ٹھمریاں ہندی کے رنگ میں ہیں۔ وہ اگر محرم بڑی دھوم سے مناتے تھے تو بڑے منگل پر بھی دل کھول کر روپے خرچ کرتے تھے۔ جس میں ان کی طرف سے ایک "برہم بھوج" بھی ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں بہت سے مندروں کی بنیادیں پڑیں اور درستگی و تزئین ہوئی۔

بیگم حضرت محل کی سلطنت میں راجہ جے لال سنگھ نے اس کی آن اور وطن کی شان کے لئے اپنی جان قربان کردی تھی۔ شنکر پور کے راجہ بینی مادھو اور کالا کانکر کے راجہ ہنومنت سنگھ اور تلسی پور کے راجہ جنگ آزادی میں جان پر کھیل گئے۔ بیگم کے ساتھ راجہ دیوی بخش سنگھ، راجہ امر سنگھ وغیرہ سرحد نیپال تک گئے تھے۔ نوابوں میں اگر ہندو لوگ تعزیہ داری اور پیر فقیروں کے مرید تھے تو مسلمان چیچک نکلنے پر شیتلا مندر سے نیر اور پھول مانگتے تھے۔ لکھنؤ میں بنی ہوئی رانی پڑائن کی مسجد اور دھنا مہری کی مسجد سے اپنے آپ میں قومی میل جول کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ یہاں اگر ہندو راجہ امام بخش ہیں تو ٹھاکر نواب علی بھی ہوئے ہیں۔ یہاں کی شاہی عمارتوں پر مچھلی، کمل، ناگ پھن اور جل پریوں کے نقوش ملتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کے مقدس نشان ہیں جس کی بہار کی آزاد فضا میں سب برابر کے حقدار تھے۔

اور تو اور اس زمانے میں لکھنؤ کے محلے آباد کئے گئے تو اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا گیا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ ایک ہی ماحول میں رہنا سیکھیں در اصل نوابی کا وہ زمانہ آپسی میل جول کا، مذہبی رواداری اور باہمی محبت کا زمانہ تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کبھی ہندو مسلم جھگڑے نہیں ہوئے۔



اودھ کے سکے

صفحہ ۴۳ کا بقیہ

عورتوں کے مچھلی دار پریاں بنی ہوئی ملتی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں واجد علی شاہ نے اپنے سکوں کی دوسری طرف بجائے "ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ کے" "ملک اودھ اختر نگر" لکھوانا شروع کیا۔ بادشاہ خود شاعر تھا اور اختر تخلص کرتا تھا۔ اس طرح کے سکے بہت کم ملتے ہیں کیونکہ اسی سال ضرب کے نام کی پھر تبدیلی ہوئی اور بجائے ملک اودھ اختر نگر" کے "بیت السلطنت لکھنؤ ملک اودھ اختر نگر" لکھا ہوا ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کے سکے بہت نفیس ساخت کے ہیں۔ روپیہ کے علاوہ چاندی کی اٹھنی، چونی، دونی اور اکنی بھی پائی جاتی ہے۔ سونے کے سکوں میں اشرفی اور نصف اشرفی بھی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مجاہدوں نے بھی تانبے کے سکے اودھ کی نقل پر چلائے مگر ان کی ساخت بہت خراب ہے۔

پرنس انجم قدر

شاہانِ اودھ کا عہد

باہمی اتحاد کے عُروج کا عہد تھا

"ملک میں حالیہ سیاسی اور سماجی بحران کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی، ثقافتی وراثت کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔"
یہ جواب آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے وارث پرنس انجم قدر کا تھا۔

گزشتہ دنوں پرنس انجم قدر کی ماہنامہ نیا دور کے مدیر سید امجد حسین کے ساتھ ہونے والی گفتگو قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کی جا رہی ہے:

امجد حسین: آج ملک میں جو افراتفری اور منافرت کا بازار گرم ہے آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے!

انجم قدر: دراصل آج انسان قومی مفاد سے زیادہ ذاتی مفاد کے بارے میں سوچ رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص بغیر کسی کے نقصان کی پرواہ کیے ہوئے خود فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور اپنے حصار کے باہر کسی اور کے وجود کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔

امجد حسین: شاہانِ اودھ کے زمانے میں قومی یکجہتی اور اخوت کے جذبے کو بہت فروغ تھا جس کا آج کے معاشرے میں فقدان ہو چلا ہے، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

انجم قدر: وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں تغیر اور تبدل ایک فطری عمل ہے اسی کلیے کے زیر اثر اودھ میں بھی تبدیلی آئی۔ کچھ تو اس بنا پر اور کچھ خارجی عناصر کے اثر سے ہمارے معاشرے کا نظام بدلا۔ آزادی کے بعد سے عمومی طور پر تمام ہندوستان اور خصوصی طور پر اتر پردیش کے بے شمار افراد نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور اودھ کو آباد کیا۔ ان کی فکر جُدا تھی، ان کی سوچ الگ تھی اور مختلف ماحول کے پروردہ ان افراد نے اودھ کے باشندوں پر بھی اپنا زبردست اثر چھوڑا۔ اودھ کی اس تاریخی روایت کا جس میں "پہلے آپ" کا جذبہ غالب تھا زوال ہوا اور اس کی جگہ "پہلے ہم" نے لے لی۔ اس نے نظامِ زندگی میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی فوت ہو گیا۔

امجد حسین: پرنس یہ بتایئے کہ اگر واجد علی شاہ یا شاہانِ اودھ آج کے سیاسی بحران میں اجودھیا مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کرتے تو وہ کون سا راستہ اختیار کرتے؛

انجم قدر۔ امجد صاحب! اجودھیا مسئلہ گزشتہ دنوں پہلی بار نہیں اٹھا ہے بلکہ ۱۸۵۵ء میں واجد علی شاہ کے عہد میں بھی ایک بار اجودھیا کا مسئلہ اٹھ چکا ہے۔ اس زمانے میں بھی اس مسئلے نے تنازعے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ایجنٹ نے جو بودھ بھکشو تھا، اجودھیا میں ایک مٹھ کی تعمیر کرا کے وہاں پر مذہبی تعلیم دینی شروع کی تھی اور اپنے اس درس و تدریس کے چھ مہینے گئے بعد ہی اس نے بابری مسجد کے باہر ایک مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسی مقام پر رام چندر جی نے جنم لیا تھا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں جب یہ تنازعہ آیا تو انھوں نے عدل اور

اودھ آئینۂ ایام میں

انصاف کے تقاضے کے تحت ۱۷×۲۱ کے رام چبوترے کی تعمیر کرائی تھی جس سے اودھ کی فضا مذہبی تعصبات سے محفوظ ہوگئی تھی۔ اس تنازعے سے قبل اور اس کے بعد پھر اجودھیا میں کبھی بھی نہ تو ہندو مسلمان تفریق کی بات چلی اور نہ ہی مذہبی تعصبات نے کبھی سر ابھارا۔ اجودھیا کے لوگ بہت ہی بھولے اور سیدھے تھے اور آج بھی وہ بہت ہی بھولے اور سیدھے ہیں۔ وہاں کے مہنت بھی صلح و آشتی اور امن و امان پر یقین رکھتے ہیں۔

امجد حسین: قومی یک جہتی کے لئے شاہانِ اودھ کے اور کون کون سے نمایاں کارنامے ہیں؟

انجم قدر: گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے کے لئے واجد علی شاہ نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس نے "دوئی" کا تصور ہی مٹا دیا۔ رام لیلا کے ڈرامے "رہس" واجد علی شاہ کی ایجادات ہیں۔ جب وہ "کراؤن پرنس" تھے تو انھوں نے ہندی زبان میں "کرشن کنھیا" لکھی۔ ہندی میں ٹھمری لکھی ٹھمری اور دادرا کی ایجاد خود انھوں نے ہی کی ہے۔

واجد علی شاہ کی ٹھمری "پیا بن آوت ناہی چین" آج بھی مقبول خواص و عوام ہے۔ واجد علی شاہ کرشن بھکت تھے رام اور کرشن کے وہ اسی طرح سے عقیدت مند تھے جیسا کہ کوئی ہندو ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کا ادبی کارنامہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ اردو ڈرامے کے موجد تو وہ خود تھے ہی، دوسروں کو بھی اس فن کی طرف انھوں نے راغب کیا اور امانت لکھنوی سے "اندر سبھا" جیسا ڈرامہ لکھوایا۔ شاہانِ اودھ نے ہمیشہ ہی ہندوؤں کو بڑی عزت دی۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے، جھاؤ لال، میوا رام، دیوان نوبت رائے، مہاراجہ بالکرشن، منشی بہادر بہاری لال، راجہ کندن لال اور درشن سنگھ جیسے ہندوؤں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے۔ رواداری، ایثار، محبت، قربانی، باہمی اتحاد، خیر سگالی اور اخوت کے جذبے کا فروغ جس قدر شاہانِ اودھ کے دور میں ہوا ہے اس کی مثال کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔

یہی وجہ تھی کہ ان کے دور میں عوام یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ؎

اب تو ہم جنت بھی نہ لیں گے بجائے لکھنؤ

لکھنؤ کے شیخ زادے

شیخ عبد الرحیم کی نسل سے ہیں جو قصبہ بجنور ضلع روھیل کھنڈ کا باشندہ تھا۔ نہایت افلاس اور محتاجی کی حالت میں گھر سے بتلاشِ معاش نکلا۔ دلی پہنچ کر جلال الدین محمد اکبر کی سرکار میں نوکر ہوگیا۔ ایک مدت تک نہایت جانفشانی کر کے ایسی عزت پیدا کی کہ زیر تخت شاہی منصب داروں میں کھڑا ہونے لگا بادشاہ نے شیخ عبد الرحیم کو کمال مرحمت نسوانی سے پرگنہ کورچ و لکھنؤ جاگیر میں دے دیا۔ شیخ مذکور بڑی دھوم دھام سے داخلِ لکھنؤ ہوا اور پانچ محل اپنی پانچ بیویوں کے واسطے بنوائے جسے پنج محلا کہتے ہیں اور پنج محلے کے جانبِ شمال ایک مکان دریائے گومتی کے کنارے بطور قلعہ تیار کرایا۔ اس میں ۲۶ دروازے تھے اور ہر دروازے پر دو دو مچھلیاں بنی تھیں جو کل تعداد میں ۵۲ مچھلیاں تھیں، اس واسطے اس مکان کو مچھی باون کہنے لگے تھے جو تغائرِ لہجے سے مچھی بھون ہوگیا۔ شیخ عبد الرحیم کا مقبرہ عیش گنج کے پیچھے جنوب کی طرف عیش باغ کے قریب ہے جسے نندان محل کہتے ہیں۔

(تاریخِ اودھ)

گرُوشَن لال

بیگماتِ اودھ کا درخشاں کِردار

شاہانِ اودھ اپنی شان و شوکت اور تعیش کے لیے مشہور تھے۔ فنونِ لطیفہ سے والہانہ عشق کے سبب انھوں نے مختلف وضع کی پوشاکیں، زیورات و آرائش کے ساز و سامان بھی ایجاد کیے۔ اسکے علاوہ ان کے دورِ حکومت میں فنِ تعمیر، دست کاری، صنعت اور زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ بیگماتِ اودھ اِن کاموں میں برابر کی شریک رہیں۔ ان میں حُبّ الوطنی، رعایہ پروری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اُن کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے نسائی زندگی میں بھی تبدیلی ہوئی اور ایک نئے فکر کا آغاز ہوا۔ ان خصوصیات کی حامل بیگمات نے نوابوں کے اذہان و افکار کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ اپنے اس مثالی کردار کی وجہ سے بیگماتِ اودھ نے ہندوستانی تاریخ میں اپنا وجود ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔ اس سلسلے میں کچھ بیگمات کا ذکر حسب ذیل ہے۔

نواب بیگم:۔ نواب منصور خاں نے برہان الملک کی دختر سے شادی کی تھی جنھیں نواب بیگم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سسرال میں انھیں صفدر جہاں بیگم کا خطاب ملا۔ جو بعد میں نواب بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ بہت ہوشیار خاتون تھیں ۱۷۵۴ء میں جب وہ اپنے زخمی شوہر کے ساتھ احمد شاہ کی دعوت پر فیض آباد سے دلّی جارہی تھیں۔ راستے میں ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا لیکن انھوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس راز کو راز ہی رہنے دیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے بعد نواب سے پچاس لاکھ رُپئے بطور جرمانہ وصول کیا گیا۔ جون ۱۷۹۶ء کو دورانِ نماز ان کا انتقال ہوگیا۔

بہو بیگم:۔ شجاع الدولہ کی بیگم امت الزہرہ دلّی کے وزیر خاندان کی بیٹی تھیں۔ ان کا نکاح ۱۷۴۵ء میں دلّی میں دارا شکوہ کے محل میں ہوا۔ اس یتیم بچّی کے نکاح میں شہنشاہ نے لاکھوں روپئے خرچ کئے۔ بعد میں انھیں بہو بیگم کا خطاب دیا گیا۔ دلّی سے وہ کافی مال و دولت ساتھ لائی تھیں۔ بکسر کی لڑائی میں انگریز فوج پر ہونے والے اخراجات کو بہو بیگم نے بھی پورا کیا تھا۔ وہ آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے بنے بُرج میں کچھ ماہ تک قیام پذیر رہیں۔ ان کی لکھنؤ آمد پر تمام شاہراہوں پر اشرفیاں لٹائی گئیں۔ ایک بار آصف الدولہ کے سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی انھوں نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھے روپیوں سے کی تھی ۱۸۱۶ء میں بہو بیگم کا انتقال ہوگیا اور فیض آباد کے جواہر باغ میں اُن کے ہی قائم کردہ ٹرسٹ سے ان کا خوبصورت مقبرہ بنوایا گیا۔

بیگم شمس النساء:۔ نواب آصف الدولہ کا پہلا نکاح دلّی کے دیوان خاندان کے امام الدّین خاں عرف امتیاز الدولہ کی دختر شمس النساء سے ہوا تھا۔ ۱۷۶۹ء میں فیض آباد میں ہوئی اس شادی میں ۲۴ لاکھ روپئے خرچ ہوئے تھے۔ دلّی کے شاہ عالم اور شعلہ پوری بیگم نے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ شمس النساء لکھنؤ کے شیش محل میں سات سال تک رہیں۔ بعد میں الہ آباد میں ان کا انتقال ہوگیا اور انھیں لکھنؤ میں دفن کیا گیا۔

بیگم قدسیہ محل:۔ غریب پرور قدسیہ بیگم کی رہائش گاہ چھتر منزل تھی۔ بادشاہ نصیر الدین کی اس منظورِ نظر کے پاس سے کوئی مایوس نہیں لوٹا تھا۔ معمولی خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ غریبوں کے دکھ درد سے بخوبی واقف تھیں۔ بچپن میں ایک نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر یہ بتایا تھا کہ ایک دن وہ ملکہ بن جائیں گی لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ غریبوں کو نہ بھولیں۔

بیگم ہوتے ہی قدسیہ محل نے میر انور علی کو بلا کر دس ہزار روپے کی تھیلی عطا کی۔ وہ روزانہ پانچ سو روپئے غریبوں میں تقسیم کرکے بعد ہی ناشتہ کرتی تھیں۔ وہ نہایت خوددار خاتون تھیں۔ انھوں نے بادشاہ کی کسی بات سے ناراض ہوکر سنکھیا چاٹ کر خودکشی کرلی تھی۔ ۲۱؍اگست ۱۸۳۴ء کو لکھنؤ کے ارادت نگر محلّے کی کربلا میں انھیں دفنا دیا گیا۔

بیگم حضرت محل:۔ لکھنؤ کے اکبری دروازے کے پاس چودھرائن کا امام باڑہ ہے۔ جس کی شکل اب کافی بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہیں سے حضرت محل کو لیجاکر شاہ عالم کے پری خانہ میں پیش کیا گیا تھا۔ شاہ عالم نے انھیں مہک پری کا خطاب دیا۔ برجیس قدر کی ولادت کے بعد انھیں بیگم کا خطاب دیا گیا۔ ۱۳؍فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ کے برسرِ اقتدار ہوتے ہی انھیں حضرت محل کا خطاب ملا۔ محمدی اور جلال آباد کی جاگیریں انھیں دے کر ان کی شان میں اضافہ کیا گیا۔

حضرت محل نے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے نابالغ فرزند رمضان علی برجیس قدر کو چاندی والی بارہ دری میں تخت نشین کرایا۔ شام کو تیز بارش میں ۲۱ توپوں کی سلامی کے ساتھ بیگم راج ماتا بنیں۔ اپنے بیش قیمت زیورات ملک کی خدمت میں پیش کردیے۔ جب لکھنؤ میدان جنگ بن گیا اور چنہٹ، سکندر باغ، قدم رسول، بیگم کوٹھی، ریزی ڈنسی، دلکشا قلع، جلال آباد اور عالم باغ میں زبردست جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ۷۵ ہزار دیسی قتل ہوگئے۔ بیگم حضرت محل نے جنگ کی باگ ڈور سنبھال کر انگریزوں سے بہت دلیرانہ مقابلہ کیا۔ گومتی کے دائیں کنارے پر موسیٰ باغ میں ان کی انگریزوں سے آخری جنگ ہوئی۔

ملکہ کشور:۔ یہ امجد علی شاہ کی خاص محل تھیں۔ ملکہ کشور ان کا خطاب تھا۔ وہ نہایت شرمیلے مزاج کی تھیں۔ واجد علی شاہ انھیں کے بیٹے تھے۔ ان کے محل میں تاتاری عورتیں پستول باندھ کر ٹہلا کرتی تھیں۔ وہ مختلف موسموں میں مختلف مقامات پر رہتی تھیں۔ موسمِ سرما میں چھتر منزل میں۔ موسم گرما میں چولکھی میں اور موسم باراں میں حویلی باغ میں رہتی تھیں۔ جس کپڑے کو ایک بار استعمال کرلیتی تھیں دوبارہ ہاتھ تک نہیں لگاتی تھیں۔

اب دھیرے دھیرے اودھ کے شاہی خاندان کی رسائی کلکتے کے مٹیا برج گارڈن تک ہوچکی تھی۔ کشور اپنے فرزند کو اپنے حقوق دلانے کی غرض سے وکٹوریا کے پاس جانے کی تیاری کررہی تھیں۔ نواب واجد علی شاہ اس وقت بیمار تھے ملکہ کشور اور حضرت محل (ساس بہو) کے درمیان تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ ملکہ کے ساتھ انگلینڈ جانے کے لئے ۱۱۰ افراد تیار کئے گئے۔ اس تاریخی اور غیر معمولی سفر کی تیاری میں دس لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔ کروڑوں روپئے کے تحفے وکٹوریا کو دینے کی غرض سے اکٹھا کئے گئے۔ ۱۶؍جون ۱۸۵۶ء کو کشتی جہاں کا یہ قافلہ رات کے بارہ بجے کوریا کے جہاز سے روانہ ہوا۔

۲۰؍اگست کو یہ قافلہ لندن پہونچا۔ چار لاکھ روپئے کے ساتھ ملکہ کشور نے وکٹوریا کے پاس اپنی اپیل بھجوائی۔ ملکہ کشور اور وکٹوریا کے درمیان دس ماہ تک ملاقات نہ ہوسکی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ آخر میں ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو وکٹوریا نے ایک زنانہ دربار منعقد کیا جس میں ملکہ کشور کو مدعو کیا گیا۔ آٹھ ہندوستانی زبان جاننے والی عورتوں کی مدد سے ان دونوں کے درمیان بات چیت ہوسکی۔ تحائف کا انبار لگا دیا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وکٹوریا بار بار مسافرت کی تفصیل اور بچوں کی خیریت ہی پوچھتی رہیں۔ کچھ دن بعد ہندوستان میں بغاوت کی خبر انگلینڈ پہنچ گئی۔ کانپور میں انگریزوں کے اجتماعی قتل کی خبر نے انگلینڈ کو مشتعل کردیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے وکٹوریا کے رُخ کو ہی بدل دیا۔ ملکہ کشور اس شکست سے ٹوٹ سی گئیں اپنی علالت کے سبب انھوں نے وطن واپس آنے کا قصد کیا۔ ۲۴؍جنوری ۱۸۵۸ء کو دوپہر کے وقت پیرس میں ان کا انتقال ہوگیا اور وہیں ان کی لاش کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کردیا گیا۔ ان کے مزار کے قریب فرانس کی حکومت نے ایک مسجد تعمیر کرادی۔

اس طرح اودھ کی بیگمات کی تاریخ کا بھی خاتمہ ہوگیا اور ان کے کارنامے قصہ کہانیوں میں تبدیل ہوکر کتابوں میں محفوظ ہوگئے۔

مرزا کوکب قدر

اودھ کا آخری تاجدار

واجد علی شاہ کو بربنائے عقیدت ہی اودھ کا آخری تاجدار لکھا جاتا ہے اور یہ بھی اسی عقیدت کا کرشمہ ہے کہ ذمہ دار اہل قلم نواب آصف الدولہ کی مقبولیت کو بھی نہیں بھولے۔ ان کی مملکت کے ساتھ ان کا لقب "نواب" بھی واجد علی شاہ کو تفویض ہوا اور اس نکتے پر مطلق غور نہیں کیا گیا کہ اگر مرزا محمد واجد شاہ نواب تھے تو شاہ لکھنے کے کیا معنی؟ اور اگر شاہ تھے تو نواب لکھنے سے کیا حاصل؟ ہمیں ایسے عقیدت شعار افراد سے قطعی کوئی تعرض نہیں لیکن جب ایسے افراد کے نزدیک یہ غلط نہیں کہ "نواب واجد علی شاہ" اودھ کے آخری تاجدار تھے تو مولوی نجم الغنی خاں رامپوری کے اس بیان کو تسلیم کرلتے میں کیا عذر کہ اودھ والوں میں سے نہ کسی کی نکسیر پھوٹی نہ بلدی لگی نہ پھٹکری، اور ملک آبائی چپ چپاتے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ واجد علی شاہ کو اودھ کا آخری تاجدار کہنا درحقیقت تاریخ کے صحیح تناظر سے چشم پوشی کرنا اور طنز و تعریض کے ایسے پہلو فراہم کرنا ہے کہ تہوّر اور مردانگی کے شیدائی شرم سے آب آب ہو جائیں۔ نجم الغنی خاں نے یہ بیان اس خفت کو مٹانے کے لیے انشاء کیا تھا جو شجاع الدولہ کے روہیل کھنڈ فتح کر لینے پر روہیلہ پٹھانوں کے حصے میں آئی تھی۔ روہیل کھنڈ کے معرکے (۱۱۸۸ھ) میں صرف حافظ رحمت خاں نے اپنے چند فدائیوں کے ساتھ آگ اگلتی توپ کے سامنے اپنے آپ کو یہ کہہ کر ڈال دیا تھا کہ جب عزت سے جینا دشوار ہو تو بہادروں کی طرح جان دے دینا آسان ہے۔ روہیلہ تذکرہ نگار اپنے طنز سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ شجاع الدولہ کے اخلاف میں کوئی حافظ رحمت خاں بھی نہ تھا جو جان پر کھیل جاتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ ۱۸۵۷ء کے معرکوں میں اودھ کے چپے چپے پر سورج بنسی راجپوتوں کی اولاد اور سلاطین اودھ کے موروثی جاں نثاروں نے شجاعت کی روایت کو پروان چڑھایا اور اودھ کی لفظی وجہ تسمیہ "اجودھ" "غیر مفتوح"

کوئی آبرو بخشی۔ واجد علی شاہ کے فرزند برجیس قدر کی ذات و حیات میں مذکورہ بالا دونوں بیانوں کی تردید موجود ہے اور یہ مقالہ اسی لیے سپرد قلم ہے کہ جو شبہات اس سلسلے میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کا انسداد ہو جائے۔

برجیس قدر کی تاجپوشی اور تاجداری حقیقت تھی یا افسانہ اس کی چھان بین کے لیے تاریخی شواہد کا لحاظ اور آئین سیاست سے استنباط ضروری ہے کیونکہ یہی وہ کسوٹی ہے جو بے بنیاد اور بے ثبات دعووں اور ٹھوس حقیقتوں میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔

آئین سیاست کا پہلا اصول اس امر کی تحقیق ہے کہ مدعی جس حق کا طلب گار ہے وہ اس تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ انگریز اس نکتے سے بخوبی واقف تھے اور شاہان اودھ اور سلاطین مغلیہ کی اولاد میں ایسے بزرگ افراد کو جو مدعی بنائے جا سکتے تھے پہلے ہی بیلی گارد میں محصور کر لیا تھا۔ انھیں اس کا قطعی اندازہ نہ تھا کہ جس رزم آرائی سے واجد علی شاہ کے مختلف البطن بھائی دارا سطوت یہ کہہ کر منھ پھیر لیں گے کہ جب شجاع الدولہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو مجھ سے کیا ہوگا، اسی جرأت آزما منصب کو ایک فرض شناس شہزادہ اپنی وطن پرست مستقل مزاج ماں کی سرپرستی میں برضا و رغبت قبول کرے گا اور اپنی تمام زندگی اسی جد و جہد کی نذر کر دے گا۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کارخانۂ قدرت میں ایسے بلند اقبال افراد کی نشاندہی دنیا میں قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ برجیس قدر پیدا ہوئے تو توپوں کی سلامی نے ساکنان اودھ کو خبردار کیا اور ختنہ کی تقریب پر نذرانے کے اٹھارہ لاکھ روپئے انھیں باشندگان اودھ کا پہلا خراج عقیدت تھا جو اس شہزادے کے حصے میں آیا۔ یہ شہنائیاں

یہ چراغاں اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا کیونکہ جو بچے برجیس قدر سے پہلے پیدا ہوئے وہ اس زمانے کی یادگار تھے جب مرزا محمد واجد علی ولی عہد نہ تھے اور جب ولی عہد کے محل میں چراغ روشن ہوا تو خود دادا نے نام تجویز کیا۔ باپ نے ذکر کیا تو صرف اسی نومولود کے نام کے ساتھ منصب کی نشان دہی تاج بنا کے کی۔ لکھنؤ کے خاص و عام اپنے اس ہونے والے تاجدار سے ناواقف نہ تھے۔ واقعی تاج پوشی سے چھ مہینے پہلے:۔

"جس وقت شہزادے کی سواری نکلی تھی شہر کی خلقت دیکھنے بیچاری نکلی تھی۔ جو گھر سے باہر آیا جس کو سواری کا اہتمام نظر آیا رنج والم دور ہوا بے ساختہ ہر لب سے یہ مذکور ہوا: "اے پروردگار عالم و چارہ ساز بیچارگاں، حاکموں کے حاکم، اس در دولت ابد مدت کو قیام قیامت تک برقرار رکھنا۔" ہر چند اس روز کچھ سامان سواری کا نہ تھا، وہ معدودے چند جو در دولت پر مقیم ہیں وہی ہمراہ تھے اور خلف ظل اللہ تھے لیکن عجیب شان و شوکت تھی، دیکھنے والوں کو حیرت تھی۔"

آنے والے چند مہینوں میں برجیس قدر نے وہ سب کچھ دیکھا اور سنا ہوگا جس نے ساکنان اودھ کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا اور اگر برجیس قدر کے بزرگوں کی تدبر آمیز بے حسی حیرت افزا نہ تھی تو برجیس قدر کے سرفروشانہ اقدام پر حیرت کیسی؟ انگریز نا عاقبت اندیش تھے جنھوں نے واجد علی شاہ کی کھلے عام نیابت کرنے والے کو بیلی گارد میں محصور نہیں کیا اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس دفعہ بھی وہی نسخہ اپنایا جو اس سے پہلے وزیر علی خاں اور مرزا فریدوں بخت (مناجان) کے موقعے پر آزما چکے تھے۔ یعنی برجیس قدر واجد علی شاہ کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ ہمیں اس کا مسکت جواب بھی اخبار ٹائمس (لندن) کے نامہ نگار سر ڈبلیو ایچ رسل کی معرفت مہیا ہے:۔

"ہمیں اسے (برجیس قدر کو) بادشاہ کا بیٹا تسلیم کرنے میں تکلف محسوس ہوتا ہے لیکن اودھ کے وہ تعلقہ دار سردار جن کو اس حقیقت کا بہتر علم ہونا چاہئے اس پر کوئی شبہ نہیں کرتے اور اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے پر ہمہ وقت تیار ہیں۔"

آئین سیاست کا دوسرا اصول اس واقعے کا تعین ہے جس سے مختلف نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ برجیس قدر عوام کے منتخب حکمراں تھے۔ اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں۔ اختلاف اگر ممکن ہے تو اس میں کہ وہ صوبے دار تھے مثل برہان الملک کے یا نواب وزیر مثل صفدر جنگ کے۔ یا بادشاہ مثل غازی الدین حیدر کے۔ یا کسی ایسی حیثیت کے جو ان سب سے الگ ہو۔ جواب کے لیے حاکم و محکوم کے درمیان معاہدہ اہل خرد کی تشفی کا سبب بن سکتا ہے ۵ جولائی ۱۸۵۷ کو فوجی افسروں کے نمائندے شہاب الدین اور برکات احمد نے مندیل شاہی مرزا برجیس قدر کے سر پر رکھی اور یہ طے پایا کہ اس کی اطلاع بادشاہ دلی کو دی جائے۔ عرض داشت لکھی گئی تو جواب بھی مرحمت ہوا:۔

"فرزند ارجمند مرزا برجیس قدر بہادر، شاہ اودھ، آفریں ہو کہ چھوٹے سے سن میں تم نے بڑا کام کیا۔ آئندہ سے تمہارے واسطے مہر خطاب بھی بھیجی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ جو ملک قدیم تمہارا تھا اس سے زیادہ عطا ہوگا۔"

اس دستاویز کے دو فقرے خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ بہادر شاہ کا برجیس قدر کو فرزند ارجمند لکھنا نہ صرف ان کی بزرگانہ شفقت کا ترجمان ہے بلکہ اس سے سو سال پہلے کے سمدھیانہ تعلقات کی یاد تازہ ہوتی ہے جب محمد شاہ نے اپنی بیٹی امۃ الزہرا (بہو بیگم صاحبہ) کو وزیر الممالک صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ سے منسوب کیا اور ایسی یک جہتی کی داغ بیل ڈالی جو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت غازی الدین حیدر کی شاہی کے اعلان سے ختم ہوگئی۔ بہادر شاہ نے انھیں دیرینہ تعلقات کی تجدید کرتے ہوئے نہ صرف اپنے قلم سے برجیس قدر کو شاہ اودھ لکھا بلکہ سفیر کو سفیر الدولہ خطاب عطا کیا اور فرمایا ہمیں نے تاج بخشی کی ہے۔ اس توثیق کے بعد برجیس قدر کی تاجپوشی میں اگر کوئی کسر باقی تھی تو خاندان اجتہاد کے رکن اعظم سلطان العلما کے تاج پہنانے سے وہ بھی دور ہوگئی۔ ۶ اگست ۱۸۵۷ء کو آداب شاہی کا لحاظ رکھتے ہوئے شاہی کا اعلان ایک ایسی دستاویز تھی جس پر واجب التعظیم مذہبی پیشوا اور ہر دلعزیز قومی رہبر دونوں کی مہریں ثبت تھیں اور یہ تاج وہ تاج تھا جو اس سے پہلے اودھ کے کسی فرمانروا نے نہیں پہنا تھا۔

۵ جولائی کو مسند نشینی اور ۶ اگست کو تاج پوشی؟ بادی النظر میں یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اتنی عجیب بھی نہیں اگر ملحوظ رکھا

جائے کہ ہندوستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا اور اس نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنی جمہوریت کا اعلان کیا۔ ۵ جولائی درحقیقت برجیس قدر اور عوام کے درمیان عہد و میثاق کی تاریخ ہے اور ۲۰ اگست ۵۷ء ایک مخصوص طرزِ حکومت اختیار کرلینے کی تاریخ۔[۲۳] فرمانروایانِ اودھ کو تاریخ کی کتابوں میں مختلف عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے اور کوئی ایک حیثیت دوسرے پر صادق نہیں آتی۔ نوابین اودھ کہا جائے تو سلاطین اس زمرے سے خارج اور سلاطین اودھ کہا جائے تو جو نواب وزیر تھے ان کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی اور بانیِ خاندان برہان الملک نہ نواب تھے نہ سلطان صرف صوبے دار تھے جس کے بعد صوبے داری کا خاندان میں باقی رہنا ضروری نہ تھا لیکن ان کا ذکر تمام شجروں میں متوازی ہے۔ ایسی حالت میں اس خاندان کے آخری فرد کو جو پہلے فرد کی طرح امتیازی حیثیت کا حامل ہے ایسے لقب سے یاد کرنا جو اس کے بزرگوں کی میراث رہا ہے ایک تسلیم شدہ روایت کا اتباع ہے۔ برہان الملک نواب کہے جاتے ہیں تو اس لیے کہ ان کے اخلاف نواب تھے۔ برجیس قدر بادشاہ لکھے جاتے ہیں تو اس لیے کہ ان کے اسلاف بادشاہ تھے۔[۲۴]

آئینِ سیاست کا تیسرا اصول ان متعلقات کی تدقیق اور تنقیح ہے۔ جن سے کسی عمل کی تشکیل مکمل ہوتی ہے۔ کاروبارِ سلطنت کے ذیل میں اگر کوئی طاقت در گروہ کسی حق دار کو حاکم بنادے اور اس کو تاج پہنا دے تو اس کی حکومت اس وقت تک قرینِ اعتبار نہ ہوگی جب تک بیرونی طاقتوں سے اس کے تعلقات استوار نہ ہوں اور اندرونِ ملک اس کے احکام کی تعمیل نہ ہو۔

سرکارِ برجیس کی رتبہ شناسی وہ تمام طاقتیں تھیں جن کا اس وقت دور دورہ تھا اور سوائے انگریزوں کے کوئی ایک ایسا نہ تھا جو اس خودمختاری کا معترف نہ ہو۔ مغلیہ تاجدار بہادر شاہ نے سفارت قبول کر کے مہر خطاب سے نوازا۔ پیشواؤں کے رہبر ناناراؤ نے پہلے وکیل بھیجا پھر خود تشریف لائے ۱۷ پارچہ خلعت ملا۔ قبول کیا۔ فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان جنرل بخت خاں روہیلہ، شفیع اللہ خاں رئیس نجیب آباد، ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ، ظہیر علی خاں رئیس موانہ، عنایت اللہ خاں رئیس پیلی بھیت، غلام قادر خاں رئیس شاہ جہاں پور، بالاراؤ پیشوا، تانتیا توپی اپنے اپنے علاقوں کے رئیس و حاکم یہ وہ افراد تھے جو توسّل کے خواستگار بنے اور حسبِ مراتب سرکار نے سب کا خیال کیا۔ انگریزوں کا برجیس قدر کو حکمراں تسلیم نہ کرنا اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اودھ کی خودمختاری خود ان کے مفادات پر ضربِ کاری تھی اور یہ فعل بعینہٖ ایسا تھا جیسے پاکستان کا شروع میں بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنا۔ مصالحت کی صورت میں انگریز آمادہ تھے کہ برجیس قدر کو بھی وہی پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جائے جو واجد علی شاہ کو پیش کیا گیا تھا اور یہ گویا معاندانہ اقرار تھا اس شاہی کا جسے دوستانہ قبول کرلینا ان کیلیے محال تھا اندرونِ ملک قطع نظر اس خلفشار کے جس کا زمانہ کارزار میں پایا جانا قدرتی ہے۔ کوئی ایک فرد ایسا نہ تھا، جو سرتابی کی جرأت رکھتا ہو۔ زرِ تحصیل اظہار ہوتا ہے۔ عوام کی اطاعت اور خیر سگالی کا:-

"تعلق داروں نے بے طلب زرِ تحصیل بھیجنا شروع کر دیا۔
ایسی صورت بے منت کسی تسلط سلطنت میں نہ ہوئی تھی۔
اس زرِ تحصیل کی عدم رسی پر کیا کیا لڑائی اکثر ضلعے میں رہا
کرتی تھی۔"

فوجوں کو استقرارِ سلطنت سے وہی نسبت ہے جو ریڑھ کی ہڈی کو انسان کے جسم سے:-

"بعض راجہ اپنی فوج کو لے کر لکھنؤ آئے، اپنے پاس سے
خوراک دیتے تھے، بعض کو سرکار سے بھی ملتی تھی اور یہ سب
فوج ممالک محروسہ زمین دار، تعلق دار راجہ کی ایک لاکھ
پچاس ہزار پانچ سے تھی۔"

سکہ علامت ہے اختیارات کی وسعت کا سہ

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر
ناصرِ دین مرزا برجیس قدر[۲۵]

شعرا کے قصیدے عوام کے جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں برجیس قدر کے جرأت آزما اقدام پر محمد جان شاذ پیرِ دمیتر کے قصیدے کا مطلع ہے۔

ہوئی جو مریم پیماں شکن کو خواہشِ زر
اودھ کے شاہ کا عیسائیوں نے موسا گھر[۲۶]

حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر کی شاہی جو ۵ جولائی ۵۷ء سے ۱۶ مارچ ۵۸ء تک خاص لکھنؤ میں جملہ لوازمِ شہریاری کے ساتھ اور برپا ہونے کے بیس ماہ بعد تک اضلاعِ اودھ میں بصورتِ کشمکش باقی رہی اس قابل نہ تھی کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا اور اگر ایسا ہوا تو اس کا سبب حکومتِ برطانیہ کی

خوشنودی تھا جو ۱۹۴۷ء تک باقی رہی۔ برجیس قدر جیسی تاریخ ساز ہستیاں صفحۂ عالم پر بار بار نہیں ابھرتیں اور جب ابھرتی ہیں تو ان کے پیچھے نارِ شس روزگار افراد کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں کو قلق تھا کہ جب اودھ کا الحاق ہوا تو کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹی۔ کوئی مؤرخ بتا سکتا ہو تو بتا دے کہ جب اودھ فتح ہوا تو ملک کے طول و عرض میں مقتولین کی تعداد کیا ان افراد کی مجموعی تعداد سے کم تھی جو برہان الملک سے واجد علی شاہ تک استحکام سلطنت میں کام آئے؟ مرنے والوں کی تعداد کا تعین دشوار ہو تو ان جیالوں کی تلاش کر لینا کیا دشوار جو خون کے دریا میں بھی رہنما میناروں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ برجیس قدر کے فدائیوں میں شاہ آباد کے ایک مولوی محمد صاحب معرکۂ سندیلہ پر یہ طے کر کے گئے تھے کہ

"یا فتح کرونگا یا مارا جاؤنگا۔ چنانچہ اس معرکے سے منھ نہ پھیرا، پانچ ہزار مرنے والے سرفروش ساتھ تھے۔ داد مردانگی دے کر خوب لڑ بھڑ کر نام کر گئے۔"

ہردوئی کے راجہ کنور سنگھ نے انگریزی فوجوں کے نرغے میں آنے کے بعد اپنی فوج کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دیں لیکن بجائے خود ہتھیار حوالے کرنے کے انگریز کمانڈر کو جواب دیا:۔

"یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے اور انہیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں خود برجیس قدر کے ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں"۔

اور تن تنہا شمشیر بکف گولیوں کی باڑھ میں آنا فاناً مارا گیا۔

شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ نے اپنا قلعہ بغیر مزاحمت جنرل ہوپ گرانٹ کے حوالے کیا تو وہ سمجھے مصالحت پر آمادہ ہے۔ رانا نے جواب دیا۔

"میں اپنے قلعے کی مدافعت سے معذور تھا۔ آپ کے حوالے کر دیا لیکن میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے"،

نیپال کی ترائی میں سر گباشی رانا نے اپنے ناموس کو حضرت محل کی سرپرستی میں دیدیا اور اپنا مال و متاع اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھ کر اجازت دی کہ جس کا جو جی چاہے لے اور چلا جائے اور مردانہ وار مرنے کی آرزو رکھتا ہو ساتھ آئے:۔

"ڈھائی سو جوانوں میں سے صرف دو نے راہ فرار اختیار کی۔ باقی سب رانا کے ساتھ اسی گھاٹی میں جان پر کھیل گیے۔"

حیات مستعار کے چند روز جو رانا نے اپنی عورتوں کو بخش دئے وہ بھی اسی دلی لگاؤ کا مظہر ہیں جو رانا کو اپنے جواں سال بادشاہ اور راج ماتا سے رہی ہوگی۔ ورنہ غیرت دار راجپوتوں کی رسم سے کون واقف نہیں کہ جب وہ مرنے پر کمر باندھتے ہیں تو ان کی عورتیں ان سے پہلے جوہر ہوتی ہیں۔ رانا جانتا تھا۔ اور خوب جانتا تھا کہ جن کی سرپرستی میں چھوڑ رہا ہے وہ وہ ہیں جنھوں نے راجہ مان سنگھ کو اپنی فرزندی میں لیا اور ملبوس خاص انعام دیا تھا۔ اگر کوئی آنچ آئی تو ان پر پہلے آئے گی۔ پھر کوئی راجپوت عورتوں کا بال بیکا کر سکے گا۔

سرفروشی اور حب الوطنی کی ایسی درخشاں مثالیں۔ یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے یہ انمول رتن اپنی نسل کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونۂ عمل۔ یہ انہیں مجاہدوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صرف گیارہ دن کے اندر انگریزی عملداری کے سارے تانے بانے توڑ کر اودھ انگریزوں کے شکنجے سے آزاد ہو گیا۔ اور اگر انھیں شکست نصیب ہوئی تو اس سے ان کی پامردی پر حرف نہیں آتا کیونکہ جس فوج نے ان پر یورش کی تعداد اور اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج کبھی صف آرا نہیں کی تھی۔ ایسی عظیم فوج کی لشکر کشی پر شاہی فوجیں فوراً سپر ڈال دیتیں جب بھی تعجب نہ ہوتا لیکن:۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملے کا رخ چولکھی کی جانب ہے حضرت محل کسی طرح چولکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں

حملہ آوروں کا بیان ہے کہ:۔

"ایک ایک انچ زمین پر سخت لڑائی ہوئی اور اہم مقامات بیگم کوٹھی، سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ وغیرہ پر سپاہیوں کی لاشوں پر سے گذر کر قبضہ ہو سکا۔"

سکندر باغ کے ایک مقام پر زخمیوں اور مقتولین کا:

"یہ بھیانک ڈھیر تقریباً ایک گز یا اس سے بھی کچھ زیادہ اونچا تھا۔"

انگریز سپہ سالار کولن کیمپل کے الفاظ میں:

"اس سے زیادہ بہادری کبھی نہیں دیکھی گئی"

خوش نصیب اس آخری تاجدار کے جس پر نچھاور ہونے والے وفاداری اور جوانمردی کے ایسے نقش یادگار چھوڑ گیے جو خفتہ صلاحیتوں کو بیدار اور مردہ دلوں کو آمادۂ پیکار کرتے رہیں گے۔ ان جیالوں کی آرزو تو یہ تھی کہ بیلی گارد کی گڑھی جو اودھ کی پاکدامنی پر ایک کلنک کا داغ بنی ہوئی تھی اس کو زمین کے برابر کر کے وہاں تالاب بنائیں اور برجیس گڑھ اس کا نام رکھیں۔ ان کی یہ حسرت تو پوری نہ ہوئی لیکن لارڈ کیننگ کا یہ قول انھیں کا طرۂ افتخار بنا کہ دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت سے ہی دوچار تھی

خون میں ڈوبی ہوئی کہہ رہی ہے بیلی گارد کی زمین

ملک میں پہلے ہوئی تنظیم آزادی یہیں — فضل

عہد برجیس کی تاریخ پر پانی پھیرنے کی خاطر لوگ طرح طرح کی موشگافیاں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک برجیس قدر خورد سال تھے۔ ان کو زبردستی تخت پر بٹھایا گیا۔ ان کو اعتراض ہے کہ وہ حکومت چند روزہ تھی۔ ان کو فخر ہے کہ انگریزوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کو فکر ہے کہ اگر اس حکومت کو تسلیم کر لیا جائے تو واجد علی شاہ کی معزولی سے برجیس قدر کی تخت نشینی تک ایک خلاء رہ جاتا ہے۔ ان سادہ لوح معترضین کے اطمینان کی خاطر ان تمام ایرادات کا جواب اسی اودھ کی تاریخ میں موجود ہے۔ فریدوں بخت عرف منا جان کو جب بادشاہ بیگم نے زبردستی تخت نشیں کیا تو وہ بھی نابالغ تھے اور ان کو بھی انگریزوں نے تسلیم نہیں کیا اور ان کی شاہی کی مدت چند ساعت سے زیادہ نہ تھی لیکن اودھ کے سرکاری کاغذات میں ان کا نام اپنے باپ کے پاس نام ہے۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ ہزیمت خوردہ اودھ سے دوبار اسی طرح بے سروسامان رخصت ہوئے جیسے ہمایوں عہد شیر شاہ سوری میں ہندوستان سے لیکن ان دونوں ریاستوں کی تقویم میں اجمالی بیان کے موقعے پر اس خلاء کی نشاندہی نہیں کی جاتی۔

توتی خامن، یازدہ سالہ فرعون مصر، سے سرزمین ہند کی چھوٹی بڑی لاتعداد ریاستوں کے نابالغ حکمرانوں تک ہندوستانی مورخین کا طریق کار تاریخ نویسی کے اصولوں سے کچھ بھی مختلف نہیں اور اگر اتباع کے لیے تاریخ انگلستان ہی سند ہے تو ایڈورڈ پنجم گیارہ برس کی عمر میں تخت نشیں ہوا اور صرف گیارہ ہفتے اپنے چچا کے حراست میں بسر کر کے پراسرار حالات میں ہلاک ہوا۔ ایڈورڈ ہشتم نو برس کا تھا جب تخت و تاج کا وارث بنا اور پندرہواں سال بھی ختم نہیں ہوا تھا جو موت نے سایہ ڈالا۔ دم مرگ اپنی عزیز لیڈی جین گرے کو اپنا جانشین نامزد کیا لیکن یہ حکومت دس دن سے زیادہ آگے نہ بڑھی مستند کتب تواریخ میں یہ تینوں افراد بہت ساری بے ضابطگیوں کے باوجود اسی انگریز قوم کے حکمراں درج ہیں جو ہندوستان میں یہ حق ہندوستانیوں سے چھین لینے کے لیے برسرپیکار رہی اور ہم آج بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے اس پرچم کو فراموش کرنے کے لیے آمادہ ہیں جس کو سربلند رکھتے ہوئے ہمارے اسلاف نے انگریزی سامراج کا مقابلہ کیا اور اپنا سب کچھ تج دیا۔

خوردسالی اور زبردستی تخت پر بٹھا دینا! یہ باتیں اس لیے بھی کچھ اور تشریح کی محتاج ہیں کہ ممتاز محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے تخت نشینی کے وقت برجیس قدر کی عمر دس برس بتائی ہے اور اسے خود واجد علی شاہ کی "سلطنت کا سلسلہ" بیان کیا ہے۔ سلسلے کے بارے میں کچھ کہنا ایک طویل بحث کو دعوت دینا ہے لیکن عمر کا فیصلہ خود واجد علی شاہ کے تین بیانات سے دو جملوں میں ہو جاتا ہے۔ مرحوم ان تینوں بیانات اور ان کے سنہ تصنیف سے بخوبی واقف تھے۔

ہوئے شاد جنت کا مکاں سن کے حال ... الخ — مثنوی عشق نامہ

تیرہ چودہ برس کا ہے خوش تر — مثنوی بحر مختلف

وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں — مثنوی حزن اختری

"نواب رمضان علی" برجیس قدر کا تاریخی نام (۱۲۶۰ھ) ہے۔ رمضان

۵۹ = ۱۰۹۱ = ۱۱۰

۱۲۷۳ھ میں سن تیرہ برس ہو یا دس؟ اور رجب ۱۲، ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو تخت نشیں ہوئے تو سن چودہ برس ہوا یا کچھ اور۔ ۹۔ برجیس قدر کے سن کے تعین کا ایک دوسرا راستہ وہ خطابی نام "مرزا برجیس قدر بہادر" ہے جو امجد علی شاہ نے عطا کیا تھا اور جس کا ذکر واجد علی شاہ نے عشق نامہ میں کیا۔ اور اس پورے نام "برجیس قدر مرزا محمد رمضان علی ۱۲۶۰ھ" کا ہے نقشی یشب مع انگشتری کے خاندان میں آج بھی موجود ہے۔

سن کی بابت ایسی واضح شہادت کے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سن کیا تھا۔ رہا یہ امر کہ ایسا کم عمر شہزادہ ایسے پرآشوب زمانے میں حکمراں بنایا بھی جاسکتا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ اسی مجلس شوری نے غور و خوض کے بعد کیا جسے حضرت محل کے ایما پر اسی مقصد کے لیے طلب کیا گیا تھا:

"افسروں نے باتیں شروع کیں، کوئی کہتا تھا لڑکا بہت چھوٹا ہے۔ کوئی کہتا تھا خوبصورت ہے۔ اس سے کام کیا ہوگا۔ کوئی آواز کرنے لگا کہ تم عیش و عشرت سے محو ہو کر غافل نہ ہو جانا ہم تم کو سلطنت دیتے ہیں"۔

شہنشاہ اکبر کی عمر بھی تخت نشینی کے وقت تقریباً چودہ برس تھی۔ ہاتھی پر فوج کا معائنہ کرتے

"سپہ سالار بیرم خاں ان کے پشت پناہ تھے"۔

برجیس قدر اتنے بے دست و پا بھی نہ تھے کہ محل سے باہر قدم نہ نکالیں۔

"ایک دن سب افسروں اور تلنگوں کو بلوایا۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ ۲۱ توپ سلامی کی چلی، آہستہ آہستہ سمجھانے لگے کہ اے بہادرو! ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ خوب لڑتے ہو، مگر ہمیں ایک بات کا رنج ہے کہ تم شہر کو لوٹ رہے ہو اسے موقوف کردو ورنہ سب رعایا بددعا کرے گی۔ افسروں نے دست بستہ عرض کی جناب عالی اب شہر نہ لٹے گا"۔

واجد علی شاہ نے اس واقعے سے چند ماہ پہلے اپنے اسی کم سن شہزادے کو اپنی نیابت تفویض کی تھی:

"۱۳، ربیع الآخر ۱۲۷۳ھ جمعہ کے دن مع دم صاحب عالم مرزا برجیس قدر بہادر حسب الحکم حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ جناب محمد العصر کے مکان پر تشریف فرما ہوئے۔ رسم تعزیت بآئین شائستہ ادا کی۔ ورثا دجناب میرن صاحب کی دل جوئی فرمائی۔ خلعت عطا ہوئی"۔

رزم و بزم دونوں موقعوں پر اپنے اور غیر سب کی نظریں اسی خورد سال شہزادے کو تلاش کرتی رہیں اور یہ موقعے وہ تھے جب بادشاہ کے پھوپھا چچا، بھائی، بیٹے بھتیجے سب موجود تھے۔

نپولین نے اپنی شہرت اور عظمت کو اپنی ماں کا رہین منت بنایا تھا۔ برجیس قدر اپنی ماں کے نپولین سے کہیں زیادہ رہین منت تھے۔ جو پندرہویں صدی کے فرانس کی جون آف آرک کی طرح انگریزوں کے تسلط کو للکارتی اور پژمردہ دلوں کو گرماتی مثل شہاب ثاقب کے پردہ گمنامی سے نمودار ہوئیں اور اودھ کے طول و عرض میں آزادی کی روح پھونک گئی۔ گرڈیے کی سترہ سالہ لڑکی جون آف آرک کو انگریزوں نے ڈائن قرار دیتے ہوئے زندہ جلا دیا تھا۔ حضرت محل انکے بس میں آجاتیں تو وہ بھی شاید دیوار میں چن دی جاتیں لیکن جب ایسا ممکن نہ ہوا تو کردار کشی کی خاطر ایسی من گھڑت باتوں کو رواج دیا گیا کہ لوگ ایسی بدکار عورت کو راج ماتا، حضور عالیہ اور ملکۂ اودھ کہتے ہوئے شرم محسوس کریں۔ برٹش انٹلی جنس کی رپورٹیں کہ حضرت محل کون تھیں، کیا تھیں ان کا گھر کہاں تھا، اصلی نام کیا تھا؟ آج بھی صیغۂ راز میں ہیں۔ وہ تصویر جسے آزاد ہندوستان کی حکومت نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ سرکاری مطبوعات اور ڈاک کے ٹکٹ پر شایع کیا اس کے بارے میں بھی شک کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ واقعی حضرت محل کی تصویر ہے کیونکہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے وہی معشوق ہے جو خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد رکھتا ہے۔

ہم حضرت محل کے اولین قرین اعتبار تعارف کے واجد علی کو ہی زحمت دیتے ہیں کہ حضرت محل نے اپنے شباب کے تقریباً ۱۰ سال اسی تلون مزاج تاجدار کی شریک حیات کی حیثیت سے بسر کرکے اپنی رفاقت کا ایسا نقش یادگار چھوڑا کہ بادشاہ مدت العمر فراموش نہ کر سکے۔ تخت نشینی کے حضرت محل کا شمار خاص محل کے فوراً بعد دوسرے نمبر پر کیا گیا تھا۔ حضرت محل کے میدان کارزار گرم کرنے کے بعد کہ اس سے بادشاہ کے مفاد کو ٹھیس پہنچی تھی وہ پچیسویں نمبر پر آ رہیں

زوجۂ پچیسویں جو میری ہے — وہ بت مہ جبیں جو میری ہے
اے انگریز فوج گھیرے ہے — خنجر غم جگر پہ پھیرے ہے

اتار چڑھاؤ کی اس عارضی کیفیت سے قطع نظر بادشاہ نے جس طرح سبطین آباد، رہین منزل، عشق منزل اور مطیع سلطانی نامی عمارتیں عہد شاہی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کلکتہ میں دوبارہ تعمیر کرائیں اسیطرح حضرت محل کی دائمی مفارقت کا یقین ہوجانے کے بعد ایک شریف النسل خاتون کو جو حضرت محل سے یقیناً کچھ مشابہت اور مماثلت رکھتی ہوں گی اپنی زوجیت کا شرف بخشا وہ حضرت محل

خطاب عطا کیا۔ بیگمات کی صورت اور سیرت نگاری میں جو غزلیں شیوع فیض کا جزو ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محل نے شمشیر و سنان کی جھنکار سے قبل طاؤس و رباب کی منزل کم سے کم دو خط ایسے بھیجے تھے جن کے منظوم جواب بھی مرحمت ہوئے بادشاہ کے جواب سے چند کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

میری جان ہیں یار حضرت محل — حسینہ طرح دار حضرت محل
شہ حسن بندہ بنا ناز کا — مری ہے سزاوار حضرت محل
لکھا وصف جسم طلا فام کا — ہوئے ہم بھی زردار حضرت محل
طلب صدقے رخ پر خط یار ہو — فدا منہ بہ تا تار حضرت محل
حمیدہ خصائل، ستودہ صفات — بری رو خوش اطوار حضرت محل
مرے خط کے ہمراہ ہوں واہ واہ — تری رات کے ہار حضرت محل
گھروں پر تباہی پڑی شہر میں — کھدے میرے بازار حضرت محل
تو ہی باعث عیش و آرام ہے — غریبوں کی غم خوار حضرت محل

شروع کے چار شعروں سے ان کے کندنی رنگ، تابناک چہرے، کھڑے ناک نقشے، سیاہ بال اور حسن و جمال کا علم ہوتا ہے۔ پانچواں اور چھٹا شعر ان کی سیرت اور ذہانت کا ترجمان ہے خصوصاً رات کے باسی پھولوں کا تحفہ جو ایک طرف ان کے قدیمی نام مہک پری اور دوسری بیگمات کے تحائف دولائی، دوپٹہ، مسی، ناخن اور زلفوں کے بال کے مقابل ان کی نفاست طبع پر دال، آخری دو شعر ۵۷ء کی ہنگامہ آرائی سے قبل لکھنؤ کی تباہی کی خبر دیتے ہیں، جس کی شکایت بیگم نے کی ہوگی اور بجز غریبوں کی غم خوار کہنے کے، قہر درویش بر جان درویش، واجد علی شاہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

شیوع فیض کی وہ دوسری غزل بھی اسی مزاج کی عکاس ہے۔

جان عالم محمدی بیگم — رہو خرم محمدی بیگم
مونس شب کی خلوتوں کی جلیس — میری ہمدم محمدی بیگم
جو چھپانا تھا وہ کھولا ہے — لکھتے ہیں ہم محمدی بیگم

اس غزل کا تیسرا شعر اس لیے قابل ذکر ہے کہ جس نام کی سند دوسرے دوسرے ماخذ میں تلاش کی جاتی رہی وہ اس اقرار کے ساتھ یہاں موجود ہے کہ لکھنے والے نے یہ نام اور کہیں کبھی نہیں لکھا۔ چوتھا حضرت محل کی شعر گوئی کی گواہی دیتا ہے اور ہم اگر حضرت محل کو بھی واجد علی شاہ کی ناخواندہ بیگمات کے زمرے میں شامل سمجھیں تو ان اشعار کا کیا کریں جو یہاں بھیجے گئے۔ وہاں کے لوگوں کے پاس موجود ہیں اور اسی صفت سے متصف ہیں جس کی یہاں داد دی گئی ہے، یعنی غم انگیز بیان، مزاج آشنا۔ بیگم نے یہ خط بھانے اور کلکتہ بلائے جانے کے لیے نہیں انحر نگری کی حالت زار پر متوجہ کرنے اور لکھنؤ واپس چلے آنے کے لیے لکھے ہوں گے لیکن جب نتیجہ برعکس نکلا تو، تن بہ تقدیر بیگم نے اپنے کو اسی آگ میں جھونک دیا جو چاروں طرف لپک رہی تھی اور وہ انقلاب ظہور میں آیا جس نے قیصر باغ کی صورت ہی بدل دی۔

دلیری اور دلاوری کی اس خونچکاں تاریخ میں جو کسی شاعر بادشاہ نے نہیں ہندوستانی اور انگریز جہاں دیدہ اہل قلم نے رقم کی ہے ہمیں حضرت محل کے عزم و استقلال اور جاہ و جلال کے وہ مرقعے نظر آتے ہیں جو ان کے حسن و جمال کے تذکرے سے زیادہ دلکش ہیں اور یہی سبب ہے کہ طبقۂ نسواں میں ان کی شخصیت نہایت پرکشش سمجھی جاتی ہے[۱۱] لکھنؤ کا چو لکھی دروازہ جو حضرت محل کا مستقر تھا ۱۶، مارچ ۱۸۵۸ء تک کھنڈر بن گیا جب وہ اس سے دست بردار ہوئیں۔ کبھی فینس کبھی ہاتھی، کبھی گھوڑے پر برجیس قدر کو ساتھ لیے فوجوں کی کمان کرنا، انعام و اکرام سے ان کے حوصلے بڑھانا۔ ایک مورچہ جاتا ہے تو دوسرا مورچہ اور ایک شہر نکل جائے تو دوسرے شہر میں اپنی پسپا سپاہ کو پھر صف آرا کرنا معمولی تنظیم اور جرأت کا کام نہ تھا۔ ہر تصادم کے ساتھ ان کی طاقت میں کمی اور انگریزوں کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن حضرت محل نے جنگ ہاری تھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ نہ صرف انگریزوں کے وظیفے اور احترام شاہانہ کی پیشکش کو ٹھکراتی رہیں۔ بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے جواب میں اپنے تدبر اور فراست کی آخری دستاویز بصورت فرمان فراہم کرنا[۱۲] اور نومبر ۱۸۵۹ء تک ہمالیہ کی ترائی میں اودھ کی ہی شمالی سرحد کے اندر انگریزوں کی فوجی چھاؤنیوں پر چھاپہ مار دستوں کا انتظام کرنا[۱۳] اس جد و جہد کا پیش خیمہ تھا جو ۱۹۴۷ء میں آزاد ہندوستان کی صورت میں نمودار ہوئی کہنے کو کوئی اسے واجد علی شاہ کی سلطنت کا ہی "سلسلہ" کہے یہ اس عہد برہان الملک کی توسیع اور مملکت اودھ کی سمٹتی ہوئی بساط تھی جسے برہان الملک کی اولاد نے دلوں کو تسخیر کرتے ہوئے بچھایا اور کھویا تھا۔ واجد علی شاہ تو اس کے بعد بھی اپنی ذاتی جائیداد، وظیفے اور خزانے پر متمکن او متصرف رہے۔ "نابالغ" برجیس قدر ہی باغی قرار پائے ان کو ان کی اولاد سمیت زہر سے

سے ہلاک کرنے کی ناپاک سازش کی گئی جو ہلاک ہونے سے بچ گیے۔ وہ باپ کی جائیداد، جاگیراور گورنمنٹ میں جمع لاکھوں روپے کے پرامیسری نوٹ سے بے حق ہونے اوران کی حریت پسند غیرت دار ماں ــــــ یہ مرثیہ اپنی زندگی کا خلاصہ چھوڑ گئی سہ

حکومت جو اپنی تھی اب ہے پرائی — اجل کی طلب تھی اجل بھی نہ آئی
نہ تخت اور تختہ، اسیری نہ شاہی — مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی
وہ رتبہ جو پایا تھا ہم نے وطن میں — اسی کی بدولت ہوئی یہ لڑائی
عدو بن کے آئے جو تھے دوست اپنے — نہ تھی جس کی امید کی وہ برائی
گھڑی دو گھڑی کے یہ جھگڑے ہیں سارے — ابھی ہوگی قید الم سے رہائی
زمانہ رکھے گا پر اپنی نظر میں — میری سرفروشی میری نارسائی
اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا — پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی

لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی فلک کی ستائی ؏۳



اسے مضمون میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیاگیا:

تاریخ اودھ، جلد ۵ ۔ نجم المغنی ۔ اخبار الصنادید ۔ قیصر التواریخ جلد ۲ ۔ مثنوی عشق نامہ داستان ۔ تاریخ اقتداریہ، قلمی کتب خانۂ آصفیہ۔ مثنوی عشق نامہ ۔ واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات ۔ اخبار طلسم ۔ مائی ڈائری آف انڈین میوٹنی ۔ سر ڈبلیو ایچ رسل ۔ نظارہ لکھنؤ ۔ حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء اے ٹین ففٹی سیون ۔ عروج عہد انگلشیہ ۔ تاریخی شہ پارے ۔ ۵۷ء کے ہیرو ۔ سیدہ انیس فاطمہ ۔ تاریخی شہ پارے، مرزا اظہر علی برلاس ۔ فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش، جلد ۱، ص ۳۵۳ ۔ واجد علی شاہ کی مٹیا برج کی اولاد کا سپاسنامہ بنام صدر جمہوریہ ہند ۱۹۶۲ء ۔ تقویم سلطانی ۱۲۶۵ھ ص ۶۵ ۔ دی آکسفورڈ اینڈ کیمبرج برٹش ہسٹری ۔ سلطان عالم واجد علی شاہ ۔ تقویم سلطانی ۱۲۶۵ھ ص ۵۴ ۔ اخبار طلسم (لکھنؤ) مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء ۔ تقویم سلطانی ۔ مثنوی بحر مختلف ۔ اودھ پلشن پیپرز ۔ حزن اختر (شرر کا مقدمہ) اودھ اخبار (لکھنؤ) ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء ۔

حواشی

۱؎ یہ درحقیقت موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں والی گجرات کی صاجزادی تھیں۔ موتمن الدولہ کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی اس لیے محمد شاہ نے اپنی لڑکی بنایا اور اپنے محل میں پرورش کی۔ خود ہی نسبت طے کی اور خود ہی جہیز بھی دیا۔ باپ نے اپنی لڑکی کو جو کچھ دیا بطور تحفہ دیا۔ اور جب ایک صوبے دار نے اتنا کچھ تحفے میں دیا تو باقی بیس صوبوں کے صوبیدار سب اسی طرح ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ یہ ابتدا تھی اودھ کے اسس ضرب المثل خزانے کی جو شجاع الدولہ سے برجیس قدر تک ہر برے وقت میں کام آیا۔

۲؎ برجیس قدر کی منکوحہ جنہیں نیپال کے کسی رئیس کی لڑکی بتایا گیا ہے (ملاحظہ ہو نئی قدریں خاص نمبر، حیدر آباد (پاک) اپریل ۱۹۵۰ء ص ۸۰) نکاح نامے کی روسے ایک ترکی النسل پناہ گزیں مرزا داؤد بیگ کی بیٹی اور بہادر شاہ کی نواسی تھیں۔ صاحب النسا بیگم نام تھا۔ حضرت محل نے اپنی بہو بناکر مہتاب آرا نواب اختر بہو بیگم صاحبہ خطاب دیا اور دلی کے شاہی خاندان سے سمدھیانے تک از سر نو تجدید کی۔ مہتاب آرا بیگم بادشاہ کے سلام کو مٹیا برج بھی گئی تھیں (دیکھیے نیا دور، لکھنؤ اگست ۱۹۵۷ء، ص ۴۳-۳۸) ــ ۱۹۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ امام باڑہ سبطین آباد مبارک مٹیا برج میں اپنے شوہر کے سرہانے دفن ہوئیں۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں انکی ایک طبعزاد داستان کا ناقص الآخر نسخہ محفوظ ہے۔

بہادر شاہ ظفر اگر تاج بخشی نہ کرتے جب بھی ان کا انجام اس سے مختلف نہ ہوتا جو ہوا لیکن مظفر الدولہ جنھوں نے دلی میں برجیس قدر کے سفیر کو مہمان رکھا تھا اسی خطا پر لقمۂ اجل ہوئے۔ (قیصر التواریخ، جلد ۲ ص ۴۴۸-۴۴۹) اور سلطان العلماء کی تیس لاکھ معافی کی جاگیر ضبط ہوئی (نظارہ حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء ص ۶ (اور ص ۷۳)

۳؎ برجیس قدر کے ان دونوں ادوار کی مہروں میں بھی فرق ہے پہلے کی تقریباً چوکور مہر میں صرف نام کندہ ہے، دوسری مہر اگر وہ مہر نہیں ہے جس کا بہادر شاہ نے اپنے شقہ میں وعدہ کیا تھا تو یقیناً وہ یہ مہر ہے جس کا تواریخ نادر العصر ص ۱۲۵ پر ذکر ہے۔ اس مہر کی پیشانی پر مچھلیاں تھیں

اٹھائے ہیں جس میں "نصر من اللہ و فتح قریب" درج ہے اور اندرون مہر یہ عبارت کندہ ہے۔ " برجیس قدر محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ ۱۲۷۳ھ "

ع۴ جن چند کتابوں میں برجیس قدر کا نام آخری فرمانروا کی حیثیت سے درج ہے۔ ان میں " دت رائے چودھری اور مجمدار " کی تالیف " این ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا " آزادی سے چند سال قبل شایع ہوئی اور برٹش میوزیم کے نیشنل ہیریٹیج کے شعبہ میں صرف اسی کتاب کو ہندوستان کی نمائندہ تاریخ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میوزیم کا کیٹ لاگ " دی کوئنیس آف دی کنگس آف اودھ " حکومت برطانیہ کا مرتب کردہ ہے اور ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس نام کو نظر انداز کریں۔ جس کے سکے اگرچہ نایاب ہیں لیکن موجود ہیں۔ قیصر التواریخ کے مؤلف نے بوجوہ اس بادشاہی کو جبری اور مصنوعی بتایا ہے لیکن اس نام کو وہ بھی نظر انداز نہ کر سکے۔ قدیم ترین ماخذ میں قیصر التواریخ سے زیادہ معتبر اور جامع کوئی کتاب نہیں ہے۔

ع۵ علاوہ گنج شائگاں جلد ۱ ص ۱۱ کے جہاں صرف تین شعر اور مختلف برجیسی سکوں کے درج ہیں اسٹنڈرڈ کیٹلاگ آف ورلڈ کوائنس (مرتبہ آر۔ بروس مطبوعہ کروز پبلیکیشن، دس کونسن، امریکہ، ایڈیشن ۱۹۸۸ء) صفحہ ۴۴۰، پر تانبے، چاندی اور سونے کے ۶ سکوں کی تفصیل اور ایک کی تصویر مع اوزان درج ہے۔

ع۶ تذکرہ آب بقا ص ۵۰، پر صرف ۴ شعر مزید اس قصیدے کے درج ہیں۔

ع۷ مزید تفصیل کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ملاحظہ فرمائیے۔

ع۸ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کاغذات چند سال پہلے تک لکھنؤ کے مال خانے میں تھے۔ بمبئی کے ایک پروڈیوسر جو حضرت محل پر کوئی فلم بنانا چاہتے تھے اور اخبارات میں بھی اس فائل کا چرچا ہوا انھوں نے کسی طرح وہ کاغذات اپنی تحویل میں لے لیے۔ حضرت محل کے اصلی نام محمدی کی اس ذریعے سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ باپ کا نام میر غلام حسین اور وطن فیض آباد درج تھا۔

ع۹ جو تصویر ۱۸۵۷ء میں ہی اخبار ٹائمس، لندن، میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں صد سالہ یادگار کے موقعے پر حکومت ہند کے کارندوں نے اس کی زیریں عبارت سے بے نیاز " ۱۸۵۷ء پکٹوریل " میں جگہ دی اور حضرت محل کو واجد علی شاہ کی پہلی بیوی قرار دیا۔ ہفت روزہ " لیل و نہار " (لاہور ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء، ص ۲۰) نے اس تصویر سے مختلف تصویر شایع کی اور ان دونوں قلمی تصویروں کا ایک تیسری قلمی تصویر سے موازنہ کیجیے جس نے واجد علی شاہ کے ذاتی نسخے عشق نامہ (مصور) میں جگہ پائی تو یہ اختلاف اور بھی نمایاں نظر آئیں گے۔

ع۱۰

زن و فرزند و اسباب و ریاست لوٹ لے ظالم

رکھے گی روز محشر تک زمیں ایک تار تار اپنا

دیگر فارسی۔

بجر یار و غم دفرزند و زن و مال و منال

چند داغ اند کہ در پردہ نہاں سوختہ اند

ع۱۱ اجالا (ہفتہ وار، کلکتہ) ۲۹ ستمبر ۱۹۵۷ء، اجالا ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء، نظارہ (حضرت محل نمبر، لکھنؤ) ۱۹۶۲ء

ع۱۲ ملاحظہ ہو: انیس فاطمہ بریلوی کی ۵۷ کے ہیرو (۱۹۴۹ء)، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی " ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ " (۱۹۹۰ء) اور این سی آر ٹی کی درسی کتاب " اردو کی نئی کتاب (۱۹۹۰ء) آٹھویں جماعت کے لیے جس میں مضمون " حضرت محل "، ایڈیٹر پروفیسر ثریا حسین صاحبہ نے راقم الحروف سے لکھوایا۔

ع۱۳ یہ فرمان انگریزی دور میں ہی وی ڈی ساورکر کی کتاب " دی انڈین وار آف انڈی پنڈنس " میں شایع ہو گیا تھا (انگریزی ترجمہ) لیکن کتاب شایع ہوتے ہی ضبط ہو گئی۔ اب اردو ہندی انگریزی مختلف زبانوں، رسالوں اور اخباروں میں اس کا صحیح متن موجود ہے

ع۱۴ حضرت محل کی یہ آرام گاہ ان کی اپنی تعمیر کردہ ہندوستانی مسجد چوک گھنٹہ گھر کے صحن میں واقع ہے اور نیپال ہی وہ ملک ہے جہاں انھوں نے اپنی جلا وطنی کے تقریباً بیس برس گزارے۔

تفصیل کے لیے نظارہ لکھنؤ کا حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۹ء آج کل مارچ ۱۹۵۹ء علی گڑھ میگزین ۴۰، ۴۶ ملاحظہ فرمائیے۔

سید امجد حسین
ایڈیٹر نیا دور لکھنؤ

برجیس قدر کی ایک غزل

اودھ میں جنگِ آزادی کے شعلوں کو تیز تر کرنے میں بیگم حضرت محل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ نہ صرف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزی افواج کے خلاف ہندستانی عوام کی رہنمائی کر رہی تھیں بلکہ انھیں کی تنظیمی صلاحیتوں اور حکمت عملی کے سبب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بھی تقریباً آٹھ نو مہینے تک اودھ پر دوبارہ شاہی حکومت کا سلسلہ قائم رہا تھا۔

بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے محلوں میں سے ایک محل میں، قیصر باغ بارہ دری کے عقب میں جسے محاذی بارہ دری کہا جاتا تھا، اس کے شمالی جانب رہا کرتی تھیں۔ حضرت محل کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوا اس کا نام مرزا محمد رمضان علی خاں رکھا گیا، جسے بعد میں برجیس قدر کے خطاب سے شہرت ملی۔ ان کی پرورش پر بیگم حضرت محل نے خاص طور پر توجہ دی، جیسے انھیں احساس ہوگیا تھا کہ واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے بچھڑنے کے بعد اب ان کی ذمہ داری کا بوجھ برجیس قدر ہی پر پڑے گا۔ چنانچہ برجیس قدر کو لکھنؤ کے مشہور عالم مولوی غلام علی سے ابتدائی تعلیم دلائی گئی۔ حضرت محل کے داروغہ محل ممو خاں اور دیوان ٹھاکر پرشاد نے حضرت محل کی پوری مدد کی۔

۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا اس وقت برجیس قدر کی عمر بارہ سال تھی۔ انھیں ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کو تاجِ شاہی پہنا کر مسندِ حکومت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن انگریزوں کی سازشوں اور ہندستانی سپاہیوں کی غیر منظم جماعت کے نتائج کے زیرِ اثر انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا، اور جب ہنگامے تیز تر ہونے لگے تو وہ محمود آباد ہوتے ہوئے بونڈی (ضلع بہرائچ) چلے گئے۔ اس کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ نیپال میں قیام کیا۔ چنانچہ کٹھمنڈو ہی میں ان کی شادی کی رسم ادا کی گئی۔ ان کی بیگم کا نام نواب مہتاب آرا ہے جو آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی پرپوتی تھیں۔

اپریل ۱۸۷۹ء میں جب بیگم حضرت محل کا انتقال ہوگیا تو برجیس قدر وطن آنے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ۱۸۹۳ء میں انھیں کلکتہ میں قیام کی اجازت مل گئی۔ لیکن یہاں بھی سازشوں کا شکار رہے۔ بالآخر چند ہی مہینوں بعد یعنی ۱۴ اگست ۱۸۹۳ء کو انھیں کھانے میں زہر دے کر قتل کرا دیا گیا۔

برجیس قدر کو شعر و ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا چنانچہ وہ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ زمانے کے انقلابات نے ان کے

کلام کو تباہ و برباد کر دیا، ورنہ شاید اس میں بہت سے ایسے ادبی جواہرات مل جاتے جن سے اُردو کے شعری ادب میں اضافہ ہوتا۔ ذیل میں ان کی ایک نایاب غزل پیش کی جارہی ہے، جس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے یہاں لکھنوی غزل کا رچاؤ تھا اور انھیں یہاں کی تہذیبی زندگی سے دور ہونے کا کتنا شدید احساس تھا:

غزل

فرقت نصیب رہتا ہوں جس نازنیں سے دُور
یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دُور

رکھا نصیب نے مجھے کس نازنیں سے دُور
بھاگے ہے ہر حسین جہاں جس حسیں سے دُور

بلبل تو ہوں پر ایک گُلِ یاسمیں سے دُور
برجیس ہوں مگر بتِ زہرہ جبیں سے دُور

ہوتا نہیں اثر ترے دل میں تو سنگِ دل
یاں تیرِ آہ گزرا ہے عرشِ بریں سے دُور

ہے شکرِ کردگار عقوبات سے بچے
خالق نے کر دیا مجھے تاج و نگیں سے دُور

یارب وہ دن ہوں پھر کہ پری بے نقاب ہو
رکھوں حجاب کو رُخِ پردہ نشیں سے دُور

دستِ جنوں سے چاک گریباں ہے تا بہ جیب
ہے تار بے شمار ہر اک آستیں سے دُور

فرشِ زمیں پہ چرخِ بریں کا جواب ہو
افشاں جو ہو گئی ہے تمھاری جبیں سے دُور

تکرار ایسے لفظ کی بوسے کے وقت، واہ
لِلّٰہ آپ رکھیں زباں کو نہیں سے دُور

یوں خالِ روئے یار ہے رُخ سے علاحدہ
رہتا ہے جیسے ملکِ حبش شاہ چیں سے دُور

میں اپنا سر قدم پہ کروں گا ترے نثار
پیارے سوار ہو تو ذرا قاشِ زیں سے دُور

تن خاک تیری راہ میں سر بہرِ نذر ہے
کس طرح جاؤں جان! تری سرزمیں سے دُور

مٹی خراب ہو گئی نیپال میں مری
رہتا ہے کیوں مزارِ امامِ مبیں سے دُور

مل لوں شبِ وصال میں دل کھول کھول کر
یارب تو کر حجاب بتِ شرمگیں سے دور

کونین کی نجات ہے جس سے حصول
کیوں رہ مزارِ خسروِ دُنیا و دیں سے دُور

□□

عشرت علی صدیقی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اودھ کا محاذ

جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر حملہ اور قبضہ کر لیتا ہے تو محکوم قوم محکومی کی زنجیریں توڑنے کی کوششیں کرتی ہے۔ اس کوشش اور بدیسی حکومت کے استحصال میں قریبی تعلق اور براہِ راست تناسب ہوتا ہے۔ یہ کوشش کامیاب ہو کر انقلاب بن جاتی ہے اور ناکامی کی صورت میں غدر کہلاتی ہے۔ اسی بنا پر ہندستان کی پہلی بڑی جنگِ آزادی کو انگریزوں اور ان کے کاسہ لیسوں نے جان بوجھ کر اور دوسرے لوگوں نے بے سوچے سمجھے "غدر" کہا ہے۔ چونکہ اس لڑائی میں انگریز کامیاب ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے اور ان کی خوشامد میں بعض ہندستانیوں نے بھی آزادی کے اس جہاد اور اس میں حصہ لینے والے مجاہدوں کے بارے میں حقائق کو چھپایا اور مسخ کر کے پیش کیا۔

اودھ کے علاقے میں آزادی کی لڑائی ملک کے دوسرے زیادہ تر علاقوں سے زیادہ دیر تک چلی ــــ دہلی کے سقوط کے ۶ مہینے بعد تک! اس علاقے کی زرخیزی اور مردم خیزی کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں جائز و ناجائز فرزندوں نے اس کو زیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ہر طرح کی چالیں چلیں، بدترین قسم کے ظلم کیے، جھوٹ بولنے کی انتہا کر دی لیکن جادو ایک مرحلے پر سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور سچ جھوٹ کے ملبے سے ہمیشہ ڈھکا نہیں رہ سکتا۔

ظاہر اسباب

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے جو اسباب عام طور پر بتائے اور سمجھے جاتے ہیں وہ پوری حقیقت بیان نہیں کرتے۔ ان اسباب کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب تھے جو زیادہ گہرے اور زیادہ بڑے تھے۔ اگر اصل سبب کارتوسوں کے اندر کی چربی ہوتی تو گورنر جنرل کی طرف سے ان کارتوسوں کے استعمال کی ممانعت ہو جانے پر بغاوت سے بہت پہلے ہی یہ سبب دور ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ معاملہ صرف سپاہیوں سے متعلق تھا۔ اور فوجی اور غیر فوجی افسر اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے لیڈر تو قابلِ اعتراض کارتوس استعمال نہیں کر رہے تھے نہ ہندستانی زمینداروں اور تعلقداروں اور رجواڑوں کے جو لشکر مجاہدین سے کٹے ان سے چربی لگے کارتوس استعمال کرنے کو کہا گیا تھا۔ جو ہندو و مسلم زمیندار اس جہاد میں شریک ہو گئے ان سب کو زمین کے نئے بندوبست میں نقصان نہیں ہوا تھا بلکہ بعض کو فائدہ ہی پہنچا تھا لیکن اس فائدے کے باوجود وہ نیا بندوبست لانے والی حکومت کو ختم کر دینے کے درپے ہو گئے۔ اودھ اور دوسرے علاقوں میں جن ہندستانی حکمرانوں سے حکومت کے اختیارات چھین لئے گئے ان کی بابت کہا گیا کہ وہ اپنی عیش پرستی کی وجہ سے نظم و نسق پر ٹھیک سے توجہ نہیں کر پا رہے تھے اور ان کی رعایا ان سے بیزار ہو چکی تھی۔ لیکن رعایا کے رویے سے ثابت ہو گیا کہ وہ ہندستانی حکمرانوں سے نہیں بلکہ انگریزی حکومت سے بیزار تھی۔

اصل مقصد

اس معاملے میں کمپنی اور اس کے کاسہ لیسوں نے اودھ کے حکمرانوں کو سب سے زیادہ بدنام اور مطعون کیا ہے ــــ خاص کر آخری تاجدار واجد علی شاہ کو۔ لیکن جب جانِ عالم جلاوطنی کے سفر پر روانہ ہوئے تو لکھنؤ کے عوام اُن پر عقیدت اور وفاداری کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ جُدائی کا سوگ منا رہے تھے۔ ان کی واپسی کے لیے مندروں مسجدوں میں دعائیں کر رہے تھے اس طرح عوام کی بیزاری والے جھوٹ کا پول کھُل گیا۔ اور جہاں تک نظم و نسق کی خرابی کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری شاہ سے زیادہ ان کو دبانے اور کنڑول کرنے والے کمپنی بہادر کے افسروں پر ہے۔ جنہوں نے شاہ پر دباؤ ڈال کر انھیں راہ راست سے ہٹا دیا۔ اس چالبازی کی ایک مثال یہ ہے کہ واجد علی شاہ اپنی تخت نشینی کے بعد روزانہ شاہی افواج کی پریڈ کا معائنہ کرنے خود جنرل کی وردی پہن کر جاتے تھے اور نہ صرف دیر سے آنے والی پلٹن کو بلکہ خود دیر سے آنے والے حکمراں کو بھی دو ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ گورنر جنرل کی ایما سے

انگریز ریذیڈنٹ نے شاہ کو پریڈ میں جانے سے منع کر دیا۔

در اصل انگریز چونکہ ہندستان کی دولت لوٹنے کے لیے اس پر اپنی حکومت جمانا چاہتے تھے اس لیے وہ یہاں کی مرکزی اور علاقائی حکومتوں کو طاقتور ہونے اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے سے روک رہے تھے۔ ہندستان اس کے نزدیک سونے کی چڑیا تھا اور اودھ اس چڑیا کی گلی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اودھ اس کے جسم کا سب سے اہم حصہ گویا دل تھا۔ اس لیے اس کو کمزور اور اپنی گرفت میں رکھنے کی خاص فکر تھی۔ چنانچہ یہاں کے نوابوں کو اپنی طاقت بڑھانے سے یہ کہہ کر روکا گیا کہ انگریزی فوج ان کا دفاع زیادہ اچھی طرح کرے گی وہ اپنی فوج پر خرچ بڑھانے کے بجائے انگریزی فوج کا خرچ برداشت کریں۔ حکومت کی مشنری میں کمپنی نے اپنے آدمی کلیدی جگہوں پر بٹھا دئے اور مختلف بہانوں سے بدیسی حکومت دیسی حکمرانوں پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بنا کر انھیں اپنے اختیارات سے دستبردار ہونے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی پھر وراثت اور جانشینی کے معاملات میں مداخلت کی گئی تاکہ اپنے آدمی کو تخت نشین کرا دیا جائے۔ جب کمپنی کے افسران اور عہداروں کی بھوک زیادہ بڑھی تو انہوں نے حکمراں کی معزولی، سلطنت کے انتزاع اور براہ راست قبضے کا طریقہ اختیار کیا۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اسی شرارت کو روکنے کی ایک بڑی کوشش کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کوشش کا اصل مقصد بدیسی راج سے چھٹکارا پانا تھا۔

ریہرسل

یہ شرارت ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں بہت نمایاں ہو گئی تھی اور اس کی کاٹ کی تیاری بھی تبھی سے شروع ہو گئی تھی پونا کے نانا فرنویس اور میسور کے حیدر علی نے انگریزوں کی شرارت سے ہندستان کو لاحق خطرات محسوس کر لیے تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی شرارت کی کاٹ پر غور کیا جا رہا تھا۔ ویلور کی ۱۸۰۶ء والی بغاوت جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر برپا کی تھی ۱۸۵۷ء کے لیے ایک ریہرسل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اودھ پر ان کے حالات کا اثر پڑ رہا تھا۔ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی جنگ کا بگل بجنے سے پہلے ہی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ یہ تیاری دربار کی سطح پر نہیں بلکہ عوام کی سطح پر کی جا رہی تھی۔ پنڈت اور مولوی دھرم یدھ اور جہاد کے لیے پرچار کر رہے تھے۔ عوام کی ذہنی تربیت میں نانا صاحب اور مولوی احمد اللہ شاہ بھی مصروف تھے۔ احمد اللہ شاہ کا خاندان گوپامئو ضلع ہردوئی کا تھا مگر ان کے پردادا دکن شاہی ملازمت پر چلے گئے تھے ان کے دادا والی کرناٹک پایاں گھاٹ تھے۔ ان کے والد بھی اسی عہدے پر فائز رہے مگر احمد اللہ نے اپنے لیے وسیع تر میدان مشکل تر کام اور بلند تر مقام کا انتخاب کیا۔ ترک وطن کرکے حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں سے انگلستان گئے جہاں کی حکومت ان کو آلہ کار بنانا چاہتی تھی مگر احمد اللہ شاہ اس جال میں نہیں پھنسے۔ وہ مدراس میں ایسٹ کمپنی کی ریشہ دوانیاں دیکھ کر پہلے ہی ہوشیار ہو گئے تھے۔ کوئی ترغیب کارگر نہیں ہوئی اور وہ حج و زیارت کے لیے حجاز، عراق اور ایران کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہاں سے درویشی کا طریقہ اور جہاد کا جذبہ لے کر واپس آئے۔

پُراسرار شخصیت

ہندستان کے مختلف مقامات میں گھوم کر انہوں نے مذہبی بزرگوں عالموں اور صوفیوں کی صحبت میں خاصا وقت گزارا، دنیاوی اور روحانی معاملات کا درس حاصل کیا۔ عبادت اور ریاضت میں انہماک دکھایا۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومے۔ صاحب کشف کرامات بنے۔ پیر روشن ضمیر محراب شاہ نے خلافت عطا کی اور جہاد کی تلقین کی۔ وہ مولوی سے مدبّر اور مدبّر سے فن جنگ کے ماہر بن گئے۔ جہاد کا پہلا مرکز آگرہ بنا۔ وہاں جمعیۃ العلما قائم کی جلسوں میں جہاد کا چرچا ہوتا اور ہندو اور مسلمان جہاد آزادی میں شرکت کا عہد کرتے۔ انگریز حاکم مخبروں سے خبر پا کر پریشان ہو گئے مگر براہ راست گفتگو کے بعد کوئی مزید کارروائی نہیں کی۔ اور احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کیا۔ مستقر بدل گیا مگر گفتگو کا موضوع اور وعظ و تلقین کا انداز نہیں بدلا۔ حکام پریشان ہوئے گھر پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ عقیدت مندوں اور حق کے متلاشیوں کی حاضری گھٹ گئی۔ کوتوال کو حکام نے ڈرایا دھمکایا اس نے شہر سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔

یہی کچھ فیض آباد میں بھی ہوا جو احمد اللہ شاہ کا اگلا پڑاؤ بنا۔ جہاں سرائے چوک میں قیام ہوا اور جہاد کا پہلا معرکہ وقوع پذیر ہوا۔ یہ معاملہ فروری مارچ ۱۸۵۷ء کا ہے جب انتزاع سلطنت ہو چکا تھا اور فیض آباد پر انگریزوں کی گرفت لکھنؤ سے زیادہ سخت تھی۔ احمد اللہ شاہ اس گرفت کو توڑنے کے لیے لوگوں کو اکساتے تھے۔ ان کے ہمراہی ہتھیار بند رہتے تھے۔ انگریز کمشنر نے اسکی اطلاع پا کر انھیں پوچھ گچھ کے لیے بلایا۔ انہوں نے جانے سے انکار کیا۔ کمشنر نے خود آ کر گفتگو کی۔ ہتھیار حوالے کرنے کے لیے حکام نے بہلایا پھسلایا اور ڈرایا دھمکایا۔

اٹکو میں فوج طلب کرلی۔ مقابلے میں کئی مجاہد اور ان کے رہنما احمد اللہ شاہ زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ فوجی اسپتال میں داخل کیے گئے اور زخموں کو مندمل ہونے پر جیل بھیج دئے گئے۔ مقدمہ چلا۔ پھانسی کا حکم ہوا فیض آباد کے ہندو مسلم باشندوں کے تشویش نے طیش کی شکل اختیار کرلی۔ انگریزی حکومت کی ہندوستانی فوج بھی باغی ہوگئی۔ جیل خانے کا پھاٹک توڑ کر احمد اللہ شاہ کو آزاد کرا لیا گیا۔ انہوں نے انگریزی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد شہر کا انتظام راجہ مان سنگھ کو سونپ دیا اور خود لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ احمد اللہ شاہ کی طرح مان سنگھ بھی قریہ قریہ گھوم کر عوام کو آزادی کی لڑائی میں شرکت کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔ اور احمد اللہ شاہ کی طرف سے ان کو فیض آباد کی حکومت سونپ دیا جانا دونوں لیڈروں کے مقصد کی یکسانگی اور قریبی تعاون کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اودھ کے چیف کمشنر سر ہنری لارنس مجاہدین میں انتشار پھیلانے کے لیے جھوٹی داستانیں بیان کر کے اور مذہبی تعصب ابھار کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلانے کی جو کوشش کر رہے تھے وہ تمامتر شرارت پر مبنی تھی۔

برہم ورت کے حکمراں نانا صاحب کے ساتھ بھی احمد اللہ شاہ کا قریبی تعاون اس وقت تک قائم رہا جب تک احمد اللہ شاہ کو پوایاں ضلع شاہجہاں پور کے راجا جگنا تھ سنگھ اور ان کے بھائی کنور بلدیو سنگھ نے ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء کو دھوکے سے شہید نہیں کر دیا۔ ان دونوں نے ملک و قوم کے ساتھ یہ غداری بدیسی حکومت سے پچاس ہزار روپیہ انعام حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ اس دغابازی سے پہلے راجہ جگنا تھ سنگھ احمد اللہ شاہ کی دوستی کا دم بھرتا تھا اس لیے انہوں نے اس سے جنگ آزادی میں تعاون چاہا تھا۔ جس سلسلے میں راجا نے انھیں گفتگو کے لیے بلایا تھا۔ حالانکہ احمد اللہ شاہ کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۲۰ر مارچ ۱۸۵۸ء کو محمدی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ تاہم تاریخ میں تذکرہ بھی موجود ہے کہ احمد اللہ شاہ نے تعاون کے لیے بیگم حضرت محل کی مہر لگا کر بھیجا تھا جو واجد علی شاہ کی اہلیہ اور ان کے جانشین برجیس قدر کی ماں اور ولی تھیں۔

خفیہ تحریکیں اور تنظیمیں

اودھ کے نظام حکومت میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کی ملک بدری کا بندوبست کر کے جو تبدیلی کی تھی اس کی وجہ سے عوام کے مزاج میں بھی تیزی سے تبدیلی آگئی۔ درحقیقت کمپنی بہادر کی حرکتوں کی وجہ سے تمام ہندوستانیوں کی قومی خودداری کو ٹھیس لگی تھی۔ انقلاب کے اسباب، حالات اور آثار ملک کے کئی حصوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ خفیہ تنظیمیں قائم ہو گئی تھیں۔ کبھی چپاتی کے ٹکڑے تبرک اور پرشاد کی شکل میں تقسیم کیے جاتے اور انقلاب کی تیاری کی علامت بن جاتے اور کبھی سرخ کنول گشت کرایا جاتا جسے سونگھ کر لوگ انقلاب کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ان تیاریوں سے انگریزی حکومت بے خبر رہی۔ اس کے ہندوستانی ملازم بھی انقلاب کے منصوبے میں شریک تھے لیکن ظاہر میں وہ حکومت کے وفادار تھے خفیہ تنظیموں کے تال میل سے انقلاب کے آغاز کے لیے ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ لیکن کچھ تو حکومت کی غیر معمولی سختی کچھ عوام کے غیر معمولی جوش اشتعال اور غصے اور کچھ تنظیم کے ڈھیلے پن کی وجہ سے بعض مقامات پر بزن کا بگل بیس روز پہلے ہی بجا دیا گیا اور میرٹھ بریلی ڈویژن کے مجاہدین اپنے وہاں انگریزوں اور ان کی حکومت کا صفایا کر کے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے استحکام اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے دہلی کی طرف چل پڑے۔

اودھ کی خفیہ انجمن نے جس کا مستقر لکھنؤ میں تھا ۳۱ر مئی کی تاریخ منظور کرلی تھی۔ اور اگرچہ فیض آباد میں مولوی کے ہمراہیوں اور کمپنی کے ملازموں میں جھڑپ پہلے ہی ہو گئی تھی مگر انقلاب کے آغاز کی توپ لکھنؤ میں ۳۰ر اور ۳۱ر کی درمیانی رات کو ۹ بجے داغی گئی۔ اور سڑکوں پر کچھ لوٹ پھونک بھی ہوئی ۳۱ر مئی کو چیف کمشنر ہنری لارنس فوج لے کر انقلابیوں کو کچلنے کے لیے آگے بڑھے مگر ان کے ساتھ کی ہندوستانی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قلعبند ریزیڈنسی میں واپس چلے گئے۔ بغاوت کی آگ تیزی سے پھیلی ۱۵ میل دور سیتاپور میں ۲ر مئی کو کچھ انگریزوں کے گھر جلا دیے گئے۔ ۲ر جون کو کچھ فوجیوں نے شکایت کی کہ انھیں جو آٹا ملا ہے اس میں ہڈیوں کا سفوف ہے۔ حکام نے یہ سارا آٹا گنگا میں پھنکوا دیا۔ لیکن اگلے روز انقلابیوں نے سرکاری خزانے پر قبضہ کر لیا اور کچھ انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ سیتاپور کے بعد انقلاب کی آگ نے فرخ آباد، ملاؤں، محمدی، شاہجہاں پور، بہرائچ، گونڈہ، فیض آباد، سلطان پور اور سلونی وغیرہ میں انگریزی راج کو بھسم کر دیا۔ کانپور، جھانسی اور دوسرے کھنڈ میں بھی انقلابیوں نے ایسی ہی آگ بھڑکائی اور اس کی گرمی انگریزی حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔

انقلاب کی شدت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ عوام انگریزوں کے ہاتھوں

اپنے امرا کی ذلت پر برافروختہ تھے۔ جاگیرداری سماج میں جاگیرداروں، زمینداروں اور بادشاہ کے ساتھ عوام کی وابستگی بہت گہری ہوتی ہے۔ انگریزی راج نے ہندستانی امرا کو ذلیل کرنے کے علاوہ لوٹا کھسوٹا تھا اور ہندستانی صنعت و حرفت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ شاہی فوج کی تخفیف نے بہت سے فوجیوں کو بے روزگار کر دیا تھا۔ انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہی زیادہ تر اودھ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ مادر وطن کی تذلیل ان کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔ اور ان کے دماغ جہاد کی تلقین اور دھرم یدھ کی باتوں اور "چپاتی" اور "سرخ کنول" جیسی تحریکوں سے بہ آسانی متاثر ہو گئے۔

کانپور کا مورچہ

۳۰ اور ۳۱ مئی کی درمیانی رات میں انقلاب کی ہراول توپ دغنے کے بعد صوبے بھر میں انقلابیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں۔ ۱۰ جون تک قریب قریب پورا صوبہ آزاد کرا لیا گیا۔ صرف لکھنؤ سے انگریزوں کو نکالنا باقی رہ گیا تھا۔ کانپور کے محاصرے کو لکھنؤ کے معرکوں کی تمہید کہا جا سکتا ہے۔ اس مورچے کی اپنی بھی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ وہ پنجاب، دلی اور کلکتہ کو جوڑنے والے رسل و رسائل اور نقل و حمل کے سلسلوں میں کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔

نانا صاحب، ان کے بھائی بالا صاحب، ان کے سپہ سالار تانتیا ٹوپے اور ان کے وزیر اعظم عظیم اللہ خاں اس مورچے کی نگرانی کر رہے تھے۔ نانا صاحب نے انگریز حکام کو ایک دن پہلے نوٹس دے کر ۶ جون کو حملہ شروع کر دیا۔ اس حملے میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والے ہندستانی سپاہیوں اور نانا صاحب کے لشکر کے علاوہ شہر کے لوگ، صنعت کار، دکان دار، غرضکہ سب طبقوں اور سب فرقوں کے لوگ شریک تھے۔ دوپہر کے بعد قلعے کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ اس روز کانپور میں ایک ہزار انگریز عورتیں اور مرد تھے اور ۲۷ جون کو جب انقلاب فتح سے ہم کنار ہوئے تو انگریزوں کی طرف سے ۴ مرد اور ۵۰ عورتیں زندہ بچی تھیں۔

محاصرہ اتنا مضبوط تھا کہ باہر سے رسد نہیں جا سکتی تھی۔ قلعے کے اندر کھانے بلکہ پانی تک کی کمی ہو گئی۔ ۲۳ جون کو جو جنگ پلاسی کی سوویں سالگرہ کی تاریخ تھی انقلابی توپوں، سواروں اور پیادوں نے کانپور کا قلعہ فتح کرنے کے لیے اس پر حملہ شروع کر دیا اور ۲۵ جون ۱۸۵۷ء کو جنرل وھیلر نے قلعہ کی فصیل پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔ نانا صاحب کے وزیر عظیم اللہ خاں نے ایک قیدی انگریز عورت کے ہاتھ جنرل وھیلر کو یہ تحریر بھیجی کہ جو لوگ ہتھیار ڈال دیں گے انھیں حفاظت سے الہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔ الہ آباد اور بنارس میں اس سے پہلے انگریزوں نے انقلابی سپاہ اور عوام پر زبردست مظالم کیے تھے۔ کانپور کے محاصرے کے وقت ان دونوں اور کئی دوسرے مقامات سے مظلوم اور ان کے رشتہ دار مظالم کا بدلہ لینے کے لیے کانپور آ گئے تھے۔ اگرچہ نانا صاحب نے انگریز قیدیوں کو الہ آباد لے جانے کے لیے کشتیوں اور کھانے پینے کے سامان کا انگریزوں کے حسب الطلب بندوبست کر دیا تھا۔ پھر بھی قافلے کو روانگی کا سگنل ملتے ہی قیدیوں کا قتل عام شروع۔ لیکن جو عورتیں اور بچے نانا صاحب کی قید میں تھے انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا۔

اس مورچے کے بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۲۸ جون کو جب نانا صاحب نے انگریزی راج پر ہندستانیوں کی فتح کے اعزاز میں دربار کیا تو ان کے توپ خانے نے سب سے پہلے شہنشاہ دہلی کے اعزاز میں سلامی کے ایک سو ایک گولے داغے۔

لکھنؤ کے معرکے

کانپور کی فتح نے لکھنؤ میں انقلابیوں کے حوصلے بڑھا دیے وہ چنہٹ کی طرف چل پڑے۔ انگریز چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے آگے بڑھ کر لوہے والے پل پر صف بندی کی۔ انہوں نے کچھ مواضعات بھی فتح کر لیے ان کے پاس اسلحہ نسبتاً زیادہ تھے لیکن انقلابیوں کے جوش اور جذبے نے آگے بڑھتی ہوئی بدیسی فوج اور اس کے دیسی حاشیہ برداروں کو زبردست نقصان پہنچایا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ریذیڈنسی میں جا چھپے اور سر ہنری لارنس نے مچھی بھون سے بھی اپنی سپاہ وہیں منتقل کر لی۔ ۳۰ جون کے اس معرکے میں انقلابیوں کی رہنمائی احمد اللہ شاہ کر رہے تھے۔

دوسرے معرکے میں مجاہدین نے ریذیڈنسی کے بیلی گارد والے پھاٹک پر حملہ کیا۔ ۲۰ جولائی کو گولہ باری اچانک رک گئی اور دیوار کے نیچے بارود کی سرنگوں کے زبردست دھماکوں کے بعد کئی سمت سے دشمن پر ہلہ بول دیا گیا۔ اس معرکے میں اگرچہ انقلابیوں کو کامیابی نہیں ہوئی تاہم انہوں نے دو انگریز چیف کمشنروں سر ہنری لارنس اور میجر بینکس کو جب لیا۔ ان کی اپنی صفوں کے سپہ سالار احمد اللہ شاہ بھی زخمی ہو گئے اور شدید نقصان کے باوجود پالا انگریزوں کے



ہاتھ رہا۔ لیکن وہ اس لائق نہیں رہے کہ محاصرہ توڑ کر ریزیڈنسی سے باہر نکل سکیں۔ انہوں نے کانپور سے مدد منگوائی اور وہاں سے خبر آئی جنرل ہیولاک کمک لے کر ۵۔ ۶ دن میں لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ ہیولاک نے اس مقصد کے لئے ۲۹ر جولائی کو گنگا پار کر لی۔

ان کی روانگی کی خبر پا کر نانا صاحب نے اودھ کو خیرباد کہہ کر کانپور کا رُخ کیا۔ ان کی نقل و حمل کی خبر پاکر ہیولاک منگلور کی طرف ہٹ گئے اور مجاہدین نے اس علاقے میں بشیرت گنج فتح کر لیا۔ اس پر قبضہ چند دنوں میں تین بار بدلا۔ لیکن فیصلہ کن اور مستقل کامیابی جنگ کے کسی فریق کو میسّر نہیں ہوئی۔ اس اثنا میں نانا صاحب بٹھور کی طرف سے کانپور پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ اور جنرل ہیولاک کو جنرل نیل نے کانپور واپس بُلا لیا۔ انہوں نے کمپنی کی اعلا کمان سے جو کلکتہ میں تھی کمک کی درخواست کی تاکہ لکھنؤ جاکر ریزیڈنسی کا محاصرہ توڑ سکیں لیکن کمک آنے سے پہلے ہی لکھنؤ جانے والی فوج کی کمان ان سے لے کر سر جیمس ووٹرم کو دے دی گئی۔ البتہ ووٹرم اپنی مرضی سے ہیولاک کی ماتحتی میں کام کرنے لگے۔ اور ۲۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ووٹرم، نیل اور ہیولاک تین ہزار دو سو پچاس افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ جس میں بارہ سو دیس سے دغا کرنے والے دیسی فوجی تھے عالم باغ پہنچ گئے۔ وہیں انگریزی فوج کو دہلی کے دوبارہ فتح ہو جانے کی خبر ملی اور ہیولاک کی سپاہ نئے ولولے کے ساتھ لکھنؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ ۲۵ر ستمبر کو وہ چارباغ میں تھی۔

ریزیڈنسی کے مورچے پر ۸۰ دن کی لگاتار جنگ میں سات سو جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ تقریباً پانچ سو انگریز اور چار سو ہندستانی ابھی زندہ تھے اگرچہ ان میں کچھ زخمی بھی شامل تھے۔ اور ہیولاک کے ساتھ جو کمک بھیجی گئی تھی اس کے ۷۲۲ آدمی کمک کے ریزیڈنسی پہنچنے سے پہلے کام آچکے تھے۔ اس مورچے پر انگریزوں کی عزّت بلکہ ہندستان میں ان کے وجود کا انحصار تھا اسی لئے کمانڈر انچیف سر کولن کیمپبل خود کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ پنجاب، مدراس اور ملک کے دوسرے حصّوں کے علاوہ نیپال سے بھی کمک منگالی گئی اور بحری دستہ بھی الٰہ آباد سے ناؤوں پر کانپور لایا گیا۔

جہاد کا فریضہ

سر کولن ۳ر نومبر ۱۸۵۷ء کو کانپور ۹ر نومبر کو عالم باغ پہنچے۔ ۱۴ر کو لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی۔ ۲۶ر دسمبر کو ریزیڈنسی کا محاصرہ ٹوٹ گیا۔ باہر سے آنے والی فوج محصور فوج سے مل گئی۔ مگر مجاہدین نے ہار نہیں مانی ہتھیار ڈالے۔ کانپور کے علاقے میں نانا صاحب اور اودھ میں احمد اللہ شاہ آزادی کے متوالے محبانِ وطن کو ساتھ لے کر انگریزی فوج کو ہراساں کرتے رہے۔ اور انگریز جنرلوں کو چھکّے چھڑاتے رہے۔

جب انقلابیوں کی کامیابی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تب بھی وہ جہاد کو ایک فریضہ مان کر ملک کے دشمنوں سے لڑتے رہے۔ جب لکھنؤ میں انگریزی فوج اور اس کے ہندستانی پٹھوؤں نے غدر مچا دیا، ایک کے بعد ایک قلعہ اور مورچہ فتح کر لیا ــــــــ سکندر باغ، دل کشا، قدم رسول، شاہ نجف، بیگم کوٹھی وغیرہ وغیرہ اور آخر میں خاص قیصر شاہی پر چھاپہ مارنے کے لیے قیصر باغ پر حملہ کیا تو انقلابیوں نے اپنے بادشاہ اور ان کی ماں کو دشمن کے نرغے سے نکالنے کا بندوبست کر لیا۔ کرنل ہوپ گرانٹ نے ان کا پیچھا کیا مگر احمد اللہ شاہ نے پیچھا کرنے والی فوج پر پیچھے سے حملہ کر کے اسے اُلجھا لیا۔

اس کے بعد بھی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کے محلّے سعادت گنج میں مورچہ بنایا۔ انگریزوں نے سوچا کہ وہ انھیں اس جگہ گھیر کر ہلاک یا گرفتار کر لیں گے مگر یہ عظیم مجاہد ایک مرتبہ پھر نرغۂ اعدا سے بچ نکلا۔ اور اس کے بعد بھی سیتاپور اور شاہجہاں پور کے ضلعوں میں مجاہدوں کی تنظیم اور جہاد کی سرگرمیوں میں صحت کی خرابی کے باوجود مصروف رہا۔ لکھنؤ کی لڑائی کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ ہندستان بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے سر کاٹنے والا انگریز افسر ہڈسن اسی شہر میں مجاہدین کے ہاتھوں ۱۰ر مارچ ۱۸۵۸ء کو مارا گیا۔ اس طرح اودھ کا محاذ گویا دہلی کے محاذ سے مل گیا۔ انتزاعِ سلطنت سے پہلے اودھ کی سرحدیں سُکڑ گئی تھیں مگر جہاد شروع ہونے پر جنگ کا محاذ جغرافیائی حدود سے باہر تک پھیل گیا۔

بے مثال بہادری

جہاد کے دوران انگریز حاکموں نے کئی مرتبہ مجاہدوں کو معافی، انعام اکرام کا اور عہدے جاگیر کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے آزادی کی خشک روٹی بلکہ فاقہ کشی کو خوف و ذلّت کے حلوے پر ترجیح دی۔ ان کے لیے وفاداری بہ شرطِ استواری عینِ ایمان تھی۔ شنکر پور کے قلعہ دار بینی مادھو کو جب انگریزی فوج نے تین طرف سے گھیر لیا تو کمانڈر انچیف نے انھیں پیغام بھیجا کہ اب لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہتھیار ڈال

دینے سے انھیں نہ صرف مکمل معافی بلکہ اپنی پوری املاک بھی مل جائے گی۔ اس مجاہد نے جواب دیا "اب قلعہ کو بچانا ناممکن ہو گیا ہے اسے چھوڑ رہا ہوں لیکن میں خود کو کبھی بھی آپ کے حوالے نہیں کروں گا اس لیے کہ اپنی ذات کا مالک میں خود نہیں ہوں بلکہ یہ میرے بادشاہ کی ملکیت ہے۔"قلعہ ہتھیار ڈال سکتا ہے مگر میں مادھو نہیں۔

لکھنؤ کے قریب نواب گنج پر ۱۳ جون ۱۸۵۸ء کو انگریز جنرل ہوپ گرانٹ نے اپنی کالی گوری سپاہ کے ساتھ اچانک حملہ کر دیا۔ اور یہ افسر خود اپنی تصنیف "سپاہیوں کی جنگ کے واقعات" میں اس معرکے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "زمیندار کے آدمیوں نے دو توپوں کے ساتھ ہم پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ میں نے ہندستان میں بہت سے بہادروں کو جیتنے یا جان دے دینے کے عزم وارادے کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا ہے لیکن مجھے کبھی ان زمینداروں جیسا شاندار کردار دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے دو اسکواڈرن سے زائد سپاہ نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ تین گھنٹے کی معرکہ آرائی کے بعد میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور دو توپوں کے پاس ۲۵ لاشیں پڑی تھیں۔"

لکھنؤ سے ۱۵ میل دور روئیاں کے چھوٹے سے زمیندار نرپت سنگھ پر جو جہاد آزادی میں شریک ہو گیا تھا ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو ایک طاقتور انگریز دستے نے حملہ کیا۔ قلعہ میں صرف ڈھائی سو آدمی تھے مگر وہ انگریزوں سے اپنے ملک اور اپنی مملکت کی اہانت کا بدلہ لینے پر بضد تھے۔ قلعہ فتح کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنے دو جنرل لگا دیے جن میں سے ایک مارا گیا پھر بھی یہ حملہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ نرپت سنگھ کو ہلاک یا گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ اور یہ بہادر انگریزوں کے لیے مصیبت بنا رہا۔

عنبر پور کا یہ قلعہ فروری ۱۸۵۸ء میں دہلی اور لکھنؤ دونوں پر سبقت لے گیا۔ وہاں صرف ۳۴ بہادر تعینات تھے۔ انگریز جنرل نے اپنے ساتھ کی نیپالی فوج کو یہ قلعہ فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ قلعہ کا دفاع کرنے والے بہادروں نے حملہ آوروں میں سے سات کو ہلاک اور ۴۳ کو زخمی کر دیا۔ اور قلعہ پر مجاہدوں کا قبضہ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ ان کا ایک ایک آدمی مادر وطن پر قربان نہیں ہو گیا۔ اس کارنامے کی دوسری مثال ہندستان کیا دنیا کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملے گی۔

□□

سعادت خاں نے فیض آباد کو اپنا دار السلطنت بنایا، اس زمانے میں اسے 'بنگلہ' کہتے تھے جس کا طرز تعمیر بھی ہندستانی تھا۔ یعنی چار گوشوں پہ چار برج اور وسط میں خس پوش بنگلہ۔ جب سعادت خاں اودھ آئے اس وقت یہ علاقہ انتشار اور آزمائشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُدھر مرکز میں بھی سازشوں اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ معاشی ابتری اور سیاسی انتشار نے مایوسی اور محرومی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ جان و مال کی حفاظت بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ ایسے حالات میں لکھنؤ ایک اچھی پناہ گاہ کی شکل میں ابھرا۔ اودھ کے نوابین نے سیاسی طور پر انتظامیہ کی تشکیل بھی اس طرح کی تھی کہ سیاسی وحدت کے لحاظ سے اودھ کا انفرادی وجود رہے۔ چنانچہ سعادت خاں نے ابتدا ہی سے اپنے کو نیم خود مختار رکھا۔ ان کے جانشین صفدر جنگ بھی مرکز کی روش پر قدم بقدم چلتے رہے۔ لیکن شجاع الدولہ نے تقریباً خود مختاری حاصل کر لی۔

اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر ص ۲۰۶
از سید عباد رطین رضوی

اسرار سنید

کاکوری ٹرین حادثہ اور مجاہدِ آزادی

رام کرشن کھتری

انگریزوں کی آمد اس سرزمین پر ظاہر ہے کہ بحیثیت حملہ آور سلطان بادشاہ یا امیر کے تو ہوئی نہ تھی بلکہ ابتدا میں وہ بحیثیت تاجر ہمارے ملک میں آئے۔ امراء و روسا، یا سلاطین و بادشاہ کی خوشنودی حاصل کی اور بہت سے جائز و ناجائز مراعات حاصل کر لیے۔ ملک کی خانہ جنگی پر گہری نظر رکھی اور اس سے استفادہ کر کے پہلے تو ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور بعد کو بنگال میں دیوانی یعنی لگان وصول کرنے کے اختیارات حاصل کر لیے۔ اور بعد میں انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کے تمام امور ریاست پر قابض ہو گئے، نتیجہ میں ہندوستانی عوام پر ان کے ظلم و جبر کے بادل دبیز ہونے لگے، غریب عوام کی مصیبتوں کا ذکر ہی کیا ہندوستان کے سلاطین و امراء بھی طوائف الملوکی کی زندگی گزارنے لگے۔ ملک کی دولت انگریزوں کے ہاتھوں لٹ رہی تھی۔ لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اس سماجی اور سیاسی انتشار و بحران کا انجام یہ ہوا کہ ہندوستان کے تمام راجاؤں اور نوابوں نے متحد ہونا شروع کیا، ملک کے عوام نے ان کی سربراہی قبول کی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم رونما ہوا، بعض کمزوریوں اور خامیوں کی بنا پر اس انقلاب عظیم یا پہلی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں کا ملک کی تمام ریاستوں پر مکمل قبضہ ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکست کے بعد ہندوستانیوں کی بے ثباتی اور بے چینی بھی کسی حد تک مفقود ہو گئی۔ لوگ انقلاب یا بغاوت کے نام سے ڈرنے لگے تھے۔ عوام مایوسی کا شکار تھے اور محرومی ان کا مقدر۔ اور یہ انحطاطی دور بیسویں صدی کی ابتدا تک یوں ہی چلتا رہا لیکن ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے اور اس انتہا کی حد جہاں پر ختم ہوتی ہے وہیں سے مظلوم جہد آزادی کے لیے انگڑائی لیتا ہے۔ جب انگریزوں کے مظالم درجۂ کمال کو پہنچے تو ہندوستان کے مظلوم عوام نے مجاہدین آزادی کی صورت اختیار کی۔ ملک گیر پیمانے پر تحریکات چلیں، مخلصوں نے اس امر میں فعال کردار نبھایا۔ لیکن کانگریس کی حکمت عملی عدمِ تشدد پر مبنی تھی جس کے نتائج یقینی تو ضرور تھے لیکن دیرپا تھے اور بعض انقلابی انتہا پسند تھے، وہ ملک سے فوراً ہی انگریزوں کے ناپاک وجود کو ختم کر دینے کے حامی تھے ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کو ملک سے ہٹانے کے لیے اگر تشدد کا راستہ بھی اختیار کرنا پڑے تو کیا جائے۔ اور اگر ضرورت ہو تو تحریکِ آزادی کو چلانے کے لیے ڈکیتی یا خزانہ لوٹنے کا کام بھی کیا جائے۔

اب ملک میں حصول آزادی کے لیے دو دھارے برابر سے کام کر رہے تھے، ایک دھارا گاندھی جی کی قیادت میں عدمِ تشدد کی پالیسی کے تحت تحریکِ آزادی چلا رہا تھا تو دوسرا دھارا انقلابیوں کا تھا جو تشدد اور انتہا پسندی کے ذریعہ ملک کی آزادی چاہ رہا تھا۔

سچندر ناتھ بخشی نے باقاعدہ تحریک آزادی کے لیے ۱۹۲۲ء میں انقلابیوں کی ایک آل انڈیا کانفرنس میں ایک پارٹی قائم کی جس کا نام ہندوستان ریوولیشنری پبلک پارٹی رکھا۔ اور تمام انقلابیوں نے متفقہ طور پر رام پرشاد بسمل کو کیپٹن اور اشفاق اللہ خاں کو وائس کیپٹن بنایا۔

انقلابیوں کا یہ گروہ چونکہ مظلوموں اور غریبوں کا گروہ تھا اور ان کے پاس اتنی بھی دولت نہ تھی کہ یہ تحریک آزادی چلا سکیں، نتیجہ کے طور انھوں نے زمینداروں اور متمول افراد کے گھروں پر ڈکیتی ڈالنے کا بھی فیصلہ لیا۔ سب سے پہلے ان انقلابیوں نے دوارکا پور (پرتاپ گڑھ) کے ایک ساہوکار کے یہاں ڈاکہ ڈالا جس میں ان کے ہاتھ بہت کم رقم لگی ا

بعد سنج پور (سہارنپور) کے ایک دولت مند گھر میں ڈاکہ ڈالا وہاں سے بھی ان لوگوں کو بہت ہی قلیل رقم دستیاب ہوئی۔ اس درمیان ہندستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور بڑھتے گئے۔ ادھر جیوں جیوں انگریزوں کا جبر بڑھتا رہا ویسے ویسے انقلابیوں کا غصہ بڑھتا رہا۔ نتیجے میں ان انقلابیوں نے ڈاؤن سہارنپور لکھنؤ پسنجر ٹرین کو لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے ۹ اگست ۱۹۲۵ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ پروگرام کے مطابق ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو انقلابیوں کا یہ گروہ جن کی تعداد ۲۳ تھی کاکوری ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوا۔ اشفاق اللہ خاں، راجندر ناتھ لاہڑی اور سچندر ناتھ بخشی سکنڈ کلاس کے ڈبہ میں سوار ہوئے۔ ان کو گاڑی روکنے کے لیے زنجیر کھینچنا اور پھر گارڈ سے روپیوں کا صندوق چھیننا اور لوٹنا تھا۔ پنڈت رام پرشاد بسمل، چندر شیکھر آزاد، منمتھ ناتھ گپتا، بنواری لال، مکندی لال گپتا، کیشو چند چکرورتی اور مراری لال شرما وغیرہ ٹرین کے دوسرے ڈبوں میں سوار تھے۔

فضا میں رات کی سیاہی بڑھنے لگی۔ پروگرام کے مطابق کاکوری اور عالم نگر کے درمیان گاڑی روک دی گئی۔ ٹرین میں سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جو بھی تھا خوف و دہشت کا شکار تھا۔ اتنے میں انقلابیوں نے مسافروں سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کو کہا اور کہا کہ وہ صرف سرکاری خزانہ لوٹنے آئے ہیں لیکن اگر کسی نے اس کام میں دخل اندازی کی تو یقیناً اس کو گولی ماری جائے گی اور اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کے پیش نظر انھوں نے دو چار ہوائی فائر بھی کر دیے۔ گاڑی میں اس وقت ۱۴ مسلح افراد تھے لیکن ان پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ انھوں نے انقلابیوں سے کسی طرح کی مزاحمت نہ کی۔ بس ایک افسوسناک واقعہ ضرور پیش آیا کہ ایک مسافر ڈر کے گاڑی سے اتر کر انقلابیوں کی طرف لپکا، انقلابیوں نے اسے انگریزی سرکار کا حامی سمجھا اور اسے ایک بلٹ ٹھوک دی۔ ایسی صورت میں وہ کسی انقلابی کی گولی کا شکار ہو افسوس کہ مارا گیا۔

انقلابیوں نے گاڑی کو دونوں طرف سے گھیر لیا اور گارڈ کو پکڑ کر اس کے ڈبے میں ہی اوندھا لٹا دیا گیا اور روپیوں والے صندوق ٹرین سے نیچے گرا دیا جہاں انقلابیوں نے بہت کوشش سے ہتھوڑوں سے صندوق کو توڑ کر رقم نکال لی کر دیا۔ اسی اثنا میں لکھنؤ کی جانب سے ڈاؤن ایکسپریس کی روشنی نظر آئی۔ انقلابیوں نے بھاگ کر شام اس واقعے کی خبریں چار باغ اسٹیشن پر ہو گئی کہ

اور وہاں سے پولیس فورس آ رہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ اپنی جگہوں سے ہلے نہیں۔ صندوق کاٹ کر روپے نکالے گئے اور اسے رومال میں لے کر رام پرشاد بسمل آگے بڑھے۔ لوٹ کی رقم بعض افراد کے مطابق ۴۶۰۹ روپے تھی لیکن شری رام کرشن کھتری جو خود بھی اس واردات میں شریک تھے کے مطابق ۸۰۰۰ روپے تھی۔ انقلابی ٹرین لوٹنے کے بعد ابھی کچھ دور ہی آگے بڑھے تھے کہ قرب و جوار کے دیہی بھولے بھالے لوگوں نے ڈاکو سمجھ کر انقلابیوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اپنے ہی لوگوں کا خونِ ناحق نہ بہے اس جذبہ کے تحت انھوں نے مقابلہ پر راہ فرار کو ترجیح دی اور بھاگ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ تمام انقلابی مسلح تھے اور چاہتے تو دو چار کا قتل بھی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ لوٹ کی رقم رام پرشاد بسمل کے پاس تھی جس کی انھوں نے ایک پوٹلی بنا رکھی تھی۔ گاؤں والوں نے جب انقلابیوں کو دوڑایا اور ان سے بچنے کے لیے جب یہ لوگ بھاگے تو اندھیرے میں رام پرشاد ایک گڑھے میں گر گئے۔ پوٹلی ہاتھ سے چھوٹی اور سارا روپیہ بھی گڑھے میں گر گیا۔ جلدی جلدی وہ تھوڑی سی رقم سمیٹ کر بھاگے اور پھر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔

رات کو ساڑھے آٹھ بجے چارباغ کے اسٹیشن ماسٹر جونس (JONES) نے ریلوے پولیس اسٹیشن چارباغ میں واردات کی پہلی رپورٹ درج کرائی۔

اطلاع ملتے ہی پولیس حرکت میں آ گئی۔ انقلابیوں کی سرگرمی سے تلاش ہونے لگی۔ مخبر چھوڑے گئے۔ گرفتاریاں ہونے لگیں اور تفتیش کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔ دورانِ تفتیش میں مدن لال، اندر بکرم سنگھ، شیتلا سہائے اور جیوتی شنکر وغیرہ پندرہ افراد گرفتار کیے گئے لیکن ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیے گئے۔

کاکوری واردات کے تمام ملزمان کو ایک ایک کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن چندر شیکھر آزاد، کیشو چند چکرورتی اور مراری لال کو پولیس گرفتار نہ کر سکی۔ اشفاق اللہ خاں اور سچندر ناتھ بخشی بھی ایک عرصہ تک پولیس کے ہاتھ نہیں آئے لیکن بعد میں ۸ دسمبر ۱۹۲۶ء کو اشفاق اللہ خاں کو دہلی میں اور ۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء کو سچندر ناتھ بخشی کو بھاگل پور بہار میں گرفتار کر لیا گیا۔ جن پر بعد میں الگ سے مقدمات چلائے گئے۔

کاکوری واردات کا مقدمہ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اسپیشل مجسٹریٹ ہرٹن (HURTON) کی عدالت میں پیش ہوا جس کی باضابطہ سماعت ۴ جنوری ۱۹۲۶ء سے شروع ہوئی۔ لکھنؤ کی عدالت میں ۱۹ افراد پر مقدمہ چلا جن پر تعزیرات ہند کی دفعہ بی ۱۲۰، اے ۲۱ اور ۳۹۶ لگائی گئی۔

انقلابیوں کی رہائی کے لیے ملک گیر پیمانہ پر کوششیں شروع ہوئیں موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس میں گنیش شنکر ودیارتھی، چندر بھان گپتا، گووند بلبھ پنت، موہن لال سکسینہ، کرپا شنکر ہجیلا وغیرہ شامل تھے۔ موتی لال نہرو اس وقت ملک کے بہت بڑے وکیل بیرسٹر تھے۔ جو دھری کو مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتہ سے لائے۔ ان کے علاوہ دیگر وکلا نے بھی بغیر معاوضہ کے مقدمے کی پیروی کی اور ۲۹ اپریل ۱۹۲۶ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ مراری لال اقبالی گواہ بن گئے جس کے عوض میں ان کو محض دو سال کی سزا سنائی گئی۔ پنڈت رام پرشاد بسمل کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اشفاق اللہ خاں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور اسی تاریخ کو فیض آباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ راجندر ناتھ لاہری کو پھانسی کی سزا ملی اور ۱۷ دسمبر ۱۹۲۷ء کو انھیں گونڈہ جیل میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، اس طرح انھوں نے بھی جام شہادت پیا۔ ٹھاکر روشن سنگھ کو بھی اسی دن الٰہ آباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ ان چاروں انقلابیوں کو پھانسی کی سزا ملی اور ان کے علاوہ ان کے دیگر ساتھیوں جن میں سچیندر ناتھ بخشی مکندی لال گپتا، یوگیش چندر چٹرجی، گوبند چرن اور سچیندر ناتھ سانیال کو عمر قید، منمتھ ناتھ گپتا، رام کرشن کھتری، وشنو شرن ڈبلش، نریش چندر بھٹاچاریہ اور راج کمار سنہا کو دس سال کی قید، پریم کرشن کھنہ، رام دلارے ترویدی، بھوپیندر سانیال اور رام ناتھ پانڈے کو پانچ سال کی قید اور بنوار ی لال [illegible] ہرن دشیش کمار چٹرجی کو چار سال کی قید ہوئی۔

چندر شیکھر آزاد، کیشو چندر چکرورتی اور مراری لال شرما روپوش ہو گئے اور گرفتار نہیں ہوئے اس لیے لکھنؤ کی عدالت انھیں کوئی سزا نہ سنا سکی۔ ان تینوں انقلابیوں میں چندر شیکھر آزاد ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کو الفریڈ پارک (جو اب چندر شیکھر آزاد پارک ہے) میں پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ چندر شیکھر آزاد جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آزاد پیدا ہوئے، آزاد جئے اور آزاد ہی مر گئے۔

صوبۂ اودھ نے جہاں دنیا کو بہت سی چیزیں دیں، تہذیب دی، ثقافتی کردار دیا، علوم و فنون دیے، ادب دیا، عزاداری دی، تاریخی عمارتیں دیں۔ لذیذ کھانے دیے وہیں اس نے جہد آزادی میں اپنا بھرپور اور فعال تعاون بھی دیا۔ ہندوستان کی جہد آزادی کی تاریخ سے کاکوری واردات کو نکالا نہیں جاسکتا اور نہ ہی شہدائے کاکوری کو فراموش کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان انقلابیوں کو بھلایا جاسکتا ہے ــــ جو ملک کو آزاد کرانے کے لیے کاکوری واردات کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے اور سزا پائی۔

کاکوری واردات کے باقیات میں اب محض ایک جاں باز انقلابی جناب رام کرشن کھتری باقی ہیں جو لکھنؤ میں ہی مقیم ہیں۔ کھتری جی آنند سینما قیصر باغ سے ملحق ایک مکان کے بالائی حصے میں رہتے ہیں ــــ ۹۴ سال کی عمر کے باوجود بھی ملک کے فلاحی امور کے لیے وہ آج بھی سرگرم عمل ہیں۔

رام کرشن کھتری ۳ مارچ ۱۹۰۲ء میں ضلع بلڈانا مہاراشٹر کے چکھلی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک اسکول سے حاصل کی۔ مڈل تک کی تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی، اس کے بعد پڑھائی میں دل نہ لگا۔ کیونکہ ملک کے کونے کونے کا ہندوستانی بیدار ہو گیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ ابھی کھتری جی کا بچپن ہی تھا۔ ملک کی آزادی کا تصور بہت مبہم سا ہی تھا۔ لیکن وہ اپنے اساتذہ کے حرکات و سکنات کو بہ غور دیکھتے رہے۔ ان کے اساتذہ میں زیادہ تر لوگ شری کرشن کلب کے ممبر تھے۔ اور یہ کلب محبان وطن کا ایک مرکز تھا۔ مڈل میں پہنچتے پہنچتے کھتری جی کو آزادی کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ مڈل کے لڑکے رام کرشن جی ایک دن گھر سے بھاگ کر ہری دوار آگئے اور وہاں سادھو سنتوں کے ساتھ رہنے لگے اور خود بھی سادھو بن گئے۔ انھوں نے اپنا نام تبدیل کر کے اپنا نام سوامی گووند پرکاش رکھا۔ کچھ عرصہ ہری دوار میں قیام کرنے کے بعد یہ اترپردیش آگئے۔ کھتری جی کا یہ وہ وقت تھا جب یہ عملی سیاست میں نہیں آئے تھے لیکن یہ محسوس ضرور کرنے لگے تھے کہ ہر ہندوستانی کو جہد آزادی میں برابر کا حصہ لینا چاہیے۔ لوک مانیہ گنگا دھر تلک کے اس قول نے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے نے کھتری جی کے ارادوں کو اور بھی مضبوط کیا۔ اسی درمیان یکم اگست ۱۹۲۰ء کو لوک مانیہ گنگا دھر تلک کا انتقال ہو گیا۔ [illegible]

ان کو یکسر جھنجھوڑ ڈالا۔ اسی درمیان کھتری جی کے خیالات و افکار میں تلاطم پیدا کرنے والا ایک واقعہ اور بھی پیش آیا۔ گاندھی جی نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستانیوں کو اواخر دسمبر ۱۹۲۱ء تک ہوم رول دے دیا جائے جس کے لیے ملک گیر پیمانے پر ہڑتال اور دھرنے دئے گئے۔ چورا چوری میں جب گاندھی جی کی آواز پر کسانوں نے ہڑتال اور دھرنے دینا شروع کئے تو انگریزی حکومت نے ان پر گولیوں کی بوچھار کرادی' نتیجے میں ۱۹ کسان مارے گئے۔ اس خونچکاں واقعے سے گاندھی جی نے ہوم رول کا مطالبہ منسوخ کر دیا۔ جس کو رام کرشن کھتری اور دیگر انقلابیوں نے پسند نہیں کیا۔

چوری چورا واقعے کے بعد رام کرشن کھتری امرتسر سے بنارس آگئے۔

بنارس میں اپیندر ناتھ اور برہمانند سادھوؤں کے ساتھ سنسکرت مہاودیالیہ ٹیڑھی نیم میں رہنے لگے۔ معمول کے مطابق یہ لوگ روز نہانے دھونے اور مذہبی ست سنگ اور عبادت کرنے دشاشومیدھ گھاٹ پر جاتے تھے۔ ایک روز کھتری جی کی ملاقات دشاشومیدھ گھاٹ پر ہی چندر شیکھر آزاد سے ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ شناسائی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ کبھی کبھار چھپ چھپا کر آزاد کھتری جی کے ٹھکانے پر بھی آجاتے تھے۔ چندر شیکھر آزاد نے کھتری جی سے کبھی انقلابی بننے کے لیے نہیں کہا۔ کچھ عرصہ کی دوستی کے بعد چندر شیکھر آزاد کو محسوس ہوا کہ کھتری جی کے دل میں بھی ملک کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ ابل رہا ہے تو انھوں نے کھتری جی کو سچندر ناتھ سانیال کی لکھی ہوئی کتاب بندی جیون پڑھنے کو دی اور اس کے بعد انھیں ۱۹۱۹ء تک کے تاریخی واقعات پر مبنی راؤلٹ کمیشن رپورٹ بھی پڑھنے کو دی۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد کھتری جی کے دل و دماغ میں انقلاب و بغاوت جیسے الفاظ گھر کر گئے۔

چندر شیکھر آزاد نے جب محسوس کیا کہ کھتری جی پوری طرح سے جدو جہد آزادی میں حصہ لینے کو بیقرار ہیں تو وہ انھیں کسی سنسان علاقے میں لے گئے۔ اور انھیں ایک روشن شمع دے کر کہا کہ ہتھیلی پر اس شمع کی لو کو رکھ کر قسم کھاؤ کہ ہر قیمت پر ملک کے لیے کام کرتے رہیں گے اور کسی بھی دباؤ کے تحت اپنا موقف نہیں بدلیں گے۔ کھتری جی نے ایسا ہی کیا جب ہتھیلی جلنے لگی تو آزاد نے شمع کو ہٹانے کے لیے کہا اور کہا یہ لو پستول تمھارے کام آئے گا۔

ہتھیلی کی جلن تو دو چار دنوں میں ٹھنڈی ہو گئی لیکن انقلاب کی جو کھتری جی کے دل میں اس دن ہوئی اس کی حرارت ان کے دل میں آج تک باقی ہے۔

یہ مرد مجاہد آزاد کے ساتھ دوارکا پور، پرتاپ گڑھ، گنج پور سہارنپور اور کاکوری واردات میں بھی ساتھ ساتھ رہا۔ کاکوری واردات میں کھتری جی کو دس سال کی قید ہوئی۔ قید کے ان دس برسوں میں وہ ڈیڑھ سال لکھنؤ جیل میں رہے اس کے بعد وہ آگرہ جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ اور رہائی سے چند دنوں قبل پھر انھیں لکھنؤ جیل میں ہی رکھا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد دلی میں کھتری جی کو استقبالیہ دیا گیا۔

۱۹۳۲ء کے آخر میں حکومت کے خلاف فعال کردار ادا کرنے کے جرم میں کھتری جی کو پھر گرفتار کر لیا گیا اور تقریباً ساڑھے چار مہینے کی قید ہوئی۔

کھتری جی جیل سے رہا ہونے کے بعد فارورڈ بلاک کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب جواہر لال نہرو رانی کھیت کے جیل سے رہا ہوئے تو کھتری جی نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا۔

کھتری جی یوں تو کوئی مصنف نہیں ہیں لیکن سچندر ناتھ بخشی کے اصرار پر انھوں نے اپنی سوانح عمری (آتم کتھا) لکھی جس کی رسم اجرا محترمہ اندرا گاندھی نے کی تھی۔

کھتری جی آج عملی سیاست سے بہت دور ہیں لیکن ملک کی فلاح و بہبود پر ہر آن نظر رکھتے ہیں۔ ہندوستانی عوام کو ان کا بس ایک ہی پیغام ہے کہ اقتدار کے پیچھے مت بھاگو بلکہ ملک کے لیے وقف ہو جاؤ۔

■■

"۱۹۰۵ء میں جب کسی انگریز حاکم نے ہندوستانیوں پر جھوٹ کا الزام لگایا تو اکبر نے یہ رباعی لکھی ؎

بے ڈھب ہے جھوٹ و سچ کی چھڑی جنگ ہند میں
سچ کہتے ہیں، جو جھوٹ ہوں کہتے تو رو سیاہ
کیسے ہی ہم ہوں آپ تو ہیں ہم پہ حکمراں
جھوٹے ہیں ہم، تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ"

(اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر)

پرنس اعظم قدر

بیگم حضرت محل پارک کی تاریخی وجہ تسمیہ

بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ کا نام ۱۹۶۲ء میں میرے بھائی پرنس نیر قدر حال مقیم لندن کی کوششوں سے رکھا گیا تھا۔ نیر صاحب کی تحریک پر حافظ محمد ابراہیم اس وقت کی حکومت یوپی کے وزیر آبپاشی (Irrigation) نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ان پہلوؤں سے روشناس کرایا جو لکھنؤ اور بالخصوص قیصر باغ سے متعلق تھے۔ اس کے بعد پنڈت نہرو نے قیصر باغ وکٹوریہ پارک کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔ جاہ و جلال میں غرق ملکۂ وکٹوریہ کے شاہی مجسمہ کو میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ اور اس جگہ ملکۂ حضرت محل کا مجسمہ نصب کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا نے ریاستی سرکار کی جانب سے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا۔ لیکن میرے اور پرنس نیر کے اعتراض پر کہ اسلامی رو سے مجسمہ اور وہ بھی خاتون کا نامناسب ہوگا وہ تجویز بدل دی گئی۔ حضرت محل کی مہر اور کتبہ چھتری کے نیچے سنگ مرمر کے ستون پر تانبے کی چکتیوں پر کندہ کر کے نصب کر دیا گیا اور پورے پارک کا نام "بیگم حضرت محل پارک" رکھ کر حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس محکمہ نے عوام کی اطلاع کیلئے نیلی تختی پر اپنا نوٹس لگا دیا ہے۔

ملکۂ وکٹوریہ کے نام سے ایک اور وکٹوریہ پارک گول دروازہ کے سامنے لکھنؤ ہی میں ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث تھا کہ جب چوک والا وکٹوریہ پارک محفوظ رکھا گیا تو یہ قیصر باغ والے نام کی تبدیلی کیوں ضروری سمجھی گئی حقیقتاً قیصر باغ کا پارک، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خوچکاں داستان سے بھری ہوئی ہے یہاں کے ذرہ ذرہ میں ہندوستانی سپاہیوں اور جانبازوں کی داستانیں پیوست ہیں۔ اسی میدان جنگ میں ہندوستانی ملکہ حضرت محل نے بدیسی ملکہ وکٹوریہ کی فرنگی فوج کو شکست دیکر لکھنؤ اور اودھ کی حکومت دوبارہ حاصل کی تھی۔

اسی میدان جنگ میں برٹش کمانڈر این چیف جنرل نیل گھوڑے کی پشت پر سوار شیر دروازے سے داغے گئے توپ کے گولے سے اڑا دیا گیا تھا۔ نیل وہیں ڈھیر ہو گیا مگر اس کا زخمی گھوڑا بھاگ کر ایک فاصلہ پر گرا۔ وہیں دفن کیا گیا جہاں اب پرنس کلب ہے۔ جنرل نیل کے قتل کے مقام پر انگریزوں کا لگا ہوا ایک کتبہ موجود ہے۔

اسی میدان جنگ میں بیگم کی ہندوستانی فوجوں سے فرنگی فوجیں شکست کھا کر مرتی مارتی بھاگ کر رزیڈنسی میں روپوش ہو گئی تھیں۔

اسی میدان جنگ میں حضرت باغ کے اندر واقع چاندی والی بارہ دری میں حضرت محل کے بیٹے برجیس قدر کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ اور ان کا جلوس تاجپوشی بھی اسی میدان سے شادیانے بجاتا ہوا گزرا تھا۔

اسی میدان جنگ کے کنارے چار عالی شان کوٹھیوں کا جھرمٹ جو چوکھی کہلاتا تھا بیگم حضرت محل کی رہائش گاہ تھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں وہ یہاں دربار بھی کرتی تھیں۔

تاجپوشی کے بعد چھ بڑے انگریز افسر قیدیوں کا مقدمہ بیگم حضرت محل کی فوجی کونسل نے اسی میدان جنگ کے اندر چوکھی میں سماعت کیا۔ یہیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ بیگم حضرت محل کے حکم سے وہ چھ لاشیں ایک مشترکہ قبر میں عیسائی طریقہ سے دفنائی گئیں اور اس پر ایک صلیب بھی نصب ہے۔ وہ قبر موجودہ تلسی سینما کے سامنے آج بھی موجود ہے۔ انگریزی

میں سنگ مرمر کا کتبہ لگا دیا گیا تھا جس پر یہ نام کندہ ہیں۔
"یادو سر ماؤنٹ اسٹورٹ جیکسن ہارٹ۔ کیپٹن پیٹرک آر، لفٹنٹ برنیس، سارجنٹ میجر مورٹن، جی پی کاریو، اور ایم جیکسن۔ ۱۸۵۷ کے مہلوکین"

دس ماہ بعد کایا پلٹ ہوئی تو انگریزی فوجوں نے بھی اسی میدان جنگ میں بیگم حضرت محل کو شکست دی۔ پانچ ہزار وفادار ہندو اور مسلم مجاہدین جنگ آزادی اسی میدان کارزار میں اپنی جانیں وطن پر نثار کر کے تاریخ بنا گئے۔ ایک بھی فرار نہ ہوا۔

یہ وہی میدان ہے جہاں خود بیگم حضرت محل ملک کو انگریزوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد کرانے اور جام شہادت نوش کرنے کے جذبہ سے پردے سے باہر نکل آئی تھیں۔ مگر عین وقت پر مولانا احمد اللہ شاہ دو ہزار جانبازوں کو لے کر انگریزوں کا گھیرا توڑ کر گھس آئے اور بیگم اور برجیس قدر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے بچالے گئے اسی موقع پر حضرت محل نے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ جنگ ہار گئی ہوں۔ مگر میں یہیں میدان جنگ میں جان دے دوں گی لیکن چوکھی چھوڑوں گی نہیں۔

اسی میدان جنگ میں فتح کے بعد فرنگیوں نے بھی اپنے دو قیدیوں کو پھانسی دی۔ اور مسلمان کی لاش کو جلا کر ہندو راجہ جیالال کو نہ صرف دفن کر دیا بلکہ نشان قبر بھی مٹا کر اپنے مظالم کا اظہار کیا۔ فرنگیوں نے اپنی عیاری اور مکر و فریب کی حکمت عملی سے ۱۸۵۷ کی جنگ میں فتح کے بعد اودھ کے پایۂ تخت لکھنؤ کے اس تاریخی میدان جنگ کا نام اپنی انگریز ملکہ کے نام پر "قیصر باغ وکٹوریہ پارک" رکھا اور اس پر عالی شان مجسمہ نصب کیا تھا۔ لیکن ملک کے پہلے وزیر اعظم کو اسکی تاریخی اہمیت کی طرف جیسے ہی متوجہ کیا گیا۔ انھوں نے اسے ہٹوا کر میوزیم میں بھجوا دیا۔ اور اس تاریخی میدان جنگ کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔

اس کے بعد ہم لوگوں کی تحریک پر حکومت اتر پردیش نے "بیگم حضرت محل پارک" کا وہ ٹکڑا جہاں حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال قتل کر کے مدفون کر دئے گئے تھے۔ "راجہ جیالال پارک" رکھ کر ایک تختی پر لکھ کر اس بہادر اور وطن پرست راجہ کے نام کو بھی شہرت دوام دیدی۔

چونکہ یہ میدان جنگ آزادی وطن کے لئے قربانی پیش کرنے کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے چنانچہ جنگ آزادی کے ایک دوسرے سورما نیتا جی سبھاش چندر بوس کا فوجی لباس میں ملبوس مجسمہ بھی اسی سابق میدان جنگ میں دوسری جگہ لگا دیا گیا ہے۔

ممکن ہے چند افراد بعض مصلحتوں کی بنا پر یا حقائق سے عدم واقفیت کے سبب اس پارک کو حضرت محل سے منسوب کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں یا اس سے اتفاق نہ ہو، بلکہ اس کا نام کچھ اور رکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ساری زمین ۱۹۶۲ء سے مرکزی حکومت کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ملکیت ہے۔ آراضی کا مالک ہی نام بدل سکتا ہے۔

۲۔ وہ پارک قیصر باغ کے شاہی محلات کی آراضی ہونے کے سبب خاندان شاہی اودھ کی ملکیت تھا اور انگریزی سرکار بطور غاصب اس پر قابض رہی۔ اس کے بعد بھی تا ۱۹۶۲ء وہی صورت حال تھی۔ اودھ کے آخری حکمراں کے حق سے وہ زمین حضرت محل کی ملکیت تھی۔

۳۔ وہ بیگم حضرت محل کا میدان جنگ تھا۔ جس پر موصوفہ نے انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں جیتیں اور ہاریں۔

۴۔ اس میدان جنگ میں برٹش کمانڈر ان چیف جنرل نیل کے قتل کی جگہ کی نشان دہی ہے۔ فرنگی فوجی قیدیوں کی قبر ہے۔ اور بیگم حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال کی بھی قبر ہے ۔ اور اسطرح فرنگیوں کی کم ظرفی کا مستقل مظاہرہ بھی ہے۔ یہاں آزاد ہند فوج کے کمانڈر ان چیف نیتا جی سبھاش چندر بوس کا جنگی مجسمہ بھی لگا ہوا ہے

۵۔ اسی میدان جنگ میں چاروں طرف ۱۸۵۷ کی جنگی کارروائیوں کی نشانیاں اور تاریخی شواہد موجود ہیں۔ تاجپوشی، جنگی کاؤنسل کے دربار، نامور انگریز اور ہندستانی جنگی قیدیوں پر چارہ جوئی، سزائے موت اور تعمیل، ان تمام تاریخی حقائق کی داستانیں پوشیدہ ہیں جس کے مطالعہ سے ہماری نئی نسل اپنی عظمت اور ملک اور قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کے کارناموں سے بخوبی واقف ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں سے واقف ہونے کے بعد نہ تو کسی کو اس پارک کی تاریخی اہمیت سے انکار

ہو سکتا ہے نہ کسی کو یہ پسند ہو گا کہ "حضرت محل پارک" کا نام تبدیل کیا جائے۔

لازم تو یہ تھا کہ مختلف اوقات تاریخ میں پائے ہوئے ایسے نادر خطابات، افتخار النساء، ملکۂ اودھ، جناب عالیہ، راج ماتا کی حامل بیگم حضرت محل کے مانے ہوئے کارناموں اور ان کے ایثار کے مدنظر ان کے نام کی بے شمار یادگاریں مختلف طریقوں کی سارے ملک میں قائم ہوتیں۔ مگر دنیا میں صرف یہی ایک "بیگم حضرت محل پارک" واحد یادگار ہے جس سے موصوف کا نام نامی زندۂ جاوید ہے۔ اور روز دنیا کے اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس کو بھی مٹا دینا یعنی حضرت محل کی یاد یکلخت محو کر دینا قوم و ملت کی احسان فراموشی ہو گی یہاں چند اقتباسات مشاہیر عالم مفکرین کے بیگم حضرت محل کی اہمیت اور ان کے اعتراف میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آزادی وطن اور ملک و قوم کے وقار کو بچانے کے لئے ان کی خدمات کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

ویر ساورکر

"باہمت اور قابل قدر بیگم صاحبہ کا باوجود اس قدر افراتفری کے، سارے نظام حکومت کو برقرار رکھنا ان کی لیاقت اور بے جگری کا بین ثبوت ہے۔"

کارل مارکس

"حضرت محل، اودھ کی بیگم نے ہندستان قومی جد و جہد آزادی میں ۵۹-۱۸۵۷ء تک مجاہدین کی قیادت کی۔" (شائع شدہ ماسکو "دی فرسٹ انڈین وار آف انڈپینڈنس ۵۹-۱۸۵۷ء صفحہ ۲۰۳)

سر ڈبلو، ایچ رسل

"بیگم نے سارے اودھ کو لڑنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ اور سرداروں نے وفاداری کا حلف لیا ہے۔" (مائی انڈین میوٹنی ڈایری سے)

سر جادو ناتھ سرکار

"بیگمات اودھ نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ...... سلطنت کے زوال پر نمودار ہوئیں حضرت محل، بغاوت کی ہیروئین، نرم تر واجد علی شاہ کی شیر دل ملکہ۔"

("تاریخ بادشاہ بیگم" مقدمہ ۱۵ جون ۱۹۳۸ء)

وزارت اطلاعات حکومت ہند

"اودھ کے معزول پادشاہ کی بڑی بیوی حضرت محل غیر معمولی صلاحیت کی خاتون تھیں اور آزادی کی جد و جہد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اپنے کم سن لڑکے برجیس قدر کو اس کے باپ کا جانشین کی حیثیت سے انھوں نے اس کی سرپرستی میں حکومت کے نظم و نسق کو سنبھالا۔ لکھنؤ کی مدافعانہ جنگ میں وہ خود شریک ہوئیں اور اپنی فوجوں میں اکثر حرکت کرتی دیکھی گئیں۔ انگریزوں نے اودھ کو جب دوبارہ فتح کیا تو انھوں نے نیپال میں پناہ لی اور اپنے لڑکے کے حقوق سے دستبردار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔"

(ترجمہ، پکچوریل پریزنٹیشن مطبوعہ حکومت ہند)

انگریز سرپرست فخر محل

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں کا مقابلہ کرتی ہے آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"

بیگمات اودھ کے خطوط

شیدا بیگم بنام واجد علی شاہ

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منھ پھر پھر گئے۔ بڑی جیداد عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر گئیں کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کرے تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہو گا۔"

(بیگمات اودھ کے خطوط)

اور یہی حقائق ہیں جن کے پیش نظر "حضرت محل" کو یاد رکھنا قومی و تہذیبی ضرورت ہے۔

□□

تشنہ کاموں سے ہے خود آج یہ ساقی کو گلہ
ہم تو دیں پر کوئی اس مے کا طلب گار بھی ہے
جاں فروشی کے لئے ہم تو ہیں تیار مگر
کوئی اس جنس گرامی کا خریدار بھی ہے
مولانا محمد علی جوہر

علی مہدی ایڈووکیٹ

لکھنؤ کے گنج، بازار اور گلی کوچے

مرزا غالب سے "مردم چشم جہان" کا لقب پانے والے لکھنؤ کی تاریخ تو صدیوں پرانی ہے۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کی آمد اور آبادی تو بس سید سالار مسعود غازی (بہرائچ ۱۰۳۳ء) اور ان کے ساتھیوں کی اس پورے خطے میں آمد و قیام سے ظاہر ہے جس کے تذکرے قدیم ماخذوں میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں اندرونِ محلہ راجہ بازار، صحبتیہ (صحبتیا باغ) سید سالار کے ساتھی "ملک آدم" کا مزار و مقبرہ اس وقت بھی موجود ہے۔ بقول صاحب گزیٹیر آف اودھ اس مزار پر باغ میں چونکہ صحبت کا میلہ ہر سال ہوتا تھا، اسی لیے یہ جگہ صحبتیا باغ مشہور ہو گئی۔

قدیم ماخذوں کی روشنی میں صاحب گزیٹیر آف اودھ اور بعد میں مولانا شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں بھی مغل شہنشاہ ہمایوں کی لکھنؤ آمد کے وقت شیوخِ لکھنؤ کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

عہدِ اکبری (۱۵۵۶ء) میں اکبری دروازہ اور چوک میں باجپئی ٹولہ، کماری ٹولہ، بنجاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ اور عہدِ جہانگیری اور شاہجہانی میں مرزا منڈی، محمود نگر، منصور نگر، فاضل نگر، شاہ گنج وغیرہ کا آباد ہونا اور عہدِ عالمگیری میں فرنگی محل میں ملا نظام الدین کا قیام کرنا تحریر کیا ہے۔

لیکن مرزا غالب سے "مردم چشم جہاں" کا لقب پانے والا لکھنؤ درحقیقت میں نواب آصف الدولہ (۱۷۹۸ء-۱۷۷۵ء) کی فیض آباد سے لکھنؤ آمد اور مستقل قیام کا نتیجہ تھا۔ دربارِ اودھ کی لکھنؤ میں قائمی کے بعد ہر چہار جانب لوگ آباد ہونے لگے۔ نئے نئے محلے، ٹولے، گنج اور بازار بسنے لگے اور یہ سلسلہ اس خاندان کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ تک جاری رہا اور آج آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ لکھنؤ ہر چہار جانب بڑھتا اور بستا ہی جا رہا ہے۔ نئے نئے محلے اور زمانۂ حال کی متعدد منزلہ عمارتیں اور کالونیاں تیار ہو رہی ہیں۔

عہدِ آصفی کے آباد محلوں اور بازاروں میں بازار جھاؤ لال، بازار ٹکیٹ رائے، ٹکیٹ گنج، بالک گنج، اماں گنج، فتح گنج، رکاب گنج، نخاس، دولت گنج، بیگم گنج، نواب گنج، ترمنی گنج، جوانی گنج، نواز گنج، مشک گنج اور وزیر گنج جو آصف الدولہ کے جانشین وزیر علی خاں کے نام پر موسوم ہے اور عہدِ نواب سعادت علی خاں میں جنگلی گنج، مقبول گنج، مولوی گنج اور موتی محل و گولہ گنج وغیرہ آباد ہوئے۔ سعادت گنج بھی نواب سعادت علی خاں نے عہدِ آصفی میں آباد کیا تھا جسے اپنے عہدِ نوابی میں اور بھی رونق بخشی۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں بادشاہ نگر اور ان کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے قلب شہر میں اپنے محلات تعمیر کرائے جو ڈیوڑھی آغا میر کے نام سے مشہور ہوئے۔ نصیر الدین حیدر نے دریا پار ارادت نگر، چاند گنج وغیرہ بسائے۔ امجد علی شاہ نے حضرت گنج اور ان کے وزیر اعظم امین الدولہ نے امین آباد وغیرہ اور عہدِ واجدی میں قیصر باغ، بادشاہ باغ جہاں آج لکھنؤ یونیورسٹی ہے، سکندر باغ، بنارسی باغ وغیرہ میں بارہ دریاں اور کوٹھیاں بنوائیں۔

انھیں گنج اور بازاروں میں آبادیاں قائم ہوئیں اور اہلِ حرفہ اور صنعت کاروں نے بھی اپنے ٹولے آباد کیے، گلیاں اور کوچے وجود میں آئے جو اپنے حلقے یا علاقے کے معروف لوگوں یا رہنے والوں کے پیشوں یا اس مقام پر بننے یا فروخت ہونے والی اشیاء کے ناموں سے معنون ہو کر مشہور ہوئے۔ اہلِ لکھنؤ اپنی علمی اور تہذیبی ثقافتوں

کے ساتھ ساتھ اپنی ظرافتوں کے لیے بھی مشہور رہے ہیں جس کی جھلک کچھ محلوں اور ٹولوں کے ناموں سے ظاہر ہوتی ہے. مثلاً جھپ جھالی ٹولہ اچھوتی گلی، شوبیٹا کی گلی، کالے کی گلی، جناب ڈالی گلی، گلی شاہ چھڑا، چوڑے کی گلی، کیتھے والے جناب کی گلی وغیرہ.

عہدِ شاہی کے لکھنؤ میں بڑی بڑی چوڑی سڑکیں نہ تھیں اور نہ ان کی ضرورت ہی تھی کیوں کہ کسی قسم کی گاڑیوں کا رواج نہ تھا، عموماً لوگ پیدل چلتے تھے. ہاں امرا اور رؤسا پالکیوں، نالکیوں، ہواداروں، فینسوں، چوپہلوں اور ڈولیوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر آتے جاتے لیکن قریب کے مقامات پر یہ حضرات بھی پیدل ہی اپنے مصاحبین کے ہمراہ چلتے پھرتے تھے. گلیوں اور تنگ راہوں میں راستہ چلنے میں دھوپ کی تیزی، گرمی کی شدت، گرد و غبار، آندھی اور طوفان نیز بارش سے بھی کسی قدر مفر و آرام رہتا تھا. ان پچی کھچی گلیوں اور تنگ راستوں میں اب بھی ایسی چند گلیاں موجود ہیں کہ جن میں ہوکر مشرقی لکھنؤ سے مغربی لکھنؤ تک نہایت آرام سے دھوپ اور گرد و غبار سے بچ کر پہونچا جا سکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اب عرصے سے ان گلیوں میں پہلے جیسی صفائی نہیں ہے.

عہدِ شاہی کا لکھنؤ اپنی آبادی، ترقی اور رونق کے سبب دُنیا کے چند اہم اور بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا. ابتدائے انگریزی دورِ حکومت میں بھی بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے بعد لکھنؤ ہندستان کا سب سے بڑا شہر تھا.

برٹش حکومت کے قیام کے بعد جب مختلف قسم کی گاڑیوں کا رواج عام ہوا اور یکے، تانگے، فٹنس، ٹم ٹم اور بگھیاں اور موٹریں بھی آگئیں تو کشادہ راستوں اور سڑکوں کی بھی ضرورت پیش آئی. شہر میں متعدد کشادہ سڑکیں نئی بنیں اور کچھ قدیمی راستوں کو ہی مزید کشادہ کیا گیا. مکانات، گلیاں اور کوچے کھود دیے گئے جن کے اب صحیح نام بھی معلوم کرنا مشکل ہے.

۱۸۶۵ء کی مردم شماری کے بموجب ملٹری، یوروپین اور جیل کے ملازمین اور مجرمین کے علاوہ لکھنؤ شہر کی آبادی دو لاکھ تہتر ہزار ایک سو چھبیس (۲۷۳۱۲۶) افراد پر مشتمل تھی اور پورا شہر سات تھانوں یا وارڈوں پر منقسم تھا. سب سے زیادہ آبادی تھانہ چوک کی ۶۳۳۵۰ نفر تھی. لکھنؤ شہر کی آبادی کی تفصیل صاحب گزیٹیر نے یوں لکھی ہے:

تھانہ چوک	۶۳۳۵۰
تھانہ حسن گنج	۲۹۸۳۹
تھانہ دولت گنج	۵۲۲۲۱
تھانہ سعادت گنج	۳۸۵۰۷
تھانہ گنیش گنج	۳۰۱۷۵
تھانہ وزیر گنج	۳۳۷۳۰
تھانہ دلکشا اور کنٹونمنٹ	۱۵۲۸۳
میزان:	۲۷۳۱۲۶

ملٹری:	۳۶۴۸	یوروپین:	۳۲۲۲
دیگر غیر ملکی:	۷۶۰	ملازمین جیل اور مجرم	۳۰۲۳

۱۸۶۱ء - ۷۰ کے درمیان لکھنؤ شہر کے بازاروں میں مختلف اجناس کی خوردہ قیمت بھی صاحب گزیٹیر نے لکھی ہے. ناظرین کی دل چسپی کے سبب سے بھی پیش کیا جاتا ہے:

کودو	۳۴ سیر فی روپیہ	چھوٹی جوار	۲۴ سیر فی روپیہ
مکا	۲۹ سیر "	ماش	۲۲ سیر "
سانواں	۳۲ سیر "	موٹھ	۲۴ سیر "
چاول	۲۷ سیر "	چنا	۲۰ سیر "
باجرہ	۲۲ سیر "	مٹر	۲۵ سیر "
ارہر	۲۷ سیر "	گیہوں	۱۹½ سیر "
مچھلی بڑی:	دو آنہ فی سیر	مچھلی چھوٹی:	۱½ آنہ فی سیر
مچھلی معمولی:	ایک آنہ فی سیر		

۱۹۷۹ء سے اس وقت تک ان تھانوں اور وارڈوں کی تعداد چند سال کے وقفوں کے بعد بڑھتی ہی رہی ہے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پورا شہر چالیس وارڈوں پر تقسیم ہے جو اس طرح ہیں:

لکھنؤ کے وارڈ

۱. نرہی ۲. حضرت گنج ۳. مُرلی نگر ۴. گھسیاری منڈی

۵. نظر باغ، ۶. بقول گنج، ۷. حسین گنج، ۸. لال کنواں،
۹. گنیش گنج، ۱۰. بشیرت گنج، ۱۱. امین آباد، ۱۲. مولوی گنج،
۱۳. وزیر گنج، ۱۴. مشک گنج، ۱۵. راجہ بازار، ۱۶. یحیٰی گنج،
۱۷. کنوڑی رکاب گنج، ۱۸. عیش باغ، ۱۹. راجندر نگر، ۲۰. چندر بھان گپت نگر
۲۱. آدرش نگر، ۲۲. جے پرکاش نگر، ۲۳. سنگار نگر، ۲۴. سروجنی نگر،
۲۵. کھر کارائے بریلی روڈ، ۲۶. راجہ جی پورم، ۲۷. سعادت گنج،
۲۸. کشمیری محلہ، ۲۹. اشرف آباد، ۳۰. چوک، ۳۱. نواز گنج،
۳۲. دولت گنج، ۳۳. تودی نگر، ۳۴. ڈالی گنج، ۳۵. نرالا نگر،
۳۶. بادشاہ نگر، ۳۷. گومتی نگر، ۳۸. اندرا نگر، ۳۹. ماہ نگر، ۴۰. علی گنج

عرصے سے جاری ان تبدیلیوں اور ردوبدل کے سبب گو بہت سے قدیم مقامات اور ان کے نام مٹ گئے ہیں، پھر بھی کچھ مقامات اور گلیاں اپنے قدیم ناموں سے ہی مقامی طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں۔ حالاں کہ کاغذات سرکار میں ان کے نام کچھ اور ہی درج ہیں۔ مثلاً چاول والی گلی جہاں کبھی چاول بکتے تھے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ادنیٰ درجہ کی کسبیوں کی آماجگاہ تھی۔ کاغذات سرکاری میں پرانا نخاس کے نام سے درج ہے۔ اسی طرح مشہور ٹاپے والی گلی کاظمین، میدان ایل چی خاں میں شامل ہے۔

زمانۂ شاہی کے بعد تک چوک گول دروازے سے بیلی گارد تک کا علاقہ، جو اب شاہ مینا روڈ اور جگت نرائن روڈ کے نام سے مشہور ہے، نبہرہ (NEBHERA) کہلاتا تھا اور اسے نبہرہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس پورے علاقے میں نیم کے درختوں کی بہت کثرت تھی۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے گذشتہ لکھنؤ کا ۱۹۷۵ء میں یونیسکو کی معرفت لندن سے انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو مترجم نے اس لفظ کو نقطوں کی بے ترتیبی یا کسی اور غلط فہمی میں (BENEHRAH) پڑھا اور اس کی تشریح بھی زیر نوٹ (۸۳) یہ فرما دی کہ "بنہرہ ضلع بارہ بنکی کا ایک قصبہ ہے۔" لیجیے نقطوں کی بے ترتیبی یا غلط فہمی میں ایک نئی تاریخ بن گئی۔

اسی طرح کھجوہ باغ ناظم صاحب جو ادھر کچھ عرصے سے شاستری نگر کے نام سے موسوم ہے، اگر علامہ صفی لکھنوی کا نظم کردہ قطعۂ تاریخ وفات پروفیسر علی اصغر مرحوم جو کیننگ کالج میں استاد تھے، کچھ عرصے بعد پڑھا جائے تو باغ ناظم صاحب اور کھجوے کا پتہ بتانے والا بھی شاید کوئی نہ ملے گا ؎

جہاں ہے کھجوے پہ باغ ناظم　　وہیں بہشت بریں کا عازم
کفن سے منھ کو چھپا کے لیٹا　　غبار پردے گرا کے اٹھا

الغرض ان حالات میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے معروف گلی کوچوں اور محلوں کی ایک مختصر ردیف دار فہرست مرتب کر دی جائے جو باعث دلچسپی بھی ہو اور شاید کبھی کام آسکے:

گلیاں

اچھوتی گلی۔ پل غلام حسین	گنے والی گلی۔ امین آباد
کنگھی والی گلی۔ نخاس	بتاشے والی گلی۔ امین آباد
چاول والی گلی۔ نخاس	جوتے والی گلی ״
پھول والی گلی۔ چوک	جھوٹے والی گلی ״
بتو والی گلی۔ ڈالی گنج	ڈور والی گلی۔ چوک
گھوڑے والی گلی۔ نخاس	پارچہ والی گلی۔ چوک
بیل والی گلی۔ مشک گنج	سرکہ والی گلی۔ کاظمین
پیڑے والی گلی۔ ڈیوڑھی آغا میر	سناروں والی گلی۔ مفتی گنج
فینس والی گلی۔ راجہ بازار	مارواڑی گلی۔ گنیش گنج
دیگ والی گلی۔ بخاری ٹولہ	پتے والی گلی۔ رکاب گنج
گلی شاہ جیون۔ وکٹوریہ اسٹریٹ	پتھر والی گلی۔ وزیر گنج
باندھ والی گلی۔ چوک	ٹاپے والی گلی۔ کاظمین
نچوڑی والی گلی۔ چوک	حمام والی گلی۔ چوک
گلی نشاط گنج نزد تالاب	جناب والی گلی۔ نخاس

کالے کی گلی۔ مفتی گنج

ٹولے:

اہیری ٹولہ۔ کشمیری محلہ	شنکری ٹولہ۔ چوک
باورچی ٹولہ۔ ڈیوڑھی آغا میر	سوندھی ٹولہ۔ چوک
ٹھٹھیری ٹولہ۔ ״	کلین ٹولہ۔ چوک
کاغذی ٹولہ۔ سعادت گنج	بھوانی ٹولہ چوک

برہمی ٹولہ ۔ سعادت گنج — سورگی ٹولہ چوک
حاجی ٹولہ " — چوپاڑی ٹولہ ۔ چوک
جوشی ٹولہ ۔ ڈیوڑھی آغا میر — جھپ جھالی ٹولہ ۔ ڈالی گنج
جھوائی ٹولہ ۔ چوپٹیاں — بھانڈوں کا ٹولہ "
نعل بندی ٹولہ ۔ ڈیوڑھی آغا میر — کُرمی ٹولہ ۔ مقبول گنج
دریائی ٹولہ ۔ راجہ بازار — جُرین ٹولہ "
رستوگی ٹولہ ۔ راجہ بازار — چکون ٹولہ ۔ چوپٹیاں
چڑی مار ٹولہ ۔ راجہ بازار — گوئن ٹولہ ۔ مولوی گنج
کلاجی ٹولہ ۔ مشک گنج — کھتری ٹولہ ۔ مشک گنج
پوری ٹولہ ۔ راجہ بازار — دیدن ٹولہ ۔ نواز گنج
بمواتی ٹولہ ۔ یٰسین گنج — پنجابی ٹولہ ۔ راجہ بازار
نواتی ٹولہ " — تھوئی ٹولہ ۔ راجہ بازار

کٹرے :

کٹرہ میر جہانگیر ۔ یحییٰ گنج — کٹرہ خدایار خاں ۔ سعادت گنج
کٹرہ ابوتراب خاں ۔ یحییٰ گنج — کٹرہ وحنا بیگ ۔ کشمیری محلہ
کٹرہ حیدر حسین ۔ چوک — کٹرہ محمد علی خاں ۔ نواز گنج
کٹرہ اعظم بیگ ۔ ٹوریہ گنج — کٹرہ مقبول گنج ۔ کٹرہ رانی

پُل

پُل غلام حسین ۔ جھاؤلال کا پُل ۔ کچّا پُل ۔ پکّا پُل ۔ گاما کا پُل (چوک) ۔ قاسم علی خاں کا پل (مفتی گنج) ۔ قصائی کا پُل (چوک) ۔ فرنگی محل کا پُل ۔ کاٹھ والا پُل ۔ لوہے والا پل ۔ موتی محل کا پل ۔ رکاب گنج کا پل ۔ کمہاروں کا پُل (مشک گنج) ۔ موتی لال کا پُل (چوک)

دروازے اور پھاٹک

رومی دروازہ ۔ گول دروازہ (چوک) ۔ اکبری دروازہ ۔ توپ دروازہ
شیر دروازہ (قیصر باغ) ۔ نعل دروازہ ۔
حیدر حسین خاں کا پھاٹک (چوک) ۔ ملکہ گیتی کا پھاٹک (قندھاری بازار)
پھاٹک جیالال (نواز گنج)

احاطے

احاطہ خواجہ بہار، حسین گنج ۔ احاطہ تُراب خاں، حسین گنج ۔ احاطہ غنی خاں، حسین گنج ۔ احاطہ ماڈرن، گنیش گنج ۔ احاطہ نور بیگ، سعادت گنج ۔ احاطہ دھنو بیگ، کاظمین ۔ احاطہ سنگی بیگ، اشرف آباد ۔ احاطہ سلیمان قدر، مولوی گنج ۔ احاطہ درگا پرشاد، مشک گنج ۔ احاطہ صورت سنگھ ۔ احاطہ مرزا علی خاں ۔ احاطہ فقیر محمد خاں، پختہ و خام ۔ احاطہ خانساماں ۔ احاطہ ستارہ بیگم ۔ احاطہ رسول خاں ۔ احاطہ حکیم خاں، نواز گنج ۔

محلّے

کشمیری محلہ ۔ چوبداری محلہ ۔ جوہری محلہ ۔ دلّالی محلہ ۔ بیلداری محلہ ۔ انکی محلہ، رکاب گنج ۔ گھڑیالی، چوک ۔

باغ

چار باغ ۔ عیش باغ ۔ عالم باغ ۔ نظر باغ ۔ قیصر باغ ۔ لال باغ ۔ بادشاہ باغ ۔ سکندر باغ ۔ وزیر باغ ۔ بنارسی باغ ۔ تیلی باغ ۔ ڈالی باغ ۔ خورشید باغ ۔ موسیٰ باغ ۔ جھاکڑ باغ ۔ صفدر باغ ۔ سندر باغ ۔ ہزارہ باغ ۔ مجھتیا باغ ۔ بلند باغ (وزیر گنج) ۔ باغ شیر جنگ ۔ باغ آشیر بی بی ۔ باغ مرزا جعفر ۔ باغ قاضی ۔ باغ مکّا ۔ باغ متّو ۔ باغ مولوی انوار ۔ باغ ناظم صاحب ۔ دلکشا باغ ۔

منڈی

چک منڈی ۔ دال منڈی ۔ گھسیاری منڈی ۔ غازی منڈی ۔ بھوسہ منڈی ۔ تمباکو منڈی ۔ بھیڑی منڈی ۔ مرزا منڈی، چوک ۔ چرس منڈی، بشرت گنج ۔ سبزی منڈی قیصر باغ ۔ سبزی منڈی چوک ۔

کنویں

لال کنواں ۔ کنکر کنواں ۔ بھولا ناتھ کا کنواں ۔ چھاچھی کنواں، ڈیوڑھی آغا میر ۔ کپتان کنواں، چوک ۔ پتھر کنواں ۔

آباد

امین آباد ۔ نظیر آباد ۔ حیدر آباد ۔ حسین آباد

خانہ

گنبد خانہ، حسین آباد ۔ چاندی خانہ ۔ مرغ خانہ ۔ فیل خانہ ۔ شُتر خانہ، مقبول گنج ۔ چھاپہ خانہ ۔ کبوتر خانہ ۔ گھسیاری منڈی ۔ تازی خانہ، مشک گنج ۔ بارود خانہ، گولہ گنج ۔ فراش خانہ، مشک گنج ۔ برف خانہ، مصاحب گنج ۔ رتھ خانہ، مولوی گنج ۔ لنگر خانہ، حسین آباد، خیرات خانہ ۔ ٹوریہ گنج ۔ قید خانہ کا پُل

بی - این - شرغا

کشمیری محلّہ

آج کی زندگی میں شہر اور محلے کی کیا اہمیت ہے ؛ لیکن ذرا غور تو کیجئے ، اودھ اور کشمیر کے تعلق خاطر کشمیریوں کو گومتی کا کنارا کتنا پسند تھا اور اہلِ لکھنؤ کو کشمیر کتنا پیارا تھا اس کا جیتا جاگتا ثبوت کشمیری محلہ ہے ۔لکھنؤ میں اور کسی صوبے کے نام پر کوئی محلہ نہیں ہے ۔

کشمیری پنڈتوں نے جس طرح اردو اور لکھنؤ کو سنوارا اس پر تو کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن خاکسار کچھ نام لکھ رہا ہے مثلاً دیا شنکر نسیم ، سرشار ، وشنو نرائن در ، آنند نرائن ملاّ ، ناول نگار کول ۔ اور ان سب سے بڑھ کر اُردو کا لافانی مجاہد سر تیج بہادر سپرو ۔۔۔ ناموں کی ایک کہکشاں ہے لیکن اس نام کے بعد کوئی نام نہیں لکھا جاسکتا تاہم یہ اشارہ کرکے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ جب تک اُردو اور اُردو تہذیب زندہ ہے نہ ہم کشمیر سے الگ ہوسکتے ہیں اور نہ کشمیر ہم سے ۔

—————— الف ج

کشمیری پنڈت فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے ، ساتھ ہی ساتھ انتظامی صلاحیت اور سوجھ بوجھ بھی ان کی بدرجۂ اتم ہوا کرتی تھی اسی وجہ سے دہلی اور اودھ کے نوابوں کے یہاں انھیں اعلا منصب ملا کرتے تھے ۔

جب ۱۷۷۵ء میں اپنی والدہ بہو بیگم صاحبہ سے اختلافات کی بنا پر نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو کشمیری پنڈتوں کے بہت سے خاندان لکھنؤ چلے آئے اور ایک محلے میں آباد ہوتے گئے جسے بعد میں کشمیری محلے کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ ۱۷۸۰ء کے آس پاس یہ محلہ پورے طور سے آباد ہوگیا تھا ۔

۱۸۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیری محلے میں ۲۰۴ کشمیری پنڈت رہا کرتے تھے ان کی اکثریت اہم سرکاری عہدوں پر فائز تھی ۔

اس محلے کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں کشمیری برادری کے ممتاز افراد رہتے تھے اور یہ بھی کہ اس محلے میں کشمیری پنڈت برادری کے رکھ رکھاؤ اور ان کی انفرادیت برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ بھی یہ محلہ تھا اس محلے میں اپنے باشندوں کی سماجی ، تفریحی اور تہذیبی مراسم ادا کرنے کی ساری سہولتیں موجود تھیں ۔ اس لیے اس تاریخی محلے میں کشمیری پنڈتائین کو محلے کے باہر جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی البتہ مرد اپنی کاروباری یا تہذیبی سرگرمیوں کی بنا پر اس چھوٹی سی دنیا کے باہر جایا کرتے تھے ۔

کشمیری محلہ کشمیری پنڈتوں کی ذات برادری کی سرگرمیوں اور اجتماعات کا اہم مرکز تھا جس سے کشمیری پنڈتوں کی سالمیت برقرار رہی کشمیری محلے کے سالانہ اجتماعات میں ایک تقریب " رشی پیر کا جگ " بھی ہوا کرتی تھی ۔ کشمیری محلے کے افراد اکثر بھولا ناتھ کے باغ میں اکٹھا ہوا کرتے تھے ۔ یہ باغ ایک کشمیری پنڈت کے خاندان کی ملکیت تھا اور اس طرح کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ۔

کشمیری محلے میں ایک شادی خانہ بھی تھا جہاں شادی کی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں، ساتھ ہی ساتھ جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔ اسی شادی خانے میں ۱۹ویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے آغاز میں کشمیری پنڈتوں کی سوشل کانفرنس بھی منعقد ہوتی تھی۔

۱۹۰۴ء میں پنڈت سورج نرائن بہادر نے سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت بشن نرائن در آبر کی حوصلہ افزائی اور ان کی تحریک پر کشمیری برادری کی لڑکیوں کے لیے کشمیری محلے میں ایک گرلس اسکول قائم کیا تھا۔ پنڈت بشن نرائن در کے نام سے اردو ادبی دنیا بہ خوبی واقف ہے۔ انھوں نے ۱۸۸۵ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور لندن سے آئے۔ ان کی انقلابی تقاریر کی بنا پر وہ کانگریس کے ۱۹۱۱ء کے کلکتہ مشن کے صدر بھی چنے گئے۔ ان کے بہت سے مضامین اردو میں شائع ہوتے تھے۔ ایک مضمون کی بہت شہرت ہوئی جس میں انھوں نے فسانۂ آزاد اور فسانۂ عجائب کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

کشمیری پنڈتوں نے اس محلے میں اپنے لیے جو رہائش گاہیں بنوائی تھیں انھیں حویلی کہا جاتا تھا۔ حویلی کے دو حصے ہوا کرتے تھے، ایک زنانخانہ اور ایک مردانہ، ان حویلیوں کے طرز تعمیر پر ایرانی فن تعمیر کا بہت اثر تھا ان کے بہت سے حصوں کے نام بھی ایرانی طرز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً غلام گردش، محراب، ستون وغیرہ۔

فیض آباد سے لکھنؤ آنے والوں میں جن کشمیری پنڈتوں کے آبا و اجداد شامل تھے ان میں پنڈت دیا شنکر نسیم اور پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر اور پنڈت برج نرائن چکبست کے خاندان تھے۔ کول شرغا کے لوگ دربار اودھ کے خاندانی وثیقہ دار اسی محلے میں رہا کرتے تھے۔ اور یہ کشمیری پنڈتوں کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوابی دور میں کشمیری محلہ اشراف، سرکاری اہل کاروں اور دانشوروں کا محلہ سمجھا جاتا تھا۔ مختلف ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں ان لوگوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ نسیم اور چکبست جیسے شاعر، رتن ناتھ سرشار جیسے ناول نگار ادبی تاریخ کے روشن اور درخشندہ ستارے ہیں۔

تحریک آزادی کے ابتدائی دنوں میں کشمیری محلہ گرلس اسکول سیاسی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے کہ پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو اور گوکھلے وغیرہ یہاں آیا کرتے تھے اور سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

کشمیری محلے میں شرغا خاندان کی سات نسلیں گزر چکی ہیں۔ پنڈت شیام منوہر لعل شرغا (۱۸۶۸ء، ۱۹۵۲ء) کے آبا و اجداد آصف الدولہ کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ شیام منوہر لعل شرغا بحیثیت جج غیر معمولی شہرت کے حامل تھے۔ اردو، فارسی اور سنسکرت کے عالم ہونے کے ساتھ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ شرغا خاندان کو اودھ دربار سے وابستگی کی بنا پر بہو بیگم صاحبہ کا وثیقہ آج تک ملتا ہے۔

پنڈت شیام منوہر کو ۱۹۳۵ء میں ان کی خدمات کے سلسلہ میں برٹش سرکار نے رائے بہادر کا خطاب دیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں اس علاقے میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کی طرف سے ایک پارک بنوایا تھا جس کا نام شرغا پارک رکھا۔ اپنی سماجی سرگرمیوں اور منفرد طرز عمل کی بنا پر ہی رائے بہادر کشمیری محلے میں عام طور سے جج کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کو آزادی ملی تو بہت سے کشمیری پنڈتوں کو لکھنؤ سے باہر اچھے اچھے عہدے ملے اور اسی لیے کشمیری پنڈتوں کے بہت سارے خاندان ایک بار پھر ہجرت کر کے بدلے ہوئے سیاسی منظر نامے میں ان کے لیے روزگار کے بہترین ذریعے اور امکانات اور مواقع دوسری جگہوں پر تھے۔ اسی لیے وہ جس طرح فیض آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ اسی طرح یہاں سے بھی چلے گئے اور ان کی جگہ پر دوسرے لوگ آکر آباد ہو گئے۔ انھیں لوگوں میں نواب جعفر علی خاں اثر بھی تھے جو کشمیر ریاست کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے بہت بڑی حویلی خریدی تھی ان کے کوئی لڑکا تو نہیں تھا لیکن ان کی نواسیاں آج بھی اپنے آبائی مکان میں فروکش ہیں۔ اثر صاحب کے علاوہ معزز کائستھوں کے کچھ خاندان آکر آباد ہوئے تھے۔ پنڈت رام نرائن بخشی جو بہت بڑے زمیندار تھے ان کے یہاں اولاد ذکور نہ تھی، انھوں نے ایک فقیر سے اپنی آرزو بیان کی، اس نے یہ مشورہ دیا کہ وہ اگر کشمیری گرلس اسکول کے پاس ایک مسجد بنوادیں تو ان کے لڑکا ہوگا چنانچہ انھوں نے مسجد بنوادی۔ محلہ کے کچھ نوجوان جو اس واقعے سے واقف نہیں ہیں انھوں نے مسجد کا نام بدل دیا ہے۔

کشمیری محلہ اب صرف کشمیری پنڈتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر ذات و فرقے کے افراد یہاں رہ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ تیس برس میں اس محلے میں کوئی ترقیاتی کام نہیں ہو سکا ہے۔ وہ ساری بنیادی سہولیتیں یہاں کے لوگوں کو میسر نہیں ہیں جو عموماً ہر شہری کو ملنی چاہیئے۔ غالباً اب یہ محلہ زوال کا شکار ہے اور یہاں کھنڈرات ویرانی کے آثار نمایاں ہیں، شاید یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ تاریخی یادگار ہے اور بس۔ حالانکہ ایک حد تک درست ہے اس لیے کہ یہاں ہر قدم پر تاریخ کے نقوش مل جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے گنج، بازار، گلی کوچے .. صفحہ ۷۵ کا بقیہ

بازار

کھالہ بازار۔ قندھاری بازار۔ راجہ بازار۔ آئینہ بازار۔ گھسیٹی منڈی۔ جھاؤلال بازار۔ ٹیڑھی بازار۔ مولوی گنج۔

نگر

منصور نگر۔ عالم نگر۔ فاضل نگر۔ محمود نگر۔ سبحان نگر۔ رستم نگر۔ ارادت نگر۔ راجندر نگر۔ مرلی نگر۔ سروجنی نگر۔ اندرا نگر۔ شاستری نگر۔ نرالا نگر۔ چندر بھان گپت نگر۔ بادشاہ نگر۔ گومتی نگر۔ ماہ نگر۔ ملکادم نگر...

گنج

علی گنج۔ بابو گنج۔ چاند گنج۔ منشی گنج۔ ڈالی گنج۔ حسن گنج۔ مفتی گنج۔ مصاحب گنج۔ ٹھاکر گنج۔ بالک گنج۔ رام گنج۔ تحسین گنج۔ نواز گنج۔ تحسین گنج۔ محبوب گنج۔ دولت گنج۔ سعادت گنج۔ بھوانی گنج۔ ترمنی گنج۔ مہدی گنج۔ حیدر گنج۔ نوریہ گنج۔ شاہ گنج۔ یحییٰ گنج۔ رکاب گنج۔ بشک گنج۔ مولوی گنج۔ وزیر گنج۔ گولہ گنج۔ فتح گنج۔ گنیش گنج۔ بشیرت گنج۔ جنگلی گنج۔ امانی گنج۔ نکیٹ گنج۔ رانی گنج۔ بیگم گنج۔ باڑے گنج۔ اودے گنج۔ نتھا گنج۔ حضرت گنج۔ جیین گنج۔ بالا گنج۔

دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی کوچوں کی موجودگی معلوم نہیں ہوتی۔

وفات انیس (دو دسمبر ۱۸۷۴ء) کے بعد کوچہ میر انیس و کوچہ مرزا دبیر یا پھر نیا گاؤں میں کوچہ میر علی جان کے علاوہ کوئی اور کوچے معلوم نہ ہو سکے۔

□□

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مُبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مُبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں میں روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

پنڈت برج نرائن چکبست


روحانی مراکز

آوازیں مختلف ہیں مگر بولتا ہے ایک
باجے ہزاروں بجتے ہیں لیکن صدا ہے ایک

مادیت تقسیم کرتی ہے، مگر
روحانیت تفرقے کی ساری دیواریں
گرا کر
یک جہتی پیدا کرتی ہے۔

——— امجد حسین

راحت علی خاں

سیّد سالار مسعود غازیؒ کا تاریخی آستانہ

اودھ میں قومی یکجہتی کا ایک بڑا مرکز

بہرائچ اترپردیش میں "اودھ" کا ایک پس ماندہ ضلع ہے لیکن زمانۂ قدیم ہی سے بے مثال تاریخی اور روحانی اقدار کا حامل چلا آرہا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ اس ضلع کی تاریخ، مسلم حکمرانوں سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بھی "شراوتی" "سلہٹ مہیلٹ، دگوں (نان پارہ) بھنگا اور چرّدہ کے جوار میں جو پرانے سکّے۔ مورتیاں، برتن اور کتبے وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں ان سے ان کی قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔

بہرائچ کیسے نام پڑا یہ ایک پہیلی بھی ہے۔ پرانی کتابوں کے مطابق 'برہماجی' نے اپنی راجدھانی کا انتخاب اسی ضلع کو کیا تھا، دوسرے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پہلے "گندھروابن" تھا جہاں پانڈوں نے اپنی جلاوطنی کے دن گزارے تھے۔ ہندو دیومالائی (HINDU MYTHOLOGY) عقیدے سے پتہ چلتا ہے کہ "برہماجی" نے بہت سے رشیوں کی ایک کانفرنس یہاں بلائی تھی اسی باعث یہ جگہ "برہم رائچ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ضلع گزیٹیر لکھتا ہے کہ مہاراج رام چندر جی کے ایک "مہاراجہ لو" اپنی حکومت اترکوشل کا نظام یہاں سے چلاتے تھے۔ ضلع کے پرانے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ مسلم سلاطین کی حکمرانی سے پہلے یہاں "بھر قوم" آباد تھی جس کے نام پر یہ بھرائچ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعد میں کثرت استعمال سے ہی بھرائچ اب "بہرائچ" ہوگیا ہے۔

عبدالرحمن ابن بطوطہ کے سفرنامے کے بموجب بہرائچ ایک خوبصورت شہر ہے جو دریائے سرجو کے کنارے آباد ہے۔ اور یہ دریا اپنے کنارے بدلتا رہتا ہے (دریا کی یہ خصوصیت آج بھی قائم ہے۔)

بایں وصف اسی ضلع میں "بدھ مذہب" کی ایک بڑی تیرتھ گاہ "شراوستی" بھی واقع ہے۔ اگر تاریخ پر قیاس کو دخل ہوتا تو بالارک رشی کے آشرم کا یقین بھی بہرائچ میں کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال "شراوستی" بدھ مذہب کا ایک بڑا تیرتھ استھان ہے جہاں مؤرخین کی رائے میں مہاتما گوتم بدھ نے اپنی ریاضت اور فیضان کے لیے ۱۸ چوماسے (یعنی ۲۴ برساتیں) گزارے تھے۔ اس کے علاوہ یہی شراوستی "جین دھرم" کی بھی عبادت گاہ کے لیے مشہور ہے اور ان کے چودھویں گرو سمبھوناتھ جین کا جنم بھی اسی مقام پر ہوا تھا الغرض بہرائچ روحانی اقدار کا حامل چلا آرہا ہے۔

اس روحانی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ اسی بہرائچ سے سلطان محمود غزنوی کے عہدِ حکومت میں ایک نوجوان صالح اور ممتاز بزرگ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے غیر معمولی کارناموں، ان کی انسانیت نوازی کے اعلانوں، مظلوموں کے حق میں ظالموں سے جہاد کرنے اور جامِ شہادت نوش کرکے اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہونے کی ایک ناقابلِ فراموش داستانِ حقیقت بھی جڑی ہوئی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی، سفرنامہ ابن بطوطہ، طبقات اکبری، خزینۃ الاصفیا، تاریخ فرشتہ، منتخب التواریخ، اخبار الاخیار اور عہد جہانگیری کے ممتاز مؤرخ مولانا عبدالرحمن بجنوری کی اہم تصنیف مرأۃ مسعودی وغیرہ جیسی اہم تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس عظیم بزرگ کے حالات اور کردار کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔

اس طرح شمالی ہندستان کا یہ منفرد آستانہ اپنی گوناں گو خصوصیات کے لیے آج بھی ہندو مسلم ایکتا کی ایک علامت بنا ہوا ہے۔ یہ سلسلہ بہت

بسنت پنچمی کے تہوار اگر میوں میں جیٹھ کے سالانہ میلہ کے مراسم اور ماہ رجب میں عرس کی تقریبات کے موقع پر لاکھوں انسانوں کا ایک سیلاب امنڈ کر آجاتا ہے جس میں غیر مسلموں کی نمایاں اکثریت ہوتی ہے جو اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرکے اپنے دامن مراد کو امیدوں سے بھر کر واپس ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار برس سے جاری و ساری ہے۔

مستند تاریخی حوالوں کے بموجب سید سالار مسعود غازی ۲۱، رجب ۴۰۵ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۰۱۵ء کو سلطان محمود غزنوی کی قلعۂ اجمیر کی تسخیر کے دوران عالم وجود میں آئے۔ آپ کا اصلی نام امیر مسعود ہے، والد صاحب سالار ساہو کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کا مزار ستر کھ (بارہ بنکی) میں ہے جو سلطان محمود کے بہنوئی اور ان کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ چار سال کی عمر میں آپ کی تعلیم کا آغاز حضرت ابراہیم نامی ایک بزرگ کی معلمی اور نگرانی میں ہوا۔

تقریباً ۹ برس کی عمر میں آپ نے مروجہ تعلیم اور علوم ظاہری کی تکمیل کر لی تھی اور دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے علوم باطنی کی طرف راغب ہوگئے تھے۔ مسلسل شب بیداری اور عبادتِ الٰہی کا شوق ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس لیے ہر وقت باوضو رہتے تھے اور درویشان اہلِ باطن کی صحبت بابرکت میں اپنا وقت گزارتے تھے، عمدہ لباس اور خوشبو کے دلدادہ تھے۔ باایں اوصاف حمیدہ آپ فن سپہ گری خاص کر تیر اندازی میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ کئی جنگوں میں شریک رہے۔

اس محاذ آرائی کے سلسلے میں ملتان، دہلی، میرٹھ، قنوج، بلگرام اور بدایوں ہوتے ہوئے آپ ستر کھ (بارہ بنکی) تک پہنچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں کا راجہ ہر سال رعایہ کی پہلی اولاد نرینہ کو دیوی جی کی بھینٹ چڑھواتا تھا۔ اتفاق سے اس سال ایسے شخص کی اولاد کی باری تھی جو اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی اس کا باپ پریشان تھا یہ اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنی روداد بیان کی، یہ سن کر حضرت غازیؒ بہرائچ کے لیے کوچ کر گئے۔ اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں لڑکے کو بھینٹ چڑھانے کا انتظام تھا اور آپ نے فوراً راجہ کے سپاہیوں سے جنگ کی اور لڑکے کو موت کے منہ سے بچا لیا لیکن خود لڑتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ واقعہ ۱۴ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰ جولائی [illegible] کا ہے۔ آپ کا مزار اسی جگہ ہے جہاں آپ نے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر اختیار کیا۔

مشہور ہے کہ ایک بار محمد شاہ تغلق نے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ ان کے ہمراہ ممتاز سیاح ابن بطوطہ بھی تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ بادشاہ عین الملک کی بغاوت فرو کر کے دریائے سرجو کو پار کرتا ہوا حضرت مسعود غازی کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ سالانہ میلہ کے ایام تھے گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مزار شریف تک پہنچنے کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اس لیے بادشاہ اندر نہ جا سکا۔

ایک اور تاریخی حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ تغلق خاندان کا ایک دوسرا بادشاہ "فیروز شاہ تغلق" بنگال کی مہم کی کامیابی کے بعد آستانہ پر حاضر ہوا اور وہاں اس کی ملاقات بہرائچ کے ایک بزرگ حضرت امیر ماہؒ سے ہوئی۔ اس نے مزار شریف پر خلقت کا ہجوم دیکھ کر پوچھا کہ اس آستانہ کی کیا کرامت ہے کہ اتنا بڑا مجمع یہاں حاضر ہے۔ حضرت امیر ماہؒ نے جواب دیا کہ یہ کرامت کیا کم ہے کہ ایک جلیل القدر بادشاہ وقت اور میرا جیسا فقیر دونوں اس مزار شریف پر حاضر ہیں۔ بادشاہ اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا پھر اسی نے مزار شریف کی چوحدی قائم کروائی اور موجودہ سنگی قلعہ تعمیر کرایا۔ مزار شریف کی تعمیر جدید کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مزار شریف کے انتظام کے لیے اس نے موضع سنگھا پرا سی وقف کر دیا جو ابھی تک قائم ہے۔

حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔

□□

سچ ہے کہ چھپائے سے محبت نہیں چھپتی
اخلاق نہیں چھپتا ہے الفت نہیں چھپتی
انساں کی کبھی خوبیٔ طینت نہیں چھپتی
چھپ جاتی ہے ہر چیز پر عادت نہیں چھپتی

تاثیر محبت نہیں کچھ آج سے کل سے
عاشق ہے کسی کا جو وہ عاشق ہے ازل سے

چھنو لال دلگیر

سید علی اشرفی

آٹھویں صدی ہجری کے صاحبِ کرامت بزرگ

سید اشرف جہانگیر سمنانی

ضلع فیض آباد میں اشرف پور کچھوچھا اور رسول پور درگاہ گرام سبھاؤں کو ملاکر ٹاؤن ایریا اشرف پور کچھوچھا، جسے کچھوچھا شریف کے نام سے کافی شہرت حاصل ہے۔

وہاں پر حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔ اور بلا امتیاز مذہب، قوم، ذات برادری، زبان، علاقہ، امیر، غریب ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نیز بیرونِ ملک سے زائرین وعقیدت مند حاضری دیتے رہتے ہیں، دفع آسیب کے لیے آستانہ پر خصوصی طور پر ہزاروں افراد شفایاب ہونے کے لئے حاضری دیتے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کے پہلو میں آپ کے بھانجے اور معنوی فرزند حضرت سید عبد الرزاق نور العین جو حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی غوث اعظم کی نسل پاک سے ہیں کا مزارِ اقدس ہے۔

حضرت نور العین کے دو فرزند حضرت سید شاہ حسن خلفِ اکبر سجادہ نشین اور حضرت سید شاہ حسین خلفِ ثانی سجادہ نشین کے مزارات حضرت کے گنبد کے سامنے صحن پہ واقع ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی اولادیں نیز ان کے سجادہ نشینان ہر سال ۲۵ محرم سے ۲۹ محرم تک مختلف مراسم عرس و مراسم سجادگی ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر کے وصال کی تاریخ ۲۸ محرم ۸۰۸ھ ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۸ لاکھ مرید تھے۔

ساتویں صدی ہجری کے آخر ربع میں ساداتِ حسینی کی ایک مضبوط سلطنت خراسان میں قائم تھی جس کی عظمت اور جلالت کا سکہ دیگر سلاطین کے دلوں پر تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، اول تو اس حکومت نے عادل، مدبر سلاطین کے ہاتھوں استحکام پایا۔ دوسرے حکمرانوں کی سیادت ان کی دینی برتری اور مذہبی تشخص کا سبب تھی۔

تیسری صدی ہجری میں سید تاج الدین بہلول نوربخشی نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، جو بڑے صاحبِ فضل وکمال ہوشمند انسان تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند اور اولادیں والیٔ سلطنت ہوئیں اور اسی تسلسل میں حضرت قدوۃ الکبریٰ مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کے والد حضرت سید ابراہیم شاہ تخت نشین ہوئے۔ حضرت سید ابراہیم کی سلطنت کا پایۂ تخت سمنان تھا۔

سمنان کوہِ البرز کے جنوب میں تہران (قدیم رے) اور دامغان کے بیچ میں واقع ہے جو ایران کا ایک نہایت قدیم شہر ہے۔

اسی سرزمین پر آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں ساداتِ حسینی کے ایک فرزند سید اشرف پیدا ہوئے۔ جو بعد میں قدوۃ الکبریٰ محبوبِ یزدانی غوث العالم جہانگیر اوحد الدین کے القاب ومنصب سے نوازے گئے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام حسینؓ سے ہے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کے والد ماجد والیٔ سلطنت کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ عالم فاضل اور وقت کے ولی کامل تھے اور امور سلطنت کے انہماک کے باوجود درس وتدریس کا سلسلہ

جاری رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے دورِ حکومت میں ہزاروں طلبہ مختلف علوم وفنون کے ماہر وکامل ہو کر نکلے۔ جنھوں نے براہِ راست سلطان سید ابراہیم سے علم کے اسباق ختم کرائے تھے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف سمنانی کے استاد مولانا عماد الدین تبریزی استاد تھے۔ ایک سال کی مدت میں حضرت قدوۃ الکبریٰ نے ہفت قرأت کے ساتھ قرآن عظیم ختم فرمایا۔ سلطان حضرت سید ابراہیم خود بھی اپنے لختِ جگر کی علمی استعداد سے متعلق اساتذہ کو ہدایت دیا کرتے تھے۔ اور خود بھی نگرانی فرماتے تھے۔ چنانچہ جب آپ چودہ سال کے ہوئے تو آپ تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کر چکے تھے۔ معقولات منقولات دونوں پر یکساں حاوی تھے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی جب پندرہ سال کے ہوئے تو والدِ ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور رسم کے مطابق تاج شاہی آپ کے سر پر رکھا گیا آپ کی قابلیت، فراست، عدل وانصاف کی دھوم مچ گئی۔ خوشحالی اور فارغ البالی گھر گھر پھیل گئی۔

بارہ سال کا آپ کا عرصۂ حکمرانی صرف دنیاوی امور میں ہی نہیں گزرا۔ بلکہ آپ کا بڑا وقت سلوک کی تعلیم میں اور علمی مشاغل میں صرف ہوا۔ حضرت عبد الرزاق کاشانی سے خصوص الحکم پڑھی اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ اور ہر وقت اللہ کی یاد میں مستغرق رہنے لگے۔ اور معرفتِ الٰہی کا مقصد بن چکا تھا۔

آپ نے ترک سلطنت کیا اور تاج شاہی اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر رکھا۔ اور ان کو نصیحت فرمائی کہ عدل وانصاف وشریعتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی رکھنا اور فرمایا کہ "دائرہ رجال الغیب کی حفاظت کرنا۔ اور پر زور تاکید فرمائی کی سورۂ مبع الشر کی مداومت کرنا اور دنیا کا کوئی کام شریعت کی پابندی میں مانع نہ ہو۔" چھوٹے بھائی کو سلطنت تفویض کرنے کے بعد رختِ سفر باندھا۔ سفر کرتے ہوئے آپ بخارا پہنچے۔ وہاں سے سمر قند آئے جہاں سمر قند کے شیخ الاسلام سے ملاقات فرمائی۔ بھینوں جنگلوں، پہاڑوں اور کابل گھنڈ راستوں سے منزل بہ منزل سفر طے کرتے ہوئے اس وقت کے) صوبہ سندھ (آج کے صوبہ پنجاب) کے شہر اوچھ پہنچے۔

اوچھ شہر اس وقت حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہانگشت کے قیام کی وجہ سے مرجع خلائق تھا۔ دوران قیام اوچھ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور فرمایا کہ فقیر نے جو کچھ آج تک اکابرینِ مشائخ سے نعمتیں حاصل کی تھیں وہ سب کی سب تم کو دیدیں۔

اوچھ شریف سے دہلی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے روضہ کی حاضری دیتے ہوئے دیگر بزرگان سلسلہ چشتیہ کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے دو سال تک پیدل سفر کرتے ہوئے بنگال میں داخل ہوئے۔

پنڈوہ شریف (بنگال) میں آپ کے پیر ومرشد حضرت سلطان المرشدین علاؤ الحق والدین گنج نبات آپ کے منتظر تھے۔

پنڈوہ شریف میں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کی آمد پر سلطان المرشدین شیخ علاؤ الحق والدین گنج نبات کا مع اصحابِ شہر کے باہر تشریف لاکر استقبال کرنا ایک غیر معمولی اور کافی اہم بات تھی۔ جوق در جوق لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت سید اشرف سمنانی نے شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت شیخ نے اٹھا کر سینہ سے لگالیا۔ چار سال تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہے۔ مجاہدات ومکاشفات اشغال ذکر وفکر ہر طرح سے پیر ومرشد کی نگاہ میں کامیاب قرار پائے اور خطاب جہانگیر سے سرفراز ہوئے۔

ایک روز حضرت شیخ جب اسرار وحدت بیان فرما رہے تھے اور حضرت انہماک سے پیر ومرشد کی تقریر سن رہے تھے تو تقریر ختم ہونے پر حضرت پیر ومرشد حضرت مخدوم سید اشرف کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ فرزند اشرف میں نے اپنی استعداد ومقدور بھر کوشش کے ذریعہ تمھیں تعلیم دی اور تربیت کی۔ ہدایت و اسرارِ غیبی سے آگاہ کیا۔ اب مناسب ہے کہ تمھارے لیے کوئی مقام تجویز کیا جائے جہاں جاکر مخلوق خدا جو گمراہی کے دلدل میں پھنسی ہے اور فریب خوردہ صفات میں گرفتار ہے وہ تم سے فیض پائے۔ شیخ نے آپ کے لیے جونپور کا علاقہ منتخب فرمایا اور عید کا دن روانگی کے لیے متعین ہوا۔

آپ منزل بہ منزل کوچ فرماتے رہے۔ قصبۂ محمد آباد گہنہ (ضلع اعظم گڈھ) میں مناقب اصحاب رسولؐ پر ایک بہت ہی جامع تقریر فرمائی۔ مولانا سید خاں اور ان کے معاون قاضی حمید الدین پوری عقیدت سے حاضر خدمت رہے۔ اور کثیر تعداد میں لوگ مشرف بیعت ہوئے۔ ظفر آباد (ضلع جونپور) کی آمد پر وہاں کے ایک مشہور نوجوان عالم دین شیخ کبیر نے انتہائی عقیدت کے ساتھ شرفِ بیعت حاصل کیا۔ دیگر بیشتر افراد بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جونپور ہوتے ہوئے حضرت بیرونِ ہند کے سفر کے لیے روانہ ہوگئے۔

بیرونِ ہند کے سفر سے واپسی پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک عرصہ تک قیام فرمایا۔ حضرت شیخ نے قدوۃ الکبریٰ حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کو مرکزِ رشد و ہدایت و مقام آرام گاہ آخرت سے آگاہ فرمایا۔

بیرونِ ہند کے سفر میں حضرت بصرہ، کربلائے معلیٰ، کاظمین شریفین، نجف اشرف ہوتے ہوئے بغداد تشریف لائے اور اپنے بھانجے، جو حضرت غوث اعظمؒ کی اولاد سے ہیں حضرت سید عبدالرزاق نورالعین کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور انھیں اپنا روحانی جانشین مقرر فرمایا۔

بغداد سے دمشق بعد عید الفطر مدینہ منورہ اور حج کے قریب کعبۃ اللہ تشریف لے گئے۔

حضرت اشرف یمن تشریف لے گئے، جہاں شیخ نظام الدین یمنی آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ بیرونِ ہند سے واپسی پر جب ہندستان کے سفر میں بہار پہنچے تو وہاں حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا وصال ہوچکا تھا۔ مخدوم الملک کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رکھا تھا۔ تارک السلطنت سید زادہ آکر نماز پڑھائیں گے۔ حضرت میر شریف پہونچے اور مخدوم الملک کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی جونپور تشریف لائے، حاکمِ جونپور نے قیام کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ تمھاری حدودِ سلطنت سے باہر رہوں گا۔

آپ کا کچھوچھہ شریف اُس دور میں شاہانِ شرقی جونپور کے حدودِ سلطنت میں تھا۔ جونپور سے جب آپ بعد میں ہر تشریف لائے۔ قرب و جوار کے لوگ آپ کی زیارت کے لیے امنڈ پڑے، اس گاؤں کے بڑے رئیس ملک محمود تھے۔ انھوں نے شاندار استقبال کیا۔ زیارت سے مشرف ہوئے۔ بیعت سے سرفراز فرماتے گئے۔

موضع مذکور سمت مغرب میں قریب ہی ایک گول تالاب کا آپ نے معائنہ کیا جس کے بیچ و بیچ ایک ٹیلہ تھا۔ حضرت نے فرمایا یہی وہ جگہ ہے جو میرے پیر و مرشد نے بہ نظر کشف دکھائی تھی۔ ملک محمود جو سلسلہ اشرفیہ سے وابستہ ہوچکے تھے فرمایا کہ اس ٹیلہ پر ایک جوگی جادوگر رہتا ہے۔

چنانچہ جادوگر نے اپنے جادو کے تمام کمالات اور شعبدے دکھائے اور جب اسے یقین ہوگیا کہ باطل حق پر فتحیاب نہیں ہوسکتا تو وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور حضرت کے پیروں پر گر پڑا۔ اور اسلام قبول کیا، اس کے ساتھ ہی اس کے پانچ سو چیلے بھی مسلمان ہوگئے۔ اس کے اسلام لانے کے بعد قرب و جوار کے پانچ ہزار مشرکین دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۸۳ لاکھ مرید تھے جن میں ۵۳ لاکھ غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

وصال سے قبل حضرت نے قبر تیار فرمائی اور ایک شبانہ روز اس قبر میں رہے — دوسرے روز صبح ایک مضمون تحریر کرکے لائے جو رسالۂ قبریہ و بشارۃ المریدین کے نام سے مشہور ہے۔ جو عقائد، اعتقادات، بشارت و ہدایت پر مشتمل ہے۔ تفصیلِ متن لطائف اشرفی میں موجود ہے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں صرف تین محبوب گزرے ہیں۔ پہلے محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی، دوسرے حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، تیسرے غوث العالم محبوب یزدانی مخدوم سید اشرف سمنانی۔

حضرت قدوۃ الکبریٰ غوث العالم محبوب یزدانی سلطان

سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو اپنے وقت کے بیشتر علوم و فنون میں دسترس تھی۔ قرآن مجید، علم حدیث و فقہ پر پورا عبور تھا۔ علم تصوف میں کمال ادراک تھا۔ قوت حافظہ ایسی تھی کہ ایک سال کے عرصہ میں آپ نے سبع قرأت کے ساتھ قرآن پاک حفظ فرمایا۔ آپ کی تصانیف میں ایک کتاب فتاویٰ اشرفیہ بھی تھی جو جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے۔

ایک طرف اگر آپ کی عملی زندگی ترک دنیا کا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف آپ کا تفقہ یہ بتاتا ہے کہ راہِ طریقت کے رہبر علم دین میں کسی سے کم نہیں۔ حضرت کے ملفوظات، تصانیف، خطوط آپ کی علمی قابلیت پر شاہد ہیں۔

لطائفِ اشرفی خود آپ کے وسعتِ علم اور عملی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب تصوف اسلام کی تمام بنیادی کتابوں کا نچوڑ ہے۔

آپ کے سیکڑوں اشعار لطائفِ اشرفی، مکتوباتِ اشرفی اور دوسری تصانیف میں موجود ہیں۔

دیوان اشرف کے اشعار جو عالمِ بے خودی میں کہے گئے ہیں شعری لطافت، جذبہ اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ نثر میں ان کی انشاء پردازی کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں اگرچہ ان کی فطری روش سادہ نگاری ہے پھر بھی زمانے کے علماء اور امراء میں رائج طرز نگارش نے ان کو پر تکلف اور دشوار راہ پر ڈال دیا تھا۔

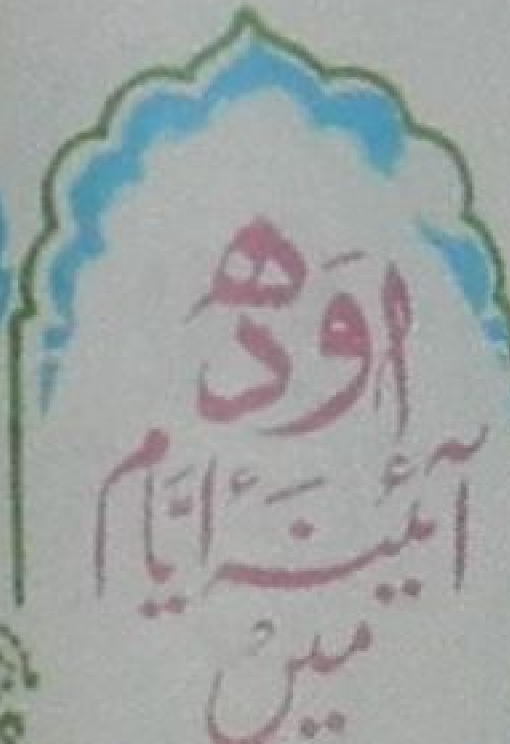
حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصانیف:۔

(۱) نحو اشرفیہ (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب عربی میں تھی حضرت نور العین اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "افضلِ روزگار دستور شد") (۲) شرح ھدایہ (یہ فقہ پر تھی) (۳) شرح عوارف، (۴) شرح خصوص الحکم، (۵) فوائد العقائد۔ (یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی گئی، اس کے بعد اسی کتاب کا عربی ترجمہ کیا۔) فتاویٰ اشرفیہ (جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے) (۷) زیج سامانی (۸) تفسیر نور بخشیہ (۹) کنز الاسرار (۱۰) دیوان اشرف (۱۱) رسالۂ غوثیہ (۱۲) رسالہ در منازل خلفائے راشدین (۱۳) مُراۃ الحقائق (اصلاحات تصوف کی تشریح پر مشتمل) (۱۴) بحر الذاکرین (۱۵) حجتہ الذاکرین (۱۶) حاشیہ بر حواشی مبارک (مولانا برہان الدین مرغیانی) (۱۷) کنز الدقائق (۱۸) شیخ علاء الدولہ سمنانی کی لکھی ہوئی کتاب تاریخ کی فہرست اسماء رجال بھی آپ نے ترتیب دی تھی۔ (۱۹) بشارت الاخوان (۲۰) مکتوباتِ اشرفی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۱) مکتوبات اشرفی مرتبہ حضرت در یتیم (۲۲) لطائف اشرفی (ملفوظاتِ حضرت مخدوم سمنانی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۳) مکتوباتِ اشرفی (جمع شدہ حضرت نور العین) (۲۴) ضمیمہ مکتوباتِ اشرفی (۲۵) اشرف الانساب (یہ کتاب قنوج میں لکھی گئی) (۲۶) فوائد الاشرف (گجرات میں لکھی گئی) (۲۷) اشرف الفوائد (گجرات میں لکھی گئی) (۲۸) بشارت الذاکرین (۲۹) تنبیہ الاخوان (سیف خاں کے لیے لکھی گئی) (۳۰) ترجمہ قرآن پاک بہ زبان فارسی بہ عہد سلطانی قرآن پاک قدیم ترک زمانے کی لائبریری مدینہ منورہ سے حاصل ہوا۔ (۳۱) رسالہ تحقیقاتِ عشق

(۳۲) رسالہ تصوّف و اخلاق

کراچی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی تحقیق کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف کا اردو نثر میں رسالہ تصوف و اخلاق اردو نثر نگاری کی پہلی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ اس سے قبل حضرت محمد گیسو دراز کو اردو نثر کا پہلا مصنف مانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی خود کتاب کے دیباچہ میں درج ہے کہ اس سے قبل شمالی ہند کے بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا تھا۔ پروفیسر احتشام حسین کی تحقیق سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے۔

■■



صبا نقوی

یک جہتی کے علمبردار

حاجی وارث علی شاہ

بارہ بنکی کے پڑوس دیوی شریف میں حاجی وارث علی شاہ کے مزار پر قوالی گائی جارہی ہے:

" دیوداسی کنور کنھیّا
موہن پیارے بنسی دھرّیا
جنم کے راجہ سُندر چھیلا
شیام بہاری " ——

حاجی وارث علی شاہ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سارے مذاہب برابر ہیں۔ ان کا قول ہے:

"نسل اور مذہب کی سرحدوں سے اوپر اٹھو کیوں کہ جو رب ہے وہی رام ہے"۔

ہزاروں اہلِ ہنود اُن کے آستانے پر کھنچ کر آئے اور آج کے زمانے میں بھی دیوی شریف آنے والوں میں کوئی آدھا حصّہ غیر مسلموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

وارث علی شاہ اور اسی قسم کے صوفی بزرگ ہی تھے جو ہندستان میں اسلام کو عوام الناس تک لے گئے۔ اس برصغیر میں زیادہ تر تبدیلیٔ مذہب انھیں صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے بتایا کہ اسلام مساوات اور دردمندی کا مذہب ہے۔ ان کا مذہبی پیغام بہت سیدھا سادا تھا۔ رب کا خدا ایک ہے اور سارے انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ ظاہر ہے ذات پات کے ظلم سے پسے ہوئے لوگوں میں اس پیغام نے گھر کرلیا۔

اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ پوری پوری برادریوں اور پورے پورے گاؤں نے کسی ایک صوفی یا پیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور مسلمان ہوگئے۔

صوفیائے کرام نے جو راہِ طریقت اختیار کی اور اس کا پرچار کیا تو وقت کے ساتھ اس میں مذہب تبدیل کرنے والوں کے بہت سے پُرانے عقائد بلکہ توہمات بھی شامل ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ صُوفیاء کی درگاہوں پر بہت سے ایسے رسوم دیکھنے کو ملتے ہیں جو عالم اسلام میں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ مزاروں پر حاضری، نذرانہ، منت ماننا چراغ روشن کرنا، قبروں پر لوبان سُلگانا، تبرک کے طور پر شیرینی اور پلاؤ وغیرہ تقسیم کرنا، مزاروں کا طواف، مزاروں پر رکھی ہوئی چیزوں اور پیروں کے تبرکات کو بوسہ دینا اور یقین کرنا کہ اس سے بیمار کو شفا ہوگی ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہندستانی اسلام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب ہندو ماحول کی دین ہیں۔ ان بزرگوں کے نام کے ساتھ فوق البشری خصوصیات وابستہ کرنا اور ان کے مزاروں پر سجدہ کرنا ہندو پرستش کے طریقوں سے مستعار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زاہدانِ خشک نے شریعت کا نام لے کر ان چیزوں کو بدعت قرار دیا ہے اور بار بار "اصلاح" کا بیڑا اٹھایا۔ جو چیز انھیں سب سے زیادہ ناگوار تھی وہ یہ کہ ان طریقوں میں انھیں بُت پرستی کا شائبہ ملتا تھا۔ ہندستانی ماحول میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام کو خطرہ ان مسلمانوں سے ہے جو اپنے رسوم لے کر اسلام میں داخل ہوگئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

ہندستان میں مزار پرستی ہندو بت پرستی کی مانند ہے جو مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے سیکھ لی ہے۔"

چوں کہ مزاروں کی عزت اور وہاں کے عرس اور میلے ٹھیلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور تہذیبی بندھن کی شکل اختیار کر چکے ہیں اس لیے ان عوامی مظاہروں کے خلاف تحریکیں اس میل ملاپ کی عمارت کو کمزور کرنے کے مترادف ہیں۔ اصلاحی تحریکوں نے شاید بہت سے مسلمانوں کو اپنے اعمال و رسوم پر نظر ثانی کرنے کے لیے اکسایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستانی اسلام سے اس یک جہتی کی روایت کو یکسر ختم نہیں کر سکیں آج بھی ملک کے بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے جتنی کشش مزاروں اور درگاہوں میں ہے اتنی شاید مسجدوں میں نہیں ہے۔ اتنی اصلاحی تحریکوں کے باوجود یہ روایتیں آج بھی زندہ ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان میں بڑی جان ہے۔ اگر اہل شریعت عام لوگوں کو آج تک صوفیا کی درگاہوں اور ان کے مزاروں سے الگ نہیں کر سکے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل ہندستان میں اسلام کی اشاعت کا سہرہ انھیں صوفی بزرگوں کے سر ہے۔

اتر پردیش ہندوتو کا گڑھ سمجھا جانے لگا تھا لیکن آج بھی صوفیوں کی درگاہیں ہندو مسلم یک جہتی کی پناہ گاہیں ہیں۔ ہزاروں ہندو صوفیوں کی ان درگاہوں پر اس لیے حاضری دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ ان مزاروں سے ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ بہت سے مزار تو ایسے ہیں جو اس لیے زیادہ مقبول ہیں کہ ان کی سرپرستی ہندو کرتے ہیں۔ مثلاً دیوی شریف میں سب سے زیادہ چڑھاوا چڑھانے اور نذرانہ پیش کرنے والی ایک ہندو راجپوت خاتون ہیں جو اجمیر میں رہتی ہیں لیکن ہر دوسرے مہینے درگاہ کی زیارت کے لیے آتی ہیں۔ حاجی وارث علی شاہ کی درگاہ کے آس پاس جو لوگ رہتے ہیں ان میں ان کے ہندو مرید بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ .... یہ سب گیروا لباس پہنتے ہیں اور تارک دنیا کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

نریش سنگھ ایک بھومی ہار ہیں جن کا تعلق بہار سے ہے کئی برس پہلے وہ وارث علی شاہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ابھی حال تک انھوں نے درگاہ کے قریب زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں" کہتے ہیں:

"صرف اس لیے کہ میں نے ایک سنت کی خدمت میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا، یہ کہنا کہ میں ہندو نہیں رہ گیا، غلط ہے۔ وارث علی شاہ کہا کرتے تھے کہ سب مذہب برابر ہیں۔ کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے مذہب سے بہتر ہے۔ وہ مسلمان تھے لیکن دیوالی کے تہوار میں حصہ لیتے تھے۔ میں انھیں کے دکھائے راستے پر چل رہا ہوں!!"

□□

وارث علی شاہ کے چند اقوال

- عشق میں جب تک آدمی کافر نہیں ہوتا، مسلمان نہیں ہوتا۔
- صاحبِ توحید ہونا آسان ہے مگر صاحبِ تصدیق ہونا مشکل ہے
- اسلام اور چیز ہے ایمان اور چیز۔

درسِ اتحاد

کاش ایسا کوئی شاعر ہوتا
معجز نہ بھی ساحر ہوتا
جو لفظوں میں جادو بھر دیتا
مُردوں کو زندہ کر دیتا
مَلتے ہوئے آنکھیں جاگ اُٹھتے
سب نیند کے ماتے متوالے
یوں خون رگوں میں رواں ہوتا
سیلاب میں دَھارا گنگا کا
سب گردِ کدُورت دھو جاتی
نفرت افسانہ ہو جاتی
پھر بھائی سے بھائی مِل جاتا
بے خوفِ جُدائی مِل جاتا

جعفر علیخاں اثر

(اُردو میں قومی شاعری کے سَو سال: علی جواد زیدی)

بشیر فاروقی

لکھنؤ کے مرجعِ خلائق مزارات

لکھنؤ زمانۂ قدیم سے اہل اللہ اور صوفیائے کرام کا مسکن رہا ہے۔ یہاں ایسے بہت سے مرجعِ خلائق مزارات ہیں جو قومی یک جہتی کا مرکز ہیں اور جہاں ہر قوم کے افراد بغیر تفریق مذہب و ملت آتے ہیں اور فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے تذکرے نزہتہ الخواطر، مشائخ نقشبندیہ، آئینۂ اودھ، عین الولایت اولیاء ہند و پاکستان، تذکرۂ اولیاء، اعجاز جہانگیری اور دیگر کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کا نام شجرۂ قادریہ، شجرۂ نقشبندیہ، شجرۂ قلندریہ اور شجرۂ چشتیہ وغیرہ میں مذکور ہے۔ لکھنؤ میں مدفون ان اکابرین سلاسل میں سے چند کے تذکرے درج ذیل سطور میں نذر قارئین ہیں۔

حضرت شاہ قوام الدّین چشتی رحؒ

امام المشرقین، حاجی الحرمین شاہ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مخدوم نصیر الدین کے خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد کے واصل بحق ہونے کے بعد آپ کچھ روز مخدوم جہانیاںؒ کی خدمتِ اقدس میں رہے۔ مخدوم شیخ سارنگ رحؒ نے آپ ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ آپ نے اپنی ساری زندگی رشد و ہدایت میں بسر کی۔ ۸۴۰ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کا مزارِ مبارک میڈیکل کالج لکھنؤ کے احاطہ میں ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت شاہ میناؒ

شیخ الاعظم، قطب العالم حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا نام مُبارک شیخ محمد تھا۔ آپ کے والد محترم کا نام شیخ قطب الدین تھا۔ شیخ قطب الدینؒ دہلی سے جون پور آئے تھے۔ جون پور کے بعد پھر دلمؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد ازاں دلمؤ سے حضرت حاجی الحرمین شیخ قوام الدینؒ کی خدمت میں لکھنؤ پہونچے۔ بچپن ہی میں آپ کے عادات و اطوار سے آثارِ ولایت ظاہر تھے۔ جب آپ پانچ برس کی عمر کو پہونچے تو آپ کو بغرضِ تعلیم مکتب بھیجا گیا۔

معلم نے آپ کو پڑھانا شروع کیا اور کہا: "کہو الف"۔

آپ نے کہا "الف"۔ لیکن جب معلم نے کہا: "کہو ب"۔

تو آپ نے کہا: "دوسرا کہاں ؟" پھر الف کے اس درجہ معنی بتائے کہ مکتب کے طلباء اور معلم سب ہی حیران رہ گئے۔

دس برس کی عمر تک شیخ قوام الدین نے آپ کی تربیت فرمائی اور پھر شیخ صاحب کے حسبِ وصیت آپ نے ان کے خلیفہ قاضی فریدوں اور قاضی فریدوں کے بعد مولانا شیخ اعظم سے بالترتیب شرح کافیہ اور کتاب وقایہ پڑھی، آپ کبھی بے وضو نہیں رہتے تھے۔

عین الولایت میں مرقوم ہے کہ ایک بار شیخ سارنگ رحؒ نے آپ کو کسی شہر بھیجا۔ جب آپ اس شہر سے ہوکر دوبارہ شیخ سارنگ رحؒ کی خدمت میں پہونچے تو حضرت شیخ سارنگ نے فرمایا کہ اس شہر میں ایک اور درویش ہیں تم نے ان سے ملاقات کی کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو آپ ہی کی محبت کافی ہے۔ حضرت شیخ سارنگ رحؒ نے حضرت شاہ مینا رحؒ کی اس بات سے خوش ہوکر انھیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

حضرت شاہ مینا ایک صاحبِ کشف ولی کامل تھے۔ ایک شمس خاں نامی ایک شخص آپ کے پاس اس ارادے سے آیا کہ

ایک انار اس کو دیا اور وہ چاروں طرف سے پھٹا ہو اور اس کے سب دانے سرخ ہوں تو وہ جانے کہ آپ ولی ہیں۔ آپ نے اس کے حسب منشا انار اس کو دیا اور پھر فرمایا:

"فقیروں کا امتحان لینا اچھا نہیں ہوتا۔ انار کی فصل نہیں ہے اگر نہ ہوتا تو میں کیا دیتا۔"

چھ ماہ علیل رہنے کے بعد ۲۲ر صفر ۸۸۴ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ تاریخ وصال کا شعر یہ ہے ؎

شیخ مینا بہ ارم رحلت کرد
آہ ز اندوہ چنیں شیخ اجل

حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اقدس شاہ مینا روڈ متصل میڈیکل کالج لکھنؤ ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت شاہ پیر محمدؒ

آپ جون پور کے سادات میں تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت عبد اللہ سیاح چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ درسی کتابیں جون پور، قنوج اور دہلی میں پڑھنے کے بعد لکھنؤ تشریف لائے۔ آپ متوکل فقرا میں تھے۔ آپ کو جو بھی نذرانے ملتے وہ سب مہمان نوازی میں صرف کر دیتے تھے۔ آپ نے فیض باطنی حضرت شاہ میناؒ کی روح پر فتوح سے حاصل کیا۔ آپ کی متعدد عارفانہ تصانیف اور تالیفات ہیں۔ اکثر مشہور علما تحصیل علم کے لیے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں راہ خدا میں صرف کیں۔ آپ کا مزار مبارک دریائے گومتی کے کنارے ایک ٹیکری پر زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔ یہ مقام ٹیلہ شاہ پیر محمد کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت شاہ عبد الرحمٰنؒ

حضرت شاہ عبد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سادات میں تھے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید محمد حسن تھا۔ آپ کی ولادت ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ میں آثار ولایت نمایاں تھے۔ آپ نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے دور حکومت میں ۱۲۰۴ھ میں لکھنؤ تشریف لائے۔ شروع میں شاہ پیر محمدؒ کے مزار ٹیلے والی مسجد میں کچھ دن رہنے کے بعد آپ مسجد درگاہ حضرت مخدوم شاہ میناؒ میں منتقل ہو گئے۔ اس مسجد میں آپ تقریباً سات سال تک قیام پذیر رہے۔ یہاں کے بعد آپ مسجد محلہ ڈیوڑھی آغا میر متصل سٹی اسٹیشن لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ یہی جگہ اب آپ کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ نواب غازی الدین حیدر کی بیگم شاہ صاحبؒ کی عقیدت مند تھیں۔ انھی نے اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ آپ تلاوت کلام پاک کے بعد بڑی پابندی سے مثنوی مولانا روم پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت صبر و تحمل، بلند اخلاق اور بلند ہمتی کی آئینہ دار تھی۔ مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ آپ ہی کی دعا سے تولد ہوئے تھے۔ آپ فلسفۂ وحدت الوجود کے عظیم مبلغ تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ، سلسلۂ علیہ قلندریہ، سلسلۂ شاریہ، سلسلۂ نقشبندیہ، سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں اجازت و خلافت تھی۔ آپ کی تاریخ وفات ۷ر ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۹ر اپریل ۱۸۳۰ء ہے۔ آپ کا مزار مبارک آغا میر کی ڈیوڑھی متصل سٹی اسٹیشن لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت شاہ مراد اللہ نقشبندیؒ

آپ نسباً فاروقی تھے۔ آپ کی ولادت تھانیسر میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام قلندر بخشؒ تھا۔ آپ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص و حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے خلیفہ تھے۔ آپ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ نعیم اللہؒ کے وصال کے بعد لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ مکتوبات عالیہ جعفر علی فریدی گورکھپور میں مرقوم ہے کہ آپ مشہور اہل سماع چشتی بزرگ حضرت شیخ نظام شاہ بلخی چشتی کی نسل میں ہیں۔ آپ کچھ عرصہ حجرہ مسجد ٹاٹ شاہ فیض آباد میں قیام پذیر رہے۔ آپ ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ ہیں۔ آپ کی کرامتوں کے تذکرے "قطب دائرے" اور "شہر اولیا" میں مرقوم ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۱۲ر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ ہے۔ آپ کا مزار مبارک رائل ہوٹل لکھنؤ کے ایک حصہ میں ہے جس میں آپ کے مزار کا احاطہ مرزا علی لین کی طرف سے ہے۔ یہاں آپ کے سجادہ نشین حضرت کریم اللہ شاہؒ کا بنوایا ہوا ایک اکھاڑہ بھی ہے۔ یہ جگہ اکھاڑہ کریم اللہ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

خواجہ محمد نبی رضا شاہ المعروف دادا میاں رح

آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حسن رضا خاں ہے۔
آپ کی تاریخ ولادت ۱۲۸۴ھ ہے۔ جائے پیدائش بھینوڑی ضلع رام پور ہے۔ آپ جسمانی طور پر بہت قوی تھے اور فوج میں ملازم تھے۔ آپ حضرت شاہ عبدالحیٔ چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے

خواجہ محمد نبی رضا شاہ رح ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور ابتدا میں مسجد محمد خاں میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ ایک صاحب کرامت بزرگ تھے۔ دنیاوی دولت و شہرت سے بے نیاز ہوکر رشد و ہدایت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے ہندوستان کی متعدد زیارت گاہوں کا سفر کیا اور فیضِ روحانی حاصل کیا۔ تاریخ وفات ۴ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ ہے۔ آپ کی درگاہ اسلامیہ قبرستان صدر بازار لکھنؤ سے ملحق مال ایونیو میں فیض بخشِ ہر خاص و عام ہے۔

حضرت مولانا عین القضاۃ رح

آپ کے والد بزرگوار کا نام الحاج سید شاہ محمد وزیر علی تھا. آپ سادات میں سے تھے. آپ ۲۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے. حصول تعلیم کی غرض سے آپ ابتدا میں بمبئی تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ بمبئی میں قیام کرنے کے بعد لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے. آپ حضرت موسیٰ ترکیسری رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے اور انہی کی خدمت میں رہ کر سلسلۂ نقش بندیہ کی تکمیل کی۔

حضرت مولانا عین القضاۃ رح ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔
آپ کا سنِ وفات ۱۳۴۳ھ ہے. سنِ وفات کا شعر یہ ہے؛

گفت عزیزؔ ایں سالِ رحلت
زیرِ زمیں شد مہرِ ملت

آپ کا مزارِ مبارک مدرسۂ عالیہ فرقانیہ چوک لکھنؤ میں زیارت گاہِ ہر خاص و عام ہے۔

"اودھ کی مختصر سی تاریخ میں دو باتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں: کسی حکمراں نے اپنے کسی بھائی، بھتیجے، بیٹے، چچا، باپ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے، اور کوئی بھی آصف الدولہ کے بعد بیس سال سے زیادہ تخت نشیں نہیں رہ سکا اور ہر بادشاہ یا نواب کسی نہ کسی طرح بدنام کیا گیا۔ سعادت علی خاں بخیل، غازی الدین، نصیر الدین حیدر عیاش، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ ملّا اور زاہد مرتاض۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اودھ کی تاریخ انگریزوں نے خود لکھی اور اپنے بہی خواہوں سے اس طرح لکھوائی کہ اپنی بدعہدی اور اپنی جفاکاری کی پردہ پوشی کر سکیں۔ واجد علی شاہ کے بارے میں جس زاویۂ نظر کو اپنایا گیا اور جس نہج سے واقعات کو پیش کیا گیا وہ صرف یہ کہ قرین قیاس نہیں ہیں بلکہ واقعات ایک دوسرے کی تکذیب بھی کرتے ہیں۔ .... شجاع الدولہ انگریزوں سے فیصلہ کن لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن انھیں موقع نہ مل سکا۔"

اردو میں قومی یک جہتی کے عناصر: مجاور حسین رضوی ص ۲۴۳

محمد اسحٰق صدیقی

لکھنؤ کے امام باڑے

لکھنؤ ان شہروں میں سے ہے جن کی اپنی الگ ایک پہچان ہے۔ زمانۂ شاہی کے سیاح لکھنؤ کو باغات کا شہر کہتے تھے۔ وہ لکھنؤ کے امام باڑوں اور محرم کے مداح تھے۔ باغات تو باقی نہ رہے، امام باڑے البتہ باقی ہیں۔ اس لیے اگر لکھنؤ کو امام باڑوں کا شہر کہا جائے تو بجا ہے۔

زمانۂ شاہی میں لکھنؤ کا شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جہاں دو چار قابلِ ذکر امام باڑے موجود نہ ہوں۔ لیکن ان میں سے بیشتر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شہید ہو گئے۔ جو بچ رہے ہیں ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوابینِ اودھ کو عزاداری سے کتنا شغف تھا۔ اسلامی فنِ تعمیر میں مسجدوں اور مقبروں کے بعد امام باڑوں کا ایک اہم مقام ہے اور یہ اضافہ نوابینِ اودھ کے مذہبی انہماک اور سرپرستی کا نتیجہ ہے۔

اگر امام باڑوں کی آرائش اور رونق دیکھنا ہے تو محرم میں دیکھیے۔ سال کے گیارہ مہینے تو ان کے آرام کا زمانہ ہے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی وہ جاگ اٹھتے ہیں۔ جس نے محرم میں بڑے امام باڑے، چھوٹے امام باڑے اور شاہ نجف کی روشنی دیکھی ہے، یوم کی صبح اور تعزیوں کے شاندار جلوس دیکھے ہیں وہ محرم کی تمدنی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ (یہ جلوس جن میں زمانۂ شاہی کی عزاداری کی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی تھی ۱۹۷۷ء سے بند ہیں)

لکھنؤ کے محرم کا مقابلہ اگر کسی تہوار سے کیا جا سکتا ہے تو وہ میسور کا دسہرہ ہے۔ دونوں کی بنیاد حق و باطل کی جنگ پر ہے۔ دسہرے کا اختتام وجے دشمی پر ہوتا ہے اور محرم کا عشرہ پر۔ دونوں دس دن منائے جاتے ہیں۔ رام (مجسم حق) راون (پیکر شر و فساد) پر فتح یاب ہوتے ہیں اور امام حسین یزید کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو کر فتح مبین حاصل کرتے ہیں۔ زمانۂ شاہی میں لکھنؤ کی عزاداری میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ شاید اس کی وجہ دونوں کے اہم واقعات کی مماثلت اور یکساں انجام تھا یعنی باطل پر حق کی فتح۔

امام باڑہ اس عمارت کو کہتے ہیں جو عزاداری کے لیے مخصوص ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ عزاداری کے لیے امام باڑہ بنایا ہی جائے۔ ایک غریب آدمی تخت یا چوکی پر چاندنی بچھا کر تعزیہ رکھ سکتا ہے۔ دیوار کی الماری یا طاق میں چھوٹا سا تعزیہ سجا سکتا ہے۔ اگر مکان میں کئی کمرے ہوں تو ایک کمرہ تعزیے کے لیے وقف کیا جا سکتا ہے جسے شمالی ہند میں "تعزیہ خانہ" اور دکن میں "عاشور خانہ" اور "امام بارگاہ" کہتے ہیں۔ جو عمارت عزاداری کے لیے وقف ہوا سے ایران میں "حسینیہ" کہا جاتا ہے۔ گنگا جمنی تہذیب کے حامل اہلِ لکھنؤ نے اسے امام باڑہ کہا۔

محرم کے علاوہ سال کے دوسرے ایام میں بھی امام باڑوں میں مجلسیں ہوتی ہیں، عام طور پر جمعرات کو۔ چہاردہ معصومین کے یومِ ولادت کے موقع پر محافل منعقد ہوتی ہیں اور یومِ وفات پر مجالس۔ بعض مجلسیں کسی کے مرنے پر ایصالِ ثواب کے لیے ہوتی ہیں۔ انتقال کے بعد پہلے یومِ وفات پر برسی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر سال دیسہ ہوتا ہے۔

بعض امام باڑوں میں قبریں نظر آتی ہیں۔ یہ وہ امام باڑے ہیں جہاں بنوانے والے اپنی وصیت کے مطابق دفن کیے گئے۔ بعض امام باڑے بطور مقبرہ تعمیر کیے گئے۔ بعض امام باڑے افرادِ خاندان کا مدفن ہیں اور بعض میں معاوضہ یا قیمت دے کر قبریں میسر ہو سکتی ہیں۔

عام طور پر امام باڑے کے تین حصے ہوتے ہیں: شہ نشین، جہاں ضریح تعزیے اور علم آراستہ کیے جاتے ہیں۔ یہ حصہ بہ لحاظِ ادب اتنا اونچا ہوتا ہے کہ حاجت مند ہاتھ آسانی سے اندر پہنچ سکتے ہیں، سرِ نیاز خم کیا جا سکتا ہے، آنکھیں بچھائی جا سکتی ہیں اور لب بوسہ لے سکتے ہیں۔

شہ نشین کے آگے دالان ہوتا ہے جو مجلس کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس میں فرش پر دری، چاندنی یا قالین بچھے ہوتے ہیں۔ خاص چیز منبر ہے۔

یہ ایک خاص وضع کا لکڑی کا زینہ ہوتا ہے جس پر بیٹھ کر مرثیہ گو یا ذاکر اس انداز سے واقعۂ کربلا کی تفصیل بیان کرتا ہے کہ اگر انسان کا ضمیر زندہ ہو، حق و باطل میں امتیاز کر سکے اور سینے میں دل کی جگہ پتھر نہ ہو تو آنکھوں میں آنسو آہی جاتے ہیں۔ یہ آنسو سوگوارانِ حسین کی نگاہ میں موتیوں سے زیادہ قیمتی اور انسانیت کی دلیل اور وسیلۂ نجات ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجلس میں شریک ہونے والے اتنے زیادہ ہوں کہ ایک دالان میں نہ سما سکیں۔ اس لیے ایک دالان کے سامنے دوسرا دالان یا برآمدہ ہوتا ہے اور جب وہ بھی بھر جاتا ہے تو بعد میں آنے والے صحن میں بیٹھتے ہیں، حفاظت کے لیے امام باڑے کے گرد چہار دیواری ہوتی ہے جس میں آمد و رفت کے لیے ایک یا دو پھاٹک ہوتے ہیں۔

امام باڑے کی عمارت میں سامنے کے رُخ پر پانچ در ہوتے ہیں جو پنجتن پاک (محمد، علی، فاطمہ، حسَن، حُسین) کی یاد دلاتے ہیں۔ امام باڑے کے دونوں طرف صحنچیاں ہوتی ہیں جن میں بارہ امام کے لحاظ سے بارہ در ہوتے ہیں۔

امام باڑے دو طرح کے ہوتے ہیں: عوامی اور نجی۔ عوامی سے مراد وہ امام باڑہ ہے جہاں ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت شریک مجلس ہو سکتا ہے یا امام باڑے کی زیارت کر سکتا ہے۔ نجی سے مراد وہ امام باڑہ ہے جو مکان کا ایک حصّہ ہو۔ جہاں صاحبِ خانہ کی اجازت یا مدعو کیے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ امام باڑے کے مردانہ اور زنانہ دو حصّے بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے لکھنؤ اور دہلی کی تاریخی عمارتوں میں خاص فرق یہ ہے کہ دہلی کی عمارتیں پتھر کی بنی ہیں۔ لکھنؤ میں پتھر نہ ہونے اور باربرداری کے مصارف سے بچنے کے لیے عمارتیں (جن میں امام باڑے بھی شامل ہیں۔) لکھوری، اینٹوں اور لال چونے سے بنائی گئیں۔ مضبوطی کے لیے گارے میں پسی ہوئی سیپیں، ماش کی دال، شیرہ (راب) اور گڑ ملایا گیا۔ دہلی کے سنگ تراش پتھر کاٹ کر مختلف وضع کے ستون اور محرابیں بناتے اور گل بوٹے تراشتے تھے۔ لکھنؤ کے معماروں نے محرابوں کی آرائش کے لیے مسالے سے گُل بوٹے، بیلیں اور مچھلیاں بنائیں۔ بیرونی دیواروں کو سپاٹ چھوڑنے کے بجائے مسالے سے خاص وضع کی کھڑکیوں (VENETIAN-BLIND) کی نقلیں بنائیں۔ اس اُبھری ہوئی آرائش کو مُنبت کاری (STUCCO — WORK) کہتے ہیں۔ اسے آپ مختلف امام باڑوں اور مسجدوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ لکھنؤ کی چکن میں اس کام کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس تمہید کے بعد لکھنؤ کے موجودہ امام باڑوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) امام باڑہ آصفی

یہ شہرۂ آفاق امام باڑہ نواب آصف الدولہ (زمانۂ حکومت ۱۷۷۵ء–۱۷۹۷ء) نے بنوایا تھا۔ اسے عام طور پر بڑا امام باڑہ کہتے ہیں۔ یہ حسین آباد کے چھوٹے امام باڑے سے کچھ دور سڑک کے کنارے واقع ہے۔ دونوں کے درمیان ایک نہایت عالیشان پھاٹک نظر آتا ہے جسے رومی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں عمارتیں لکھنؤ کی شان ہیں۔ بڑا امام باڑہ ہندوستان میں اسلامی فنِ تعمیر کا آخری شاہکار ہے۔

اس امام باڑے کی تعمیر کا آغاز ۱۷۸۴ء میں دورانِ قحط رعایا پروری کے لیے ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قلعے جیسی یہ عمارت برسوں میں تیار ہوئی ہوگی۔ تاریخِ تعمیر یہ ہے ؎

آستانِ شہید ابنِ شہید (۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء)

اس حیرت انگیز عمارت کا نقشہ کفایت اللہ شاہ جہاں آبادی نے بنایا تھا، لیکن افسوس کہ اب یہ نقشہ موجود نہیں ہے ـــــ اگر ہوتا تو امام باڑے کی بھول بھلیاں کا بھید کھلتا اور زمین دوز راستوں کے راز معلوم ہوتے۔ امام باڑے کی تعمیر کی لاگت کا اندازہ اس زمانے کے ڈیڑھ کروڑ روپے کیا جاتا ہے۔ کام کرنے والوں کی تعداد ... ۲۲ بیان کی جاتی ہے۔

حسین آباد سے بڑے امام باڑے کی طرف آنے پر رومی دروازے کا سامنے کا رُخ نظر آتا ہے۔ یہ بڑے امام باڑے میں داخلے کا خاص دروازہ ہے۔ اس میں تین بلند و بالا در ہیں۔ بڑے بڑے ٹرک سامان سے لدے درمیانی در سے بہ آسانی گزرتے ہیں۔ چھوٹی سواریاں اور پیدل چلنے والے اطراف کے دروں سے آتے جاتے ہیں۔

رومی دروازہ پار کرنے کے بعد دائیں جانب امام باڑے کا پہلا پھاٹک نظر آتا ہے جس میں تین در ہیں، سڑک کے پار اس کے مقابل بائیں جانب کا پھاٹک اس کا جواب ہے جسے نوبت خانہ کہتے ہیں ــــ پھاٹک میں جانے کے بعد ایک کشادہ صحن نظر آتا ہے جس کے بیچ میں

گری سبزہ زار ہے اور دونوں جانب راستے ہیں۔ اس صحن کے سرے پر پھوس کے دالان بنے ہیں جن پر چڑھ کر ایک دوسرا پھاٹک ملتا ہے۔ اس میں بھی تین در ہیں۔ یہ گاؤ دُم کمند وضع کے بنے ہوئے ہیں۔ دالان کے در بند ہیں۔ ان کے سامنے اور زینوں پر خوش نما پودوں کے گملے سجے ہیں۔ اس پھاٹک سے گزرنے کے بعد دوسرا باغ و سبزہ صحن ملتا ہے جس کے دائیں طرف آصفی مسجد اور بائیں جانب باؤلی ہے۔ سامنے امام باڑے کی عالیشان عمارت ایک بلند چبوترے پر بنی ہے۔ اس چبوترے کے سامنے پتھر کے ۱۰ زینے ہیں۔ سامنے کے رُخ محرابوں کے دروازے ملا کر کل ۲۰ در ہیں (۲۳ + ۲ + ۳) جن میں جالی دار لکڑی کے دروازے انگریزی دورِ حکومت کا اضافہ ہیں۔

امام باڑہ بظاہر ایک لیکن درحقیقت تین منزلہ عمارت ہے جس کے تین درجے ہیں: پشت پر تیرہ دروں والی شہ نشین اور سامنے دالان در دالان۔ شہ نشین کی زینت بیش قیمت تعزیے اور علم ہیں۔ مرکزی دالان کی اندرونی لمبائی ۱۶۳ فٹ، چوڑائی ۵۳ فٹ اور بلندی ۵۰ فٹ ہے۔ اس کی دیواریں ۱۶ فٹ موٹی ہیں۔ اتنے بڑے ہال کی چھت میں سہارے کے لیے کہیں بھی لوہے یا لکڑی کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ چھت قالب دار ہے یعنی اس کا وزن کمان دار ڈاٹوں پر بانٹا گیا ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ہال ہے۔ اور اس کی چھت کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شہ نشین اور دالانوں کے دونوں جانب جو صحنچیاں ہیں، ان کی اونچائی ۵۳ فٹ اور دیواروں کی موٹائی ۱۶ فٹ ہے) مرکزی دالان کے وسط میں نواب آصف الدولہ کی قبر ہے۔ اور ان کے پہلو میں ان کی زوجہ شمس النساء بیگم دفن ہیں۔ اس دالان کے سامنے ایک دوسرا دالان ہے۔ یہ دونوں دالان جو مجالس کے لیے وقف ہیں نہایت خوش نما اور بیش قیمت جھاڑ فانوس سے آراستہ ہیں، بعض چھت سے لٹک رہے ہیں اور بعض فرش پر رکھے ہیں۔ یہ بلجیم اور انگلستان کے بنے ہیں۔ ان کے علاوہ شہ نشین کے سامنے چند بہت بڑے آئینے آراستہ ہیں جن کے فریم سنہری ہیں۔ جو شیشہ آلات موجود ہیں وہ بہت کم ہیں۔ بیشتر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہوگئے۔ محرم میں جب یہ روشن کیے جاتے ہیں تو امام باڑے میں رنگ و نور کا سیلاب آجاتا ہے۔ آٹھویں اور نویں محرم کو اس امام باڑے میں روشنی کی جاتی ہے (انھیں تاریخوں میں چھوٹے امام باڑے اور شاہ نجف میں بھی روشنی ہوتی ہے) نویں محرم کو آگ کا ماتم ہوتا ہے۔ روشنی اور آگ کا ماتم دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔

آصفی امام باڑے میں پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل کی چھت تک بھول بھلیاں ہے جس کے راستے اور در یکساں ہیں۔ دروں کی اونچائی اور ستونوں کی چوڑائی اتنی ہے کہ بیک وقت ایک تندرست انسان گزر سکتا ہے۔ دروں کی تعداد ۴۸۹ اور راستے ہزار بیان کیے جاتے ہیں۔ روشنی اور ہوا کی رسائی کے لیے دیواروں میں جا بجا روشن دان ہیں۔ راستے میں کہیں زینوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کہیں اُترنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راستے مختلف بلندیوں پر ہیں۔

بھُول بھُلیاں میں جانے کا راستہ امام باڑے کے باہر بائیں جانب ہے (باہر سے اندر آنے کے لحاظ سے) اگر گائڈ ساتھ نہ ہو تو انسان گھنٹوں بھٹکتا رہے۔ اور باہر نہ نکل سکے۔ کہا جاتا ہے کہ امام باڑے کی موٹی موٹی دیواریں اور محرابوں کے پائے بھی کچھ کھلے ہیں۔ ان میں بھی بھُول بھلیاں کا کچھ حصّہ ہے۔ اسی طرح فرش کے نیچے تہہ خانے اور پُر پیچ راستے ہیں۔ ان میں جو گیا کبھی واپس نہ آیا۔ اسی لیے انھیں احتیاطاً انگریزی دورِ حکومت میں بند کر دیا گیا۔

امام باڑہ، بھُول بھُلیاں، باؤلی اور رومی دروازہ دیکھنے کے لیے دن بھر لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ بھیڑ میں مقامی، ملکی اور غیر ملکی ہر طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ یہ لکھنؤ کی واحد عمارت ہے جسے دیکھنے کے لیے بیرونی سیاح خاص طور سے آتے ہیں۔

آصفی امام باڑہ اور اس سے متعلقہ عمارتیں محکمۂ آثارِ قدیمہ اور حسین آباد ٹرسٹ کی نگرانی میں ہیں۔

(۲) امام باڑہ حسین آباد

اسے عام طور پر چھوٹا امام باڑہ کہتے ہیں۔ اسے اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ نے ۱۸۳۷ء میں بنوایا تھا۔ یہ بڑے امام باڑے سے کچھ دُور اس سڑک پر واقع ہے جو حسین آباد سے ٹھاکر گنج جاتی ہے۔ اس کے شروع اور آخر میں سڑک پر تین دروں والے دو پھاٹک ہیں۔ امام باڑہ سڑک کے بائیں جانب ہے۔ اندر جانے کے لیے سہ درہ پھاٹک ہے۔ اس پھاٹک کا جواب سڑک کے دائیں جانب ہے۔ اسے نوبت خانہ کہتے ہیں۔

پھاٹک میں داخل ہونے پر ایک لوہے کا گیٹ ملتا ہے جس کے اوپر ایک سُنہری مچھلی نصب ہے جو ہوا کا رُخ بتاتی ہے۔ اس پھاٹک کے دونوں جانب دو حسین عورتوں کے سنہری مجسمے نصب ہیں جن کا لباس یونانی ہے۔ ہر عورت لوہے کی ایک لمبی زنجیر تھامے ہے جس کا دوسرا سرا پھاٹک کے بالائی حصے سے بندھا ہے۔

مچھلی والے پھاٹک کے آگے ایک وسیع صحن کے دونوں جانب باغ ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک نہر (مستطیل حوض) ہے جو فواروں سے آراستہ ہے۔ درمیان میں لوہے کا آرائشی پل ہے۔ اس پل کے آگے پہلے ایک کشتی پر دُلدُل کا مجسمہ تھا جو عرصہ ہوا آندھی طوفان میں ٹوٹ گیا۔ اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔

امام باڑے کے صحن کے دائیں گوشے میں ایک خوشنما چھوٹی مسجد اور بائیں جانب شاہی حمام ہے۔ (آصفی امام باڑے میں دائیں جانب ایک بڑی مسجد اور بائیں جانب باؤلی ہے۔) امام باڑے کے دونوں جانب غلام گردش ہے جس کے دائیں طرف کے ایک حجرے میں دُلدُل کا اصطبل ہے۔

نہر کے دونوں جانب تاج محل سے مشابہ دو چھوٹی عمارتیں ہیں۔ دائیں جانب والی عمارت کو شہزادی کا مقبرہ کہتے ہیں۔ اس میں محمد علی شاہ کی بیٹی دفن ہیں جن کا صغر سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بائیں جانب اس مقبرے کا جواب ہے۔

صحن کے سامنے دوسرے سرے پر امام باڑے کی عمارت ایک قدِ آدم اونچے چبوترے پر بنی ہے جس کے دونوں جانب زینے بنے ہیں اور بیچ میں ایک خوشنما حوض ہے۔

امام باڑے کی عمارت کے تین درجے ہیں: شہ نشین، مرکزی دالان اور اگلا دالان (یا کمرہ) جو آگے کو نکلا ہوا ہے۔ اگلے دالان میں سامنے کے رُخ پانچ در ہیں۔ اس کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں جن میں اوپر نیچے پانچ پانچ در ہیں۔ عمارت کی پیشانی اور محرابوں پر خطِ نسخ میں کتبے ہیں۔ مرکز میں تاریخِ تعمیر درج ہے ؎

شہ زمانہ محمد علی بنا فرمود — امام باڑہ پئے ذکرِ مجلسِ حسینؑ
زدوئے آہ دلم خواند نوحہ تاریخ — بنارِ تعزیہ و ماتمِ امام حسینؑ ۱۲۵۳ھ

دھوپ میں چمکتا سنہرا گنبد امام باڑہ کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اس میں کمرخ کی بیسیں پھانکیں ہیں۔ تاج محل سے مشابہ عمارتوں کے کلس کے بیچ کے حصے بادشاہ کے تاج کی نقل ہیں۔ اُن کی سنہری چمک ماند پڑ گئی ہے اور بعض حصے مرمت طلب ہیں۔

شہ نشین میں (بائیں سے دائیں کو) موم کی ضریح، صندل کا تعزیہ، چھوٹے مقفّی بوتل میں ہاتھی دانت کی ضریح، درمیانی در میں چاندی کا روضۂ امام حسینؑ، صندل اور ہاتھی دانت کے بنے امام رضاؑ کے روضے اور قیمتی علم قابلِ دید ہیں۔

شہ نشین کے سامنے مرکزی دالان کے وسط میں دائیں طرف محمد علی شاہ کی قبر ہے اور بائیں طرف ان کی والدہ (ملکۂ عالیہ) کی۔ کچھ دور پر زرنشاںیادہ چاندی کا منبر نظر آتا ہے۔ فرش نہایت خوشنما سنگِ مرمر (سفید)، سنگِ موسیٰ (سیاہ) اور سنگِ عیسیٰ (زرد) کا بنا ہے۔ دیواریں خطاطی کے بہترین نمونوں اور طغروں سے آراستہ ہیں۔ سنہری فریم والے آئینے بھی قابلِ دید ہیں۔ خاص آرائش شیشہ آلات کی ہے۔ بلجیم اور انگلستان کے بنے بھاری بھرکم جھاڑ چھت سے لٹکے اور فرش پر رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ چین کی بنی ہوئی رنگ برنگ ہانڈیاں اور چھابے بھی آویزاں ہیں۔ محرم میں جب ان میں روشنی کی جاتی ہے تب گویا ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ جھاڑوں کے سہ پہل قلموں میں قوس قزح کے سات رنگ نظر آتے ہیں۔ رنگ و نور سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

امام باڑے کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے ذمہ ہے۔ یہ ٹرسٹ (وقف) محمد علی شاہ نے ۱۸۳۹ء میں قائم کیا تھا اور اس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خزانے میں ۳۶ لاکھ روپے جمع کیے تھے۔

(۳) امام باڑہ شاہ نجف

یہ امام باڑہ دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ اس کے دائیں جانب سکندر باغ اور بائیں جانب کچھ دور موتی محل ہے۔ موتی محل کے علاوہ جواہر بھون اور شاہ نجف روڈ (حضرت گنج) سے بھی راستے جاتے ہیں۔ اسے اودھ کے پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر (زمانۂ حکومت ۱۸۲۷ء - ۱۸۱۴ء) نے اعلان بادشاہت (۱۸۱۹ء) سے قبل بنوایا تھا۔ تاریخ تعمیر ہے ؎

باحُسنِ عقیدت نجفِ اشرف را — فرمود بنا نہند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل — ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر

(۱۲۳۲ھ/ مطابق ۱۷-۱۸۱۲ء)

اندرونی پھاٹک پر کتبہ ہے "شبیہ روضہ نجف اشرف" یہ پیغمبر اسلام کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی کے مزار کی نقل ہے جو عراق کے شہر نجف میں ہے۔

پہلا پھاٹک سڑک کے کنارے ہے جس کے اوپر دو شیر بنے ہیں۔ جو حضرت علی کے لقب اسد اللہ (فارسی شیرِ خدا) کی یاد دلاتے ہیں۔ شیروں کے بیچ دو مچھلیوں کے ملتے پر ٹکے ہیں۔ اوپر تاج بنا ہے (جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پھاٹک غالباً اعلانِ بادشاہت کے بعد کا اضافہ ہے) پھاٹک کی محراب گول ہے۔ اس کے دونوں جانب گنبد ہیں۔

اس پھاٹک کے آگے پختہ راستہ ہے جس کے اطراف میں سبزہ زار ہیں۔ اس کے بعد دوسرا پھاٹک ملتا ہے۔ یہاں ایک ملازم ہر ایک گھنٹے کے بعد وقت کے مطابق گھنٹہ بجاتا ہے۔ پھاٹک کے دونوں جانب ملازمین کے رہنے کے لیے کمرے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا پھاٹک ہے جہاں سے روضہ کا جنوبی رُخ اور چھت پر شاندار سفید گنبد نظر آتا ہے۔ گنبد کا کلس سنہری ہے۔ روضہ کی عمارت چوکور ہے۔ اس کے چاروں طرف غلام گردش ہے۔ روضے کے جانبِ مغرب ایک چھوٹی مسجد ہے۔ شمال کی طرف چوتھا پھاٹک ہے۔ اس کے بعد فصیل میں پانچواں پھاٹک ہے جو عام طور پر بند رہتا ہے۔ اس پھاٹک سے کچھ دور دریائے گومتی ہے۔

امام باڑے میں داخلہ چوتھے پھاٹک سے ہوتا ہے۔ برآمدے کے بعد خاص عمارت کے تین دروازے نظر آتے ہیں جن میں برما کے ساگون (TEAK) کی بنی نقشی چوکھٹیں لگی ہیں۔ اندر کا فرش سنگِ مرمر سفید اور سنگ موسیٰ (سیاہ) کا شطرنجی ہے۔ گنبد ہشت پہلو ہے۔ جس کے ہر پہلو میں روشن دان ہے۔ گنبد کے نیچے تین قبریں ہیں۔ بیچ میں غازی الدین حیدر کی، داہنی جانب مبارک محل کی اور بائیں جانب ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر بائیں گوشے میں بادشاہ کی تیسری بیوی سرفراز محل دفن ہیں۔ قبروں پر تعزیے رکھے ہیں۔ آخرالذکر کے نزدیک منبر نظر آتا ہے۔

امام باڑے کا جنوبی در بند کر دیا گیا ہے۔ اس حصے میں شہ نشین ہے جہاں چاندی کی شبیہ نجف اشرف، صندل کا تعزیہ اور علم آراستہ ہیں۔

امام باڑے کی آرائش قابلِ دید ہے۔ بیش قیمت جھاڑ فانوس، رنگین ہانڈیاں چھت سے مناسب فاصلوں پر لٹکی ہیں۔ فرش پر جھکیں (فرش جھاڑ) اور مردنگ رکھے ہیں۔

امام باڑے میں داخل ہوتے ہی دیوار پر فریم کی ہوئی تین تصویریں (OIL PAINTINGS) نظر آتی ہیں۔ غازی الدین حیدر، نواب سر محسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ کی یہ تصویریں مسز جاپلنگ رو (MRS. JOPLING - ROWE) کی بنائی ہوئی ہیں۔

غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خزانے میں ایک کروڑ روپے بطور قرضِ دوام جمع کیے تھے جس کا سود بیگمات کے وثیقے، امام باڑے کی بقا اور عزاداری جاری رکھنے کے لیے وقف کیا تھا۔

غازی الدین حیدر کے بعد ان کی بیگم مبارک محل، ان کے بعد حکیم بندہ مہدی خاں حسبِ وصیت شاہ نجف کے متولی ہوئے۔ ان کے بیٹے اور جانشین حکیم بندہ رضا خاں نے بلا وصیت ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ اس لیے شاہ نجف کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے ذمے کر دیا گیا۔ شاہ نجف کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر یہ امام باڑہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وطن پرستوں نے سکندر باغ کی طرح یہاں بھی انگریزی فوج سے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن شکست ہوئی۔ اس جنگ میں شاہ نجف کا بیش بہا آرائشی سامان لوٹ لیا گیا یا ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جو بچا وہ ہمارے سامنے ہے۔

(۳) امام باڑہ سبطین آباد

یہ امام باڑہ حضرت گنج میں واقع ہے (نمبر ۳۰) اسے عام طور پر لوگ مقبرہ کہتے ہیں کیونکہ یہاں حضرت گنج کے بانی حضرت امجد علی شاہ (زمانہ حکومت ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) دفن ہیں۔

اسے حضرت امجد علی شاہ کے بیٹے واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ تاریخِ تعمیر ہے "آرام گاہ ظل اللہ" (۱۲۶۴ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء) انھوں نے اس کا نام رکھا سبطین آباد (سبط عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نواسا، مراد رسولِ خدا کے نواسوں امام حسن اور امام حسین سے) یہ زمانۂ شاہی کی لکھنؤ میں آخری یادگار ہے۔ معزولی کے بعد واجد علی شاہ نے مٹیا برج کلکتے میں اسی نام کا دوسرا امام باڑہ بنوایا جہاں ان کی دائمی آرام گاہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس امام باڑے کو شدید نقصان پہنچا۔

اس کا سارا آرائشی سامان لٹ گیا۔ امام باڑے کے سامنے دو پھاٹک ہیں جن کے درمیان "مقبرہ روڈ" حائل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سڑک انگریزی دورِ حکومت کی تعمیر ہے۔ پہلے یہاں دونوں پھاٹکوں کے درمیان صحن اور باغ رہا ہوگا۔ سڑک کے دونوں طرف کی عمارتیں بھی بعد کی تعمیر ہیں ــــ امام باڑے کی وسعت کا اندازہ اس کی پشت پر واقع لال باغ کی اس گلی میں جاکر ہو سکتا ہے جس کا نام بی این گھئی لین (B.N. GHAI LANE) ہے۔

امام باڑہ سبطین آباد بڑے امام باڑے کی چھوٹی موٹی نقل ہے۔ عمارت ایک اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جس کے دونوں طرف زینے اور درمیان میں حوض ہے (جسے پاٹ دیا گیا ہے۔)

امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں، ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں طرف دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں اوپر نیچے تین تین در ہیں۔ عمارت ککھوری اینٹ اور لال چونے کی بنی ہے۔ بڑے امام باڑے کی طرح اس کی چھت میں بھی لوہے یا لکڑی کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ محرابوں در پٹ کی مُنبّت کاری قابلِ دید ہے۔

امام باڑے کے داہنی جانب مسجد ہے۔ سامنے صحن کے بیچ میں اندرونی پھاٹک ہے۔ پھاٹک اور صحن کے دونوں طرف غلام گردش ہے جس کے کمروں اور پھاٹکوں میں کرائے دار آباد ہیں۔ اگلے پھاٹک میں دکانیں ہیں، شہ نشین اور بائیں طرف کی صحنچی میں لکڑی کے فرنیچر کا کارخانہ ہے۔ چبوترے کے سامنے جھونپڑیاں اور اوپر ٹین کا بنا گودام ہے۔ امام باڑہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔

(۵) امام باڑہ قاسم علی خاں

یہ امام باڑہ حسین آباد کے نزدیک محلہ پیر بخارا میں ڈھال پر واقع ہے۔ اس کے مقابل چوک کا فائر اسٹیشن اور قریب ہی کونیشور کا مندر ہے۔ اسے نواب قاسم علی خاں خلف مرزا محمد علی سالار جنگ نے آصف الدولہ کے زمانے میں (۱۱۹۶ھ ۔ ۱۷۷۹ء) بنوایا تھا۔ اس کے پاس ہی مرزا علی خاں کا مقبرہ ہے (وفات ۱۷۷۹ء) وہ اور سالار جنگ سگے بھائی اور نواب آصف الدولہ کے ماموں تھے۔

دوسرے امام باڑوں کے برخلاف جن کا رُخ جنوب کی طرف ہے اس کا رُخ مشرق کی طرف ہے۔ یہ کالے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس کی سیاہ دیواروں اور محرابوں پر آیاتِ قرآنی بخطِ نسخ سفید رنگ سے لکھی گئی تھیں اور سفید رنگ سے ظروف، گلدستے، دُلدُل، اونٹ اور بُراق وغیرہ بنائے گئے تھے۔

شہ نشین کی چھت پُرانی ہے۔ سامنے دو دالان ہیں (اگلے دالان کو برآمدہ کہنا مناسب ہوگا) جن کی چھتیں نو تعمیر ہیں۔ خاص عمارت کے پہلوؤں میں صحنچیاں ہیں۔ دروازے لوہے کے ہیں۔ کُل ملا کر نو در ہیں (۲ + ۵ + ۲) امام باڑے کی زینت لکڑی کی ایک ضریح ہے جو امام علی رضاؑ (آٹھویں امام) کے روضے کی نقل ہے۔

امام باڑے کے سامنے ایک وسیع صحن ہے جہاں جا بجا قبروں کے نشان ہیں۔ سالار جنگ (متوفی ۱۲۰۰ھ) اور ان کے بیٹے قاسم علی خاں بھی اسی امام باڑے میں دفن ہیں لیکن قبروں کا پتا نہیں۔ امام باڑہ وثیقہ دفتر کی نگرانی میں ہے۔ عزاداری اور مجالس ہوتی ہیں۔

(۶) امام باڑہ زین العابدین خاں

گول دروازے سے کاکوری جانے والی سڑک پر بائیں جانب کالی چرن انٹر کالج ہے۔ اس سے ملا ہوا ایک شاندار مگر شکستہ امام باڑہ نواب آصف الدولہ کے زمانے (۱۱۹۰ھ ۔ ۱۷۷۶ء) کی یادگار ہے۔ اسے میر زین العابدین خاں (متوفی ۱۳۰۰ھ، مطابق ۱۸۹۲ء) نے صرف کثیر لاہوری اینٹ سے تعمیر کرایا تھا۔ موصوف الماس علی خاں خواجہ سرا کی طرف سے کئی پرگنوں کے عامل تھے۔

اس عمارت میں شہ نشین کے سامنے پانچ پانچ دروں کے دو دالان ہیں۔ چھتیں گرنے کی وجہ سے یہ امام باڑہ عرصۂ دراز تک اینٹوں کا ڈھیر بنا رہا۔ دالان اب بھی بغیر چھتوں کے ہیں۔ شہ نشین کی چھت نئی تعمیر ہے۔ اس کی دیوار پر سنگِ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:

مولانا کلب عابد ہال افتتاح ۲۸ جون ۱۹۹۲ء
بدستِ مولانا کلب جواد صاحب قبلہ منجانب: علی کانگرس

دروں کے پایوں اور محرابوں پر نہایت خوبصورت مُنبّت کاری ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دالانوں کے سامنے وسیع صحن ہے جو آرائش کا محتاج ہے۔ امام باڑے میں حسبِ معمول مجالس ہوتی ہیں۔

(متولی: سید کلب جواد صاحب قبلہ)

(۷) امام باڑہ راجہ جھاؤلال

یہ امام باڑہ ٹھاکر گنج میں واقع ہے۔ اسے نواب آصف الدولہ کے وزیر

راجہ جھاؤ لال نے بنوایا تھا۔ جب قدوۃ العلما سید آقا حسن (متوفی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء) نے یہاں "بیت المال" قائم کیا تب سے یہ اس نام سے مشہور ہو گیا۔

امام باڑے کے راجہ جھاؤ لال کی بنوائی مسجد بھی ہے جو اصلی والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے یہ مسجد امام باڑے کے احاطے میں تھی لیکن سڑک (ٹکاکوری روڈ) نکلنے کی وجہ سے الگ ہو گئی۔

امام باڑے کے دائیں جانب بابا گومتی داس کا مندر ہے (اس کے پیچھے ٹی بی اسپتال ہے) اسے نواب آصف الدولہ (۱۷۹۶ء۔ ۱۷۷۵ء) نے بابا کی رہائش گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی لیے اسے بابا گومتی داس کا استھل بھی کہتے ہیں۔ امام باڑے اور اس مندر کا طرز تعمیر یکساں (مغل اور راجپوت طرز تعمیر کا امتزاج) ہے۔

امام باڑے کا صحن پہلے کافی وسیع تھا لیکن حصار کی دیواریں گر جانے کی وجہ سے لوگوں نے رفتہ رفتہ امام باڑے کی آراضی پر قبضہ کر لیا۔ امام باڑے کے دونوں طرف مکان اور دکانیں ہیں۔

موجودہ عمارت میں شہ نشین کے سامنے دالان ہے۔ دونوں میں نو نو در ہیں۔ دالان کے پہلوؤں میں تین تین در ہیں۔ اس کی چھتیں اور چھجے گر گئے تھے پھر سے بنائے گئے ہیں۔ تعمیر کا کام جو سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء سے شروع ہوا تھا اب مکمل ہو چکا ہے۔ انجمن رضاکاران حسینی اس امام باڑے کی نگرانی کرتی ہے۔ یہاں باقاعدہ مجلسیں ہوتی ہیں۔

(متولی: سید شمس الحسن تاج، سکریٹری انجمن رضاکاران حسینی)

(۸) امام باڑہ ملکہ زمانیہ

یہ امام باڑہ محلہ گولا گنج میں واقع ہے۔ اس کے سامنے جگت نرائن روڈ ہے اور دائیں جانب وہ سڑک ہے جو جھاؤ لال کے پل سے ہو کر امین آباد جاتی ہے۔ اس کے سامنے، دائیں طرف مسجد ملکہ زمانیہ ہے۔ یہ دونوں عمارتیں نواب ملکہ زمانیہ زوجۂ نصیر الدین حیدر نے باہتمام محمد احسن خاں ۱۸۳۶ء میں بنوائی تھیں۔

دسمبر ۱۸۴۳ء میں ملکہ زمانیہ نے بہ زمانۂ امجد علی شاہ انتقال کیا اور اپنے ہی امام باڑے میں دفن کی گئیں لیکن قبر کا پتا نہیں۔ امام باڑے کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ مسجد آباد ہے۔

امام باڑے کی عمارت میں ایک شہ نشین اور اس کے سامنے دو کشادہ دالان ہیں۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ پہلو میں تین دروں والی صحنچیاں ہیں۔ سامنے کی صحنچیاں دو منزلہ تین تین دروں والی ہیں۔ چھتیں سب کی گر چکی ہیں۔ صرف ایک حصے میں دھنیاں، چھانیں اور چند شہتیر باقی ہیں۔

امام باڑے کے صحن کی جگہ ایک کچا میدان ہے جس پر ایک دودھ والے کا قبضہ ہے۔ گائیں امام باڑے کے اندر آرام کرتی ہیں (شاید انھیں بھی سکون کی ضرورت ہے) جا بجا کنڈوں، اپلوں اور گوبر کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اوبڑ کھابڑ زمین اور کوڑے کرکٹ کو پار کر کے امام باڑے میں رسائی ہو سکتی ہے۔

پہلے اس کے صحن میں نہر تھی۔ لب سڑک عظیم الشان پھاٹک تھا۔ در و دیوار پر خوشنما منبت کاری اور رنگ آمیزی تھی لیکن اب کچھ باقی نہیں ہے۔ امام باڑے کی آراضی فروخت ہو چکی ہے جس پر عمارتیں اور دکانیں بن گئی ہیں۔ بہرحال جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُسے مزید بربادی سے بچانے کی اشد ضرورت ہے۔ سید آغا مہدی صاحب مصنف تاریخ لکھنؤ کی رائے میں یہ امام باڑہ اپنی وسعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے۔ امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جھاؤ لال، امام باڑہ ملکہ زمانی بزرگ ترین عمارتیں ہیں۔

(۹) امام باڑہ ولایتی محل

یہ امام باڑہ بیگم والی کوٹھی، ریذیڈنسی (بیلی گارد) میں واقع ہے۔ اس کوٹھی میں کبھی جارج ہاپکنس والٹرز (GEORGE HOPKINS WALTERS) کا خاندان رہا کرتا تھا۔ ان کی ایک بیٹی سے شاہ نصیر الدین حیدر نے ۱۸۲۶ء میں عقد کر کے نواب مخدرۂ علیہ کا خطاب دیا۔ وہ ولایتی محل کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بادشاہ کے انتقال (۱۸۳۷ء) کے بعد وہ دولت سرائے سلطانی سے اپنے والدین کے مکان میں منتقل ہو گئیں اور بعد انتقال (۱۸۴۰ء) اپنے مکان کے صحن میں اپنی ماں کی قبر کے پاس دفن کی گئیں۔ (یہ مکان ان کے قیام کی وجہ سے بیگم والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہو گیا۔)

بیگم والی کوٹھی سے متصل ایک امام باڑہ اور ایک مسجد ہے جنھیں نواب مخدرہ علیا یا ان کی سوتیلی نومسلم بہن اشرف النساء نے بنوایا تھا۔ غدر میں ان دونوں عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔

امام باڑے میں ایک شہ نشین اور سامنے دو دالان ہیں۔ تینوں میں پانچ پانچ در ہیں۔ دونوں جانب تین دروں والی بلند و بالا صحنچیاں ہیں۔ چھتیں سب کی منہدم ہو چکی ہیں۔ سامنے وسیع صحن ہے۔ مشرقی غلام گردش اب باقی نہیں ہے۔ مغربی غلام گردش کی چھت کے ایک حصے پر مسجد ہے جو

بلندی کی وجہ سے دُور نظر آتی ہے۔ امام باڑے میں مُنبتی نقش و نگار اور گل بوٹے نہایت دل کش اور خوشنما بنے ہوئے ہیں جو اس زمانے کے معماروں کی استادی اور چابک دستی کا پتہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا خوبصورت نوک پلک سے درست اور جاذبِ نظر آرائشی کام اس مسجد اور امام باڑے میں بنا ہے ایسا ریذیڈنسی کی کسی عمارت میں نہیں ہے۔

(۱۰) امام باڑہ مُغل صاحب

یہ امام باڑہ درگاہ حضرت عباس کے دائیں جانب محلہ رستم نگر میں وزیر باغ روڈ پر واقع ہے۔ راستہ گلی سے ہو کر پُلیا کے پار ہے۔ اسے تاجدارِ اودھ محمد علی شاہ کی بیٹی مغل صاحب نے ۱۸۶۹ء میں بنوایا تھا۔ مغل صاحب عُرف، اصلی نام اُمت الصغریٰ فخر النساء بیگم تھا۔ بعد انتقال (۸ دسمبر ۱۸۹۳ء) اپنے ہی امام باڑے کے دالان میں دفن کی گئیں۔

امام باڑے کے عالی شان پھاٹک کا صرف ایک پکھا (دائیں جانب کا) باقی ہے جس کے اوپر ایک خوبصورت گُنبد ہے۔ پھاٹک کے اِس حصّے میں اوپر سے نیچے تک نہایت خوشنما مُنبت کاری ہے۔ اس انداز کا نازک اور دل کش کام لکھنؤ کے کسی امام باڑے کے پھاٹک میں نہیں ہے۔

پھاٹک کے دائیں جانب ایک دو منزلہ عمارت ہے جس میں اوپر نیچے پانچ پانچ در ہیں۔ اوپر کے کمروں اور نیچے کی دُکانوں میں کرائے دار آباد ہیں۔ غالباً ایسی ہی عمارت پھاٹک کے بائیں جانب بھی تھی لیکن اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

پہلے پھاٹک سے گزر کر کچھ فاصلے پر ایک دوسرا پھاٹک ملتا ہے جو ادنا درجے کا ہے۔ اس کے اندر کے رُخ پر دو مچھلیاں بنی ہیں۔ امام باڑہ اس پھاٹک کے دائیں جانب ہے۔ پھاٹک سے باہر، بائیں جانب بلندی پر مغل صاحب کی بنوائی ہوئی مسجد ہے۔ دونوں کے راستے کھڑی لکھوری اینٹوں کے بنے ہیں۔

امام باڑہ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہے جس کے دونوں جانب پانچ پانچ زینے ہیں۔ چبوترے کے سامنے ایک وسیع صحن ہے جس کے بیچ میں ایک خوشنما نہر (پختہ مستطیل حوض) ہے۔ صحن کے دونوں جانب غلام گردش ہے جس کے کمروں میں کرائے دار آباد ہیں۔

امام باڑہ ایک شہ نشین اور دو دالانوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ سامنے کے رُخ امام باڑے کے دونوں جانب دو نہایت خوشنما گُنبد ہیں جن کے نیچے کی تعمیر ہشت پہل ہے۔ ان سے ملے ہوئے کمروں میں دونوں جانب اوپر جانے کے لیے زینے ہیں۔ امام باڑے کے اندر کی مُنبت کاری اور رنگ آمیزی قابلِ دید ہے۔ پلستر میں جو مصالحہ صرف ہوا تھا اُس کا جزوِ غالب سنگِ جراحت ہے اور استرکاری میں وہ چمک ہے جو کسی عمارت میں نہیں۔

امام باڑے کا منبر نادرِ روزگار ہے۔ اتنا اونچا منبر ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منبر مغل صاحب کے زمانے کا ہے۔ نہ جانے کون سی لکڑی ہے کہ اب تک دیمک نہ لگی۔

امام باڑہ شیعہ سنٹرل وقف بورڈ کی نگرانی میں ہے۔ کرائے دار بھی اس کے محافظ ہیں۔ باقاعدہ مجلسیں ہوتی ہیں۔ چند سال سے آگ کا ماتم بھی ہوتا ہے۔

(۱۱) امام باڑہ آغا باقر خاں

یہ امام باڑہ چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں واقع ہے۔ اسے نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں (۱۷۷۵ء۔۱۷۵۶ء) آغا اسمٰعیل دلاور جنگ کی خواہش پر ان کے چچا و کار پرداز آغا باقر خاں نے بنوایا تھا۔ آغا باقر نواب شجاع الدولہ کی فوج میں پانچ ہزار سواروں کے رسالدار تھے۔ اُس زمانے میں یہ لکھنؤ کا دوسرا امام باڑہ تھا۔ پہلا امام باڑہ آغا ابو طالب خاں نے بنوایا تھا۔ لیکن اب وہ موجود نہیں ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں نے امام باڑہ آصف الدولہ کو فوجی چھاؤنی قرار دے کر ارد گرد کی ساری عمارتیں مسمار کرا دیں تو یہ امام باڑہ بھی شہید ہو گیا۔ یہاں مرزا کام بخش (خلف مرزا سلیمان شکوہ پسرِ دویم حضرت شاہ عالم ثانی، بادشاہ دہلی) کی قبر تھی۔ اِسی لیے ان کے بیٹے مرزا حیدر شکوہ نے ۱۸۵۹ء میں آراضی کو واگزار کرا کے دوبارہ امام باڑہ بنوایا۔ اب وہ باقی نہیں ہے۔ موجودہ تعمیر کا آغاز ۱۹۷۱ء سے ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

امام باڑے کے دو حصے ہیں: سامنے مردانہ، پیچھے زنانہ۔ آگے پیچھے صحن اور ارد گرد چہار دیواری ہے۔ امام باڑے کی زینت ضریح کے علاوہ ایک خاص وضع کا علم ہے جو زمین کھودنے پر برآمد ہوا تھا۔ امام باڑے کے اندر اور باہر (صحن میں) جا بجا قبریں ہیں۔

یہ امام باڑہ زمانۂ قدیم سے مقبول خاص و عام ہے۔ ہر جمعرات کو عقیدت مند مرد عورتوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شام کو ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے۔ حدیث کسا کی تلاوت اور حضرت علی کی شان میں مناجات ہوتی ہے۔ شب کے ۱۲ بجے تک آنے والوں کی تعداد گھٹ کر سو سوا سو رہ جاتی ہے۔

(متولی: کشور جہاں صاحبہ اہلیہ یوسف اختر صاحب)

(۱۲) امام باڑہ غفران مآب

یہ امام باڑہ چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں واقع ہے۔ (آغا باقر کا امام باڑہ اس سے چند قدم پچھلے بائیں جانب ہے) اس کے سامنے سے وکٹوریہ اسٹریٹ گزرتی ہے اور پشت پر کنگ اسٹریٹ ہے۔ سڑک (وکٹوریہ اسٹریٹ) سے سیدھا راستہ گیا ہے۔ سبزی سے لدے چھکڑوں اور ٹرکوں کی وجہ سے گندہ راستہ پار کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

یہ امام باڑہ ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں مولانا سید دلدار علی صاحب نے بنوایا تھا جو ہندوستان میں اثنا عشری مذہب کے پہلے مجتہد تھے۔ غفران مآب لقب بعد وفات ہوا۔

امام باڑے کے داہنی جانب ایک کمرے میں بانی امام باڑہ ان کی بیگم اور ان کے چھوٹے بیٹے سید العلماء سید حسین مجتہد کی قبریں ہیں۔ (وفات ۱۸۵۶ء بہ عہد واجد علی شاہ۔ لقب بعد وفات علیین مکان) ان کے علاوہ ایک چوتھی قبر ہے جس کے سنگ مزار پر کتبہ ہے "مزار متقی قدوۃ العلماء بانی شیعہ کانفرنس" قبروں پر سنگ مرمر کے تختے نصب ہیں۔ صحن میں فرش کر کے خوشنما فوارے بنائے گئے ہیں۔ حوض (جو بے حد عمیق ہے) سے کچھ ہٹ کر بانی امام باڑہ کی قبر پر کتبہ ہے "مزار مرحوم مجتہد قبلۂ حضرت غفران مآب طاب ثراہ" ان کے بیٹے سید العلماء کی قبر کا تعویذ بہت بڑا ہے۔ کہ اتنا بڑا سنگ مرمر کا تعویذ کسی قبر پر کہیں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایران سے لایا گیا تھا۔

امام باڑے کے داہنی جانب ناکے پر غفران مآب کے بڑے بیٹے سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد کی بنوائی ہوئی مسجد ہے جس کی تعمیر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء۔ سلطان العلماء نے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ (مطابق ۱۸۶۷ء) کو رحلت کی اور امام باڑے کے صحن میں دفن ہیں۔

امام باڑے کی موجودہ عمارت نئی ہے جس کی تعمیر کا سلسلہ سن ۱۹۵۵ء سے مسلسل اب تک جاری ہے۔

امام باڑے میں سامنے کے رُخ پانچ در ہیں جن کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ عمارت کے دونوں جانب برآمدے اور ان کے پیچھے کمرے ہیں۔ جن میں چار چار در ہیں (۳+۵+۳) چھت پر دونوں جانب خوبصورت گنبد ہیں۔ عمارت کا رنگ باہر کی جانب زرد ہے۔ (رنگ خوشنما صدر دروازے کا بھی ہے)

امام باڑے میں داخل ہونے پر پہلے دو دالان (یا کمرے) نظر آتے ہیں جن کا فرش نہایت خوشنما (MOSAIC) کا ہے۔ صرف ایک قبر کچی ہے جو فرش کے نیچے بھی قبریں ہیں۔) دونوں دالان پار کرنے کے بعد شہ نشین کے درمیانی دَر میں امام حسین علیہ السلام کی ضریح کی زیارت ہوتی ہے۔ اس دَر کا دروازہ اور ادھر ادھر کی کھڑکیاں وغیرہ ہیں جن کا رنگ سبز ہے۔ شہ نشین سے متصل دالان میں بائیں جانب منبر نظر آتا ہے۔

دونوں دالانوں کے پہلوؤں میں دو منزلہ صحنچیاں ہیں۔ شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تین تین در ہیں اور اس کے بعد والے (اگلے) دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے دو دو در ہیں (۵+۳+۲)

امام باڑے کے سامنے کچا میدان ہے جس میں جا بجا صدر دروازے (گیٹ) تک قبریں نظر آتی ہیں۔ صحن کے دو حصے ہیں۔ امام باڑے سے متصل وقف خاص ہے جو افراد خاندان کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے آگے وقف عام ہے۔ قبروں کے کتبے پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے علمائے دین، نامور شاعر اور باکمال ادیب یہاں دفن ہیں۔ "اہل قلم حسین شاعر نقش نقوی (تاریخ وفات ۲ مئی ۱۹۹۱ء) کے سنگ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

زندگی چند دن کی رعنائی
پھر ہزاروں برس کی تنہائی

بھلا اسے کون بھلا سکتا ہے۔

امام باڑہ غفران مآب کا نام "شام غریباں" کی مجلس کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ مجلس بروز عشرہ (۱۰ محرم) رات کی تاریکی میں کھلے میدان میں منعقد ہوتی ہے جس کے لیے منبر اندر سے باہر لا کر رکھا جاتا ہے۔ ہر سال بے شمار انسان ریڈیو پر اس مجلس کو سنتے ہیں۔ بیان اتنا پُر اثر ہوتا ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت آبدیدہ ہو جاتا ہے۔

متولیان: مولانا سید کلب حسین صاحب (مرحوم)
" مولانا سید کلب عابد صاحب (مرحوم)



موجودہ: مولانا کلب صادق صاحب، مولانا سید کلب جواد صاحب۔
منتظم مجالس: سید شمس الحسن تاج (شمسی صاحب)

(۱۳) جنت کی کھڑکی

چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں امام باڑہ غفرانمآب سے چند قدم پہلے داہنی جانب ایک سفید دو منزلہ عمارت ہے جس کے سبز پھاٹک کے دائیں طرف دیوار پر ایک دائرے میں "حسن منزل" اور بائیں جانب دیوار پر دوسرے دائرے میں "حسین منزل" لکھا ہے۔ یہی عمارت "جنت کی کھڑکی" ہے۔ اسے حکیم سید یوسف حسین نے ۱۹۱۵ء میں بنوایا تھا۔

یہ امام باڑے کے علاوہ مکان بھی ہے جس میں وارثان رہتے ہیں۔ اس کی عمارت میں خاص بات یہ ہے کہ لکڑی کا کہیں بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ سب دروازے لوہے کے ہیں۔

صدر دروازے کے بعد ڈیوڑھی اور اس کے دونوں طرف کوٹھریاں ہیں۔ ڈیوڑھی کے بعد پختہ صحن ہے۔ اس کے سامنے دالان اور پھر شہ نشین جس کی زینت زمانۂ قدیم کی ایک ضریح ہے۔ دالان کے دائیں جانب [illegible] مسجد ہے اور بائیں جانب دو منزلہ بھی۔

صحن کے دائیں جانب مذکورہ دالان سے متصل غسل خانہ اور پھر ایک کمرہ ہے۔ صحن کے بائیں جانب برآمدے میں باورچی خانہ ہے۔ گھر کے باہر بائیں جانب دکانیں ہیں۔

چہل منبری اس امام باڑے کی خصوصیت ہے۔ یہاں ۹ محرم کی شب کو چالیس چھوٹے چھوٹے منبر آراستہ کیے جاتے ہیں۔ جماعت منتیں [illegible] آتے ہیں۔ بعض مانتے ہیں اور مراد پوری ہونے پر چالیس منبروں پر شیرینی چڑھا کر رسول خدا کی نیاز دلواتے ہیں۔

(۱۴) امام باڑہ سید تقی صاحب

یہ امام باڑہ چوک میں مسجد تحسین علی خاں کی پشت پر واقع ہے۔ [illegible] مسجد کے دونوں طرف گلیوں سے ہو کر ہے۔ تیسرا راستہ عبدالعزیز روڈ (مولانا علی نقی روڈ) سے ہے۔

امام باڑے کی عمارت میں سامنے کے رخ پانچ بلند و بالا [illegible] لوہے کے سبز دروازے لگے ہیں۔ درمیانی در کے اوپر سنگ مرمر کی ایک تختی پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:

حسینیہ حضرت جنت مآب طاب ثراہ
زیر نظر مرمت و تعمیر
سرپرستی جناب صدر العلماء مولانا سید باقر صاحب قبلہ
متولی وقف ہذا ۱۴۰۲ھ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۸۱ء میں پرانی عمارت کی مرمت و تعمیر ہوئی۔ لوہے کے دروازے حفاظت کے خیال سے لگائے گئے ہیں۔ پہلے در دالان میں بجائے جوڑیوں کے قدیم وضع کے لکڑی کے کٹہرے لگے تھے جو ضرورت کے وقت ہٹا دیے جاتے تھے۔

امام باڑے کے دائیں جانب "دانش گاہ ممتاز العلوم" (مدرسہ) اور "کتب خانۂ ممتاز العلوم" ہیں۔ اس کتب خانے میں قلمی کتابوں کا بے نظیر ذخیرہ ہے جو وقف علی الاولاد ہے۔

اس امام باڑے کو ممتاز العلماء فخر المجتہدین سید محمد تقی صاحب نے بنوایا تھا۔ ۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو سنگ بنیاد رکھا۔ فروری ۱۸۶۶ء میں بن کر تیار ہوا۔

اس کے بانی سید العلماء مولوی سید حسین صاحب کے فرزند اور مولوی سید دلدار علی صاحب غفرانمآب کے پوتے تھے۔ ممتاز العلماء اور فخر المجتہدین کے خطاب حضرت امجد علی شاہ (زمانۂ حکومت ۱۸۴۲ء۔ ۱۸۴۷ء) نے دیے تھے۔ بعد وفات (۲۶ دسمبر ۱۸۸۹ء) "جنت مآب" لقب ہوا۔ قبر امام باڑے کے دکھنی دالان سے متصل صحنچی میں ہے۔ پہلو میں آپ کے پسر اکبر و جانشین شمس العلماء سید محمد ابراہیم صاحب مجتہد کا مزار ہے۔ (وفات ۱۲ جنوری ۱۹۰۹ء)

شہ نشین کی زینت کربلائے معلّیٰ کی نقرئی ضریح ہے جو ممتاز العلماء کے زمانے میں عراق سے آئی تھی۔ ضریح کے سامنے دالان (بارگاہ حسینی) میں لکڑی کی خوبصورت جالی لگی ہے۔ شہ نشین کے سامنے تین گز دو دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ اگلے دو دالانوں کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں اوپر نیچے تین تین در ہیں۔ [illegible] پرانی چھتیں کڑی کے تختوں اور شہتیروں کی تھیں۔ اب ان کی جگہ سلیب (SLAB) نے لے لی ہے۔ امام باڑے کے سامنے ایک وسیع صحن یا کچا میدان ہے۔

مجلس میں شریک ہونے والوں کو اندر جگہ نہیں ملتی تو وہ باہر سید ان میں دروں و شامیانے کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

اس امام باڑے کے بارے میں سید آغا مہدی صاحب، مصنف تاریخ لکھنؤ (کراچی ۱۹۷۶ء) کی یہ رائے ہے "یہ امام باڑہ امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جھاؤ لال، امام باڑہ ملکہ زمانی کے بعد چوتھے نمبر پر ہے اور اس سے بڑا کوئی عزاخانہ نہیں ہے"۔ (صفحہ ۸۴)

امام باڑے سے کچھ دور دائیں جانب ایک مختصر سی عمارت ہے جس پر لکھا ہے "آرام گاہ سید العلماء" جہاں افراد خاندان دفن ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) جناب مولانا سید ابوالحسن صاحب والد محترم سید علی نقی صاحب (۲) سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب عرف نقن صاحب (۳) اہلیہ مولانا سید ابوالحسن صاحب (۴) دختر سید علی نقی صاحب۔

آرام گاہ سید العلماء سے متصل ایک قدیم مسجد بھی ہے جس کی مکمل مرمت مولانا سید باقر صاحب قبلہ نے کرائی ہے۔ امام باڑے کے موجودہ متولی مولانا سید باقر صاحب قبلہ، مولانا سید علی نقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔

۱۵۔ امام باڑہ میر باقر سوداگر

یہ امام باڑہ چوک سے متصل جوہری محلہ میں واقع ہے گول دروازہ سے چوک جاتے ہوئے بائیں جانب ایک قدیم پھاٹک ملتا ہے جو گھڑیالی محلہ کے پھاٹک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سے امام باڑے کو سیدھا راستہ گیا ہے۔

امام باڑے کا بلند پھاٹک اور اس کی جوڑیاں مضبوط اور موٹی لکڑی کی بنی ہیں ان کا رنگ سیاہ ہے۔ اوپر کا حصہ خراب کی صورت میں ہے۔ پھاٹک کے دائیں جانب عمارت کے حصے میں ایک دکان ہے۔ پھاٹک کے بائیں جانب گلی میں جانے پر امام باڑے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لمبی دیوار کے نیچے کے حصے کا پلستر غائب ہو چکا ہے جس سے لکھوری اینٹیں اور بعد کی جڑائی نظر آتی ہے۔ اوپر کے حصے کا پرانا پلستر موجود ہے۔ باہر سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عمارت دو منزلہ ہے۔

اس عمارت کو میر باقر سوداگر نے اپنے رہائشی مکان کے قریب بنوایا تھا۔ میر باقر شاہ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء ۱۸۲۷ء) اور ان کے بعد کے بادشاہوں کے زمانہ حکومت میں جواہرات اور شیشہ آلات کے نامی سوداگر تھے۔ انھوں نے مختلف شہروں میں بہت سی کوٹھیاں بھی قائم کی تھیں جن میں ہنڈی پرزے کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ بعد انتقال (۱۸۹۳ء) حسب منشا خود پھاٹک کے سامنے ایسے مقام پر دفن کئے گئے کہ امام باڑے میں زائرین اور شرکاء مجلس کی آمد و رفت کے وقت ان کی قبر پر سے گذرتے ہیں۔

پھاٹک میں داخل ہونے پر دالان نما ڈیوڑھی ملتی ہے جس سے گذر کر ایک دوسرا دالان ملتا ہے جس میں صدر دروازے کے دونوں جانب پانچ پانچ در ہیں۔

پختہ صحن میں قدم رکھتے ہی فرش سے ملی ایک پکی قبر نظر آتی ہے جس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان کی نامور شخصیت حکیم نظیر حسن خاں (متوفی ۱۳۴۸ ہجری مطابق ۱۹۲۹ء) کا مدفن ہے۔

پختہ صحن کے بعد ایک وسیع چبوترہ ہے۔ اس چبوترے کے بعد دو منزلہ امام باڑہ ہے۔ امام باڑے میں ضریح سے مزین شہ نشین کے سامنے تین دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں ایک ایک دروازہ ہے۔ دوسرے دالان (شہ نشین کی طرف سے شمار کرنے پر) کے دونوں طرف ایک منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں تین تین در ہیں ان میں تعزیے رکھے ہیں۔ تیسرے دالان کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں اندر اور باہر تین تین در ہیں۔ باہر والے دالان اور صحنچیوں کے دروازے لکڑی کے ہیں۔

امام باڑے میں وقتاً فوقتاً مرمت ہوتی رہتی ہے۔ پہلے دالان (شہ نشین کی طرف سے شمار کرنے پر) کی چھت قدیم ہے۔ دھنیوں اور جھانپوں کا رنگ سیاہ ہے۔ بعد کے دونوں دالانوں کی چھتیں نو تعمیر ہیں (سلیپ پڑی ہے) امام باڑے کا پختہ فرش بھی بنا ہے۔ باہر کی دیوار کے جو حصے گر گئے تھے نئی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں۔

امام باڑے کے اگلے دو دالان نہایت خوش نما جھاڑ فانوس سے آراستہ ہیں۔ چار بھاری بھرکم جھاڑ فرش پر رکھے ہیں جنھیں بیٹھکیں کہتے ہیں۔ بعض دیوار سے جڑے ہیں۔ ان کی قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

امام باڑے کے دونوں جانب اور سامنے غلام گردش ہے۔ دونوں طرف غلام گردش میں تیرہ تیرہ در ہیں۔ (چبوترے کے اطراف میں چار گلی کے اطراف میں نو) غلام گردش دو منزلہ ہے اوپر کے حصے میں جو کمرے ہیں وہ باہر سے آنے والے نادار طلبا کے قیام کے لیے وقف ہیں ان سے کرایہ نہیں لیا جاتا۔

چبوترے کے دائیں طرف جو پہلا در ہے اس کا دروازہ امام باڑے میں آنے جانے کے لیے دن میں کھلا رہتا ہے۔ اس کے سامنے جو گلی ہے وہ جوہری محلے نزگی محل جاتی ہے۔

چبوترے سے اتر کر بائیں جانب (شمال کی طرف) جو در ہے اسے پار کرنے کے بعد امام باڑے کے باہر ایک بڑی مسجد نظر آتی ہے جسے پیر باقر سوداگر نے بنوایا تھا اس کے سامنے ایک حوض ہے۔ امام باڑے کی پشت پر ایک چھوٹی مسجد ہے جسے کسی اور شخص نے بنوایا تھا۔ دونوں مسجدوں میں تین تین در ہیں۔ مسجدیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے امام باڑوں کے برخلاف (جن کا رخ جنوب کی طرف ہے) اس امام باڑے کا رخ شرق کی جانب ہے۔

امام باڑہ خاندانی وقف ہے اور اس کے صحن میں اہلِ خاندان ہی دفن ہو سکتے ہیں۔

۱۶۔ امام باڑہ ناظم صاحب

یہ امام باڑہ میڈیکل کالج سے نخاس جاتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ کے بائیں جانب شیعہ کالج (آرٹس) سے پہلے واقع ہے۔ اسے مرزا آغا علی خاں عرف آغائی صاحب نے بنوایا تھا۔ وہ زمانۂ واجد علی شاہ میں سلطان پور کے ناظم تھے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔

امام باڑہ عمارتوں کے ایک طویل سلسلے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اس کے گول پھاٹک کے دونوں جانب دکانیں ہیں۔ پھاٹک میں داخل ہونے پر صحن ملتا ہے جس کے سامنے اور اطراف میں اوپر نیچے کمرے بنے ہیں۔ دائیں جانب کے آخری در میں امام باڑے میں جانے کا راستہ ہے

دوسرے امام باڑوں کے بر خلاف (جن کا رخ جانب جنوب ہے) اس کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔ شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے اطراف میں دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں تین تین در ہیں۔ ہر جانب کل ۱۱ در ہیں (۲/۳ + ۲/۵ + ۲/۳) بیرونی دالان اور صحنچیوں کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ امام باڑہ اندر کی جانب نصف سبز رنگ (اوپر کا حصہ) اور نصف (نیچے کا حصہ) سفید چونے سے پُتا ہوا ہے۔ دالانوں کے فرش کے نیچے اہلِ خاندان کی قبریں ہیں۔

امام باڑے کے پانچ در اور ہر جانب کی صحنچی کے ایک ایک در کو ملا کر سامنے کے رخ سات در ہیں۔ امام باڑے کے سامنے اینٹوں کا پختہ صحن ہے جس کے تینوں طرف دو منزلہ غلام گردش ہے۔ ہر جانب اوپر نیچے سات سات در ہیں۔ امام باڑے کے دائیں جانب صحنچی سے متصل اندر آنے کا دروازہ ہے بائیں جانب کی صحنچی کے نزدیک باہر جانے کے لیے دوسرا دروازہ ہے جس کے باہر ایک گلی ہے۔ غلام گردش کے کمروں میں اوپر اہلِ خاندان اور نیچے ان کے متعلقین آباد ہیں۔

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ مجالس و محافل کے لیے اجازت لینا ضروری ہے۔ امام باڑے کے موجودہ متولی مرزا تقی رضا صاحب (ایڈوکیٹ) امام باڑے کی بقا اور تحفظ کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ پہلے دالان کا فرش کچا تھا اب پختہ بنوا دیا گیا ہے۔ شہ نشین کی زینت لکڑی کی ایک نہایت خوشنما ضریح ہے اس کے لیے مناسب ناپ کا چبوترہ بنوا دیا جس کے چاروں طرف چینی مٹی کے خوشنما چوکے (TILES) لگے ہیں ____ امام باڑے کے گول کھمبوں کے نیچے کے حصے مضبوطی کے خیال سے چوکور بنائے گئے ہیں چھتوں کی دھنیاں اور چھانیں کمزور ہو گئی ہیں اسی لیے ان کی جگہ سلیپ ڈلوانے کا ارادہ ہے۔

اس امام باڑے کی خصوصیت چپ تعزیے کی مجالس ہیں جو ۱۸ر صفر سے ۸ر ربیع الاول تک روزانہ صبح ہوتی ہیں۔ یہ تعزیہ یکم محرم سے ۷ر ربیع الاول کی شب تک ڈاکٹر آغا محمد باقر (آلِ بانی چپ تعزیے) کے نئے مکان نمبر ۸ ہم واقع بنجاری ٹولہ (لکھنؤ ۳) میں رکھا جاتا ہے۔ ۷ر ربیع الاول کا دن گذرنے کے بعد رات میں کسی وقت خاموشی کے ساتھ تعزیہ ناظم صاحب کے امام باڑے میں لایا جاتا ہے۔ ۸ر ربیع الاول کی صبح الوداعی مجلس اور ماتم کے بعد لوگ چپ تعزیے کی زیارت کرتے ہیں۔ تعزیہ بنانے والے کاریگر کم یاب ہیں۔ اسی لیے یہ تعزیہ دو تین سال تک محفوظ رکھا جاتا ہے جب کاغذ بوسیدہ اور ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے تو اسے دفن کر دیتے ہیں۔

۱۷۔ امام باڑہ افضل محل

یہ امام باڑہ میڈیکل کالج سے نخاس جاتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ کے

دوسری جانب واقع ہے۔ اس کے سامنے سڑک کے بائیں جانب شیعہ کالج (کارشی) ہے امام باڑے کے باہر کی طرف لال رنگ کی ایک شاندار دو منزلہ عمارت ہے جس کے لوہے کے دروازے (CHANNEL GATE) کے دونوں جانب دکانیں اور اوپر مکانات ہیں۔

پھاٹک میں داخل ہونے پر پختہ فرش والی ڈیوڑھی ملتی ہے جس کے آخر میں لوہے کا ایک دوسرا پھاٹک ہے۔ اس کے سامنے باغیچہ ہے جس کے باہر جانب (جنوب رخ) امام باڑے کی خوشنما عمارت ہے امام باڑے کے سامنے باغیچہ کی جس کے داہنی جانب ایک دو منزلہ پرانی مسجد ہے۔ اس سے ملی ہوئی ایک نئی عمارت ہے۔ امام باڑے کے بائیں جانب مکانات تعمیر کرے ہیں۔

امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں۔ شہ نشین اور دالان میں پانچ پانچ در ہیں۔ دونوں دالانوں کے اطراف میں صحنچیاں ہیں شہ نشین سے متصل ہر صحنچی میں ایک ایک در اور اوپر جانے کے لیے پتلا سا زینہ ہے اگلے دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تین تین در ہیں۔ ان صحنچیوں کی اوپری منزل مستورات کے لیے وقف ہے۔ اگلے دالان کے دروں میں شیشہ لگے ہوئے لکڑی کے دروازے ہیں۔ ان کے اوپر لوہے کا سائبان ہے۔

امام باڑے کے اندر کے حصے کا رنگ ہلکا فیروزی ہے۔ بعض حصے سفید ہیں در و دیوار پر سنہری کام ہے یہ رنگ روغنی (OIL PAINTS) ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر در کی محراب پر دونوں جانب خوشنما مچھلیاں بنی ہیں۔ شہ نشین کے مرکزی در کی محراب کے اوپر بجائے مچھلیوں کے دو لمبی دم والے مور بنے ہیں شہ نشین کے دروں کے گرد دیواروں پر چینی مٹی کے خوشنما ڈیزائنوں والے چوکے (TILES) لگے ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم لیکن رنگ روپ نیا ہے۔

یہ امام باڑہ جس قطعہ آراضی پر بنا ہے وہ کبھی افضل محل کی ملکیت تھی (افضل محل خاں بہادر واجد علی شاہ کی بیگم تھیں) یہ جائداد رانی شہنشاہ بیگم زوجہ فضل علی خاں، تعلقہ دار اکبرپور (ضلع سیتاپور) نے ۱۹۰۱ء میں خریدی تھی ان کے بیٹے راجہ ٹھاکر نواب علی خاں علم موسیقی کی مشہور کتاب "معارف النغمات" کے مولف اور بھات کھنڈے میوزک کالج کے بانیوں میں سے تھے ٹھاکر نواب علی خاں اور ان کے بیٹے کنور یوسف علی خاں دونوں ہی رانی صاحبہ کی زندگی میں داغ مفارقت دے گئے ٹھاکر نواب علی خاں کا مقبرہ امام باڑہ غفران مآب کے نزدیک ہے رانی صاحبہ کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

امام باڑے کے موجودہ متولی مظفر عباس صاحب عرف منصور سلطان ہیں ان کے والد سلطان علی خاں کو رانی صاحبہ نے گود لے لیا تھا اور ان کے نام پر اپنی بنوائی ہوئی عمارت کا نام سلطان منزل رکھا تھا چنانچہ پھاٹک کے داہنی جانب سنگ مرمر کی تختی پر اردو میں اور بائیں جانب سنگ مرمر کی تختی پر انگریزی میں عمارت کا نام اور سنہ تعمیر درج ہے۔

سلطان منزل

۲۶ ستمبر ۱۹۰۷ء مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۲۵ھ

SULTAN MANZIL

1907

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ خاندان کے ایک ممتاز فرد اور خاص مکین ڈاکٹر سید سلیمان حسین (ریڈر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) منصور سلطان صاحب کے سگے بہنوئی ہیں۔

۱۸۔ امام باڑہ اکرام اللہ خاں

یہ امام باڑہ نخاس پولیس چوکی کے نزدیک واقع ہے (اس کی پشت پر شاہ گنج ہے) قدیم عمارت عرصہ دراز تک کھنڈر کی صورت میں باقی رہی۔ اب اس کی جگہ حسینیہ اکرام اللہ خاں اور اکرام بازار ہیں۔ تعمیر جدید کا آغاز ۱۶ نومبر ۱۹۸۶ء کو ہوا تھا۔

نواب اکرام اللہ خاں علامہ تفضل حسین خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ جب نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۶ء میں خان علامہ کو نائب ریاست مقرر کیا تو اکرام اللہ خاں ان کی پیش دستی میں کام کرتے رہے[۴۲] ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ تقریباً ۵۸۰۰ مربع فٹ زمین پر پھیلا ہوا ہے اب اس کی جگہ ایک مختصر سا امام باڑہ ہے جس کی تعمیر کا انداز یہ ہے کہ لوہے کے دروازے (CHANNEL GATE) جس کے دونوں جانب دکانیں اور اوپر مکانات ہیں۔ ڈیوڑھی کے بعد پختہ صحن اور اس کے دونوں جانب دو منزلہ عمارتیں ہیں۔ جن میں کرائے دار آباد ہیں۔ صحن کے بعد امام باڑے کی خاص عمارت ہے پانچ در والے دالان کے پیچھے پانچ در والے برآمدے میں مختصر سی شہ نشین ہے دالان کے اندر داہنی جانب (مغرب رخ) مختصر سی مسجد ہے بائیں جانب اس کا جواب ہے اس کے سامنے منبر رکھا ہے۔ امام باڑے کی پشت پر داہنی جانب ایک خوشنما مینار ہے۔ امام باڑہ شیعہ سنٹرل وقف بورڈ کی نگرانی میں ہے۔

۱۹- امام باڑہ تجمل حسین خاں

یہ امام باڑہ نخاس (چڑیا بازار) کی پشت پر کٹرہ ابو تراب خاں میں واقع ہے۔ راستہ پولیو یونانی اسپتال کے سامنے والی گلی میں سیدھا جاکر بائیں طرف وہاں مڑتا ہے جہاں ڈاکٹر اشوک کمار کے مطب بیڈیکل پوائنٹ کا بورڈ لگا ہے۔ گلی میں جاکر لکھوری اینٹوں کی ایک لمبی دیوار کے بعد نئی وضع کا لکڑی کا سبز پھاٹک نظر آتا ہے (لگا اینٹوں کی جڑائی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پھاٹک دوبارہ بنایا گیا ہے) یہی امام باڑہ تجمل حسین خاں ہے۔ اس کے داہنی اور بائیں جانب گلیاں ہیں۔ بائیں طرف کی گلی میں امام باڑے کے زیر سایہ کرایہ دار آباد ہیں۔

امام باڑے کے پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے ڈیوڑھی ملتی ہے جس پر چھت کی جگہ ٹین پڑی ہے۔ پھر کچا صحن پار کرکے امام باڑے کی عمارت نظر آتی ہے جس میں دو کمرے ہیں۔ آگے والا کمرہ مجلس کے لیے وقف ہے اور پیچھے والا شہ نشین ہے جس کی زینت ضریح کے علاوہ زمانۂ قدیم کا ایک شاندار منبر ہے اس کے بارے میں بیگمات اودھ کے مصنف اور تاریخ لکھنؤ کے مشہور محقق شیخ تصدق حسین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا (امام باڑے کا) منبر ایک نادر اور محو بہ روزگار چیز ہے جس (کے پہلوؤں) جالی دار چوبی تختیاں جڑی ہیں جن میں تاج محل آگرہ کی پتھر کی جالیوں کی ہو بہو نہایت نفیس اور نازک نقل بنائی گئی ہے۔ شاہ روپہلے پینٹ کی وجہ سے یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلے اس کا کیا رنگ تھا اور یہ کس لکڑی کا بنا ہے۔

شہ نشین کے سامنے دالان میں امام باڑے کے بانی کی فرش سے ملی قبر ہے جس پر سنگ مرمر کی ایک مختصر سی تختی لگی ہے جس پر سیاہ حروف میں مندرجہ ذیل کتبہ ہے۔

۷۸۶

یا غفار

مرقد منور جدم نواب تجمل حسین خاں فردوس مسکن
نواب مغفور بتاریخ بست و سوم ماہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ ہجری وفات یافت
محمد ارتضیٰ حسین خاں رئیس خاندان در ۱۲۸۸ھ ہجری نصب کردہ

تجمل حسین خاں خلف تفضل حسین خاں کا انتقال ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۰ جنوری ۱۸۲۰ء کو ہوا تھا۔ سنگ مزار ان کے پوتے نے ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں نصب کرایا۔

امام باڑے سے متصل پکا صحن ہے۔ اس کے آگے کچا صحن ہے جس کے دائیں جانب دو کشادہ دالان ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں سامنے کے رخ پانچ پانچ در ہیں۔ ان کی محرابیں نہایت خوشنما تھیں لیکن اب چند شکستہ باقی ہیں۔ دالانوں کے مقابلے میں امام باڑہ ایک ادنیٰ عمارت ہے موجودہ حالت سے اس کی گذشتہ شان و شوکت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ موجودہ متولی قائم حسین خاں ہیں۔

۲۰- امام باڑہ امیر محل صاحبہ

یہ امام باڑہ مولوی گنج سے متصل رستم بٹھان میں واقع ہے اسے نواب امیر محل صاحبہ نے محکمہ نزول سے اراضی خرید کر بنوایا تھا۔

جان عالم واجد علی شاہ نے بزمانۂ ولی عہدی امیر محل سے عقد کیا تھا۔ تخت نشین ہونے پر دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ مقرر کرکے، خورشید لقا، خطاب دیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں وہ شاہ معزول کے ساتھ کلکتے نہیں گئیں بلکہ علیحدگی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ انھوں نے بارہ بنکی کے قاضی اصغر خاں سے دوسری شادی کی ان سے چار اولادیں ہوئیں جن میں خلف اکبر امجد علی خاں کے بعد ان کے بیٹے بہادر علی خاں امام باڑے کے متولی ہوئے۔ موجودہ متولیہ امیر جہاں بیگم بہادر علی خاں (مرحوم) کی بیٹی ہیں۔ ان کے شوہر کا اسم گرامی طاہر علی خاں ہے امام باڑہ خاندانی وقف ہے۔

امام باڑے کا پھاٹک لب سڑک ہے۔ ڈیوڑھی کے بعد کچا صحن ہے اور پھر دوسری ڈیوڑھی کے بعد پکا صحن جس کے سامنے امام باڑہ ہے۔ امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں تینوں میں پانچ پانچ در ہیں دروازے لکڑی کے ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم ہے لیکن چھتیں بدلی گئی ہیں، جنھیں امجد علی خاں (مرحوم) نے بنوایا تھا۔ امام باڑے کی زینت کربلائے معلیٰ کی ضریح ہے۔ شیشے کے خوشنما جھاڑ، ہانڈیاں، کنول، دیوارگیریاں اور بڑے بڑے تعزیے زمانۂ قدیم کی یادگار ہیں۔

امام باڑے کے اطراف میں مکانات اور سامنے دکانیں ہیں پشت پر دار ثان مذکورہ بالا کا رہائشی مکان ہے (نمبر ۲، رستم بٹھان) امام باڑہ عام طور پر بند رہتا ہے بر سلسلۂ مجالس کھلتا ہے۔

۲۱- امام باڑہ داراب علی خاں

یہ امام باڑہ مولوی گنج میں حیدر مرزا روڈ (چک منڈی کی پشت) پر واقع ہے اسے میاں داراب علی خاں (زمانۂ حیات ۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۱ء) نے بنوایا تھا موصوف حسینی خانم صاحبہ مخاطب بہ نواب ملکۂ عہد نواب ناظر تھے۔ ملکۂ عہد امجد علی

زمانۂ سلطنت ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۶) کی زوجہ تھیں۔ ش

امام باڑہ سڑک کے دائیں جانب ہے اندر جانے کے لیے سبز رنگ کا لوہے کا پھاٹک ہے۔ پھاٹک کے بعد ڈیوڑھی اور پھر صحن ہے۔ سبز، سرخ، سفید اور زرد پیلے روغنی رنگ (OIL PAINT) سے رنگے ہوئے در و دیوار جدید آرائش کا ثبوت ہیں۔ البتہ صحن کی مشرقی دیوار پر بنی ہوئی مچھلی زمانۂ قدیم کی یادگار ہے۔ سنہری روکار پر بنی مچھلی تعمیر نو کی نذر ہو گئی۔ امام باڑے کے ارد گرد دکانیں اور مکانات ہیں۔

امام باڑہ صحن کے دائیں جانب (جنوب رخ) ہے اس کے سامنے صحن کے دوسرے سرے پر حوض ہے۔ امام باڑے کی عمارت میں برآمدے کے بعد دو دالان ہیں اور پھر شہ نشین۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں۔ شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے ایک ایک دروازہ ہے۔ اس کے سامنے منبر والے دالان (کو؟) کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تین تین در ہیں جن کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ شہ نشین کی زینت پیتل کی خوشنما ضریح (شبیہ روضۂ امام حسین) ہے جس پر سونے کی پالش ہے۔ متعدد علم ہیں جن کے پنجے سونے چاندی کے ہیں۔ پٹکوں پر سونے کا بھاری کام ہے۔ چھتوں سے بیش قیمت جھاڑ فانوس لٹکے ہیں۔ یہ سب سامان زمانۂ شاہی کا ہے۔ میاں داماب علی خاں نے امام باڑے کی بقا اور دیگر امور خیر کے لیے دائمی جائداد وقف کی تھی۔

امام باڑہ اچھی حالت میں ہے۔ متولی کا تقرر باضرور تا۔ انتظامی کمیٹی کا تقرر شیعہ وقف بورڈ ایک مدت کے لیے کرتا ہے۔ موجودہ منتظم متولی سید احمد عباس ردولوی (لکچرر شعبہ اردو کرسچن کالج گولہ گنج لکھنؤ) ہیں۔

۲۲۔ امام باڑہ داروغہ میر واجد علی

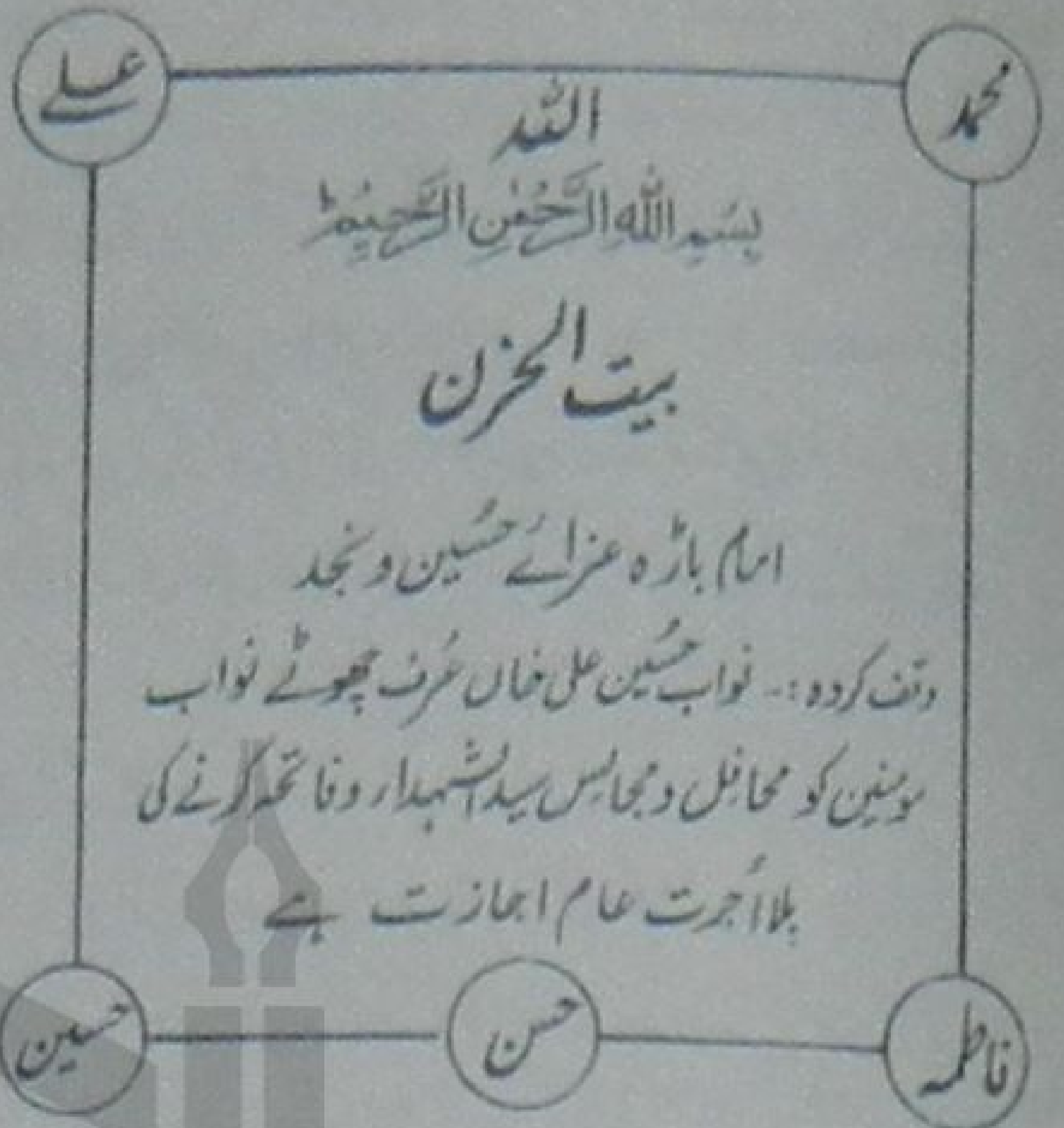
یہ امام باڑہ محلہ گولہ گنج میں بارود خانہ کے بائیں جانب ایک گلی میں واقع ہے۔ میر واجد علی آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی زوجہ نواب سلطان جہاں محل کی ڈیوڑھی کے داروغہ تھے۔ بادشاہ کی معزولی کے بعد سلطان جہاں ان کے ساتھ کلکتے نہیں گئیں۔ لکھنؤ ہی میں رہیں۔ پہلے قیصر باغ میں اور پھر گولہ گنج میں۔ داروغہ میر واجد علی نے آخری وقت تک ان کا ساتھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دو انگریز عورتوں کی جان بچانے کے صلے میں دونوں کی جان بچی۔ سلطان محل کی جاگیر اور جائداد برقرار رہی گزارہ بھی مقرر ہوا میر واجد علی کو سرکار سے لاکھ روپیہ بطور انعام ملا۔

اس امام باڑے کی خصوصیت ۷ محرم کا مہندی کا جلوس ہے جس کی بانیہ سلطان جہاں تھیں۔ مہندی کے جلوس اور دیگر امور خیر کے لیے انھوں نے دائمی جائداد اور زر و جواہرات وقف کیے تھے۔ وقف نامے کے مطابق سلطان جہاں کے انتقال کے بعد میر واجد علی بڑے اہتمام کے ساتھ مہندی کا جلوس اٹھاتے رہے۔ یہ سلسلہ ان کی اولاد نے جاری رکھا جلوس ہائے عزا پر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے اب امام باڑے میں ۷ محرم کو زنانی مجلس ہوتی ہے اور بعد مجلس مہندی کا جلوس امام باڑے میں گشت کرتا ہے۔

داروغہ میر واجد علی کا انتقال ۲۳ دسمبر ۱۸۸۶ء کو ہوا تھا ان کے بیٹے میر نظیر حسین نے اپنے نام پر امین آباد سے متصل مشہور محلہ نظیر آباد آباد کیا تھا۔ سلطان جہاں کی قبر امام باڑے کی شہ نشین کے مرکز میں ہے۔ ان کے بائیں جانب میر واجد علی اور دائیں جانب میر نظیر حسین دفن ہیں۔ امام باڑے کے صحن میں (جہاں پہلے چمن تھا) اور اطراف کے بعض کمروں میں اہل خاندان کی قبریں ہیں۔ شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں۔ ان کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں کل ملا کر سامنے کے رخ نو در ہیں (۲ + ۵ + ۲) سامنے کچا صحن ہے جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں (سابقہ غلام گردش) جن میں کرایہ دار آباد ہیں پھر ڈیوڑھی ہے جن کے دونوں جانب دو کمرے ہیں امام باڑے کی عمارت ایک منزلہ ہے لکھوری اینٹوں اور گارے کی بنی ہے لکڑی کے معمولی پھاٹک پر ایک تختی لگی ہے جس پر دیوناگری حروف میں لکھا ہے "وقف سلطان جہاں صاحبہ، متولی وقف سید حبیب علی خاں عرف راجہ میاں خاقان منزل عقب وزیر گنج لکھنؤ"۔

۲۳۔ امام باڑہ ڈپٹی محمد عظیم خاں

یہ امام باڑہ محلہ وزیر گنج میں بھون پرساد روڈ پر واقع ہے (نمبر ۷۶) اگر آپ سٹی اسٹیشن سے وزیر گنج جائیں تو سڑک کے دائیں جانب پتلی گلی میں کچھ دور جا کر بائیں جانب امام باڑے کا بلند و بالا لکڑی کا پھاٹک نظر آتا ہے جس کے اوپر دیوار میں سنگ مرمر کی تختی نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:



نواب حسین علی خاں ڈپٹی محمد عظیم خاں کے بیٹے تھے۔

نواب حسین علی خاں اور ان کی بہن سلطان زمانی بیگم نے امام باڑہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس وقف کیا تھا۔

ڈپٹی محمد عظیم خاں کا تعلق افغانستان کے شاہ شجاع درانی کے خاندان سے تھا۔ ان کے اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے دہلی میں آبسے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار تک رسائی اور رشتے داری تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل یہ خاندان رفتہ رفتہ لکھنؤ منتقل ہوگیا۔ محمد عظیم خاں اس خاندان کے ایک نمایاں فرد تھے۔ وہ اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کر کے ڈپٹی کمشنر ہوئے اور خان بہادر کا خطاب پایا۔ ۲۲ اگست ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا۔ قبر کربلائے تالکٹورہ میں روضہ کے سامنے ہے۔

امام باڑہ جس عمارت کا حصّہ ہے اس کا پرانا نام محلسرائے ڈپٹی محمد عظیم خاں یا ڈپٹی صاحب کی کوٹھی ہے۔ یہ عمارت انھوں نے بنوائی نہ تھی بلکہ خریدی تھی۔

امام باڑے کے پھاٹک میں داخل ہونے پر پہلے ڈیوڑھی ملتی ہے جس میں بائیں جانب چوڑا زینہ ہے۔ یہ آمد و رفت کی آسانی کے لیے بعد کی تعمیر ہے۔ پہلے پھاٹک سے اوپر تک لکھوری اینٹوں کی ڈھال تھی جس سے ذوالجناح آسانی سے گزر کر امام باڑے کے صحن تک جا سکتا تھا۔ زینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمارت کی کرسی تقریباً ایک منزل بلند ہے۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد داہنی جانب ایک دروازہ ہے اندر داخل ہونے پر ایک وسیع صحن نظر آتا ہے اس میں داہنی جانب (مغرب میں) ایک پانچ دروں والی مسجد ہے اور بائیں جانب (مشرق میں) اس کا جواب دالان کی صورت میں تھا (وہ اب موجود نہیں ہے)

صحن کے سامنے جانب جنوب امام باڑے کی عمارت ایک اونچے چبوترے پر تعمیر ہے۔ چبوترے کے سامنے وسط میں حوض ہے جسے پاٹ دیا گیا ہے۔ امام باڑے کے دو حصّے ہیں پہلا دالان جہاں محافل و مجالس ہوتی ہیں اور پھر شہ نشین۔ دونوں میں خوشنما محرابوں والے پانچ در ہیں شہ نشین اور دالان کے دونوں طرف دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں آمنے سامنے تین تین در ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم ہے لیکن چھتیں بدل گئی ہیں (لوہے کے گرڈر لگا کر بنائی گئی ہیں)

شہ نشین کی زینت شیشے (آئینہ کے ٹکڑوں) کی ایک خوشنما ضریح ہے جو روضۂ امام حسین کی شبیہ ہے۔ شیشے کے دو علم بھی ضریح مبارک کے ارد گرد موجود ہیں۔ ضریح کے نیچے تحریر ہے:

بانی کردہ: نواب حسین علی خاں ابن خان بہادر نواب محمد عظیم خاں۔

محرم میں امام باڑے کی آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی ہے لیکن عمارت غیر محفوظ ہے اس لیے جزوی طور پر سجایا جاتا ہے۔

۲۴۔ چھوٹی مہارانی کا امام باڑہ

یہ خوبصورت امام باڑہ محلہ وزیر گنج میں سٹی اسٹیشن کے نزدیک واقع ہے اسے مہاراجہ سر محمد علی خاں، والئ ریاست محمود آباد نے اپنی دوسری بیوی مہارانی زاکیہ بیگم صاحبہ کے لیے ۱۹۲۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ وہ چھوٹی مہارانی کے نام سے مشہور تھیں۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے مہاراجکمار محمد محمود حسن خاں نے اپنا حصّۂ جائداد جس میں امام باڑہ شامل ہے اپنے بیٹے راجکمار محمد امیر نقی خاں کے نام منتقل کر دیا۔ مہاراجکمار محمد امیر علی خاں (خلف اصغر) نے اپنا حصّہ شہر کی مشہور و معروف شخصیت مقبول احمد لاری کے ہاتھ ۱۹۶۷ء میں فروخت کر دیا۔

چھوٹی مہارانی کا امام باڑہ پہلے "اقبال منزل" کا ایک حصّہ تھا جس کا موجودہ نام "مقبول لاری منزل" ہے۔ تاریخی اہمیت کے پیش نظر فراخ دل اور دور اندیش خریدار نے سنہ تعمیر کے کتبے کو بجنسہ محفوظ رکھا ہے۔

عمارت کے اندر ور گیٹ کے داہنی جانب دیوار میں نصب ہے، سنگ مرمر کی سپید تختی پر سیاہ حروف میں مسارہ جو ذیل تاریخ کندہ کی گئی ہے۔

ہو المصطفےٰ

شاہ کی یہ تعمیر جدید است	فلک رفعت حسیں چوں ماہ کامل
سبک گفت ہاتف باد دل شاد	زہے این خوش نما اقبال منزل

۱۳۲۲ھ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال منزل مہاراجہ محمود آباد نے ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس سے پہلے یہاں ممتاز الدولہ محمد حسین علی خاں کا محل تھا جس کے بارے میں سید آغا مہدی صاحب "تاریخ لکھنؤ" (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء) میں صفحہ ۱۴۹ پر ڈیوڑھی ممتاز الدولہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"نواب ممتاز الدولہ دو مسار شہر میں بڑی آن بان کے رئیس تھے۔ تاریخ اودھ میں ان کا نمایاں ذکر ہے۔ بڑی آباد سرکار تھی۔ نواب کے فرزند منظور مرزا بہادر کے وقت تک ڈیوڑھی پر بائی بند جار رہتا تھا۔ دلی دربار میں شرکت کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ اور یہ جائداد ورثا نے مہاراجہ محمود آباد کے ہاتھ فروخت کر دی جس پر اقبال منزل کی تعمیر ہوئی۔"

مقبول احمد لاری صاحب نے ازراہ کرم نواب ممتاز الدولہ کا شجرہ عنایت فرمایا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نواب ممتاز الدولہ کے چچا زاد بھائی تھے۔

چھوٹی رانی کا امام باڑہ بارہ دری واقع محمود آباد (ضلع سیتاپور) کی نقل ہے تعمیر کے بعد تقریباً ۴۰ سال تک یہاں بڑی شان و شوکت سے عزاداری ہوتی رہی۔ نویں اور دسویں محرم کی روشنی دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ یہ اور ڈپٹی محمد عظیم خاں کا امام باڑہ وزیر گنج میں عوام کی کشش کا خاص مرکز ہے لیکن اب وہ بات کہاں: "اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"۔

امام باڑہ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہے جس کے دونوں جانب پانچ دروں والی دو منزلہ عمارتیں ہیں۔ ان کے درمیان کشادہ صحن کے مقابل اصل عمارت ہے۔ امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے پانچ دروں والے دو دالان ہیں۔ اگلے دالان کے اطراف میں صحنچیاں ہیں۔ اگلا دالان ایک کمرے کی صورت میں ہے جس میں سامنے کے رخ لکڑی کے خوشنما دروازے لگے ہیں۔ اسی کشادہ کمرے میں بچوں کا ایک اسکول قائم ہے جس کا نام گرین ہال اسکول (GREEN HALL SCHOOL) ہے ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور فی الحال ساتویں درجے تک تعلیم ہوتی ہے۔ پرنسپل راجکمار امیر نقی خاں ہیں۔ ان کا دفتر بائیں جانب کی صحنچی میں ہے۔

حواشی

۱۔ شیخ تصدق حسین "امام باڑہ میر باقر سوداگر" ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ اگست ستمبر ۱۹۵۴ء صفحات ۵۲۔ ۴۹ سید آغا مہدی تاریخ لکھنؤ (کراچی ۱۹۷۶ء) صفحات ۱۵۰۔ ۱۴۹

۲۔ رانی شہنشاہ بیگم کے والد محمد حسن خاں شیدا انگنی خانم (زوجہ نواب سعادت علی خاں) کے بھائی نواب رمضان علی خاں کے بیٹے تھے۔ شیخ تصدق حسین بیگمات اودھ (کتاب نگر لکھنؤ) صفحہ ۹۱

۳۔ معارف المنعمات حصہ اول، نور المطابع تھوی ٹولہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء حصہ دوم ممتاز المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

۴۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ نواب اکرام اللہ خاں۔ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ مارچ ۱۹۵۰ء صفحات ۱۳۔ ۱۲

روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۴ (خبر)

۵۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ تجمل حسین خاں۔ ماہنامہ الواعظ (لکھنؤ) اپریل ۱۹۵۰ء صفحات ۱۴، ۱۳ سید آغا مہدی۔ تاریخ لکھنؤ، صفحہ ۲۴۷

۶۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ نواب امیر محل صاحبہ۔ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ مئی ۱۹۴۸ء صفحات ۱۵۔ ۱۲

۷۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ میاں داراب علی خاں ماہنامہ الواعظ (لکھنؤ) اپریل ۱۹۴۸ء صفحات ۱۵۔ ۱۲ سید آغا مہدی۔ تاریخ لکھنؤ، صفحہ ۳۱۱۔

۸۔ سید تصدق حسین بیگمات اودھ "نواب سلطان جہاں محل" صفحات ۲۸۲۔ ۲۶۶ سید آغا مہدی تاریخ لکھنؤ صفحات ۳۰۶۔ ۳۰۵ ۹۔ ایضاً صفحہ ۲۹۶

۱۰۔ مرزا جعفر حسین "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۵۸

یُوگیش پروینْ

لکھنؤ کے قدیم اور مشہور مندر

لکھنؤ کے مندروں میں سب سے زیادہ اہمیت دیوی مندروں کی رہی ہے یہ دیوی مندر کم سے کم ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ہم چند مندروں کا ذکر کرنا چاہیں گے۔

کالی مندر

لکھنؤ کے چوک علاقہ میں دہلا کنواں اور پان والی گلی کے درمیان مشہور دیو مٹھ بڑی مندر ہے جو بہت ہی قدیم مندر ہے۔ اس مندر کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں گومتی اس مندر کے قریب سے ہی کہیں بہتی تھی۔ اس مندر کی تعمیر بلندی پر ہے۔ مندر سے ملحق سرکٹا نالہ بہتا ہے جس کی دیواروں میں گپت زمانے کی اینٹیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اصل مندر چاروں طرف سے کئی چھوٹے چھوٹے مندروں سے گھرا ہوا ہے جن میں ایک مندر کی چوٹی گیا طرز کی ہے۔ اس مندر میں چار ہاتھوں والا ایک مجسمہ نصب ہے جو ہزار ہا برس قدیم کے باقیات میں سے ایک ہے۔ نوراتری کے دنوں میں یہاں کثیر تعداد میں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔

چندریکا دیوی کا مندر

لکھنؤ میں چندریکا دیوی کی وہی اہمیت ہے جو کشمیر میں کھیر بھوانی کی ہے کہا جاتا ہے کہ رام کے بھائی لکشمن کے بڑے بیٹے کنور چندرکیتو جب اشوک میگھ یگ کے گھوڑے کے ساتھ نومی سارن کی طرف روانہ ہوئے تو مانڈو رشی آشرم سے آگے گومتی کے کنارے ایک خیمہ نصب تھا۔ اماوس کی شبانہ رات تھی جہاں انھوں نے دیوی منتر پڑھا۔ دیوی منتر پڑھتے ہی ماں درگا چودھویں کے چاند کے مثل نمودار ہوئیں۔ بعد میں چندرکیتو نے اس مقام پر بھگوتی کو چندریکا کے نام سے موسوم کرتے ہوئے ایک مندر قایم کیا۔

اس علاقے میں بھی گپت کے زمانے کے نشانات ملتے ہیں۔ چونکہ درگا اماوس کی رات میں ہی ظاہر ہوئی تھیں اس لئے آج بھی ان کی پوجا کا دن اماوس ہی مقرر ہے اور اس دن یہاں مندر پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے

شیتلا دیوی مندر

قدیم مشہور شیتلا دیوی مندر لکھنؤ کے مہدی گنج میں واقع ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ اس مندر کی تعمیر سیتا کے بیٹے لو نے کرائی تھی۔ جس کی بعد میں تعمیر نو بنجاروں نے کرائی تھی۔ اس مندر میں شنگ کے وقت کی مورتیاں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ہولی کے بعد کی اشٹمی کے دن یہاں ایک میلہ لگتا ہے جو آٹھوں کے میلے کے نام سے مشہور ہے۔

مسانی دیوی مندر

یہ قدیم مندر سعادت گنج میں واقع ہے اس مندر میں نرسنگھ بھگوان کی ایک سفید خوبصورت سی مورتی ہے۔ ۱۸۸۲ میں مثادین مالی نے اس مندر کی تعمیر نو کے لئے ایک نقشہ بنایا پیتل کے صدر دروازے پر بڑی خوبصورتی سے گن پت اور بھوانی کے چہرے ابھارے گئے ہیں۔ اس مندر کی پوجا کا خاص دن بدھ ہے جہاں لوگ اپنی مرادوں کے لئے چوکی بھرتے ہیں اور اس کے لئے سات بدھ جاکر چوکھٹ کو پھول، پان، لونگ، بتاشے اور چاول سے سجاتے ہیں

بدھیشور مہادیو کا مندر

لکھنؤ میں شہ دراکے قریب ساون کے مہینے میں ہر بدھ کو بدھیشور مہادیو کا میلہ لگتا ہے۔ بدھ گنیش کا دن ہے اور بدھ چاند کا بیٹا بھی ہے اس لئے شیو سے ان کا سیدھا تعلق ہے

اس مندر کا شیو لنگ گپت کے زمانے کا ہے۔ اس مندر کے قریب دھنیا مہری نے راستے میں پڑنے والے ایک نالہ پر پل بنوایا تھا جس کے نشانات آج بھی برائے نام ہی سہی مل جاتے ہیں۔

من کامیشور شیو مندر

لکھنؤ میں گومتی کے بائیں کنارے پر واقع کامیشور مندر بہت قدیم شیوالہ ہے۔ اسے راجہ ہرنیہ دھنو نے دشمن پر غلبہ پانے کے بعد تعمیر کرایا تھا جس کی چوٹی ۲۳ سونے کے کلشوں سے سجی ہوئی تھی۔ بارہویں صدی عیسوی میں [illegible] اور [illegible]

نے اس مندر کا تمام سونا لوٹ کر اسے برباد کر دیا تھا جو تعمیر نو کے بعد اب اس شکل میں ہے۔ موجودہ مندر کی تعمیر سیٹھ پورن داس نے کرائی تھی۔

● لکھنؤ کے مشہور شیوالے

بڑا شیوالہ۔ یہ لکھنؤ کے رانی کٹرہ محلے میں کشمیریوں کا سیکڑوں برس قدیم ایک شیوالہ ہے جو بڑے شیوالے کے نام سے مشہور ہے اس مندر میں مشرقی ہند کا سب سے بڑا شیولنگ ہے

● رتنیشور شیو مندر

یہ مندر اٹونجہ میں ہے جس کو ۱۸۹۲ء میں اٹونجہ کے راجہ اندر وکرم سنگھ نے بنوایا تھا۔ بلندی پر بنے اس مندر میں پانچ خوبصورت چوٹیاں ہیں۔ کمسورنی دھنگ کی چوٹیوں کی نقل بعد میں کاشی ڈیرا کے ناگیشور شیو مندر میں کی گئی مندر کے درمیانی حصے اور برآمدوں میں خوبصورت تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

پھاگن کے مہینے کی شیوراتری کے موقع پر یہاں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی پھاگن کے مہینے میں اس مندر کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا۔

● کاشیشور مہادیو کا مندر

کاشی شیو کی نگری ہے اسی لیے بھگوان شیو کو کاشیشور کہا جاتا ہے۔ لکھنؤ ضلع کے جنوب مشرقی علاقہ موہن لال گنج کے کاشیشور مہادیو مندر کی تعمیر سیڈی کے تعلقہ دار راجہ کاشی پرشاد نے ۱۸۷۰ء میں کرائی تھی۔

شیوالے کے ساتھ آٹھ کونوں پر آٹھ مندر اور بے ہوئے ہیں۔ درمیانی مندر بہت بلند اور خوبصورت ہے۔

● کلیان گری مندر

لکھنؤ کے مغرب میں کاکوری روڈ پر کلیان گری کا علاقہ ہے۔ وہیں سڑک کی بائیں جانب بلندی پر کلیان گری مندر بنا ہوا ہے۔ اس مندر کو ہری دوار کے ایک سنت بابا کلیان گری نے قائم کیا تھا۔ اس مندر کی تعمیر میں آصف الدولہ کے دیوان راجہ مہرا نے مالی امداد فراہم کی تھی اس مقام پر بابا کلیان گری اور بعد کے متعدد مہنتوں کی سمادھیاں بھی ہیں۔ مہاشیوراتری اور کجلی کے علاوہ ساون کے ہر پیر کو یہاں میلہ لگتا ہے۔

● علی گنج کا قدیم ہنومان مندر

لکھنؤ میں علی گنج کا قدیم ہنومان مندر عہدِ نوابین اودھ کی قومی یکجہتی کا ترجمان ہے۔ اس مندر کی چوٹی پر آج بھی چاند کا نشان چمک رہا ہے۔

نواب شجاع الدولہ کے دوسرے بیٹے نواب سعادت علی خاں کی ماں چھتر کنور نے منگل کے دن پیدا ہوئے اپنے بیٹے کا نام منگلو رکھا تھا۔

نواب سعادت علی خاں جب ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء میں والئی سلطنت اودھ ہوئے تو ان کی ماں کو راج ماتا کا درجہ ملا اور اس دن سے ان کی ماں جناب عالیہ کہی جانے لگیں جنھوں نے بہو بیگم کے بسائے گئے محلے علی گنج میں ہنومان مندر بنوایا۔ نوابین اودھ مہاویرجی کے لئے احترام و عقیدت رکھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس صوبہ میں بندروں کے شکار پر ہمیشہ پابندی رہی ہے۔ جان عالم واجد علی شاہ اپنے زمانے میں بڑے منگل کے موقع پر ایک دعوتِ عام کا اہتمام کرتے تھے۔

● علی گنج کا مہاویر مندر

علی گنج کے ہنومان مندر کے قریب ہی ایک عطر فروش جاٹ مل نے ۱۷۸۳ء میں ایک مہاویر مندر کی تعمیر کرائی۔ اس مندر کے قریب پہلے ایک بہت ہی قدیم تالاب تھا جو بشکرجی کے نام سے مشہور تھا۔

لکھنؤ کے تمام ہنومان مندروں میں آج اس مندر کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بڑے منگل کا میلہ اسی مندر پر لگتا ہے

● چھاچھی کنواں ہنومان مندر

سولہویں صدی کی بات ہے کہ ایودھیا کے ایک سنت پرمیشور داس نے لکھنؤ کے ایک جنگل میں ایک کنویں کے قریب ایک ٹھاکر دوار کی تعمیر کرائی تھی اور اس میں ہنومان کی ایک قدیم مورتی نصب کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کنویں سے تین دنوں تک چھاچھ نکلتا رہا اسی کی مناسبت سے اس کنویں کا نام چھاچھی کنواں ہو گیا۔ منگل کو یہاں بھیڑ ہوتی ہے لیکن موسم گرما میں جیٹھ کے مہینے میں خصوصی طور پر دھوم دھام رہتی ہے کہا جاتا ہے کہ تلسی داس بھی یہاں قیام کر چکے ہیں۔

● بھیروجی کا مندر

لکھنؤ کے وسط میں بھیرجی کا مندر ہے جو مغلیہ دور میں بھی موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت گومتی اس کے قریب سے گذرتی تھی اور یہاں پر شمشان تھا۔

آصف الدولہ نے اس مندر کی بہت قدر کی۔ مہاراجہ جھاؤلال اس مندر کے پرستار تھے۔ راجہ بلرام پور کا خاندان بھی اس مندر کے عقیدت مندوں میں تھا۔

موسم باراں کے بھادوں مہینے کے آخری اتوار کو یہاں میلہ لگتا ہے۔ □□


علم و ادب

عِلم و ادب

وہ خزانہ ہے جس میں ماضی کی وراثت کے

لعل و جواہر چمکتے ہیں

اور

حال کے درخشاں آب مستقبل میں رہنمائی کا

شاندار فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اودھ میں

ایسے ہی علم و ادب کا خزانہ تھا۔

امجد حسین

پروفیسر محمد ولی الحق انصاری

فرنگی محل کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات

خانوادۂ علماء فرنگی محل غالباً دنیا کا تنہا خاندان ہے جس میں کم از کم ایک ہزار سال سے نہ صرف پڑھے لکھے لوگ بلکہ نابغہ روزگار علماء پیدا ہوتے رہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں اہم علمی خدمات انجام دیں۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب مشہور صحابی اور میزبان رسول اکرمؐ حضرت ابوایوب خزرجی انصاری تک پہنچتا ہے۔ حضرت ابوایوب کے بیٹے یا پوتے[۱] ابومنصور مت (یا بقول علاء الدین چشتی برناوی "صامت") حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں احنف بن قیس کے ہمراہ خراسان تشریف لائے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کی آٹھویں پشت میں ایک زبردست عالم، صوفی، شاعر اور نثار پیدا ہوا جس کا شمار آج افغانستان کی محترم ترین شخصیتوں اور فارسی ادب کے بہترین اہل قلم میں ہوتا ہے اور جو علمی اور مذہبی دنیا میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری (متوفی ۲۲ ذی الحجہ ۴۸۱ھ مطابق ۸ مارچ ۱۰۸۹ء) کے نام سے مشہور ہے۔[۲] شیخ الاسلام کا حضرت ابوایوب انصاری تک شجرہ نسب اس طور سے ہے:

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ابن ابومنصور محمد بلخی ابن جعفر ابن[۳] ابومعاذ ابن محمد ابن احمد ابن علی ابن جعفر ابن ابی منصور مت (صامت) الانصاری الہروی تابعی ابن ابوایوب انصاری۔

شیخ الاسلام عبداللہ ۳۸۶ھ مطابق ۱۰۰۶ء میں ہرات میں پیدا ہوئے اور اس وقت سے اب تک ہندستان کے علاوہ ان کی نسل کے لوگ ہرات میں موجود ہیں۔ انصاریان ہرات کے علاوہ ہندستان آنے کا سلسلہ عہد التمش سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں وسط ایشیا، خراسان، ایران وغیرہ پر چنگیزی حملے کی وجہ سے دیگر علماء اور صلحاء کی طرح انصاریان ہرات کو بھی ہندستان ہجرت کرنا پڑی۔ انھیں مہاجرین میں حضرت عبداللہ انصاری کے بھائی منصور ابن ابی منصور محمد کے پرپوتے خواجہ سلیم ابن خواجہ ابواسمٰعیل ابن خواجہ عبیداللہ ابن خواجہ منصور کے بیٹے خواجہ جلال الدین بھی تھے وہ دیگر اہل قبیلہ کے ساتھ دہلی کے پڑوس میں سرسل نامی ایک قصبے میں آباد ہو گئے تھے۔ حالات کے ناموافق ہونے کی وجہ سے پانچ پشتوں تک ہندستان میں قیام کرنے کے بعد مشہور بزرگ مخدوم بدرالدین برناوی کے والد خواجہ شرف الدین کے علاوہ باقی تمام افراد قبیلہ ہرات واپس چلے گئے۔ مخدوم بدرالدین نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے ارشاد کے مطابق موضع برناوا (ضلع میرٹھ) میں قیام کیا اور وہیں ۸۰۰ھ (مطابق ۱۴۰۳ء) میں وفات[۴] پائی اور اب تک ان کی نسل کے افراد وہاں موجود ہیں۔ مخدوم بدرالدین کے پوتے مخدوم علاء الدین ابن مخدوم نصیرالدین (متوفی ۸۷۵ھ مطابق ۱۴۷۰ء) کا آخری زمانہ وہ تھا جب تیموری لشکر وسط ایشیا، ترکی، ایران اور خراسان وغیرہ ممالک کو تاراج کر رہا تھا۔ اسی تاریک دور میں انصاریان ہرات کے کچھ افراد کو دوبارہ ہجرت کر کے ہندستان آنا پڑا اور ان مہاجروں میں قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی بھی شامل تھے جو علماء فرنگی محل کے ہندستان آنے والے اجداد میں پہلے شخص ہیں اور جن کا خواجہ عبداللہ انصاری ہروی تک سلسلہ نسب اس طور سے ہے:[۵]

قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی ابن خواجہ اسمٰعیل ابن خواجہ اسحٰق ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ عزیزالدین ابن خواجہ جمال الدین ابن خواجہ دوست محمد ابن خواجہ پیر غیاث الدین ابن خواجہ پیر معزالدین ابن خواجہ پیر حبیب ابن خواجہ شمس الدین ابن خواجہ جلال الدین ابن خواجہ ظہیرالدین ابن خواجہ سلطان محمد ابن خواجہ نظام الدین ابن خواجہ شہاب الدین محمود ابن خواجہ عوض ابن ایوب ابن جابر مقرب باری ابن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری۔

فرنگی محل کی خاندانی روایات کے مطابق اس خاندان کے اجداد برناوا سے سہالی ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے اور اسی وجہ سے کچھ حضرات کو سہو ہوگیا کہ انصاریان فرنگی محل انصاریان برناوہ ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ان روایات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی ہندوستان آنے کے بعد اپنے ہم نام مخدوم علاء الدین برناوی کے آخری زمانے میں یا پھر اس کے بعد اپنے ہم جد عزیزوں کے پاس برناوا میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے شیخ نظام الدین انصاری برناوہ سے سرجودہ ضلع بارہ بنکی کے قصبۂ سہالی آ گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور سہالی کے قریب ایک مقام "روضہ" میں دفن ہوئے۔

شیخ نظام الدین کے قیام کے بعد سہالی علم و فن کا مرکز بن گیا اور ان کی آٹھویں پشت میں مشہور زمانہ عالم ملا قطب الدین شہید پیدا ہوئے جن کے متعلق علامہ غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

"ملا قطب الدین شہید امام اساتذہ و مقتدائے جہابذہ است۔ معدن عقلیات و مخزن نقلیات ...... ملا قطب الدین عمرہا انجمن درس آراست و جہان جہان ارباب تحصیل را بپایۂ تکمیل رساند۔ امروز سلسلۂ استفادہ اکثر علمائے کشور ہندوستان بہ او منتہی می شود۔"

یہی ملا قطب الدین شہید خانوادۂ علمائے فرنگی محل کے جد ہیں اور انھیں کے چاروں بیٹے یا ان کی اولادوں نے مشعل علم کو اس طرح روشن کیا کہ آٹھ پشتوں تک سارے ہندوستان میں اس کی روشنی پھیلتی رہی اور ہر نسل میں ایک سے زیادہ ایسے عالم ہوتے رہے جنھیں بجا طور پر نابغۂ روزگار کہا جا سکتا ہے اور جن کے علم کی روشنی نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کو بھی منور کیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اگرچہ علم کی نوعیت بہت حد تک بدل چکی ہے۔

ملا قطب الدین کی شہادت (۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۶۹۲ء) کے بعد شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے ملا صاحب شہید کی اولاد کے قیام کے لئے ان کے دونوں بڑے بیٹوں ملا محمد اسعد کو لکھنؤ میں احاطۂ شاہ پیر میں ایک تیل اور گھوڑوں کے یورپین تاجر کی چھوڑی ہوئی خالی عمارت جو فرنگی محل کے نام سے مشہور تھی دے دی گئی اور ۱۶۹۳ء میں ملا سعید اپنے چھوٹے بھائیوں ملا نظام الدین اور ملا رضا نیز دیگر افراد خاندان کو اس فرنگی محل میں آباد کر کے حیدر آباد چلے گئے اور تمام افراد خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کم عمر ۱۶ سالہ نوجوان کے سر آ پڑی جو آئندہ استاذ الہند ملا نظام الدین کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے وہ درس ترتیب دیا جو آج بھی بیشتر عربی و فارسی مدارس میں رائج ہے اور جس نے اس ادارے کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت سیکڑوں سے زیادہ عربی و فارسی نیز اردو تصانیف وجود میں آئیں۔

ملا نظام الدین (پیدائش ۱۰۸۹ھ، وفات ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۷۴۸ء) نے اپنے والد نیز دیگر علماء مثل ملا امان اللہ بنارسی، ملا علی قلی جائسی وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کے بعد ملا غلام نقشبند لکھنوی سے فاتحۂ فراغ پڑھا اور چھبیس سال کی عمر میں تحصیل سے فراغت کے بعد مسند درس آراستہ کی اور اپنے چھوٹے بھائی ملا رضا اور بڑے بھائی ملا سعید کے بیٹوں ملا احمد عبدالحق (وفات ۹ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۷۵۴ء) اور ملا عبدالعزیز (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء) کے ساتھ اس علمی ادارے کو وجود میں لائے جو ان کی فرنگی محل میں سکونت کی وجہ سے "فرنگی محل" کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں اس وقت تک تین سو سے زیادہ حضرات گزر چکے ہیں جن میں شاید ہی کوئی کم علم رہا ہو۔ یہ علماء بنیادی طور سے صاحب درس تھے اس لئے ان کی بیشتر تالیفات کا تعلق بھی درس ہی سے ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی تالیفات میں شرحوں اور حاشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ محض حواشی ہیں۔ حقیقتاً وہ بلند پایہ مستقل تصانیف کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

ملا نظام الدین کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی مدارس کے لئے متفقہ درس ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے درس میں منقولات پر زیادہ زور دیا۔ جبکہ ملا نظام الدین نے اپنے ترتیب دادہ درس نظامی میں منقولات و معقولات دونوں پر یکساں زور دیا تھا۔ ملا نظام الدین کے ترتیب دادہ اس درس نے پورے ملک میں شرف قبولیت حاصل کیا اور آج تک زیادہ تر مدارس میں اسی کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے۔ ملا نظام الدین کو بحیثیت استاد کے اپنی

زندگی ہی میں وہ مرتبہ حاصل ہو گیا تھا کہ اکناف و اطراف ملک سے نہ صرف طالبانِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بلکہ دوسرے اساتذہ کے طلباء بھی فاتحہ فراغ کے لیے ملا نظام الدین (جو اس وقت تک استاذ الہند کے لقب سے شہرت حاصل کر چکے تھے) ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسا کہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں :-

"تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اشتہار عظیم یافت۔ امروز علمای اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہِ گوشہ تفاخر می شکنند و کسی کہ سلسلہ تلمذ بہ او می رساند بین فضلا علم امتیاز می افرازد و مردم بسیار دیدہ شد کہ تحصیل جاہای دیگر کردند و برای اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند :

ایک زبردست استاد ہونے کے علاوہ ملا نظام الدین متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں شرح مسلّم الثبوت، شرح تحریر الاصول لابن الہمام، صبح صادق، منار الاصول، حاشیہ شرح عقائد جلالی، حاشیہ حواشی قدیمہ دوانیہ حاشیۂ صدرا، حاشیۂ شمس بازغہ، شرح رسالہ جبارزیہ، مناقب رزاقیہ اور رسالہ در بیان وضوء آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شامل ہیں۔

ملا نظام الدین نے جس شمع کو روشن کیا تھا اس کی روشنی نے آئندہ نسل میں پورے ہندستان کو جگمگا دیا۔ اس نسل کے علماء میں ملا عبدالعلی بحر العلوم (پیدائش ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء - وفات ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۱۰ء)، ملا محمد حسن المعروف بہ ملا حسن (متوفی ۳ صفر ۱۲۰۹ھ / ۳۰ اگست ۱۷۹۴ء)، ملا احمد انوار الحق (پیدائش ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء - وفات ۲۰ شعبان ۱۲۳۶ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۲۱ء)، ملا مبین (پیدائش ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء - وفات ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۸۱۰ء)، ملا نور الحق ابن مولانا انوار الحق (وفات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۸۲۲ء) وہ حضرات ہیں جن کا اسلامی علمی دنیا میں جواب نہ تھا اور جن سے تمام مسالک کے لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ ان حضرات میں ملا عبدالعلی بحر العلوم اور ملا حسن کا خصوصی رجحان معقولات کی طرف تھا۔ ملا حسن ابن قاضی غلام مصطفےٰ اپنے والد کے نامور بھتیجے استاذ الہند ملا نظام الدین کے شاگرد تھے اور علوم معقولات میں ابو سینائے عصر سمجھے جاتے تھے۔ ایک عرصے تک فرنگی محل میں درس و تدریس اور تالیفات کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد کچھ خاص حالات اور مقامی سیاست کے تحت لکھنؤ چھوڑ کر حافظ رحمت خاں کے پاس شاہجہاں پور میں رہے اس کے بعد ضابطہ خاں نے انھیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کے امراء نے ملا کمال الدین فتحپوری کی جگہ دارانگر کے مدرسے میں ان کا تقرر کر دیا۔ ضابطہ خاں کے پاس سے ملا حسن نواب فیض اللہ خاں کے پاس رام پور چلے گئے جہاں سرکاری مدرسہ آپ کے سپرد کر دیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور جہاں دفن ہوئے وہ پورا علاقہ آج بھی انھیں کے نام سے موسوم ہے۔

ایک بلند پایہ عالم اور استاد ہونے کے علاوہ ملا حسن ایک اہم مصنف بھی تھے جن کی مختلف شرحیں اور حاشیے مثلاً شرح مسلم العلوم، شرح مسلم الثبوت، حواشی صدرا، حواشی زوائد ثلثہ، حاشیہ شمس بازغہ، معارج العلوم اور مدارج العلوم علمی دنیا میں عالی مقام رکھتے ہیں۔ ملک العلماء ملا عبدالعلی بحر العلوم صحیح معنی میں علم کا ایک ایسا سمندر تھے جس کی تھاہ لگانا مشکل تھا۔ ملا نظام الدین کے شاگرد رشید ملا کمال الدین سے تکمیل علم کے بعد "فاضل بے نظیر اور جامع معقول و منقول، عالم ظاہر و باطن" ہوئے اور مدت تک لکھنؤ میں فیض علم جاری رکھا اور اس کے بعد انھیں حالات کے تحت جن میں ملا حسن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا انھیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔ وہ اولاً شاہ جہاں پور پھر رامپور تشریف لے گئے اور وہاں سے بوہار ضلع بردوان (بنگال) پہنچے جہاں شایانِ شان قدر افزائی ہوئی۔ بعد چندے نواب ارکاٹ نے مدراس بلوا لیا جہاں ان کی وہ قدردانی ہوئی جو چند علماء کے حصے میں آئی۔ نواب ارکاٹ نے انھیں ملک العلماء کا خطاب عطا فرمایا۔ بحر العلوم کا خطاب انھیں مشہور زمانہ بزرگ شاہ عبدالعزیز سے عطا ہوا تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا حسن کے قیام دہلی کے دوران شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد ان سے بحث میں الجھ گئے لیکن ملا حسن کے جوابوں سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس واپس ہو کر انھوں نے ملا حسن کے علم و فضل کی تعریف کی، جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ معقولی حدیث و قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کسی نے اس گفتگو کی اطلاع ملا عبدالعلی کو دی۔ جنھوں نے علم فقہ میں ارکانِ اربعہ لکھ کر شاہ صاحب کو روانہ کر دی جسے پڑھ کر شاہ صاحب

اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے خط میں ملا عبد العلی کو بحر العلوم کے خطاب سے یاد فرمایا اور اسی وقت سے یہ خطاب نام سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

ملا بحر العلوم کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اور ان دونوں زبانوں میں ان کی تالیفات موجود ہیں جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور یہ تالیفات معقولات و منقولات و تصوف ہر فن میں ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ——

ہدایت المعرفت۔ شرح فقہ اکبر (دونوں فارسی میں مطبوعہ)، شرح سلم العلوم (مطبوعہ)، شرح مسلم الثبوت (مطبوعہ)۔ حواشی بر زواہد ثلثہ، حاشیہ رسالہ میر زاہد (مطبوعہ)۔ تحریر الاصول۔ شرح مثنوی معنوی (متعدد مطبوعہ جلدیں)۔ حواشی بر میر زاہد شرح مواقف۔ حاشیہ صدرا (مطبوعہ)، شرح فارسی منار وحدت الوجود پر تین رسالے، رسالہ بر احوالِ قیامت۔ ارکان اربعہ یا رسائل الارکان (مطبوعہ)۔

مولانا کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول مفتی عنایت اللہ صاحب وہ معقولات میں ابن ہمام، جلال دوانی اور صدرا شیرازی سے کم نہ تھے۔

اس دور کی تیسری بڑی ہستی مولانا احمد انوار الحق نے اپنے عہد کے بزرگ ترین علماء یعنی ملا احمد حسین ابن ملا رضا ابن ملا قطب الدین شہید، ملا عبد العلی بحر العلوم ابن ملا نظام الدین اور ملا حسن سے کسب علوم ظاہری حاصل کیا اور تربیتِ روحانی اپنے والد ملا احمد عبد الحق ابن ملا سعید سے پائی۔ اس طرح علوم دین کے زبردست عالم ہونے کے ساتھ وہ اپنے عہد کے بزرگ ترین صاحبِ عرفان سمجھے جاتے ہیں اور آج بھی باغ مولوی انوار صاحب میں ان سے روحانی فیضان حاصل کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ [۳۳]

ان کے فرزند ملا نور الحق جید عالم اور فاضل کامل تھے اور فرنگی محل کے ان چند علماء میں سے تھے جن کے بے شمار شاگرد تھے جن میں بعض مثلاً مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مرزا حسن علی محدث، مولانا حسین احمد محدث، مولانا اولاد حسن قنوجی (نواب صدیق حسن کے والد) اور بہت سے فرنگی محل کے حضرات خود زبردست اور صاحبِ سلسلہ عالم ہوئے ہیں۔

ملا نور الحق نے مختلف کتب درسیہ پر حواشی لکھنے کے علاوہ سورہ فاتحہ کی ایک تفسیر بھی لکھی۔ ملا حسن کے برادر خورد ملا ولی بھی اسی دور کے عالم ہیں۔ اپنے حقیقی ماموں ملا کمال الدین فتحپوری سے کسبِ علم کرنے کے بعد وہ فاضل نامدار ہوئے۔ آپ کا سلسلہ درس و تالیف تا عمر جاری رہا اور آپ کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے علماء روزگار فارغ التحصیل ہو کر مشہور زمانہ ہوئے۔ مولانا کی تالیفات میں سلم العلوم کی شرح اور حواشیہ زاہدیہ علی الجلالیہ اور حواشی زاہدیہ علی شرح مواقف پر آپ کے حواشی مستقل ہیں۔ فرنگی محل کے اس دور کے علماء میں ملا مبین ابن ملا محب اللہ نہایت ممتاز ہیں۔ یہ یگانۂ عصر فرنگی محل کے سب سے زیادہ صاحبِ تصنیف علماء، اور بے مثل حل مطلب کرنے والے جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول واعظ و محدث تھے۔ آپ نے کتب درسیہ از اول تا آخر ملا حسن سے پڑھیں اور استاد کی موجودگی ہی میں سلسلۂ درس و تدریس شروع کر دیا اور ان کی رامپور روانگی کے بعد صحیح معنی میں ملا مبین ان کے جانشین ہوئے۔ زبردست معقولی ہونے کے باوجود ملا مبین نہایت خوش عقیدہ تھے اور اپنے چچا مولانا انوار الحق سے نہایت اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ کی تالیفات میں زیادہ کا تعلق درسیات سے ہے اور وہ تعلیقات اور حواشی پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ مستقل تالیفات میں سلم العلوم (کامل) شرح مسلم الثبوت (تا ختم مبادی کلامیہ)، حواشی زواہد ثلثہ حل بحث مشاۃ بالتکریر مذکورۂ صدرا، رسالہ فی الزکوۃ کنز الحسنات فی مسائل الزکاۃ، شرح اسماء حسنیٰ، ترجمہ حکایات الصالحین، وسیلۃ النجاۃ، احوال ائمہ اثنا عشری جواہر الفوائد اہمیت کی حامل ہیں۔

فرنگی محل کے تیسرے دور کے علماء میں مفتی ظہور اللہ ابن ملا ولی (پیدائش ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۰ء — وفات ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۹ مئی ۱۸۴۰ء)، ملک العلماء ملا حیدر ابن ملا مبین (وفات ۲ محرم ۱۲۵۶ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۴۰ء)۔ مولانا ولی اللہ (پیدائش ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۷۶۰ء — وفات صفر ۱۲۷۰ھ مطابق نومبر ۱۸۵۳ء)، مولانا ظہور علی (وفات ۳۰ رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء)، مولانا عبد الوالی (پیدائش ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء — وفات ۲۲ شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۲ فروری ۱۸۸۳ء) اور ان کے کم عمر معاصرین ملا برہان الحق (پیدائش محرم ۱۲۱۴ھ مطابق جون ۱۷۹۹ء — وفات ۱۲ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء)، مفتی محمد یوسف (پیدائش ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء — وفات ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء)، مولانا عبد الرزاق (پیدائش ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۲۱ء — وفات ۵ صفر ۱۳۰۷ھ

مطابق ۱۰ر اکتوبر ۱۸۸۹ء)، مولانا نعمت اللہ (متوفی ۳ر محرم ۱۲۹۰ھ مطابق ۴ر مارچ ۱۸۸۳ء)، مولانا رحمت اللہ (متوفی ۱ر جمادی الاول ۱۳۰۵ھ مطابق یکم فروری ۱۸۸۸ء) اور مولانا عبد الحلیم ابن مولانا امین اللہ (پیدائش ۱ر شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۱ر اپریل ۱۸۲۴ء - وفات ۲۹ر شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ر دسمبر ۱۸۶۸ء) فلک علم کے روشن ستارے تھے۔ ان حضرات میں ملا ظہور اللہ اپنے والد اور چچا ملا حسن کے لائق شاگرد تھے اور سرکار اودھ میں عہدۂ افتاء ان کے سپرد تھا۔ لیکن اس عہدے سے متعلق مصروفیات کے باوجود سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔

شاگردانِ فرنگی محل کو چھوڑ کر ان کے بیرونی اہم شاگردوں کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے اور ان کی تالیفات میں تمام کتب درسیہ خاص کر کتب فقہ پر مختلف حواشی ہیں جن میں زوائد ثلثہ پر مطول حواشی اور شمس بازغہ کے رسالہ دورہ کی شرح خصوصیت کی حامل ہیں۔ ملک العلماء ملا حیدر ابن ملا مبین نے کتب درسیہ اپنے والد ماجد اور مفتی ظہور اللہ سے پڑھیں اور سرکار اودھ کی طرف سے اعزاز پاتے رہے لیکن کچھ انھیں اسباب کے تحت جن کے تحت ملا عبد العلی بحر العلوم اور ملا حسن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا، انھیں بھی ترکِ وطن کرنا پڑا اور سفرِ حج کے بعد مستقلاً حیدرآباد میں آباد ہو گئے جہاں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہوئی۔ آپ کی تالیفات میں ایک رسالہ منطق میں، ایک رسالہ اوراد میں، ایک رسالہ کیفیاتِ حج میں اور اکثر کتبِ درسیہ پر حواشی ہیں۔

مولانا ولی اللہ نے مولانا عبد القدوس ابن مفتی محمد یعقوب، مفتی ظہور اللہ اور اپنے چچا ملا مبین سے تحصیل علم کی اور ساری عمر درس و تدریس اور خدمت علم میں بسر کردی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت ہے لیکن بدقسمتی سے ان میں سے بہت کافی ضائع ہو گئی ہیں پھر بھی مندرجہ ذیل باقی ہیں:۔ حاشیہ بر میر زاہد۔ حاشیہ بر میر زاہد ملا جلالی، حاشیہ بر شرح ہدایت الحکمت للصدر شیرازی، حاشیہ بر حاشیہ کمال علیٰ شرح العقائد الجلالی، رسالہ اتقانہات ایک رسالہ بحث تشکیک میں، شرح سلم العلوم نفائس الملکوت، شرح مسلم الثبوت (دو ضخیم جلدوں میں)، حاشیہ بر میر زاہد شرح مواقف۔ آداب السلاطین یعنی رسالہ در مباحث سلطنت و ریاست، مرأۃ المومنین و تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین۔ شرح غایت العلوم، شرح معارج العلوم، کشف الابرار فی خصائص سید الابرار، حاشیہ ہدایہ (چار ضخیم جلدوں میں عبادات و معاملات پر)، تذکرۃ المیزان، تکملہ شرح سلم مولانا احمد عبد الحق، تکملہ شرح مسلم ملا حسن، تفسیر معدن الجواہر (سات جلدوں میں)۔

ان تمام تالیفات کے علاوہ فن رجال پر مولانا کی دو اہم فارسی تصانیف ہیں یعنی عمدۃ الوسائل اور اغصانِ اربعہ۔ ان میں اول الذکر حضرت قطب الآفاق حضرت سید عبد الرزاق بانسوی اور ان کے خلفاء اور ملا قطب شہید اور ملا نظام الدین کے بعض تلامذہ کے حالات میں ہے اور ثانی الذکر مولانا انوار الحق صاحب کی سوانح عمری ہے جس میں کچھ دوسرے حضرات فرنگی محلی کے حالات بھی شامل ہیں۔

مولوی ظہور علی ملک العلماء ملا حیدر کے بیٹے اور شاگرد تھے والد کی وفات کے بعد حیدرآباد چلے گئے اور وہاں بھی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ تصانیف میں علاوہ کتبِ درسیہ پر حواشی کے رسالہ معراج النبوت اور الطریقۃ الوسطیٰ فی سماع الموتیٰ اور شرح خطبۂ سلم قاضی مبارک ہیں۔

مولانا عبد الوالی، مولانا برہان الحق اور مولانا عبد الرزاق زبردست عالم ہونے کے علاوہ صوفیانِ کبار بھی تھے جن سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں اول الذکر اپنے نامور ماموں ملا انوار الحق کے شاگرد تھے اور بعد تحصیل علم مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ تالیفات میں کتبِ درسیہ پر حواشی ہیں۔ ثانی الذکر اپنے والد ملا انوار الحق کے شاگرد تھے اور والد کی حیات ہی میں درس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تالیفات میں مختلف کتب درسیہ پر حواشی ہیں۔ ثالث الذکر بھی مولانا عبد الرزاق میلاد رسول اکرم سے متعلق مختلف رسائل کے علاوہ حاشیہ شرح وقایہ (ناتمام)، منہج الرضوان فی قیام رمضان، کشف الغمات عن اصول الاموات) انوارِ غیبیہ، رسالہ سعد و نحس، رسالہ آدابِ مطالعہ، ثمرۃ الوسائل اور اس کی شرح احسن الخصائل، رسائل درازکار خلفاء و سبطین، گیارہ رسائل در احوال و سیر حضرت غوثیت اور دیگر چند رسائل کے مصنف ہیں۔

مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر نے کتب درسیہ اپنے والد اور کچھ کتب مفتی ظہور اللہ سے پڑھیں اور مدت تک وطن میں درس دیتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد عہدۂ افتاء آپ کے سپرد ہوا اور ۱۲۷۷ھ میں جونپور چلے گئے۔ تصانیف یہ ہیں: حاشیہ شرح سلم ملا حسن، حاشیہ شرح

قاضی مبارک، حاشیہ شمس بازغہ، الکلم حواشی ملا حسن مرشمس بازغہ، حاشیہ طبیعات شفا، حاشیہ شرح وقایہ۔ ان کے علاوہ بخاری شریف اور بیضاوی پر تعلیقات بھی ہیں۔

مولانا کا حلقۂ درس وسیع تھا اور نامور شاگردوں میں مولانا عبدالحئی صاحب کے والد مولانا عبدالحلیم اور مولانا عبدالرزاق شامل ہیں۔

مولوی نعمت اللہ ابن مولوی نوراللہ ابن ملا ولی اپنے والد اور نامور چچا مفتی ظہور اللہ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں عہدۂ افتاء مدتوں آپ کے سپرد رہا۔ آپ کی آخری عمر دتیا میں بسر ہوئی اور انتقال بنارس میں ہوا۔ مولانا نے اپنی تالیفات خود جلادیں لیکن کچھ چشمۂ رحمت کالج جون پور اور مولانا عبدالحئی کے کتب خانے میں جواب علی گڑھ یونیورسٹی میں ہے موجود ہیں۔ ملا نعمت اللہ کے بھائی مولوی رحمت اللہ نے تحصیل علم اپنے بھائی سے کی اور چچا مولوی ظہور اللہ کے بعد مفتی عدالت ہوئے اور تھوڑے عرصے کے بعد غازی پور چلے گئے اور وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت جاری کیا جو ایک اہم کالج کی شکل میں اب تک موجود ہے۔

مولانا عبدالحلیم نے تحصیل علم مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد یوسف، مولوی نعمت اللہ، مرزا حسن علی محدث، ملا حسین احمد محدث اور اپنے والد سے کی اور اس کے بعد عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اولاً باندہ اور جونپور کے مدارس میں درس دیتے رہے اور اس کے بعد حیدرآباد دکن میں مدرسہ سرکاری میں ملازم ہوگئے۔ مولانا کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے اور یہی حال ان کی تصانیف کا بھی ہے جن میں کم ازکم ۳۳ کا ذکر تذکرہ علمائے فرنگی محل میں کیا گیا ہے۔ ان مولانا کے مفصل حالات زندگی ان کے نامور صاحبزادے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اپنی تصانیف مقدمہ سعایہ و عمدۃ الرعایا اور حسرت العالم بوفاۃ مرجع العالم میں بیان کیے ہیں۔

آئندہ نسل یعنی چوتھے دور میں بھی خاندان فرنگی محل نے اپنی علمی برتری اور روایات کو برقرار رکھا اور اس دور میں اس نابغۂ روزگار نے پرچم علم بلند کیا جسے دنیا عبدالحئی فرنگی محلی کے نام سے جانتی ہے۔ مولانا کی ولادت باندہ میں ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو ہوئی۔ تحصیل علم اپنے والد ماجد مولانا عبدالحلیم ابن مولوی امین اللہ ابن مولانا نعمت اللہ ابن مولانا نوراللہ سے کی۔ ابتدائی قیام حیدرآباد کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ مولانا نے کل اتالیس سال کی عمر پائی لیکن اس مختصر عمر میں ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے جن میں بہت سے خود بلند مقام عالم ہوئے۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد تذکرۂ علمائے فرنگی محل میں ایک سو دس بتائی گئی ہے جن کا تعلق مختلف علوم نقلیہ و عقلیہ سے ہے۔ ان میں صرف چار ہی ایسی ہیں کہ اگر مولانا ان کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی علمی دنیا میں زندۂ جاوید ہوجاتے۔ یہ چاروں کتابیں چار مختلف علوم میں ہیں اور یہ ہیں:

(۱) مصباح الدجیٰ یعنی حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد۔ رسالے کا مبسوط حاشیہ مولانا کی وسعت نظر اور قوت علمی اور منطق میں بے مثل محقق ہونے کا گواہ ناطق ہے

(۲) سعایہ یعنی شرح وقایہ کا حامل المتن حاشیہ

(۳) التعلیق الممجد یعنی موطا امام محمد کا مبسوط حاشیہ۔

(۴) ظفر الامانی جو اصول حدیث میں رسالۂ سید شریف کی شرح ہے۔ لیکن اہمیت کے حساب سے ایک مستقل تصنیف ہے۔ اس علامۂ بے نظیر کا انتقال بہ مرض صرع ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء میں ہوا۔

مولانا عبدالحئی کے معاصر شمس العلماء مولانا محمد نعیم (وفات ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۹۰۰ء) زاہد یگانہ اور عالم زمانہ تھے جنھوں نے اپنے پردادا ملا عبدالعلی بحر العلوم کی روایات کو برقرار رکھا۔ علوم فقہ اور انساب میں وہ یگانۂ عصر تھے۔ اس کے علاوہ وہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ زیادہ تر نامکمل رہیں۔ تنقید الکلام التبنۃ زیور طبع سے آراستہ ہوکر شائع ہوئی۔

مولانا عبدالوہاب بن مولانا عبدالرزاق (وفات ۲ محرم ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء) اس نسل کے ایک تیسرے جید عالم ہیں جنھوں نے اپنے دیگر بلند پایہ معاصرین مثلاً مولانا ابوالحیا عبدالحلیم بن مولوی عبدالحکیم (متوفی ۱۵ شعبان ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء) مولانا امان الحق بن ملا برہان الحق (متوفی ۱۹ ربیع الاول ۱۳۰۵ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۸۸۷ء) مولانا فضل اللہ بن نعمت اللہ (متوفی ۱۱ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء)، مولانا انعام اللہ بن مولانا ولی اللہ (متوفی رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۰۲ء)، مولانا افہام اللہ ابن مولانا انعام اللہ (متوفی ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء)، مولانا المعان الحق

بن ملا بُرہان الحق (متوفی ۱۵ر رمضان ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء) کے ساتھ علمی روایات فرنگی محل کو برقرار رکھا۔

بیسویں صدی میں بھی فرنگی محل نے اپنی علمی روایات کو برقرار رکھا اس دور کے علماء میں مولانا عبدالباقی بن ملا علی محمد (پیدائش ۱۸ر رجب ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۴ر نومبر ۱۸۶۹ء - وفات ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء)، مولانا محمد عظمت اللہ ابن مولانا احمد اللہ (ولادت، ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء - وفات، ۲۳ر جمادی الآخر ۱۳۵۴ھ مطابق ۳ر اکتوبر ۱۹۳۴ء)، مولانا برکت اللہ ابن مولوی احمد اللہ (ولادت؛ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء وفات: ۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۹۲۵ء)، شمس العلماء عبدالمجید (پیدائش: ۲ر صفر ۱۲۷۷ھ وفات: ۲۴ر جمادی الاول ۱۳۴۰ھ)، شمس العلماء مولانا عبدالحمید (پیدائش، ۱۴ر جمادی الاول ۱۲۸۲ھ؛ وفات ۱۵ر شوال ۱۳۵۳ھ)، مولانا قیام الدین عبدالباری (پیدائش: ۱۰ر ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۴ر اپریل ۱۸۷۸ء۔ وفات: ۴ر رجب ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹ر جنوری ۱۹۲۶ء) سربرآوردہ ہیں۔

اول الذکر نے دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالحیٔ اور ان کے مایہ ناز شاگرد مولانا عین القضاۃ، مولانا نعیم اور مولانا عبدالرزاق سے دولتِ علم حاصل کی اور خود فخرِ زمانہ ہوئے۔ وطن میں جب تک قیام رہا سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں مدینہ منورہ میں قیام کے بعد یہ سلسلہ اس دیارِ پاک میں قائم رہا اور لاتعداد غیر ہندستانی بھی مولانا کے شاگردوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے جن میں سے زیادہ تر مدینہ منورہ میں تکمیل پذیر ہوئیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں؛ حاشیۂ توضیح تلویح (ناتمام)، تکملۂ خیر العمل، حسرت الفحول فی نائب الرسول، التعلیق المحمود حاشیۂ سنن ابی داؤد (ناتمام)، زبدۃ الخصائل شرح عمدۃ الوسائل، نور العین فی تقبیل الابہامین عقد ذکر الشہادتین، رسالہ ذکر الشہادت سبط اصغر جواہر العبقریہ، شرح رسالۂ غوثیہ رسالہ فی جواز السمع، رسالہ فی مسئلہ علم الغیب وغیرہ۔

مولانا کے برادرِ خورد مولانا عبدالہادی صاحب (متوفی ۱۹۴۳ء) بھی ایک صاحب استغنا بزرگ، جید عالم اور صاحب تصانیف متعدد تھے۔ مولانا عظمت اللہ بن مولوی احمد اللہ نے اپنے چچا محمد فضل اللہ، ملا محمد انعام اللہ، مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا عبدالحمید سے تحصیلِ علم کی اور درسِ نظامی کے علاوہ فنونِ جدید بھی پڑھے۔ مولانا نے تین سال مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس کے فرائض بھی ادا کیے۔ آپ کی تصانیف میں تحفۂ آئین پر حاشیہ ہے جس کا نام ازالۃ المحن ہے۔ ملا حسن، مقالات حریری وغیرہ پر بھی آپ کے حواشی موجود ہیں۔

مولانا کے برادرِ خورد مولانا برکت اللہ بھی صاحب استعداد عالم تھے۔ بعض کتابیں انھوں نے مولانا عظمت اللہ سے، بعض ملا انعام اللہ ابن مولانا انعام اللہ سے اور بعض مولانا عبدالباری سے پڑھیں اور درسِ نظامیہ میں علوم عربیہ اور فارسی کا ایک زمانے تک درس دیتے رہے۔ تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے جن میں بعض یہ ہیں؛ ترجمۂ فصوص الحکم، ترجمۂ تذکرۃ الاولیاء، ترجمہ درۃ الناصحین، ترجمۂ جواہر خمسہ کے علاوہ حاشیہ قطبی و میر بر قطبی و حواشی مسلم حمد اللہ و ملا حسن و حواشی سُلّم العلوم و حاشیہ مراح الارواح و حاشیہ شرح جامی و حاشیۂ کافیہ، و حاشیۂ اخوان الصفا و حاشیۂ تاریخ الخلفاء، و حاشیہ کسائی، حاشیۂ مسلم الثبوت، حواشی پنج گنج۔

شمس العلماء مولانا عبدالمجید ابن مولوی عبدالحلیم نے علوم درسیہ مولانا عبدالحیٔ اور اپنے چچا مولانا نعیم سے حاصل کیے اور فاتحۂ فراغ مولانا عین القضاۃ سے پڑھا۔ مولانا فضل اللہ بن مولوی نعمت اللہ کے انتقال کے بعد کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبۂ علوم شرقیہ) میں مدرس عربی مقرر ہوئے اور وہاں تا عمر درس دیا۔

آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحمید بھی مولانا عبدالحیٔ اور مولانا نعیم کے شاگرد تھے اور تدریس کے سلسلے میں ایک مدرسہ قدیمیہ قائم کیا جو آپ کے بیٹے مفتی محمد عتیق کے زمانے تک چلتا رہا۔ اس دور کی سب سے اہم شخصیت مولانا عبدالباری ہیں جنھوں نے اپنی عالمیت کے علاوہ آپ نے شخصیت سے ہندستان کی سیاست کو بھی ایک اہم رُخ بخشا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس طرح وہ ایک عالمِ دین ہونے کے علاوہ ایک بین الاقوامی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آگئے۔

مولانا عبدالباری نے مولانا عبدالحیٔ، مولانا غلام احمد پنجابی، مولانا عین القضاۃ اور مولانا عبدالباقی جیسے جید علماء سے دولتِ علم حاصل کی

اور زمانۂ تحصیل ہی سے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا سے قبل علماء فرنگی محل عموماً اپنے مکانوں پر درس دیا کرتے تھے۔ مولانا نے عامۂ اہل اسلام کی تعلیم کے لئے ۹؍ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۹۰۴ء) کو ملا نظام الدین کے یوم وفات کے موقع پر ان کی یادگار کے طور پر مدرسہ نظامیہ قائم کیا جو افسوس ہے کہ آزادی ہند کے بعد ختم ہو گیا۔ مولانا فرنگی محل میں ملا بحر العلوم اور مولانا عبدالحی کے بعد سب سے زیادہ صاحب تصنیف ہیں اور تذکرہ علماء فرنگی محل جس میں مولانا کے حالات شرح و بسط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، میں ان کی تعداد ایک سو دس بتائی گئی ہے۔[۵۱]

علماء فرنگی محل جن کا امتیاز علوم دین، خواہ معقولات ہوں یا منقولات اور خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، کی خدمت تھا اس کا آخری دور مولانا عبدالباری کے انتقال سے لے کر چند سال قبل مفتی رضا انصاری کے انتقال (۵؍ فروری ۱۹۹۰ء) تک باقی رہا، اگرچہ اس کے بعد بھی مولوی حیات اللہ انصاری، جلال الدین عبدالمتین، ابوالکمال محمد حبیب الحلیم کے ایسے درس نظامی کے فارغ التحصیل لوگ اب بھی موجود ہیں اور نئی نسل میں طارق رشید ابن ابوطیب احمد انصاری اور ابوالحسن نظام الدین ابن عبدالعلی محمد فاخر ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے جد بحر العلوم کے نام کو روشن کریں گے۔ اس آخری دور میں وہ تمام علماء شامل ہیں جن کی تربیت مدرسہ نظامیہ کے قیام کے بعد ہوئی اگرچہ ان میں زیادہ نے مدرسہ نظامیہ ہی میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ علماء کے اس گروہ کا سربراہ مفتی عنایت اللہ صاحب کو سمجھنا چاہیے اور اس میں مولانا محمد اسلم (متوفی ۱۹۵۲ء) مفتی عبدالقیوم محمد قاسم (متوفی ۱۹۰۰ء)، مفتی عبدالقادر (متوفی ۱۹۵۹ء)، مولوی محمد یونس بن مفتی محمد یوسف (متوفی ۱۹۲۲ء)، مولانا صبغت اللہ (متوفی ۲۴؍ دسمبر ۱۹۶۴ء)، مولانا قطب الدین عبدالوالی (متوفی مئی ۱۹۵۴ء)، مولانا ابوالقاسم محمد عتیق، مولانا محمد شفیع حجت اللہ (متوفی ۷؍ فروری ۱۹۶۹ء)، مولانا حیات اللہ مفتی محمد رضا شامل ہیں۔ اور یہ تمام حضرات درس نظامی کے منتہی اور باقاعدہ صاحب درس ہونے کے علاوہ صاحبان تصنیف بھی ہوئے ہیں۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ان حضرات کے بعد بھی علوم دین کی ترویج کا سلسلہ فرنگی محل میں باقی ہے۔ لیکن موجودہ نسل کے زیادہ تر حضرات کی توجہ عہد جدید کے معقولات کی طرف ہے۔ علماء اس وقت بھی اس خاندان میں موجود ہیں لیکن ان کے میدان علم دین سے الگ ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انور انصاری ابن مولانا محمد مسلم علم نفسیات میں ڈاکٹر اور اردو ادب کے ایم اے تھے اور انتقال کے وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور ان کی بیگم ڈاکٹر غزالہ انور اس یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم کی پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر مہدی انصاری ابن مفتی محمد ایوب جن کی تعلیم مصر میں ہوئی ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم سعیدہ مہدی لائبریری سائنس کی ڈگری رکھتی ہیں اور مولانا آزاد لائبریری سے حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہیں۔

مفتی محمد رضا انصاری نے کئی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں درس دیا۔

راقم الحروف یعنی ڈاکٹر ولی الحق ابن مولانا وجیہ الحق نے قانون اور اقتصادیات میں ایم اے کی ڈگری کے بعد فارسی ادب کی اعلیٰ ترین ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ حاصل کیے اور بارہ سال لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ کام کرنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم ڈاکٹر ذاجرہ ولی الحق ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر تعلیم گاہ نسواں کالج لکھنؤ سے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

ڈاکٹر غوث ابن مولانا اسلم اینتھروپالوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد بغداد یونیورسٹی میں استاد ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی جنید انصاری مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاد تھے۔

ڈاکٹر نسیم انصاری ابن مولانا محمد شفیع نے کلکتہ نیشنل میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انگلینڈ سے ایف آر سی ایس کیا اور سال گزشتہ علی گڑھ میڈیکل کالج سے ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم ڈاکٹر زینت انصاری بھی اسی میڈیکل کالج سے اسی سال ریٹائر ہو گئیں۔

عصمت اللہ ابن مولوی عزت اللہ فلسفہ کے منتہی ہیں اور دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں استاد ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ جو اعلیٰ درس گاہوں میں پروفیسر رہے ہیں دیگر حضرات فرنگی محل بھی علم کے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کے بعد

اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ چنانچہ انجینئر عبدالوہاب ابن مولانا منظور الحق انصاری محکمۂ برقیات میں چیف انجینئر ہیں۔

ڈاکٹر محمد زبیر رشید الحق ابن مولانا وحید الحق ایف. آر. سی. ایس کرنے کے بعد انگلینڈ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی محمد شعیب زید الحق اور چھوٹے بھائی محمد طلحہ حفیظ الحق بھی انجینئر ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ مولانا صبغت اللہ کے پوتے ممتاز ہاشم ابن مولانا محمد ہاشم ایگزیکیٹو انجینئر ہیں اور ان کے بڑے بھائی اقبال ہاشم ایک ڈگری کالج میں استاد ہیں۔ محمد وسیم ابن مولوی محمد شفیع پاکستان میں انجینئر ہیں۔

مولوی محمد سعید ابن حکیم امتیاز الحق کے بیٹے معین الحق انجینئر تھے اور ان کا امریکہ میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے بیٹے حبیب الحق سائنٹسٹ ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کر رہے ہیں اور ان کی بڑی بہن ڈاکٹر شمیمہ انگلینڈ میں میڈیکل پریکٹس کر رہی ہیں اور ان سے چھوٹی بہن ڈاکٹر سلمیٰ جلیل سرکار ہند کے حیدر آباد کے تحقیقی سنٹر میں اعلیٰ عہدے پر سائنٹسٹ تھیں اور اب ریٹائر ہو چکیں۔ زبیدہ فاطمہ بنت مولانا جمال میاں ڈاکٹر ہیں اور لیبیا میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہیں۔

فرنگی محل کی آئندہ نسل کے بچے بھی ہونہار ہیں۔ طارق عزیز (پیدائش ۱۹۶۸ء) جو اب امریکہ میں ہیں اور ابوالحسن نظام الدین (پیدائش ۱۹۸۱ء) کا ذکر ہو چکا ہے۔ مولوی عظیم اللہ (جو اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس کے عہدے تک پہونچے تھے) کے بیٹے ندیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۰ء) دوبئی میں ملازم ہیں اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی نعیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۵ء) اور علیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۷ء) دونوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم. بی. اے کیا اور اول الذکر دوبئی میں ہیں اور ثانی الذکر لکھنؤ میں ملازم ہیں۔ محمد سلیم انوار الحق ابن پروفیسر ولی الحق (پیدائش ۱۳ راکتوبر ۱۹۶۴ء) نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم. بی. اے کیا ہے اور لکھنؤ میں ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور ان کی بہن درِ یمن (پیدائش ۱۹۶۸ء) نے بھی ایم. بی. اے کیا اور اپنے شوہر شکیل احمد ہاشمی جو خود بھی ایم بی اے ہیں اور ٹاٹا کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں کے ساتھ کلکتہ میں مقیم ہے۔ محمد شعیب فرید الحق کی بیٹی صبا (پیدائش ۱۹۷۰ء) ایم ایس سی کر چکی ہے اور بیٹا فرخ (پیدائش ۱۹۷۳ء) علی گڑھ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہے ——— ان کے علاوہ خاندان کے اور تمام بچے بھی تعلیمی مدارج اس طرح طے کر رہے ہیں کہ ان سے آئندہ بہت کچھ توقعات کی جا سکتی ہیں۔ بہر حال علم خاندان فرنگی محل کا طرۂ امتیاز تھا اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

فرنگی محل میں دینی ظاہری تعلیم کے علاوہ روحانی تعلیم اور تزکیہ نفس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا۔ خاندان کے جد اعلیٰ خواجہ عبداللہ انصاری زبردست صوفی تھے اور صوفیوں کے حالات میں ایک اہم تذکرے کے مصنف بھی اور ان کے پہلے جابر کا مقرب باری کا نقیب ان کی روحانیت کی دلیل ہے اور ان کی اولاد میں متعدد حضرات کے ناموں کا جزء "پیر" ثابت کرتا ہے کہ ان کے بعد بھی یہ روحانی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی اولاد میں ہندوستان آنے والے پہلے بزرگ قطب عالم علاء الدین کا نام بھی ان کے روحانی مرتبے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سہالی سے فرنگی محل آنے کے بعد بھی علماء فرنگی محل میں سے بیشتر کی توجہ علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کی طرف بھی رہی اور اس میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کی تربیت کو خاص دخل ہے۔ ادارہ فرنگی محل کے بانی ملا نظام الدین، ان کے بھائی ملا رضا (جو ان دا میں بڑے بھائی کی شاہ صاحب سے ارادت کی وجہ سے سخت نالاں تھے) اور بھتیجے ملا احمد عبدالحق شاہ سید عبدالرزاق بانسوی کے خصوصی مرید تھے اور آخر الذکر کے بیٹے مولانا انوار الحق جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عارف کامل بھی تھے اور یہی ان کے بیٹے ملا نور الحق اور نواسے مولانا عبدالولی کا بھی حال تھا۔ ان حضرات کے علاوہ دوسرے حضرات خاندان میں بھی ذوق تصوف مزاج کا حصہ بنا ہوا تھا اور اس فن میں ان کی تصانیف موجود ہیں جن میں ملا بحر العلوم کی متعدد جلدوں پر مشتمل شرح مثنوی معنوی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ زمانۂ حال میں مولانا نجیب اللہ ابن مولانا منیع اللہ نے علمی مشغلہ ترک کر کے طریقہ تصوف اختیار کیا تھا۔

خاندان فرنگی محل کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ پشتوں لکھنؤ میں رہنے کے بعد بھی اس کے افراد نے کبھی اپنے کو لکھنوی نہیں لکھا اور گھر والیں نصابی روایات کو برقرار رکھا۔ اس کے باوجود اس کا اردو ادب کے فروغ سے ... اور اردو کے کچھ عظیم ترین شعراء کو اس خاندان کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جہاں چہ ملا ولی ابن قاضی غلام مصطفےٰ ابن

کے شاگردوں کی فہرست میں بسرات شاہ اللہ خاں انشاؔ کا نام بھی ملتا ہے۔ انشاؔ ہی کی طرح مکتب لکھنؤ کے بانی شیخ امام بخش ناسخؔ کو بھی مُلّا نور الحق (اور شاید حاکمین سے بھی) شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان کے علاوہ حضرات فرنگی محل میں بھی متعدد حضرات کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ ان میں سب سے پہلا نام مولوی غضنفر ابن ملک العلماء مولا حیدر (متوفی ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء) کا ہے جو ضیغمؔ تخلص فرماتے تھے اور عموماً نعت کہتے تھے۔ فرنگی محل کے شعراء میں دوسرا نام مولانا امان الحق ابن مولانا برہان الحق (متوفی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء) کا ہے جن کا تخلص انورؔ تھا۔ انھیں فارسی میں مہارت کامل حاصل تھی، اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

مولوی محمد حسین بن مولوی محمد شاکر (متوفی ۱۰ر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) متینؔ تخلص فرماتے تھے اور کچھ زمانہ قبل تک ان کا دیوان موجود تھا اس کے علاوہ مناقب رزاقیہ (مولفہ ملا نظام الدین) کا بھی منظوم ترجمہ کیا جس کا نام گلستانِ طریقت رکھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب کراماتِ غوثیہ نظم کی۔

مولانا انعام اللہ ابن مولانا ولی اللہ (متوفی رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) کا تخلص انعامؔ تھا۔ ان کا بھی اُردو اشعار کا دیوان کچھ عرصہ قبل تک مولانا روح اللہ صاحب کے پاس موجود تھا۔ یہ وزیر علی صباؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ مولانا حبیب اللہ ابن مولوی مسیح اللہ (متوفی جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء) حبیبؔ تخلص کرتے تھے اور منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ دیوان منتشر صورت میں کچھ زمانہ قبل تک موجود تھا۔ افسوس ہے کہ مذکورہ بالا دونوں حضرات کا کلام اب بظاہر نایاب ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ کم از کم تین دوسرے شاعر جن کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا ان کا کلام ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا اور اب بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔ ان میں پہلے مولوی فصیح اللہ بن مولوی عظیم اللہ (متوفی ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء) وفاؔ تخلص کرتے تھے اور وزیر علی صباؔ کے شاگرد تھے۔ ان کے دونوں دیوان مطبوعہ تھے اور تیسرے کی طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔

انھیں خوش قسمتوں میں دوسرے شاعر مولانا عبدالاحد شمشادؔ بن مولوی عبدالرحیم (ولادت ۳ر صفر ۱۲۶۶ھ۔ وفات ۵ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء) تھے۔ آپ کتاب ”ابو الفلق“، مولانا عبدالعلیم آسیؔ غازی پوری اور سید محمد جعفر حسین کاشف

سے مشورہ سخن فرماتے تھے اور تین مطبوعہ دیوان یادگار ہیں۔ مولانا برکت اللہ رضاؔ ابن مولوی احمد اللہ کا کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ آپ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام پر خواجہ عزیز الدین عزیزؔ مرحوم اور اُردو کلام پر مولانا انعام اللہ انعامؔ اور منشی امیر احمد امیرؔ مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ مولانا کا ایک اُردو دیوان طبع ہو چکا ہے اور بقیہ کچھ زمانہ قبل تک مرتب موجود تھا۔ مولانا برکت اللہ کے معاصرین میں مولانا نجیب اللہ نجیبؔ ابن مولانا مسیح اللہ خواجہ عزیز الدین عزیزؔ کے شاگرد اور فارسی کے زبردست عالم تھے اور ایک مدت تک مدرسہ عالیہ نظامیہ میں فارسی کا درس دیتے تھے آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا فارسی کلام تھوڑا بہت اب بھی ملتا ہے۔ مولانا انعام اللہ (متوفی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۸۹۹ء) کا نام بھی شعراء فرنگی محل کی فہرست میں داخل ہے۔

عصر جدید میں جناب انور حسین صاحب آرزوؔ لکھنوی کا فرنگی محل سے بہت گہرا تعلق رہا۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی، مولانا عبدالرزاق صاحب اور مولانا عبدالوہاب صاحب سے ارادت مندی کی بنیاد پر اکثر فرنگی محل میں قیام پذیر رہتے تھے۔ ان کے اثرات نے حضرات فرنگی محل میں شعر گوئی کے جذبے کو بیدار رکھا اور اس عہد کے متعدد حضرات شعر اور اچھے شعر کہا کرتے تھے۔ ان شعراء میں مولانا روح اللہ ابن مولانا محب اللہ (متوفی ۲۰ر جولائی ۱۹۶۳ء)، مولانا صبغت اللہ شہیدؔ بن مولانا ہدایت اللہ (متوفی ۱۰ر اگست ۱۹۷۲ء)، ان کے بھائی حکیم ارادت اللہ حکیمؔ (متوفی ۱۲ر فروری ۱۹۶۹ء)، مولانا ظہور الحق ظہورؔ ابن مولانا فضل حق (متوفی ۱۹۴۲ء) اور مولانا اسد حسین اسدؔ (متوفی ء) شامل ہیں۔

دورِ جدید میں راقم الحروف یعنی ڈاکٹر ولی الحق ابن مولانا وجیہ الحق فرنگی محل کی شاعرانہ روایات کو سنبھالے ہوئے ہے اور اپنے پردادا مولانا امان الحق انورؔ کی پیروی کرتے ہوئے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا ہے اور تا حال دو فارسی کے مجموعۂ کلام ”شعلۂ ادراک“ اور ”خرمنِ گل“ شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر میں فارسی غزلیات اور مختلف نظمیں شامل ہیں اور ثانی الذکر چند غزلوں اور قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے۔ اُردو میں تا حال چار دیوان شائع ہوئے ہیں جن میں پہلا اور تیسرا غزالانِ خیال اور شاہدانِ معانی تمام تر غزلیات اور فارسی اشعار کے اُردو تراجم پر مشتمل ہیں۔

ان کے علاوہ تین دوسرے مجموعے طباعت کے لئے تیار ہیں۔ یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ دورِ جدید میں فرنگی محل میں ذوق شعرگوئی مردوں تک محدود نہ تھا مستوراتِ فرنگی محل بھی شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور ان میں صغریٰ فاطمہ بنتِ مولانا عبدالباری ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ ان کا کچھ کلام جو زیادہ تر نعتوں پر مشتمل ہے، ان کے بھائی مولانا جمال میاں نے شائع بھی کروا دیا تھا۔

اردو نثر، صحافت اور طباعت کے میدانوں میں بھی علمائے فرنگی محل نے حصہ لیا اور متاخرین فرنگی محل میں اکثر کی تالیفات اسی زبان میں ہیں۔ مولانا برکت اللہ رضا نے متعدد عربی کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ مولانا عبدالرزاق صاحب نے اپنے میلاد کے رسائل اسی زبان میں لکھے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے فن رجال میں تذکرہ علمائے فرنگی محل اُردو میں لکھا۔ مولانا صبغت اللہ شہید نے اپنے چچا اور استاد مولانا عنایت اللہ صاحب کی سوانح عمری "صدرالمدرسین" کے نام سے اُردو ہی میں لکھی اور مولانا حیات اللہ صاحب کی تمام نگارشات اُردو ہی میں ہیں۔ موصوف اُردو زبان کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں اور ان کے ضخیم ناول "لہو کے پھول" کا شمار اُردو کے بہترین نثری ادب میں کیا جاتا ہے۔

مفتی محمد رضا انصاری کی تمام تالیفات بشمول "بانیِ درسِ نظامی" اور شاہ عبدالرزاق صاحب کی سوانح عمری اردو زبان ہی میں ہیں اور مولانا مفتی عبدالقادر صاحب کے فتوے جنہیں مفتی رضا صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اسی زبان میں ہیں اور راقم الحروف (ولی الحق انصاری) کے بیشتر تحقیقی مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، یا مختلف کانفرنسوں میں ہندستان میں پڑھے گئے ہیں اُردو زبان ہی میں ہیں۔

اس عہد میں فرنگی محل کی خواتین بھی اُردو کی خدمت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ماجدہ ولی الحق کا مطبوعہ تحقیقی مقالہ اُردو سے متعلق اور اُردو زبان میں ہے۔ مولانا نور میاں مرحوم کی صاحبزادی نزہت فاطمہ نے آتش لکھنوی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور مولانا ولی اللہ صاحب کی تالیف الاغصان اربعہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مفتی رضا صاحب کی صاحبزادی فرزانہ رضا کی اُردو نگارشات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اور خواتین بھی اُردو میں اعلیٰ ڈگریاں رکھتی ہیں۔ ان میں مولانا فضل حق صاحب کی نواسی صبوحی اور حکیم مولوی محمد فاخر قابلِ ذکر ہیں۔

صحافت کے میدان میں بھی فرنگی محل پیچھے نہیں رہا۔ یہاں سب سے پہلے مولوی محمد یعقوب بن مولوی محمد عیسیٰ بن مولوی محمد یوسف (متوفی ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء) نے اپنا اخبار "کارنامہ" نکالا جو مدت دراز تک ادبی خدمت کرتا رہا۔ تحریکِ خلافت سے قبل یہاں سے مولوی صبغت اللہ صاحب کی ادارت میں "النظامیہ" جاری ہوا لیکن چار سال کے بعد سرکاری حکم سے اسے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھیں کی ادارت میں اخبار "خادم الحرمین" نکالا گیا جو انجمن خدام الحرمین کا آرگن تھا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کا بھی فرنگی محل سے گہرا تعلق رہا ہے اور مفتی رضا صاحب ایک زمانے میں اس کے روحِ رواں تھے اور پارٹی آرگن "نیا ادب" سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ مفتی رضا صاحب نے "قومی آواز" میں بحیثیت سب ایڈیٹر مدتوں کام کیا۔ مولانا حیات اللہ صاحب آزادیٔ ہند سے پہلے کانگریس پارٹی کے نقیب ہفتہ وار "ہندوستان" کے ایڈیٹر تھے اور آزادیٔ ہند سے کچھ پہلے کانگریس کا روزنامہ "قومی آواز" انھیں کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور انھوں نے اُردو صحافت کو ایک نیا تصور بخشا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۶ء میں مولانا جمال الدین عبدالوہاب نے "ہمدم" اخبار خرید لیا تھا اور وہ تقریباً ایک سال تک ان کی ادارت میں چلتا رہا۔ اسی زمانے میں (یعنی آزادی سے قبل) اسد حسن اسعد انصاری نے ایک رسالہ موسوم بہ قیام الدین نکالا اور اس کے بند ہونے کے بعد ایک دوسرا رسالہ "میخانہ" نکالتے رہے۔

علم کی ترویج کے سلسلے میں فرنگی محل میں مختلف زمانوں میں مختلف پریس بھی قائم کیے گئے۔ مولوی یعقوب حسن صاحب نے کارنامہ کے سلسلے میں اس کا پریس بھی قائم کیا تھا اور علمائے فرنگی محل کی بہت کافی کتابیں اس پریس میں طبع ہوئیں۔ مولانا عبدالحی صاحب کے داماد مولوی محمد یوسف (متوفی ۲ صفر ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء) نے مطبع یوسفی قائم کیا جس میں ابتدا میں مولانا عبدالحی صاحب کی تالیفات چھپی تھیں لیکن بعد کو عام طباعت کا

انضمام ہو گیا تھا۔ یہ پریس ان کے بیٹے مولوی محمد ادریس کے زمانے میں بند ہو گیا تھا۔ مفتی محمد عتیق صاحب نے بھی اپنی کتابوں کی طباعت کے لیے ایک پریس قائم کیا تھا اور ۱۹۴۰ء میں مولانا جمال میاں نے ہمدم پریس خرید لیا تھا لیکن یہ دونوں پریس زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکے۔

علماء فرنگی محل نے ابتدا میں اپنے کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن اکثر ایسے مواقع آ گئے جب ان کو درباری سیاست کا نشانہ بننا پڑا۔ انہیں حالات کے تحت ملا بحر العلوم، ملا حسن اور دیگر علماء ملا نظام الدین کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی کچھ حضرات ایسے بھی تھے جنہیں دربار سے منسلک رہنے پر مجبور بھی کیا جاتا تھا۔ جہاد مولوی امیر علی کے سلسلے میں مولانا برہان الحق صاحب اور مولانا عبد الرزاق صاحب نے عملی حصہ لیا اور مولوی امیر علی صاحب کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دیئے۔ موجودہ معنی میں عملی سیاست میں علماء فرنگی محل نے پہلی عالمی جنگ کے بعد حصہ لینا شروع کیا جب اتحادیوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر دیے اور اسی سلسلے میں فرنگی محل سے مولانا عبد الباری صاحب کی سربراہی میں تحریکِ خلافت شروع کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی سربراہی گاندھی جی نے سنبھال لی تھی۔ خلافت کے خاتمے کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں جو منافرت پیدا ہوئی ویسا ہی جذبہ برادرانِ وطن کے دلوں میں بھی موجود تھا اور اسی جذبے نے دونوں مذہبی گروہوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کر دیا۔ اس اتحاد کی بنیاد رکھنے والے مولانا عبد الباری صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔

اس عہد میں فرنگی محل ہندوستانی سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی کے سیاسی حالات میں مشورے فرنگی محل ہی میں ہوا کرتے تھے اور آج تک فرنگی محل میں وہ کمرہ محفوظ ہے جہاں گاندھی جی قیام پذیر ہوتے تھے۔ تحریکِ ترک موالات شروع ہونے پر دیگر زعمائے قوم کے ساتھ علماء فرنگی محل نے بھی اس میں عملی حصہ لیا اور ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو پنڈت نہرو اور چودھری خلیق الزماں کے ساتھ مولانا شرافت اللہ صاحب نے بھی قید و بند کے مصائب برداشت کیے اور مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد شفیع حجت اللہ جو لکھنؤ خلافت کمیٹی کے صدر تھے نومبر ۱۹۲۲ء میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک سال تک بہرام پور جیل مرشد آباد میں قید رہے۔ ان کے علاوہ بہت سے حضرات نے انگریزوں کے تحت ملازمت کرنا یا انگریزی تعلیم حاصل کرنا ترک کر دیا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے سے حضرات فرنگی محل کی سیاست میں دلچسپی بڑھ گئی۔ یہاں ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے کانگریس سے اپنی وابستگی باقی رکھی، اس گروہ کے سربراہ حیات اللہ انصاری صاحب تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے کانگریس کی پالیسیوں سے غیر مطمئن ہو کر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ کے ساتھ اس جماعت کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس گروہ کے سربراہ مولانا عنایت اللہ صاحب اور مولانا جمال میاں تھے۔

۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ایک ایسا گروہ اور ظہور پذیر ہوا جس کے خیالات اشتراکی تھے۔ اس گروہ میں عموماً نوجوانانِ فرنگی محل شامل تھے جن میں مفتی رضا فرنگی محلی اور انور انصاری قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو بظاہر عملی سیاست میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد مسلم لیگی اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے جنھوں نے پاکستان کی حمایت کی تھی، پاکستان چلے گئے یا اپنی غلطی کا احساس کر لیا۔

اور اب حضراتِ فرنگی محل سچے ہندوستانیوں کی طرح سیاست میں صحیح سمت جا رہے ہیں۔

□□

حواشی:

۱ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے "بن منصور بن مت انصاری الہروی ذریۃ ابی ایوب انصاری" اور طبقات حنابلہ میں "بن منصور بن مت الانصاری الہروی ولد ابی ایوب زید بن خالد الانصاری" لکھا ہے اور مولانا جامی "ابو منصور مت پسر ابو ایوب انصاری" لکھتے ہیں۔ اس لیے 'مت' (یا صامت) حضرت ابو ایوب کے بیٹے یا پوتے ہو سکتے ہیں۔ ذہبی اور ابن رجب دونوں نے "منصور بن مت" لکھا ہے جو غالباً درست نہیں ہے۔

۲ رجال کی مختلف عربی و فارسی کتابوں کے علاوہ شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری کے حالاتِ زندگی فرانسیسی عالم بادکونی کی شیخ الاسلام کی زندگی پر فرانسیسی

زبان کی تالیف یا اس کے فارسی ترجمے "سرگذشت پیر ہرات" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۳ یہ شجرہ وہی ہے جو تذکرۂ علماء فرنگی محل میں دیا ہے (دیکھئے علماء فرنگی محل ص۳۹) اس کے مطابق "عبداللہ ابن منصور محمد ابن جعفر ابن ابی معاذ ابن محمد" ہے۔ "تذکرۃ الحفاظ میں "عبداللہ بن محمد بن علی بن محمد" ہے اور طبقات حنابلہ میں "عبداللہ بن محمد بن علی بن محمد" ہے۔

۴ چشتیہ بہشتیہ "تالیف شیخ علاء الدین چشتی برناوی (پیدائش ۱۰ر شوال ۱۰۰۱ھ) قلمی نسخہ ملک شیخ محمد احمد انصاری رئیس شیخ پورہ برناوا۔ اس سلسلے میں مزید اطلاعات کے لیے مفتی عنایت اللہ صاحب کے تذکرۂ علماء فرنگی محل کے مولوی محمد حامد انصاری کے ترتیب دیئے ہوئے نئے ایڈیشن بنام "علماء فرنگی محل" کے لفظ اور راقم الحروف کے "اختتامیہ" کو پڑھنے کی زحمت کی جائے۔

۵ یہ شجرہ وہی ہے جسے مولانا انعام اللہ نے اغصان اربعہ کے مطبوعہ ضمیمہ میں پیش کیا ہے اور جس پر اکابرین فرنگی محل متفق ہیں (دیکھئے علماء فرنگی محل ص۳)۔ بارکوی کی تالیف کے فارسی ترجمے "سرگذشت پیر ہرات" کے آخر میں اخلاف پیر ہرات کے عنوان کے تحت ایک موجودہ ہراتی خاندان کا شجرہ پیش کیا گیا ہے جس کے مورث اعلیٰ بھی جابر مقرب باری ہیں۔ یہ شجرہ خواجہ پیر حبیب اللہ کے بعد دونوں شاخیں جدا ہوتی ہیں۔

۶ علماء فرنگی محل ص۱۴۱ پیش لفظ و اختتامیہ

۷ علماء فرنگی محل ص۱۴۱ پیش لفظ، اختتامیہ۔ تذکرۂ علماء فرنگی محل میں مخدوم علاء الدین برناوی اور قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی کو ایک دوسرے سے غلط ملط کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطب عالم خواجہ علاء الدین ہرات سے آ کر اپنے عزیزوں کے ساتھ برناوا میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہ برناوا ہی میں دفن ہوئے ان کے ہمنام مخدوم علاء الدین کا وطن اگرچہ برناوا تھا لیکن ان کا انتقال رائے بریلی ضلع میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہیں (دیکھئے چشتیہ بہشتیہ)

۸ علماء فرنگی محل ص۱۴۱ روضہ میں حقیقتاً شیخ نظام الدین ابن قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی کا مزار ہے نہ کہ مخدوم علاء الدین کے بیٹے مخدوم نظام الدین کا (جیسا کہ تذکرہ علماء فرنگی محل میں ص۹۰۸ پر درج ہے)

جو اپنے والد اور دادا کی طرح بانگری ضلع بین پوری میں دفن ہیں۔ اور بقول مؤلف چشتیہ بہشتیہ ان کے زمانے تک مخدوم نظام الدین کی اولاد وہیں مقیم تھی۔ تذکرہ علماء فرنگی محل میں جس طرح مخدوم علاء الدین برناوی اور خواجہ علاء الدین ہروی کو خلط ملط کیا گیا ہے اسی طرح ان کے ہمنام بیٹوں کو بھی ایک ہی سمجھ کر خلط ملط کیا گیا۔

۹ شجرہ یہ ہے: ملا قطب الدین شہید بن ملا عبدالحلیم بن ملا عبدالکریم بن شیخ الاسلام ملا احمد بن ملا حافظ بن شیخ فضل اللہ بن شیخ محی الدین بن شیخ شرف الدین (رونق بدھ) بن شیخ نظام الدین

۱۰ آثر الکرام "دفتر اول (مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ) ص۲۰۹

۱۱ حالات شہادت کے لیے دیکھئے آثر الکرام ص۲۰۹ رسالہ قطبیہ (قلمی)، علماء فرنگی محل ص۲۶-۴۰

۱۲ مآثر الکرام نیز علماء فرنگی محل ص۲۹۶ تا ص۲۶۶ دیکھئے۔ "بانی درس نظامی" مفتی رضا انصاری کا ملا نظام الدین پر ایک تحقیقی مقالہ۔

۱۳ مولانا انوار الحق صاحب کے مکمل حالات کے لیے مولانا ولی اللہ صاحب کی اغصان اربعہ سے رجوع کیا جائے۔

۱۴ کتابوں کے نام "علماء فرنگی محل (یعنی تذکرۂ علماء فرنگی محل کے جدید اڈیشن) میں ص۱۹۸ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۵ مولانا کی تصانیف کی فہرست اور نام تذکرہ علماء فرنگی محل یا اس کے جدید اڈیشن میں صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳ دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۶ پوری فہرست علماء فرنگی محل میں ص۸۹ پر دیکھی جا سکتی ہے نیز تذکرہ علماء فرنگی محل (از مفتی عنایت اللہ) میں ص۳۳ پر دیکھئے۔

۱۷ مولانا عبدالباری صاحب کی تصانیف کے نام تذکرۂ علماء فرنگی محل یا اس کے جدید ایڈیشن "علماء فرنگی محل" میں صفحات ۸۱-۸۲ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۸ مولانا حسرت موہانی کا انتقال بھی فرنگی محل ہی میں ہوا اور فرنگی محل کے خاندانی قبرستان باغ مولوی انوار صاحب میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

۱۹ مفتی رضا انصاری صاحب بعد کو اس تحریک سے بالکل الگ ہو گئے۔

□□

سبط محمد نقوی

اودھ کے چند ممتاز علماء

پورب میں علمی سرگرمیاں اتنی نمایاں تھیں کہ شاہجہاں نے اسے اپنا شیراز کہا تھا۔ بعض حضرات اسے جون پور اور اس کے ملحقات و نواح تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اہل دلّی کی زبان جب "پورب" کی لفظ آتی تھی تو اس سے اودھ کا علاقہ بھی مراد ہوتا تھا۔

ہمارے دور کے نامی عالم اور قلم کار ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق قاضی اطہر مبارکپوری نے ایک کتاب "دیار پورب میں علم اور علماء" کے نام سے لکھی ہے جس میں اودھ کے علمائے کرام کا ذکر جمیل بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب کا وطن مبارکپور ضلع اعظم گڑھ ایک زمانے میں خطۂ جون پور کا جزو سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی قباحت نہیں کہ اودھ بھی "شاہجہاں کے شیراز" کا ایک حصّہ ہے۔ شاہجہاں کے ملاحظہ کو سرکاری اعتراف سمجھنا چاہیئے۔

شرقیات کے نئے نصاب درس کی تاسیس اور شاہجہاں کی تخت نشینی تقریباً ہمعصر دو قوعے ہیں۔ اس نصاب درس کی تاسیس ملا قطب الدین شہید سہالوی کے ہاتھوں ہوئی مگر اسے ملائے شہید کے نامور فرزند ملا نظام الدین فرنگی محلی کی درس نظامی کہا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ ملا نظام الدین کے ہاتھوں ہی پروان چڑھا۔

اس نصاب کی جہانگیری کی کیفیت یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ۔

ہندستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے تو

یہ تو مسلّم حقیقت ہے کہ اس درس کی تدوین ملا قطب الدین شہید نے کی۔ مگر اسے ملا نظام الدین سے کب اور کس نے منسوب کیا۔ اس کا کوئی سراغ نظر قاصر سے نہیں ملتا۔ اس درس نظامی کے استاذ الاساتذہ اور معلم اول اکبری رتن میر فتح اللہ شیرازی تھے جس نصاب نے ملک میں معقولات کی تعلیم کو نیا رواج دیا تھا ملا قطب الدین تک

امیر شیرازی کا فیضان جن تین واسطوں سے پہونچا ان میں سے دو ملا دانیال جوراسی اور عبدالسلام دیوئی اودھ کے ہی باشندے تھے۔ صرف امیر کے ہی براہ راست شاگرد ملا عبدالسلام لاہوری تھے۔ جوراس اور دیوئی شریف دونوں ہی بارہ بنکی ضلع میں واقع ہیں۔ فرنگی محلی نوجوان کا رجحان سیکولر تعلیم کی طرف مبذول ہو جانے سے اب علوم دین سے ربط میں یہ خانوادہ آگے ہے۔ یہ گھرانہ خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے اور اس کے علماء و ذاکرین ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

شدید دقت اس بات کی ہے کہ اودھ ایک ایسا عالم خیز خطہ رہا ہے اور بحمداللہ اب بھی ہے کہ اس کے ممتاز تر علماء کو بھی لیا جائے تو ان کے ذکرِ خیر کی گنجائش کسی رسالے کے مخصوص نمبر میں تو کیا، ایک دو مجلدات میں بھی نہیں نکل سکتی۔ اس لئے ہم بس چند علماء کو لیں گے جن کی خدمات توسیع تعلیم یا تدریس میں بے مثال ہیں یا ملت و ملک کی ایسی یادگار خدمت کی ہے جو تاریخی عظمت کی حامل ہے۔

ابھی جس خاندان اجتہاد کی نشان دہی کی گئی ہے اور اب جس کی قدرے قلیل نہایت موزوں انتخاب کی بنا پر تفصیل پیش کرنا ہے اور اس کے مورث سید دلدار علی نقوی نصیرآبادی تھے جو برصغیر خصوصاً شمالی ہند میں ایک انفرادی اعزاز و امتیاز کے مالک ہوئے آپ سے قبل کسی ہندوستانی کو عراق کا سفر کر کے حوزۂ علمیہ سے تحصیل فقہ و اصول کے بعد، سند اجتہاد، لانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ اختصاص تسام ازل نے آپ کے لئے مخصوص فرما رکھا تھا۔

مولانا دلدار علی نقوی غفران مآب

کی ولادت ۱۱۶۶ھ/۵۳-۱۷۵۲ء کی کسی شب جمعہ نصیرآباد ضلع رائے بریلی کے ایک زراعت پیشہ سید گھر میں ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق مکتبی تعلیم وطن میں حاصل کر کے گھر گرہستی میں مشغول ہو گئے۔

آپ کی ولادت کے وقت جس طرح آپ کے مکان میں نور سا چمکتا دیکھا گیا

اسی طرح کا معجز المعقول واقعہ تعلیم کے سلسلے میں بھی پیش آیا۔ ایک روز ہل بیل سے کے اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے کہ ایک غیبی صدا سنائی دی: "دلدار علی! اپنی تعلیم جاری رکھو": مولانا مرتضیٰ حسین فاضل تفصیل بتاتے ہیں۔

"دل کی آواز یا غیب کا اشارہ ملتے ہی طبیعت نے شوق اور دل نے عزیمت کی انگڑائی لی اور متوسطات پڑھنے رائے بریلی اور الہ آباد گئے۔ رائے بریلی میں مولوی باب اللہ سے اور الہ آباد میں فاضل کامل سید غلام حسین دکنی سے اور لکھنؤ کے قریب سندیلہ میں مولانا حیدر علی ابن ملا حمد اللہ سے منقولات اور معقولات کا درس مکمل کیا۔

شاید یہی وہ زمانہ تھا کہ ایک غیر مسلم دوکاندار سے رات کو حفاظت دوکان کی شرط پر اس کے چراغ کی روشنی میں پڑھنے اور اس کی دوکان کے باہر سونے کی اجازت لی اور یہ دور عسرو محنت سے گذار کر علم سے بہرہ ور ہوئے۔

مولوی محمد باقر شمس فرماتے ہیں کہ مولانا دلدار علی اس نوعمری میں ذہانت و ذکاوت میں اس درجہ پر تھے کہ بسا اوقات استاد کے الجھے ہوئے مطلب کو اس طرح سلجھا دیتے تھے کہ طلبہ کے ذہن میں اتر جاتا تھا۔

شاہجہاں پور میں ملا عبد العلی سے ایک مسجد میں ملاقات ہوئی۔ موصوف نے شرح سلم ملا حمد اللہ پر کچھ بڑے بڑے اعتراضات کئے تھے۔ مباحثہ میں مولانا نے ان اعتراضات کو رد کر کے ملا کو حیران کر دیا۔

ملا حسن سے دلی کی جامع مسجد میں ملاقات ہوئی اور مسئلہ انجرار و تر پر تفصیلی بحث میں ملا صاحب کو اعتراف فضل کرنا پڑا،، ؎

اودھ میں دو دمان سعادت وزارت و صوبہ داری کے نام پر دراصل بادشاہت کر رہا تھا۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کے اقتدار کا تھا۔ نواب حسن رضا خاں سرفراز الدولہ نائب تھے۔ سرفراز الدولہ خود ذی علم آدمی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں علم دوست و دیندار بہت تھے۔ سید دلدار علی ان کے دربار تک پہونچے۔

عراق و ایران میں تحصیل علم کی تفصیل مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"ہندوستان میں تکمیل تحصیل کے بعد عراق و ایران کے لئے کمر باندھی اور عہد کے عالم جلیل مجدد فقہ و اصول، زعیم اکبر ملا سید محمد باقر بہبہانی (متوفی ۱۲۰۸ھ) سید علی عبدی طباطبائی (م ۱۲۱۲ھ) سید مہدی موسوی شہرستانی متوفی (۱۲۱۶ھ) سید علی صاحب ریاض المسائل متوفی (۱۲۳۱ھ)

تاریخ تشیع کے رہنما اور حوزہ علمیہ نجف و کربلا کے سربراہ تھے۔ ان حضرات کے تلامذہ نے شام، حجاز، ایران، ہندوستان اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں اور ترکی میں فقہ شیعہ پر بہت کام کیا۔ آقائے بہبہانی تمام شیعی دنیا کے مرجع تھے۔ ان کا حلقہ درس نجف و کربلا کی تاریخ کا ممتاز حلقہ مانا گیا ہے۔

مولانا دلدار علی نجف و کربلا و سامرا کے ان اساتذہ سے اجازت لیکر ایران پہونچے اور یہاں کے شیخ الفقہ والاصول سید مہدی ابن ہدایت اللہ اصفہانی کے درس میں حاضری دی۔ کچھ عرصہ تک قم و مشہد میں قیام کر کے اکابر علماء سے سند حدیث و اجازت لیکر ایران سے وطن کا رخ کیا،، ؎

سفر عراق کے لئے ہندوستان سے روانگی کا زمانہ تو تعین کے ساتھ نہیں معلوم لیکن مولانا فاضل کا فرمانا ہے کہ "مولانا کی لکھنؤ آمد کا سن ۱۱۹۴ھ بتایا جاتا ہے ظاہر ہے کہ یہاں فاضل مصنف کی مراد لکھنؤ آمد سے مراجعت ایران و عراق سے لکھنؤ پہنچنے سے ہے کیونکہ مستقل اقامت کے لئے وطن معروف نصیر آباد ضلع رائے بریلی سے تشریف آوری ۱۲۰۰ھ کا واقعہ ہے جیسا کہ مولانا آغا مہدی صاحب نے لکھا ہے کامل پینتیس ۳۵ برس تک اس سحاب علم کے ترشحات سے قوم سیراب ہوتی رہی ؎ چونکہ غفرانمآب کی وفات ۱۲۳۵ھ میں واقع ہوئی اس لئے ماننا چاہئے کہ فاضل مصنف کی مراد ۱۲۰۰ھ سے شروع ہونے والے عہد سے ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے دلی کے اضمحلال اور لکھنؤ کے عروج سے اثنا عشری فرقہ میں اپنا تشخص ایک بار پھر نمایاں کرنے کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایسے میں مشترکہ جمعہ و جماعت میں اس فرقہ کی شرکت میں بھی سستی در آئی یہ صورتحال دیکھ کر ایک صوفی عالم شیخ علی اکبر مودودی نے جو نواب بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے کسی طرح متعلق تھے یہ صلاح دی کہ شیعوں کو اپنا جمعہ و جماعت الگ کر لینا چاہیے چنانچہ ملا محمد علی بادشاہ نے نماز جماعت کی فضیلت پر ایک رسالہ لکھ کے آصف الدولہ کے حضور میں پیش کیا۔ نواب وزیر کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں تو مولانا کے دلدادہ اور قدرداں تھے ہی۔ انھوں نے مولانا دلدار علی کو لکھنؤ کی اقامت کے لئے مدعو کیا اور سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے مکان پر ہی ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ ۱۲ مئی ۱۷۸۶ء کو شیعوں کی پہلی نماز جماعت ہوئی اسی تاریخ کو فیض آباد میں مولانا عبد العلی دیوکھٹوی کی امامت میں نماز جماعت قائم ہوئی اس لئے عبادت الٰہی کے وسیلہ سے شیعہ سماج کا کھویا ہوا اجتماعی تشخص ابھر کر اجاگر ہوا۔

اس اقدام کی تنقید کی گئی ہے اور اسے حکومت کی سرپرستی کا ثمرہ بتایا گیا ہے لیکن بہ اندک تامل یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تبدیلیٔ مذہب کی کارروائی نہ تھی بلکہ یہ حجاب تقیہ کا چاک ہونا تھا مگر شکر کا مقام ہے کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق جیسے حضرات نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام نہیں لیا تھا۔

حکومت کی ناجانبداری کی بدولت بالواسطہ تحفظ ملا تو مولانا دلدار علی نے پھر تعلیمات اہل بیت کی روشنی میں شیعہ سماج کو استحکام عطا کرنے کا تبلیغی جہاد چھیڑ دیا۔ اب اس کی زد میں اخبارات، تصوف، عرس، قوالی، قبروں پر چادریں، بھنگ کے چبوترے، شیخ سدو کا بکرا، شیخ فرید کا بیلھا وغیرہ وغیرہ سبھی آگئے۔

اس جہاد میں شمشیر زبان اور ذوالفقار قلم دونوں تیز تیز چلیں اثر یہ ہوا کہ خود نواب آصف الدولہ کو بھنگ سے تائب ہونا پڑا۔

اب دور آیا مسجدوں اور امام باڑوں کی تعمیر کا، کتب خانوں کی تاسیس کا اور مجالس درس کے قیام کا۔ آصف الدولہ نے جو مسجد اور امام باڑہ بنوایا اسے تو مرحوم کے حسن نیت نے تاریخی تعمیر کا رتبہ بخشا اور وہ آج تک زیارت گاہ خلائق ہے جو امام باڑہ خود مولانا دلدار علی نے لکھنؤ میں تعمیر کیا جو ان کے دنیاوی لقب غفرانمآب کے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے جو گذشتہ دس برس میں از سر نو تعمیر ہوا ہے اور ہنوز کچھ کام باقی ہے۔ البتہ جو عزاخانہ مولانا دلدار علی نے اپنے وطن نصیر آباد میں بنوایا وہ البتہ ابھی شکستہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔

یہاں یہ یاددہانی طلبا و محققین کے لئے مفید ہوگی کہ عزاخانہ لکھنؤ کی تعمیر ۱۲۲۳ھ میں ہوئی تھی اور اس کی تاریخ ہوئی۔

مزار و مدرسہ جائے ماتم سبطین

جناب غفرانمآب نے اپنے وصیت نامہ میں امام باڑہ میں طلباء کو قیام کی سہولت دینے کی نہایت تاکید کی ہے۔

مولانا دلدار علی غفرانمآب کے جس اختصاص وامتیاز کو ایک زبردست خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہئے وہ ہے اتحاد بین المسلمین کی پاسداری۔ خود ہی قیام گاہ کے لئے فرنگی محل کے متصل محلہ کو منتخب فرمایا اگر قضا و افتاء کے لئے اثنا عشری افراد معین ہوئے تو ساتھ ہی ساتھ سنی قاضیوں اور مفتیوں کی تقرریاں بھی ہوئیں کسی فرقے نے دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کی اگر کہیں بے احتیاطی کچھ ہوا تو اس کی حیثیت شاذ و نادر کی ہے۔ دونوں طبقے متحد رہیں نہ شیعہ علماء سے استفادے میں سنی طلاب کو کراہت ہوئی اور اسی طرح شیعہ طلاب نے اور سنی حضرات علماء سے استفادے میں تکلف و احتیاط کو راہ نہ دی

اس خدا رسیدہ عالم جلیل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کی نسل میں علم دین آج بھی باقی ہے۔ اس دودمان عالی شان کے علماء ہندوستان و پاکستان میں اب بھی مشغول فیض رسانی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اپنے دوران قیام عراق میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ پر آپ نے دعا کی تھی کہ میری نسل میں علم دین ہمیشہ رہے۔ اس سلسلے میں اس شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ دوسرے علماء و مجتہدین روضے کی مجاورت میں یہ سعادت کیوں نہ حاصل کر سکے صرف دلدار علی (غفرانمآب) کو یہ امتیاز کیسے حاصل ہوا۔

اس سوال پر متعدد حضرات نے گفتگو کی ہے۔ مولانا آغا مہدی مرحوم نے جو توجیہہ فرمائی ہے وہ اس طرح ہے کہ یہ دعا ایسی شب جمعہ میں کی گئی تھی جو شب قدر بھی تھی اور ایسی ساعت تھی جس میں مشتری کا اقتران راس ذنب سے تھا جو عموماً چودھویں برس ہوتا ہے اور اس ساعت کو قبولیت دعا کا وقت بتایا جاتا ہے۔

خداوند عالم نے جناب غفرانمآب کو پانچ بیٹے عطا کئے۔ صاحبزادی بھی ایک تو ضرور ہی تھیں اور زیادہ کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا سید سلطان العلماء اور سب سے چھوٹے مولانا سید حسین سید العلماء تاریخی اہمیت کے حامل ہوئے۔ دوسرے صاحبزادگان مولانا سید علی، مولانا سید حسن اور مولانا سید مہدی تھے۔

تصنیفات کی تعداد بہت ہے لیکن آپ کا کارنامہ کمال عماد الاسلام کہی جاتی ہے یہ اصول دین پر پانچ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی دو جلدیں جو امامت اور معاد کی بحث میں ہیں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

وفات

۱۲۳۵ھ کی انیسویں رجب اور از روئے تقویم ۲ مئی ۱۸۲۰ء کو اس عہد ساز شخصیت کا دور حیات پورا ہوا۔ اپنے ہی نو تعمیر عزاخانے واقع لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ آپ کے ممتاز شاگرد علامۃ العلماء مولانا سید احمد علی محمد آبادی نے تاریخ وفات کہی۔ دو ابیات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

رسید چوں شب تاسع عشر زماہ رجب   سفر بروضۂ رضواں عفو از دنیا
سروش غیب ہاں وقت ناگہاں فرمود   ستون دین بزمین اوفتاد وا ویلا

سید محمد سلطان العلماء:- جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ شمالی ہند میں شیعہ سماج

کا استقلال جناب غفرانمآب مولوی دلدار علی صاحب کا کارنامہ ہے لیکن آپ کے فرزند اکبر مولوی سید محمد کو حالات نے زیادہ عہد آفریں شخصیت ثابت کیا۔ آپ علمی دنیا میں سلطان العلماء کے شاہی خطاب سے مشہور ہوئے۔ دربار میں باتباع شاہی بلاو کعبہ اور گھر میں "بڑے آپ" کہے جاتے تھے۔ عہد امجد علی شاہ اور بعد کی تاریخ میں مجتہد العصر اور وفات "رضوان مآب" کے لقب سے یاد کئے گئے۔

اس عالم اجل کی ولادت ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۸۴ء) کو لکھنؤ میں ہوئی تمام تر تعلیم اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاصل کی۔ کچھ مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھنے کی روایت کی گئی۔ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹ برس کی عمر میں تحصیل کامل ہو گئی اور صاحب نظر مجسمہ علم و کمال باپ نے اجازۂ اجتہاد کا مستحق سمجھا اور عطا فرمایا۔ اجازۂ اجتہاد سے مزین ہو کے اپنے والد ماجد کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا اور اس سلسلے میں اولیں مرحلہ اپنے چاروں چھوٹے بھائیوں کے درس کا تھا اور اپنے والد کے دوران علالت یہ خدمت انجام دی۔

مملکت اودھ کی وہ انقلابی کروٹ جس میں مسند وزارت و صوبہ داری بساط شاہی بن گئی جناب غفرانمآب کی حیات کے آخری دنوں کا واقعہ ہے اس لئے صورتحال کی سنگینی سے الجھنے کی ذمہ داری جناب سلطان العلماء کے سر آئی۔

ہوا یہ کہ نواب غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر مرکزی شہنشاہیت سے رابطہ توڑ لیا اور خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس اقدام کے جواز کے سامنے سوالیہ نشان لگ گیا۔ اس لئے بادشاہ سلامت سے مولانا سید محمد کا ربط بس واجبی سا ہی رہا لیکن نصیر الدین شاہ سے تو کشمکش کی نوبت آ گئی اور رشتے اتنے تلخ ہوئے کہ مولانا نے دربار میں آنے کا بلاوا ہی رد کر دیا لیکن محمد علی شاہ کے عہد میں حالات سدھرے لیکن جواز کا سوالیہ بدستور قائم رہا لیکن جب ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ / مئی ۱۸۴۲ء میں محمد علی شاہ کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سنجیدگی سے یہ مسئلہ حل کرنے کی سعی کی اور تخت و تاج "نائب امام" کی حیثیت سے سلطان العلماء کی خدمت میں پیش کرنا چاہا۔

مگر آپ نے یہ عہد لے کر کہ حکومت فقہ جعفری کے الٰہی نظام پر چلے گی تاج امجد علی شاہ کے سر پر رکھ کر زمام سلطنت انھیں کو سونپ دی۔ بادشاہ نے مخلصانہ نیاز مندی کے ساتھ خطاب پیش کیا۔

"مجھے علوم دین مرجع سادات و مومنین، حافظ احکام اللہ مورد اعتقادات امجد علی شاہ، سلطان العلماء، مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب"۔

لیکن خود سلطان العلماء نے "اعتقادات" کی لفظ "عنایات" سے بدلوا دی وہ خطاب گلے کو کھلے نہ تھے یہ عمل و نفوذ کی روح سے معمور تھے جو شعبے برطانوی اقتدار کے زیر اثر تھے ان کے علاوہ تمام شعبوں میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا اور کاروبار سلطنت کا اچھا خاصا حصہ جناب سلطان العلماء اور ان کے چھوٹے بھائی جناب سید العلماء سید حسین علیین مکاں کی نگرانی میں آ گیا۔ اس صورتحال کی حکایت میں کچھ جانبدار قسم کے کم فکر نوجوانوں نے یہاں تک مبالغہ آرائی کر دی کہ ملک کے انتظامی امور سے لیکر بادشاہ کی نجی زندگی تک ہر کام میں مجتہدین کا دخل تھا۔ مجتہدین سے مراد یہی دونوں بھائی سلطان العلماء و سید العلماء ہیں۔ جناب سلطان العلماء کی حیثیت سلطنت کے سب سے بڑے حاکم کی تھی اور دوسرے عہدوں میں بھی آپ کے بھائی صاحبزادوں اور شاگردوں وغیرہ کی اچھی حصہ داری رہی۔

اگرچہ جناب سلطان العلماء اور جناب سید العلماء کے درمیان کوئی کسی طرح کی تقسیم کار نہ تھی پھر بھی تعلیمی اور تدریسی میدان میں جناب سید العلماء اپنے فیض جاوداں کی ایک نہایت فیض رساں یادگار چھوڑ گئے آپ کے فخر استاد شاگرد مفتی علامہ میر محمد عباس شوشتری نے آپ کے حسب ارشاد علم دین کی تحصیل کے ثواب و فوائد پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جسے بادشاہ وقت کی خدمت میں پیش کیا گیا اور امجد علی شاہ نے نائب وزیر اعظم نواب امین الدولہ امداد حسین خاں کو مدرسہ کی تاسیس کی ہدایت فرمائی اس طرح اس مدرسہ کا قیام ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں وجود میں آ گیا پہلے یہ درسگاہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے کی دالانوں میں رہی لیکن جب قیصر باغ کی تعمیر ہوئی اور وہاں سلطان عالم واجد علی شاہ کا قیام فنون لطیفہ سے علمی دلچسپیوں کے ساتھ ہوا تو پھر مدرسہ سلطانیہ آصفی امام باڑہ میں منتقل ہو گیا اور غصب اودھ کے بعد غاصب حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا۔ ـه

اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تو جناب سید العلماء کے صاحبزادے جناب مولانا سید تقی صاحب ممتاز العلماء فخر المدرسین کے خطاب کے ساتھ مقرر ہوئے تھے اور تین اساتذہ حضرات کی حیثیت سینیر پروفیسر کی تھی جن میں ایک جناب مفتی علامہ میر عباس صاحب تھے۔ یہاں کے اودگی اساتذہ کا ذکر اس تحریر میں کسی قدر تفصیل سے آنا چاہئے تھا لیکن افسوس ہے کہ مضمون کو بجا طور پر بھی طوالت نہیں دی جا سکتی۔

سلطنت اودھ کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی جناب سلطان العلماء کی زندگی نہایت سرگرم گذری۔ صرف انتظامی امور یا سماجی خدمات میں محصور و محدود ہو کے نہیں رہ گئے بلکہ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں بھی برابر کی دلچسپی۔ جناب

سلطان العلماء کے قلم سے چالیس اہم تصنیفیں یادگار ہیں اور یہ فقہ و اصول، معقولات، علم کلام اور مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ چند یہ ہیں۔

(۱) احیاء الاجتہاد ۔ اصول فقہ	(۶) حاشیہ حمد اللہ
(۲) اصل الاصول	(۷) رسالہ حل مسئلہ جذر اصم
(۳) بشارت محمدیہ	(۸) حاشیہ شرح صغیر
(۴) برق خاطف	(۹) ضربت حیدری (دو ضخیم مجلدات)
(۵) ثمرۃ الخلافۃ	(۱۰) منہاج التدقیق

یہ بہت مشہور و اہمیت کی حامل ہیں۔

سلطان العلماء نے اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کے علاوہ باکمال شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کو فیض پہونچایا اس میں مولانا حامد حسین فردوس مآب صاحب عبقات الانوار ایک عظیم الشان اور نادر الوجود کتب خانہ کے بانی اور ایک علمی و دینی خانوادہ کے مؤسس ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین بھی اپنے دور کے عظیم عالم تھے۔ خدا کے فضل سے اس نسل میں بھی علم کا ہنوز سلسلہ جاری ہے جو عبقاتی کی نسبت کے ساتھ آج بھی وسیع شہرت کی مالک ہے۔

مفتی علامہ سید محمد عباس صاحب کی دختری نسل میں بھی علم دین کا سلسلہ بھی بحمد اللہ جاری ہے اور مرحوم کے صاحب صلاحیت احفاد علم دین کے بڑے اداروں سے وابستہ رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ جناب سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب نے ۲۷ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء کو شب میں دو بجے اس سرائے فانی کو خیرباد کہا۔

سلطان العلماء کو خلاق عالم نے گیارہ فرزندوں سے نوازا ان میں کئی حضرات علم و عمل کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کے مالک ہوئے لیکن حالات نہایت مختصر طریقے سے بھی قلم بند کرنے کی گنجائش نہیں۔ محض نام شماری سے کیا فائدہ ہوگا لہٰذا ہم اب جناب کے برادر زادے ممتاز العلماء فخر المدرسین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جناب سید تقی صاحب

جناب سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکاں کے منجھلے صاحبزادے سید محمد تقی اپنے جد امجد جناب مولوی دلدار علی غفرانمآب کی حیات میں پیدا ہوئے اور تقریباً دہ مہینے آپ کے زیر سایہ رہے اور اپنے والد اور تایا کی تربیت میں پروان چڑھے۔

جن اساتذہ سے آپ نے درس لیا ان میں جناب غفرانمآب کے شاگرد رشید جناب علامۃ العلماء مولانا احمد علی محمد آبادی اور آپ کے دادا کے نامور شاگرد جناب علامہ سید محمد عباس صاحب کے اسمائے گرامی ہیں۔ والد اور تایا نے خود بھی توجہ فرمائی اور انتہائی کتابیں پڑھائیں اور اٹھائیس ۲۸ سال کے سن میں آپ کو سند اجتہاد مرحمت کی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اجتہاد کے حصول کے بعد سند دی گئی کیونکہ مدرسہ سلطانیہ میں صدر مدرس کی سند آپ کو پہلے ہی عطا ہو چکی تھی اور آپ کی ماتحتی میں جو تین مدرس اعلیٰ یعنی سینیئر پروفیسر تھے۔ ان میں آپ کے سابق الذکر دو اساتذہ بھی تھے۔

جناب ممتاز العلماء فخر المدرسین کے رنگارنگ خدمات کی داستان عظیم بھی ہے طویل بھی لیکن ان کے بیان کا محل نہیں۔ آپ نے تدریس و توسیع علم میں گراں بہا خدمات انجام دیں جہاں ایک شاندار امام باڑے اور مسجد کی تعمیر فرمائی وہیں طلبہ کے لئے اقامت گاہ بھی بنوائی۔ یہ صاف اپنے جد بزرگوار غفرانمآب کی تاسی تھی جنھوں نے لکھنؤ میں اپنے امام باڑے میں طلبہ کے قیام کا خاص اہتمام فرمایا تھا اور وصیت نامہ میں اس کے لئے شدید تاکید کی تھی مجتہد عصر کی حیثیت سے بھی آپ کو غیر معمولی مرجعیت میسر ہوئی۔ آپ اپنے خانوادے کی پہلی ہستی تھے جن کے فتاوی اخبار الاخیار میں چھپا کرتے تھے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے لکھا ہے۔ ایک دنیا آپ کی تقلید میں تھی"۔

تدریس کے ساتھ تصنیف میں بھی آپ کی گہری دلچسپی تھی ۲۲ رمضان ۱۲۸۹ھ کو جس وقت مرض الموت میں مبتلا ہوئے ہیں اس وقت بھی اپنی مشہور تصنیف ینابیع الانوار کی تصنیف میں مشغول تھے۔ دن گذرا رات آئی صبح ہوتے ہوتے شب قدر کی سعید ساعتوں میں رحلت فرمائی۔ آپ کی نسل میں اب بھی علم بدرجۂ کمال ہے۔ آپ کا عزاخانہ عقب مسجد تحسین چوک لکھنؤ مقبول و معروف عزاخانوں میں ہے۔ آپنے تصانیف کی بھی بڑی تعداد یادگار چھوڑی۔ آپ کے صاحبزادے جناب سید محمد ابراہیم صاحب آپ کے جانشین ہوئے ہر چند کہ آپ کا زیادہ وقت غصب اودھ کے عواقب سے عہدہ برآ ہونے میں گذرا۔ عواقب میں علی گڑھ تحریک بھی تھی انگریزی تعلیم کا شرعی جواز ایک ہنگامہ خیز مسئلہ بنا ہوا تھا۔ آپنے اس شرط پر کہ جو اپنے بچے کی مذہبی نگرانی کر سکے وہ انگریزی تعلیم دلوا سکتا ہے مشروط اجازت دی۔ عمر صرف اڑتالیس ۴۸ سال کی ملی پھر بھی نامور تلامذہ اور معتبر تصانیف بھی آپکے یادگار ہیں جن میں آیۃ اللہ سید محمد جواد بنارسی اور مرزا محمد ہادی رسوا مشاہیر زمانہ میں ہوئے۔

مولانا ابو الحسن صاحب رضوی

عرف جناب ابو صاحب جناب ممتاز العلماء کے داماد اور آپ کے

برادر نسبتی تھے بعد میں صاحبزادوں کے کم عمر ہونے کے باعث آپ کے وصی بھی ہوئے جناب ابو صاحب نے جناب سید ابراہیم کے تعاون سے توسیع تعلیم میں بڑی جدوجہد کی. جناب کا ذکر خیر ہم کسی قدر تفصیل سے کریں گے لیکن جناب ابو صاحب کی طرف رجوع سے قبل سلسلہ بیان کو الجھاؤ سے بچانے کے لئے یہ عرض کر دیا جائے کہ جناب ممتاز العلماء صدر المدرسین کے ایک داماد اور جناب سید ابراہیم کے نسبتی بھائی جناب سید مصطفیٰ صاحب عرف جناب میر آغا صاحب بھی تھے جن کی فقہی حیثیت اس پائے کی تھی کہ ایک وقت میں مرحوم کے اعلم ہونے کی روایت بھی سنی ہے. لکھنؤ کی آصفی مسجد کی نماز جماعت جناب کی ہی نسل کے لئے مخصوص ہے آپ کے خویش قدوۃ العلماء مولانا آقا حسن صاحب اور نواسے عمدۃ العلماء مولانا کلب حسین صاحب کی بڑی دینی اور سماجی خدمات ہیں مگر یہاں تفصیل میں جانے کا محل نہیں اس لئے اب ہم جناب ابو صاحب کی طرف رجوع کرتے ہیں.

جناب مولانا سید ابو الحسن صاحب بن جناب مولانا سید محمد صاحب کی ولادت ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۲۶۰ھ کو ہوئی اور کسی بزرگ نے سن ولادت کا مادہ تاریخ خورشید علم برآمد کیا ہے اور یہ بہت بابرکت اور مطابق حال ثابت ہوا. جناب مرحوم نے نہ صرف فقیہ استاذ بلکہ تعلیمی تحریک کے ایک عظیم رہنما و مدارس کے برگزیدہ موسس کی حیثیت سے اپنی حیثیت منوالی.

مکتبی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی جنھوں نے نہ صرف تعلیم بلکہ عبادتوں اور ریاضت کی تربیت بھی دی جب خود نماز شب کے لئے بیدار ہوتے تو فرزند کو مطالعہ کے لئے جگا دیتے اور خود نماز تہجد ادا فرما کے بیٹے کو ایک سبق پڑھاتے افسوس ہے کہ پدر شفیق کی حیات مستعار بہت مختصر ثابت ہوئی جناب ابو صاحب ابھی عمر کے نویں سال میں تھے کہ پدر نامدار کے سایۂ شفقت و تربیت سے محروم ہو گئے آپکی تعلیم کا مرحلہ دوسرے حضرات اساتذہ کے حضور میں طے ہوا. فقہ و اصول جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب سے پڑھا. جناب غفرانمآب کی معرکہ آرا تصنیف عماد الاسلام کا درس جناب سلطان العلماء مولانا سید محمد سے لیا.

آپ نے اپنے وقت کے علامۂ روزگار فقیہ ادیب اور نہایت جامع کمال بزرگ جناب مفتی سید محمد عباس صاحب سے بہت استفادہ کیا جناب پر جناب ممتاز العلماء کی شفقت کا یہ حال تھا کہ صاحبزادی سے عقد کر کے آپ کو اپنی فرزندی میں لے لیا جناب مفتی صاحب بھی نہایت شفقت فرماتے تھے مفتی صاحب اپنے مصنفات میں بھی جناب ابو کی رائے کا بہت لحاظ فرماتے تھے.

آپ نے جناب سید ابراہیم صاحب کی حمایت اور علامہ کنتوری مولانا حکیم مولانا سید غلام حسنین صاحب کے سرگرم تعاون سے ملک میں ایمانیہ مدرسوں کی تاسیس کی مہم چلائی. جو وقتی طور پر بہت کامیاب رہی لیکن ان مدرسوں کو استحکام و استقامت میسر نہیں ہوئی. اس تحریک کی یادگار مدرسہ ایمانیہ بنارس میں اب تک کامیابی سے چل رہا ہے. اس دور کی یادگار میرٹھ کا منصبیہ بھی ہے جسے اس کے بانی منصب علی خاں مرحوم نے اپنے نام نامی سے جاری فرمایا تھا. یہ دینی درسگاہ بڑے نشیب و فراز سے گذرا اس وقت اس کا پھر احیاء ہوا ہے خداوند علیم استقلال بخشے.

سب سے پہلے لکھنؤ میں مدرسہ ایمانیہ کی بنیاد ڈالی لیکن وہ جب بند ہو گیا تو آپ اس درجہ آزردہ خاطر ہوئے کہ وطن سے ہجرت کر جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن سید ابراہیم اور علامہ کنتوری کی وجہ سے باز رہے اور مرزا بہادر مرزا محمد عباس خاں صاحب کو آمادہ کر کے مدرسہ قائم کیا. مرزا صاحب کے والد ماجد آغا علی خاں عرف آغائی صاحب ناظم کے خطاب سے منسوب ہو کے یہ درسگاہ مدرسہ ناظمیہ کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئی ہر چند کہ اصل نام مدرسہ مشارع الشرائع ہے.

جب حالات سازگار ہو گئے اور اودھ کے غاصب حاکموں سے حسین آباد وقف کے متولیوں سے رشتے ہموار ہو گئے تو جناب آغا ابو صاحب مرحوم متوفی اور ڈپٹی راحت علی خاں مرحوم سکریٹری کو آمادہ کر کے مدرسہ سلطانیہ کی تجدید کرائی اور مدرسہ ناظمیہ جناب نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب کے حوالے کر کے آپ نے مدرسہ سلطانیہ کی باگ ڈور سنبھالی. یہ جناب مرحوم کی روحانیت کا ہی اثر ہے کہ اس دینی درسگاہ کی افسری آپ ہی کی اولاد میں اب تک ہے. آپ فقہ و اصول کا درس اس طرح سے دیتے تھے کہ واقف کار بتاتے ہیں کہ کربلا اور نجف کے درس کی شان ہوتی تھی.

۱۴ رمضان سنہ ۱۳۱۲ھ (غالباً ۱۲ مارچ بدھ سنہ ۱۸۹۵ء) کو دفعتاً کربلائے معلی کے چھٹے اور آخری سفر کے لئے کمربستہ ہو گئے ۲۴ محرم سنہ ۱۳۱۳ھ (غالباً ۱۴ جون ۱۸۹۵ء) انتقال فرمایا. آپ کے فخر پدر فرزند جناب سید باقر صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی جناب کے چار صاحبزادے تھے بڑے سید زین العابدین کا انتقال بھی ۱۳۱۳ھ میں ہوا. دوسرے سید محمد جعفر سنہ ۱۳۱۰ھ میں انتقال فرما چکے تھے جناب

سید باقر اور جناب سید ہادی سے آپ کی نسل اور علمی روایت دونوں چلی جس کا سلسلہ ہندوستان، پاکستان اور ایران میں اب بھی جاری ہے۔

درس و تدریس میں شدید مشغولیت کے باوجود جناب نے متعدد بیش قیمت مصنفات چھوڑے ہیں جن کی تعداد صاحب مطلع انوار نے ستائیس درج کی ہے اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

علامہ غلام حسنین کنتوری

نہایت جامع العلوم بزرگوار تھے اور علامہ کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے اور اس کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ جتنے علوم و فنون پر مرحوم کو ماہرانہ دسترس تھی اور جتنی زبانوں میں مہارت کامل تھی اس کی نظیر تب بھی نایاب تھی۔ اب تو خیر! وسیع تعلیم میں علامہ کنتوری کی زبردست خدمات ہیں۔ انھوں نے تعلیم کو دست کاری سے جوڑنے عنصر شناسی کا جو ثبوت دیا اس کی بدولت انھیں علوم مشرقیہ کے مجدد کی حیثیت حاصل ہوئی۔

آپ کا تعلق اس خانوادے سے ہے جو وارد ہند کے بعد کنتور (ضلع بارہ بنکی) میں آباد ہوا۔ اور اب علمی دنیا میں خانوادۂ عبقات۔ کے نام سے مشہور ہے اس دودمان نے کئی مشاہیر روزگار دئے۔ دلوں میں جن کی یاد اور زبانوں پر جن کا ذکر بھی رہتا ہے آپ کی ولادت اس عالم خیز خاندان میں ۱۷ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ / ۲۷ اگست ۱۸۳۱ء کو ہوئی۔ مکتبی تعلیم کا سلسلہ بہت کم سنی میں طے کیا ۱۲۵۴ھ میں لکھنؤ آکر شاہی مدرسہ میں داخل ہوئے ۱۵ سال کی عمر میں جناب مفتی محمد قلی صاحب کی دختر نیک اختر سے عقد ہوا اور بہتر سے بہتر علمی ستفادے کا وسیلہ ہاتھ آگیا۔ پھر جناب سید العلماء و سید حسین علیین مکاں علامۃ العلماء مولانا سید علی محمد آبادی اور جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب سے بھی کسب فیض کیا۔ اجازے بھی حاصل کیے۔

مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ قائم ہوا تو اس میں صنعتی تربیت بھی داخل کی۔ گھڑی سازی کی تربیت بنفس نفیس دیتے تھے۔ اس ہنر کو آپ نے خود اپنے طور پر حاصل کیا تھا کسی سے سیکھا نہیں تھا۔

دینیات کے ساتھ طب میں بھی بارگاہ بہم پہونچائی صحافت کا کوچہ بھی چھانا اخبار ہمارنامی اخبار اور تہافت الفلاسفہ نامی رسالہ جاری کیا اپنا پریس لگایا اور جناب ممتاز العلماء کی تفسیر ینابیع الانوار کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا لیکن اپنے کو منظر رہا۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے۔ کے دلدادہ نہ تھے۔

ایک نہایت فعال اور سرگرم شخصیت کے مالک تھے۔ تدریس، مطب اور اخبار نویسی کے علاوہ کیمیائی عمل و صنعت کاری کے شائق و سعی تھے۔ صابن سازی و عکس لگانے کے کارخانے قائم کیے مگر اتفاقات کی ناسازگاری سے ان کاموں کو کسی کام کو نہ ملا۔ محض برطرح سازش نہیں، سماجی خدمات کے بطور بہت سے کام کیے۔ اتحاد اسلامی کے نہایت پرجوش اور وسیع النظر حامی تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تاسیسی دور میں علامہ شبلی نعمانی کی بہت رفاقت کی۔ مختلف علوم میں تصنیف و تراجم یادگار چھوڑے۔ بعض آثار قلم تو معرکے کے ہیں۔ قانون شیخ کا جو ترجمہ مختلف جہات سے خامے کی چیز شمار ہوتا ہے حد یہ ہے کہ موسیقی اس لیے سیکھی غنا کی حلت و حرمت کی حدود و شناخت کر سکیں باایں ہمہ وضع ظاہر عالمانہ اختیار نہ کی اپنے دور کے ثقہ اشراف کے حلیے میں رہتے تھے۔ طب یونانی کے بڑے حاذق معالج تھے۔ میرے بزرگ مرحوم کے بعض معرکہ آرا معالجات کا اکثر آپس میں ذکر فرماتے تھے۔

اس پہلودار شخصیت کے مالک علامہ روزگار جامع کمالات بزرگ نے ۳ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ / ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو فیض آباد میں آخری سانس لی۔ لاش وطن مالوف کنتور لائی گئی اور خاندانی گورستان میں مٹی پائی۔ جناب فاضل لکھنوی نے مطلع انوار میں سن وفات ۱۹۱۹ء درج کیا ہے ؎۔ اس میں ماتن یا کاتب کسی کسی کی لغزش قلم ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے علامہ کے مصنفات کی تعداد کافی ہے جو مجلات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے وہ الگ ہیں لیکن ان کے قلم کے یادگار نقش جیسا کہ عرض کیا گیا قانون شیخ کا ترجمہ علم کلام میں انتصار الاسلام، اعجاز خسروی کی شرح آئین نامی متقل معراج نامہ قرآنیہ ہیں۔ خود گذشت لائف بھی بہت سبق آموز ہے۔

اب ہم اس سلسلے کے آخری فرد کا ذکر کرتے ہیں پھر حضرات علماء اہل سنت میں سے منتخب حضرات کی یاد تازہ کریں گے۔

مفتی علامہ میر عباس شوستری

میر تقی میر کا شہرۂ آفاق شعر ہے ؎

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آپ دوسرے مصرعہ میں انسان کو عالم سے بدل دیں۔ تب شاید اس نابغۂ روزگار کی جامعیت کا تصور ہو سکے۔ ان کا علم، ان کی فکر، ان کا مطالعہ، ان کے ذوق کا تنوع بے مثل مثال، بے مثالی تھا۔ علم تھوڑا اور سادہ علم نہیں عمل بھی،

عبادت بھی کھیل کود سے یکسر بیگانگی. نو سال کی عمر تھی کہ شعری تصنیفات شروع ہو گئی تھی پھیلنے لگی!

مفتی صاحب کی ولادت سید علی اکبر جزائری، شوستری کے گھر میں شب شنبہ آخر ربیع الاول ۱۲۲۴ھ (۱۳ مئی ۱۸۰۹ء) کو لکھنؤ میں ہوئی جزائری کا لاحقہ اس لئے نام کے ساتھ شامل ہوا کہ آپ مشہور عالم و درویش سید نعمت اللہ جزائری کی نسل میں تھے. اس دودمان عالی شان کے افراد لکھنؤ اور حیدر آباد میں تھے.

مکتبی تعلیم جن اساتذہ سے پائی ان میں والد ماجد کے علاوہ مولوی عبدالقوی صاحب، مولوی عبد القوی صاحب ہیں. لیکن جس حریم درس نے مفتی صاحب کو یہ بلند مقام عطا کیا وہ سید العلماء سید حسین علیین مکاں کی بزم درس تھی. جہاں جہاں سے مفتی صاحب نے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھایا پھر حضرت استاد کی شکر گزاری اور اظہار ممنونیت میں کمال کر دکھایا. آپ کی اوراق الذہب اور دیوان رطب العرب میں اس ستائش گری کے نایاب مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں جن سے خود جناب مفتی علام کی پرواز فکر اور تصنیفی منزلت کا پتہ چلتا ہے لکھنؤ میں اب فقہ کا بڑا چرچا تھا اور استدلالی فقہ کے اس دور نشاۃ میں بڑے بڑے فقیہہ مسند اجتہاد پر فائز تھے. یہی زمانہ تھا جب مجتہد اکبر فقیہہ اعظم شیخ محمد حسن اور سید علی طباطبائی عراق میں اس فن شریف کے تاجدار سمجھے جاتے تھے. ان کی کتابیں جواہر الکلام اور شرح کبیر حرف آخر کا درجہ پا چکی تھیں. مفتی صاحب غالباً یہاں کے اولیں مجتہد تھے جنھوں نے عراقی دبستان اور تحقیقی اسلوب پر شریعت غرا پیش کی. فقہ جعفری میں آپ کا دست رس دیکھ کے جناب سلطان العلماء نے آپ کو مفتی مقرر کئے جانے کی سفارش کی. بادشاہ نے تاج العلماء و افتخار الفضلاء کے خطاب کے ساتھ تقرر کا پروانہ جاری کیا. اس طرح آپ نے بیک وقت مدرسہ سلطانیہ کی معلمی اور مفتی حکومت کی دوہری ذمہ داریاں نبھائیں. ساتھ ہی ساتھ اپنے استاد یگانہ جناب سید العلماء کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ جاری رکھا.

عبادت میں غیر معمولی شغف اور خوف خدا میں مستغرق رہنے کے باوصف مزاج معلّیٰ میں خوش طبعی و مزاح کا مادہ نمایاں تھا. حاضر دماغی، برجستہ جوابی میں طاق تھے. نثر کے مانند نظم میں بھی اپنی مثال آپ تھے. اردو، عربی فارسی شاعری میں یکساں دستگاہ رکھتے تھے جو طبع ہو کے سامنے آیا وہ بھی بہت ہے جو منظر عام پر نہیں آسکا اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں.

غصب اودھ تک مدرسہ سلطانیہ کے ایک مدرس اعلیٰ (سینیر پروفیسر) اور مفتی حکومت تھے بعد غدر [illegible] مرحوم کے فرزند نواب افضل علی خاں صاحب سے متعلق ہو کے کانپور میں قیام رہا پھر سلطان عالم واجد علی شاہ نے یاد فرمایا تو مٹیا برج تشریف لے گئے یہ سلسلہ درمیان میں منقطع ہوا تو لکھنؤ تشریف لائے. سلطان عالم نے پھر زحمت دی تو دوبارہ تشریف لے گئے بادشاہ نے قدر دانی و احترام کی حد کر دی.

مصنفات کی تعداد سوا سو بتائی جاتی ہے جو بیشتر عربی میں ہیں پھر فارسی میں مفتی صاحب کے دو صاحبزادگان جنھوں نے مفتی صاحب کی مسند علم آباد کی. مفتی محمد علی صاحب بڑے اور مفتی احمد علی صاحب چھوٹے فرزند تھے. بڑے مفتی صاحب کی نسل میں اب بھی بحمدہ علم دین باقی ہے جس سے پاکستان کے حضرات مستفید ہو رہے ہیں. جناب مفتی صاحب کی تدریسی و تعلیمی روایت ان کے ارشد تلامذہ و داماد جناب نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب سے آگے بڑھی جو جناب مفتی صاحب کے فرزندوں کی خورد سالی کی بنا پر مفتی صاحب کے جانشین ہوئے اور بحمدہ علم دین کی خدمت اس نسل کے متعدد علماء کے ہاتھوں ہو رہی ہے.

آپ کے تلامذہ کی فہرست بہت طولانی ہے ان میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی بھی شامل ہیں جس کے فخر استاد شاگرد مولانا شبلی نعمانی ہوئے اس طرح جناب مفتی صاحب کا شجرۂ علم کمال بکثرت برگ و بار لایا.

کلکتہ سے واپس آ کے جناب مفتی صاحب زندگی کے آخری دن لکھنؤ میں بسر کر رہے تھے کہ علیل ہوئے اور مرض جان کے ساتھ رخصت ہوا. مفتی صاحب نے ۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ / ۲۷ مارچ ۱۸۸۹ کو جان جان آفریں کے سپرد کی جناب غفرانمآب کے امام باڑے کے گورستان میں آسودۂ خاک ہیں.

اب قلم کا سیاح حضرات علمائے اہل سنت کے منتخب تر بزرگوں کی طرف رخ کرتا ہے

مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی

آپ بہ اعتبار عہد مولوی دلدار علی غفرانمآب سے نصف صدی مقدم تھے آپ کی ولادت ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (غالباً ۲۹ جنوری ۱۷۰۴ء) کو قصبہ بلگرام (ہردوئی) میں حسینی سادات کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو واسط (ایران) سے چل کر زمین مارنا سرزمین اودھ پر وارد ہوا تھا اور بلگرام میں آباد ہو کے اسے عالم خیز زمین بنا دیا. یوں تو سارا خطہ اودھ عالم و عارف و زاہد خیز تھا لیکن جس بہتات کے ساتھ خاک بلگرام کے پردے سے عالم نکلے اس کی اپنی ایک الگ شناخت ہے اور یہ شناخت معین کرنے میں آزاد مرحوم کا حصہ کسی سے کم نہیں.

میر غلام علی میر محمد نوح کے گھر میں سید عبد الجلیل ایسے جلیل القدر عالم کی صاحبزادی کے بطن سے پیدا ہوئے آپ کا شجرۂ نسب موتم الاشبال عیسیٰ بن زید شہید سے گزرتا ہوا حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ موتم الاشبال کا مفہوم ہے رانگی معنی ہیں۔ شیر کے بچوں کو یتیم بنانے والا۔

میر غلام علی کی تعلیم کا مرحلہ کیسے طے ہوا اس کی نشاندہی کا وسیلہ فی الوقت یا نہیں ہے البتہ تکمیل تحصیل سے قبل والی منزل جسے ہم وسطانی سطح کہہ سکتے ہیں کرالا حسینی اور میر طفیل محمد کی رہنمائی میں سر ہوئی آزاد خود بتاتے ہیں ؎

شاگرد خاص میر طفیل محمدم　　　اور در علوم عقلی و نقلی ست رہبرم

قیاس قرین یہ ہے کہ والد بزرگوار (میر محمد لطف اللہ) کے سامنے بس حصول برکت کے زانوے ادب تہہ کیا ہوگا اور اصل استفادہ فرزند نامدار (میر طفیل محمد) کی بزم سے کیا۔

ابھی تعلیم کی منزل تمام نہیں ہوئی تھی کہ سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے میر لطف اللہ ی کے ہاتھ پر طریقۂ چشتیہ میں بیعت ہو گئے۔ یہ ۱۱۳۰؁ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۱۳۴؁ھ میں تکمیل تحصیل کے لئے اپنے جد امجد میر عبد الجلیل کی خدمت میں دہلی پہنچے جہاں صاحب ان دنوں سلطان شاہ کی ملازمت میں تھے۔ آزاد نے اپنے نانا کی خدمت فقہ، حدیث، سیرت، لغت وادب میں استفادہ کیا بلکہ عربی و فارسی شاعری شورۂ سخن انھیں بزرگوار سے کیا۔ آزاد اپنے فضل و کمال کو اپنے نانا کا ہی فیضان قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

آزاد ما کہ فضل و کمالے بہم رسانند۔ خدمت نمود حضرت عبد الجلیل را۔

نانا کی خدمت میں آزاد کا قیام دو سال رہا۔ پھر وطن واپس ہو گئے۔ ۱۱۴۳؁ھ میں اپنے ماموں میر سید محمد کی طلب پر سوستان پہنچے۔ وہاں اپنے سے فن عروض و قافیہ میں استفادہ کیا اور اس دوران مطالعہ جاری رکھا۔ پنے پہلے فارسی تذکرے "ید بیضا" کے کام کو آگے بڑھایا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ میر سید محمد دوسری سرکاری مہم پر بھیجے گئے یا رخصت پر وطن آ گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں آزاد مرحوم نے ان کی سیر کشش انع نگار کی حیثیت سے قائم مقامی کی۔ اس کے بعد آزاد نے وطن کی طرف ت کی۔ یہ سفر بہت معلومات افزا رہا۔ مختلف دانشوروں اور علماء سے ملاقات ہ ملا۔ جن میں شیخ علی بادی کی ملاقات قابل ذکر ہے جنھوں نے آزاد کی علمی صلاحیت اثر ہو کے اپنے ہاتھ سے کچھ اشعار لکھ کے بطور یادگار ہدیہ میں دئے۔

آزاد کے والد میر محمد نوح نواب شاہ نواز خاں صوبے دار الہ آباد کی سرکار میں میر ساماں کے منصب پر فائز تھے۔ میر صاحب اپنے دونوں بیٹوں کو نواب کی حضوری میں دربار لے گئے وہاں جو کچھ گذری اس سے بد دل ہو کے آزاد اپنے باپ اور بھائی کو چھوڑ کے واپس چلے آئے کہ یہاں کی عاجزی اور خاکساری سے حاکم حقیقی کی طرف رجوع کیوں نہ کیا جائے۔

بظاہر اس واقعہ سے متاثر ہو کے آزاد نے حرمین شریفین کی زیارت کا قصد کرلیا۔ یہ منزل پا پیادہ سر کرنے کے لئے رجب ۱۱۵۰؁ھ میں گھر سے نکل پڑے راستے میں سرونج نامی مقام پر نواب آصف جاہ نظام دکن کے حضور میں وارد ہوئے جو جذبۂ للّٰہیت نواب سر بلند خاں کی سرد مہری سے اپجا تھا یہاں پہنچ کر کچھ کمزور پڑ گیا اور حسن طلب میں آصف کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ رباعی نذر کی ؎

اے حاتم دہر محیط جود و احساں　　　حق داد خطاب آصف شایاں

او تخت بدرگاہ سلیماں آورد　　　تو آل نبی را بدر کعبہ برساں

نواب نے عرض داشت قبول کی اور وسائل سفر مہیا کرا دئے۔

آزاد مالوے سے سورت پہنچے اور پھر وہاں سے چل کے جدہ کی بندرگاہ پر اترے اور ۱۱۵۱؁ھ انھوں نے حج و زیارت میں بسر کیا۔ اور "عمل اعظم" سے اس کا مادۂ تاریخ برآمد کیا۔

ہر چند کہ آزاد کا یہ سفر بیت خدا کے حج و بیت رسول کی زیارت کی نیت سے تھا۔ لیکن ان کے ذوق علم کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے کہ اس موقع کو بھی انھوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور انھوں نے مدینہ منورہ میں صحاح ستہ پڑھے مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو علم حدیث میں ہی شیخ عبد الوہاب سے کچھ استفادہ کیا۔ حج کی بجا آوری کے بعد ۱۱۵۲؁ھ میں وطن واپس پہنچے۔ "سفر بخیر" مادۂ تاریخ ٹھہرا۔

کچھ دن اورنگ آباد و حیدر آباد میں قیام رہا پھر ۱۱۵۸؁ھ سے ۱۱۶۴؁ھ تک نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بعد کا زمانہ بھی یہیں گزارا۔ اسی دوران جواں سال بیٹے میر نور الحسین کا داغ دیکھا۔ اس غم نے میر صاحب کو نڈھال کردیا پھر بھی دس سال حیدر آباد میں گزارے۔ ۱۱۷۰؁ھ میں آصف جاہ ثانی نے رحلت کی تو آزاد اورنگ آباد مستقلاً چلے گئے۔

میر صاحب نے کبھی بزم درس سجائی ہو اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن فن شعر میں میر صاحب سے مستفید ہونے والوں کے نام بکثرت ملتے ہیں۔ لیکن خدا رسیدہ اور مقبول بارگاہ عالم متورع کی حیثیت سے اول کی قدر و منزلت

زندگی میں بھی ہوئی۔ بعد وفات مزار زیارت گاہ خلائق بن گیا۔ یہ مزار اول والدین کا خصوصی مرجع رہا جو اپنی اولاد کو علم و فضل کا سرمایہ دار بنانا چاہتے تھے۔ وہ لوگ اپنے بچوں کو آزاد کے مزار پر لے جاتے اور قبر پر جو مصری کے ٹکڑے یا شکر کے ریزے پڑے ہوتے انہیں چاٹنے کے لئے اپنے بچوں سے کہتے۔ عقیدہ یہ رکھتے کہ اس عمل کی بدولت ان کی اولاد علم و عمل کی شیرینی سے شاد کام رہے گی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میر صاحب کے بزم درس آراستہ کرنے کی نہ کوئی تفصیل ملتی ہے اور نہ علم فقہ میں کوئی تصنیف ملتی ہے لیکن اول کی کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کے چار ابواب میں سے پہلا باب ہندوستان میں قرآنیات و حدیث کی جو اس وقت تک خدمت ہوئی اس کے ذکر پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب میں ممتاز ہندوستانی علماء کا ذکر ہے۔ ادب، تاریخ، سوانح میں ان کے قلم نے وافر ذخیرہ پیش کیا۔ ان کی تصنیف مآثر الکرام کا شمار تذکروں میں کیا جاتا ہے لیکن خود مصنف علام نے اسے بلگرام کی تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے اس میں بلگرام اور مضافات کے تقریباً ۱۵۰ عارفوں اور فاضلوں کا ذکر ہے۔ اس طرح تقریباً ایک سو ساٹھ فارسی اور اردو شعراء کا تذکرہ ہے جس میں ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی کے بیان کے مطابق تیس شاعر بلگرام خاص کے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر عابدی نے اسے اہم تذکرہ قرار دیا ہے۔[۱۲] اس کے علاوہ آزاد کے تین تذکرے اور ہیں۔ ان کے قلمی آثار کا احاطہ اس مضمون میں مقصود نہیں ہے۔

میر غلام علی آزاد کے سن رحلت میں اختلاف ہے۔ بعض اہل قلم نے سنہ ۱۱۹۴ھ لکھا ہے۔ ایسی تاریخیں بھی دستیاب ہیں جس سے سنہ ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے سنہ ۱۲۰۰ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے۔ اس کا مادہ «آہ غلام علی آزاد» پایا جاتا ہے۔ اس اختلافی قضیہ کے تصفیہ کے لئے جس تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے امید ہے کہ ہمارے تحقیق کاروں میں سے کوئی مرد مستعد اس کی طرف توجہ کرے گا۔ لیکن ڈاکٹر تقی علی کا کہنا ہے کہ:۔

"... سنہ ۱۱۹۵ھ میں شاہ برہان الدین غریب کے مزار کے قریب زمین خریدی اور اس کا نام «عاقبت خانہ» رکھا۔ بالآخر ۲۱ ذی قعدہ سنہ ۱۲۰۰ھ کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔" [۱۳]

اس لئے قوی رجحان سنہ ۱۲۰۰ھ ہی کے سن وفات ہونے کا ہے۔ عشقی اور میر غلام رسول بلگرامی نے جو مادہ ہائے تاریخ برآمد کئے ہیں دونوں میں واو کے محذوف رہ جانے سے چھ کی کمی کا امکان یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۲۰۰ھ والی روایت میں تاریخ بھی ۲۱ ذیقعدہ نہیں ہے جو اس کے قرین صحت ہونے کی دلیل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر سنہ ۱۱۹۴ھ کو سن وفات تسلیم کریں تو ۱۱۹۵ھ میں زمین کی خریداری کا واقعہ غلط ہو جائے گا۔ لہٰذا جب تک تحقیق عمل کسی قطع و یقین تک نہ پہونچا دے تب تک سنہ ۱۲۰۰ھ ہی کو میر کا سن وفات لکھنا چاہئے۔ مالک رام صاحب نے بھی یہی کہا ہے اور ان کا ماخذ اتحاف النبلاء اور خم خانہ جاوید ہے۔[۱۴]

یہاں ایک پہلو کی طرف اشارہ شاید طلاب اور مبتدی تحقیق کاروں کے لئے سود مند ہو وہ یہ ہے کہ اس بات کو دیکھا جائے کہ میر صاحب کی کہی ہوئی تاریخیں کس سنہ تک کی ملتی ہیں۔ آزاد مرحوم کو تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ تھی۔ بہ کثرت مادہ ہائے تاریخ ان سے یادگار ہیں۔

بلگرام کی سرزمین جیسا کہ عرض ہوا بڑی عالم خیز تھی۔ یہاں کے صدہا بزرگ بلا مبالغہ مثلاً علامہ مرتضیٰ بلگرامی، سید عبد الجلیل بلگرامی وغیرہ متقدمین ہیں۔ اور عماد الملک سید حسین بلگرامی وغیرہ متاخرین میں اس کے مستحق تھے کہ ان کے ذکر جمیل سے اس تحریک کی زینت بڑھائی جاتی مگر افسوس ہے کہ مضمون کو طول عمل سے بچانے کی خواہش سد راہ ہے۔

اب ہم خیرآباد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اودھ کا یہ تاریخی قصبہ بھی علماء، فضلاء و شعراء کا بڑا مخزن رہا ہے۔

حواشی

(۱) اس کی پہلی اشاعت ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی سے ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی۔ اور دوسری اشاعت پیش نظر ہے۔ (۲) اعلام و افکار، سبط محمد نقوی ص ۱۳ بحوالہ مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۰۵ (۳) ایضاً (۴) مطلع انوار، سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ص ۲۱۔۳۲ بحوالہ شیعیت کی تاریخ، محمد باقر شمس ص ۱۲ (۵) ایضاً۔ (۶) سوانح حیات حضرت غفرانمآب سید آغا مہدی لکھنوی ص ۱۳ (۷) دیار پورب میں علم اور علما، قاضی اطہر مبارکپوری ص ۱۱۱ بحوالہ مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴ (۸) سوانح حیات حضرت غفرانمآب۔ سید آغا مہدی لکھنوی ص ۱۵ (۹) امجد علی شاہ، سبط محمد نقوی ص ۲۴۲ (۱۰) ایضاً ص ۲۰۔۱۱۹ (۱۱) مطلع انوار صفحہ ۳۸۳ (۱۲) دو ماہی العلم بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۹۳ء مضمون ڈاکٹر محمد تقی علی ص ۹۶ (۱۳) ایضاً (۱۴) تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام ص ۹۹۔

□□

نذر الحفیظ ندوی، ازہری

ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر

ندوۃ العلماء کی بنیاد جس زمانے میں رکھی گئی وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف و ناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس عقلی و فکری کشمکش کے نتیجے میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کی نمائندہ تھیں۔ متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

قدیم عربی مدارس

اس عہد پر نظر ڈالئے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنے تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے۔ کتاب و سنت استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم پر اصرار ان کا شعار تھا اور نو وارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی سماج کے تصادم سے پیدا ہونیوالے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی۔ ان کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے۔ شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ مفید ہے اور صرف اس طریقہ سے ایمان کی حفاظت ممکن ہے۔

اس طرز فکر کا اظہار نصاب تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درس نظامی جس کے نظام میں اس سے پہلے برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

اس زمانہ میں (قیام ندوۃ العلماء کے وقت) نصاب تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں رائج تھا اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ معقولات پر بلا ضرورت صرف ہو رہا تھا، اور دینیات اور علم نافع کی طرف توجہ کتنی کم تھی مثلاً شرح ملا جامی جو چار سو صفحوں کی کتاب ہے۔ اس کی مدت سات ماہ تھی، لیکن صحیح بخاری کیلئے ۱۱۰۰ صفحے کی کتاب ہے ۳/۴ ۶ مہینے کی رکھی گئی۔ ؎

مولانا رشید احمد گنگوہی رح۔ فلسفہ کی کتابوں کا پڑھانا دین اور وقت دونوں کا ضیاع سمجھتے تھے ؎ لیکن ہندوستان کی عام تدریسی فضا کے اثر سے نیز دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش اور دباؤ سے مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد تدریجی طور پر فلسفہ و منطق کی ساری کتابیں داخل کرلی گئیں، اور اس کے ساتھ مدت تعلیم میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

تاہم اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا، و استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد دینی علوم اہل دین کی وقعت، اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلا شبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔ اگرچہ زمانہ کی تغیر پذیری نئے نئے خطرات اور مسائل میں روز افزوں ترقی الحاد و بے دینی کی اشاعت نیز مغربیت و اشتراکیت کی ہر دلعزیزی و مقبولیت کی بنا پر مادیت کی طوفانی لہر عام مسلمانوں کے سروں سے گزر کر اب ان قلعوں کی دیواروں سے بھی ٹکرانے لگی ہے جنکو ابتک محفوظ اور اس نئے طوفان کی دسترس سے دور سمجھا جاتا رہا ہے۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق، خیالات و افکار میں مغرب کی تقلید کرو، اور اس کے سانچے میں اپنے کو ڈھال دو لیکن کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا؟

سید امیر علی اور مولوی چراغ علی

سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) اور مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء) نے سرسید سے کچھ آگے بڑھ کر اسلام کی مدافعت کی اور مغربی مفکرین و مصنفین کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، بالخصوص سید

امیر علی کی کتاب (SPRIT OF ISLAM) نے مغرب کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا، اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقہ پر خاصا اثر ڈالا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں کا طرز فکر اور اسلوب بیان معذرت خواہانہ APOLOGETIC اور مدافعانہ تھا وہ کہتے تھے کہ اسلام مغربی علوم کا کسی صورت میں مخالف نہیں ہے۔ ان کتابوں کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھکر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی حد تک اسلام کی فضیلت و برتری کا اچھا اثر دیا ہے، لیکن مغربی فلسفہ مغربی علم اجتماع اور مغربی علم تمدن نے لوگوں کے ذہن و دماغ پر جو نقش قائم کر رکھا تھا، اس کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیا تاثر اور نیا نقش دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور مغربی طرز فکر کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم رہیں۔

روحانی مراکز اور خانقاہیں: ان مکاتب خیال کے پہلو بہ پہلو ایک قوت اور بھی تھی جس کے اثر سے اسلامی ہند کا کوئی حصہ آزاد نہیں تھا۔ یہ روحانی خانقاہیں اور سلسلے تھے، جن کے احسان بارگراں سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ یہ مراکز ایمان و یقین، اخلاقی اور روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا وہ سرچشمہ تھے جہاں بس اہل ایمان اور اہل طلب سیراب ہوتے تھے، اور اپنی روحانی تشنگی بجھاتے تھے جو چند نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں ان میں خواجہ محمد سلمان تونسوی (م ۱۸۴۱ء) اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (م ۱۸۹۵ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کے نام سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے حلقے ہندستان کے مضطرب تغیر پذیر ماحول میں رشد و ہدایت کے وہ جزیرے تھے جہاں آکر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے دل کا مرہم اور قلب کا سکون پایا۔

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعد وجود میں آئی گویا ندوۃ العلماء کی تاسیس اس وقت ہوئی جب قدیم و جدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کے برسوں بیت چکے تھے، دیوبند کے قیام کو ۲۶ سال ہو چکے تھے، اور علی گڑھ کا ایم اے او کالج اپنی عمر کا اٹھارواں سال پورا کر رہا تھا۔ علی گڑھ اور دیوبند کی تعلیمی و اصلاحی تحریکوں کے عین عہد شباب میں ندوۃ العلماء کا قیام جن اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آیا وہ حسب ذیل تھے، اس تحریک کے پیش نظر ابتدا میں دو مقاصد تھے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) رفع نزاع باہمی۔ یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔ تحریک ندوۃ العلماء بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور ان کے عالی ہمت رفقاء کی قیادت میں جوں جوں آگے بڑھتی رہی اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا۔ اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں

۳۔ اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد ماجد سید عبدالحی حسنی جو تحریک ندوۃ العلماء کے سرگرم مخلص، داعی و ناظم بھی تھے کی سیرت حیات عبدالحی میں تحریک کی فکری اساس اور اس کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

۱۔ اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے خلاف) خالص دینی تھی۔ یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزلی کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اس کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا

(۲) اس تحریک میں طبقہ علماء میں امور شریعت اسلامی کا حامل و امین، کتاب و سنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے۔ مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اس کی قیادت

کی تعمیر و تخریب یا ترقی و تنزلی، اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دیکر اپنی دعوت اور جد وجہد کا محور بنایا گیا ہے۔ کہ اس میں اصلاح حال کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علما اسکے داعی و علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی کی قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو اس کیلئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

۳۔ اس تحریک کا مزاج (سیاسی و ہنگامی کے بجائے) علمی و فکری تھا۔

۴۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقی کے کام سے ہوا تھا۔

۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر علماء جمع تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد مدرس دوئم دیوبند مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نذر محمد پنجابی، (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور) مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، شیخ الہند مولانا محمود حسن (مدرس اول دارالعلوم دیوبند) مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبدالغنی خاں، مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی، مولانا سید شاہ تجمل حسین دسنوی ۔ اس منتخب جلسہ میں باہمی مشورے سے ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مجلس کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی کہ آئندہ سال ندوۃ العلماء کے نام سے ایک جلسہ کیا جائے۔ مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس مجلس کا پہلا ناظم اور سکریٹری مقرر کیا گیا۔

مولانا سید محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے تعارف کرانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں اپنے آدمی بھیجے جنہوں نے علماء اور جدید حلقہ سے رابطہ قائم کرکے انہیں ندوۃ العلماء کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ندوۃ العلماء کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷، شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴، اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا، پھر تو ملک کے مختلف مقامات پر اجلاس ہونے لگے مسلمانوں کے ہر طبقہ نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی حوصلہ افزائی کی، اور اس کو وقت کا اہم تقاضہ قرار دیا۔

دارالعلوم کے قیام کا پہلا خاکہ

۱۲ محرم ۱۳۱۱ھ کو شہر بریلی کے جلسے میں مولانا سید محمد علی مونگیری نے سب سے پہلے دارالعلوم کے قیام کا خاکہ پیش کیا جسے استصواب رائے کیلئے ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں کے پاس بھیجا گیا۔ دوسرے سال کے جلسہ میں عام بحث و مباحثہ کے بعد یہ مسودہ منظور کر لیا گیا۔

علماء حضرات نے نہ صرف اس مسودہ کی بھرپور تائید و حمایت کی بلکہ ندوۃ العلماء کے تحت ایک دارالعلوم کے قیام کو ہندوستان میں نیز پورے عالم اسلام کے لئے ایک انقلاب انگیز قدم قرار دیا۔ دارالعلوم کے لئے مطلوب درسگاہ کی عمارت کے علاوہ دارالاقاموں، کتب خانہ، شفاخانہ، اساتذہ کے لئے رہائشی عمارتیں، لکچر ہال، طلبہ کی یونین اور مسجد کیلئے عمارتوں کی تفصیل دی ہے۔ دفعہ ۴ کے تحت اس دارالعلوم کے طلبہ کے لئے نظام تربیت کی تفصیل بارہ دفعات میں ہے پھر شرائط، اقدار و اصول و ضوابط ہیں اس کے بعد نظام تعلیم و تدریس اور نصاب کا ذکر ہے اور یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً عالم اسلام کے تعلیمی مراکز سے نصاب کی تفصیلات منگوائی جائیں گی، اور اگر کوئی کتاب مطلوبہ معیار کے مطابق دستیاب نہ ہوئی تو اس کو ترتیب دیا جائے گا

دارالعلوم کے طلبہ کی انجمنوں کا خاصا تفصیل سے تذکرہ ہے جس میں دارالمطالعہ، دارالکتب تحریری و تقریری ملکہ پیدا کرنے کے لئے مختلف ثقافتی و فکری شعبوں کی تفصیل ہے۔

اس مسودہ دارالعلوم میں سالانہ و ششماہی امتحانات کا بھی تذکرہ ہے۔ اس مجوزہ دارالعلوم کے قیام کے لئے متفقہ طور پر لکھنؤ کا انتخاب ہوا۔ جو ہر طرح اس علمی، ادبی تہذیبی مرکز کے شایان شان تھا۔

کانپور سے علماء کا ایک وفد مولانا سید محمد علی مونگیری کی قیادت میں ۱۶ر شوال ۱۳۱۰ھ مطابق بروز پنجشنبہ ۱۰ر مارچ ۱۸۹۰ء لکھنؤ روانہ ہوا، اس وفد میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حاجی محمد یونس خاں صاحب، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا حفیظ اللہ وغیرہ تھے منشی احترام علی کاکوروی اور منشی احتشام علی کاکوروی نے کشادہ دلی سے دریائے گومتی کے کنارے اپنی ایک وسیع قطعۂ اراضی ندوۃ العلماء کے حوالہ کی۔ یہ جگہ اس وقت بروہ حسن باڑی کے نام سے مشہور تھی، ابتداء میں گولہ گنج کی ایک عمارت کو خرید کر عارضی طور پر دارالعلوم قائم کر دیا گیا، پھر رفتہ رفتہ دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔ اب اس وقت مرکزی عمارت درسگاہ کے لئے۔ ایک عمارت تین منزل کتب خانہ کے لئے، ایک حسین و جمیل مسجد، ایک مہمان خانہ، ایک شفاخانہ ایک دارالقضا، ایک وسیع عمارت، معہد تحفیظ القرآن کے نام سے، ایک معہد ثانویہ مع دارالاقامہ، سلیمانیہ ہوسٹل، اطہر ہوسٹل، رحمانیہ ہوسٹل اور شبلی ہوسٹل نیز اساتذہ اور اسٹاف کے لئے رہائشی عمارتیں دارالعلوم کے کیمپس کے مختلف حصوں میں موجود ہیں شعبۂ تعمیر و ترقی، اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی بھی عمارتیں اس کیمپس میں موجود ہیں ۲ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو کانپور سے ندوہ کا دفتر منتقل ہو کر لکھنؤ گولہ گنج آ گیا۔ ۲۶ر ستمبر کو دارالعلوم کا عملی افتتاح اس خاتون منزل میں ہو گیا جو دارالعلوم کے لئے خریدی گئی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس عزم و ارادے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس نے جاری رکھا ملک کے طول و عرض میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے منعقد کئے جاتے تھے کانپور، لکھنؤ، ناگپور، امرتسر، بریلی، بلگام، کلکتہ، مدراس، میرٹھ، شاہجہاں پور، پٹنہ بنارس، پونہ، انبالہ جیسے مقامات پر ندوۃ العلماء کے تقریباً بائیس ۲۲ سالانہ جلسے منعقد کئے گئے، دوسری طرف تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی ندوۃ العلماء نے اپنا سفر جاری رکھا، اور اس نے اپنے نصب العین سے کسی دور میں بھی انحراف نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو ایسی مخلص اور باکمال شخصیتیں عطا فرمائیں جنہوں نے اس کے پیغام کو مشرق و مغرب کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے روشن ضمیر، عالم ربانی، مولانا سید عبدالحئی حسنی جیسے بلند پایہ محقق و مصنف دیدہ ور، مبصر ندوہ کے مقاصد اور پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے سراپا اخلاص، جد و جہد و قربانی ایثار کی تابندہ مثال تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علامہ شبلی جیسے ممتاز عالم و ادیب اور سید سلیمان ندوی جیسے بلند پایہ علمی رہنما، غلام محمد شملوی، مولوی عبدالغفور جیسے مخلص اور خاموش و انتھک کارکن ندوۃ العلماء کو نصیب ہوئے، مولانا سید عبدالحئی حسنی کے علاوہ نواب علی حسن خاں، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جیسے حضرات نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ اور بڑے نازک اور سنگین حالات میں اس سفینہ کو طوفان سے بچا کر لانے میں کامیاب ہوئے، اللہ تعالیٰ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ ندوۃ العلماء کے لئے ان کی نظامت کا دور سب سے درخشاں، تابناک اور فعال دور ہے۔

ندوۃ العلماء کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا پہلا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں میں جو چپقلش اور چشمک تھی، اس میں بہت کمی ہو گئی، قدیم و جدید گروہوں کے درمیان جو خلیج تھی وہ دور ہو گئی، علامہ عبدالحئی حسنی مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کی جدید و قدیم دونوں حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور ان حضرات پر ہر طبقہ نے اعتماد کیا بلکہ اب تو ندویوں کو اعتدال و توازن اور جدید و قدیم کا جامع تصور کیا جاتا ہے۔ اور دونوں حلقوں کا اعتماد ان کو حاصل ہے۔ ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، اور اس ادارے کے ذریعہ مسلمانوں کی فکری، علمی، رہنمائی، اور ان کی ذہنی و دینی تربیت کا کام کیا۔

سیرت نبویؐ سیرت عائشہؓ، امام مالک، عربوں کی جہاز رانی

عمر خیام، نقوشِ سلیمانی، عرب و ہند کے تعلقات، خطباتِ مدراس، رحمتِ عالم، ارض القرآن، المامون، الغزالی، شعر العجم، شعر الہند، حکمائے اسلام، سیرۃ النعمان، الفاروق، علم کلام، سیرۃ الصحابہ والصحابیات کے موضوع پر گیارہ جلدوں میں ان حضرات کے سیرت کے کارنامے تابعین و تبع تابعین و اہل کتاب اور صحابہ کی سیرت کے علاوہ خلفاء راشدین، خلفاء بنوامیہ، خلفاء بنی عباس کی تاریخ چار جلدوں میں، دولت عثمانیہ کی تاریخ دو جلدوں میں، اور حکومت صقلیہ کی تاریخ دو حصوں میں مرتب کرکے دار المصنفین نے اسلامی کتب خانے میں گراں قدر اضافے کئے۔

آخری نصف صدی کا یہ دور بلا شبہ اسلامی دعوت و عزیمت اور فکر کے میدان میں ندوہ کا تجدیدی دور ہے جیسا کہ اس کے فرزندوں کی تصنیفی اور دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کے طلائی سلسلہ نے اسلامی کتب خانے میں ایک نئے موضوع کا نہ صرف اضافہ بلکہ مسلمانوں کا اعتماد اسلامی تاریخ پر از سر نو بحال کیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ایک ایسا سدا بہار درخت ہے جو ہر زمانہ میں برگ و بار لاتا رہا ہے اور لاتا رہے گا۔

مسلم ممالک میں اسلامیات و مغربیت کی کش مکش، اور ارکان اربعہ، نبی رحمت، المرتضیٰ تذکرہ و سوانح کی کتابوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اندر اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور ہر زمانہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت پر یقین پیدا کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

یہاں پر ۱۹۵۰ء کے بعد سے اب تک کی ندوی تصنیفات کا تعارف اور جائزہ مقصود نہیں صرف اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالنے سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں نئے اسلوب اور عصری زبان میں لکھنے کے علاوہ ندوۃ العلماء نے اردو عربی، صحافت کے میدان میں بھی انقلابی انداز میں قدم ایسے وقت ۱۹۵۵ء میں رکھا، اور صحافت و اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی، جبکہ عالم عربی میں زبردست خلا تھا۔ ماہنامہ "البعث الاسلامی" مولانا سید محمد الحسنی نے ۱۹۵۵ء میں جاری کیا، جس نے اپنے طاقتور اداریوں اور بے لاگ تبصروں کی بدولت عالم عربی کے سب سے بڑے فتنے عرب قومیت کو رسوا کر دیا۔ عربوں کے دماغ سے اس فتنے کے مسموم اثرات کو زائل کرنے اور اسلام پر ان کا از سر نو اعتماد بحال کرنے میں "البعث الاسلامی" کے ساتھ پندرہ روزہ الرائد نے بنیادی کردار ادا کیا پہلے دور میں الندوہ، الضیا، اور اس دور میں تعمیر حیات نے یہ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء نے جو شاندار تعلیمی جشن منعقد کیا وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام کا ممتاز و منفرد اور تاریخی جشن کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جشن میں عالم عربی و اسلامی کے تقریباً تمام ہی ملکوں سے وفود شریک ہوئے تھے یہ جشن ایک طرح سے عالم اسلام کی طرف سے ندوہ کی فکری قیادت پر اتحاد کا اظہار تھا۔

□□

حواشی:

۱؎ روئیداد ندوۃ العلماء سال اول

۲؎ سوانح قاسمی ص ۳۹۲

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

—— جوش ملیح آبادی

(اردو میں قومی شاعری کے سو سال)

شہاب سرمدی
۹۴۴، دودپور، سول لائنس
علی گڑھ

جائسی و نظامی کی اودھی و پارسی

اِس کا ایک رُخ "بزم و رزم" کے عنوان سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اودھ میں مثنوی ہو یا مرثیہ، بزم و رزم کا التزام دونوں میں بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اس لیے براہ راست جائسی کی مثنوی "پدماوت" کی طرف آئیے اور اس کے بزم و رزم پر قدرے تفصیل سے نظر ڈالیے۔

بزم و رزم

شدید جذبہ چاہے وہ غم کا ہو یا خوشی کا جیسے انسانی رُوح کی گہرائیوں میں تیر جاتا ہے ویسے ہی انسانی تہذیب پر شدید تر اثر انداز ہوتا ہے۔ جائسی نے انسان و کائنات، خالق و مخلوق، جلال و جمال رشد و ہدایت، حسن و عشق اور اسی طرح حرص و ہوس، ظلم و ستم اور غصّہ و نفرت کے متعلق جو کچھ جس طرح کہا ہے اسے پوری کتاب پدماوت پر پھیلا کر دیکھیے تو بزم کے ایک عظیم شاعر کا تعارف حاصل ہوگا اور اعلان جنگ سے لے کر میدان جنگ تک جس طرح ہر حرکت ہر آواز کے ہیجان اور تناؤ کو انھوں نے الفاظ و اوزان کا جامہ پہنایا ہے جس طرح بوٹی بوٹی تھرکتے ہوئے گھوڑے، ٹھوکر پر ٹھوکر دیتے ہوئے ہاتھی سمتیں سیدھی کرتی ہوئی توپیں، تلواریں سُونتے اور نیزے تانے سپاہی بڑھے اور لڑے ہیں اور جس طرح جائسی نے ہر شور، ہر دھماکے، ہر چیخ، ہر للکار کو پدماوت کے ہر پاٹھک کے کانوں تک پہونچایا ہے اسے حساب میں لیجیے؛ یا پھر جنگ اور میدانِ جنگ سے الگ بھی اگر کسی بہادر کا ذکر آگیا، یا میدانِ جنگ میں بھی حسن و جمال کا تصوّر در آیا ہے، یا عورت کی جنسی خواہش نے ترغیبِ حریفانہ سے کام لینا چاہا ہے تو اندازِ بیان نے معاً تیور بدل لیے ہیں، لہجہ کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، سکون کی جگہ سنسنی اور ٹھہراؤ کی جگہ تناؤ نے لے لی ہے یا پھر جس طرح "دھائیں دھائیں اور سائیں سائیں" کی دھواں دھاری میں میٹھے سُر اور مدّھم لے کی مٹھاس بھی جس طرح پیوست ہوتی ملتی ہے، اس کا لحاظ کیجیے تو ایک آفاقی قدر و قامت کا رزم نگار سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

جائسی، جیسا ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، نظامی سے بغایت متاثر تھے چنانچہ انھوں نے نظامی کا انداز خوب خوب برتا ہے لیکن جیسا کہ ہر صاحب طرز شاعر کا شعار ہوتا ہے "میدانِ جنگ کی گرد" میں توپ اور تفنگ" کا دھواں بھی ملا دیا ہے۔ نظامی نے اپنے "سکندر نامہ" میں دارا و سکندر کے لشکر کا پہلا ٹکراؤ یوں نظم کیا ہے ؎

زبس گرد، بر تارک ترک و زیں   زمیں آسماں، آسماں شد زمیں
ز بس رفت در رفت راہ نبرد   نم خوں بہ ماہی و بر ماہ گرد
ز سُمِ ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

ان ابیات کی تاب لانا کھیل نہیں تھا، مگر مرحبا ہے جائسی کو اور حبّذا ان کی اودھی کو کہ نہ پیوند کا پتہ چلتا ہے نہ جوڑ کا۔ ایسی حالت میں نظامی اور جائسی کا تقابل دلچسپ سے زیادہ مفید ہوگا۔ لیکن تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اس لیے بات بزم و رزم تک محدود رہے تو مناسب ہوگا، خاص کر اس لیے کہ بقول میر انیس ؎

اوّل طرفِ رزم بھی چھوڑ کے جب بزم
دکھلائے زباں سب کو یہیں معرکۂ رزم

یہ رزم و بزم کو یکساں اہمیت دینے والا جذبہ انیسویں صدی کے اودھ

کے لئے بڑا چوکھا رنگ رکھا تھا چنانچہ رزم و بزم کے رنگ ڈھنگ کو الگ اور ایک ساتھ برتنے کی تکنیک کے بارے میں جائسی خود بھی جا بجا اشارے کرتے ہیں۔ جیسے "توپ اور حسین عورت" کے تلازمہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

بیر سنگار دُاؤ اک ٹھاؤں (۵۰۷/ب)

बीर सिंगार दुअउ एक ठाऊं

کہیں دوسروں کے منھ میں بات ڈال کر (جیسے رتن سین کی زبانی)

بیر سنگار جیتے میں دوؤ (۳۲۴/ب)

बीर सिंगार जिते मैं दोऊ।

نظامی بھی اسی طرح سکندر سے کہلاتے ہیں ؎

بہ ہر تو ام پیشتر گشت عزم
کہ دریائی بزمی و زیبائی رزم

خاتمۂ کتاب میں نظامی مدحِ سکندر اس طرح کرتے ہیں:

بہ بزم آفتابیست افروختہ
بہ رزم اژدہائے جہاں سوختہ

دو بالکل متضاد کیفیات کو ایک ساتھ ہی نہیں ایک ہی بات کی طرح بیان کرنا آسان نہیں پھر بھی جائسی نے "آورد" اور "آمد" کے بین بین جو طریق کار برتا ہے وہ ادبی جمالیات کو فردوسی و نظامی کی مثنوی نگاری سے ہم پلہ کر دیتا ہے۔ مثلاً وہ ایک نئی بیاہی دلہن کا چتر کھینچتے ہوئے ویر اور سنگار رس کا دو آتشہ تیار کرتے ہیں۔ صرف ایک بیت پر غور کیجیے:

اَلَکْ پھانس گِیَہ میل اَسُوجھا
اَدھر اَدھر سَوں چاہے جُوجھا (۶۱۹/ب)

अलक-फाँस गिय मेल असूझा
अधर अधर सौं चौह जूझा।

یعنی "کمندِ زلف کا پھندا دکھائی نہیں دیتا۔ تمہارے گلے میں بھی پھندا ڈال کر ہونٹ سے ہونٹ بر سرِ پیکار ہو جانا چاہتے ہیں۔"

اب نظامی کو ملاحظہ فرمایئے۔ سکندر اپنی از حد حسین و جمیل اور زیرک چینی کنیزک سے التفات کی مہلت نہیں پاتا۔ چینی کنیزک پہلے تو چپ ہی پھر یک دن بپھر کر کہنے لگی ؎

اگرچہ کمندِ جہانگیر شاہ   فتادست در گردنِ مہر و ماہ
کمندِ من از زلف بر سازمش
نہ ترسم بگردن در اندازمش

"یہ سچ ہے کہ شاہ جہانگیر نے حوصلہ و مردانگی کی کمند سورج اور چاند کی گردن میں بھی ڈال دی ہے مگر میں نے اس کے لئے وہ کمندِ زلف تیار کی ہے جسے اسی کی گردن میں ڈالتے مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔"

قادر الکلامی کے ان مظاہروں سے قطع نظر "پدماوتِ جائسی" اور "سکندر نامۂ نظامی" میں باہم دگر ہندی اور ایرانی کا وہ سانجھ ملتا ہے جس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول نہ کرانا ہماری طرف سے کوتاہی ہوگی۔ مثلاً:

لغات و اصطلاحات

ہند و ایران میں تہذیبی لین دین کا بیوپار اتنا پرانا رہا ہے کہ ان کی زبانوں میں لغات کا مشترک ہونا معاملۂ معمولہ سمجھا جا سکتا ہے چنانچہ فردوسی و فرخی نے بہت سے ہندستانی الفاظ استعمال کیے ہیں اسی طرح فارسی الفاظ کی ایک خاصی تعداد دسویں صدی سے پہلے بھی ہندستانی ہو گئی تھی۔ اسی لیے نظامی جیسا مشکل پسند شاعر بھی سنسکرت زبان کا ایک سموچا لفظ اس بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے جیسے وہ عام ایرانی بول چال کا ہو کہتا ہے ؎

ندارد کسے سوگ در جبہ گاہ
نہ کس جز قراگند پوشد سیاہ

جائسی نے بھی فارسی کے ہزاروں الفاظ استعمال کئے ہیں مگر ان میں بہتیرے ایسے ہیں جو خاص نظامی کے انداز سے اپنائے گئے ہیں مثلاً "دیو بمعنی شیطان، ساز بمعنی جنگی ساز و سامان، چکاوک، چکئی چکوا" بمعنی سرخاب، ہرے بمعنی ہرات، بے سراک (بے سرا) بمعنی خچر، بار بمعنی دروازہ اور دربار، بحری (بہری) بمعنی بال، اور ان کے علاوہ خنگ، بور، دُرکیبی، سمند گھوڑوں کے لیے۔ اسی طرح موسیقی، اسپ شطرنج اور چوگان کے تلازمے اور اس سے بھی آگے بڑھا جائے تو فلسفۂ وجود اپنی ساری متانت و دیانت کے ساتھ جائسی اور نظامی کے یہاں یکساں ملتے ہیں۔

صرف دو ایک مقامات مدِ نظر ہوں: ———

فلسفۂ تخلیق

ہتُ پہلیٔں اور اَبْ ہے سوئی پُنِ سو رَہِی رہی نہیں کوئی

اُوئیں سَبْ کینہہ جہاں لگ کوئی

وہ نہ کینہہ کاہو کر ہوئی

جائسی

हत पहिलेइं और अब है सोई।

पुनि सो रहहि, रहहि नाहिं कोई।।

ओइं सब कीन्ह 'जहाँ लगि कोई।

वह न कन्हि काहू कर होई।।

توای کآسماں را برافراختی زمیں را گزرگاہ او ساختی

نہ بود آفرینش تو بودے خدائے

نہ باشد ہمہ ہسم تو باشی زجائے

نظامی

فلسفۂ وجود

آدِ سُوئِن بَرنَو بَڑ راجا

جائسی

आदि सोइं वरनौं बड़ राजा।

خدایا جہاں پادشاہی تراست

نظامی

عقیدہ اور تخیل میں جو متوازیت نظامی اور جائسی کے یہاں پائی جاتی ہے اس سے قطع نظر متفرق مضامین سے دونوں کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اس سلسلے میں نام اور ہیئت کی بحث نہ چھیڑی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ دونوں کا وہ طریقۂ کار جو بحیثیت مثنوی نگار سامنے آیا ہے وہ گفتنی ہے. مثلاً: ذکرِ نامۂ دیگراں یعنی دوسرے گرنتھوں کا ذکر، یہ جائسی سے پہلے اودھی میں اور نظامی سے پہلے فارسی میں نہ ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح "نشاط بھوگ" کی مثال ہے "شب وصال" کی منظر کشی و محاکات نگاری بھی انہی دونوں شعراء کی خصوصیت سمجھی جاسکتی ہے۔ "نکھ سکھ ورڈن"، "کھٹرت ورڈن" اور بارہ ماسہ کی ٹھیٹھ روایات جائسی لوک ساہتیہ اور دیسی ادب سے لیں. نظامی کے یہاں ان کو ڈھونڈھنا عبث تھا لیکن بڑا دل چسپ اتفاق ہے کہ یہاں بھی نظامی جائسی کا ساتھ نہیں چھوڑتے. چنانچہ نکھ سکھ ورڈن کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ع

پس از ناخن پائے تا فرق سر

یہ نکھ سکھ (ناخن اور بال) کی لفظی تشریح ہے نظامی اور جائسی دونوں نے سنسکرت کے زیر اثر اس تصور کو اپنایا ہے حالاں کہ ہر حصۂ جسم کا بیان دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا. اس طرح جائسی کے کئی سراپے ایسے ہیں جن میں نظامی کی سراپا نگاری کا انداز پایا جاتا ہے. البتہ فوج کی فراہمی، فوج کا کوچ، فوجی ہاتھی جنگی لباس اور گھمسان کی لڑائی، یہ اور اس طرح کے دوسرے عنوانات اور بھی ہیں جن کو نظامی اور جائسی نے اس یگانگت سے برتا ہے کہ اس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی. مثلاً:

فوج کی فراہمی

فرستاد تا لشکر از ہر دیار روانہ شود بر در شہریار

قدرخاں ز چیں، گورخاں از ختن رئیس از مداین ولید از یمن

نظامی

لکھے پتر چارہوں دِس دھائے جاوَت اُمرا بیگ بلائے

رہا نہ رُوم سام، سُلطانو کاسمیر ٹھٹھا، مُلتانو

جائسی (ب ۴۹۵/۳۱۱)

लिखे पत्र चारिहँ दिसि धाये।

जावत उमरा, बेग बुलाये।।

रहा न रूम 'साम सुल्तानू।

कास्मीर, ठट्ठा मुल्तानू।।

فوج کا کوچ

بہ غرید کوس از در شہریار

جہاں شد ز بانگ جرس بے قرار

نظامی

ساہ بجاء چڑھا جگ جانا

بیس کوس بجا پہل پیانا

جائسی (ب ۴۵۵/...)

साह बजाइ चढ़ा जग जाना।

बसि–कोस मा पहल पयाना।।

فوجی ہاتھی

ز پیلاں دو صد پیل پولاد پوش کہ آرند خون زمیں را بجوش

زمیں پیل کا آمد بہ جاتش بروں

شد از پائے پیلاں زمیں نیلگوں — نظامی

لوہے سار ہست پہرائے — میگھ گھٹا جس گرجت آئے
سوا لاکھ ہستی جب چلا — پربت سرس چلت جگ ہلا
جائسی

लोहे सारि हस्ति पहिराये।
मेघ-घटा जस गरजत आये।।
सवा-लाख हस्ती जब चला।
परबत सरिस चलत जग हला।।

جنگی لباس

بہ آہن شداں غرق جملہ سپاہ — نہادہ بہ سر خود آہن کلاہ
قبائے زرہ بر تنش تابدار — چو سیماب روشن چو سیما بدار
نظامی

اب جائسی کی ابیات ملاحظہ ہوں ؎

جیبا کھول راگ سو مڑھے — لیجم گھال ارا کنہ چڑھے
چمکے پکھریں سار سنواری — درپن چاہ ادھک اجیاری
(ب ۳۹۹، ۵/۳)

जेबा खोल राग सों मढ़े।
लेजिम वालि इराकिन्ह चढ़े।।
चमके पखरैं सारि सँवारी।
दरपन चाहि आधक उजियारी।।

اس کے بعد دونوں لشکروں کا آمنے سامنے آجانا، للکار، ہنکار اور جنگ کی ابتدا، نظامی نے اس طرح تصویر کھینچی ہے ؎

دو ابر از دو سو در خروش آمدند — دو دریائے آتش بہ جوش آمدند
سپاہ از دو جانب صف آراستہ
زمیں آسماں وار برخاستہ

جائسی فرماتے ہیں ؎

داؤ سمند ددھ اودھ اپارا
دواؤ میرو کھکھند پہارا

दाउ समुदन्दधि दउधि अपारा।
दुअउ मेरु खिखिन्द पहारा।।

— دوھا —

دھرتی سرگ داؤ دھر — جوہیں اوپر جوہ
کوؤ ٹرے نہ ٹارے — دواؤ بجر سموہ
(ب ۵۱۲، ۵/ بیز ۸-۹)

धरती-सरग दाऊ धर — जूहहि ऊपर जूह।
कोऊ टरै न टारे — दुअउ बज्र-समूह

گھمسان کی لڑائی

بہ جنبش در آمد بہ دریائے خوں — شد از موج آتش زمیں لالہ گوں
برانگیخت رزمی چو بارندہ میغ
تگرگش ز پیکان و باراں ز تیغ
بہ شمشیر پولاد و تیر خدنگ — گزرگاہ بر مور کردند تنگ
بہ تیغ آتش برکشیدہ چو آب
کز و خیرہ شد چشمۂ آفتاب

جائسی بھی اسی "گھمسان" کو نظم کرتے ہیں اور نظامی کی نقل کیے بغیر اودھی کو "پارسی" کا ہم پلہ بنا کر اپنی اچھوتی انفرادیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

گرب گیندنہ گگن پسیجا
رہر جو چوائی دھرت سب بھیجا (ب ۵۱۷، ۶)

गरब गैंदन्ह गगन पसीजा।
रुहिर जो चुअइ धरति सब भीजा।।

سو سو من کے برسہیں گولا — برسہیں تپک تیر جس اولا
لوہیں سین سوجھ سب کاری — تل اک کتہوں نہ سوجھ اگھاری
باجہیں کھرگ اٹھے در آگی
بھوئیں جری چہے سرگ کنہ لاگی

सौ सौ मन के बरसंहि गोला।
बरसँहि तुपुक, तरि जस ओला।।
लौहैं सैन सूझ सब कारी।
तिल एक कतहँ न सूझ उधारी।।
बाजीहँ खरग उठै दर आगी।
मुइं जरि चहै सरग कँह लागी।।

اسی طرح جائسی اور نظامی، یعنی اودھی اور پارسی کی متوازیت کے اور بھی کئی پہلو ہیں، مگر طوالت کے پیش نظر اتنے ہی پر اکتفا کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(پروفیسر) گیان چند

داستانِ امیر حمزہ لکھنؤ میں

داستانِ امیر حمزہ کی عظمت اس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ذہن میں داستان کا جو تصور ہے وہ قصۂ حمزہ ہی پر قائم ہے۔ یہ کسی ایک کتاب کا نام نہیں، یہ صنفِ داستان کی ایک نوع بزرگ ہے جس کے زیرِ سایہ متعدد شاہکار وجود میں آئے۔ اردو داستان گوئی اور داستان نویسی کی معراج داستان امیر حمزہ ہی ہے اور یہ بہت کچھ اودھ کے داستان نگاروں کی دین ہے۔ یہ داستانِ اعظم سب سے پہلے کلکتے میں اور پھر رام پور میں پھولی پھلی لیکن اس کے باغبان اودھ ہی کے فن کار تھے۔ اس کی دو مشہور شکلیں ہیں۔ ۱۔ داستانِ امیر حمزہ ایک جلد جو فارسی رموزِ حمزہ پر مبنی ہے۔ ۲۔ داستان امیر حمزہ آٹھ دفتر اور ان کی لاتناہی توسیعات۔ دونوں اپنے نشو و نما کے لیے اہلِ اودھ کے ممنونِ احسان ہیں۔

اردو میں داستانِ امیر حمزہ کی شہرت خلیل علی خاں اشک کے یک جلدی ترجمے سے ہوئی۔ اشک کی پرورش فیض آباد میں ہوئی تھی جہاں سے یہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں داستانِ امیر حمزہ کا فارسی سے ترجمہ کیا۔ اسی سے مماثل ترجمہ نواب مرزا امان علی خاں بہادر غالب لکھنوی کا ہے۔ اس کا سنِ تالیف ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء ہے۔ یہ اسی سال میں مطبع حکیم محتشم الدیہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن نہایت نادر ہے لیکن یہ اصلاح شدہ شکل میں نولکشور پریس کے طفیل زندہ ہے۔ منشی نول کشور کے حکم سے مولوی سید محمد عبد اللہ بلگرامی نے غالب کے ترجمے پر نظرِ ثانی کی اور ۱۸۷۱ء میں شائع کیا۔ اصل میں انھوں نے کوئی خاص اصلاح و ترمیم نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نولکشور پریس نے سید عبد اللہ کا نام محض اس لیے ٹانک دیا کہ غالب کے ترجمے کو اپنا مال بنایا جا سکے۔

یہ جو مشہور ہے کہ نول کشوری ایڈیشن اشک کے نسخے پر مبنی ہے وہ صحیح نہیں۔ دراصل یہ غالب کے نسخے کا قالبِ نو ہے۔ ۱۸۸۰ء میں سیّد تصدق حسین مصحح نول کشور پریس نے اس نسخے کو مرقع اور مسجع کیا۔ بیسویں صدی میں عبد الباری آسی نے اس نسخے کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ آسی نے دو کام کیے: ۱۔ اشعار کو یک قلم خارج کر دیا، ۲۔ رنگین بیانی میں کہیں کہیں کچھ کمی کر دی۔ یہ ایڈیشن نول کشور پریس کے وارث تیج کمار بھارگو پریس نے شائع کیا۔

لیکن داستانِ امیر حمزہ کی دلداری اور دلربائی اس یک جلدی نسخے کے طفیل نہیں، یہ اس کے ہوشربائی دفتروں کی بدولت ہے۔ یہ دفتر پہلے رام پور میں اور پھر لکھنؤ میں لکھے گئے۔ رام پور کے دفتر غیر مطبوعہ رہے، رضا لائبریری میں دفن ہیں۔ عوام کی نظروں سے اوجھل ہیں یہ بھی زیادہ تر لکھنوی داستان گویوں کی تخلیق، لیکن اس داستان کو عوام کی ملک بنانے کا سہرا نول کشور پریس کو ہے۔ چونکہ تقدمِ زمانی رام پور کو حاصل ہے اس لیے وہاں کے لکھنوی فن کاروں کی نام شماری میں بخل نہ کروں گا۔

داستانِ امیر حمزہ کے سلسلے میں بڑا نام میر احمد علی کا ہے۔ یہ لکھنؤ کے مشہور داستان گو تھے جو رام پور چلے گئے۔ ان کی تصنیف سے سلسلۂ حمزہ کی دو کتابیں ملتی ہیں، ایک فارسی اور دوسری اردو۔ کہا جاتا ہے کہ طلسمِ ہوشربا میر احمد علی کی اختراع ہے لیکن ان کے قلم سے اس کا کوئی فارسی یا اردو نسخہ نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے انھوں نے اسے محض زبانی مجلس آرائی تک محدود رکھا ہو۔ لکھنؤ کے دوسرے بڑے داستان گو میر قاسم علی بھی رام پور میں ملازم تھے۔ انھوں نے اردو میں کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا۔ میر احمد علی کے شاگرد حکیم سید اصغر علی خاں نواب محمد سعید خاں (۱۸۴۰ء تا ۱۸۵۵ء) کے عہد میں لکھنؤ سے رام پور گئے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں حمزہ کے سلسلے کی کئی داستانیں لکھیں۔ کتنے عالم ہوں گے یہ داستان باف کہ فارسی میں بے تکلف لکھ سکتے تھے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے

اواسط میں کافی قارئین فارسی میں بھی داستان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ اصغر علی خاں کے بیٹے مشہور شاعر ضامن علی جلالؔ لکھنوی بھی رام پور میں بحیثیت داستان گو ملازم ہوئے جہاں انھوں نے والد کے ساتھ مل کر حمزہ کے دفتر بالا باختر کی کچھ جلدیں لکھیں۔

ایک پُرگو لکھنے والے منشی انبا پرشاد رسا لکھنوی تھے۔ یہ بھی نواب محمد سعید خاں کے عہد میں رام پور گئے، یہ بھی میر احمد علی کے شاگرد تھے؛ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلامی نام عبد الرحمٰن رکھا تھا۔ ان کے بیٹے غلام رضا ان سے بھی زیادہ کثیر التصانیف تھے۔ ایک اور داستان گو حیدر مرزا تصور لکھنوی داستان گوئی میں اصغر علی خاں کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۵ ضخیم جلدوں میں ایک داستان لکھی۔ دوسرے داستان گو حاجی علی ابن مرزا مکو بیگ لکھنوی اور ان کے بیٹے سید حسین زیدی تھے۔ ایک اور فن کار مرتضیٰ حسین دمال لکھنوی تھے۔ ان سب کی معرکہ آرا تصانیف کے مخطوطے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ ان کی اشاعت کی کوئی امید نہیں۔

داستان گوئی کا مرکز، داستانِ امیر حمزہ ہے اور داستانِ حمزہ کا وطنِ ثانی لکھنؤ ہے۔ رتن ناتھ سرشار اپنے سحر آفریں رنگ میں سماں باندھتے ہیں۔

"لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یارانِ صادق اور داستان موافق شب کے وقت کہ پردہ دارِ عاشقاں ہے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر ہاتھ تیز کر رہا ہے۔ جابجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب بہ لحنِ داؤدی فرما رہے ہیں "اور خوں خوار ظلماتی ......" ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرشِ بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

(تقریظ طلسمِ ہوشربا جلد ہفتم)

عشرت لکھنوی نے اپنے مضمون "لکھنؤ کی داستان گوئی" میں لکھا ہے، کہ لکھنؤ میں اول مرزا طور نے داستان گوئی میں اصلاح کی۔ ان کے بعد سب سے مشہور بڑے منشی میر فدا علی[1] تھے۔ مرزا طور اور میر فدا علی کی لکھی ہوئی کوئی داستان موجود نہیں جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ محض داستان گو تھے، داستان نگار نہیں۔ داستان نگاری کا شاہکار داستانِ حمزہ کا وہ لامتناہی طومار ہے جو نول کشور پریس میں معرضِ تحریر میں آیا۔ اس کی شروعات طلسمِ ہوشربا سے ہوئی اور بعد میں ماقبل اور مابعد کے دفتر لکھے گئے۔ اور ان کے بعد ان کی توسیعات جو اصل دفتروں سے بھی زیادہ فراواں تھیں۔ نول کشوری دفتروں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ نوشیرواں نامہ	۲ جلد	مولفۂ شیخ تصدق حسین	۱۸۹۳ء
ہرمز نامہ	۱ جلد	"	۱۹۰۰ء
ہرمان نامہ	۱ جلد	احمد حسین قمر	۱۹۰۱ء
۲۔ کوچک باختر	۱ جلد	تصدق حسین	بعد ۱۸۹۲ء
۳۔ بالا باختر	۱ جلد	"	"
۴۔ ایرج نامہ	۲ جلد	"	"
۵۔ طلسمِ ہوشربا	جلد اول	محمد حسین جاہ	۱۸۸۱ء
"	" دوم	"	۱۸۸۴ء
"	" سوم	"	۱۸۸۸-۸۹ء / ۱۳۰۶ھ
"	" چہارم	"	
"	جلد پنجم حصہ اول	احمد حسین قمر	۱۸۹۱ء
"	جلد پنجم حصہ دوم	"	
"	جلد ششم	"	۱۸۹۲ء
"	جلد ہفتم	"	۱۸۹۲ء یا اوائل ۱۸۹۳ء
۶۔ صندلی نامہ	۱ جلد	محمد اسمٰعیل اثر	۱۸۹۵ء
۷۔ تورج نامہ	جلد اول	پیارے مرزا باعانت تصدق حسین	
"	جلد دوم	تصدق حسین بہ تصحیحِ اسمٰعیل اثر	
۸۔ لعل نامہ	۲ جلد	تصدق حسین	۱۸۹۶ء
آفتابِ شجاعت	۵ جلد	مصنفۂ تصدق حسین	۱۹۰۳-۰۸ء
گلستانِ باختر	جلد اول و دوم	تصدق حسین بہ تصحیح اسمٰعیل اثر	۱۹۰۶ء
	جلد سوم	"	طبع ۱۹۱۷ء
		"	بعدِ وفاتِ مصنف

---

[1] عشرت، لکھنؤ کی داستان گوئی۔ نگار مئی ۱۹۳۵ء

طلسم فتنۂ نور افشاں	۳ جلد	احمد حسین قمر	۱۸۹۶ء
بقیہ طلسم ہوشربا	۲ جلد	"	۱۸۹۷ء
طلسم ہفت پیکر	۳ جلد	"	۱۸۹۸ء
طلسم خیال سکندری	۳ جلد	"	۱۹۰۰ء
طلسم نوخیز جمشیدی	۳ جلد	"	۱۹۰۱ء
طلسم زعفران زار سلیمانی	۲ جلد	احمد حسین قمر و تصدق حسین	
"	"	ترتیب: اسمٰعیل اثر	۱۹۰۵ء

طلسم ہوشربا جلد پنجم اور آفتاب شجاعت' جلد پنجم دو حصّوں یعنی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اس طرح کُل ۴۶ جلدیں ہیں۔ مندرجہ بالا داستان نگاروں میں منشی محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر ممتاز ہیں۔ ان دونوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

محمد حسین جاہ لکھنوی

یہ بڑے منشی میر فدا علی کے شاگرد تھے اور چھوٹے منشی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں 'طلسم فصاحت' تصنیف کی لیکن یہ داستانِ حمزہ سے متعلق نہیں۔ اس کی اشاعت بھی ہوئی۔ جاہ کی شہرت مطبع نول کشور کی ملازمت سے ہوئی۔ منشی نول کشور نے انھیں طلسم ہوشربا، لکھنے پر مامور کیا۔ چار جلدیں لکھی تھیں کہ بقول عشرت معاوضے پر جھگڑا ہو گیا اور یہ منشی گلاب سنگھ لاہوری کے مطبع میں چلے آئے جو اس وقت لکھنؤ میں تھا۔ گلاب سنگھ نے ھوشربا کا ایک مختصر ٹکڑا شائع کیا لیکن نول کشور نے منشی احمد حسین قمر سے لکھا کر ھوشربا کی جلد پنجم شائع کر دی جس کے آگے گلاب سنگھ کے مطبع کا چراغ نہ جل سکا۔

(لکھنؤ کی داستان گوئی۔ نگار مئی ۱۹۳۵ء)

داستانِ امیر حمزہ کے تمام راویوں میں جاہ کا ادبی مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ وہ رنگین بیانی پر بھی قادر ہیں اور روزمرہ لکھنے پر بھی۔ اردو انشا پردازوں کے کسی انتخاب میں جاہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مُشتے نمونہ از خروارے ۔ ملکہ بہار کا جادو ۔ یہ اسلام کی طرف دار ہو گئی ہے۔ افراسیاب کی طرف سے شدید جادوگر آتا ہے:۔

"شدید کا پکارنا سُنا فوراً تخت بڑھایا اور ایک گلدستہ اٹھا کر جنگل کی طرف مارا کہ پہاڑوں کی جانب سے ایک ظلمت مثلِ شب دیجوُر پیدا ہوئی اور تاریکی تمام عالم میں چھا گئی۔ اس وقت بہار نے نقاب کھول کر اپنی پیشانی پر افشاں اور چاند ٹیکی لگائی۔ اس وقت اس تاریکی میں ایک چاند اور ستارے چھٹکتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی رات ہے' دن نہ ظاہر ہوتا تھا۔ شدید دنگیں رد سحر پڑھ کر دینے لگا کہ بہار نے دوسرا گلدستہ مارا اور پکاری کہ اے بہار آؤ۔ جھونکے ہوائے سرد کے آنے لگے اور لشکرِ شدید کے ساحر تالیاں بجانے لگے کہ بہار نے تیسرا گلدستہ مارا۔ ہزارہا عورت نازنین مہ جبین ہاتھوں میں ساز اور باجے لیے پیدا ہوئیں ... انھوں نے ساز اپنے اپنے نہایت خوش آہنگی سے بجائے کہ لشکرِ حریف ان پر دل و جاں سے عاشق ہوا کہ بہار نے چوتھا گلدستہ مارا کہ آنکھیں اہلِ لشکر کی بند ہوئیں اور موسم بہار کا ظاہر ہوا۔ عجب لطف تھا کہ شبِ ماہ میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی اور باغ و چمنستاں دُور تک دکھائی دیتے تھے۔ نسیم مشک بار ہر مینائے شجر سے ٹکراتی تھی، غنچے چٹک کر جماہی لیتے تھے"

افسوس صفحات کا دامن تنگ ہے' میں دوسرے گوناگوں اسالیب کے نمونے نہیں دے سکتا۔

منشی احمد حسین قمر لکھنوی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قمر کے دو بھائی کام آئے۔ ذریعۂ معاش کے طور پر قمر نے وکالت کی سند حاصل کرنا چاہی لیکن اس میں ناکام رہنے پر داستان گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔ قمر بہت زود نویس تھے اور سحر اور رزم لکھنے پر خاص طور سے قادر تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے ھوشربا جلد پنجم کے دو حصّے نیز جلد ششم اور جلد ہفتم لکھیں۔ اس کے بعد ایک طرف تو انھوں نے بقیہ طلسم ہوشربا کی دو جلدیں تصنیف کیں جن میں ھوشربا سے قبل کا کچھ حصّہ ہے اور کچھ طلسم ھوشربا کی جلدوں سے متوازی چلتا ہے' دوسری طرف انھوں نے ہوشربا کا سلسلہ اپنے طور پر آگے بڑھایا۔ مروجہ دفاتر میں ھوشربا کے بعد صندل نامہ ہے لیکن قمر ہوشربا کی جلد ہفتم کے سلسلے میں بالترتیب طلسم فتنۂ نور افشاں، طلسم ہفت پیکر، طلسم خیال سکندری اور طلسم نوخیز جمشیدی کے بعد 'زعفران زار سلیمانی' لکھ رہے تھے کہ ۱۹۰۹ء میں اجل نے آ دبوچا۔ تصدق حسین نے اس دفتر کی تکمیل

کی۔ ۱۹۰۱ء میں قمر نے ہنومان نامہ بھی شائع کیا۔ یہ نوشیرواں نامہ کی جلد دوم سے متعلق ہے لیکن دراصل بیچ میں ایک حشو ہے۔ اس میں کچھ بیان ہرمز نامے سے بھی مشترک ہے۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے طلسم تاریخ بھی تصنیف کیا۔ یہ نوشیرواں نامہ کے ایک جزو سے مشترک ہے۔

نائب حسین نقوی کے مطابق قمر بھی اچھے ادیب ہیں گو جاہ کے گرتے کے ہیں۔ ان کی تحریر کے نمونے کے طور پر شہنشاہ طلسم ہوشربا افراسیاب جادو کے قتل کا منظر ملاحظہ ہو:

"لوح کا عکس پڑا۔ تیغۂ نورافشانی چمک کر گرا۔ سپرِ سحر کے پُرزے اڑ گئے۔ شبِ سپر کٹی۔ تیغۂ نورافشانی مثلِ ہلالِ شبِ اول چمکا۔ سپر کو کاٹ کر تیغ نے تاجِ فرقِ افراسیاب کو کاٹا۔ سرا سر دو سر دونیم ہوا جس میں نخوت کا مقام تھا، اپنے غرور سے ناکام تھا۔ تا جگرگاہ تیغۂ نورافشانی پہنچا۔ افراسیاب آہ کا نعرہ کر کے گرا۔ اس وقت کی کیا کیفیت تحریر کروں۔ ایک غبارِ سیاہ بلند ہوا۔ ہزارہا طائر گلستان سے اڑے۔ طاؤس پروں سے سر پیٹنے لگے۔ صدہا مکان گرے۔ دریا کھول کر خشک ہوئے۔ چشموں کا پانی اُبلا۔ منزلوں تک تاثیر قتلِ افراسیاب پہنچی۔ بعد عرصۂ دراز آئی

کُشتی مرا نام محو افراسیاب جادو شہنشاہِ طلسم ہوشربا بود۔ افسوس
مُردیم و جاں دادیم، بمطلب خود نرسیدیم"

شیخ تصدق حسین

عشرت نے لکھا ہے کہ شیخ تصدق حسین جاہل تھے اور کاتبوں سے لکھاتے تھے (نگار مئی ۱۹۳۵ء)۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بھی اس کی تائید کی۔ واضح ہو کہ نول کشور پریس سے متعلق شیخ تصدق حسین اور سید تصدق حسین دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ ہرمز نامے کی تمہید میں خود شیخ تصدق حسین نے مطبع نول کشور کے نامی حضرات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں منجملہ دوسرے حضرات کے سید تصدق حسین مصحح کا نام بھی شامل ہے۔ سید تصدق حسین نے داستان امیر حمزہ مولفۂ سید عبداللہ بلگرامی کی زبان پر نظرِ ثانی کی۔ اس کے علاوہ انھیں داستان نگاری سے کوئی سروکار نہیں۔

ہوشربا کی تکمیل کے بعد تصدق حسین کی قلم کاری کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے اول نوشیرواں نامہ ۲ جلد، کوچک باختر، بالا باختر اور ایرج نامہ ۲ جلد لکھے۔ اس کے بعد منشی پیارے مرزا کو ساتویں دفتر 'تورج نامے' کی جلد اول کی تالیف میں مدد دی۔ 'تورج نامے' کی جلد دوم خود انھیں کے قلم کا کارنامہ ہے۔ آٹھواں دفتر لعل نامہ بھی تصدق حسین ہی نے لکھا۔ لعل نامے سے فارغ ہو کر ۱۹۰۰ء میں انھوں نے ہرمز نامہ لکھا جو نوشیرواں نامہ جلد دوم سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لعل نامے کے قصے کو آگے بڑھاتے ہوئے آفتابِ شجاعت کی پانچ جلدیں تصنیف کیں۔ اس دفتر کی پانچویں جلد دو ضخیم جلدوں میں ہے یعنی یہ دفتر دراصل چھے جلدوں پر مشتمل ہے۔

آفتابِ شجاعت کی جلد چہارم میں تصدق حسین لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرشید عبدالعزیز رعنا لاہوری معتمدِ ریاست بھاول پور کی وساطت سے انھوں نے نواب بھاول پور کی ملازمت کی۔ چنانچہ جلد چہارم نواب بھاول پور کے حکم پر باستعانتِ منشی اسمٰعیل اثر تصنیف کی۔ جلد پنجم کے دونوں حصوں کا دیباچہ اور خاتمہ عبدالعزیز کا لکھا ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت سے مُراد کسی قسم کا وظیفہ ہے جو تصدق حسین نے لکھنؤ بیٹھے بیٹھے حاصل کیا کیونکہ وہ آخر دم تک نول کشور پریس سے وابستہ رہے۔

'آفتابِ شجاعت' کی تکمیل کے بعد تصدق حسین نے پھر کام مانگا جس پر منشی پراگ نرائن نے قمر کے تحریر کردہ 'زعفران زار سلیمانی' کے قریب سائٹھ جزو مکمل کرنے کے لیے دیے۔ انھوں نے محمد اسمٰعیل اثر کی مدد سے دو جلدوں میں داستان ختم کی جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے 'آفتابِ شجاعت' کے سلسلے میں 'گلستانِ باختر' تصنیف کی۔ اس کی دو جلدیں ۱۹۰۹ء تک شائع ہوگئیں۔ تیسری جلد ان کی وفات کے بعد پہلی بار مارچ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ جلد سوم میں بدیع الملک صاحب قرانِ ثالث کے بعد عادلِ کیواں شکوہ صاحبقرانِ رابع ظاہر ہوتے ہیں۔

امیر حسن نورانی نے تصدق حسین کی دو اور داستانوں کا ذکر کیا ہے جن کے مخطوطے نول کشور پریس کے محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔ پہلی داستان 'چرخِ گردوں' ہے جو ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری داستان 'انیسِ دلربا' تین جلدوں میں دو ہزار صفحات کو محیط ہے۔ یہ رومانی داستان قصۂ حمزہ سے متعلق نہیں ہے۔ (امیر حسن نورانی: غیر مطبوعہ نثری داستانیں 'ہماری زبان' ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء)

حالانکہ تصدق حسین بے پڑھے لکھے تھے لیکن یہ بھی داستان گو خوب نباہ گئے ہیں۔ جاہ اور قمر کے رنگ سے بے میل نہیں ہونے پاتے۔ کیا ذیل کی عبارت کا مصنف ناخواندہ ہوسکتا ہے؟

"ہر درخت بوقلموں فیضِ ہوائے سرسبز سے ہرا ہے۔ ایک ایک شاخ اتنی اونچی ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ ادھر بیخ ہیگا و زمین تک پہنچتی ہے۔ آیۂ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء، انھیں اشجار کی شان میں ہے۔ معلوم نہیں درختِ طوبیٰ کس گمان میں ہے۔ میوے تر و تازہ لگے ہیں کہ فقط جن کے خیالوں سے زبانوں پر مزے ہیں اور ان کے نوش کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ کھانے والے کو حیاتِ ابدی ملتی ہے، مرنے سے ہاتھ دھوتا ہے...... ہزارے کے فوارے چھوٹتے ہیں گویا موتیوں کا مینھ برس رہا ہے، دیکھنے والے مزے لوٹتے ہیں۔"

محمد اسمٰعیل اثر

انھوں نے صندل نامہ تحریر کیا اور زعفران زارِ سلیمانی اور گلستانِ باختر کی ترتیب میں تصدق حسین کی مدد کی۔

پیارے مرزا

یہ مرزا محسن علی خاں عرف آغا جو ہندی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تصدق حسین کی مدد سے تورج نامے کی جلد اول لکھی۔ ان کا خاص کارنامہ داستانِ خیال کے لکھنوی ترجمے کی ترتیب ہے۔

مرزا رضا علی

یہ احمد حسین قمر کے شاگرد تھے۔ انھوں نے 'آفتاب شجاعت' جلد چہارم کے سلسلے میں 'صولت الضیغم' معروف بہ داستانِ اسد ثانی لکھی۔ کتاب کی تصنیف لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی لیکن طبعِ اول لاہور میں ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔

محمد امیر خاں

جاہ و قمر کے ہم عصر ایک داستان گو محمد امیر خاں تھے۔ بقول عشرت انھیں عیاری لکھنے پر ناز تھا چنانچہ داستانوں میں عمرو کی عیاریاں انھیں کے بیانات کا چہرہ ہیں۔ یہ نول کشور کے یہاں نہیں گئے۔ ان کے رام پور جانے کا بھی پتا نہیں چلتا لیکن ان کی تصنیف سے ایک مخطوطہ طلسم ہوشربا جلد دوم رام پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

رضا لائبریری رام پور کی طرح نول کشور پریس لکھنؤ میں بھی داستانوں کے متعدد مخطوطے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض کرم خوردہ ہو کر ضائع ہو گئے ہیں لیکن کچھ مصنفین کے کارنامے ابھی تک محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل ابر حسن نورانی نے ہماری زبان کے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء کے بعض شماروں میں دی۔ انھیں سے استفادہ کرتے ہوئے محض نام شماری پر اکتفا کی جاتی ہے۔

انور حسین آرزو لکھنوی

انھوں نے داستان جنوبیہ لکھی۔ اس کے مخطوطے میں ۸۰۰ صفحات ہیں۔

سید میرن آبرو رضوی لکھنوی

انھوں نے ایک داستان 'طلسم تحت الارض' نواب بھاول پور کو پیش کی ان کے یہاں سے طباعت کی غرض سے یہ داستان نول کشور پریس میں پہنچی۔ آبرو نے اپنی دوسری داستانیں بھی نول کشور پریس کو دیں لیکن کسی نے اشاعت کا منھ نہ دیکھا۔ تفصیل یہ ہے:

۱۔ داستان معرکہ آرا۔ (فارسی) پچاس پچاس جزو کی ۲ جلدیں۔ اس کا سلسلہ 'لعل نامہ' دفتر ہشتم امیر حمزہ سے ملتا ہے۔

۲۔ اقبال نامۂ غضنفری۔ پچاس پچاس جزو کی ۳ جلدیں۔ بسلسلۂ داستانِ معرکہ آرا

۳۔ توزک صاحب قرانی۔ پچاس پچاس جزو کی ۳ جلدیں بسلسلۂ اقبال نامۂ غضنفری۔

۴۔ طلسم دار الجنوں ۲ جلدیں۔ اس کا سلسلہ بھی اقبال نامۂ غضنفر کی سے ملتا ہے۔ اس میں عیاریاں اور سحر بہت حیرت انگیز ہیں۔

۵۔ طلسم آفت خیز۔ ۴ جلد۔ یہ توزکِ صاحب قرانی سے متعلق ہے۔ مصنف کے مطابق یہ ہوشربا سے زیادہ دلچسپ ہے۔

۶۔ طلسم کرشمہ گاہ جمشیدی۔ ۴ جلد۔ یہ بھی توزکِ قرانی سے متعلق ہے۔ بقولِ مصنف یہ داستان اکبر ثانی نے فارسی میں تصنیف کرائی تھی۔

۷۔ طلسم تحت الارض۔ ۳ جلد، بہ سلسلۂ طلسم زعفران زارِ سلیمانی۔ از تصدق حسین۔

۸۔ طلسم بزم آرائے سامری ۲ جلد۔ بہ سلسلۂ تحت الارض۔

۹۔ طلسم انجم آرائے جمشیدی۔ ۲ جلد۔ بہ سلسلۂ تحت الارض۔

۱۰۔ طلسم ہفت ملک ۱۰ جلد۔ بہ سلسلۂ تحت الارض

۱۱۔ دفتر اختتام داستاں ۲ جلد۔ اس میں خاندانِ صاحب قراں کے خاتمے کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق امیر حمزہ کے بارھویں دفتر (یعنی دراصل ۹) سے ہے۔

نورالدین احمد علوی کیفی کاکوروی

ان کی تصانیف کا تعارف امیر حسن نورانی یوں کرتے ہیں:۔

"اردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانوں میں غالباً نورنگار سے بڑی کوئی داستان نہیں ہے اور مصنف کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی ۹ جلدیں ہیں اور چند جلدیں دو دو حصوں میں ہیں۔ اس لیے کُل داستان ۲۴ حصوں میں ہے۔ ہر حصہ بڑے سائز کے کم سے کم ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بعض حصے ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ داستان یوں تو امیر حمزہ کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور داستان میں نہیں۔ اس میں علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔"

سید حشمت علی

انھوں نے ایک ہزار صفحات کی ایک جلد میں طلسم ہفت جرہ لکھا۔ یہ بہت دلچسپ ہے۔

طلسم لالہ زارِ سلیمانی ۲ جلد۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ کو جس طرح لکھنؤ نے پروان چڑھایا وہ بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ تمام شاہی سرپرستی کے باوجود پورا اس باب میں نول کشور پریس کے تجارتی ادارے کو نہیں پہنچتا آج دنیائے اردو میں داستانِ امیر حمزہ کا جو غلغلہ ہے وہ محض لکھنؤ میں تصنیف شدہ اور شائع شدہ دفاتر کی وجہ سے ہے۔ ان کی ضخامت ان کی قدر پرستی میں آڑے آئی ہے۔ ان کے صفحات میں وہ ادبی جوہر وگوہر بھرے پڑے ہیں جو اُردو کی چوٹی کی داستانوں میں ملتے ہیں۔ اگر یہ مختصر ہوتیں تو زیادہ قاریوں کو اپنی کمند میں اسیر کر سکتی تھیں۔ اگر لکھنؤ سلسلۂ حمزہ میں صرف طلسم ہوشربا کا تحفہ ہی پیش کرتا تو وہ اردو کی کسی داستان اور داستان نگار سے ہیٹا نہیں رہتا۔

قومی گیت

اے ماں اے ماں تجھ کو سلام، بھارت ماتا کو پرنام
تو تو کیسی پیاری ماں ہے
سب ماؤں سے اچھی ماں ہے
لاڈ اٹھانے والی ماں ہے
اپنی ماں ہے اپنی ماں ہے
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
تیری مانگ میں گنگا جل ہے
ہرا بھرا تیرا آنچل ہے
ہریالی ہے پھول ہے پھل ہے
تیری گود سکھ منڈل ہے
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
سب سے اونچے پربت والی
سب سے بڑھ کر شوکت والی
سب سے بھاری دولت والی
عزت والی عظمت والی
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
تیری چھاتی دھرم سمندر
جس کی موجیں مسجد مندر
دونوں کی ہے گونج برابر
اللہ اللہ، ایشور ایشور
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
اے ماں اے ماں تجھ کو سلام، بھارت ماتا کو پرنام

—— آرزو لکھنوی

شمس الرحمٰن فاروقی

داستانِ امیر حمزہ: بعض ابتدائی باتیں

لکھنؤ نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ اگرچہ اس شہر کی اداؤں میں ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عاشقوں کو مار رکھتا ہے۔ یا گاڑ کر بھول جاتا ہے، لیکن اس کے چاہنے والے اپنی مدت حیات اسکے ناز اٹھانے ہی میں گذار دیتے ہیں۔ آتش و ناسخ، میر و مصحفی، کتنے ہی ایسے ہیں جن کی لوح مزار کیا، مزار تک اب باقی نہیں۔ لیکن ان کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ یہ خاک لکھنؤ میں آسودہ ہیں (اگر "آسودہ" کا لفظ ایسوں کے لئے مناسب ہو۔) داستان امیر حمزہ (طویل) اور داستان امیر حمزہ (مختصر) کی تخلیق کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لکھنؤ میں دفن ہیں یا کہاں دفن ہیں؟ کسی قوم اور کسی تہذیب نے کم ہی اپنے محسنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہوگا جو اہل لکھنؤ، اہل اردو اور اہل ہند نے داستان امیر حمزہ جیسی عظیم المرتبت کارگاہ نیرنگ کے صانعوں کے ساتھ کیا۔ اگر لکھنؤ کے ادبی کارناموں کی قیمت لگائی جائے تو انیس کے مرثیوں اور ناسخ کی غزلوں کے سوا غالباً کوئی بھی متن ایسا نہ ہوگا جسے داستان امیر حمزہ (طویل) کے مقابل رکھا جا سکے۔

داستان، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کے زوال کا سبب صرف ناول کی مقبولیت نہیں۔ اور صرف ناول ہی کیوں، تھیٹر خاص کر پارسی تھیٹر، اور داستان کے آخری زمانے میں خاموش فلموں کا بھی غلغلہ کچھ کم نہ تھا۔ تاہم یہ چیزیں اتنی طاقت ور نہ تھیں کہ سیکڑوں برس کی توانا اور دور رس روایت کو چند برسوں میں اکھاڑ پھینکتیں۔ اصل وجہ تو یہ تھی کہ ہم اپنے ورثے پر شرمندہ اور اپنے تہذیبی مظاہر سے متنفر تھے۔ نصوح نے کلیم کا کتب خانہ بے وجہ ہی نذر آتش نہ کیا تھا۔ اور گلستان سعدی میں "فحش" عناصر کچھ یوں ہی محجوب نہ تھے اپنی بیوی سے اس نے کہا کہ مجھے "گلستاں" کے صفحے کے صفحے کاٹنے پڑے، کیوں کہ وہ تمہیں پڑھانے کے لائق نہ تھے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو ہمارے بزرگان سلف ہیں اور جن کا نام ہم "رحمۃ اللہ علیہ" اور "شیخ" کہہ کر لیتے ہیں۔ اپنی تہذیبی روایت سے برگشتگی اور اس کی ناقدری اور اس سے تنفر کا دور دورہ ہمارے یہاں اب بھی ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس پر گفتگو کبھی اور ہوگی لیکن جب کبھی میں کسی "بزرگ" سے کہتا ہوں کہ میں داستان امیر حمزہ پر کام کر رہا ہوں، تو وہ مسکرا کر کہتے ہیں "ہاں ہم نے بھی بچپن میں طلسم ہوشربا/داستان امیر حمزہ پڑھی تھی" یعنی یہ بس پرانے زمانے کے بچوں کا دل بہلانے کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ آج کوئی عمر رسیدہ شخص اسے پڑھے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"داستان" کے بارے میں فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ داستان ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لئے تصنیف کیا جائے۔ چاہے فی البدیہ، چاہے سوچ کر، خواہ دن رات محنت کر کے لکھ کر، یا دل میں گڑھ کر اور پھر زبانی یاد کر کے، چاہے لکھ کر چھپوانے کی غرض سے طریقہ "تصنیف" جو بھی ہو، لیکن مقصود یہی ہوتا ہے کہ اسے زبانی سنایا جائے۔ باختن نے لکھا ہے کہ دنیا میں ناول نگار سے زیادہ تنہا کوئی فن کار نہیں۔ کیوں کہ اس کی تحریر پڑھنے والا اجنبی، خالق تحریر سے دور، اور اکثر خالق تحریر سے کوئی مطلب نہ رکھنے والا ہوتا ہے۔ ناول تنہائی میں یا چپ چاپ پڑھا جاتا ہے یعنی وہ ایسا بیانیہ ہے جس کا

Target audience مفقود ہوتی ہے اگرچہ جیرالڈ پرنس Gerald Prince اور بعض دوسرے وضعیاتی مفکرین نے فکشن کے Narratee کا تصور پیش کیا ہے، یعنی ایسے شخص (یا سننے والے/پڑھنے والے) کا جسے فکشن نگار اپنے مفروضہ قاری کی طرح ذہن میں رکھتا ہے۔ لیکن باختن کی بات میں پھر بھی بہت سچائی ہے۔ ناول نگار اور اس کے قاری/سامع کے درمیان براہ راست کوئی رشتہ نہیں قائم ہو سکتا۔ ناول نگار کی مثال اندھیرے میں بیٹھ کر گانے والے کی ہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا گانا کون سن رہا ہے۔ سن بھی رہا ہے کہ نہیں، اور اگر سن رہا ہے تو وہ اسے ناپسند کر رہا ہے یا پسند کر رہا ہے، یا بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے، یا بالکل پہلو تہی کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف زبانی بیانیہ اور Target audience کے درمیان فوری عمل اور ردعمل ہوتا ہے۔ اور اگر بیانیہ سنایا نہ بھی جا رہا ہو، لیکن تصنیف اس غرض سے کیا جا رہا ہو کہ اسے زبانی سنایا جائے گا۔ تو بھی اس کی شعریات وہی ہوگی۔ اس کی بدیعیات Rhetoric وہی ہوگی۔ رسومیات اور انداز وہی ہوں گے جو زبانی بیانیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی نے کوئی زبانی بیانیہ کبھی نہ سنایا ہو، تو وہ ایسا بیانیہ تصنیف بھی نہیں کر سکتا جسے زبانی بیانیہ oral Narrative کہا جا سکے۔ داستان امیر حمزہ۔ زبانی بیانیہ کی اعلیٰ ترین مثالوں میں بھی ممتاز تو ہے ہی، اسے تحریری یا ریکارڈ کی ہوئی شکل میں موجود دنیا کا طویل ترین زبانی بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔

جب ہم اردو میں "داستان امیر حمزہ" کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی کم از کم مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

(۱) وہ زبانی (یا زبانی۔ تحریری) بیانیہ جو اردو، فارسی، ترکی، پشتو، سندھی، انڈونیشائی بھاشا، جارجیائی، بنگالی، ہندی، اور بہت سی دیگر زبانوں میں ہے اور جس میں امیر حمزہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

(۲) وہ داستان جسے خلیل علی اشک نے فورٹ ولیم کالج میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۰۱)۔ یہ ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ اس کی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔

(۳) وہ داستان جسے امان علی خاں غالب لکھنوی نے کلکتہ میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۵۵)۔ یہ اب تقریباً ناپید ہے، لیکن نولکشور نے اسے ۱۸۷۱ میں عبداللہ بلگرامی کے نام سے تھوڑے بہت تغیر کے بعد چھاپا۔ یہ بھی ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ بلگرامی کے بعد تصدق حسین، اور پھر عبدالباری آسی نے اس میں رد و بدل کیا، لیکن عمومی اعتبار سے یہ اب بھی وہی متن ہے جو غالب لکھنوی نے ۱۸۵۵ میں شایع کیا تھا۔ اس کی بھی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ اشک اور غالب لکھنوی کے پیش نظر دو الگ الگ نسخے تھے۔ اشک کے سامنے "رموز حمزہ" کا کوئی متن تھا اور غالب لکھنوی کا متن کوئی بالکل مختلف نسخہ تھا۔ اس کا "زبدۃ الرموز" سے بھی کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔

(۴) وہ داستان جو چھیالیس جلدوں میں بزبان اردو نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپی۔ ۱۸۸۳ سے ۱۹۰۹ کے درمیان پینتالیس جلدیں چھپیں۔ آخری جلد ۱۹۱۷ میں چھپی۔

سہولت کے لئے میں اشک کی داستان کے لئے "داستان (مختصر) مصنفہ اشک" غالب لکھنوی کی داستان کے لئے "داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی اور چھیالیس جلدوں والی داستان کے لئے "داستان (طویل)" کے فقرے استعمال کروں گا۔ اگر لفظ داستان تنہا آئے تو اس سے داستان بطور صنف، یا کوئی خاص داستان جو کسی کتاب/جلد میں مذکور ہو، یا عمومی طور پر داستان امیر حمزہ مراد ہوگی۔ ایسی صورت میں سیاق کلام سے مفہوم متعین ہوگا۔

"داستان امیر حمزہ" جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے (اگر اس کی بے گھری اور ناقدری اور کسی بھی جگہ پر اس کی مکمل جلدوں کا نہ ہونا، ہم تک پہنچنا قرار دیا جائے) اس کے اعتبار سے یہ داستان آٹھ دفتروں اور چھیالیس جلدوں پر مشتمل قرار دی جا سکتی ہے۔ "قرار دی جا سکتی ہے" میں نے اس لئے کہا کہ دفتروں اور جلدوں

کی تعداد میں تھوڑی بحث کی گنجائش ہے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ جلدیں چھیالیس ہیں یا زیادہ؟ سراج منیر مرحوم نے مجھ سے بہ وثوق کہا تھا کہ باون جلدیں ہیں۔ میں نے تفصیل چاہی تو انھوں نے کہا کراچی میں ایک صاحب کے پاس تھیں۔ لیکن وہ ان صاحب کا پتہ نشان دینے سے قاصر رہے، اور نہ مجھے ہی میری تلاش کا کوئی پھل ملا۔ نہ ان صاحب کی خبر لگی اور نہ کسی فہرست یا تحریر میں ہی مجھے باون جلدوں کا ذکر ملا۔

علی بہادر خاں نے اکتالیس جلدیں بیان کی ہیں۔ لیکن انھوں نے "آفتاب شجاعت" کو خدا معلوم کیوں ایک ہی جلد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں بھی دراصل چھیالیس جلدیں ہوئیں۔ راز یزدانی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۰ء) میں لکھا ہے کہ انچاس جلدیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"ہرمز نامہ، آفتاب شجاعت اور گلستان باختر وغیرہ سب کو گنا جائے تو انچاس جلدیں اور تقریباً سینتالیس ہزار صفحات ہوتے ہیں۔"

یزدانی نے جلدوں کی فہرست یا تفصیل نہیں دی ہے۔ لہٰذا ان کے دعوے کو بے دلیل ہی قرار دینا پڑے گا۔ صفحات کا اندازہ البتہ ان کا تقریباً درست ہے کیونکہ صفحات کی تعداد بیالیس ہزار بیٹھتی ہے۔ گیان چند نے پہلی بار تمام جلدوں کی فہرست تیار کی اور ان کا مختصر بیان لکھا ان کے یہاں بھی جلدیں چھیالیس ہی ہیں۔ اپنی حالیہ تحریر میں بھی انھوں نے وہی چھیالیس جلدیں بتائی ہیں۔ (مضمون مطبوعہ "نیا دور"، لکھنؤ، اودھ نمبر) سینتالیس کا معاملہ یہ ہے کہ ایم۔ حبیب خاں نے اپنی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" میں احمد حسین قمر کی طلسم نارنج" پر مفصل گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ "داستان امیر حمزہ کے پہلے دفتر "نوشیرواں نامہ" کی دراصل ایک کڑی ہے۔" حبیب خاں نے مزید کہا ہے کہ "طلسم نارنج" چونکہ داستان امیر حمزہ ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، "طلسم نارنج" کا ذکر سب سے پہلے حبیب خاں نے کیا۔ اس کا مفصل تعارف تو یقیناً حبیب خاں ہی نے لکھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے داستان امیر حمزہ کی سینتالیسویں جلد قرار دینا تو الگ رہا، کسی نے طلسم نارنج" کا ذکر حبیب خاں کے بعد بھی نہیں کیا۔ نہ ہی کسی نے حبیب خاں کے اس دعوے کا محاکمہ کیا ہے کہ "طلسم نارنج" کو امیر حمزہ کے سلسلے کی ایک قرارداد دیا جانا چاہئے اور اس طرح جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ٹھہرائی چاہئے۔ "طلسم نارنج" کے بارے میں خاموشی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بہت کم یاب ہے۔ حبیب خاں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری کے نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ ممکن ہے یہ نسخہ اوروں کی دسترس میں نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "طلسم نارنج" میں واقعات، کردار اور عمومی فضا بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ داستان امیر حمزہ (طویل) کی کسی اور جلد میں۔ پھر یہ بھی ہے کہ داستان (طویل) اور داستان (مختصر) دونوں میں "طلسم نارنج" کے حوالے بھی ہیں۔ "طلسم نارنج" کے شروع ہی میں داستان گو ہمیں بتاتا ہے کہ عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان جیسا کہ "دفتر" میں ہے، درست نہیں۔ بلکہ وہ بیان درست ہے جو زیر نظر داستان میں مذکور ہے۔ یہاں "دفتر" سے مراد "نوشیرواں نامہ" جلد اول (صفحہ ۴۴۹) یا داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک، جلد دوم (صفحہ ۲۲) ہے جہاں عمرو بن حمزہ کی پیدائش کے بارے میں ایک دلچسپ اور انوکھا واقعہ مذکور ہے۔ "نارنج" کے مصنف احمد حسین قمر کو یہ فکر ہمیشہ رہتی ہے دوسرے داستان گویوں پر اپنی برتری کسی طرح ثابت کریں۔ صفحہ ۷ تا ۸ پر وہ دوسرے داستان گویوں کو ناقص بتاتے اور عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا ایک اور بیان درج کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا دوسرا بیان بھی "نوشیرواں" اول میں اسی جگہ (صفحہ ۴۴۹) موجود ہے۔ قمر نے اپنی فوقیت جتانے کے جوش میں "نوشیرواں نامہ" کا مکمل حوالہ نہیں دیا۔ بہر حال، وہ بات الگ ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ "طلسم نارنج" کا مرکزی کردار عمرو بن حمزہ ہے اور اس کی پیدائش کے واقعات داستان (مختصر) اور داستان (طویل) دونوں میں موجود

میں عمرو بن حمزہ کے ہاتھوں "طلسم نارنج" کی فتح کا بیان بھی "نوشیرواں" (اول) میں موجود ہے۔ "طلسم ہوشربا" (چہارم) کے صفحہ ۱۲۰ پر بھی طلسم نارنج" کا حوالہ ہے۔ اور ایک بندریا کا ذکر ہے جس کا نام دم خبیثہ تھا اور جو بڑی ساحرہ تھی۔ دم خبیثہ کی تفصیلی روداد "طلسم نارنج" میں ہے۔ "ہوشربا" (پنجم اول) میں بھی نارنج جادو کا ذکر ہے۔ داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی میں بھی طلسم نارنج کا سرسری حوالہ ہے۔ غرض کہ اس بات میں کوئی شک ہی نہیں کہ داستان طلسم نارنج اپنی تفصیلات میں اور عام نقشے کے اعتبار سے بھی اور طرز بیان کے اعتبار سے تو بالکل سو فی صدی) داستان (طویل) کا حصہ قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ کسی نے اسے داستان (طویل) کا حصہ قرار نہیں دیا۔ گیان چند کی کتاب کے تازہ ایڈیشن کی کتابیات میں "طلسم نارنج" اور حبیب خاں کی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" دونوں درج ہیں۔ لیکن نفس کتاب میں "طلسم نارنج" پر ایک جملہ بھی نہیں۔ داستان امیر حمزہ کا جتنا تفصیلی اور محتاط محاکمہ گیان چند نے کیا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ دریں صورت انھوں نے اگر "طلسم نارنج" کو نظر انداز کیا تو اس کی وجوہ ہونگی افسوس کہ انھوں نے اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ "نارنج" کو داستان (طویل) کا حصہ قرار دینا غلط ہوگا۔ یعنی داستان (طویل) کی کل جلدیں چھیالیس ہی ہیں سینتالیس نہیں۔ "نارنج" کو داستان (طویل) سے الگ رکھنے کی وجہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔ قمر نے اپنے معمول لاف وگزاف اور اپنے معاصروں کو نیچا دکھانے کی کوششوں کے باوجود یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ "نارنج" بھی داستان (طویل) کی جلدوں میں سے ایک ہے۔ یہ داستان انھوں نے بالکل آخری زمانے میں لکھی تھی۔ اس وقت تک ان کا رنگ خوب جم چکا تھا۔ ان کے صاحب زادے اشتیاق حسین سہیل نے "نارنج" کے آخر میں جو تقریظ لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر نے "ہومان نامہ" انھیں دنوں ختم کی تھی اور اس وقت وہ "جمشیدی" پر کام کر رہے تھے۔ "اور جوش طبع عالی اسی طور پر ہے اور فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قدر داں بقدر دانی لکھوائے تو دس بیس جلدیں مثل بوستان خیال کے لکھوں کہ کچھ رنگ طبیعت ظاہر ہو۔ ان دو تین جلدوں میں کیا جودت طبع کم ہو۔ اس طلسم کو ملاحظ فرما کر ناظرین بہت خوش ہوں گے کہ نوشیرواں نامہ میں نہیں تحریر ہوا۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ داستان گو، اور ان کے بیٹے دونوں ہی کی نظر میں "نارنج" داستان (طویل) کا حصہ نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتے۔ وہ ایسے چوکنے والے لوگ نہ تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ قمر نے عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان تصدق حسین (نوشیرواں اول) کے یہاں سے بے کھٹکے اپنا مال بنا کر لے لیا اور تمام داستان گویوں (بہ شمول تصدق حسین) کو مطعون بھی کیا کہ وہ "خلاف امر" روائتیں بیان کرتے ہیں، اصل روایت تو میں بیان کر رہا ہوں۔ خود قمر نے "نارنج" کے آخر میں یہی کہا ہے کہ "طلسم حقیر نے تمام کیا۔ اب آگے داستان صاحب قران کا ذکر ہے... اگر ناظرین وسامعین اس طلسم کو ہاتھوں ہاتھ خرید یں گے تو آئندہ اس کو بھی تحریر کروں گا۔" یعنی انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے داستان (طویل) کی ایک جلد لکھی ہے۔ داستان (طویل) کی جلدیں تو وہ نولکشور کیلئے لکھ ہی رہے تھے یہاں انکو غالباً یہ امید تھی کہ اگر "ناظرین وسامعین" اصرار کریں گے۔ تو انھیں نوشیرواں جیسی داستان الگ سے لکھنے کا موقع مل جائے گا۔ معلوم نہیں "نارنج" کے ساتھ "ناظرین وسامعین" نے کیا سلوک کیا؟ یہ داستان شاید مقبول نہ ہوئی۔ کیوں کہ یہ کم و بیش گم نام رہی ہے۔ بہر حال قمر کی بھی عمر نے دفا نہ کی، اور "نارنج" کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(۲)۔ خود پبلشر کی کسی فہرست یا اشتہار میں "طلسم نارنج" کا ذکر داستان (طویل) کے حصے کے طور پر نہیں ہے۔ شروع داستان کی جلدیں جو میرے پاس ہیں، ان میں "نارنج" کا اشتہار کیا، اور داستان (طویل) کے حصے کے طور پر اس کا ذکر کیسا، فہرست تک میں اس کا نام نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر اس داستان اور داستان (طویل) کے درمیان واضح امتیاز رکھنا چاہتا ہے۔ اشتہار اور فہرست سے نام غائب رہنا بھی "نارنج" کی گمنامی کا ایک سبب یقیناً رہا ہوگا۔

(۳)۔ داستان (طویل) کی جلدیں اوسطاً نو سو صفحے یا کچھ زیادہ کی ہیں۔ (بوستان خیال" کی جلدیں اوسطاً" بڑی تقطیع کے سات سو صفحات یا کچھ ہیں۔ یہ اوسطً دہلوی اور لکھنوی دونوں "بوستان" کا ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ طوالت اور ضخامت بھی داستان کی شرط ہے۔ "نارنج" کی ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے، یعنی یہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس جیسی چار داستانیں بآسانی داستان (طویل) کی کسی جلد میں سما سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا محاکمے سے یہ بات کم و بیش ثابت ہو جاتی ہے کہ نارنج کو داستان (طویل) کی سینتالیسویں جلد قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں، اور جلدوں کی صحیح تعداد چھیالیس ہی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، داستان (طویل) کی چھیالیس جلدیں آٹھ دفتروں میں منقسم ہیں۔ یہ دفتر کس نے بنائے اور دفتروں کی تعداد کس نے متعین کی۔ ان سوالوں کے جواب فی الوقت ممکن نہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دفتروں کی یہ تقسیم اتنی قدیم نہیں جتنی نولکشوری بیانات، یا داستان گویوں کے مفروضات سے مستفاد ہوتا ہے۔ "رموز حمزہ" میں دفتروں کا پتہ نہیں۔

راز یزدانی نے لکھا ہے (نگار لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۵۹ء) کہ انھوں نے "رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۲۷۵۔۱۲۷۸ھ دیکھی ہے۔

(برٹش لائبریری میں جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۲۷۴۔۱۲۷۶ھ ہے۔ ممکن ہے راز یزدانی نے دوسرا ایڈیشن دیکھا ہو)۔ اس مضمون میں انھوں نے دفتروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں "رموز حمزہ" منقسم ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اس "رموز حمزہ" کو سات جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر جلد کو "کتاب" کہا گیا ہے لیکن "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۰ء والے مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں "صرف تین دفتروں کا نام ملتا ہے۔ نوشیرواں نامہ۔ ایرج نامہ اور صندلی نامہ" اصل کتاب دیکھے بغیر میں نہیں یقین کر سکتا کہ اس میں دفتر ہوں (جب کہ راز صاحب خود بھی "کتابوں" کا ہی ذکر کر رہے ہیں) "رموز حمزہ" مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۹ء میرے سامنے ہے اس میں اور نہ "قصہ حمزہ" مرتبہ جعفر شعار (تہران ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء) میں دفتر ہیں۔ موخر الذکر بھی میرے سامنے ہے۔ "زبدۃ الرموز" میں بھی دفتر نہیں ہیں۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ اٹھارویں صدی آتے آتے داستان اتنی پھیل گئی ہو کہ اس کے کئی حصے یا دفتر ہو گئے ہوں جیسا کہ فرنیس پرچیٹ نے لکھا ہے کہ غالب نے ۱۸۶۱۔۱۸۶۲ کے زمانے میں میرن صاحب کو جب یہ لکھا کہ "مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی... آگئی ہے..." تو ممکن ہے کہ وہ "کتاب رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۸۵۷۔۱۸۵۹ کا ذکر کر رہے ہوں، کیوں کہ اردو یا فارسی میں اس وقت کسی اور داستان امیر حمزہ کا پتہ نہیں چلتا جو اس حجم کی ہو۔ راز یزدانی نے اپنی دیکھی ہوئی "رموز حمزہ" کا جو حجم بتایا ہے وہ غالب کے بیان کردہ حجم سے مطابقت رکھتا ہے

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک (۱۸۰۱) اور داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی (۱۸۵۵) دونوں میں داستان کی چودہ جلدوں کا ذکر ہے۔ اگرچہ یہ دونوں کتابیں خود بالترتیب ۴۳۳ اور ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہیں لیکن دونوں میں تاثر اس بات کا پایا جاتا ہے کہ اصل داستان بہت طویل ہے

داستان کے آٹھ دفتروں کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی ترتیب وہی ہے جو خود قصے کی ترتیب ہے یعنی

داستان کا آغاز "نوشیرواں" اول میں ہوتا ہے۔ بعد کے دفاتر جس ترتیب سے رکھے گئے ہیں، اسی ترتیب سے واقعات پیش آتے ہیں اور "لعل نامہ" دوم میں امیر حمزہ اور عمرو کی موت پر داستان تمام ہوجاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان کی بہت سی جلدیں یا بہت سے اجزا کو پبلشر (نولکشور) نے دفتروں کا حصہ نہیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ "ہفت پیکر"، "نور افشاں"، "سکندری" وغیرہ کسی دفتر کا حصہ نہیں قرار دیا گیا۔ "آفتاب شجاعت" کو ہمیشہ "دفتر آفتاب شجاعت" کہا گیا۔ (یعنی عملاً آٹھ کے بعد نواں دفتر جاری کیا گیا۔) "گلستان باختر" کو "آفتاب" کے سلسلے کی داستان (لہذا "دفتر" "آفتاب شجاعت" کا حصہ) بیان کیا گیا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ دفتروں کی داستانیں، اور ان کی جلدوں کی تعداد، دونوں بائیں دفتروں کی تحریر کے پہلے کم و بیش متعین ہوچکی تھیں اس تیسری بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا داستان گو اور پبلشر کو پورا اندازہ تھا کہ تحریری شکل میں کون داستان کتنے صفحے لے گی اور کون سے دفتر میں کتنی جلدیں ہوں گی؟ ظاہر ہے کہ بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ لہذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ پبلشر اور داستان گو مل کر طے کرلیتے ہوں گے کہ کس دفتر میں کتنی اور کون سی جلدیں ہوں، اور اگر کوئی نئی داستان (یا پرانی داستان کی توسیع) ہو تو اسے کس دفتر میں رکھا جائے۔ لہذا یہ بات بھی پوری طرح ممکن، بلکہ اغلب معلوم ہوتی ہے کہ پوری داستان (یا کم سے کم وہ حصے، جلدیں جو آٹھ دفتروں تک محدود تھیں) زبانی شکل میں کم و بیش مستقل صورت اختیار کرچکی تھی معرض تحریر میں آنے کے بعد صحیح پتہ لگتا تھا کہ کوئی داستان کتنی جلدوں میں سمائی ہے۔ لیکن دفتروں کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور یہ ممکن ہے کہ فارسی میں بھی (ہندوستان کی حد تک) یہ اپنی اصل سے بہت زیادہ پھیل چکی ہو۔ "بہار عجم" اور "چراغ ہدایت" میں بعض داستان الفاظ کا اندراج اس خیال کو مستحکم کرتا ہے۔

اس موضوع پر گفتگو آئندہ ہوگی۔ فی الحال آٹھ دفتروں پر کچھ مزید کہتے ہیں۔ "نوشیرواں" اول (جون ۱۸۹۳) کے سرورق پر نمایاں الفاظ میں حسب ذیل اعلان ہمیں ملتا ہے: "... اس کے آٹھ دفتر ہیں اور بعض دفتر کی کئی جلدیں حسب تفصیل ذیل۔" اس کے بعد چوکھٹے میں جلدوں اور دفتروں کے نام یوں درج ہیں:۔

تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد	تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد
اول	نوشیرواں نامہ	۲ جلد	پنجم	طلسم ہوشربا	۷ جلد
دوم	کوچک باختر	ا جلد	ششم	صندلی نامہ	ا جلد
سوم	بالا باختر	ا جلد	ہفتم	تورج نامہ	۲ جلد
چہارم	ایرج نامہ	۲ جلد	ہشتم	لال (کذا) نامہ	ا جلد

"ہوشربا" (پنجم اول) کے ایک نسخے کی داشت میرے پاس ہے۔ یادداشت کے مطابق اس کے صفحہ ۷۶۰ پر ایک اشتہار ہے جو ۱۸۹۱ء کی اشاعت (یعنی اول اشاعت) میں مندرج اعلان کی من و عن نقل ہے۔ جون ۱۸۹۳ کی منقولہ بالا فہرست بھی بالکل وہی ہے جو ۱۸۹۱ کے اشتہار میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۱۸۹۱-۱۸۹۳ میں یہ بات طے نہ تھی کہ "لعل" کی دو جلدیں ہوں گی۔ نہ ہی "ہومان" اور "ہرمز" کی اشاعت کی کوئی تجویز نظر آتی ہے، اور نہ بقیہ طلسم ہوشربا کی دو جلدوں کی۔ ہاں "ہرمز" کی اشاعت اول (۱۹۰۰) میں "لال (کذا) نامہ" کی دو جلدیں بتائی گئی ہیں۔ اشتہار میں "ہرمز" نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" اور "ہومان نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" کا اعلان ہے۔ "آفتاب" کا اشتہار "جمشیدی" دوم اور سوم (۱۹۰۲) "سلیمانی" دوم (۱۹۰۵) میں بھی نہیں، اور جب ہے تو الگ "دفتر" کی حیثیت سے ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پبلشر (اور شاید داستان گو بھی) دفتروں کی تعداد میں اضافہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور نئی داستانوں کی تصنیف یا تحریر اور پھر اشاعت کے مشتاق بھی تھے۔ "ہومان" اور "ہرمز" کو تو انھوں نے دفتر میں شامل کرلیا کہ ان کا تعلق براہ راست "نوشیرواں" سے تھا، اور شاید یہ داستانیں پہلے سے موجود بھی تھیں اور "بقیہ ہوشربا" کو دفتر میں ڈالنا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن بقیہ داستانوں کے بارے میں ان کا رویہ گومگو کا رہا۔

یہاں ہمارے لئے مشکل آپڑتی ہے کہ ہم داستان (طویل) کو ایک داستان کہیں، یا دو کہیں، اگر ایک کہیں تو دفتر کے باہر والی داستانوں کو کہاں رکھیں؟ اور اگر دو کہیں تو اس کے لئے جواز کیا ہو، جب کہ داستان گویوں اور پبلشر، کسی نے بھی کبھی نہیں کہا کہ دو داستانیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ گیان چند نے اس معاملے کو یوں حل کیا ہے کہ گیارہ دفتروں اور انتیس انتیس جلدوں کے دو سلسلے قائم کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جلدیں چونکہ صرف چھیالیس ہیں اس لئے دونوں سلسلوں میں کئی جلدیں مشترک ہیں۔ گیان چند کہتے ہیں کہ اس ترکیب کو اختیار کرنے کے باعث "کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی ہے اور جنہیں ایک مربوط داستان قرار دیا جاسکتا ہے۔" گیان چند کی یہ ترکیب ہے تو دلچسپ۔ لیکن اس میں کئی قباحتیں ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ جلدوں کی تکرار کے باعث Symmetry غائب ہوگئی ہے اور مطالعہ مشکل ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دفتروں کی تعداد آٹھ سے گیارہ ہوگئی ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک کی جگہ دو سلسلے ہوگئے ہیں اور پھر بھی جلدوں کی تعداد چھیالیس نہ رہ سکی، اٹھاون ہوگئی، میرا خیال ہے کہ آٹھ دفتروں کی ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے ایک ہی سلسلہ وضع کیا جاسکتا ہے۔ اور ربط بھی پہلے سے زیادہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ مکمل ربط اور کامل طور پر ہر واقعے کی منطقی اور زمانی ترکیب داستان کے لئے نہ ضروری ہے نہ ممکن، ضروری صرف یہ ہے کہ ربط بیش از بیش ہو اور اہم واقعات و اشخاص کے بارے میں معلوم ہوسکے کہ وہ کس وقت کہاں ہوں گے گیان چند کی ترتیب کے نتیجے میں داستان کا ربط زائل ہوجاتا ہے کیوں کہ انھوں نے سلسلۂ اول میں "لعل" "پھر" آفتاب "، اور پھر "گلستان" کو رکھا ہے۔ حالانکہ "لعل" میں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی اور عمرو، سب کی موت ہوجاتی ہے۔ یہ داستان بہرحال "داستان امیر حمزہ" ہے، داستان حمزۂ ثالث و رابع نہیں، اور نہ ہی امیر حمزہ و حمزۂ ثانی و ثالث و رابع ہے۔ اس داستان کا اختتام بہرحال امیر حمزہ اول کی موت پر ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ داستان گو ان کی موت کا بیان نہ کرے، اور ان کی زندگی کے واقعات کو طویل سے طویل تر کرتا جائے۔ لیکن اگر وہ امیر حمزۂ اول کی موت کا بیان کرتا ہے تو داستان وہیں ختم بھی کرتا ہے۔ داستان (مختصر) کی دونوں روایتیں (اشک اور غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی) امیر حمزۂ اول کی موت پر ہی ختم ہوتی ہیں۔

بنیادی بات جو ذہن میں رکھنے کی ہے وہ حمزۂ ثانی کا ظہور ہے (صندلی نامہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب قران (امیر حمزہ) مر سکتے ہیں، لیکن صاحب قرانی باقی رہتی ہے۔ یعنی صاحب قرآن تو اور بھی ہوں گے (اگر خدا چاہے) لیکن صاحب قرآن وقت کو موت بھی ہے۔ اور عزل بھی۔ یعنی وہ اپنی زندگی ہی میں صاحب قرانی کسی اور کو منتقل کرسکتا ہے۔ لہٰذا "صندلی" کو داستان (طویل) کا خط انقسام کہنا چاہئے۔ صندلی کے بعد کی جلدیں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی، صاحب قران ثالث (بدیع الملک) اور صاحب قران رابع (عادل کیواں شکوہ) کے کارناموں کے اعتبار سے مرتب ہوں گی۔

داستان (مختصر، شک) اردو میں داستان امیر حمزہ کی قدیم ترین تحریری شکل ہے۔ اس کی جلد دوم صفحہ ۱۹۱ اور "رموز حمزہ" صفحہ ۹۷ پر لکھا ہے کہ قضا و قدر نے امیر حمزہ کی عمر ایک سو پچانوے برس دو پہر لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امیر حمزہ کی مدت حیات میں بہت کارناموں اور واقعات کی گنجائش ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ داستان (طویل) کے داستان گویوں کو وقت کا احساس نہ تھا۔ ایک جگہ ایک پہلوان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عمر ایک سو بیس برس ہے اور یہ نوشیرواں نامے کے وقت سے جنگوں میں شریک رہا ہے۔ طلسم ہوشربا میں کتنی مدت گذرتی ہے۔ طلسم ہفت پیکر میں کتنا عرصہ لگتا ہے، ان سب باتوں کا ذکر داستان (طویل) میں ہے۔ تفصیل اپنے وقت پر بیان ہوگی۔

□□

شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات و احساسات اس کے جذبات دل کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔

برج نرائن چکبست

ڈاکٹر شمیمہ رضوی

اٹھارھویں صدی میں

اودھ میں اردو داستان نگاری

اُردو ادب کے ارتقاء کے لحاظ سے شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب اُردو کو ادبی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن فارسی کے مقابلے میں وہ ابھی بہت کم سن تھی۔ شعری سرمایہ کے لحاظ سے تو اس نے ایک مقام حاصل کر لیا تھا لیکن اس دور کا نثری ادب خاصا کمزور تھا۔ شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی کی نثری داستانوں کی تفصیل اس طرح ہے،

(۱) قصہ مہر افروز و دلبر۔ از عیسوی خاں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے، جس سے سالِ تصنیف ۱۰۶۶ھ (مطابق ۵۹۔۱۶۵۵ء) کا استخراج ہوتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے آخری زمانے کی تالیف ہے۔

(۲) عجائب القصص، از شاہ عالم ثانی (زمانہ شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء۔ ۱۸۰۶ء)۔ دہلی کے اس مظلوم بادشاہ نے نہ صرف اُردو شعراء کی سرپرستی کی بلکہ وہ ایک نثری داستان کے مؤلف بھی ہیں جس کا ذکر سب سے پہلے قدرت اللہ قاسم نے مجموعہ نغز میں کیا۔ اس قصے میں ہندی عنصر کا زیادہ غلبہ ہے۔

(۳) نوطرزِ مرصع۔ از میر محمد حسین عطا خاں تحسین۔

(۴) نو آئین ہندی عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز۔ از مہر چند کھتری مہر (۱۲۱۳ھ/۱۸۰۳ء)

(۵) جذبِ عشق از شاہ حسین حقیقت بریلوی (۱۲۱۲ھ/۹۸۔۱۷۹۷ء)

ان میں سے اول الذکر دو داستانیں "قصہ مہر افروز و دلبر" اور "عجائب القصص" بالترتیب دورِ شاہجہانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں۔ چوں کہ ہمارا موضوع اودھ کی نثری داستان سے ہے، اس لئے اول الذکر دونوں داستانیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ بقیہ تین داستانوں پر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

(۱) نوطرزِ مُرصّع

میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی نوطرزِ مرصع نہ صرف شمالی ہند میں اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب مانی گئی ہے بلکہ اودھ میں داستان نگاری کی حیثیت سے بھی اسے اولیت کا فخر حاصل ہے۔ جن مستند کتابوں میں تحسین کا ذکر ملتا ہے وہ حوالے اس طرح ہیں،

(۱) تحسین کا سب سے پہلے ذکر آبِ حیات میں ملتا ہے اس لیے آزاد نے نوطرزِ مرصع کا سالِ تالیف ۱۷۸۹ء لکھا ہے۔

(۲) قدیم تذکروں میں سب سے پہلے خوب چند ذکاؔ کے تذکرے (سالِ ترتیب ۱۷۸۸ء) میں تحسین کا ذکر بحیثیت شاعر ملتا ہے۔ نوطرزِ مرصع کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔

(۳) ڈاکٹر گل کرسٹ نے میر امن کی تصنیف "باغ و بہار" کے مقدمے میں تحسین کے طرز اور اسٹائل پر صرف تبصرہ کیا ہے ان کے حالات کچھ نہیں لکھے۔

(۴) غلام علی خاں نے اپنی فارسی تاریخ اودھ مسمّیٰ بہ عماد السعادت (۱۸۰۸ء) میں تحسین کا مختصر ذکر کیا ہے۔

(۵) گارساں دتاسی نے تحسین کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ کلکتہ، پٹنہ اور فیض آباد میں رہ چکے ہیں۔ شجاع الدولہ اور پھر آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ شجاع الدولہ کے کہنے سے نوطرزِ مرصع لکھی اور پھر اسے آصف الدولہ نے بھی

پسند کیا۔

یہ وہ خارجی شواہد ہیں جن سے تحسین کے متعلق کسی تفصیلی حالات کا علم نہیں ہوتا، نہ تو سنہ پیدائش کا پتہ چلتا ہے، نہ سنہ وفات کا۔ تحسین کی تعلیم و تربیت کا بھی کچھ علم نہیں ہوتا۔ نوطرز مرصع کے شروع میں ایک دیباچہ شامل ہے جس سے اس قدر علم ہوتا ہے کہ ان کے والد مشہور آدمی تھے، خاندان میں علم و ہنر کا چرچا تھا۔ دادا سے لے کر پوتے تک سبھی سرکار مغلیہ میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ نوطرز مرصع کے علاوہ وہ انشائے تحسین، ضوابط انگریزی اور تواریخ قاسمی کے بھی مصنف تھے۔ یہ کتابیں اب ناپید ہیں۔

تحسین نے نوطرز مرصع کا سبب تالیف یوں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ تحسین کو جنرل اسمتھ کے ساتھ جو انگریزی فوج کے کمانڈر تھے، کشتی پر کلکتے کا سفر درپیش ہوا۔ سفر بہت طویل تھا چنانچہ ان کا ایک خادم سفر مختلف قسم کی داستانیں سنا کر دل بہلایا کرتا۔ اس کو سن کر تحسین کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اس داستان کو (جو نوطرز مرصع میں موجود ہے) مرصع ہندی زبان میں لکھا جائے تو کہیں بہتر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے دوران سفر کئی قصے لکھ ڈالے لیکن مکمل نہ کر سکے۔ کلکتہ پہونچنے کے بعد ان کا تبادلہ عظیم آباد ہو گیا اور داستان کا کام ملتوی کرنا پڑا۔ بعد کو فیض آباد جا کر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور انھیں اس داستان کا کچھ حصہ سنایا۔ انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے مکمل کرو۔ اس کی تکمیل ہوئی تھی کہ شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ آصف الدولہ کے تخت نشین ہونے کے بعد دیباچے میں چند کلمات توصیف کے اور ایک قصیدہ ان کی تعریف میں لکھ کر اسے آصف الدولہ کے حضور پیش کیا۔

نوطرز مرصع لکھنے کی ابتدا ۱۷۶۸ء میں ہوئی تھی اور ۱۷۷۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس میں چار درویش کا قصہ مذکور ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں لکھا گیا۔ اس سلسلے میں دو ناموں کا پتہ ملتا ہے۔ اول حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں دوسرے انجب جن کا ذکر مصحفی نے "عقد ثریا" میں کیا ہے۔ لیکن یہ قصہ اب ناپید ہے۔ بعد کے مؤلفین میں میر احمد خلف شاہ محمد کی فارسی تالیف میں چہار درویش کے قصے کی تصنیف امیر خسرو سے منسوب ہے۔ اسی

روایت کو میر امن نے "باغ و بہار" میں نقل کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اس کی تردید جن بنیادوں پر کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱. چہار درویش کے جتنے بھی قلمی نسخے ملے ہیں ان میں سے کوئی بھی بارھویں صدی ہجری سے پہلے کا نہیں۔
۲. شیخ نظام الدین اولیاء کے مقالات و ملفوظات میں اس کا کوئی ذکر نہیں
۳. کسی بھی مورخ یا تذکرہ نگار نے اسے امیر خسرو کی تصنیف نہیں بتایا ہے
۴. اس قصے میں شامل اشعار خسرو کے بعد کے شعرا مثلاً حافظ خاقانی، نظیری، عرفی کے کہے ہوئے ہیں۔
۵. "تومان" اور "اشرفی" جن کا ذکر قصوں میں آیا ہے، خسرو کے زمانے میں ان کا رواج نہ تھا۔
۶. مختلف منصب و عہدے جیسے خزانہ دار، امیر آخور مغلوں کی آمد کے بعد رواج پذیر ہوئے۔
۷. دوربین کا ذکر خواجہ سگ پرست کے قصے میں ملتا ہے۔ یہ سترھویں صدی کی دین ہے۔
۸. متن کی عبارت سے مولف کا اثنا عشری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امیر خسرو حنفی تھے۔

ایک قدیمی نسخے کے مطالعہ کے بعد پروفیسر شیرانی اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ یہ فارسی تالیف حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں کی ہے جو محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں گزرا ہے۔ اس کا ذکر پرانی کتابوں کے سرورق پر یوں ملتا ہے:

"باغ و بہار" تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا، ماخذ اس کا نوطرز مرصع، لیکن باغ و بہار میں قصہ کی جو ترتیب ہے وہ احمد خلف شاہ کے فارسی نسخے سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لیے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ میر امن نے احمد خلف شاہ کے نسخے سے بھی استفادہ کیا ہے؟

اٹھارھویں صدی عیسوی میں فارسی انشاء کے زیر اثر اردو نثر پر بھی تکلف و تصنع غالب تھا۔ منشی محمد حسین عطا مرصع رقم تو منشی کے عہدے پر ہی فائز تھے نیز یہ داستان بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی تو کیوں کر ممکن تھا کہ وہ انشاء پردازی سے کام نہ لیتے۔ شجاع الدولہ کا ذکر کرنے میں

کی سطریں تو صرف ان کے رنگین کلمات کی نذر ہو جاتی ہیں۔ قصے کے شروع میں ساری عبارت آرائی کرنا ہے، ملاحظہ ہو:

"بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا سلیمان قدر فریدوں فر، جہاں بان، رعیت پرور، رعیت نواز، عدالت گستر، برآرندۂ حاجات، بستہ کاراں، بخشندۂ مرادات امیدواراں، از خندۂ سیر نام کہ اشعہ شوارق فضل ربانی کا اور شعشۂ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوح پیشانی اس کے لمعان و نور افشاں رہتا۔"

(نوطرز مرصع صفحہ ۶۵)

یہ اور اسی قسم کی عبارتوں سے ایسا لگتا ہے کہ فارسی کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے باغ و بہار میں اس طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"عطا حسین خاں نے ابتداءً اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا مگر چوں کہ اس کی زبان بوجہ کثرت ترکیب و محاورہ فارسی و عربی مغلق اور قابل اعتراض مانی گئی تھی اسلئے ...... اس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں میر امن دہلوی نے مذکورہ بالا ترجمے سے موجودہ متن تیار کیا۔ دونوں کا ایک ساتھ متن ملاحظہ کیجئے، فرق خود بخود سامنے آجائے گا ...

نوطرز مرصع:

"جس وقت زلف خاتون شب کی کمر تک پہونچی اور چشم خلائق کی خمار نشۂ غنودگی کے سے سرمست خواب غفلت کے ہوئی یکایک صندوق جو بیچ فراز دیوار حصار کے سے مانند خورشید کے برج حمل کے سے جلا بخش دیدۂ تماشا بین کا ہوا۔ فقیر واردات اس عجائبات کے سے کمال متعجب ہوا کہ آیا یہ خیال طلسمات کا ہے یا سبب الاسباب حقیقی نے اوپر بیکسی اس بیکس کے نظر ترحم کی خزانے کے خزانۂ غیب سے دولت غیر مترقب مرحمت کی۔" (ص ۹۳۔۹۴)

باغ و بہار:

"جس وقت آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر ہو گئی، سنسان ہو گیا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعہ کی دیوار سے نیچے چلا آتا ہے۔ دیکھ کر میں اچنبھے میں آیا کہ یہ کیا طلسم ہے شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھا کر خزانۂ غیب سے عطا کیا۔"

عبارت میں جگہ جگہ تحسین نے مشہور شعرا کے منتخب اشعار بھی پیش کیے ہیں، بہ لحاظ اسلوب یہ تالیف انتہائی مرصع ہے۔

(۳) نوآئین ہندی عرف قصہ ملک محمد وگیتی افروز

مہر چند کھتری مہر کی تالیف "نوآئین ہندی" اٹھارھویں صدی عیسوی کے دور اخیر کی اہم تالیف ہے۔ مہر کے حالات مختلف تذکروں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے مستند تذکرہ نیراتی لال بے جگر کا "تذکرۂ بے جگر" ہے۔ اس لیے کہ اس میں مہر نے خود اپنے حالات لکھ کر بھیجے تھے۔

مہر ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں کوڑا جہان آباد تحصیل کھجوا ضلع فتحپور میں پیدا ہوئے۔ مہر آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے اور یہیں شعری و ادبی ماحول میں ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ فارسی میں مہر اور اردو میں ذرہ تخلص کرتے تھے۔ اس داستان کو ہم اسی بنیاد پر اودھ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ مہر کے بڑے بھائی لالہ گوکل چند کھتری متخلص بہ ہندو اور چھوٹے بھائی لالہ کشن چند متخلص بہ عاشق بھی شاعر تھے۔

"نوآئین ہندی" کے سبب تالیف سے علم ہوتا ہے کہ اسے مہر نے اپنے مربی سر کیلی کو اردو سکھانے کی غرض سے آذر شاہ دشمن رُخ کا قصہ سادہ اور آسان زبان میں پیش کیا۔

مہر کے کہے ہوئے ایک قطعہ کے آخری مصرعہ سے اس کا سال تصنیف برآمد ہوتا ہے ؎

سراپا اگر اس سہو و خطا ہے
تو صاحب دلوں سے امید عطا ہے
کہا مجھ سے ہاتف نے تاریخ اس کی
بیاں کر تو لے مہر قصے کو جلدی ؎

۱۲۱۸ھ

لیکن پروفیسر گیان چند جین نے ایک مطبوعہ ایڈیشن کی بنیاد پر اس کا سال تالیف ۱۲۰۳ھ/ ۸۹-۱۷۸۸ء قرار دیا ہے اور ثبوت میں یہ مادہ تاریخ پیش کیا ہے : "بیاں کر تو آہستہ قصہ کو جلوی" اس بنیاد پر ہم اسے اٹھارھویں صدی کی ہی داستان قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند لکھتے ہیں کہ اس داستان کا قدیم ترین فارسی نسخہ کلکتہ مدرسے میں قصۂ ابوالجواہر کے نام سے ملتا ہے جو ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا۔ دوسرا فارسی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں قصہ ملک محمود گیتی افروز کے نام سے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ایک فارسی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ ایک قدیم دکنی نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اسی قصے کو "شگوفۂ محبت" کے نام سے ۱۸۷۰ء میں لکھا۔

یہ ایک مختصر داستان ہے لیکن اس میں واقعہ نگاری پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔ نثر میں شعریت پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ اشعار سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن بعض اشعار پست اور غیر معیاری ہیں اس میں شک نہیں کہ اردو نثر نگاری کی سادہ بیانی کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج نے کلیدی رول ادا کیا لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ وہ اس کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔

نوآئین ہندی میں قصہ در قصہ تکنیک کو اپنایا گیا ہے۔ اس طرح پوری داستان ۲۵ حصوں پر مشتمل ہے۔ داستانیں عموماً اپنی معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں، نوآئین ہندی پر بھی ہم عصر تہذیبی جھلک نمایاں ہے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اودھ کے کسی حکمراں کے زمانے کی تصویر نہیں ہے :

"اندر جا کے جو دیکھا تو عجب نادر باغ ہے کہ جس کی رونق اور بہار کو بہشت بھی نہ پہونچ سکے اور تمام صحن میں یک لخت مخمل زربفتی فرش ہے اور چاروں طرف سنہری دیواروں پر موتی اور لعل اور یاقوت اور زمرد وغیرہ جواہر کی ایسی ایسی جڑاؤ تصویریں بنائی گئی ہیں کہ نقل کھینچنے میں نقاش چین کا چیں مان جائیں بلکہ مانی و بہزاد ہاتھ کھائیں اور باغ کے چاروں کونوں پر بلور کے تختوں پر لعل و زمرد کی صراحیاں رنگ برنگ کی شرابوں سے بھری ہوئی قطار بہ قطار رکھی ہیں اور ان کے پاس سونے کی چوکیوں پر یاقوت کے پیالوں اور ہیرے کے آبخوروں کی عجب بہار ہے۔" ؎

نوآئین ہند کا بھی اگرچہ فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوا لیکن اسلوب بیان سے ترجمہ پن کا اظہار کہیں نہیں ہوتا۔

(۳) جذب عشق

جذب عشق شاہ حسین حقیقت کی تالیف ہے۔ حقیقت کی تصانیف میں دیوان ریختہ، صنم کدۂ چین، تحفۃ العجم، خزینۃ الامثال، مثنوی ہشت گلزار، ہفت نسخہ، تذکرہ احبا اور جذب عشق بھی شامل ہیں۔ حقیقت حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہدا امام حسینؑ تک پہونچتا ہے۔ حقیقت کے والد سید عرب شاہ نے آنولہ بریلی میں حکیم میر محمد نواز کی دختر سے شادی کی۔ حقیقت کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے۔ حقیقت کی پیدائش ۷۲-۱۷۷۰ء میں بریلی میں ہوئی۔ بلخ کی مناسبت سے اکثر تذکرہ نگاروں نے انھیں بلخی بھی لکھا ہے۔ حقیقت تین بھائی تھے، بڑے بھائی محسن شاہ ضبط (پیدائش ۱۱۸۴ھ) اور چھوٹے بھائی کا نام سید قاسم شاہ تھا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں ان کے نانا نے انھیں بریلی سے کان پور بلوالیا۔ بعد کو وہ لکھنؤ آ گئے۔ حقیقت کا مختصر ذکر عیار الشعرا، تذکرہ گلشن بے خار، تذکرہ سراپا سخن اور مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" میں موجود ہے۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے ان کا سنہ وفات ۱۲۴۹ھ/ ۳۴-۱۸۳۳ء بتایا ہے۔

"جذب عشق" فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری تصانیف سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ مادۂ تاریخ "جذب عشق آہ" سے برآمد ہوتا ہے۔ حقیقت نے خود ہی اس کی وضاحت کی ہے :

حقیقت نے کی جو تاریخ کی فکر ۔۔۔ کروں خوبی کا اس کی تم سے کیا ذکر
کیا ہاتف نے اس معنی سے آگاہ ۔۔۔ حقیقت کو کہ ہے یہ "جذب عشق آہ"

۱۲۱۲ھ

حقیقت نے جس لکھنؤ میں قدم رکھا وہ لکھنؤ آصف الدولہ کا لکھنؤ تھا آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہوا اور یہ داستان بھی اسی دوران تکمیل ہوئی چنانچہ یہ داستان بھی دورِ اودھ سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نے اسے اردو کی پہلی طبع زاد کہانی سے تعبیر کیا ہے [1] لیکن پروفیسر لطیف حسین لکھتے ہیں کہ :

"حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ ضبط نے فارسی زبان میں ایک کہانی ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء میں لکھی تھی، حقیقت نے محمد حسن شاہ کے ارشاد کے مطابق اس کہانی کو ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اردو میں منتقل کیا۔ [2]

ضبط کی کوئی اور تصنیف باقی نہیں، ان کا صرف ایک ناول "نشتر" موجود ہے۔ یہ ناول بھی فارسی میں لکھا گیا ہے لیکن جذبِ عشق اور اس ناول کے پلاٹ مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی کوئی تصنیف قلمی صورت میں موجود ہو جس کی بنیاد پر حقیقت نے اسے اردو میں منتقل کیا۔

جذبِ عشق کا قصہ میر کی مثنوی دریائے عشق سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے حالاں کہ مصنف لکھتا ہے کہ یہ قصہ ۱۲۰۴ھ میں بندرابن کے قریب پیش آیا اور واقعہ سچا ہے۔ حقیقت نے شعوری طور پر اس داستان میں فوق الفطرت عناصر سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اختیار کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ان داستانوں پر فارسی کے مرصع اسلوب کا اثر زیادہ ہے۔ خصوصاً تحسین کی نوطرزِ مرصع، ہرچند کھتری نے اس اسلوب سے سب سے پہلے بغاوت کی اور سلیس و روزمرہ کا نمونہ پیش کیا حقیقت کی داستان میں رنگین و سلیس دونوں اسلوب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

اگرچہ یہ داستانیں تعداد کے لحاظ سے بہت قلیل ہیں لیکن ہم عصر زندگی کا آئینہ دار ہیں۔ ان میں عظمت رفتہ کے بعض شعبوں کے تابناک مرقعے موجود ہیں جس سے ہم اودھ کی تہذیب و معاشرت کا شعور آسانی سے کر سکتے ہیں۔ قدیم اردو ادب کا زیادہ تر حصہ امراء کی سرپرستی ہی میں پروان چڑھا اور داستانیں بھی انھیں کے ایما پر لکھی گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان داستانوں سے اودھ اور خاص کر لکھنؤ کی تہذیب کی پوری تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔

□□

حواشی

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اپنی تاریخ ادب اردو جلد دوم میں ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

۲۔ بحوالہ مقدمہ نوآئینِ ہندی، ڈاکٹر سیلمان حسین۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۰ء صـ ۱۳

۳۔ نوآئینِ ہندی صـ ۹۳

۴۔ جذبِ عشق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالرؤف۔ پیش لفظ پروفیسر محمود الحسن صـ ۳۰ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۹۳ء

۵۔ شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان: مشرف احمد۔ ادارہ ادبیات پاکستان کراچی، ۱۹۷۷ء صـ ۹۲

اُردو اَدب کی تنقیدی تاریخ

"اردو ادب کے ارتقاء کے تاریخی پس منظر میں دہلی کے زوال اور اودھ کے عروج کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اردو کے کچھ مورخوں اور ناقدوں نے بہار و خزاں کی اس تصویر میں ایسا رنگ بھرا ہے جیسے کسی معجزے سے اردو شاعری کا روپ ایسا بدل دیا گیا جو دلی میں تھا وہ اودھ میں جان بوجھ کر مٹایا گیا اور ایسی تبدیلیاں کی گئیں جو ایک کو دوسرے سے بالکل الگ کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر زبان کے استعمال، لب و لہجہ کے تغیر، اسلوب کے بعض عناصر اور بعض اصناف کی ترقی کو نظر انداز کرکے دیکھا جائے تو ہندستان کے سماجی نظام میں یہ کوئی بڑا تغیر نہ تھا۔ پھر بھی ادبی اور علمی نقطۂ نظر سے لسانی اور ادبی روایات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں تہذیب کے وسیع ہوتے ہوئے دائرے میں رکھ کر دیکھنا مفید ہوگا۔

پروفیسر سید احتشام حسین

پروفیسر مجاور حسین رضوی

اودھ میں ادبی صنّاعی

صنّاعی تخلیقی ہنر ہے. تخلیق کے تین مدارج ہیں:

(۱) تخلیق محض (۲) ایجاد یا انوکھاپن یعنی بدیع

(۳) بیان اور اس کا حُسن

یہی حسُن، ایجاد و انوکھے پن سے مل کر توازن اور تناسب و فن پیدا کرتا ہے جسے صنّاعی کہا جاتا ہے.

اگر کائنات کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا، کہ خداوند عالم خالق بھی ہے، بدیع السماوات والارض بھی ہے اور صانع مطلق بھی ہے. اس کی صنّاعی کا ایک کرشمہ وہ ہے جسے حسُن کا نام دیا جاتا ہے.

ادبی تخلیق میں بھی جو حسُن ہوتا ہے وہ صنّاعی کا رہین منت ہوتا ہے. صنّاعی میں بیان کی وہ نزاکتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں تشبیہ، مجاز استعارہ اور کنایہ کہتے ہیں اور الفاظ کا وہ آہنگ بھی ہوتا ہے جو نجم الغنیٰ کے مطابق "کلام میں ایسی خوبی پیدا کرتا ہے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور دل میں اثر کر جائے." لے یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ الفاظ کے وجود اور پیکر کا احساس قوتِ حاسّہ ہر طرح کرتی ہے ہم بولتے ہیں تو ساخت کو محسوس کرتے ہیں، کبھی کبھی تو اس کا ذائقہ بھی چکھنا پڑتا ہے. سنتے ہیں تو ناگواری اور خوش گواری کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے. دیکھتے ہیں تو کمر خمیدہ دال (د) یا چیں بر جبیں تشدید (ّ) یا خوبصورت بالوں کی چوٹی والی میم (م) یا زلفوں والا لام (ل) ان سب کی شکلیں بھی ایک دوسرے سے مل کر مخصوص صوری پیکر تیار کرتے ہیں.

ادب انسانی احساسات کا وہ دُھندلکا ہے جہاں الفاظ سے معنی روشنی میں آجاتے ہیں. یہ عمل فن کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ فنکاری حسُن پیدا کرتی ہے اور انھیں محاسن سے صنّاعی وجود میں آتی ہے.

ادبی تخلیق میں سب سے اہم الفاظ ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ الفاظ ہوتے ہیں حالاں کہ ابنِ قتیبہ نے چار صورتیں بتائی ہیں، لفظ و معنی اچھے ہوں، لفظ اچھے ہوں، معنی اچھے نہ ہوں. معنی اچھے ہوں لفظ اچھے نہ ہوں، لفظ و معنی دونوں اچھے نہ ہوں. لیکن اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ کے نزدیک لفظ الگ کوئی چیز ہے اور معنی الگ کوئی شے ہے. ایسا نہیں ہے. دراصل لفظ کا استعمال ہی معنی کی تخلیق کرتا ہے اور یہی لفظ اپنی ترتیب سے جہانِ معنی آباد کرتے ہیں.

جس کے پاس جتنے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی معلومات زیادہ ہوتی ہیں اور کسی حد تک علم بھی زیادہ ہوتا ہے. اگر غور کیا جائے تو لفظ ہی سب کچھ ہیں.

"کُن"، لفظ ہی تھا جس سے یہ دُنیا وجود میں آئی. اس سے زیادہ لفظ کی اور کیا اہمیت بیان کی جاسکتی ہے. انھیں لفظوں کے استعمال سے محاسن اور استقام پیدا ہوتے ہیں اور انھیں محاسن کو صنّاعی کا ایک رخ سمجھا جاتا ہے ورنہ صنّاعی میں تو سب کچھ شامل ہے. علم بیان بھی، علم بدیع بھی، عروض بھی اور جتنے اسالیب یا طرزِ ادا ممکن ہیں وہ سب بھی. اس لیے یہاں جب صنّاعی یا صنعت کا لفظ استعمال کیا جارہا ہے تو اس کا مفہوم ہے وہ محاسن جو لفظ کے استعمال سے کلام کے ظاہر و باطن میں پیدا ہوتے ہیں.

ادب کا وہ رُخ جہاں محاسن کی تلاش ہونا چاہیے یعنی دراصل

کڑھے ہوئے علم اور کلاسیکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق کا مطالبہ کرتا تھا۔ ان دونوں کے لیے جگر سوزی کی بھی ضرورت تھی اور ایک خاص طرح کی لطافتِ ذہنی کی بھی۔ اگرچہ ہمارے اکثر بزرگ صنائع سے خوش نہیں تھے۔ امداد امام اثر نے اسے "ڈھکوسلا" کہا ہے۔ شبلی جیسے متوازن ذہن رکھنے والے نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"انیس جس شاعری کو زندہ رکھنا چاہتے تھے اس کے چہرے پر صنائع اور بدائع کے داغ ہیں۔"

ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "صنائع بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہے۔" مسعود حسن رضوی ادیب نے انیسیات میں نہایت عالمانہ انداز میں انیس کے کلام میں محاسن شاعری کی تلاش کی۔ لیکن یہ بھی لکھ گئے کہ:

"صنعتوں کا استعمال بذاتِ خود شاعری نہیں ہے.... کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا استعمال بذاتِ خود ایک مشکل صنعت ہے..... ان صنعتوں کے استعمال کا ملکہ اور چیز ہے اور شاعری اور چیز ہے۔ جو صنّاع ان صنعتوں میں کمال رکھتا ہے وہ شاعر نہیں بلکہ ایک طرح کا بازی گر اور شعبدہ باز ہے۔"

اس سلسلے میں حالی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ کھانے کی مثال سے بات سمجھاتے ہیں:

"مفید ہو، لذیذ ہو، جزوِ بدن ہونے کے لائق ہو۔ بو باس، رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بہتر ہے۔"

ہمارے بزرگوں کے لئے ساری مشکل یہی تھی کہ وہ صنائع کو چینی کا باسن یا نفسِ شاعری سے الگ کوئی چیز سمجھتے تھے۔ لوگوں کے خیال میں صنائع کی مثال زیور کی سی تھی، جسے کہیں سے لاکر عروسِ شعر کو پہنا دیا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ صنعتیں کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی تھیں، الفاظ کی نشست، ان کے دروبست سے پیدا ہوتی تھیں۔ یہ دراصل کھانے کا ملک، بوباس اور کسی حد تک ذائقہ تھا۔ چینی کا باسن تو وہ ہیئت تھی جس ہیئت میں تخلیق پیش کی جاتی تھی۔

دراصل صنعت خود الفاظ کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ لفظ کا استعمال بہت سارے امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ عام آدمی جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو بات وہیں ختم ہوجاتی ہے، سارے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ بہت سارے امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

قواعد اور صنائع میں یہی فرق ہے۔ قواعد یہ تو بتادے گی کہ یہ لفظ اسم ہے، صفت ہے، فعل ہے۔ باہمی الفاظ یا حروف میں کیا رشتہ ہے۔ مضاف مضاف الیہ، جار مجرور، صفت موصوف وغیرہ۔ لیکن صنائع یہ بتاتی ہے کہ لفظ میں کتنی گہرائی ہے۔ اس میں کہاں تک وسعت ہے وہ دوسرے لفظ کے ساتھ کس حد تک نبھا سکتا ہے۔ "پوشش چھینٹ کی گل کاری تو اچھی لگی مگر پوشش کھدّر بہت گاڑھا معلوم ہوا۔"

بالکل انسانوں کی طرح لفظ بھی ایک دوسرے سے مل کر رہتے ہیں، اور جب ان کی دوسرے لفظ سے نہیں نبھتی تو "زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے" جیسے مصرعے وجود میں آتے ہیں۔ الفاظ میں ایک دوسرے کے ساتھ تصادم اور تعاون ہوتا رہتا ہے اور ان کی ترتیب میں جب کسی طرح کا حسن آجاتا ہے تو کبھی معنی چمک اُٹھتے ہیں اور کبھی انھیں کا باہمی میل ملاپ مکمل تخلیق کو چمکا دیتا ہے۔

ان محاسن کی طرف ۲۷۴ھ میں عبداللہ بن معتز عباسی نے توجہ دی۔ اس نے سترہ محاسن شمار کیے۔ ابونصر علی بن احمد طوسی نے بھی اس موضوع کی طرف متوجہ کیا۔ مولوی شمس الدین کی "حدائق البلاغت" اس سلسلے میں اہم کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن اُردو میں کہا جاتا ہے کہ خوب محمد چشتی نے "بھاو بھید" علم بدیع پر کتاب لکھی۔ منشی رنچھور داس جون پوری نے ۱۱۳۵ھ میں "حقائق الانشاء" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں نثر میں صنائع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے موتی بکھیرے ہیں۔ انھوں نے کل ایک سو گیارہ یعنی ستاون صنائع لفظی اور چون صنائع معنوی پر روشنی ڈالی ہے۔

عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی

مقالے میں تین صنعتوں کا اضافہ کیا۔ عزیزی ڈاکٹر محبوب عالم انصاری نے مزید تین صنعتیں دریافت کیں۔ اس طرح ان کی تعداد ایک سو ستره[11] ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ چھپن[12] کے بعد سے نقد ادب میں محاسن کی تلاش بے سود سمجھی گئی۔ شعر میں سماج اور عوام، بل بیل، بل بجھی وغیرہ وغیرہ تلاش کیے جانے لگے۔ ادبی معیاروں پر ادب کی تفہیم زیاں کاری اور سود فراموشی کی علامت سمجھی گئی۔ اسلوبیاتی تنقید یا ساختیاتی تنقید نے تعبیر تشریح تجزیہ اور تفہیم میں محاسن کی تلاش فعل عبث بنا دی کبھی کبھی بعض مدرسین امتحان کے پرچوں میں گلزار نسیم یا مزاد تبیر پر سوال کرتے ہوئے یہ ایک فقرہ بڑھا دیتے ہیں کہ محاسن شعری پر روشنی ڈالیے۔ حالاں کہ اُردو کے مزاج سے یہ محاسن ہم آہنگ تھے۔ اُردو کی وراثت ہندستانی تھی۔ عربی اور فارسی سے اگر نخلستان کی شادابی ملی تھی تو سنسکرت سے ہمالیائی سربلندی بھی عطا ہوئی تھی محترم علی جواد زیدی[13] نے بڑے خوبصورت انداز میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تجنیسات میں کوئی سنسکرت شعراء سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے وقیع مقالے میں عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کے ساتھ تلگو میں بھی صناعی پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تلگو میں ایکاکشری ایک صنعت ہے جس میں ایک ہی حرف کا استعمال کرتے ہوئے پوری نظم کی تشکیل کی جاتی ہے اس طرح یہ صنعت گری ہندستانی ہے اور ہندستان میں تو ہر ورق سے صنعت ترصیع آشکار ہے اور بالخصوص اُردو میں اگر دکنی پر نظر ڈالی جائے تو فخر دین نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر غواصی تک وہ سارے محاسن تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کے لیے اودھ کی شاعری کو زیادہ "بدنام" کیا گیا۔ نثر میں 'سب رس' کے تمثیلی اسلوب میں جب محاسن کی تلاش کی جائے گی تو تجنیس کی بیشتر اقسام کے ساتھ اس کی مقفیٰ عبارت میں قافیہ معمولہ تک مل جائے گا اور اشتقاق، تاکید المدح، کلام جامع جیسی صنعتیں بھی تلاش کرنے پر مل جائیں گی۔ مراعاۃ النظیر اور حسن تعلیل تو عام بات ہے۔

یہی وراثت دہلی سے گزرتی ہوئی اودھ میں آئی اور بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجسم و شجر جو دکن سے دہلی تک آئے تھے اودھ میں آکر سجدہ ریز نظر آئے اور یہاں کے آفتاب و مہتاب نے اس صناعی کو تابندہ و درخشندہ بنا دیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اودھ کی فضا، نفیس طبیعتیں، مزاج کی لطافت ان محاسن کو برتنے کیلئے بے حد موزوں بھی تھی اسی لیے یہ صناعی انیسویں صدی ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی اور دورِ حاضر میں بھی موجود ہے اور یہ وہ ادبی اور تہذیبی میراث ہے جس کے بارِ امانت کو سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام انشا[14] کا لیا جانا چاہیے جنہوں نے صنعت مقلوب کے نادر نمونے پیش کیے اور ایک شعر میں نہیں کئی اشعار میں۔ صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

فقط اس لفافے پہ ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹ

یہاں ایسی صنعتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو نسبتاً کم معروف ہیں مثلاً میر تقی میر کی محبوب صنعت ایہام یا سودا اور غالب کی نظر کردہ حسن تعلیل اور مراعاۃ النظیر (جو لکھنؤ کے انیسویں صدی کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں پائی جائے گی) سے صرفِ نظر کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ اودھ کے شعرا نے جس بے تکلفی اور جس حسن کے ساتھ ایک ایک شعر میں کئی محاسن جمع کیے اور جو صنعتیں نسبتاً کم معروف ہیں انھیں پیش کیا جائے

ناسخ کی اصلاح زبان کی کوششوں نے لفظ کے نکھار اور مرکبات کو حسین سے حسین تر بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ فراغت اور خوش حالی کا دور ہی زندگی کے ان گوشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جہاں حسن کاری ہوتی ہے۔ حسن کاری ہی کا ایک نام صناعی تھا۔ اسی لیے اودھ میں صناعی کی روایت نسبتاً ہر جگہ سے زیادہ ارتقا پذیر رہی۔ ناسخ کہتے ہیں ؎

وہ آفتاب نہ ہو کس طرح سے بے سایہ
ہوا نہ سر سے کبھی سایۂ سحاب جدا

اس میں جہاں مراعاۃ النظیر ہے وہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی ایک بات کبھی جو دعوے کے طور پر ہے اور پھر اس کے لئے دلیل لائے۔ آفتاب اس لیے بے سایہ ہے کہ سحاب ہمیشہ سایہ فگن رہتا ہے تو آفتاب پر کیسے سایہ ڈالے۔

انیس و دبیر سے پہلے دوسرے مرثیہ نگاروں خصوصاً ضمیر کے یہاں صناعی کا حسن ہے ؎

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

میں شالیہ، الف و نشر وغیرہ بھی دیگر صنعتوں کے ساتھ ملتی ہیں لیکن صنعتوں کے خدو سخن اور خدائے سخن اور خالق بنائے سخن انیس و دبیر ہیں۔

دبیر نے شاعری میں صناعی کو اس منزل تک پہنچا دیا جس کے آگے سوچتے ہوئے تخیل کے پر جلتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دبیر کے کلام سے معروف صنعتوں کی مثالیں نہیں پیش کی جا رہی ہیں جیسے ایہام، رعایت لفظی، صنعت مراعاۃ النظیر حُسنِ تعلیل وغیرہ بلکہ صرف ان صنعتوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن کی طرف نسبتاً ذہن نہیں جاتا حالاں کہ روزانہ کی بات چیت میں ان میں سے اکثر صنعتیں شرفا اور اہلِ علم کے کلام میں خود بخود آجاتی ہیں۔ مثلاً صنعتِ عکس [12] اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دو لفظ لائیں پھر ان کو اُلٹ پلٹ دیں۔ اس صنعت کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ براہِ راست قرآن حکیم سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ،

اب مرزا صاحب نے اپنے اسلوب میں اس سے جو فیض اُٹھایا ہے وہ دیکھیے [13]

انصاف کہاں ہے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں ہے ہو کہ انصاف نہیں ہے

میر انیس [14] کا بھی انداز دیکھ لیجیے ؎

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

اس سلسلے میں اسی سے ملتی جلتی صنعت صنعت مقلوب ہے یعنی مصرع کو اگر اُلٹ دیں تو وہی مصرع بنے۔ مرزا صاحب کے یہاں کئی بند ایسے مل جائیں گے جن میں یہ صنعت موجود ہے۔ ایک بند کی بیت ملاحظہ ہو:

آقائے امم عرشِ معلیٰ کا شرف ہے
یہ فرشِ باآداب ایک آقا کا شرف ہے [15]

دوسرا مصرع اگر اُلٹ دیا جائے تو بھی یہی مصرع بنے گا یعنی اب اگر اس کے حروف کی ترتیب بائیں جانب سے شروع کی جائے تو یہی مصرع برقرار رہے گا۔

میر انیس نے مقلوب سے ملتی جلتی صنعت کا نمونہ تجنیس قلب میں پیش کیا ہے ؎

زُفر زدال اُدھر سے دم جست و خیز تھا
اُلٹا پھرا اِدھر سے تو رف رف سے تیز تھا

انیس نے اشارہ بھی کر دیا ہے کہ زفر کو اگر اُلٹ دیکھیے تو رف رف بن جائے گا اور رف رف کو اُلٹا تو بھی زفر۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت جمع، تفریق، اور تقسیم کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ صنعت جمع کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک یا چند چیزیں ایک حکم میں جمع کر دی جائیں۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

المال والبنون زينة الحيوة الدنيا

یعنی مال و اولاد زندگانیِ دُنیا کی زینت ہیں۔ مال و اولاد کو ایک حکم زینت میں جمع کر دیا ہے۔ اب مرزا صاحب کا استفادہ ملاحظہ ہو [19]

نقاش، نقش، کاتب و خط، بانی و بنا
بود و نبود، ذات و صفت، ہستی و فنا
آدم، ملک، زمین، فلک، گرد کیمیا
دُنیا و دیں، حدوث و قدم، بندہ و خدا
سب شاہدِ کمالِ شہ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسین ہیں

اس بند میں صرف صنعتِ جمع ہی نہیں ہے صنعتِ تضاد بھی ہے۔ تجنیس بھی ہے، اشتقاق بھی ہے اور مراعاۃ النظیر بھی ہے۔

ثابت لکھتے ہیں کہ اس کمال کو دیکھیے کہ ہر مصرع میں چھ چیزیں لائے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی صنعت تنسیق الصفات ہے یعنی کئی صفات ایک ساتھ مذکور ہوں، انیس کہتے ہیں ؎

احسان بھی، حیا بھی، مروت بھی، قہر بھی
خود موت بھی، حیات بھی، امرت بھی، زہر بھی

مزیادہ نکتہ سنج بھی، دانائے دہر بھی
تسنیم بھی، بہشت بھی، کوثر کی نہر بھی

سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد میں ید بیضا بیاض میں

صنعت تفریق[17] میں دو امر بظاہر ایک طرح کے ہوں لیکن ان کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح کر دیا جائے۔ دبیر کہتے ہیں ؎

آئینے کے آئین پہ میں نے جو کیا غور | منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور | ہر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور

جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے

صنعت تقسیم[18] بھی ایک صنعت ہے اس میں اور لف و نشر میں باریک سا فرق ہے کہ لف و نشر میں اول چند چیزیں بیان کرتے ہیں پھر ان کے منسوبات لاتے ہیں تقسیم میں چند چیزیں یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کیے جاتے ہیں پھر ہر چیز یا ہر چیز کے منسوب کو واضح کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

تابوت اٹھانے کی جزا، قبر کی راحت | دلدل کو بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی حکومت | دولت ہے سبب تعزیہ داری کی بدولت

عابد کے لئے طوق پہنتے ہیں تو کیا ہے
وہ طوق نہیں، دائرہ حفظ خدا ہے

اس میں صنعت تقسیم ہی نہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی جزا کو دلیل بنایا ہے مراعاۃ النظیر و رعایت لفظی کے ساتھ دولت بدولت میں تجنیس زاید بھی ہے۔ مسعود صاحب نے میر انیس کے یہاں تینوں صنعتوں کی مثال ایک شعر میں دی ہے یعنی جمع، تقسیم اور تفریق کے بارے میں ؎

نکلا ادھر سے وہ جو اجل کا شکار تھا
پیدل ہوا سوار یہ ڈونھا وہ چار تھا

ان صنعتوں کے علاوہ میر صاحب کے یہاں دوسرے مصرع میں سیاقۃ الاعداد بھی ہے۔

ایک اور صنعت مرزا صاحب کے یہاں ملتی ہے جس کو استتباع[19] کہتے ہیں یعنی اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت | بس ان کی زباں سے جو ہوا جس کو حاجت
گردوں نے بلندی لی زمیں نے زر و دولت | یوسفؑ نے لیا حسن سلیمانؑ نے حشمت

پر ان کی قناعت ہے فزوں حد بیاں سے
جز نام خدا آپ لیا کچھ نہ زباں سے

یہاں آخری مصرع میں ابتدائی مصرعوں کی مدح سے مدح نکالی ہے کہ کائنات نے ہر شے آپ سے لی اور آپ نے سوائے ذکر خدا کچھ نہ لیا۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت رجوع کا بھی بڑا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ یہ صنعت جب کئی بندوں میں مسلسل آتی ہے تو نئی صنعت بن جاتی ہے جسے مثالیہ کہتے ہیں۔ یہاں صرف صنعت رجوع کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثالیہ کی گنجائش نہیں ہے ؎

تاروں کا ہے دعویٰ کہ یہ رخ برج ہے
پر بدر ہے منکر، یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذروں کا اشارہ ہے، یہ شمس ضحیٰ ہے
خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے

پروانہ و بلبل میں عجب بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

مرزا صاحب کے یہاں بہت ساری صنعتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف چند کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔ جن کی طرف توقی بلگرامی نے بھی متوجہ کیا ہے۔ صنعت تجرید کی مثال ملاحظہ ہو۔ گھوڑے کا تذکرہ ہے۔ یہ صنعت مبالغہ مقبول میں بھی آتی ہے اس لیے کہ گھوڑے کے افعال کو جن صفات سے استعارہ کیا ہے وہ سب ممکن ہیں ؎

لڑنے میں یہ ہے عقل، بگڑنے میں جہالت
بڑھنے میں یہ ہے حرص، تو گھٹنے میں قناعت
جانے میں حواس، آنے میں عاشق کی طبیعت
مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت

ہر سو جو نسیم اس کے طرارے کی بہی ہے
سبزے کی طرح دل کی زمیں کھیت رہی ہے

جہالت میں ہی آدمی بگڑتا ہے۔ حواس جاتے ہیں۔ عاشق کی طبیعت کی

محبوب پر آتی ہے وغیرہ۔

نوق نے بہت سی صنعتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں قافیہ معمولہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر لفظ کے ایک جزو کو قافیہ اور دوسرے جزو کو ردیف میں شامل کریں یعنی ایک ہی کلمہ میں ردیف و قافیہ پیدا کریں تو اس کو قافیہ معمولہ کہتے ہیں۔ مثال دہی ہے ؎

کیا ہاتھ ہے کیا سینہ ہے کیا چہرہ ہے کیا سر
اے صلِّ علی نور کا مجمع ہے سراسر

موصوف نے صنعتِ ترصیع کو صنعتِ موازنہ کہا ہے۔ اسی طرح مراعاۃ النظیر کی ایک قسم ایہام تناسب قرار دی ہے لکھتے ہیں کہ اس کی پرلطف قسم وہ ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں۔ مثلاً دو معنی جمع کریں جن کو آپس میں کچھ مناسبت نہ ہو مگر ان معنوں کو جن دو لفظ سے تعبیر کریں ان میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنی دوئم جو غیر مقصود ہوں ان کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو۔ مثلاً ؎

بارش تھی آب تیغ کی برسات سے فزوں
بدلی تھی نوج شام کی رنگت گھٹا تھا خوں

یہاں بدلی کو بارش سے اور گھٹا کو برسات سے مناسبت ہے لیکن معنی دوئم مقصود نہیں ہے بدلی کے معنی بدلنا ہے۔

مرزا صاحب کے یہاں کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں مل سکا۔ بحر الفصاحت میں تو اس کا امکان ہی نہیں تھا حیات دبیر اور المیزان میں بھی ان صنعتوں کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ مثلاً ایک مرثیہ ہے جس میں ہند قید خانۂ شام میں آتی ہے اور اسے کنیزیں بتاتی ہیں کہ قید خانہ میں ایک یوسف ہے۔ مرزا صاحب نے یوسفؑ کا تلازمہ آخر تک برقرار رکھا ہے اور اس طرح سے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت سید سجاد کے موازنے میں مصائب کے رخ سے حضرت سید سجاد کی برتری ظاہر کی ہے۔ کچھ مصرعے درج کیے جاتے ہیں

یوسف جسے میں کہتی تھی وہ ہے یہی دارکی
یوسف مجھے کس واسطے تو کہتی ہے ہر بار
آداب بجا لاتی ہوں اے یوسف ذی جاں
اس عہد کے یوسف ہو تمھیں خلقِ خدا میں

فرمایا یہ درجہ تو ہے یوسف سے فراواں
گھر سے گئے یوسف تو ہوئے مصر کے سلطاں
یوسف نے زمانے میں یہ محشر نہیں دیکھا
یوسف کا فقط باپ کی فرقت میں کڑھا دل

ہو سکتا ہے اسے صنعتِ لزوم یا صنعتِ التزام کہا جائے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ ایک بند یا دو بند کے لیے ہے۔ یہاں تشابہ الاطراف ہے اور تلمیح کو نبھایا ہے، حسن یہ پیدا کیا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت سید سجاد دونوں کی علامتوں کو ایک طرح سے روایت بنا دیا گیا ہے۔ اس بے مثالی صناعی کی نزاکت نام کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔

اسی طرح ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سر دربار   دربار میں دُر بار علی ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھر بار   عارض ہے قمر بار لب لعل گہر بار
یہ والیِ اقلیم ولایت کا ولی ہے
تصویر تولائے حسینؑ ابن علی ہے

یہاں لفظ 'بار' چھ مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ کہیں دوسرے لفظ کے ساتھ کبھی تنہا نئے معنی دیتا ہے ایک ہی لفظ کے کثیر الجہت استعمال کو اگر صنعت نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے اور پھر اس صنعت کا کیا نام رکھا جائے۔

یہ کہنا پڑتا ہے کہ میر انیس نے اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، کہتے ہیں ؎

دولت حاکم دوں پر ہے مدار دار و مدار   دارِ دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیں دار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار   بخت خفتہ ہیں تمہارے اور مرے طالع بیدار
کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبیٰ کا مرے فرق پہ سایہ ہوگا

نُو بار انیس نے لفظ 'دار' کا استعمال کیا ہے اور ہر بار یہ لفظ ایک نئے معنی دیتا ہے۔ مسعود صاحب نے بھی "انیسیات" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ اس صنعت کا کیا نام ہوگا۔ حالاں کہ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انیس کے کلام میں ان صنعتوں کی طرف متوجہ کیا ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لکھتے ہیں انیس نے ایسی صنعتیں ایجاد کر دی ہیں جن کا نام ابھی تک مقرر نہیں ہو سکا۔ مسعود صاحب نے ایسے مصرعوں کی

فہرست دی ہے۔

(۱) الجھاتے تھے کمند کمینے کمان میں

(۲) بیکار کمیں میں ہیں کمینوں کی کمانیں

(۳) گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

(۴) دہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے

(۵) تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا

پہلے مصرع میں تجنیس لاحق اور دوسرے میں تضمین المزدوج کہا گیا ہے لیکن مسعود صاحب نے تفصیل سے یہ بتایا کہ دونوں میں یہ صنعت نہیں ہے

اسی طرح صنعتِ التزام بالزوم کے تحت انھوں نے دو بند لکھے ہیں [۲۲]

اعدا کے حق میں ہو گیا آبِ حسام سم ۔۔۔ کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم [۲۳]
نیزے تھے خوفِ صعوتِ چوبِ خام خم ۔۔۔ ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے وہ بیکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

رکھتا نہیں کوئی یہ غریب الدیار یار ۔۔۔ شمشیر شعلہ بار پڑے سر پہ بار بار
تیروں کی تن پہ دُور سے ہوشیار مار ۔۔۔ نیزے اٹھا اٹھا کے کریں سب سوار وار
آگے سے تیغ و خنجر و تیر و سناں چلے
پیچھے سے فرقِ پاک پہ گُرزِ گراں چلے

اس میں صنعت لزوم کا حُسن بھی ہے شبہ اشتقاق [۲۴] سام سم، رام رم، خام خم، کام کم کے ساتھ صنعت ذو قافیتین بھی۔ دوسرے بند میں ان دونوں صنعتوں کے ساتھ صنعت تکریر بھی ہے اور بے شمار صنعتیں دونوں بندوں میں ہیں۔

ایک ہی بند اگر کئی صنعت رکھتا ہو تو اس صنعت کا کیا نام ہوگا جس کے ذیل میں ساری صنعتیں آتی ہیں؛

ع: عین اس کا ہے وہ چشمہ کہ فیض اس کا ہوا عام
یہ علم کا آغاز ہے اور شرح کا انجام
ب، ا: بے سے ہے برکت اور الف اول اسلام
س: ہے سین سعادت کہ اسی نام کا اتمام
عباس
یہ اسم مقدس تو سعید ازلی ہے
اعلیٰ نہ ہو کیونکر کہ شریک اس کے علی ہے

تیلگو ادب میں ایکا کشری اس سے کچھ ملتی جلتی صنعت ہے لیکن اردو میں اس صنعت کا کوئی نام ابھی تک راقم کو نہیں مل سکا۔ انیس کی خوش گوار تقلید کرتے ہوئے نسیم امروہوی نے اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ سورہ مریم اسی تکنیک میں لکھا ہے۔ انیس کا کمالِ فن یہی ہے کہ وہ ایک ہی بند میں بیک وقت کئی صنعتیں استعمال کرتے ہیں اور یہ اتفاق نہیں بلکہ شعوری طور پر یہ محاسن ان کے یہاں جلوہ گر ہیں۔ ان کا نظریہ ہے ؎

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی

سامعین اسے جلد سمجھ لیتے تھے کہ نہیں کہ کون سی صنعت ہے لیکن سامعین کو یہ اندازہ یقیناً ہو جاتا رہا ہوگا کہ شعر میں یا بند میں کوئی حسن ضرور ہے جو قلب و ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ انیس ان صنعتوں کے ساتھ تجنیس میں اپنا کوئی مقابل نہیں رکھتے تھے۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ وہ کہیں کہیں مرزا دبیر سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ کچھ مثالیں ہیں جو پیش کی جارہی ہیں:

تجنیس [۲۵] تام: خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

تجنیس تام اسے کہتے ہیں جس میں دو لفظ ہر لحاظ سے ایک ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں۔ پر ہر لحاظ سے ایک ہے مگر معنی کے اعتبار سے مختلف ہے۔

تجنیس [۲۶] لاحق میں پہلا حرف تبدیل ہوتا ہے اور اگر پہلا حرف زائد ہو تو اسے تجنیس زائد کہتے ہیں مثلاً ع

صاحب ہو تو ایسا ہو مصاحب ہو تو ایسا

صنعت تضمین [۲۷] المزدوج کی تعریف یہ ہے کہ رعایتِ قوافی کے بعد اثنائے کلام میں دو ایسے لفظ جمع کیے جائیں جو وزن اور روی میں موافق ہوں مثلاً ؎

ابرِ کرم، خدیوِ عجم، خسروِ عرب ۔۔۔ عالی ہمم، امامِ اُمم، شاہِ تشنہ لب

اس میں ترصیع بھی ہے۔

انیس کے یہاں ایسی صنعتیں بھی ملتی ہیں جو بظاہر بہت مشکل ہیں لیکن انیس انھیں اتنی بے تکلفی سے نظم کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے جیسے صنعت مبادلۃ الراسین [۲۸] یعنی دو لفظوں میں حرف اول باہم تبدیل ہو جیسے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے

انیس کے یہاں صنعتِ اطراد کی لاجواب مثالیں ہیں یعنی جس شخص کی مدح کرنی ہو اس کے آباد اجداد کا نام آجائے۔ انیس کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں صنعت اطراد کی نشان دہی کی جا رہی ہے ؎

عباسِ نامور بھی عجب سج کا ہے جواں
نازاں ہے جس کے دوش منور پہ خود نشاں
حمزہ کا رعب صولتِ جعفر علی کی شاں
ہاشم کا دل حسینؑ کا بازو حسنؑ کی جاں
کیونکر نہ عشق ہو شہِ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

صنعتِ ادماج: یہ وہ صنعت ہے جس میں پورا مصرع دو معنی دیتا ہے۔ انیس کے ان چار مصرعوں کے چوتھے مصرع میں صنعت ادماج ہے۔ حضرت حبیب ابن مظاہر جو بہت ضعیف تھے ان کیلئے لکھتے ہیں ؎

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم — گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارہ بصد حشم — یعنی جہاں سے جائیں گے سیدھے جناں میں ہم

یہاں دو معنی ہیں ایک یہ کہ جنت میں بغیر کسی رکاوٹ کے جائیں گے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب جنت میں جائیں گے تو کمر خمیدہ نہ ہوگی بلکہ سیدھی ہوگی۔

صنعت تصلیف: جس طرح انیس و دبیر اور دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں ہے شاید ہی کسی کے یہاں ہو اس کا مطلب ہے شاعرانہ تعلی — انیس کہتے ہیں ؎

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کان جواہر — ہنگامِ سخن کھلتی ہے دکان جواہر
ہر بند مرصع تو ورق خوانِ جواہر — دیکھے اسے ہاں ہے کوئی خواہانِ جواہر
بینائے رقومات ہنر چاہیئے اس کو
سودا ہے جواہر کا، نظر چاہیئے اس کو

انیس کے فنی سمندر کی یہ کچھ لہریں ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کچھ بعض دل چسپ پہلو بھی ہیں۔ مثلاً ؎

پیش آجاتا تھا گر کوئی زبردست دلیر
دونوں تشدید شجاعت سے ایسے کرتے تھے زیر

قواعد کا تلازمہ ہے زیر، زبر، پیش، تشدید۔ یہاں چاروں موجود ہیں۔

انیس کہیں کہیں صنعت کو اس طرح استعمال کرتے ہیں اور اس کی طرف ایسا اشارہ کرتے ہیں کہ بالغ ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوے

بھائی کو خوش فکر و خوش لہجہ و پاکیزہ خیال — جن کا سینہ گہر علم سے ہے مالامال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال — معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا ہے یہ رحمتِ یزدانی ہے

اس کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ سحر حلال ایک صنعت ہے اور اس بند میں یہ صنعت موجود ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک لفظ یا زیادہ لفظ جو بظاہر کلمات سابقہ کا تتمہ ہو اور کلمات آئندہ کے مقدمات میں شمار ہو سکے چنانچہ اس بند میں لفظ کمال تتمہ ہے اور آئندہ کا مقدمہ ہے۔

انیس و دبیر کے یہاں جتنی صنعتیں انسانی ذہن سوچ سکتا ہے وہ سب ہیں۔ انھوں نے جو روایت سازی کی وہ ان کے بعد کے شعرا اور دور حاضر کے شعراء کے یہاں ملتی ہے اس لیے بہت صنعتوں کا تذکرہ جو دوسروں کے یہاں کیا گیا ہے وہ سب انیس کے یہاں ہیں لیکن دو صنعتوں کا ذکر انیس کے یہاں ضروری ہے ان میں سے ایک صنعت مکالمہ ہے۔ علم بدیع کے ماہرین نے صنعت سوال و جواب تو لکھی لیکن عام طور سے یہ صنعت صرف ایک شعر میں پائی جاتی ہے۔ انیس کے مشہور مرثیہ "بخدا فارس میدانِ تہور تھا حر" میں عمر ابن سعد اور حضرت حر کا مکالمہ ہے۔ یہ صنعت کسی ایک بند یا شعر تک محدود نہیں ہے بلکہ رد العجز علی الصدر کی طرح کئی بندوں پر محیط ہے۔ یہ صنعت مرثیہ نگاروں کے یہاں عموماً ہے لیکن جو حسن انیس نے پیدا کیا ہے وہ صرف حضرت امام کا لطف اور رحمتِ یزدانی ہونے کی وجہ سے لاثانی ہے یہ صنعت بند نمبر اکتیس سے شروع ہوتی ہے اور پچپن تک اس کا سلسلہ چلتا ہے۔ ان بندوں میں صنعت ابداع تو ہے ہی یعنی لفظ سے خوب معنی نکالے ان میں صنعت تدارک یعنی کسی کی اس طرح برائی کرے کہ تعریف معلوم ہو صنعت احتجاج بدلیل (یہ مذہب کلامی کی ایک قسم ہے اور تاکید المدح وغیرہ بھی ہے)

انیس کے دادا میر حسن نے ایک مصرع لکھا تھا:

دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

اس میں نقارے کی آواز یعنی "دوں دوں" نظم کر دیا تھا۔ غالباً اسی ایک مصرع کی طرف ذہن گیا اور اس صنعت کا کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ زبان انگریزی میں کہا جاتا ہے onomotopoeia میں یہ ہوتا ہے کہ گونجتی ہوئی چیخ کے لئے Shrill کہہ دیں گے یا پہیے کی کھڑکھڑاہٹ کو Rattling کہہ دیں گے وغیرہ۔ اردو میں میر انیس نے اس صنعت میں کمال دکھایا ہے اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ علم بدیع کے اس رُخ کو علم بیان میں لے آئے اور اس صنعت سے انھوں نے صوتی آہنگ ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ فضا آفرینی کی ہے۔ موضوع سے مناسبت رکھنے والے حروف منتخب کر کے پورا منظر نامہ تیار کیا ہے ایک شعر اور ایک بند ملاحظہ ہو ؎

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا   فر فر فرس کے نتھنوں سے آنے لگی صدا

اور یہ بند

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے

وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے

ڈھالیں لڑیں سیاہ کی یا ابر گڑ گڑائے

غصے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے

ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعین کے پاؤں

ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں

تلمیع تجنیس، مراعات النظیر کے ساتھ جس پہلو کی طرف متوجہ کرنا ہے وہ فضا آفرینی کے لئے کراہت، ڈر، تناؤ پیدا کرنے والے ایسے الفاظ کا انتخاب ہے جن میں کریہہ الصوت حروف بہت آئے ہیں جیسے ڈٹ ڑ وغیرہ اور گھوڑے کا دانت کڑکڑانا یا تیز روی میں فرفرانا میر حسن سے کہیں آگے میر انیس کو لے جاتا ہے ۳۴

انیس کے یہاں ایک صنعت اور ہے صنعت ملمع یا تلمیع ۳۵ اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دوسری زبان کا ایک رکن لے آنا۔ اس کی مثال عام طور سے انیس کے یہاں سے پیش کی جاتی ہے ؎

ٹر پکارا بابی انت وامی یا شاہ   قابل عفو نہ تھے بندہ آثم کے گناہ

کہتے ہیں کہ انگریزی کے ایک بہت بڑے شاعر کی سب سے مشہور نظم میں یہ صناعی درجہ کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔ حالاں کہ تو کل میں بند زندگی اور موسموں کا تذکرہ برباد شدہ دنیا کا بیان لیکن "بے مصرف زمین" والی یہ نظم اس لیے بہت اہم سمجھی جاتی ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے صنعت تلمیع کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس میں اطالوی، جرمن، فرانسیسی سے آگہی ضروری ہے۔ نظم شانتی شانتی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جیمس جوائس کی نثری تخلیق میں کہ نام جس کا یولیسس ہے یہ صنعت پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انیس و دبیر کی روایات کی پاسداری تمام مرثیہ نگاروں نے کی اور ان محاسن کو برقرار رکھا جن کو انیس و دبیر نے منزل کمال تک پہنچا دیا تھا عشق، تعشق، پیارے صاحب رشید وغیرہ کے یہاں صناعی ملتی ہے۔ پروفیسر جعفر رضا نے تفصیل سے بتایا کہ دبستان عشق، علم بیان کا شیدائی تھا۔ تشبیہ کی لطافت، استعارے کی نزاکت، فضا کی تخلیق ــــ لیکن اس دبستان میں بھی علم بدیع کی مروجہ صنعتوں کے علاوہ صناعی ملتی ہے۔

عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو   (عشق)

سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے

کھینچ لے قلم مرقع صحرائے کربلا ــــ تعشق کے مرثیے اس سلسلے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال نفیس کے یہاں تجنیس خطی ۳۶ کی ایک مثال ؎

علی کا دبدبہ و رعب جرأت و شہرت   حسن کا حسن حسین حسیں کی سب شوکت

اس میں دو لفظ بغیر رعایت نکات و حرکات مشابہ واقع ہوئے ہیں جیسے حسُن، حسَن، حَسین، حسِین

ناسخ و آتش کے شاگردوں نے صناعی کی روایت کو برقرار رکھا۔ ان کے یہاں حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر، ایہام تناسب اور رعایت لفظی کی کثرت ہے لیکن دیا شنکر نسیم نے انیس و دبیر کے معاصر کی حیثیت سے ان بزرگوں کے ساتھ صناعی کے کمال میں اپنے کو اس منزل تک پہنچایا کہ ان کا نام انیس و دبیر کے ساتھ لیا جانے لگا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

صنعتِ مشاکلہ: میں جا کے جلی تو غم نہیں ہائے
ڈر ہے نہ تجھ پہ آنچ آ جائے

اس صنعت میں دو لفظوں کو اس طرح لاتے ہیں کہ اصل سے بھی انھیں نسبت ہو اور اپنی جگہ الگ معنی بھی رکھتے ہوں۔

صنعت توجیہ یا محتمل الضدین

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے   جس گھر میں ہو وہ گل چراغ ہو جائے

یہ دراصل قرأت کی صنعت ہے، جس طرح پڑھیے نئے معنی حاصل ہوں گے۔

تجنیس محرّف: مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

مشکیں اور مشکیں میں تجنیس محرف ہے۔

صنعت سوال و جواب: ؎

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت   پوچھا کہ طلب کہا قناعت

یہاں بے اختیار یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ منیر شکوہ آبادی کا مشہور قصیدہ "اشک زلیخا ہوئے بحر صنعت جوش زن" کنایہ کی بہترین مثال ہے لیکن نسیم نے جو خط بکاؤلی کی طرف سے تاج الملوک کو لکھا ہے وہ بے حد بلیغ کنایہ کی دولت لیے ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی کے یہاں بھی صناعی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ ایک صنعت ہے کلام جامع جس کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اس میں شکایت زمانہ ہوتی ہے۔ اس صنعت کے سلسلے میں انیس کا بند "ناقدری عالم کی شکایت نہیں مولا" بہت معروف ہے۔ اس کے علاوہ صنعت تکریر کی مشہور مثال زہر عشق سے دی جاتی ہے ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی   کر دیے جس نے گھر کے گھر خالی

لیکن عزیزی رحمت علی خاں کے مطابق تکریر مسانف یا مجرد میں جن الفاظ کی تکرار ہوتی ہے ان کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ منیر کے یہاں سے انھوں نے مثال دی ہے ؎

سر بگریبان فکر، فکر کی دل میں جگہ
خامہ میان دوات، شمع میان لگن

اودھ کے شعراء میں مرزا شوق کا نام بہت مشہور ہے۔ ذرا غور کیجیے: زہر عشق کا پہلا مصرع

لکھ قلم پہلے حمد رب ودود

اس میں صنعت براعت الاستہلال بھی ہے اور صنعت حذف قطع الالف بھی ہے، یعنی مصرع میں الف نہیں ہے۔ ایک شعر اسی صنعت میں ملاحظہ ہو ؎

پیش یوں فرقت حبیب نہ ہو
کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

اودھ کے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن میں محسن کاکوروی، صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ صرف اشعار درج کیے جا رہے ہیں اور صنعت کا نام درج کر دیا ہے، اہل نظر کے لیے سمجھنے کو کافی ہے ؎

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل —— محسن کاکوروی

صنعت تکریر متانف: ایک سر فکر معیشت وہ کرے یا فکر شعر
کام ہے فکر سخن ہر فکر سے آزاد کا (صفی)

اشتقاق: آتش عشق نے عشاق کو اف پھونک دیا
تھا ادھر حسن ادھر مہر مبیں کی حدت (عزیز)

صنعت ایراد المثل: باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقب)

(دوسرا مصرع ضرب المثل ہے اور یہی نظم کرنا مذکورہ صنعت ہے)

عہد حاضر کا تذکرہ کرتے ہی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے شاعری کا رشتہ الفاظ سے توڑ دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ شعراء نے ان محاسن شعری کی طرف سے آنکھیں موڑ لی ہیں لیکن قصور شعراء کا نہ تھا قاری کا تھا۔ ان محاسن کی فہم کے لیے جس علم کی ضرورت تھی وہ تیز رفتار زندگی میں ممکن نہ رہ گیا تھا۔ حالانکہ اقبال جیسے شاعر کے یہاں شاید ہی کوئی ایسی نظم ہو جو صناعی کا شاہکار نہ ہو۔ "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" میں تلمیع، تلمیح، اشتقاق، ابداع، طباق، جمع وغیرہ ہر قدم پر ملیں گے۔ بہرحال ضمناً اقبال کا تذکرہ آگیا ہے۔

اودھ میں جوش ملیح آبادی سے دور حاضر کا آغاز ہوتا ہے۔ صنعت جمع میں تو جہاں سے جی چاہے ان کی کوئی نظم اٹھا لیجیے۔ یہی حال

تنسیق الصفات کا ہے، پھر بھی ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس میں دونوں صنعتیں موجود ہیں ؎

آبِ مکاں، امامِ زماں، آبروِ مبیں — کنزِ علوم، کاشفِ سر، کعبۂ یقیں
قاضیِ دہر، قبلۂ دوراں، قوامِ دیں — منشائے عصر، معنیِ کن، میرِ عالمیں
تابندگیِ طرۂ طرفِ کلاہِ علم
مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہِ علم

اس میں بہت ساری صنعتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ مثلاً پہلے دو مصرعوں میں لف و نشر بھی ہے اور تیسرے و چوتھے مصرعوں میں مراعاۃ النظیر تو ہے ہی، مبالغۂ مقبول بھی ہے۔ پہلے مصرعہ کے دو رکن صنعتِ ترصیع میں ہیں۔

جوشؔ کے یہاں صنعتوں کی تلاش کی ضرورت نہیں، "جنگل کی شہزادی" ہو یا "حسین اور انقلاب" ہر جگہ صناعی بولتا ہوا پیکر اختیار کر لیتی ہے۔ صنعتِ توسیم کی مثال ملاحظہ ہو۔ اس صنعت میں قافیہ کی ایسے حروف پر بنیاد رکھتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں ممدوح کا نام آ جائے۔ مثلاً جوشؔ کہتے ہیں ؎

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے — جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

حسرتؔ موہانی کلاسیکی مزاج کے غزل گو تھے اس لیے کہ ان کے مشہور شعر ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میں صنعتِ عکس ہے اور یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس دور کے جتنے ممتاز شعراء ہیں، جن میں حسرتؔ اور ان کے بزرگ معاصرین اور کم عمر شعراء ہیں، ان سب کے یہاں صنعتوں کا التزام ہے چاہے وہ اصغرؔ گونڈوی ہوں یا ریاضؔ خیر آبادی یا مضطرؔ خیر آبادی یا آرزوؔ لکھنوی لیکن خوشگوار تعجب ہوتا ہے جب مجازؔ اور علی سردار جعفری کے یہاں صنعتیں ملتی ہیں۔ مجازؔ کہتے ہیں ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اس میں رد الابتدا علی الصدر[٤٣] و صنعتِ تکریر کی نشاندہی عزیزی ہمت علی خاں نے کی ہے۔ مجازؔ کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

اب چل اور چلتا میں تجنیسِ مذیل لطف دے رہی ہے۔ اس کی تعریف یہی لکھی ہوئی ہے کہ ایک لفظ کے آخر میں دو حرف کی زیادتی ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی صنعتیں ہیں۔ علی سردار جعفری[٤٥] کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خواب اب حسنِ تصور کے افق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب

یہ صنعتِ مجاز بھی کہلاتی ہے اور اکثر نے اسے صنعتِ معاد بھی کہا ہے مگر صحیح نام رد العجز علی الابتداء ہے۔ ان کا ایک بند اور ملاحظہ ہو ؎

صبح سے لے کے تا بہ شام، مست خرام تیز گام
کرتی نہیں کہیں قیام، کرتی نہیں کہیں مقام
جذبۂ شوق ہے تمام منزلِ شوق ناتمام
دامنِ شش جہات میں سیلِ رواں سے ہے زندگی

اس میں صنعتِ ذوقافیتیں، قیام اور مقام میں تجنیس، تیسرے مصرعہ میں تضاد وغیرہ ہے۔

حضرت خمار بارہ بنکوی کی تمام مقبولِ عام غزلیں صناعی کا حسن رکھتی ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر وحید اختر[٤٦] محسن زیدی[٤٧] کے یہاں بھی صنعتوں کا برمحل اور متناسب التزام ہے۔ وحید اختر کے ایک مرثیہ کے چہرے میں قلم کا قصیدہ ہے۔ اس میں تصلیف سے لے کر تجنیس کے بیشتر اقسام، کلام جامع، صنعتِ جمع اور مراعاۃ النظیر وغیرہ ہیں۔ ان کے مرثیے "مریم سے بھی سوا ہے فضیلت بتول کی" سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس میں تجنیس، تجاہلِ عارف سے لے کر صنعتِ منقطع و رد و د۔ ذر ذر میں ہے ؎

بولی جو ہو سو ہو یہ ہے کس حسن کی نمو — نیزے پہ سر نہیں، یہ ہے صبح کا ورود
ایسا جوان دیکھے کب چشمِ ہست و بود — دیکھوں ادھر تو بڑھتی ہے ہر ہر نظر درود
دل کہہ رہا ہے پھول یہ باغِ علیؑ کا ہے
میرے دہن میں خاک یہ چہرہ نبیؐ کا ہے

مجروح سلطان پوری ہمارے عہد کے آتش ہیں۔ ان کی غزل

آ رکل کے یہ دل میں دو رُخی کے جانے سے

پڑھیے تو اپنے لہجے کے اعتبار سے یہ آتش کی غزل ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

کی یاد دلاتی ہے۔ مجروح بھی اسی بانکپن کے ساتھ اپنی کلاہ کج رکھتے ہیں جو آتش کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آتش نے جب کہا تھا ؏

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

تو انھوں نے اپنی شعری روایت کا سلسلہ مستقبل تک پھیلا دیا تھا۔ یہی شعری روایت اور مرصع سازی غزل گو شعرا، بالخصوص اودھ کی ادبی اور شعری روایت کے ورثہ دار اور نمائندہ شاعر مجروح سلطان پوری کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے دو بہت مشہور شعر ملاحظہ ہوں ؎

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن

دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

پہلے شعر میں رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے نے تکرار پیدا کی۔ نغمہ اور فغاں میں تضاد ہے۔ دوسرے شعر میں جمع ہے، مراعاۃ النظیر ہے اور اب ارسال المثل ہے کہ پورا شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ جب کوئی ضرب المثل نظم کی جاتی ہے تو اسے ارسال المثل کہتے ہیں۔ مجروح کے اس شعر میں صناعی کی یہ کرامت ہے کہ اب یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کے یہاں تلاش کرنے پر بھی کوئی ایسا شعر نہ مل سکا جو آتش کی مرصع سازی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ مثال کے طور پر ان کے دو معروف شعر ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے

میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

پہلے شعر میں مراعاۃ النظیر، صنعتِ طباق ہے۔ دوسرے شعر میں ان کے علاوہ صنعتِ تجاہلِ عارفانہ بھی ہے۔ لفظ "کہیں" نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے اور یہ صنعت شعر کے پیکر میں بول رہی ہے۔

یہ وہ وراثت ہے جو انشا، اور مصحفی کے زمانے سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی آئی ہے اور یہ وراثت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب انیس و دبیر نہیں ہیں اور علمِ بدیع سے زیادہ علمِ بیان کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ استعارہ کا ستارہ چمک رہا ہے۔ تشبیہ و کنایہ و مجاز اور پھر دوسری صنعتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ لیکن آج بھی اعلیٰ علمی سطح رکھنے والے ادبی اذہان، کلاسیکی ادب سے شناسائی تربیت یافتہ ذوق، ادبی معیار رکھنے والے اور محاسنِ شعری تلاش کرنے والوں کو یہ صنعتیں ذہنی حظ و انبساط مہیا کرتی ہیں۔[55] مشاعروں میں بھی عوام یہ تو نہیں جانتے کہ جس شعر پر وہ داد و تحسین کے پھول نچھاور کر رہے ہیں ان میں کون سے محاسنِ شعری ہیں لیکن غور کیجیے تو یہ احساس ہوگا کہ عوامی ذہن بھی انھیں اشعار سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جن میں رعایتِ لفظی، مراعاۃ النظیر اور حُسنِ تعلیل کا سحرِ حلال ہوتا ہے۔

اودھ نے نظم کے ساتھ نثر میں بھی ادبی صناعی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں جاہ و قمر کی 'طلسمِ ہوش رُبا' آغا جو ہندی کی چھوٹے آغا کی تصحیح کی ہوئی 'بوستانِ خیال' وغیرہ میں سجع، ترصیع، مراعاۃ النظیر اور تجنیس کی مختلف اقسام ملتی ہیں، اور یہ ساری صنعتیں آغا حسن 'امانت' کے ضلع اور جگت اور فقرے بازی سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں سرورؔ شن سخن بھی ادبی صناعی کا اچھوتا نمونہ ہے لیکن بلاشبہ سرورؔ کی فسانۂ عجائب میں یہ تمام صنعتیں معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں۔ سرور نے گلزارِ نسیم اور سحر البیان کی طرح ہر قصّے کے چہرے میں براعت الاستہلال سے کام لیا ہے یعنی ابتدا میں کسی لفظ سے بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ رعایتِ لفظی، مراعاۃ النظیر، ایہام التناسب اور صنعتِ تصحیف کے ایسے الفاظ لائیں کہ حرکات کو بدل دیں تو مدح ہجو بن جائے یا صنعتِ ترلزل کہ اس میں بھی ذرا سی تبدیلی سے مدح ہجو میں بدل جاتی ہے یا صنعت الہزل الذی کہ بظاہر تمسخرانہ و ہزلیانہ ہو مگر مراد اس سے ہزل نہ ہو۔ یہ ساری صنعتیں سرورؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ ایک بہت مختصر سا تذکرہ دیکھیے:

"اور تو اور شہدا ہیر بخارا کا، تماسا، سید الشہداء
کا شیدا۔" [۵۱]

شہدا، شہدا، شیدا میں صنعت تجنیس نے بیان کا جو حسن پیدا کیا ہے اس کے حسن کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہے۔ سرور کے یہاں ایک صنعت ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکا۔ صرف ایک فقرے پر غور کیجئے:

"اصل تو یہ ہے کہ عسل مصفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اترا" [۵۲]

اس میں اصل اور عسل میں تجنیس نہیں ہے۔ یہاں وہ صوتی آہنگ ہے جو انگریزی ادب میں پایا جاتا ہے۔

صرف داستانوں ہی میں نہیں، اودھ کی بیشتر نمائندہ تخلیقات میں بھی صناعی ملے گی، چاہے وہ فسانہ آزاد ہو یا سرشار کے ناول۔ ظاہر ہے طویل اقتباسات کی گنجائش نہیں۔ "امراؤ جان ادا" سے کچھ فقرے ملاحظہ ہوں:

رسوا: "امراؤ جان! سنا کیا شعر کہا ہے۔"

امراؤ جان: "سبحان اللہ۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی جو چاہیں کہیں، مالک ہیں۔"

اس میں ہجو ملیح اور تاکید الذم بما یشبہ المدح ہے۔ اس لیے کہ مالک، داروغہ جہنم کو بھی کہتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں صناعی کا باقاعدہ التزام ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے صنعتوں سے بھرپور ہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں صرف ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"اول تو پہلے ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہوگئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔!"

یہاں تجنیس، اشتقاق اور "رسائی کیسی" سے صنعت رجوع سامنے آتی ہے۔

اودھ میں ادبی صناعی [۵۴] کی اس داستان مجز بیان کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذوق، کڑھی ہوئی شخصیت، شگفتہ ذہن اور علمی مزاج ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل علم اور شرفاء کی صحبتوں میں ان سے موانست اور مجالست رہی ہو۔ ورنہ اگر یہ نہیں تو پھر بقول انیس

ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار!

حواشی تعلیقات

□□

۱؎ نجم الغنی: بحر الفصاحت ص ۹۵ ۔ ۲؎ رشید حسن خاں، مقدمہ فسانہ عجائب ص ۲۶

۳؎ لفظوں کی چٹانوں سے اُبلتے ہیں معانی
اک بات کے سو رُخ سے نکلتے ہیں معانی (وحید اختر)

۴؎ پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل۔ سودا

۵؎ قدیر شاگرد مرزا دبیر

۶؎ بحوالہ اردو شاعری میں صنائع و بدائع: عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خان یوسف زئی، ریڈر سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد ص ۸

۷؎ ایضاً ص ۹۶

۸؎ نجی خط، عزیزی ڈاکٹر محبوب عالم انصاری ریڈر فی این ڈگری کالج، ٹانڈہ

۹؎ فکر و ریاض: علی جواد زیدی ص ۱۱۸

۱۰؎ یہاں ایک بحث یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ اودھ میں ادبی صناعی کا نقطہ آغاز کسے اور کیوں قرار دیا جائے؟ انشا سے ہی اس کا آغاز کیوں؟ وہ سارے دلائل ایک بسیط مضمون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عابد پشاوری کا مضمون "انشا کا وطن" (نیا دور فروری، مارچ ۱۹۹۴ء) اس سلسلے میں فیصلے تک پہنچنے میں ممد و معاون ہوا۔

۱۱؎ اشعار اور صنعتوں کے انتخاب میں ذاتی وجدان ہی کو دخل رہا ہے، بے شمار اشعار اور بھی ہو سکتے ہیں۔ جتنی صنعتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اتنی ہی صنعتیں باقی رہ گئی ہیں۔

۱۲؎ مہذب اللغات ص ۳۴ ۱۳؎ حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص ۴۴

۱۴؎ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ جتنی صنعتیں مرزا صاحب کے یہاں ہیں وہ سب انیس کے یہاں بھی ہیں، راقم الحروف نے اسی لیے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ دونوں کے یہاں الگ الگ صنعتوں کی نشاندہی کی جائے البتہ کہیں کہیں شعر کے حسن نے مجبور کر دیا ہے۔

۱۵؎ حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص ۱۴۴ ، ۱۶؎ ایضاً ص ۴۴

۱۷؎ ایضاً ص ۱۱۱ ۱۸؎ انیسیات ص ۱۲۷

۱۹ حیات دبیر ص۱۸۱ ، ۲۰ ایضاً ص۱۹۲ ۲۱ مہذب اللغات ص۳۲۹

۲۲ المیزان ، چودھری سید نظیر الحسن فوق بگرامی ص۸

۲۳ انیسیات ص۱۳۴

۲۴ کلام میں ایسے لفظ لانا کہ بادی النظر میں یہ محسوس ہو کر ایک لفظ سے مشتق ہے مگر ایسا نہ ہو۔ شبہ اشتقاق سے کلام میں صوتی آہنگ کا حسن پیدا ہوتا ہے۔

۲۵ مہذب اللغات ص۳۲۵ ۲۶ ایضاً ص۳۲۶ ، ۲۷ ایضاً ص۳۳۱

۲۸ ایضاً ص۳۳۱ ، ۲۹ ایضاً ص۳۳۸ ، ۳۰ ایضاً ص۳۴۶

۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ مہذب اللغات ص۳۴۶

۳۴ اور یہی کمال فن ہے کہ بدیع کو بیان میں لے آئے، صوتی آہنگ سے فضا آفرینی اور شعری منظر نامے کا حسن چمک اٹھا ہے۔

۳۵ انیسیات ص۱۲۹ ، ۳۶ مہذب اللغات ص۳۲۵ ،

۳۷ مہذب اللغات ص۳۴۲ ، ۳۸ ایضاً ص۳۳۹ ، ۳۹ ایضاً ص۳۴۷

۴۰ ایضاً ص۳۳۸ ، ۴۱ غیر مطبوعہ مقالہ : اردو شاعری میں صنائع بدائع۔ از ڈاکٹر رحمت علی خاں۔

۴۲ عنوان کی پابندی کے خیال سے صرف اودھ کے شعراء تک تذکرہ محدود رکھا گیا ہے ورنہ اقبال ، فیض ، مخدوم ، ناصر کاظمی ، احمد فراز ، فیتل شفائی ، اختر شیرانی ، وامق جونپوری ، علی جواد زیدی ، کیفی اعظمی ان سب کے یہاں وافر صنعتیں ہیں۔

۴۳ اردو شاعری میں صنائع بدائع۔ رحمت یوسف ص۴۸

۴۴ مہذب اللغات ص۳۲۶

۴۵ علی سردار جعفری بلرامپور گونڈہ کے رہنے والے ہیں۔

۴۶ وحید اختر کا اصل وطن نصیر آباد (رائے بریلی) ہے۔

۴۷ محسن زیدی کا اصل وطن بہرائچ ہے

۴۸ مجروح کی غزلوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے نظمی گانوں کے بارے میں نہیں۔

۴۹ مسعود صاحب نے 'انیسیات' میں اسے تجاہل عارفانہ لکھا ہے۔ لیکن مہذب صاحب نے تجاہل عارف لکھا اور یہی مرجح ہے

۵۰ مزاحیہ شعراء مثلاً ظریف لکھنوی ، ناچیں لکھنوی ، شوق بہرائچی ساغر خیامی کے کلام میں متداول صنعتوں کے علاوہ تزلزل الہزل الذی اور تصحیف بکثرت ملتی ہیں۔ یہاں صناعی کلام میں بے انتہا شگفتگی وگوگدی پیدا کرتی ہے۔ طوالت کے خیال سے مثالوں سے گریز کیا گیا۔

۵۱ مہذب اللغات ص۳۲۹

۵۲ رشید حسن خاں ؛ مقدمہ فسانۂ عجائب ص۳۲

۵۳ فسانۂ عجائب ص۳

۵۴ یہ صناعی ماضی کا مزار نہیں دور حاضر کی بھی زندہ حقیقت ہے۔ پارلی منٹ ہو یا اسمبلی یا عوامی رہنماؤں کی تقریریں، اگر صناعی ہے تو پھر یادگار حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ تقریر کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

"نیتا کی نیتی ہی نہیں، نیت بھی اچھی ہو۔"

ایک بیان پڑھئے: "کل تک وہ ہمارا ہاتھ تھے آج سفید ہاتھی ہیں"؛ "نوجوان تمہارا ہتھیار نہیں، ہاتھ ہیں۔" اور صرف سیاست داں نہیں، ہر شعبۂ حیات کا انسان اگر لفظ کے استعمال کا ہنر جانتا ہے تو وہ صناعی برتتا ہے۔

"سر پر تو بال و بال جان، بسان سنبل پریشان ہیں اور اس گل کا گریبان مانند گل تا بداماں چاک ہے اور تیری نرگس چشم کے خیال میں وہ روز و شب آنکھوں سے آب جو جاری رکھتا ہے اور تیری مژگان رشک سنان کے تصور میں شام و سحر خار ہجراں اس کے دل میں کھٹکتا ہے، اور تیرے لعل لب خنداں کے دھیان میں غنچے کی طرح آٹھ پہر گردن جھکائے چپ بیٹھا رہتا ہے اور کبھی تیرے دست حنائی، رشک پنجۂ مرجان کی یاد میں برنگ اور رنگ قطرۂ خون دیدۂ خوں بار ہر دم ٹپکاتا ہے.... اور تیرے فراق پُر اشتیاق میں روز و شب بحال پر تعب مانند بلبل دور از چمن نعرہ زن ہے اور رنگ رخسار جو اس گل عذار کا مثل گل۔ سرخ تھا سو کاہش غم سے مثل، صد برگ زرد ہو گیا۔"

مہجور

[شیخ محمد بخش مہجور کی داستان "نورتن" (۱۸۱۴ء) کا ایک اقتباس۔]

پروفیسر محمد حسین

لکھنؤ کے مہاجر ادب پر ایک نظر

اودھ کا اُردو ادب تمامتر مہاجر ادب ہے۔ دلی سے آنے والے اُردو شاعروں کے نشانات نہیں ملتے۔ بعد کے دَور میں البتہ یہاں آباد مہاجر خاندانوں نے اس علاقے کو اپنایا اور یہیں ایک نئے رنگِ سخن کی بنیاد ڈالی۔ بعد کو انہی مہاجرین نے لکھنؤ کو ایسا اپنایا کر ان کی اولاد اودھ کی ہو رہی اور لکھنوی کہلائی۔

پہلا دور میر، سودا، ضاحک اور میر حسن کا ہے۔ یہ سب دلی سے فیض آباد اور پھر لکھنؤ پہنچے اور دلی کی ادبی وراثتوں کے ساتھ پہنچے۔ ان سب کے ہاں (سوائے میر کے) ایک ایسی معروضیت کے آثار ملتے ہیں جو اس سے قبل تقریباً ناپید تھی۔ دلی سے آنے والے مہاجروں نے اپنا غم تو یکسر نہیں بھلا دیا اور میر تقی میر ہوں یا میر حسن یا پھر بعد کے دَور کے دریائے لطافت والے انشاء اللہ خاں جنھوں نے قتیل کے ساتھ مل کر میر غضر غیبی کا کردار تخلیق کیا اور مہاجروں کی طرح یادِ ماضی کو پھر سے زندہ کر دیا۔ مگر اودھ آکر اپنی ذات کے خول میں بند شاعروں کو بھی ذات سے ماورا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اس کی نظیر ہے۔

اردگرد کی زندگی کی ساری بہار کو شاعری میں سمونے کا میلان اودھ کی پہچان ہے۔ وجہ اس کی کئی ہیں، ان میں ایک تصوف کی بالادستی کا خاتمہ بھی ہے جو دلی کے شاعروں کو ان کی ذات کے اندر بند کیے تھے یہاں آکر وہ بت ٹوٹ گیا، گو گاہے بگاہے اودھ کی غزل بھی تصوف سے یکسر آشنا نہیں مگر یہ کبھی کبھار کی صاحب سلامت ہے۔ تصوف "اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی" سے عبارت ہے۔ اودھ کے اُردو ادب نے زندگی کو اس کے معروضی روپ میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پائیں باغ کی وہ کھڑکی جو بقول محمد حسین آزاد، میر نے آکر نہ کھولی، یہاں آکر کھل گئی اور اس کھڑکی کے کھل جانے سے نظارہ بہار بھی ہوا اور باہر کی ہوائیں بھی اندر آئیں اور ان کے ساتھ خوشبوئیں بھی آئیں اور گرد و غبار کے جھکڑ بھی۔

اسی لیے مثنوی اُبھری۔ سحر البیان۔ گلزار نسیم اور زہر عشق ہی نہیں ہوس کی لیلیٰ مجنوں بھی اور واجد علی شاہ کی غزالہ ماہ رو بھی۔ اسی لیے اندر سبھا کی روایت اُبھری جس نے صرف اُردو ہی میں نہیں، دورِ جدید میں ہندستان کے قومی ڈرامے کا آغاز کیا۔ اسی کے زیر اثر واسوخت کا پورا سلسلہ سامنے آیا۔ امانت سے لے کر امیر مینائی تک جس نے اس دَور کے تمدن کی جھلکیاں لاثانی طور پر محفوظ کر لیں۔ لباس، آرائش و زیبائش سے لے کر رہن سہن کی نجی تفصیلات تک۔ اسی کے زیر اثر قصہ گوئی اور داستان گوئی پروان چڑھی جو لکھنؤ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر چوراہے پر داستانیں بیان کی جانے لگیں۔ اسی کے سہارے مرثیہ گوئی نے محض نجی رنج و غم کے اظہار کے دائرے سے آگے قدم بڑھا کر اسے رزمیہ شاعری اور ڈرامائی عناصر سے روشناس کرا دیا اور تاثر سے زیادہ واقعہ نگاری کا مرقع بنا دیا۔

آج بھی بیانیہ شاعری کے نام پر ناک بھوں چڑھانے والوں کی کمی نہیں لیکن یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ اودھ کی اُردو شاعری نے شعری افق کو معروضیت کے سہارے وسیع نہ کیا ہوتا تو اقبال اور جوش ملیح آبادی کا وجود نہ ہوتا اور اُردو شعر و ادب کا کل سرمایہ چند منہ بسورتی غزلوں اور کچھ تصوف زدہ باطنی تصورات تک محدود رہتا۔

لوک عناصر

اسی معروضیت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اودھ میں چوں کہ اُردو

ادب کا دور دہلی سے لکھنؤ آچکا تھا اور اودھ میں ایسی حکومت بن چکی تھی جو برائے نام دہلی کے تابع بھی (اور وہاں کی تہذیبی فضا سے متاثر بھی تھی) مگر درحقیقت اپنی انفرادیت اور پہچان رکھتی تھی اس لئے اسے مقامی عناصر سے قریب تر ہونے کی ضرورت تھی کہ مرکز کے مقابلے میں بھی اسے علاقائی اور مقامی مدد حاصل ہو سکے۔ اس لحاظ سے بھی اودھ کے اُردو ادب کے رشتے اس علاقے کی عوامی روایت سے بہت قریبی ہو گئے۔ لکھنوی کلچر اور ادب کے اس پہلو پر ابھی کام نہیں ہوا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس سے قبل عوامی تہذیب کے عناصر کا استعمال اُردو ادب میں شاید ہی کبھی اس قدر اور اس طرح ہوا ہو۔ صرف ایک ہی مثال کافی ہے اور وہ ہے امانت اور مداری لال کی اندر سبھا میں لوک روایت کا بھرپور استعمال۔ یہ عوامی عناصر خواہ کسی پردے میں کیوں نہ پیش کیے گئے ہوں، چھپائے نہیں چھپتے۔ یا پھر واجد علی شاہ کا رادھا کنہیا کا قصہ یا پھر خود مرثیوں اور داستانوں میں لوک عناصر۔ کرشن کنہیا سے واجد علی شاہ کا گہرا لگاؤ بلکہ اور بسنت کا قومی تہوار بن جانا بھی اسی کا ثبوت ہیں۔

عشق کی ارضیت

معروضیت کا ایک تیسرا رُخ بھی تھا۔ اپنے باطن کی گہرائیوں سے نکلے پر رشتہ نشاطِ زندگی سے بھی مضبوط ہوا۔ کل کے نشاطِ زیست پر آج فحاشی کا لیبل لگا کر اس دور کے ادب کو مصلوب کرنا نہایت آسان ہے لیکن ذرا ایک اور زاویے سے بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اس سے قبل اردو ادب کا ایک بڑا حصہ (خاص طور پر شاعری) ایک ایسے محبوب کے بارے میں تھا جس کے ذہن تھا نہ کمر۔ شاعروں اور شاعروں کے خوش عقیدہ ناقدوں نے اسے حُسن کا حقیقی پیکر قرار دے کر تصوف سے اس کا جواز تلاش کر لیا مگر اودھ میں جس عشق کا تصور اُبھرا وہ ارضی عشق تھا اور اس کے رشتے ماورائی اور متصوفانہ نہیں تھے۔ گوشت پوست کے انسانوں سے تھے اس لیے ذہن بھی تھا اور کمر بھی اور ناز و انداز بھی۔ نشاط و کیف اور درد و کرب بھی۔

[illegible] ہے کہ یہ محض عیاشی نہیں تھی بلکہ عشق کے ایک ارضی روپ کا عمل دخل تھا۔ بے شک اس میں کھردرگی بھی پیدا ہوئی مگر پہلی بار اردو ادب میں انسانوں کے انسانی معاملات کسی قسم کی متصوفانہ معذرت یا کسی قسم کے اخلاقی یا نیم اخلاقی جواز کے بغیر پیش کیے گئے۔ نظم ہی میں نہیں نثر میں بھی۔ یہاں شہزادیاں ہوں یا چڑیلیں، دونوں کے روپ کم و بیش ارضی ہیں۔ حتیٰ کہ فوق فطری داستانوں اور قصوں میں بھی اور دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم کی بکاؤلی میں بھی، اور حسن و عشق کے اس ارضی روپ کی بازیافت اودھ کے کارناموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

یہ بات منفی طور پر تو بہت دہرائی گئی ہے کہ اودھ کے اُردو ادب میں سوز و گداز کی کمی ہے مگر اس کا مثبت پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ زندگی میں بہت سے دکھ درد سہی مگر زندگی تمام و کمال نالہ و فریاد نہیں ہے، نشاطِ زیست کا نغمہ بھی ہے اور یہ نشاطیہ نغمہ یا یوں کہیے کہ زندگی کی لذت کا عکس جتنا اودھ کے ادب میں ملتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ زندگی کی صلابت اس کے نعمت ہونے کا احساس اور اس کی لذتوں کا ذکر۔ ہمارے ادب میں اودھ ہی کی بدولت ہوا ہے۔ بعد کے دور میں بھی ان قدروں کے ساتھ جن شاعروں کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے وہ بھی اکثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اودھ کلچر ہی کے پروردہ ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی، یگانہ اور مجاز۔

زبان

اودھ کلچر کی ایک اور پہچان ہے زبان دانی۔ بے شک ادب ہی میں نہیں، روزمرہ کی زندگی میں بھی صحتِ زبانی پر لکھنؤ میں بہت زیادہ زور دیا گیا۔ زبان کے آئین و آداب بنے، لغت نویسی پر توجہ صرف ہوئی، قواعد پر کتابیں تصنیف ہوئیں، متروکات کی فہرستیں مرتب ہوئیں اور یہ اعتراض عام ہو گیا کہ لکھنؤ نے کتابی دنیا کو رواج دیا اور ہندی الفاظ کے ساتھ تعصب برتا۔

ان دونوں باتوں میں بھی ادھوری سچائی ہے جو جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ پہلے ہندی لفظوں کی بات کو لیجیے، جنھیں 'ہندی' لفظ کہا جاتا ہے وہ زیادہ تر برج اور اودھی کے الفاظ ہیں اور انھیں ترک کرنے کی بات اتنی تعصب کے زیر اثر نہیں کہی گئی جتنی شہری شائستگی کے پیشِ نظر کہی گئی۔ آج کی ایک مثال لیجیے۔ مغربی اتر پردیش کے دیہاتوں میں

اور بعض قصبوں تک میں قریب کے معنی میں 'دھورے' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اسی طرح پھینکنے کے معنوں میں 'نگھیلنے' کا لفظ مستعمل ہے لگر وہی لوگ جو بلا تکلف یہ لفظ اپنے گھروں میں یا اپنے قصبوں اور دیہاتوں میں بولتے ہیں، شہروں میں یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔

اور یہ استعمال نہ کرنا کسی تعصب کی وجہ سے نہیں ہوتا شہری تمدن کے فراہم کردہ لسانی کلچر کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اودھ میں بھی ایسا ہی ہوا جسے لے کر نئی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔ اور امرت رائے نے تو اپنی کتاب "ہاؤس ڈوائیڈڈ" میں اسی کو اُردو کی علاحدہ شناخت کی بنیاد قرار دے دیا۔ سچ یہ ہے کہ شہری زندگی کے عروج سے الفاظ میں یہ کاٹ چھانٹ ہونا لازمی ہے اور اودھ میں اُردو کی یہ آئین بندی ہونا ایک قدرتی لسانی عمل کا نتیجہ تھی۔

اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ لفظ کی تہ داریوں اور معنویت کی رنگارنگی کا جو شعور اودھ کے ادب نے عطا کیا اس کی صرف ایک مثال دہلی میں ایہام گوئی میں اور کہیں کہیں میرؔ کی شیوا بیانی ہی میں ملے تو ملے ورنہ نایاب ہے۔ ہر لفظ کے ہزار گونہ پہلو ہوتے ہیں اور ان میں لہجہ، فضا اور اشاریت مزید اضافے کرتی چلتی ہے۔ بے شک غزل کی شاعری لکھنؤ میں اعلیٰ درجے کی نہیں ہوئی اور ناسخ کی بے کیفی نے تغزل پر فتح پائی یا یوں کہیے اسے بے کیف کردیا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ لفظ کی جو ہزار شیوگی اور رنگارنگی لکھنؤ نے بخشی وہ نایاب تھی۔

بعد کے ادبی مورخوں نے ناکافی شواہد کی بنا پر لکھنؤ کو دہلی کے زبان کے مقابل لاکھڑا کیا، اور ایسی تصویر بنائی جیسے یہ دونوں مقامی دبستان ایک دوسرے کے مقابل یا ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ جبکہ لکھنؤ کا دبستان شاعری دہلی کا ارتقا تھا اس کی اگلی منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ارتقا قدرتی اور فطری تھا۔ اسی لیے جو رنگ اودھ میں ابھرا اسی کی پیروی بعد میں دہلی میں بھی ہوئی۔ زبان اور محاورے کے بعض اختلافات سے قطع نظر دہلی میں بھی بعد کو یہی رنگ شاعری غالب ہوا۔ خود مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے جتنی غزلیں ناسخ کی زمینوں میں کہی ہیں اتنی کسی اور اُردو شاعر کی زمینوں میں نہیں کہیں۔ حد یہ ہے کہ میرؔ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے تو بھی بقول ناسخ کہہ کر کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ نصیر کی غزلوں میں بھی ناسخی رنگ کی بے کیفی ہے اور بعد کے ٹھیٹھ دہلوی شاعر داغؔ دہلوی میں جرأت کی "چوما چاٹی" بھرپور شکل میں موجود ہے۔ گویا بہا جرأت کے ادب میں جو کچھ لکھنؤ میں پروان چڑھا تھا وہ اپنے اصل وطن کی طرف وراثت کے طور پر پہونچ گیا۔

اس کا ایک ثبوت اُردو ادب کی تہذیبی توسیع اور اس کی بڑھتی ہوئی ارضیت بھی ہے جو محمد شاہی دور کی دہلی سے شروع ہوئی اور لکھنؤ میں اپنے عروج کو پہنچی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے نقد میرؔ کے آخری مضمون میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محمد شاہی دور میں کلچر اور علم و ادب کے سبھی شعبوں پر فارسی اور ترکی اثرات کم ہونے لگے اور ہندستانی اور مقامی اثرات کا غلبہ ہوا۔ اسی کا ایک نتیجہ اس دور کے ایرانی اور ہندستان کے فارسی داں شاعروں کی کشمکش (علی حزیں اور خان آرزو کے معرکے) کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسی سبب دہلی میں فارسی کی جگہ اُردو شاعری کا چلن ہوا۔ سوداؔ نے اپنے قطعے میں واضح طور پر فارسی گو ہندستانی شاعروں کو یہ صلاح دی کہ وہ فارسی چھوڑ کر اُردو میں شاعری کریں۔

یہی رنگ اودھ پہونچ کر اور پکا ہو گیا اور یہاں کے مقامی بلکہ لوک عناصر کی آمیزش زیادہ نمایاں ہوئی جس کی طرف ASSEMBLY OF RIVALS میں کارلا پیٹی وچ (CARLA PETIEVICH) نے بجا طور پر لکھا ہے:

THE COURT AND CULTURE OF LUCKNOW PRESENTED A CASE IN POINT. ITS OFFICIAL COURT LANGUAGE WAS URDU, AN INDIAN LANGUAGE, AND MANY OF THE ART FORMS DEVELOVED THERE (ESPECIALLY KATHAK DANCE AND THE THUMRI STYLE OF VOCAL MUSIC - BOTH ART FORMS FEATURED NARRATIVES OF THE LOVES OF KRISHNA AS WELL AS OTHER HINDU LEGENDS) WERE UNABASHEDLY INDIAN - IN FACT HINDU- IN THEME. P: 192

مقامی ہندستانی عناصر اور لوک کلچر سے قربت پر اضافہ کچھ ان یورپی اثرات کا ہے جو اودھ میں غیر ملکی ذرائع سے آئے۔ ان میں خاص طور پر فرانسیسی اور انگریزی کلچر کے اثرات تھے۔ نصیر الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک فرانسیسیوں اور انگریزوں دونوں کا اودھ میں اچھا خاصا عمل دخل رہا ہے جس کی تصویر کشی PRIVATE LIFE OF AN EASTERN KING اور کسی قدر ایک انگریز تاریخ نگار کی "لکھنؤ کا تاریخ اودھ" میں کی گئی ہے اور اسی بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے محمد عمر نور الٰہی صاحبان کو مطالعہ (باقی)

اودھ آئینۂ ایام میں

اکبر حیدری کشمیری

لکھنؤ کا رثائی ادب
اور
میر خلیق کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

مرثیہ رثا سے مشتق ہے اور اس کے معنی کسی عزیز کے گزرنے پر رنج وملال کا اظہار کرنا ہے۔ اردو ادب میں مرثیے کا اطلاق شہدائے کربلا کے آلام ومصائب اور ان کی مظلومیت کے خوں چکاں واقعات کے بیان کرنے پر ہوتا ہے۔ مرثیہ کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں اتنا عروج حاصل ہوا کہ ناقدینِ ادب نے اسے ایک اہم صنف کے طور پر تسلیم کیا ہے اور جتنا لٹریچر اس میں فراہم کیا گیا ہے وہ دنیائے ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

مرثیہ عزاداری کی آغوش میں پروان چڑھا اور اس کے ارتقاء کے لیے لکھنؤ کا ماحول سازگار ثابت ہوا۔ اودھ میں عزاداری کی ابتدا باقاعدہ طور پر نواب سعادت خاں برہان الملک میر محمد امین نیشاپوری (متوفی ۱۷۳۹ء) کے عہد میں اس وقت ہوئی جب قاضی محمد عاقل نے بابری مسجد کی مرمت کرائی اور پھر انہی کی اجازت سے باقی شاہ نقیر نے مسجد کے چبوترے پر ایک تعزیہ رکھا۔ نواب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے داماد مرزا محمد مقیم نواب صفدر جنگ (متوفی نومبر ۱۷۵۴ء) نے اودھ میں فیض آباد کی بنیاد ڈالی۔ موصوف نے عزاداری کو فروغ دینے کے لئے امامباڑے تعمیر کیے۔ ان کی بیوی صدر جہاں بیگم (متوفی ۱۷۹۶ء) نے موتی باغ کے عقب میں ایک عالی شان امامباڑہ ۱۷۶۳ء میں تعمیر کیا۔ اس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ بعد ازاں ان کے صاحبزادے نواب شجاع الدولہ بہادر (متوفی ۱۷۷۵ء) نے اپنی بیوی نواب بہو بیگم امۃ الزہرا (متوفی ۱۸۱۵ء) کے لئے فیض آباد میں ہی اپنے حرم سرا موتی محل میں ایک عظیم الشان امامباڑہ تعمیر کیا۔ اس کے بھی آثار اب تک موجود ہیں۔

فیض آباد میں ہی جواہر علی خاں خواجہ سرا (متوفی ۱۷۹۹ء) نے نواب شجاع الدولہ کی زندگی میں کاٹھ کا ایک وسیع امامباڑہ بنایا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد داراب علی خاں خواجہ سرا (متوفی ۱۸۱۸ء) نے اس میں توسیع کی اور اسے پختہ بنایا۔ اس وقت یہ فیض آباد کا سب سے بڑا امامباڑہ ہے۔ جواہر علی خاں بہو بیگم کے خزانے کے وزیر تھے۔ بیگم صاحبہ انھیں نواب ناظر کے نام سے پکارتی تھیں اور اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ میر حسن، نواب ناظر کی رفاقت میں فیض آباد میں رہتے تھے۔ انھوں نے اس امیر کبیر کی حویلی کی تعریف میں ایک مثنوی "قصر جواہر" کے نام سے لکھی۔ فیض آباد میں نواب حسن رضا خاں سرفراز الدولہ (متوفی ۱۸۰۱ء) نے ۱۷۶۵ء میں اپنے امامباڑے میں علم نصب کیا تھا۔ اس کی ایستادگی کی تاریخ مرزا سودا نے کہی ہے

ہاں علم نذر حضرت عباسؑ — صدق دل سے ترا جو برپا ہے
سال تاریخ اس علم کی ہے یہ — سر ترے سایا اس علم کا ہے

۱۱۷۹ھ

نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ امامباڑوں میں مجلسیں ہوتی تھیں اور شعرا مرثیے پڑھتے تھے۔ جن لوگوں نے مرثیے میں مہارت حاصل کی تھی، ان میں سے چند شعرا یہ ہیں۔

افسردہ (مرزا پناہ علی)۔ میر امانی، حسن (میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان)۔ جرأت (میاں قلندر بخش)، خُلق (میر احسن خلق)، خلیق (میر مستحسن)، درخشاں (مرزا منکو بیگ)، سودا (مرزا محمد رفیع) صبر (میر محمد علی)، ضاحک (میر ضاحک)، فغاں (اشرف علی) گماں (نذر علی)، مقبل (اکبر علی خاں)، گدا (مرزا گدا علی)۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند نواب آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۷۹۷ء) ۱۷۷۵ء میں مسند وزارت پر رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے کچھ ہی دنوں کے بعد فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ ان کے ساتھ اور لوگوں کے علاوہ شعراء کا قافلہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے قبل لکھنؤ کی کوئی رونق نہ تھی اور وہ دیہات سے بھی بدتر تھا۔ یہاں کی زمین پست و بلند تھی۔ بازار، گلی کوچے نہایت ہی تنگ اور محدود تھے۔ میر حسن (متوفی ۱۷۸۸ء) جب پہلی بار دارالخلافہ بننے سے قبل لکھنؤ آئے تھے تو انھوں نے لکھنؤ کی ہجو کہی تھی۔ وہ مثنوی گلزار ارم میں لکھتے ہیں ؎

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا — لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
یہ گلی سے گلی یوں تر رہے ہے — بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی — کہے پستی ہے اور گاہے بلندی
جو کوئی مدت کو بھولے یہاں گھر — پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در
چڑھے ہے گومتی جب گرد آکر — حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر
سوائے تودۂ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

نواب آصف الدولہ بہادر نے یہاں وارد ہوتے ہی تعمیرات شروع کیں محلوں کے محلے آباد کیے، سڑکیں بنوائیں، بازار لگوائے۔ جب میر حسن دوبارہ لکھنؤ آئے تو یہاں کی حالت کچھ اور ہی دیکھی۔ اب شہر کی ترقی اور گہما گہمی دیکھ کر کہتے ہیں ؎

رہے بت آصف الدولہ سلامت — کہ جس نے کی یہاں طرحِ اقامت
عمارت کی یہاں وہ اس نے بُنیاد — کہ نظارے سے ہو جیسے جہاں شاد
مٹادی اس نے سب یاں کی کدورت
بنائی لکھنؤ کی ایک صُورت

لکھنؤ کی تمام عمارات میں بڑا امامباڑہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ہندوستان کے طول و عرض میں فنِ تعمیرات کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کئی سال تک جاری رہی۔ بالآخر ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔ مادۂ تاریخ یہ ہے :—

"رواقِ عرش جناب ائمہ اطہار" : ۱۲۰۵ھ

آصف الدولہ بہادر جو شاعر بھی تھے، اپنے امامباڑے میں خود تصنیف مرثیہ ایامِ محرم میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے ارد گرد امراء و رؤسا کے علاوہ شعراء کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ عزاداری کے سیاہ پوش اور غم آلود ماحول نے امراء اور شعراء کو اس قدر متاثر کیا کہ بہت سے امامباڑے اور مرثیہ گو شعراء وجود میں آگئے۔ راجہ جھاؤلال (متوفی ۱۸۱۳ء) نے ٹھاکر گنج میں ایک وسیع امامباڑہ تعمیر کیا۔ اس کے نوّ در اور چار دیواریں اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ ان کے علاوہ راجہ ٹکیٹ رائے (متوفی ۱۷۹۹ء)، افتخار الدولہ راجہ میوارام (متوفی ۱۸۶۷ء)، راجہ بلاس رائے رنگین، جگن ناتھ خطاب شرف الدولہ) متوفی ۱۸۶۲ء، نے بھی امامباڑے اور کربلائیں تعمیر کیں، ان میں کاظمین آج بھی مرجع خلائق ہے۔ شرف الدولہ نے کاظمین کے علاوہ گھڑیالی میں بھی امامباڑہ بنایا تھا۔ اس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ایک مشہور ہندو رئیس دلارام تھے۔ وہ بھی عزاداری شان و شوکت سے کرتے تھے۔ انھوں نے امامباڑہ تعمیر کیا۔ اس میں میر انیس اور ان کے بعد میر نفیس پڑھتے تھے۔ ان امامباڑوں میں جو مجلسیں برپا کی جاتی تھیں ان میں شعراء مرثیہ ہی پڑھتے تھے۔ مجلسوں میں ہندو لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ انھیں تعزیوں سے بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی گھروں میں تعزیے رکھتے تھے۔ ایک انگریز خاتون مسز میر حسن علی لندنی اپنی کتاب (آبزرویشنز آن دی مسلمانز آف انڈیا، مرتبہ کروک ۱۸۳۲ء لندن) میں لکھتی ہیں :

"ہندوستان میں کسی شیعہ مسلمان کا گھر تعزیہ سے خالی نہیں ہوتا، ہندوؤں کو تعزیوں سے کافی عقیدت ہے چنانچہ تعزیہ دیکھ کر یہ لوگ مؤدبانہ جھک جاتے ہیں۔ مجالس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور مسلمان انھیں بخوبی بٹھاتے ہیں۔ اس طرح امامباڑوں میں ہر مذہب کا آدمی صرف جوتا اُتار کر داخل ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سوائے انگریزوں کے کسی اور سے امامباڑے کے باہر جوتا اتارنے کے لئے کہنا بھی نہیں پڑتا۔"

ایک اور انگریز خاتون، جس نے لکھنؤ میں محرم دیکھا تھا اور جس کا نام مسس فانی پارکس تھا، اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

"یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیعوں کے علاوہ سنّی اور ہندو بھی ایامِ محرم میں اپنے گھروں میں تعزیے رکھتے ہیں۔ میرا باورچی ایک مجوسی تھا، وہ بھی محرم میں تعزیے پر کم سے کم چالیس روپے خرچ کر کے ایک پرجوش مسلمان کی طرح عزاداری کے مراسم بجا لاتا تھا۔ عاشورہ کے دن اپنے تعزیے کو کربلا میں دفن کرنے کے بعد پھر وہ اپنے دھرم کی پیروی کرنے لگتا تھا۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کی مزید تائید مرزا محمد حسن قتیل لکھنوی (متوفی ۱۸۱۷ء) سے بھی ہوتی ہے۔ وہ "ہفت تماشا" صـ۵۶ میں لکھتے ہیں کہ:

"لکھنؤ میں خدا کے فضل سے ہندو بھی تعزیہ دار، مرثیہ گو اور مرثیہ خوان ہیں۔"

غرضیکہ لکھنؤ میں جن امام باڑوں میں مجالسِ عزا منعقد کی جاتی تھیں، وہاں مرثیہ پڑھنا لازم و ملزوم تھا۔ مرثیہ ابتدا سے ہی آغوشِ شاہی میں پروان چڑھا تھا اسی لیے مرثیہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی جو عمر بھر مرثیے ہی کہتے رہے۔ مرثیہ زمانۂ قدیم میں غزل اور مربع کی صورت میں محدود اشعار میں لکھا جاتا تھا اور اس قسم کے مرثیے محض رونے اور رلانے کے لیے پڑھے جاتے تھے۔ ان میں کوئی ادبی شان نہیں ہوتی تھی۔ اس قسم کی مثالیں دکنی ادب میں ملتی ہیں۔ لکھنوی شعرا نے اس کی ہیئت اور روایت میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ سب سے پہلے اس کے لیے مسدس کا بہتر پیکر استعمال کیا گیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے پرانے مرثیہ گو شعرا جن کے مرثیے بڑی تعداد میں مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، قابلِ ذکر ہیں:

احسان، اعجاز، افسردہ، بشیر، ترقی، حاتم، حیدری، خادم، رضا، سودا، شریف، عالم (مرزا محمد عالم)، عشرت، اکرم، گدا، گل، مذنب، مشرق، میر، ناظم، ہوش، میر کاظمی اور مہربان۔ تمام شعرا نے مسدس میں ہی مرثیے کہے تھے اور یہ ذخیرہ ادبیات اور راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں مرثیہ کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اس دور میں مرثیے میں تنوع اور جدت آ گئی اور اس کے اجزائے ترکیبی بھی ایجاد کیے گئے۔ میر خلیق، میاں دلگیر، میر ضمیر، مرزا سید فصیح، ذاکر، عشرت وغیرہ نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ میاں دلگیر کی چھ، میر ضمیر کی ایک اور میرزا فصیح کی دو جلدیں آج سے سو سال پہلے چھپ چکی تھیں۔ یہ جلدیں اب بہت کمیاب ہیں۔

سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں جو مرثیہ گو مشہور ہو چکے تھے اور جن کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فسانۂ عجائب" میں میاں دلگیر کے ضمن میں کیا ہے، یہ ہیں:

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن، نیک ضمیر خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکرداتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب، سکندر بصورتِ گدا، بارِ احسانِ اہلِ دول کا نہ اٹھایا، عرصۂ قلیل میں سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"

فنِ مرثیہ کو اودھ کے آخری تاجدار حضرت واجد علی شاہ کے عہد میں اتنا عروج حاصل ہوا کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ افسوس کہ سلطنتِ اودھ کے انتزاع کے بعد ہی مرثیہ کا فن بھی رو بہ زوال ہوا۔ انیس و دبیر، انس و مونس، عشق و تعشق اور نفیس کے پہلو بہ پہلو ہندو شعرا نے بھی مرثیے میں نام پیدا کیا۔ ان میں دیا کشن ریحان، راجہ الفت رائے الفت، کنور دھنپت رائے محب، رام پرشاد بشر، چھنو لال زار، گربخش رائے اور لالہ حسین بخش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مرثیہ گوئی کے آخری دور میں اوج، عروج، پیارے صاحب رشید اور عارف وغیرہ نے اس فن کو متنوع مضامین سے دوچار کیا۔ آزادی سے قبل جن ہندو شعرا نے مرثیہ کے فن میں مظاہرہ کیا اور جو لکھنؤ کی عزاداری کے ماحول سے متاثر ہوئے تھے ان میں نانک لکھنوی، دتو رام کوثری، روپ کماری، فراقی دریابادی، منی لال جوان اور یوگیندر پال صابر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ مجالسِ عزا میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ انھوں نے متعدد مرثیے کہے ہیں جو راقم الحروف کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ جوش نے اپنے انقلاب آفریں مرثیوں میں تحریکِ آزادی کے

ولولوں اور اُمنگوں کو اُجاگر کر کے اہلِ استبداد اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ان کے مرثیے قابلِ مطالعہ ہیں۔ ایسا قادر الکلام شاعر اب کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کا مرثیہ "حسین اور انقلاب" معرکے کی چیز ہے۔

اُردو مرثیہ ہر اعتبار سے بھائی چارہ اور قومی یک جہتی کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی سیرت ہر بنی نوعِ انسان کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ انھوں نے سچائی، اتحاد وحدت اور انسانیت کے بلند اصولوں کے تحفظ کے لیے عظیم ترین اور بے مثال قربانی پیش کی، وہ آزادی پسند تھے۔ جیو اور جینے دو یعنی صلح پسندی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ وہ فتنہ و فساد اور جاہ و اقتدار سے دور رہ کر زندگی گزارنا چاہتے تھے اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتے تھے۔ مرثیوں میں انھی زرّیں اصولوں کا احیا کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندستانی تہذیب کے اعلیٰ عناصر محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذُوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

صندل اور مانگ ہندستانی عورتوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں دونوں عناصر عرب کی عورتوں میں مفقود ہیں۔ اب جبکہ ہندستانی عورت دُعا کے طور پر صندل اور مانگ کے الفاظ استعمال کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو دُعا حضرت زینب کرتی ہیں، ایسے موقعوں پر وہ محل کی مناسبت سے موزوں ترین ہے۔ کسی عورت کا عورت کو دعا دینا کہ مانگ صندل سے بھری رہے، اس کا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ فی الواقع مانگ میں صندل بھرا ہوا ہو۔ بلکہ یہ کہنا ہے کہ سہاگ قائم رہے۔ شوہر زندہ رہے۔ علاوہ بریں ہندو عورتیں مانگ میں صندل نہیں بلکہ سیندور بھرتی ہیں۔ صندل بطور قشقہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ امر قطعاً غیر متعلق ہے کہ عرب عورت اس حالت میں کیا دعا مانگتی ہے۔ جہاں تک ہندستانیوں کے جذبات کا تعلق ہے یہ دُعا بالکل نیچرل ہے اور انیس کے مخاطب ہندستانی ہیں نہ کہ عرب کے مسلمان۔ یہ مرثیہ نگاروں، خاص کر انیس کا کمال ہے کہ انھوں نے جن لسانی سیرتوں کو پیش کیا ہے ان میں ایک حد تک ہندستانی فطرت کو بھی شامل کر لیا ہے۔

لکھنؤ کی مجالس میں صاحبانِ فہم کا مجمع رہتا ہے۔ اس میں ہندو وغیرہ بھی شرکت کرتے ہیں اور باادب ہمہ تن گوش ہو کر مرثیہ سنتے ہیں انیس ایک مرثیے میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بند انیس کی کسی جلد میں نہیں ہیں بلکہ ایک قلمی نسخے میں موجود ہیں، جو راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان میں سے صرف دو بند جن کے پہلے مصرعے یہ ہیں ؎

(۱) ہر چند بے ثبات ہیں یہ آسماں اساس
(۲) ذی علم و نکتہ فہم و سخن سنج و ذی شعور

پروفیسر ادیب مرحوم نے ایک رسالہ "ادب" لکھنؤ بابت مئی ۱۹۳۱ء صـ۵۳ میں "عکس تحریرِ حضرت انیس مغفور" کے عنوان سے ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع کیے:۔

"خدائے سخن میر انیس مغفور نے غدر کے بعد اُجڑے ہوئے لکھنؤ کی تعریف میں سولہ بند کہہ کر کسی مرثیے میں شامل کر دیے تھے۔ یہ بند ایک رُو ورق پر خود حضرت مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مغفور کے پڑ پوتے جناب محمد حسن صاحب فائز کے پاس موجود ہیں۔ انھیں میں سے نویں اور دسویں بند کا عکس ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ناظرین اس یگانۂ روزگار کی شانِ خط سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔" (ادیب)

ہماری تحقیق کے مطابق مرثیے کے یہ بند انیس کے اس مرثیے میں موجود ہیں جو راجہ صاحب کے کتب خانے میں ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؏

جب تک خدا کا عَلَم سرنگوں ہوا (۲۳۱ بند)

ہر دل ہے عندلیبِ گلستانِ لکھنؤ — رضواں بھی ہے ارم میں ثنا خوانِ لکھنؤ
گلزار مومنیں ہے زہے شانِ لکھنؤ — نورے علی علی کے ہیں قربانِ لکھنؤ
کیوں سرخرو نہ ہو چمن سبزہ زار ہے
دیکھو کہ اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے
مالی بھی اس مرقعِ ماتم میں دنگ ہے — گلشن کو صورت کیجیے بکلی [illegible]

نوحوں میں ان کے نالۂ بلبل کا آہنگ ہے　　ماتم کے ولولے میں بُکا کی امنگ ہے
دس روز ماتمِ شہِ دیں میں گزرتے ہیں
جیتے رہیں یہ لوگ کہ رونے پہ مرتے ہیں

مجلس کا انتظام اسی شہر پر ہے ختم　　رونے کا اہتمام اسی شہر پر ہے ختم
یہ آبروئے نام اسی شہر پر ہے ختم　　بس ماتمِ امام اسی شہر پر ہے ختم
پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

سب عارفِ حق خلفِ بوتراب ہیں　　شیدائے نامِ سبطِ رسالت مآب ہیں
سرگرمِ کارِ خیر و شریکِ ثواب ہیں　　بے شک یہ کوثری ہیں کہ آنکھیں پُر آب ہیں
روتے ہیں ذکرِ قتلِ شہِ خوش خصال پر
موتی نثار کرتے ہیں زہراؑ کے لال پر

ذی علم، نکتہ فہم، سخن سنج و ذی شعور　　ذی قدر، ذی وقار، فروتن، سخی، غیور
نخوت نہ خود سری، نہ تکبر نہ مکر و زور　　وضعیں درست، قلب صفا اور رُخوں پہ نور
کیونکر نہ فرش و عرش پہ یہ نیک نام ہیں
آقا حسینؑ سا ہو تو ایسے غلام ہیں

سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ہندوستانی معاشرہ روبہ تنزل ہوا ہے اور ترقی پذیر زمانے میں انسانی افکار و خیالات میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فقدان ہو رہا ہے جہاں لوگ مذہبی معاملات میں دور ہوتے جا رہے ہیں وہاں عزاداری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ الحمد للہ روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ منی لال جوآں سندیلوی اپنے ایک مرثیے کے چہرے میں کہتے ہیں ؎

ہم شانِ خلد کوچہ و بازارِ لکھنؤ　　جامِ جہاں نما در و دیوارِ لکھنؤ
حوریں بھی آتی ہیں پئے دیدارِ لکھنؤ　　حق سے ملا کریں ہیں طلب گارِ لکھنؤ
ہر شخص کی زباں پہ ہے چرچا حسینؑ کا
سایہ ہے لکھنؤ پہ شہِ مشرقین کا

بے شک عزائے شاہ کا مرکز ہے لکھنؤ　　وہ اہلِ شہر ہیں کہ فرشتوں کی جن میں خو
ہوں ملیں گے ایسے جو رہتے ہیں باوضو　　ہنگامِ تسبیح اُٹھے دم لبے میں گفتگو
بزمِ عزا سے مات ضیا کہکشاں کی ہے
قربان مجلسوں میں فضا آسماں کی ہے

دنیا ہے کون جس کو نہیں ہے غمِ امام　　سبطِ نبیؐ پہ بھیج رہا ہے ہر اک سلام
ہیں اہلِ لکھنؤ پہ عزادار یاں تمام　　شہؑ نے گلا کٹا کے کیا ہے بلند نام
سب کو جو آں ہے بادشہِ مشرقین کی
ہر دل میں ایک قبر بنی ہے حسینؑ کی

انیس اور دبیر نے مرثیے کے فن میں زبردست تبدیلی رونما کی اور اپنے متنوع مضامین اور طرزِ ادا کی جدت سے اس کو رزم نگاری سے ہمکنار کیا۔ اس طرح دو کتابیں مرتب کی گئیں۔ ایک رزم نامہ انیس (مسعود حسن رضوی) اور رزم نامہ دبیر (دبیر لکھنوی)۔ انیس کے مرثیے فن تنقید نگاری کے بانی ارسطو کے مقرر کردہ اصولوں کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان میں مبالغہ کی خوبیوں کے علاوہ المیہ عناصر بھی بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ابتدا، درمیانی کڑیاں اور خاتمہ کے اجزا ملتے ہیں اور یہ ایک ہی نشست میں ختم ہوتے ہیں۔ وہ مرثیے کے اسلوب کے بارے میں کہتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

میر انیس اپنے والد میر خلیق کے شاگرد تھے۔ وہ فخر سے کہا کرتے تھے ؏

حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر سبز زباں

خلیق کے مرثیے اپنی سلاستِ زبان اور فصاحت و محاورات کے اعتبار سے اردو شعرا کے لئے ایک معیار اور محک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے تینوں بیٹے انیس، انس اور مونس، ان کے پوتے اور پرپوتے سب مرثیہ گوئی میں اپنے اپنے وقت میں استاد مانے جاتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے آخری دورِ تمدن کا یہ بھی ایک زمانہ ہے جو معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہی نسل سات پشتوں تک مسلسل شعر و شاعری کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر قائم رہی۔ غالباً دنیا کے کسی تمدن میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میر خلیق نے صحتِ محاورہ اور بیان کی سادگی اور لطافت کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس کا نفسِ شعر مصحفی سے

قطعی متاثر نظر نہیں آتا۔ ان کے گھر میں کئی پشت سے شاعری کا چرچا تھا اور لکھنؤ کے سارے باکمال ان کے خاندان کی زبان سیکھنا فخر سمجھتے تھے خلیق نے جو کچھ سیکھا میر حسن سے سیکھا۔ خلیق صاحب دیوان شاعر تھے۔ دیوان اب نایاب ہے۔ راقم کو ان کی ستعدد غزلیں دستیاب ہوئیں جن کے اشعار کی تعداد ۲۲۱ ہے۔

میر خلیق (متوفی ۱۸۴۴ء) کے مرثیوں کی کوئی جلد نہیں چھپی ہے ناقدین ادب مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ خلیق کے مرثیے ان کے ساتھ ہی دفن ہو چکے ہیں۔ شبلی کا یہ بھی کہنا درست نہیں کہ انیس سے پہلے عون و محمد کی روایت کا سرے سے کہیں پتہ نہ تھا۔ (موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۵۸ الہ آباد ایڈیشن ۱۹۳۶ء) خلیق نے ان دونوں شہزادوں کے حال میں متعدد مرثیے لکھے ہیں۔ مثال میں ذیل کے مرثیے پیش کیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) جب کہ زینبؑ کے پسر جنگ کو آئے رن میں (۵۸ بند)
سال کتابت ۳ر جمادی الاول ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء)

(۲) جب گرے گھوڑوں سے زینبؑ کے پسر میدان میں (۶۰ بند)
سال کتابت ۱۰ر شوال ۱۲۲۳ھ (۱۸۱۸ء)

(۳) رن کی جب قاسمؑ و عباسؑ نے رخصت پائی (۳۶ بند)
سال کتابت ۹ر رمضان ۱۲۲۰ھ (۱۸۱۴ء)

آج سے کوئی ۲۵ سال قبل ادیب مرحوم کے ذخیرۂ مراثی میں میر خلیق کے مراثی کی چار ضخیم غیر مطبوعہ جلدیں راقم کی نظر سے گزریں۔ ان کی تعداد ۲۶۴ ہے۔ بعض مرثیوں کے ایک سے زیادہ نسخے بھی ہیں۔ علاوہ بریں راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں کوئی ۷۵ نسخے دستیاب ہوئے۔ ان سبھی مرثیوں کی فہرست ہم نے "اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقا" میں تفصیلات کے ساتھ مرتب کی ہے۔ خلیق کے دیوان سلام کی فہرست بھی کتاب میں شامل ہے۔ ہم نے مراثی خلیق کی ایک جلد بھی ترتیب دی ہے اس میں ۱۴ غیر مطبوعہ مرثیے ہیں۔ ذیل میں ہم میر خلیق کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ کے ابتدائی چند بند درج کرتے ہیں۔

اس میں ۱۲۹ بند ہیں۔ اس مرثیے سے یہ روایت بھی کالعدم ہوجاتی ہے کہ انیس اور دبیر سے قبل مرثیوں میں بندوں کی تعداد ۵۰، اور ۶۰ کے درمیان ہوتی تھی۔ مقطع میں خلیق نے میر ضمیر (متوفی ۱۸۵۲ء) کا نام بھی لیا ہے۔ مرثیے میں حضرت عباس کا سراپا بڑی نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کھینچا گیا ہے۔ اس کا طرزِ اسلوب لاجواب اور برجستہ ہے۔ سادگی، شگفتگی اور روانی قابلِ ستائش ہے۔ اشعار پُرلطف، تشبیہیں دلآویز، بندشیں چُست ہیں۔ مرثیے میں آمد، رفت، رجز، جنگ، شہادت اور بین کے متنوع مضامین اچھے ڈھنگ سے استعمال کیے گئے ہیں۔ غرضیکہ شاعر کی قادر الکلامی، مضامین کی پختگی اور مکالمہ نگاری کے گوناگوں خوبیوں سے مرثیہ لبریز ہے ؎

ہاں آمدِ برادرِ شاہِ شہید ہے
لرزاں مثالِ بید سپاہِ یزید ہے
مشہورِ دو جہاں یہ شجاع و سعید ہے
صبحِ شبِ قتال اسے روزِ عید ہے
غل ہے کہ یہ دلیر ہے ابنِ دلیر ہے
یہ غازیوں کا غازی ہے شیروں کا شیر ہے

شاہِ سریرِ منصب اعلائے جعفری
فرماں روائے سلطنتِ ارثِ حیدری
سرتاج نورِ مہر سپہرِ رُخ جعفری
زیرِ نگیں ہے کشورِ ہر خشکی و تری
شاہِ وفا حسینؑ ہے اور یہ وزیر ہے
خود بھی امیر و ابنِ جنابِ امیرؑ ہے

سردار ہے شجاعوں کا غازی یہ سر بسر
سینہ برائے سرورِ دیں کر دیا سپر
سر کر دیا نثار سرِ شاہِ بحر و بر
تحسین اس کو کرتے ہیں سارے بچو پسر
سب مل کے اسکو کہتے ہیں شیدائے اہلبیتؑ
سردفترِ وفا ہے یہ سقائے اہلبیتؑ

مرثیے کا مقطع یہ ہے ؎
خاموش اے خلیق بہت طول اب ہوا
افسردہ ان دنوں دلِ غمگین ہے مرا

ہرچند ناامید ہوں مطلب سے ہو چکا
قولِ شبیرؑ سے ہے مگر دل کو آسرا
اعجاز صد ہزار پیمبرؑ کرے علیؑ
چاہے تو انقلاب مقدر کرے علیؑ

□□

کتابیات:

(۱) اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء۔ اکبر حیدری
(۲) قیصر التواریخ (جلد اول) سید کمال الدین حیدر ص ۳۸، ص ۱۰۳، ص ۱۳۴
(۳) لکھنؤ گزیٹیر ص ۱۳۸، ص ۱۰۲، ص ۲۰۳
(۴) تفضیح الغافلین۔ مرزا ابو طالب ص ۱۵
(۵) مثنوی گلزار ارم۔ میر حسن ص ۱۴۲ (۶) مرقع اودھ ص ۲۹
(۷) آفتاب اودھ (قلمی نسخہ) ص ۱۱ (۸) کلیات سودا (قلمی نسخہ)
(۹) انیس کی مرثیہ نگاری۔ مرزا جعفر علی خاں اثر ص ۲۱
(۱۰) تاریخ اودھ جلد سوم ص ۲۹۹، (۱۱) تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۰
(۱۲) تاریخ اودھ جلد دوم ص ۲۵۳ (۱۳) وزیر نامہ ص ۲۵
(۱۴) ہفت تماشا۔ مرزا قتیل لکھنوی ص ۱۵۶
(۱۵) تنقیدی مقالات۔ ڈاکٹر زور ص ۲۹۴

لکھنؤ کے مہاجر ادب پر ایک نظر

صفحہ ۱۸۳ کا بقیہ

کہ واجد علی شاہ کے دور میں اندر سبھا کا عروج یورپی ڈرامے کی تحریک سے ہوا۔ انشاؔ کے کلام میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طرف اشارے اور حوالے جابجا ملتے ہیں۔ یہی حال رنگینؔ کا بھی ہے۔ "فسانۂ عجائب" میں سپر مجسٹین جیسے کردار ہی ملتے ہیں۔ غرض تہذیبی امتزاج کا ایک نیا پیکر لکھنؤ کے اُردو ادب میں اُبھرا۔

بے شک غزل سے لکھنؤ کے سکّہ بند شاعروں نے کیفیت چھین لی مگر اسی کے عوض مرثیے، مثنوی، ڈرامے، واسوخت کی شکل میں اتنا کچھ دے دیا اور نثر کو اتنا آگے بڑھا دیا کہ یہ کمی پوری ہو گئی۔ اس ذخیرۂ ادب کی اپنی خصوصیات اور اپنی پہچان ہے جس میں ارضیت اور زبان کی آئین بندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے لکھنؤ کی شاعری اور ادب پر منفی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے دیانت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کے مثبت اور قابلِ قدر پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے اور اس کی تہذیبی انفرادیت اور ادبی قدر و قیمت کا بھی معروضی انداز میں تعین کیا جائے، اس کے لئے شاید لکھنؤ کے ادبی سرمائے پر نئے سرے سے دوبارہ نظر ڈالنا ضروری ہے جو تعصب سے پاک اور قدیم تنقید کی سکہ بندی سے آزاد ہو۔

"ہندوستان کی قومی یک جہتی کی راہ میں فرقہ وارانہ تعصب ہی نہیں چھوت چھات بھی بہت بڑا روڑا تھا۔ اُردو شاعر نے اس مسئلہ پر بھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ مہاراج بہادر برقؔ اپنی نظم "اچھوتوں سے نفرت" میں کہتے ہیں ؎

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے
اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
دُور از رہِ حقیقت یہ فرق ظاہری ہے
ہر قصرِ تن میں روشن اک شمعِ زندگی ہے
جلوے ہیں سب اسی کے رازِ حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیصِ ذات کیا ہے

"اُردو میں قومی یک جہتی کے عناصر"
از مجاور حسین رضوی ص ۲۱۷

ڈاکٹر حبیب نثار

حیدرآباد میں عہدِ آصف الدولہ کے

چند نایاب غیر مطبوعہ مخطوطات

آصفُ الدّولہ کا عہدِ حکومت ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ/۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء پر محیط ہے۔ یہ زمانہ تہذیب کی ترقی کے لحاظ سے سلطنتِ اودھ میں سنہری عہد کہلائے جانے کا مستحق ہے ــــــ اسی زمانے میں فنونِ لطیفہ کے تمام دبستانوں نے اودھ میں ترقی کی۔ اُردو شعراء میں میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، صاحب قرانؔ، انشاؔ دادِ سخن دے رہے تھے۔ میر حسین عطا خاں تحسین نے ۱۷۸۱ء میں نوطرزِ مرصع مکمل کی۔ شاہ صابر علی غلام رضا نے ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں ہندستانی موسیقی کی مبادیات پر "اصول النغمات الآصفی" جیسی بے بدل کتاب تصنیف کی۔ شاہ کمال نے اُردو کا ضخیم ترین تذکرہ یہیں اور اسی زمانے میں ترتیب دیا۔ میر حسنؔ نے اُردو کی بہترین مثنوی سحر البیان اسی عہد آصف الدولہ میں مکمل کی۔ ہولی، بہار اور بسنت کے جشن مناتے ہوئے آصف الدولہ نے موسیقی کو دربار کے ایوانوں سے نکال کر تیوہار کا روپ دے کر ڈرامہ کی بنا ڈالی۔ اسی عہد میں زوفینی نے مصوری میں اودھ اسکول کی پہچان بنائی ــــــ خود آصف الدولہ نے امام باڑہ آصفی، دولت خانۂ آصفی اور مسجد آصفی تعمیر کیں، اور اسی زمانے میں غلام مرتضیٰ فیض آبادی نے ۱۱۹۴ھ میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر اُردو میں لکھنے کی سعیِ بلیغ فرمائی ــــــ اسی لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ اردو ادب کی ترقی و ترویج کے تناظر میں اس عہد کو لکھنؤ کا عہدِ زرّیں کہنا مناسب ہوگا۔

حیدرآباد کے کتب خانوں میں اس عہد کے بیشتر مخطوطات محفوظ ہیں۔ کلیاتِ سوداؔ کا ۱۱۹۵ھ کا مکتوبہ نسخہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ کلیاتِ سوداؔ کا ایک اور قلمی نسخہ شعبۂ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ دیوان میر سوز کے قلمی نسخے کتبخانہ سالارجنگ، کتب خانۂ آصفیہ (موجودہ ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی) اور کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح دیوانِ میر حسنؔ، دیوانِ جراتؔ، دیوانِ مصحفیؔ، کلیاتِ انشاؔ، کے مخطوطات حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں مخزون ہیں۔ مثنوی سحر البیان کے تقریباً پچاس قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں کی زینت ہیں، جن میں بعض لکھنوٴ میں کتابت شدہ ہیں۔

حیدرآباد میں مخزون عہد آصف الدولہ کے سیکڑوں مخطوطات میں سے راقم الحروف صرف چند ایسے مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کر رہا ہے ــــــ جو نایاب ہیں اور جن کی تفصیل بیشتر اہلِ ادب کی آنکھوں سے اب تک اوجھل رہی ہے۔

اودھ کا پہلا صاحبِ کلیات حکمراں :

نواب آصفُ الدّولہ آصفؔ

یحییٰ خاں عرف مرزا امانی، نواب شجاع الدولہ بہادر کے یہاں ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ دہلی سے آئے مہاجر شاعر میر سوزؔ سے مشورۂ سخن کیا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال پر مسند نشین ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد لکھنؤ کو بجائے فیض آباد اپنا دار الحکومت بنایا۔ یہیں پر محل بنوائے، امام باڑہ تعمیر کیا اور لکھنؤ کو اتنی ترقی دی کہ رشکِ شیراز و اصفہان ہوگیا۔ آصف الدولہ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہوئے عمدہ منتخبہ میں سرورؔ لکھتے ہیں :

"...... الکتاب فضائل وکمالات فنون بے نظیر و در ہر فن ید طولیٰ داشت چنانچہ در تیر اندازی و تفنگ بازی بنوعے ماہر بود کہ طائران را از فلک بر زمین مے انداخت، غرضکہ مناقب و توصیف آں والا مرتبت ہر قدر کہ مرقوم شود بجاست و خامۂ بلند تلاشش بلکہ از ارقام جوہر ذاتیش کوتہی می کند" [۵۱]

آصف الدولہ کی مہارتِ تیر اندازی کا بیان عبدالغفور نساخ نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں :

"تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا" [۵۲]

آصف الدولہ کی شعر گوئی سے متعلق تذکروں میں تراجم ملتے ہیں چناں چہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی "گلشنِ سخن" میں لکھتے ہیں

"گاہے سخنے می فرماید ایں دو بیت از آنجناب است" [۵۳]

مصحفی تذکرہ ہندی میں رقم طراز ہیں :

"از بسکہ از ابتدائے عمر در جمیع فنون دانائے یگانۂ روزگار است بمقتضائے موزونیِ طبع گاہ گاہے خیال شعر نیز می نماید چند اشعار از کلام اوست" [۵۴]

مجموعۂ نغز میں قاسم لکھتے ہیں :

"گاہ گاہ طبع فیض بخشش میل سخن می کرد و بامزہ می گفت ایں بست و یک بیت از کلام حشمت انتظام اوست عفی اللہ عنہ" [۵۵]

عمدۂ منتخبہ میں سرور نے بھی اسی طرح کا بیان لکھا ہے۔ دیکھیے :

"خاطرش اکثر مائل ریختہ گوئی بود۔ اشعار برجستہ از طبع وقادش سر می زد و پرداخت...... ایں چند شعر ازاں گوہر دریائے وزارت بہ نظر ایں مولف رسیدہ" [۵۶]

ان اقتباسات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ آصف الدولہ آصف کے مکمل کلام سے تذکرہ نگار واقف نہیں صرف کچھ ابیات پر نظر رہی جبکہ آصف الدولہ آصف نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں اردو میں انھوں نے مکمل کلیات ترتیب دیا ہے۔ فارسی کلام بھی قابلِ قدر ہے۔ اردو میں انھوں نے غزل، مثنوی، رُباعی، مخمس، مسدس سبھی کہے ہیں۔

کلیاتِ آصف الدولہ آصف

حیدر آباد میں کلیاتِ آصف کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ایک قلمی نسخہ شعبۂ مخطوطات الکتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں موجود ہے اور دوسرا نسخہ کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی آندھرا پردیش میں محفوظ ہے۔

کلیاتِ آصف نسخہ سالارِ جنگ حیدر آباد

کلیاتِ آصف نسخہ سالار جنگ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے کلیات میں کلام کی مناسبت سے تین حصّے قرار دیئے گئے ہیں اور ہر حصّے کی ابتدا میں طلائی لاجوردی نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ تقریباً دو سو صفحات پر جدول بنایا گیا ہے جس پر نیلگوں، سنہری اور سرخ حاشیہ ہے، درمیان سے جدول کو تقسیم کیا گیا ہے تاکہ شعر کے دونوں مصرعے اہتمام سے لکھے جائیں۔ جملہ ۳۱۲ ورق اور ایک صفحہ پر یعنی جملہ ۶۲۵ صفحات پر کلام موجود ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کاغذ دیسی۔ مخطوطہ کا سائز "۱۰×۷" ہے اور ہر صفحہ پر ۱۱-۱۰ سطر لکھی گئی ہیں۔

مخطوطہ کی ابتدا میں ۲۰ صفحات سادہ ہیں۔ صفحہ ۲۸ منقش ہے نیلگوں اور سنہری قلم سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ صہ۲۸ اور صہ۲۹ کے ہر شعر کو سنہری زنجیرہ سے سجایا گیا ہے۔ ان دو صفحات کے حاشیہ کو بھی سنہری بیل بوٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اوراق پر نمبر ہیں ترک موجود نہیں چنانچہ صہ۲۹ پر کاتب ہی کے قلم سے ورق کا نمبر لکھا ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ورق سے قبل بھی ایک ورق موجود تھا جس پر یقیناً کلیات اور شاعر کا نام لکھا ہوگا ــــ تقریباً تمام حروف تہجی پر مشتمل ردیف میں کلام موجود ہے۔ ہر ردیف کی غزلوں کے بعد چند صفحات سادہ رکھے گئے ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ خود آصف الدولہ بہادر کا نجی مخطوطہ ہوگا۔؟

فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ کے مرتب نصیر الدین ہاشمی اس مخطوطہ کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں :

اس کلیات میں اولاً ردیف دار غزلیات ہیں۔ ہر ردیف کے بعد کسی قدر صفحے خالی رکھے گئے ہیں۔ اس کے

بعد دوسرے ردیف کی غزلیات شروع ہوئی ہیں۔ غزلیات کے بعد مخمس ہیں اور اس کے بعد ایسے چند مخمس ہیں جو فارسی غزلیات پر موزوں کیے گئے ہیں۔ آخر پر (کذا) ایک مثنوی ہے ـــــ اس کے بعد ۹ صفحے میں فارسی غزلیات ہیں پھر رُباعیات اس کے بعد بسم اللہ کے ساتھ حمد اور نعت ہیں، مثنویاں ہیں۔ آخر میں ایک مخمس ہے۔ مخمس کے بعد ایک مثنوی منقبت حضرت علی میں ہے اس کے باوجود کلیات ناقص الآخر ہے۔" ؎۵

نصیر الدین ہاشمی نے کلیات کو ناقص الآخر قرار دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کلیات ناقص الاوسط بھی ہے کہ درمیان سے بھی بیشتر صفحات گم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بیشتر غزلیات اور صفحات گم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بیشتر غزلیات اور صفحات نامکمل رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب کتب خانہ کو کاتب کے لکھے ہوئے نمبر اوراق سے علاحدہ نمبرات اوراق پر لکھنے پڑے ہیں۔ اس کلیات میں ہر ردیف کی حسبِ ذیل غزلیں موجود ہیں جسے یہاں ایک جدول کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے:

حرف	تعداد غزلیات	حرف	تعداد غزلیات	حرف	تعداد غزلیات
ا	۴۴	ر	۱۸	ف	۱
ب	۳	ز	۶	ق	۱
ت	۸	س	۵۹	ک	۲
ث	۲	ش	۴	ل	۳
ج	۴	ص	۱۵	م	۶
چ	۱	ض	۱۳	ن	۲۵
ح	۲	ط	۱۸	و	۱۲
خ	۲	ظ	۱۲	ہ	۶
د	۱۰	ع	۱۳	ی	۷۰
ذ	۱۳	غ	۱۲	میزان:	۳۸۵

... اور اس طرح کلیات میں جملہ ۳۸۵ غزلیں ہیں جو ورق ۲ الف سے ورق ۱۸۰ الف تک درج ہیں۔ اس کے بعد ورق ۱۸۰ ب سے ابتداءً فارسی غزلیات پر لکھے گئے صفحات ہیں پھر اُردو کے ۵۴ مخمس ہیں جو ورق ۲۵۱ ب تک ہیں۔ اسی حصے میں چند مسدس بھی ہیں۔ ورق ۲۵۵ الف سے ورق ۲۶۱ ب تک ۷۵ فارسی غزلیں ہیں۔ ورق ۲۶۳ الف سے رباعیات درج ہیں، تمام ۳۰ اُردو اور ایک فارسی رباعی ہے۔ ورق ۲۶۵ الف سے معتبر مثنوی شروع ہوتا ہے۔ پہلا صفحہ نیلگوں اور سنہری نقش و نگار سے مزین ہے۔ ابتداءً حمد میں مثنوی کہی ہے جس میں ۵۴ شعر ہیں۔ پہلا شعر:

خدا وندا کہاں طاقت زباں میں
کر لاؤں وصف تیرا کچھ بیاں میں

۵۴ شعر کے بعد ۱۴ شعر پر مشتمل فارسی غزل ہے۔ پھر مزید نو شعر کہہ کر نعت شروع کی ہے جو ورق ۲۶۱ الف سے شروع ہوتی ہے۔ پہلا شعر ہے ؎

محمد خازنِ گنجِ خدائی
محمد نورِ ذاتِ کبریائی

نعت کے ہر شعر میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر شعر کے دونوں مصرعے سرورِ کائنات کے اسم مبارک یعنی محمدؐ ہی سے شروع ہوتے ہیں اور اس طرح ۹۸ شعر کہے ہیں اور ۱۰۲ شعر کے بعد نعت ہی کے بیان میں اُردو غزل کہی ہے جو ۱۲ شعر پر مشتمل ہے پھر ایک فارسی غزل نعت ہی میں ۱۵ شعر کی کہی ہے اور پھر مثنوی مسلسل ہوئی ہے اور مزید ۱۴۴ شعر کہنے کے بعد واقعہ معراج وصفت براق ؓ بیان کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی منقبت کی جانب گریز کیا ہے۔ ص۲۰۳

بہر اِن اشعار کے بعد منقبت شروع کی ہے ؎

سنا ہے میں نے راوی معتبر سے — نبیؐ پاک جب اودھر گئے ہیں
یہاں سوئے تھے اون کے بستر اوپر — وصیِ مصطفےٰ شاہِ ولایت

علیِ مرتضےٰ جانِ محمدؐ
نبی آرا وہ بستانِ محمدؐ

اور اس کے بعد منقبت شروع کی ہے اور ۹۸ شعر تک شعر کے ہر دو مصرعوں کو حضرت علیؑ کے اسم مبارک سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد کے دو شعر بھی حضرت علیؑ کے نام ہی سے شروع کیے ہیں لیکن مصرعِ ثانی میں اس کا اہتمام نہیں ہے۔ ان اشعار کے بعد حضرت علی کی مدح میں غزل کہی ہے پھر مثنوی شروع کی ہے ... چند شعر کے بعد مثنوی کے اوراق ضائع ہو گئے ہیں اس لیے مثنوی ناقص الآخر ہے۔ موجودہ صورت میں

یہ مثنوی تقریباً آٹھ سو شعروں پر مشتمل ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے کلیات میں تین مثنویوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے انھیں تسامح ہوا ہے۔ دراصل کلیات میں صرف دو مثنویاں ہیں، ایک مختصر مثنوی صرف تیس شعر پر مشتمل ردیف الف کی غزلوں کے درمیان "ہُوا" پر موجود ہے

اے یارو میں رکھوں تھا ایک زر نگار ہُوا

مت تجھے کیا تھا جس کے اوپر ہزار ہُوا

اور دوسری مثنوی فارسی کلام کے بعد کلیات کے حصۂ سوم میں درج ہے جو کہ حمد نعت و منقبت میں ہے۔ کلیات آصف نسخۂ سالار جنگ کی ابتدا حسب ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

کس قدر اردو کے شب کرتا تھا مذکور ترا

وہی بیمار ترا خستہ و رنجور ترا

(ورق ۱۲ الف)

کلیات آصف نسخۂ آصفیہ

کلیات آصف کے اس نسخہ میں جملہ اوراق ۳۲۸ ہیں یعنی نسخۂ سالار جنگ سے ۲۰ ورق زیادہ ہیں۔ مخطوطہ کا سائز ۲۹٫۱۵ × ۲۰ ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں۔ کاغذ دیسی، خط نستعلیق ہے۔

مخطوطہ کے پہلے صفحہ پر جہاں کلیات کا نام اور شاعر کا نام کاتب کے قلم سے درج ہے اسی صفحہ پر شکستہ تحریر میں ایک نوٹ بہ زبان فارسی موجود ہے جس کے آخر میں تفضل حسین خاں کا نام صاف پڑھا جاتا ہے یہ تفضل حسین خاں خان علامہ ہیں جنھوں نے نواب سعادت علیخاں کی تخت نشینی ہونے میں مدد کی تھی ــ اس طرح یہ نسخہ نہایت اہم ہے۔ مذکرہ بالا نوٹ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ آصف الدولہ ہی کی حیات میں نقل ہوا ہے۔ کلیات کے صفحات پر کوئی جدول وغیرہ نہیں بنایا گیا ہے۔ سادہ صفحات پر کلام نوٹ کرلیا گیا ہے۔ نقش و نگار مطلق نہیں ہیں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر پہلے مثنوی درج کی ہے چنانچہ کلیات حسب ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

خدا وندا کہاں طاقت زباں میں

کہ لاؤں وصف تیرا کچھ بیاں میں

جہاں مثنوی مکمل ہے۔ اس مثنوی کے بعد متعدد دوسرے شعراء کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ جرأت کی مختصر مثنوی (صرف چھ شعر) "کربلا جاؤ" بھی ان صفحات پر درج ہے۔ سودا کی بھی چند مثنویات درج ہیں۔ دوسرے شعراء کے کلام کو درج کرنے کے بعد چند صفحات سادہ چھوڑ دیئے گئے ہیں پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر غزلیات آصف نقل کی گئی ہیں۔ اس نسخہ میں صرف ۲۰۸ غزلیات موجود ہیں یعنی نسخۂ سالار جنگ سے ۹۰ غزلیات کم ہیں۔ لیکن آٹھ غزلیں اس نسخہ میں ایسی ہیں جو سالار جنگ میں موجود نہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ذ۔ دو غزلیں، ش۔ دو غزلیں، غ۔ دو غزلیں، م۔ ایک غزل اور ن ایک غزل ــــــ اس طرح آصف الدولہ کے ہر دو کلیات میں موجود غزلیات کی جملہ تعداد ۳۸۵+۸=۳۹۳ ہوتی ہے اور ان غزلوں کے اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔

نسخۂ سالار جنگ میں موجود مثنوی "ہُوا" نسخۂ آصفیہ میں موجود نہیں اس کے برخلاف نسخۂ آصفیہ میں "مثنوی چیٹنی" موجود ہے۔ جو بڑی چٹ پٹی مختصر مثنوی ہے۔ مگر نسخۂ سالار جنگ ہی کے مماثل ہیں۔ البتہ اس نسخہ میں صرف ۲۳ رباعیاں موجود ہیں یعنی نسخۂ سالار جنگ سے ۷ کم نسخۂ آصفیہ میں ۲۰ رباعیاں درج ہیں۔

دونوں ہی نسخوں میں املا بارھویں صدی ہجری کے آخر کا ہے۔ چنانچہ یائے مجہول اور یائے معروف میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا ہے۔ ٹ اور ڈ کے لئے حرف پر چار نقطے ڈالے گئے ہیں، ک فارسی و ک ہندی پر ایک ہی مرکز "ڈالا گیا ہے۔

غزل کے اشعار نسخۂ سالار جنگ سے یہاں نمونتہً درج کیے جاتے ہیں "کلام الملوک ملوک الکلام" ہے ؎

ایک ہی آن میں غلام کیا	اس ادا سے مجھے سلام کیا
عشق نے آخر اپنا کام کیا	لے گیا ننگ و نام اب مجھ سے

قصۂ جاں گداز اے آصف

تھوڑی سی بات میں تمام کیا

ــــــــ ورق ۱۲ الف

یہ حسن عارضی ہے اس پہ ناز کرنا	دو چار دن میں ظالم ہو دیگی خط کی شدت

ــــــــ صفحہ ۵ ب

شبنم نہیں ہے رگِ گل اوپر چمن کے بیچ — آصف گرا ہے اشک کسی بے قرار کا

ص۶ ب

مقدور کب زباں کو بیانِ صفات کا — جلوہ ہو ہر صفات میں جب عینِ ذات کا

ص۸ ب

جلنے نہ دیا آتشِ غم سے جگر اور دل — کیا کیا کہوں احسان میں اس دیدۂ نم کا

ص۹ الف

کہاں تک میں پونچھوں تمہارے اشک آصف — ہوا تر بتر خوں سے دامان میرا

ص۹ ب

ہم نے دُنیا میں آن کر دیکھا — جلوہ تیرا ہی سر بسر دیکھا[1]
تیرے کوچے میں آن کر پیارے — لوہو اپنا ہی تا کمر دیکھا

ص۱۰ ب

نہ کام آوے کسب کچھ نہ ہُنر کچھ فائدہ بخشے
نصیبہ شرط ہے ہر چیز میں کسب و ہُنر کس کا

ص۱۲ الف

ہمیشہ ایک عالم پر یہ آب و گِل نہیں رہتا
جہاں میں بن کُھلے عقدہ کوئی مشکل نہیں رہتا

ص۱۳ ب

دلِ بے تاب تو نسبت تو پوری اس سے پیدا کر
جہاں نسبت ہوئی پوری تو کچھ حائل نہیں رہتا
بھروسا جُز خدا آصف نہیں کچھ خوب دُنیا کا
کہ دُنیا کے بھروسے پر کوئی کامل نہیں رہتا

ص۱۴ الف

آصف اس تیری کہانی نے تو مارا ہم کو
اے میاں یہ بھی کوئی کہنے کا افسانہ تھا

ص۱۸ الف

دل ٹھہرتا نہیں ہے سینے میں — آگ میں کس طرح رہے پارا

ص۱۹ ب

آصف اب اور لگے کرنے ترقی دن رات — شامت بخت ہوئی بہری تو کم یا قسمت

ص۲۴ الف

سیر گلشن کی کیوں کروں میں ہوس — دل کا یہاں لالہ زار ہے موجود

ص۳۲ ب

نہ ہوویں چاشنیِ دردِ بن کلام لذیذ — کہ بے نمک نہیں ہوتا کہیں طعام لذیذ

ص۳۸ الف

آصف خدا ہی بندوں کو دیتا ہے رات دن — کس کس مزہ کی نعمتیں اور بے طلب لذیذ

ص۴۰ ب

دوستی کے امور میں دل سا — ہم نے دیکھا نہ با اثر تعویذ

ص۴۳ ب

مت گمرہی سے چلنا اے گمرہاں زمیں پر
گزرے ہیں تم سے لاکھوں اس بے نشاں زمیں پر

ص۴۶ الف

مچا دوں شورِ قیامت ہر ایک جا آصف — غزل سرائی پہ آؤں اگر بہ سوز و گداز

ص۵۵ ب

ایک گردش کو ہی ثبات نہیں — تیرے اے چرخ بے مدار افسوس

ص۵۷ ب

صفات و ذات سے باہر ہے وہ بہ ذات و صفات
خدا نہ ہووے گا ذات و صفات کا محبوس
یہی ہے واجب و ممکن کا فرق اے آصف
کہ وہ تو واجب و یہ ممکنات کا محبوس

ص۶۲ الف

پانی پہ خاک کب تئیں ٹھہرے گی دوستو — بے فائدہ ہے دل کا لگانا یہیں اساس

ص۶۴ الف

وسعت کا دل کے کیا کروں آصف بیان میں
ایسا نہ ہے طویل نہ کون و مکاں عریض

ص۹۹ ب

---

[1] خواجہ میر دردؔ بزرگ معاصر قرار پاتے ہیں اسلئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آصفؔ نے دردؔ کے اس شعر سے استفادہ کیا ہے۔
جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
(ایڈیٹر)

کانٹا سا یہ بھی دل سے نکل جاوے یا خدا
سینے میں سانس کھٹکے ہے اب خار کی غلط

ص۱۲۳ ب

بنا کے پہلے مٹاتا ہے پھر بناتا ہے   جو چاہتا ہو سو کرتا ہے یار و سب صانع

ص۱۲۴ الف

جوں شمع سوز دل سے جو پوچھا کچھ تھی رات
اک آہ کھینچ کر پڑے آنسو ڈھلک دریغ

ص۱۲۵ ب

اب تو اک مدت ہوئی آنے سے وہ بھی رہ گئے
ورنہ دیتے تھے خبر دل کی مجھے ہر بار اشک

ص۱۲۸ الف

جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا   تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

ص۱۳۶ ب

زنہار مرتے مرتے بھی سجدہ ضرور ہے   اے دل نمازِ عشق مبادا قضا نہ ہو

ص۱۴۷ ب

آتا ہے تیغ ہاتھ میں وہ جنگ جو لیے   جاتا ہوں میں بھی سر کے تئیں رو برو لیے

ص۱۶۱ الف

آصف نہ چھوڑ دستِ سخاوت کو زینہار   لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا کچھ لیے

ص۱۶۱ الف

عہد حکومت آصف الدولہ میں انگریزوں نے خوب خوب پر پھیلائے اور نواب وزیر کو طرح طرح سے تنگ کیا۔ تاریخ کے صفحات پر یہ داستان شرح و بسیط کے ساتھ لکھی ہوئی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ نواب آصف الدولہ آصف اپنے اور انگریزوں کے تعلق خاطر اور انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری کے بارے میں اپنے کلام میں کیا بیان کرتے ہیں۔ آصف کے کلام کی یہ عصری حیثیت نقادان ادب کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ ذیل میں صرف چند اشعار لکھے
جاتے ہیں ۔

گدا تیرے کوچے کا ہے پادشاہ   نہیں اس کو درکار کچھ تخت و تاج

ص۲۹ الف

قفس سے چھوٹنے پائے تو ہم صفیروں سے
کریں گے جا کے ہم آصف شکایتِ صیاد

ص۳۶ ب

ذرا جور و جفا کو کم کرے شوخ   کہ لازم ہے ترحیم بے وطن پر

ص۴۹ ب

اس شوخ کی ہو طبع اگر امتحان پر   لاکھوں ہی کھیل جائیں اپنی جان پر

ص۵۰ ب

تمہاری خفگی سے ہو جائیں کیوں نہ ہم مایوس
کہ ہم سا عاشقوں میں ہوگا کوئی کم مایوس   ص۵۸ الف

تمہارا اجنبی سخن کانوں کو لگا مانوس   لگے ہے ساری خدائی کی بات مانوس

ص۵۸ ب

برا نہیں جو کرو تم بھی انس آصف سے   کہ آشناؤں سے ہوتے ہیں آشنا مانوس

ص۵۹ الف

ملاپ کے تو یہ اطوار ہی نہیں پیارے   ہر ایک بات کا لڑ کر جواب دو برعکس

ص۶۴ الف

کہو ہو اپنی ہر اک الٹی بات کو سیدھا   ہماری سیدھی کو سمجھو ہو اور سنو برعکس
خدا ہمارا ہمیں تم سے چاہیے سیدھا   تمہارے جی میں جہاں تک کہ ہو کرو برعکس

ص۶۴ ب

انسان کی بے غیرتی کا اور سبب کچھ   دنیا میں نہیں اسکے سوا تیری قسم حرص
زر کے عوض اب جان کے خواہاں ہیں یہ کافر   عشاق سے اب پیار نہیں کرتے ہیں صنم حرص
آصف نہیں کچھ حرص دہرا منحصر ہند   پھیلی ہوئی ہے تا بہ عرب اور عجم حرص

ص۹۰ الف

آصف الدولہ آصف نے سودا کی غزل پر مخمس کہا ہے۔ ذیل میں پہلا اور آخری بند درج کیا جاتا ہے ۔

عزیز و دگر بھی یہ مت کرو ہوا سو ہوا   مبادا غصہ ہوئے تند خو ہوا سو ہوا
نہ اس کے آگے میرا نام لو ہوا سو ہوا   جو گزری مجھ پہ اسے مت کہو ہوا سو ہوا

۱؎ مرزا غالب نے غالباً یہیں سے چراغ روشن کیا ہے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں   ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
ایڈیٹر

باکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

صفحہ ۲۳۹ الف

جو پوچھا عشق میں آصف کے حال میں دل کا — تو دیکھ دیکھ کے سُن سُن کے رو رو سر کو اٹھا
لگا یہ کہنے کہ اب پوچھتا ہے کیا دل کا — دیا او سے دل دین اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

صفحہ ۲۴۰ الف

امام باڑۂ آصفی پر کہے ہوئے مخمس کا بند ملاحظہ ہو ؎

مسجد کا گرچہ سب سے بڑا احترام ہے — لیکن امامباڑہ بھی عالی مقام ہے
وہ آستانِ حق یہ مکانِ امام ہے — بندے جو ہیں سو رات دن ان کا یہ کام ہے
سجدہ اگر ادھر ہے تو اُدھر سلام ہے

صفحہ ۱۳۲ . الف

ایک رباعی نسخۂ سالار جنگ سے یہاں درج کی جاتی ہے ؎

جو کوئی کسی کو یار کل یاد دے گا — یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل یاد دے گا
جو اس دورِ مکافات میں سن اے غافل — بیداد کرے گا آج کل یاد دے گا

صفحہ ۲۶۳ ب ، صفحہ ۲۶۴ الف

لکھنؤ کے بدنام ہزل گو شاعر

صاحبقران کا سنجیدہ کلام

سید امام علی بلگرامی ولد غلام حسین رضوی بلگرامی متخلص بہ صاحبقران کا مکمل کلیات اور دو دیوان حیدر آباد کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کلیات شعبہ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں مخزون ہے ____ تاریخ ادب اُردو میں صاحبقران لکھنؤ کا یقیناً پہلا اور آخری شاعر ہے جس پر "صاحبانِ تذکرہ" نے بے سوچے سمجھے ظلم ڈھایا ہے اور اس کے کلام کو پڑھے بغیر اسے ہزل گو، فحش گو اور جیسی چناں .... کے القاب سے نواز دیا۔ چنانچہ "مجموعۂ نغز" میں حکیم قدرت اللہ قاسم صاحبقران کے کلام پر اس طرح اپنی رائے لکھتے ہیں:

"صاحبقران ____ دیوانے مملو از انمائے فحش و اقسام ہزل دارد موزون الطبع واقع شد در ردیف و قافیہ غلطی نمی کند . اما غیر از ہزل و فحش بر زبانش نمی رود" [9]

یعنی ردیف و قافیہ پر دسترس رکھنے اور طبع موزوں کے اعتراف کے باوجود کلام کو "مملو از انمائے فحش و اقسام ہزل" کا تمغہ عطا کیا گویا کہ کل کلام تک صاحب تذکرہ کی رسائی نہ ہوئی ___ اسی طرح "تذکرہ ریاض الفصحاً" میں مصحفی رقمطراز ہیں:

"صاحبقران تخلص ساکن بلگرام شخصے یاوہ زبان طوائف بود فی الحقیقت دریں فن نظیر خود نہ داشت" [10]

اس "مدح سرائی" کے باوجود تذکرہ میں ۲۶ شعر درج کیے ہیں جو مطلق فحش یا ہزل سے علاقہ نہیں رکھتے بلکہ ایک شعر بھی فحش یا ابتذال لیے ہوئے نہیں ہے اور تمامتر سنجیدہ اشعار ہیں [11]
اعظم الدولہ سرور "عمدۂ منتخبہ" میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شخصے ہزال و فحاش ہر چند در ردیف و قوافی و معانی بندی و موزونیت قصورے نہ دارد لیکن تمام دیوانش مملو از الفاظ فحش و ہزل است .... کہ دریں فن یکتا و وحید وقت خود ست" [12]

سخن شعرا میں نساخ نے حق رائے دہی اس طرح ادا کیا ہے:

"معاصر جرأت و انشا ہزل اور فحش سے اشعار ان کے مملو ہیں دیوان ان کا نظر سے گزرا" [13]

یادگار الشعرا میں اسپرنگر لکھتا ہے:

"لکھنؤ کے ایک مسخرے شاعر نے ایک نہایت فحش دیوان لکھا ہے" [14]

اسپرنگر نے صاحبقران کے کلام کو فحش تو قرار ہی دیا ہے ساتھ ہی ان کو مسخرے کا لقب بھی عطا کیا۔ اور لالہ سری رام فرماتے ہیں:

"طبیعت ہزل گوئی کی طرف رجوع ہو گئی تھی لیکن دو چار شعر اچھے بھی کہہ گئے ہیں" [15]

چند معتبر "تذکرہ نگار صاحبان" کی آرا آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب چند ناقدانِ ادب کی سخن فہمی کی داد بھی دیکھئے ___ عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں:

"صاحبقران تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ آئے .... معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں

میں ان کا نشو و نما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے: ؎

"فحش اور تہذیب سے کوسوں دور" کلام میں "پھر بھی ایک بات" کیا ہے؟ اس کا بیان اور وضاحت شرؔ نے نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی مشیر لکھتے ہیں:۔

"وہ ایک ہزل گو شاعر ہیں۔ ان کا سارا دیوان ہزلیات کا مجموعہ ہے جو فحش ہے اور گالیوں سے بھرپور ہے"؎

نصیر الدین ہاشمی مرتب فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ فرماتے ہیں:

"مصنف ہزلیات میں اپنی آپ نظیر تھا"؎

ان تمام آراء کو پڑھنے کے بعد اور صاحبقراں کے کلیات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ ان "صاحبانِ تذکرہ" اور "ناقدانِ ادب" نے یا تو صاحبقراں کے مکمل کلیات کو دیکھا ہی نہیں ہے یا پھر ان کے کلام پر ایک "نگہِ غلط" ڈال کر اپنی آراء کا اظہار کر دیا ہے اور تفصیل سے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی یا تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے سے قبل کے "صاحبانِ تذکرہ و نقد" کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔

حیدرآباد میں دیوان صاحبقراں کے دو قلمی نسخے اور ایک مکمل کلیات کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ان مخطوطات کی تفصیل سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس "پاجی، زٹل، لولیان اور فحش و ہزل گو مسخرے شاعر" کے سنجیدہ کلام کے چند منتخب اشعار پڑھ لیں ______ قارئینِ کرام! ان اشعار کو توجہ سے پڑھیے، غور کیجیے کہ عہد مرزا و میر کا ایک شاعر لکھنؤ میں دادِ سخن دے رہا ہے اور زبان و بیان، تشبیہ و استعارہ، کو اپنے طور پر باندھ رہا ہے۔ میر و مرزا سے متاثر نہیں ـــ اپنا ایک علاحدہ لہجہ بنائے ہوئے ہے ـــ!

ان اشعار میں آصف الدولہ بہادر کی توصیف و مدح سرائی بھی ہے نواب وزیر علی بہادر کا قصیدہ بھی ہے۔ نواب سعادت علی خاں کی مدح بھی ہے۔ خدا کے رازق ہونے پر ایمان بھی ہے۔ انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بیان بھی ان اشعار میں اپنا شعور دکھا رہا ہے ہندستان کی لٹتی ہوئی دولت اور بڑھتی ہوئی غربت کا بیان بھی آپ کو ان اشعار میں ملے گا اور انہی اشعار میں ہندستانیوں کے ہاتھوں ایک ایک صوبہ کا نکل جانا بیان ہوا ہے۔ یہ چند اشعار کلیاتِ صاحبقراں سے پیش ہیں:

یہ حسن خداداد ہے یا نور کا جھکا — عالم سے جمال اس کا نظر آتا ہے چکا

______ صـ۲ الف

قتل کرنے کو ہمارے جو رسالا نکلا — ناز کی برچھی ادا کا لیے بھالا نکلا

______ صـ۵ الف

دیر و حرم سے جلوہ گہِ عشق ہے پرے — صوفی سے پوچھ سبحہ و زنار ہی عبث

______ صـ۹ الف

زاہد نے کرتا نیلا رنگایا بسنت میں — جو دوسرے ہیں کیا انھیں پروا بسنت کی

______ صـ۳۲ ب

سر رشتۂ محبت وابستہ زلف سے تھا
دیتے ہیں اب تو دھاگا آنکھوں کے لال ڈورے — صـ۵۸ الف

اشعار در مدح آصف الدولہ بہادر

اس زمانے میں وہ محسن ہے گدا اور شاہ کا
دونوں عالم میں ہے جاری فیض آصف جاہ کا — صـ۲ الف

ہوتا نہیں ہے خدمتِ فقرا سے کچھ حصول — صاحبقراں زیارتِ نواب کیجیے

______ صـ۳۴ الف

آصف برنگِ آئینہ روشن ضمیر ہے — معنی میں بادشاہ بصورت وزیر ہے

______ صـ۶۲ الف

اشعار متعلق نواب وزیر علی بہادر

یوں کہے تھا وزیر علی باشعور — ہم سے جو رو ٹھ رو ٹھ نکلے گا
تن بدن میں نمک حراموں کے — پھنک پھوٹ پھوٹ نکلے گا

______ صـ۶۷ الف

اشعار در مدح نواب سعادت علی خان

یہ حشم و جاہ تم کو سعادت علی مبارک — ناز و ادا مبارک فیض و عطا مبارک
ہے سعادت علی خاں کہ اندریں عالم — بود سخاوت و جود ش دو چند از حاتم

______ صـ۷۲ ب

عصری حسیت کے کچھ اشعار

اے فرنگی بچہ تیرے ہاتھوں   دانت ہر باکمال کے ٹوٹے
کیوں پکڑتا نہیں ہے رندوں کو   ہاتھ کیا کوتوال کے ٹوٹے

ص۴۴ ب

بساطِ دہر ہے شطرنج بازی   پیادے سے ہوا جاتا ہے شہ مات

ص۶ الف

مسلم معاشرت

اشک اب متصل آتے ہیں میری آنکھوں میں
ہوش لڑکی نے جہاں گھر میں سنبھالا نکلا   ص۵ الف

ہوا میں ٹھہر سکی کوئی شمع بے فانوس
جو بی بی پردے سے نکلے تو کب رہا ناموس   ص۱۵ ب

اشعار موسیقی

نہ دھرپت ہے نہ پٹہ ہے کھروا ہے نہ ٹھمری ہے
کہیں جو مست ہوئے ہے تو پھر گائے ہے ٹن ٹن ٹن   ص۱ ب

زہر ہے بزم طرب میں جو کوئی چونکے تال
میٹھا ہے شہد سے گر خوب میاں سم بیٹھے   ص۴۴ ب

ذیل کے مصرعوں اور اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے غالب نے انہی سے اپنے اشعار کا چراغ جلایا ہے ؎

صاحبقران: ہے عشق کے سبب میری اوقات میں خلل   ص۱۹ ب
غالب: کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا
صاحبقران: ہر بوالہوس سے عشق کا تکرار ہے عبث   ص۱۹ الف
غالب: ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

شاعر کا نام و زمان

اسپرنگر، صاحبقران کا نام "امام علی رضوی لکھتا ہے[19] عبدالغفور نساخ نے سید امام علی نام بتایا ہے[20] لالہ سری رام نے امام علی نام لکھا ہے[21] شاہ کمال نے "سید امام خاں رضوی بلگرامی" نام لکھا ہے[22] شاہ کمال، صاحبقران کے دوست تھے اور صاحبقران اکثر شاہ کمال کے گھر آیا کرتے تھے۔ صاحبقران نے خود کو اپنے ایک شعر میں "مِن سید رضوی امام" کہا ہے[23] صاحبقران کے والد کا نام سید غلام حسین رضوی تھا۔[24] صاحبقران کا وطن ضلع ہردوئی بلگرام تھا اور انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تھی۔ مصحفی "ریاض الفصحا" میں لکھتے ہیں:

"بعمر ہفتاد سالگی از جہاں درگذشت"[25]

مصحفی نے "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ میں مکمل کیا اور صاحبقران کا ترجمہ انھوں نے ماضی کے صیغہ میں کیا ہے۔ شاہ کمال نے اپنا تذکرہ "مجموعہ انتخاب" ۱۲۱۹ھ میں ختم کیا۔ ۱۲۱۶ھ/۱۲۱۷ھ تک وہ لکھنؤ ہی میں تھے۔ نور الامرا کے ساتھ وہ حیدرآباد چلے آئے اور ڈیڑھ برس میں تذکرہ ترتیب دیا اور ۱۲۱۹ھ میں اسے نقل کیا۔ جس میں صاحبقران کے لیے[26]

"حق تعالیٰ سلامت دارد"

لکھا ہے۔ اس طرح ہم صاحبقران کی وفات کو ۱۲۱۹ھ/۱۲۲۰ھ کا واقعہ قرار دے سکتے ہیں۔ مصحفی نے صاحبقران کی عمر ستر برس بوقت وفات لکھی ہے۔ اس طرح صاحبقران کی پیدائش ۱۱۴۹ھ یا ۱۱۵۰ھ قرار پائی ہے۔ تحقیق کے محتاط تقاضے کے وقت ہم ان کی پیدائش کا سنہ ۱۱۴۹ھ تا ۱۱۵۱ھ کے درمیان قرار دے سکتے ہیں۔

کلیاتِ صاحبقران کی اندرونی شہادت گواہی دیتی ہے کہ وہ شجاع الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آچکے تھے اور انھوں نے آصف الدولہ کے تخت نشین ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح صاحبقران نے گویا لکھنؤ کے چار حکمرانوں کا زمانہ دیکھا یعنی شجاع الدولہ، آصف الدولہ، وزیر علی خاں اور سعادت علی خاں۔ آخر الذکر تین حکمرانوں کی مدح میں انھوں نے شعر کہے ہیں لیکن کلام کی شہادت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ صاحبقران کو صرف نواب آصف الدولہ کی سرپرستی حاصل ہوئی تھی یا پھر شہزادہ سلیمان شکوہ کی۔ اس طرح ہم صاحبقران کو میر درد، میر اور مصحفی کا ہم عصر شاعر کہہ سکتے ہیں۔ صاحبقران کا انتقال نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ہوا۔ اس لیے انھیں جرأت انشا اور رنگین کا معاصر شاعر کہنا مناسب نہیں، جیسا کہ تقریباً ہر تذکرے میں لکھا گیا ہے۔

خطی کلیات کی تفصیلات

کلیات صاحبقران میں ۹۹ اوراق اور ایک صفحہ ہے اس طرح

جو صفحات ۹۹ ہیں۔ مخطوط کا سائز ۱۲×۸ ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۹ تا ۲۲ سطر ہیں۔ جگہ جگہ حاشیہ پر بھی شعر لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق اور کاغذ دیسی ہے۔ صفحہ ۱ الف مطلا و منقش ہے۔ بیلوں و سنہری بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ تخلص ہر غزل و نظم میں سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ صفحات پر نمبرات نہیں ہیں، ترک موجود ہے۔ اس کلیات کی کتابت یقیناً صاحبقران کی حیات ہی میں ہوئی ہے کہ کلام میں جا بجا تنسیخ و ترمیم کی گئی ہے۔ کہیں کسی شعر کا ایک مصرعہ بدلا گیا ہے اور حوالۂ نشان کے ساتھ حاشیہ پر دوسرا مصرعہ لکھا گیا ہے کہیں نقطہ کوئی لفظ قلمزد کرتے ہوئے حاشیہ پر دوسرا لفظ لکھ دیا ہے۔ بعض غزلوں میں چند اشعار کے بعد چلیپا بناتے ہوئے حاشیہ پر مزید اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس کیفیت کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مخطوط خود شاعر کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔

کلیات صاحبقران کا زیر مطالعہ نسخہ شاہانِ اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت رہا ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری میں یہ مخطوط کسی کے ہاتھ لگا اور حیدرآباد پہونچ گیا۔ کلیات کے پہلے صفحہ پر پانچ مہریں ہیں۔ سب سے قدیم مہر نثار حسین خاں کی ہے۔ ۱۸ رمضان ۱۲۲۷ھ سے متعلق۔ دوسری مہر کتب خانہ سلیمان جاہ ۱۲۴۴ھ۔ تیسری مہر سلطان والا جناب کی ہے۔ چوتھی مہر نواب امجد علی شاہ ۱۲۶۰ھ اور آخری مہر نواب واجد علی شاہ ۱۲۶۳ھ ثبت ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ مختلف شکستہ تحریریں بھی ہیں۔

کلیات کی پہلی غزل حمد میں ہے، شعر ہے ؎

یہ حسنِ خداداد ہے یا نور کا چمکا
عالم سے جمال اس کا نظر آتا ہے چمکا ص۲ الف

دوسری غزل بادشاہِ وقت کی مدح میں ہے، مطلع ہے ؎

اس زمانے میں وہ محسن ہے گدا اور شاہ کا
دونوں عالم میں ہے جاری فیض آصف جاہ کا ص۲ الف

اس کے بعد غزلیات ہیں۔ ہزلیات اور سنجیدہ کلام ایک ساتھ درج ہے اردو غزلوں ہی کے ساتھ فارسی غزلیات بلا کسی تخصیص درج ہیں۔ یعنی اردو و فارسی کلام گڈمڈ ہے۔ ورق ۹۵ الف تک مسلسل غزلیات ہیں۔ غزلیات بعد ایک مخمس مثنوی ہے جو ورق ۹۵ الف و ب پر درج ہے۔

ورق ۹۵ ب سے مخمس درج ہیں۔ ورق ۹۶ ب سے مثلث درج ہیں۔ ورق ۹۶ الف تا ۹۶ ب تک ہجویات ہیں۔ ورق ۹۶ الف سے پھر اردو فارسی کی سنجیدہ غزلیات ہیں۔ ورق ۹۷ ب و ۹۷ الف پر نواب سعادت علی خاں کی مبارکباد درج ہے۔ ورق ۹۷ ب سے پھر ایک مخمس مثنوی شروع ہوتی ہے جو ۹۸ ب پر ختم ہوئی ہے۔ ورق ۹۸ الف پر غزلیات مخمسات درج ہیں۔ ورق ۹۸ ب سے مناقبِ حضرت علیؑ شروع ہیں جو مسدس اور مخمس کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ ہر منقبت کے آخری بند میں اپنے کثیر العیال خاندان کی مفلسی کا بیان کیا ہے اور غیبی مدد کی دعا مانگی ہے سلسلۂ منقبت اس بند پر ختم ہوتا ہے ؎

صاحبقران توسل جس کو ہے علیؑ سے
تحقیق میں سنا ہوں یہ کلمہ ہر ولی سے
پروا نہیں ہے اس کو ہر دن کی تنگی سے
پڑھتے تھے سب یہ مطلع ہر آن خوشدلی سے
کیا غم کوں سے رکھتا ہے دل امیدواری
کرے گا تجھ کو حیدرؑ ہفتے میں ہفت ہزاری

ص۹۸ ب

ورق ۹۹ الف پر ایک سلام درج ہے۔ ورق ۹۹ ب پر مزید دو منقبت موجود ہیں۔ ورق ۱۰۰ الف پر کلیات ختم ہو جاتا ہے۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"برائے خاطر مرزا قربان علی بیگ صاحب تحریر نمودہ شد
کتبہ شیخ احمد علی تمام نمودہ شد"

اس ورق پر بھی صفحہ اول ہی کی طرح شاہانِ اودھ کی مہریں ثبت ہیں۔

دیوان صاحبقران کا ایک خطی نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں مخزون ہے غیر مخطوطہ ۸۲ فن نظم۔ اس میں صرف ۱۸ ورق ہیں اور صرف بچاسی شعر انتخاب کیے گئے ہیں۔ دیوان صاحبقران کا ایک اور قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ لیکن یہ بھی مکمل دیوان نہیں بلکہ صرف انتخاب ہے۔
واللہ اعلم بالصواب۔

تفسیر مرتضوی قلمی

اردو نثر میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر سب سے پہلے شاہ محمد رفیع الدین

دہلوی نے "تفسیر رفیعی" اور شاہ عبد القادر نے ترجمہ قرآن بہ نام "موضح قرآن" نے کیا۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ سب سے پہلے غالباً شاہ بہاء الدین متوفی ۹۱۲ھ نے کیا۔ یہ منظوم ترجمہ آج کل دستیاب نہیں لیکن خزائن رحمت اللہ کے خزینۂ ششم میں سورۂ اخلاص کا منظوم ترجمہ موجود ہے[26]

عہد آصف الدولہ میں یعنی ۱۱۹۴ھ میں غلام مرتضیٰ فیض آبادی نے لکھنؤ میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر اردو میں لکھنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ نام و تاریخ تصنیف اور اپنا نام ان اشعار میں منظوم کیا ہے ؎

دل لگا کہنے بوقت اختتام | اس کار کو تفسیر مرتضوی تو نام
کیونکہ تو ہے گا غلام مرتضیٰ | حکم سے مولیٰ کے ہے اس کو لکھا
سنہ ہجری ان دنوں تو جان لے
یک ہزار اور ایک سو چورانوے

تفسیر مرتضوی کا یہ نادر مخطوطہ شعبۂ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد میں مخزون ہے۔ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔ فی الحال مخطوطہ ۱۲۸ ورق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۵ اشعار ہیں۔ سائز ۵x۹ ہے۔ مخطوطے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام مرتضیٰ نے غالباً تمام قرآن مجید کا ترجمہ/تفسیر کیا تھا لیکن اس مخطوطہ میں مکمل نہیں ہے۔ تفسیر مثنوی کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت و مدح صحابہ موجود ہے۔ غلام مرتضیٰ نے اپنے والد شاہ تیمور کی مدح میں بھی شعر کہے ہیں۔ غلام مرتضیٰ شاہ یٰسین کے مرید تھے۔ مثنوی میں ان کی مدح بھی موجود ہے۔ والد اور مرشد کے علاوہ شاعر نے اپنے استاد مولوی محمد برکت کی مدح بھی کی ہے اور پھر مغل شہنشاہ شاہ عالم کی مدح ہے۔ پھر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کی توصیف کی گئی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آصف الدولہ وزیر مملکت | حامیِ دین و مشیر سلطنت
آصفِ وقت سلیمانِ زماں | ہے سکندر بخت و دارائے جہاں
وہ سعادت سے ہے منصورِ جہاں | ہے شجاعت اس سے با نام و نشاں
بے تکلف گر کروں مدحِ وزیر
کر دعائے خیر ہے کار فقیر

مثنوی میں جا بجا آیتیں اور حدیثیں عربی میں درج ہیں جیسے

ترجمہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ املائی خصوصیات تیرھویں صدی ہجری کی نصف اول کی ہیں۔ چونکہ ترقیمہ موجود نہیں اس لئے سنہ کتابت اور کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

حواشی:

[1] اعظم الدولہ سرور "عمدہ منتخبہ" ص۵ طبع اول، شائع کردہ دہلی یونیورسٹی دہلی
[2] عبد الغفور نساخ "سخن شعرا" ص۳۴۰ سن اشاعت ۱۲۹۱ھ
[3] مردان علی خاں مبتلا "گلشن سخن" ص۱ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب بار اول ۱۹۶۵ء
[4] غلام ہمدانی مصحفی "تذکرہ ہندی" ص۱۳ اکیڈمی ایڈیشن ۱۹۸۵ء
[5] حکیم قدرت اللہ قاسم "مجموعہ نغز" ص۳۹ مرتبہ حافظ محمود شیرانی اکتوبر ۱۹۸۳ء
[6] اعظم الدولہ سرور "عمدہ منتخبہ" ص۵۔ [7] نصیر الدین ہاشمی "فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ" اردو ص۴۱۷ [8] خان آرزو کا شعر
داغ چھوٹا نہیں کس کا لہو ہے قاتل | ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
[9] قاسم "مجموعہ نغز" ص۳۶۱۔ [10] مصحفی "تذکرہ ہندی" ص۱۸۶
[11] ایضاً ص۱۸۸ و ص۱۸۹ [12] سرور "عمدہ منتخبہ" ص۳۰۲
[13] عبد الغفور نساخ "سخن شعرا" ص۲۸۳ [14] اسپرنگر "یادگار الشعرا" مترجم طفیل احمد ص۱۰۶ ۱۹۸۵ء [15] لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" جلد پنجم ص۲۷۱ مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ۱۹۴۰ء
[16] عبد الحلیم شرر "گزشتہ لکھنؤ" ص۱۰۵ مرتبہ شمیم انہونوی ۱۹۷۴ء
[17] خلیل احمد صدیقی "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" ص۲۴۳ بار اول ۱۹۷۴ء
[18] نصیر الدین ہاشمی "فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد" طبع اول ص۴۳۸۔ [19] اسپرنگر "یادگار الشعرا" ص۱۰۶
[20] نساخ "سخن شعرا" ص۲۸۳۔ [21] لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" ص۲۷۱
[22] شاہ کمال "مجموعہ انتخاب" ص۵۳۱ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد فن تذکرہ نمبر ۲ داخلہ نمبر ۱۹۱ [23] صاحبقران "کلیات صاحبقران" ص۱۱ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد فن کلیات نمبر ۷
[24] لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" ص۲۴۱
[25] غلام ہمدانی مصحفی "ریاض الفصحا" ص۱۸۸ اکیڈمی ایڈیشن
[26] ملاحظہ ہو "شاہ بہاء الدین باجن، حیات اور کلام" مرتبہ ڈاکٹر شیخ فرید ۱۹۸۲ء

عرفان عباسی

چند شاعراتِ اودھ

اجمالی تذکرے

شاعری بار فطرت کا وہ حسین و دلچسپ تحفہ ہے جو بلا تفریق ہر ملک ہر قوم، ہر صنف اور ہر زبان کو عطا ہوا ہے۔ اقوام عالم کی طرح ہندستان اور ہندستان کے مختلف گوشوں کی طرح اودھ میں بھی ابتدا سے ہی فارسی و اردو شاعری کا بڑا چرچا رہا ہے۔ اگر شعرا نے اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھا کر شہرت و ناموری حاصل کی ہے تو شاعراتِ اودھ نے بھی ہر دور میں شعری کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ابتدا میں خواتین کی شاعری پر مذہبی رنگ نمایاں تھا وہ تسکین ذوق کے لیے عقیدت و احترام کے ساتھ حمد، مناجات، قصیدہ، منقبت، سلام اور نوحہ وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی کرتی تھیں لیکن رواج زمانہ، سماجی حالات، پردہ، باقاعدہ تعلیم، شعری محفلوں، مشاعروں میں شرکت اور نام و کلام کی اشاعت وغیرہ پر سخت پابندیوں کی وجہ سے ان کی دل کش تخلیقات گھروں کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل پاتی تھیں۔ نتیجۃً لاتعداد خوش کلام شاعرات کا نام و کلام نظروں سے اوجھل رہا اور وقت کے ساتھ معدوم ہوگیا۔ بتدریج معمولی سماجی تبدیلیوں کے ساتھ بعض شاعرات نے مذہبی شاعری کے علاوہ غزل، نظم اور مثنوی وغیرہ اصناف کو بھی ذریعۂ اظہار خیال تو بنا لیا لیکن فطری شرم و حیا اور رسمی و سماجی پابندیاں بہرحال حائل و مائل رہیں اور وہ قابل قدر شعری اثاثہ بھی عموماً گھروں کی چہار دیواری میں ہی محصور رہا۔

سرزمین اودھ نے فنون لطیفہ کی تخلیق و تشہیر میں ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے اس کے نوابوں اور حکمرانوں نے شعری، ادبی اور تہذیبی زندگی کو فروغ دینے کے لئے طرح طرح کے مشاغل اختیار کرکے اودھ کی ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیئے تھے۔ ان کے دور میں شاعروں اور فن کاروں کی جھولیاں زر و جواہر سے بھر گئیں۔ لاتعداد باکمال اساتذۂ سخن کی انجمن ان کی فیاضی و دریا دلی کی شہرت سن کر اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ کی طرف کھنچ آئی جس نے طرزِ لکھنؤ کو آسمانِ کمال تک پہنچا کر گویا آبِ حیات پلا دیا۔ ان اثرات نے سرزمین اودھ پر ایسی شعر انگیز فضا طاری کر دی کہ در و دیوار سے نغمے پھوٹنے لگے۔!

اودھ کے اس ادبی، تہذیبی و ثقافتی عروج کے زمانے میں شرفاء و رؤسائے اودھ کے درباروں میں طوائفوں کی پذیرائی ہوئی۔ معاشرے میں رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ شاہدانِ بازاری کا عشق بطور فیشن داخل ہوگیا۔ امراء و رؤساء کے حرموں میں ان کی بڑی تعداد داخل ہوگئی اور انھیں ایسی اہمیت حاصل ہوئی کہ شرفاء و امراء کے بچے تربیت کے لئے ان کے سپرد کیے جانے لگے۔ ان میں سے بعض اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ اور خوش گو شاعرات ابھر کر سامنے آئیں اور بحیثیت شاعرہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئیں۔ وہ اپنے کلام کی تشہیر کر سکتی تھیں اس لئے ان کا کلام عوام تک پہنچنے لگا اور داد و تحسین سے نوازا جانے لگا۔ ان ماہ جبینوں اور زہرہ جبینوں کی شہرت و مقبولیت کے ساتھ اہم عصمت مآب شاعرات کے ناموں کے بھی انکشافات ہوئے جو تاریخ کے سینے میں پنہاں تھے اور جنھیں پیٹ کی ہلکی تاریخ راز نہیں رکھ سکی۔ اس طرح چند عصمت مآب پردہ نشین شاعرات کے کارنامے بھی سامنے آگئے۔ لیکن وہ شاعراتِ اودھ کی اصل تعداد کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

جہاں تک شاعرات کے کلام کا سوال ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

وہیں پردوں اور بلند و بالا فصیلوں کے اندر پنپنے والی شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔ بعض شاعرات کے اشعار اساتذۂ سخن کے زبان زد اشعار سے آنکھیں ملانے کی سکت رکھتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ اگر وہ سماجی پابندیوں میں جکڑی نہ ہوتیں اور اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرسکتیں تو بیشتر شاعرات کے لیے صفِ اساتذہ میں جگہ پانے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔

چند تقدس مآب اور عصمت مآب شاعرات کی شخصیت، شعری صلاحیتوں اور لیاقتوں کا ذکر اودھ کی ماہ جبینوں اور زہرہ جبینوں کے تذکروں کے ساتھ ضرورتاً اور مجبوراً کر رہا ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔ متعین و محدود صفحات ضخامت کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتے، اس لیے اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے صرف چند شاعرات کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ تفصیلی تذکرہ انشاء اللہ پھر کبھی۔

اختر جائسی

وقار فاطمہ۔ مولوی سید اصغر حسین کے گھر نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۲۳ء میں ممتاز شاعر و ادیب اور اپنے زمانے کی فعّال ادبی شخصیت سید آل محمد مہر جائسی سے شادی ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں بیوہ ہوگئیں۔ انھوں نے طویل عرصہ مہر جائسی کی رفاقت میں گزارا اور بھرپور فنی استفادہ کیا۔ بیشتر اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔

امیر لکھنوی

لکھنؤ کی نہایت ذہین و طباع طوائف۔ ۱۲۷۰ھ تک بقید حیات تھی۔ خوش فکر شاعرہ۔ صاحبِ تذکرہ "سخنِ شعراء" عبد الغفور نسّاخ اس سے ملے تھے۔ اپنے تذکرہ میں اس سے ملاقات کا ذکر کیا ہے ؎

جدھر کے دیکھنے سے جانِ زار جاتی ہے
اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے

انیس لکھنوی (انیس بانو)

؎ اپنی وحشت کی ترقی حد سے گزری اے جنوں
ہاتھ کو جنبش ہوئی اور چاک داماں ہوگیا

بہتر رائے بریلوی: سیدہ خیر النساء بہتر۔ علم و فضل، عبادت و ریاضت، شرافت و نجابت اور دینی خدمات کی بنا پر مشہور خاندان کے فرد سید ضیاء النبی مرحوم کے گھر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئیں۔ عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم خانگی طور پر حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا حکیم سید عبد الحئی ناظم ندوۃ العلماء مصنف "گلِ رعنا" سے شادی ہوئی۔ فطری و وہبی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے حمد، نعت اور مناجات کے لیے اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتیں وقف کردیں۔ ان کے مجموعے "بابِ رحمت"، "کلید بابِ رحمت" اور نثری تصنیفات "حسنِ معاشرت" اور "ذائقہ" وغیرہ مطبوعہ ہیں۔ ۳۱ اگست ۱۹۶۸ء کو انتقال ہوا۔

تیری رحمت، کبھی ہم پر نظر ہوگی ضرور
نہ رہے گی شبِ تاریک سحر ہوگی ضرور

بنت نیّر خیرآبادی، سیدہ خاتون

بنتِ نیّر اور دخترِ نیّر تخلص ؎

مشکل مری آساں ہوجائے اے دخترِ نیّر محشر میں
گر ان کی نگاہِ لطف و کرم مائل بہ اشارا ہوجائے

پارسا لکھنوی۔ دخترِ مرزا محمد تقی ہوس ؎

چلتا نہیں ہے ابلقِ ایام ایک چال
اکثر یہ بر رکاب بنا اور بگڑ گیا

تاجدار لکھنوی۔ تاجدار بہو۔

ان کے حالات دستیاب نہیں ہوسکے۔ بعض تحریروں کے مطابق زبان و بیان پر قادر خوش فکر شاعرہ تھیں۔ مرثیہ نگاری سے خاص شغف تھا۔ ان کا مخطوطہ مراثی کتب خانہ محمود آباد میں محفوظ ہے ؎

یہ جنگ بھی جہاں کے لئے یادگار ہے — یہ معرکہ بھی قدرتِ پروردگار ہے
حمزہؑ کی اور علیؑ کی بہم کارزار ہے — فوجِ عدو میں رعب سے اب انتشار ہے
لشکر میں ساتھ شہ کے علمدار آتے ہیں
ہمرہ علیؑ کے جعفرِ طیارؑ آتے ہیں

تسنیم جون پوری۔ معصومہ تسنیم زیدی

خان بہادر محمد مصطفےٰ کج گاؤں ضلع جون پور کی دختر اور ممتاز شاعر وامق جون پوری کی بہن ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے۔ مرثیہ، قصیدہ اور سلام وغیرہ کہتی ہیں ؎

ہالے میں گیسوؤں کے ہے مہتاب کی جبیں — خم دار ابروؤں پہ مہِ نو کا ہے یقیں
سایہ اگر ذوالفقار کا ہے چشمِ سُرمگیں — باریک جلد عارضِ تاباں کی آتشیں

دو پھول ہیں بہار یہ سارے چمن کی ہے
رنگت گلاب کی ہے مہک یاسمن کی ہے

تسنیم بلائے بریلوی۔ امۃ اللہ

مولانا حکیم سید عبد الحیٔ و خیر النساء بہتر کی صاحبزادی، مولانا علی میاں کی ہمشیر، اور مولانا سید ابو الخیر حسنی کی شریکِ حیات تھیں۔ ۱۸ر جون ۱۹۰۸ء کو تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ حفظِ قرآنِ پاک کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ معلمہ، شاعرہ اور مصنفہ کی حیثیت سے خاصی شہرت کی مالک تھیں۔ زادِ سفر، ہمارے حضورؐ، موجِ تسنیم (شعری مجموعہ)، دیارِ حبیبؐ اور بچوں کی قصص الانبیاء وغیرہ مطبوعہ ہیں۔

۲۸ر جنوری ۱۹۷۶ء کو انتقال ہوا۔

تمہاری آل میں اک خاکسار ہم بھی ہیں
چمن میں اک شجرِ خار دار ہم بھی ہیں

تسنیم ملیح آبادی۔ جمیلہ خاتون

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی کی دختر، اعجاز احمد خاں کی شریکِ حیات جوش ملیح آبادی کی بھانجی۔ تعلیم خانگی طور پر حاصل کی۔ ذوقِ سخن ورثہ میں پایا۔ خاندان میں متعدد نامور شعراء گزرے ہیں۔ اثر بھی اپنے زمانے میں اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔

دل افسردہ کیوں کھلا رہا ہے
ٹھہر جا کوئی شاید آ رہا ہے

جانی۔ بیگم جان المعروف بہو بیگم

دخترِ نواب قمر الدین خاں۔ حرم نواب آصف الدولہ اپنے دور کی مشہور و معروف شاعرہ تھیں۔

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمنِ جانی
پھر دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

جعفری لکھنوی

لکھنؤ کی مشہور طوائف، منشی فدا حسین فدا کی شاگردہ۔ ۱۲۹۵ھ تک بقیدِ حیات تھی۔

منھ کو آجائے کلیجہ ضبط کی طاقت نہ ہو
گر ہمارا دل رہے دم بھر کسی کے دل کے پاس

چہارم لکھنوی۔ امیر جان (طوائف)

غالباً ناز تخلص بھی کرتی تھی۔

اپنے پہلو میں جگہ دی سرِ محفل مجھ کو — دلدہی یار نے کی دیکھ کے بیدل مجھ کو

حاجی لکھنوی۔ زیب النساء بیگم

محمد علی شاہ فرماں روائے اودھ کی دختر، نواب اقتدار الدولہ کو منسوب تھیں، خوش فکر شاعرہ تھیں۔ عموماً سلام کہتی تھیں اور مرزا دبیر سے اصلاح لیتی تھیں۔ بڑی مخیر خاتون تھیں۔

قبرِ اصغر کھودتے تھے اور فرماتے تھے شاہ
یہ بھی لکھا تھا سیدِ مظلوم کی تقدیر کا

حجاب بارہ بنکوی۔ حشمت آرا

نواب گنج بارہ بنکی کے ایک معزز گھرانے میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئیں۔ ذوقِ شاعری فطری تھا۔ دورانِ تعلیم مشقِ سخن کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ لاہور میں قیام ہے۔

دو گھڑی کے لیے آجا کہ لبوں پر دم ہے
کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو

حجاب لکھنوی۔ عسکری بیگم

ملا محمد زماں اصفہانی کی پوتی۔ محمد علی خاں مسیحا کی شاگرد۔ باذوق شاعرہ تھیں، اکثر اپنی رہائش گاہ پر مشاعرے منعقد کرتی تھیں۔

رات کو آئیں گے وہ صاف معمّہ یہ ہے — وعدۂ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

حجاب لکھنوی۔ نواب بیگم عرف چھوٹی بہو

نواب اعظم علی خاں کی دختر، ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئیں۔ واجد علی شاہ اختر کے نکاح میں آئیں۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد بحالتِ نظربندی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔

دامنِ محبوب تک پہنچا نہ جب دستِ جنوں
بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

حرماں خیر آبادی۔ سعید النساء

علامہ فضلِ حق کی صاحبزادی، مضطر خیر آبادی کی والدہ علم و فضل

اور شعر و سخن میں شہرت رکھتی تھیں۔ ذکاوت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ خود علامہ نے کہا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم کیا کہ یہ مرد نہ ہوئیں ورنہ میری قدر ختم ہو جاتی ؎

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

میری برگشتگیٔ بخت کو لکھتے لکھتے
آخرش کاتبِ تقدیر کو چکر آیا

حزیں نیوتنوی ثم لکھنوی۔ حسن جہاں بیگم

حکیم سید اصغر حسین کی دختر۔ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئیں۔ مشرقی طرز پر تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں ممتاز ادیب و محقق سید مسعود حسن رضوی ادیب سے شادی ہوئی اور تقریباً ۴۲ سال اُن کی رفاقت میں گزارے، فطری ذوق علم و ادب اور شعر و سخن ادبی ماحول میں پروان چڑھا اُردو امثال پر بڑا کام کیا تھا جو مکمل اور شائع نہیں ہو سکا۔ اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا ؎

جانبِ میداں ہمکتے تھے جو اصغر بار بار
ماں لگا لیتی تھی سینے سے تڑپ کر بار بار

اک غمِ شہ کے سوا دنیا میں کوئی غم نہ ہو
یہ حزیں تجھ سے دعا کرتی ہے داور بار بار

حسن لکھنوی۔ وزیر جان (طوائف)

محلہ باما نالہ میں رہتی تھی۔ اچھی شاعرہ تھی ؎

نالۂ سوزاں جو کھینچے میں نے رو کے ہجر میں
رشک سے بجلی جلی شرمندہ اشکِ تر ہوا

وہ مریضِ غم ہوں میں جس کو دوا آئی نہ راس
سر پہ جب صندل لگایا اور دردِ سر ہوا

حسین فیض آبادی۔ حشمت جان (طوائف) ؎

فکرِ انجامِ محبت ہو گئی آغاز میں
ہم سے بھی کم لوگ دیکھے ہوں گے دیوانہ مزاج

اے حسین! ہم کو تو دل سے خاکساری ہے پسند
ہو مبارک اس پری پیکر کو شاہانہ مزاج

حنا لکھنوی۔ عزیز بانو

اختر حسین کے گھر ۵ ر اگست ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوئیں۔ زمانۂ حال کی شاعرہ ہیں۔ ہزار لکھنوی اور سلیم شاہد کلکتوی کی شاگرد ہیں۔ شاعروں میں شرکت کرتی ہیں ؎

وفا تو ان سے ہوئی ہے نہ عمر بھر ہو گی
تو پھر حنا تجھے کیوں اعتبار آج بھی ہے

حور لکھنوی۔ منا جان (طوائف)

شاگرد محمد رضا طور لکھنوی ؎

بدی کی جس نے ہم سے ہم نے اس کے ساتھ نیکی کی
ہماری خُو یہ ہے ہم دوستی کرتے ہیں دشمن سے

حیا بارہ بنکوی ثم لکھنوی۔ کنیز فاطمہ

چودھری نعمت اللہ کی دختر، چودھری عبدالرحمٰن سندیلوی کی شریک حیات مشہور ادیبہ، شاعرہ اور صحافی۔ علمی، ادبی و سماجی کاموں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ وہ عرصہ تک ماہنامہ "حیا" نکالتی رہیں جو ادبی حلقوں میں مقبول تھا ان کا کلام متواتر اخبار و رسائل میں چھپتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے قریب پاکستان میں موجود تھیں ؎

شرابِ ناب میں اب رنگ و بو نہیں باقی — وہ ربطِ شیشہ و جام و سبو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیاؔ اب بھی — مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

خورشید لکھنوی۔ خورشید جان (طوائف)

جان لینے کو ہے اک جنبشِ ابرو کافی
قتلِ عاشق کے لئے باندھی ہے شمشیر عبث

دُلھن فیض آبادی۔ شمس النساء بیگم

۱۷۶۹ء میں نواب آصف الدولہ سے عقد ہوا تو سسرال سے "نواب بہو" اور "دُلھن بیگم" کے خطابات ملے۔ شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتی تھیں اور صاحبِ دیوان تھیں ؎

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

دھرم لکھنوی۔ دھرم دیوی

آپ ہی دردِ محبت دل میں پیدا کیجئے — آپ ہی سامان تسلی کا مہیا کیجئے

رابعہ جہانگیر آبادی۔ رابعہ سلطان

رانی جہانگیر آباد۔ نعت و مناجات اچھی کہتی تھیں ؎

آقائے دو عالم مرے سرکارِ مدینہ   بلّلہ دکھا دیجئے گلزارِ مدینہ

زاہدہ لکھنوی۔ زاہدہ خاتون

(زاہدہ خلیق الزماں) بنت محمد نعمی خاں۔ ۱۸ جولائی ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئیں والد مشہور عطر ساز فرم اصغر علی محمد علی کے مالکان میں تھے۔ اس تجارت پیشہ خوش حال و رئیس گھرانے میں شعر و ادب کا بڑا چرچا تھا۔ کئی بزرگ خوش فکر اور صاحب دیوان شعرا تھے جن کی وجہ سے شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ زاہدہ نے ۱۲ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی، اس کے بعد غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی بہت کہیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ حیا لکھنوی، عصمت لکھنوی اور عظمت لکھنوی سے پردے کی موافقت اور مخالفت میں ان کے منظوم مباحثوں کی بڑی دھوم تھی۔ وہ مباحثے کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے تھے۔ ۸ جنوری ۱۹۶۲ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

ترجمانِ دل ہے اک اک شعر اپنا زاہدہ
کون پا سکتا ہے یہ گوہر ترے بغیر

زُہرا خیر آبادی۔ امراؤ جان عرف چھٹن

امام باندی طوائف کی بیٹی اور ڈیرے دار طوائف تھیں۔ خیر آباد ضلع سیتا پور میں پیدا ہوئیں لیکن آب و دانہ لکھنؤ لے آیا اور پھر لکھنؤ ہی کی ہو گئیں۔ میر آغا علی شمس کی تربیت یافتہ تھیں۔ انھیں کی سرپرستی میں فارسی اور اردو شاعری میں مہارت حاصل کی۔ زُہرا اور ان کی بہن مشتری مرزا غالب کی حریف تھیں۔ ان کے تنقیدی مضامین اخبار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ دونوں بہنیں فارسی و اُردو زبانوں پر عبور رکھنے والی اپنے دور کی ممتاز شاعرہ، انشا پرداز اور ماہر رقاصہ تھیں۔ انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی ؎

میں نے واللہ دی دُعا تجھ کو
تو خدا جانے دل میں کیا سمجھا

زینت النسا۔ سیدن جون پوری

علی امام کی دُختر اور ڈاکٹر غلام السیدین کی شریکِ حیات۔ قصیدہ، مرثیہ اور نوحہ کہتی ہیں۔ شروع میں کلام پر اصلاح اپنے چچا غلام امام نامی مرحوم سے لیتی تھیں ؎

مدّت کی دُعاؤں کا صلہ آج ملا ہے
احمدؐ کے گلستاں میں نیا پھول کھلا ہے

زیبا کاکوروی۔ عفت بانو عباسی

مشہور ادبی خانوادے کے فرد رئیس احمد عباسی مرحوم کے گھر ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دورانِ طالب علمی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ معروف شاعر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شاگردی اختیار کر کے بھرپور فنی استفادہ کیا، پرگو اور صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں۔ غزل اور نظم دونوں اچھی کہتی ہیں۔ کلام اخبارات و رسائل میں بہت چھپا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "حرفِ زیرِ لب" بھی شائع ہو چکا ہے ؎

نظر نظر ہے جمال تیرا، نفس نفس ہے خیال تیرا
مگر یہ حسنِ سبک خرامی کہیں بھی آوازِ پا نہیں ہے

زینت لکھنوی۔ بچّن (طوائف)

میر اصغر علی اصغر سے اصلاح لیتی تھی، آخر عمر میں کلکتہ چلی گئی تھی ؎

جنوں کے ہاتھ سے دامن بچا کے رکھا تھا
لپٹ کے دشت میں کانٹوں نے تار تار کیا

سَردار لکھنوی۔ سردار بیگم

ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ غدر کے بعد بیوہ ہو کر کانپور، قنوج اس کے بعد اٹاوہ چلی گئی تھیں، بقیہ عمر وہیں گزاری ؎

سردار روزِ حشر کو اُٹھ کر کہے گی یہ
عاشق کہاں سے سنگ کا اپنے بنائے دل

سُلطان لکھنوی۔ سُلطان بیگم

دخترِ معتمد الدولہ۔ قبل ۱۸۵۷ء بقیدِ حیات تھیں ؎

قاتل نے کب کہا تھا کہ آنکھیں لڑائے دل
آخر یہ میری جان پہ آئی۔ بلائے دل

سُلطان لکھنوی۔ نواب سلطان عالیہ بیگم

محمد علی شاہ کے پوتے نواب حسین علی خاں کی شریکِ حیات۔ اپنے زمانے کی پختہ مشق شاعرہ اور مرزا دبیر کی شاگرد تھیں ؎

نیزہ ہو دل میں، لاش ہو رن میں، سناں پر
اکبر کو تھے شباب کے ارماں نئے نئے

سیدہ نیر آبادی

حالات دستیاب نہیں۔ کلام میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔

تا کجا یہ صورتِ تخریبِ ملت تا کجا
فکرِ مسلم کو کمالِ حسرتِ تعمیر دے

شمس لکھنوی۔ شمس النساء بیگم

حکیم قمر الدین خاں تلمیذ خواجہ وزیر کی دختر۔ مولد بنارس تھا لیکن لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

جو تیری کاکل مشکیں کی بو صبا لائی
دماغ عرش پہ اس خاکسار کا پہنچا

شمس لکھنوی۔ امامی جان (طوائف)

اکبری دروازہ کے قریب لکھنؤ میں سکونت تھی۔

اثر خاکِ لحد یہ ہے کہ چھو جانے سے
مرضِ ہجر کے بیمار شفا پاتے ہیں

شمس لکھنوی۔ عصمت آرا مرتضیٰ بیگم

مرزا محمد قمر الدین حیدر عرف بڑے صاحب عالم کی دختر۔ باقر علی خاں راز لکھنوی کی اہلیہ تھیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ سلام و مرثیہ خوب کہتی تھیں۔ ان کا ایک مرثیہ کتابی شکل میں ۱۹۲۹ء میں شائع بھی ہوا تھا۔

شمع لکھنوی۔ عظمت اقبال

شمع اور عظمت تخلص کرتی تھیں۔ چودھری نعمت اللہ کی بیٹی، کنیز فاطمہ حیا کی بہن اور انھیں کی شاگرد۔ چند سال قبل تک پاکستان میں تھیں۔ کلام رسائل میں چھپتا تھا۔

کتنی لامحدود ہیں اس بیخودی کی وسعتیں
منزلِ ادراک سے آگے بڑھی جاتی ہوں میں

شمیم ملیح آبادی۔ صفیہ خاتون

بنتِ دیدار حسن خاں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ دورِ حاضر کی معروف شاعرہ ہیں۔ شعری مجموعے "آہنگ شمیم" اور "گریۂ تبسم" مطبوعہ ہیں۔ راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

نقابِ شب میں جمالِ سحر تلاش کریں
چلو تبسمِ گل ہائے تر تلاش کریں

شمیم لکھنوی۔ انوار فاطمہ

پولیس انسپکٹر عبد الرشید کے گھر لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ عربی، فارسی و اردو تعلیم گھریلو طور پر حاصل کرنے کے بعد لاہور اور الہ آباد سے عربی فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں اور الہ آباد کراس ویٹ گرلس کالج میں اردو، فارسی استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ تصنیف تالیف اور شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ جملہ اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ کلام رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ ایک کتاب "انوار اسرار احمدیہ" (واقعاتِ حیاتِ نبویؐ) بھی چھپی تھی۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۰ء کو الہ آباد میں وفات پائی۔

مری تباہیاں مشہور ہیں زمانے میں
یقیں ہے آپ نے بھی کچھ نہ کچھ سنا ہوگا

شمیم لکھنوی۔ بی بیگم

تلمیذ نشتر سندیلوی۔ پردہ نشین شاعرہ۔

قول ہے شمشیرِ قاتل کا مجھے دل چاہیے
دل یہ کہتا ہے مجھے شمشیرِ قاتل چاہیے

شیدا لکھنوی۔ شیدا بیگم

کیوں ہم سے چھپانے لگے تم راز کی باتیں
ہم تم سے کسی بات کا پردا نہیں کرتے

شیریں لکھنوی۔ بیگا

محلہ چوک میں سکونت تھی۔ شعر و شاعری سے والہانہ لگاؤ تھا اور اچھے شعر کہتی تھیں۔ شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لیتی تھیں۔

پری زادوں میں تم مشہور میں مشہور دیوانہ
اگر تم شمع محفل ہو تو یہ بندہ ہے پروانہ

شیریں لکھنوی

چوک کی ایک شاہد رعنا تھی جو آخر میں کلکتہ چلی گئی تھی۔

دیر سے ہم سر جھکائے منتظر ہیں تیغ کے دست و بازو کو تمہارے اس وقت قاتل کیا ہوا

صاحب لکھنوی۔ امۃ الفاطمہ

حکیم مومن خاں مومن سے اصلاح لیتی تھیں۔

جو خط جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
دکھلانا مرا نامۂ اعمال الٰہی

صغریٰ لکھنوی۔ صغریٰ فاطمہ

دلِ غم گیں کو مرے یا الٰہی شادماں کر دے
مجھے بھی حاضرِ دربارِ سلطانِ جہاں کر دے

صدر لکھنوی۔ نواب صدر محل

آخری تاجدارِ اودھ کی بیگمات میں تھیں۔ اچھی شاعرہ اور صاحبِ دیوان (بادشاہ نامہ "۱۲۸۸ھ) تھیں۔ ۱۲۹۳ھ تک بقیدِ حیات تھیں ؎

حسرت و آرزوئے وصل اور دو مصیبت و فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

صنوبر خیر آبادی۔ وارث فاطمہ

معروف استاد وسیم خیر آبادی کی دختر اور اثیم خیر آبادی کی بڑی بہن ذکی و فہیم اچھی شاعرہ تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد لکھی گئی ایک جذباتی و تاثراتی نظم کا بند ؎

لٹ چکیں سب آرزوئیں خونِ ارماں ہو چکا
خانۂ آباد دل گنجِ شہیداں ہو چکا
بے سر و سامانیوں کا اپنی ساماں ہو چکا
شوقِ لطفِ نوجوانی بھی پریشاں ہو چکا

سخت جاں بیشک ہیں لیکن شوق کھو دیتے ہیں ہم
یاد جب آتی ہے تیری آہ رو دیتے ہیں ہم

ضیاء لکھنوی۔ ضیائی بیگم

حکیم انور علی کی شریکِ حیات۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر قادر اور تینوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں ؎

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

طاہرہ لکھنوی۔ طاہرہ بیگم

سید اعجاز حسین اعجاز کی دختر اور سرفراز حسین عبیر کی بہن۔ اچھی شاعرہ اور خطیب۔ تلمیذ عبیر۔ ان کا مجموعۂ قصائد "گوہرِ کعبہ" شائع ہو چکا ہے ؎

کہتے ہیں ہر اک قصیدہ طاہرہ اپنا
لسان اللہ کے صدقے میں پائی ہے زبان ثانی

عاطف خیر آبادی۔ ریحانہ انصاری

الٰہی بخش انصاری کے گھر ۱۹۵۹ء میں خیر آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئیں۔ جنبش خیر آبادی کی شاگرد ہیں ؎

غموں نے، مرحلوں نے، مشکلوں نے
مری جرأت بڑھائی مشکلوں نے

عالم لکھنوی۔ عالم آرا بیگم

واجد علی شاہ کی بیاہتا بیوی۔ صاحبِ دیوان "بیاضِ عشق" و مثنوی "مثنوی عالم" تھیں۔ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں ۱۸۹۴ء میں انتقال ہوا ؎

گیسوئے خم دار اس کے رخ پہ بل کھانے لگا
سینۂ عشاق پر بس سانپ لہرانے لگا

عشرت لکھنوی۔ نواب عشرت محل

حرم واجد علی شاہ۔ ان کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں آخر تک وہیں رہیں ؎

گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ لگا اور جل گیا

عصمت لکھنوی۔ عصمت آرا بیگم

لکھنؤ کے مشہور خانوادۂ اطبا کے فرد حکیم عبدالولی کے گھر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تمام تر تعلیم بشمول انگریزی خانگی طور پر حاصل کی۔ شاعری کا ذوق تھا غزلوں کے علاوہ ان کی وطنی و اصلاحی نظمیں بھی پسند کی جاتی تھیں۔ زاہدہ خلیق الزماں سے ان کا منظوم مباحثہ مشہور ہے جو رسالہ کی شکل میں شائع بھی ہوا تھا۔ تحریکِ خلافت و آزادی کی سرگرم کارکن تھیں۔ اپنے بھائی حکیم محمد بشیر مخمور سے اصلاح لیتی تھیں۔ ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا ؎

ہر سانس زندگی کی کٹی یوں کسی کے ساتھ
جیسے کوئی سفر میں ہو اک اجنبی کے ساتھ

فاخرہ نقوی

مشہور شاعر و صحافی فضل نقوی ایڈیٹر "نظارہ" لکھنؤ کی شریکِ حیات، زیورِ علم سے آراستہ، خوش فکر شاعرہ تھیں۔ غزل، قصیدہ، سلام اور نوحہ وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ نوحہ جات کے مجموعے "صبحِ کربلا"، "شفقِ کربلا" اور "شبابِ کربلا" وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ۶ جنوری ۱۹۹۰ء کو انتقال ہوا ؎

اتنا تھا پُر درد افسانہ مرا
سننے والے ہر طرف سے آ گئے

فرحت فیض آبادی ۔ فرحت بیگم

فن موسیقی میں دست گاہ رکھنے والی طوائف ۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا ۔ ۱۸۵۷ء تک بقیدِ حیات تھی ؎

دل لگایا ہے تری زلفِ رسا سے کچھ ہو
سانپ کو چھیڑ لیا اب تو بلا سے کچھ ہو

قمر بارہ بنکوی

متوطن دیوی شریف ضلع بارہ بنکی ۔ سید حسین کی دختر اور اچھی شاعرہ ؎

اُٹھی انگڑائیاں لیتی جو گھٹا ساون کی
چلی بل کھاتی ہوئی بادِ صبا ساون کی

قمر لکھنوی ۔ حیدری بیگم عرف ماہ طلعت

مرزا ہمایوں بخت کی بیٹی اور واجد علی شاہ کی حرم تھیں ۔ بے حد ذہین اور خوش مزاج ۔ شعری سخن کا فطری ذوق تھا ۔ فارسی و اُردو میں شعر کہتی تھیں ۔ فن موسیقی میں بھی دست گاہ بہم پہونچائی تھی ۔ ۱۲۸۱ھ میں کلکتہ میں انتقال ہوا

؎ دعویٰ تھا عبث یار مسیحائی کا تم کو
اچھا نہ ہوا ایک بھی بیمار تمہارا

کشن خیرآبادی ثم لکھنوی ۔ کشن پیاری

رائے پورن چند عاجز کی بیٹی ۔ ۱۸۵۶ء کے قریب خیر آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئیں ۔ آٹھ سال کی عمر میں معروف شاعر و ادیب منشی رام سہائے تمنا لکھنوی سے شادی ہوئی ۔ تقریباً ۷ سال تمنا کی رفاقت اور مشہور محلہ نوبستہ لکھنؤ جیسے مرکز شعر و ادب میں گزارے ۔ اردو و ہندی کی مشہور شاعرہ تھیں ، ان کی غزلیں اور بھجن وغیرہ بہت مقبول تھے ۔ ۱۹۲۴ء میں تمنا لکھنوی کی وفات کے ۲۵ دن بعد لکھنؤ میں انتقال ہوا ؎

یارب یکتائے دو جہاں ہے تو ہی بانیِ زمین و آسماں ہے تو ہی

کنیز لکھنوی ۔ فاطمہ بیگم

دختر نصرت الدولہ کی لونڈی ۔ بڑی طباع ، شوخ اور حاضر جواب تھی

وصل کی شب ہو گا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے
جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائے گی

گنا لکھنوی ؎ بتایا مجھ کو زمانے نے آخرش چورنگ
کیا ہے کون سا یاروں نے مجھ پہ وار نہیں

گوہر لکھنوی ۔ سیدہ گوہر بیگم

ڈاکٹر ہدایت حسین ذہنوی کی اہلیہ اور تجبر لکھنوی کی شاگرد ۔ نوحوں کے مجموعے "بیاض گوہر" ، "ریاض گوہر" اور "سراج گوہر" مطبوعہ ہیں ؎

قبر پر رو کے کہتی تھیں مادر گھر چلو پیارے اصغر یہاں سے
تم ڈرو گے اکیلے میں دلبر گھر چلو پیارے اصغر یہاں سے

گوہر لکھنوی ۔ لال بی (کسبی) ؎

حسرت و یاس و الم اور غمِ تنہائی ہے
اپنی قسمت میں یہی انجمن آرائی ہے

ماہ لکھنوی ۔ منجھلی بیگم ؎

گر مقابل عارضِ جاناں کے اک دم آ لے گل
شرم سے بلبل کو پھر ہرگز نہ منھ دکھلائے گل

محبوب لکھنوی ۔ سلطان جہاں بیگم

واجد علی شاہ کی منکوحہ ۔ اچھی شاعرہ تھیں ؎

ہے آرزو ترے ہاتھوں سے قتل ہوں میں بھی
لگی ہوئی ہے تری تیغِ آبدار میں روح

مخفی لکھنوی ۔ امۃ الفاطمہ

آغا ہادی کے گھر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں ۔ حصولِ علم کا شوق تھا ، پردہ نشین رہ کر عربی ، سنسکرت ، ہندی ، فارسی اور اُردو خانگی طور پر پڑھ کر ان سب زبانوں پر دست رس حاصل کی ۔ شاعروں میں شرکت نہیں کرتی تھیں لیکن شاعروں کی طرحوں پر غزلیں کہتی تھیں اور اگر طرح پہلے معلوم ہو جاتی تھی تو اپنی غزل بھیج بھی دیتی تھیں ۔ جو مشاعرے میں کوئی پڑھ دیتا تھا ۔ پرگو و پختہ مشق شاعرہ تھیں ۔ مجموعۂ کلام "تخیلاتِ مخفی" مطبوعہ ہے ۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال ہوا ؎

یہ سب باتیں ہیں کہنے کی نہ قاتل تھا نہ بسمل تھا
اُدھر سے تیر آگے تھے اِدھر سینہ مقابل تھا

مذنب لکھنوی ۔ امین جان (طوائف)

یوسف لکھنوی کی شاگرد تھی ؎

ہو گئی ہے شام اب تو تیرے کوچے کے قریب
شب کی شب رہنے دے او ظالم ذرا منزل کے پاس

مستور لکھنوی۔ مستورہ بیگم

صاحبِ جائداد و لیاقت اور اچھی شاعرہ تھیں ۔

خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت
رہا ہے اپنا گریباں بے رفو برسوں

مشتری خیرآبادی۔ قمر جان عرف منجو

وطن خیرآباد ضلع سیتاپور تھا، لیکن ماں و خالہ کے ساتھ لکھنؤ آ کر محلہ چوک میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ موسیقی میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ فارسی و اردو زبان و ادبیات پر عبور رکھنے والی فارسی و اردو کی نامور شاعرہ تھی۔ آغا علی شمس کی شاگرد و تربیت یافتہ، نظم و نثر پر قادر۔ مرزا غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ادبی محاذ قائم کرنے والی مشتری اور ان کی بہن زہرہ کو ناقدینِ غالب میں اوّلیت حاصل تھی اور ان کے تنقیدی مضامین بکثرت چھپتے تھے۔ دیوانِ فارسی اور شعری مجموعہ "خانۂ خیال" مطبوعہ ہیں۔ آخر میں سید اعجاز حسین سے عقدِ شرعی کر لیا تھا۔ ۔

قاتل کے ہاتھ پاؤں سے سُرخی نہ جائے گی
خونِ شہیدِ ناز ہے رنگِ حنا نہیں

معشوق فیض آبادی۔ حیدری خانم ۔

پان کھا کر جو کہیں تھوک دیا اس گل نے
رشکِ یاقوت بنے باغ کے کنکر پتھر

مہک لکھنوی۔ گلشن جان (نجن جان)

امداد حسین رضا لکھنوی کی شاگرد تھی ۔

نے مزاج اپنا موافق ہے نہ بیگانہ مزاج
آج کل وحشی طبیعت ہے تو دیوانہ مزاج

ناز سیدن پوری۔ بیگم قاضی حماد حسین ۔

ہائے رے سادگی محبت کی   یہ نشیب و فراز کیا جانے

ناز سندیلوی۔ امراؤ جان (طوائف)

سندیلہ ضلع ہردوئی کی رہنے والی تھی، وہاں سے خیرآباد منتقل ہو گئی۔ شعر اچھے کہتی تھی ۔

جی بھر آیا بس اک آہ کے ساتھ
جوشِ حسرت اٹھا نگاہ کے ساتھ

ناز لکھنوی۔ اچھی بی

شاہد بازاری۔ مرزا فدا حسین فدا کی شاگرد تھی ۔

دل جل گیا حرارتِ داغِ فراق سے   اس آفتابِ حشر کا ہوگا زوال کب

نازک فیض آبادی۔ زینت ۔

کوچے میں کوئی سسکے کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے تو یہ کیا ظلم کرے ہے

نشتر لکھنوی۔ قیصر بیگم ۔

کسی کے گیسوئے پُرخم جو نشتر یاد آتے ہیں
مری آنکھوں میں پھرتی ہے سیاہی شامِ ہجراں کی

نظیرن لکھنوی

ایک پردہ نشین و عفت مآب خاتون کا تخلص تھا ۔

کیا کہیں تم سے ہم کہ کیا ہیں ہم   پاک دامن ہیں پارسا ہیں ہم

نکہت لکھنوی (نسیم نکہت)

نسیم آرا۔ سید مصطفےٰ حسین کی دختر اور زمانۂ حال کی شاعرہ۔ ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں۔ شعری مجموعہ مطبوعہ ہے ۔

ہم نوا، ہم نفس، ہم سفر زندگی   پھر بھی ہے کتنی نامعتبر زندگی

نہاں رُدولوی۔ زاہدہ بیگم رزم

معروف شاعر جعفر مہدی رزم ردولوی کی شریکِ حیات اور انھیں کی تربیت یافتہ اچھی شاعرہ ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔ بیشتر کلام مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مرثیہ و سلام وغیرہ بھی خوب کہتی ہیں

ہالے میں گیسوؤں کے ہے مہتاب سی جبیں
خم دار ابروؤں پہ مہِ نو کا ہے یقیں
سایہ ہے ذوالفقار کا، ہے چشم سُرمگیں
باریک جلد عارضِ تاباں کی آتشیں

دو پھول ہیں بہار یہ سارے چمن کی ہے
رنگت گلاب کی ہے مہک یاسمن کی ہے

وزیرن خیرآبادی۔ وزیر بیگم (طوائف) ۔

نہیں جب ثباتِ دنیا تو مجھے ترا گلہ کیا   مرے ساتھ عہد کیونکر ترا استوار ہوتا

وصیہ جائسی ۔ فاطمہ وصیہ نقوی

شعر و ادب سے دل چسپی رکھنے والے خاندان میں ۱۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو سید وارث حسین نقوی کے گھر جائس ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ دوران طالب علمی ہی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ خاندان میں متعدد ممتاز شعرا موجود تھے۔ وصیہ نے مولانا کامل حسین کامل سے کلام پر اصلاح لی۔ زمانۂ حال کی خوش فکر شاعرہ ہیں ؎

دستِ طلب دراز ہوا دنیا کو فکر تھی
لیکن نہ کھُل سکی میری مٹھی بندھی ہوئی

وفا لکھنوی ۔ عزیز بانو داراب

ڈاکٹر شریف الدین داراب کے گھر ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور اسی سے وابستہ رہیں۔ بحیثیت انگریزی لکچرر خدمات انجام دیکر تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج لکھنؤ سے سبکدوش ہوئیں۔ مقامی و غیر مقامی شاعروں میں شرکت کرتی ہیں۔

یاد ۔ شاہجہاں بانو

اچھے شاعر محمد حفیظ حفیظ کے گھر ۲ فروری ۱۹۴۷ء کو گوالیار میں پیدا ہوئیں۔ عمر کا ابتدائی حصہ دہلی میں گزارا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ والد خوش فکر شاعر تھے، انھیں سے اصلاح لی اور جلد ہی ملک کے اہم شاعروں میں شرکت کر کے ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خوش گو شاعرہ ہیں۔ شعری مجموعہ "یاد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ؎

آپ جب آتے ہیں لیکر کوئی غم آتے ہیں
رنج و راحت مرے نزدیک بہم آتے ہیں

ڈوبنے والوں میں اک اور اضافہ ہی سہی
ڈوبنے والو نہ گھبراؤ کہ ہم آتے ہیں

یاس فیض آبادی ۔ آفتاب بیگم

اچھی شاعرہ تھیں۔ شعر خوب کہتی تھیں ؎

اُڑ کے وہ نخچیرِ یادِ شوق میں بے پر لگا
تیر تیرا جس کسی کے لے پری پیکر لگا



"لکھنؤ میں بعض شریف، شائستہ اور تعلیم یافتہ عورتیں ایسی اچھی سوز خوان ہیں کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خوان ان کے مقابلے میں ہرگز فروغ نہ پا سکتے۔ بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ تال کٹورے کی کربلا میں گیا تھا اور وہیں ایک خیمے میں شب باش ہوا۔ ڈو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان میں آئی، جس نے سب دوستوں کو جگانے کے لیے بیتاب کر دیا۔ ہم سب اس آواز کے شوق میں خیمے سے نکلے اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے، چاندنی کھیت کیے ہوئے ہے اور اس میں عورتوں کا ایک غول تعزیہ لیے ہوئے آ رہا ہے۔ سب بال کھولے اور سر برہنہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لیے ہوئے ہے، اس کی روشنی میں ایک حسین، سرو قد نازنین، چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی عورتیں اسکے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اُس سناٹے، اُس وقت، اس چاندنی، اُن سر برہنہ حسیناؤں اور اس پُر سوز و گداز نغمے نے جو سماں پیدا کر رکھا تھا، اس کو میں بیان نہیں کر سکتا......

جب کاروانِ شہرِ مدینہ لُٹا ہوا
پہنچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسینؑ کا آگے دھرا ہوا
اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھُلا ہوا

اس مناسبِ حال مرثیے نے یکایک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہ ہوتا تھا کہ ان اشعار کے ذریعہ وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے یا خود اپنے اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی"

(گزشتہ لکھنؤ: عبد الحلیم شرر ص ۲۵۰)

شارب ردولوی

لکھنؤ کی تہذیب کا آخری نمائندہ شاعر

اثر لکھنوی

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نہ صرف یہ کہ اُردو کے ایک اہم اور بلند پایہ شاعر تھے بلکہ لکھنؤ کی تہذیب، رواداری، نفاست، وضعداری، آداب اور زبان میں ایک روایت کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کی صحت مند شعری روایت کے آخری نمائندہ شاعر تھے جن سے اُردو شعراء کی کئی نسلوں نے ادبی و فکری تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اُردو کے ایک اچھے نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور تہذیب، شائستگی اور نفاست یا اُردو شاعری کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی۔

اثر لکھنوی ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء یعنی ۱۰۹ سال پہلے کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ لکھنؤ کی آخری بہار تھے۔ زمانہ بہت بدل چکا تھا، انتزاعِ سلطنتِ اودھ کو تقریباً تین دہائیاں گزر چکی تھیں اور ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام اپنی تہذیب اور زبان کے ساتھ پورے ملک میں اپنے قدم مضبوط کر چکا تھا۔ دلی کی تہذیبی شناخت مدھم پڑنے لگی تھی لیکن اودھ میں یہ چراغ ابھی مخالف ہواؤں کی تیزی و تندی کے باوجود روشن تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ یہاں کی تہذیب صرف ایک شہر تک محدود نہیں تھی بلکہ تہذیب کے اس درخت کی جڑیں دور دور تک اودھ کے چھوٹے چھوٹے قصبات میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اثر صاحب کہا کرتے تھے:

"میاں ردولی، دریاآباد، سندیلہ، کاکوری، محمودآباد اودھ کے قصبات نہیں لکھنؤ کے محلے ہیں اور لکھنؤ کی تہذیب انھیں سے زندہ ہے۔"

لکھنوی تہذیب کی نرمی، نفاست، شائستگی، حسنِ اخلاق، علم دوستی، ادب نوازی، رواداری، زبان و آداب، وضعداری اور دلکشی کی جیتی جاگتی مجسم تصویر تھے۔

اثر لکھنوی نے طویل عمر پائی۔ ڈپٹی کلکٹر سے لے کر کشمیر کے وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اعظم تک کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۸۲ سال کی عمر میں ۶ر جون ۱۹۶۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس عرصہ میں انھوں نے زندگی، ادب اور تہذیب کے افق پر بہت کچھ بنتے، ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کٹرہ ابوتراب خاں، پاٹانالا، فرنگی محل، کشمیری محلہ جلیل القدر علماء، مجتہدین اور شعراء سے جھلک رہا تھا۔ ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا۔ اثر لکھنوی نے اسی علمی و ادبی ماحول میں ایک رئیس، باوقار اور ذی علم خانوادے میں آنکھ کھولی۔ یہ ایک ایسا خاندان تھا جہاں دولت کی بھی فراوانی تھی اور علم کی بھی۔ اثر نے مشرقی روایات، زبان اور تہذیب کی وراثت اپنے خاندان سے پائی اور جدید تعلیم اسکول اور کالج سے حاصل کی۔ مغربی علم، لباس اور تہذیب کو انھوں نے کارِ دُنیا کے لیے ہی رکھا۔ وہ کبھی ان کی زندگی کا حصہ نہیں بن پائی۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب ان کی زندگی تھی۔ لکھنؤ کا یہ زمانہ شعر و ادب کے لحاظ سے بہت اہم زمانہ تھا۔ اثر نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی اور آرزو لکھنوی کے نام افقِ شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ عزیز لکھنوی سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا۔ یہ زمانہ لکھنؤ کی شاعری کا اہم زمانہ ہے۔ یہ دبستانِ لکھنؤ کی شناخت بھی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب بھی ہے۔ اس عہد کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ زبان اور خیال آرائی کے ساتھ فکر کی گہرائی اور

جذبے کی تصویر کشی کا زمانہ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس عہد کی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا گیا، ورنہ ناقدین کو دبستانِ لکھنؤ کے بارے میں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنی پڑتی۔ اصل میں ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ کسی عہد کے بارے میں اگر کوئی بات کہہ دی گئی تو وہ تاریخ بن جاتی ہے، حالاں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ فکر و اظہار کے زاویے بدلتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ امانت اور خواجہ وزیر کے عہد کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ اصطلاحات اس طرح تنقید میں چل پڑیں کہ حالات بدلے، فکر و اظہار کے انداز تبدیل ہوئے، لیکن اعتراض اسی طرح باقی رہا۔ حالاں کہ اس عہد کی شاعری اگر دیکھیں تو دبستانِ لکھنؤ کی ایک نئی صورت نظر آئے گی۔ ثاقب لکھنوی کا یہ شعر صرف توجہ دلانے کے لئے پیش ہے ؎

قفس مجھ کو نشیمن ہوگیا خوفِ اسیری سے
کوئی پتا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

قفس اور نشیمن، باغباں اور چمن کہنے کو تو قدیم علامات اور اشارے ہیں لیکن یہ کس معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور عصری حسیت کے کس پہلو کو پیش کرتے ہیں اس کی طرف توجہ نہ دینا ناانصافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عہد ان سماجی تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے، جو لفظی بازیگری اور قافیہ پیمائی کی شاعری کو عصری فکر کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہی تبدیل ہوتی ہوئی فضا تھی جس میں آثر لکھنوی کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ آثر کی نگاہ بدلتے ہوئے حالات پر بھی تھی اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار پر بھی۔ آثر کی شاعری کے یہی دو اہم عناصر ہیں۔

لکھنؤ کی تہذیب اکثر اُن لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے جنھوں نے اس کے بارے میں سنا ہے یا اِدھر اُدھر کے غیر ذمہ دارانہ تبصرے پڑھے ہیں۔ مثلاً اس طرح کی باتیں بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں کہ:

"دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی نسائیت، فارسی کی دل آویز تراکیب کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی داخلی اور رومانی مضامین کا فقدان، تصوف کا فقدان، رعایتِ لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، بیہودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال۔" [1]

اور جب کسی نے لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کیا تو یہی اعتراضات دہرا دیے گئے۔ سوال یہ ہے کہ کس لکھنؤ کا ذکر ہے۔ کیا لکھنؤ اور دبستانِ لکھنؤ آصف الدولہ سے لے کر دولتِ انگلیشیہ کا صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کا مرکز بننے کے بعد تک ایک ہی رہا۔ لکھنؤ کی شاعری کا ایک عہد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا عہد ضرور رہا ہے۔ اس فکر کے ذمہ دار اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات تھے اور اس طرح کے حالات جہاں بھی جب کبھی پیدا ہوئے ہیں شعر و ادب میں اس طرح کی باتیں آئی ہیں۔ دہلی میں ایک پورا عہد ایہام گوئی اور اس کے بعد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا رہا ہے جس سے بہادر شاہ ظفر اور امیر مینائی جیسے شاعر بھی نہیں بچ سکے۔ لیکن دہلی اس عہد کی عمر اس لیے مختصر رہی کہ دہلی اُجڑ گئی۔ اہلِ علم، اہلِ خرد جہاں سکون و تحفظ تھا، عزت و نیک نامی تھی وہاں چلے گئے۔ لکھنؤ اس وقت سب سے زیادہ امن کی جگہ تھی، دولت کی فراوانی تھی، شعر و ادب کی سرپرستی کرنے والے تھے، یہاں پہنچ کر ان اساتذہ نے اس لذت اندوزی اور لفظی بازی گری کو اور ہوا دی۔ بہرحال اس کا سبب کچھ بھی ہو، کوئی بھی تحریک یا انداز ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ فکر، اظہار یہاں تک کہ ہیئت کے سانچے سب، وقت اور سماجی تبدیلیوں یا سماجی مطالبات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے اس تبدیلی کو لکھنؤ کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ تبدیلی کی یہ رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ ثاقب، عزیز، صفی اور آرزو کے یہاں تبدیلی نمایاں ضرور ہے۔ خاص طور پر ثاقب کے یہاں فکر کی جو گہرائی اور احساس کی جو شدت ہے وہ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ تبدیلی آثر کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ آثر کی شاعری میں کسی طرح کی شدت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی شاعری کی کمی ہو۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب کی خصوصیت ہی نرمی، نفاست اور سکون ہے۔ یہاں تیز تیز چلنا، تیز آواز میں بولنا بدتمیزی میں شامل ہے۔ یہاں کی تہذیب شعری، دادرا اور خیال میں ہے۔ یہاں کی تہذیب کتھک میں ہے۔ یہاں کی تہذیب غزل میں ہے۔

آثر کی شاعری اسی تہذیب کی نرمی، نفاست اور سلیقے کی تصویر ہے۔ آثر کی زندگی میں بھی ایک سلیقہ، نفاست اور سکون ہے اور ان کا

شاعری میں بھی۔ ان کے یہاں فکر کی گہرائی کا اظہار بھی سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی زبان میں کوئی پیچیدگی، ابہام اور الجھاؤ نہیں ہے، یہی ان کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے روشن ہے شمع دیر و حرم
کبھی آزر، کبھی خلیل ہوں میں

کون ہوں، کیا ہوں اور کیوں ہوں میں
عاجز ادراک و ہوش ہے مجھ سے

خدا معلوم ہستی کیا ہے، کیا ہے راز ہستی کا
جہاں تک شرح کرتے جاؤ مبہم ہوتی جاتی ہے

اثر کے ان اشعار میں جو فکری گہرائی ہے اور ایسے فلسفیانہ اور متصوفانہ موضوعات کو جس سلاست اور صفائی کے ساتھ وہ نظم کر دیتے ہیں یہ انھیں کا حصّہ ہے۔ خدا، انسان، ازل و ابد، دُنیا، حیات اور موت ایسے موضوعات ہیں، جن پر اُردو شعراء نے اکثر اظہار خیال کیا ہے لیکن اثر نے جس طرح اسے نظم کیا ہے اس میں نہ کسی طرح کی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ ہے نہ فلسفیانہ موشگافی ہے۔ "موت سے چند چرائے ہوئے لمحے ہیں کہ زیست" زندگی پر اتنے سادہ اور دل کش انداز میں تبصرہ مشکل ہی سے کسی شاعر کے یہاں نظر آئے گا۔ اظہار و بیان میں یہی سادگی ان کی خصوصیت ہے۔ دراصل لکھنؤ کی تہذیب ان کی شاعری میں زندہ، متحرک اور بولتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں کچھ سکوت ہے، کچھ حجاب ہے، جہاں تہذیب مجلس نہ بولنے دیتی ہے اور نہ نظر بھر کر دیکھنے دیتی ہے۔ بس ایک کسک ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی، محسوس کی جا سکتی ہے ؎

لب پہ آیا نہ اس کا نام کبھی
غم کی پرہیزگاریاں نہ گئیں

سخن نہ آشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو
کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب مجلس نے

اس تہذیب مجلس اور ترتیب مجلس کا لطف کوئی 'لکھنؤ تہذیب آشنا' ہی لے سکتا ہے۔ اثر تو حرف تمنا بھی لب پر نہیں لاتے کہ یہ تہذیب عشق اور آداب محبت کے خلاف ہے۔ یہاں تو سب کچھ خموشی کی زبان میں کہا جاتا ہے اور زبان نگہ مست سے سُنا جاتا ہے ؎

ہے ہے وہ مفتیں نگہ نیم مست کی
اب اس کے بعد شوق کا اظہار کیا کریں

نگہ مست کی منتوں میں کیا کچھ ہے جو اثر نے نہیں کہہ دیا۔ اثر کی زبان ایسی سادہ و پُرکار ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اس میں کہہ جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا بیشتر حصّہ سہل ممتنع پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت آہستہ لب و لہجہ میں بات کر رہے ہیں۔ ان کا پورا کردار ان کی شاعری کی زبان میں پوشیدہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی ایسی کسک ہے، اور ایسا اثر ہے کہ احساس کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ یہ سادگی اور یہ شائستگی لکھنؤ کی اس کی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئی۔

آج کے عہد اور آج کی زندگی کا چہرہ اثر کے اس شعر کے آئینے میں دیکھئے ؎

اب یہی ہے نباہ کی صورت
ناسزا سُنیئے مرحبا کہیئے

اس کے علاوہ ان کے چند اور اشعار اسی سادگی اور پرکاری کے ملاحظہ فرمائیں ؎

آ تو ملے ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
لو آئے تھے وہ پرسش بیمار کے لئے

کچھ جو کہیے تو ایک آفت ہے
چپ جو رہیے تو بات جاتی ہے

اثر میر کی شاعری کے زبردست معتقد اور مداح ہیں۔ یوں تو بیشتر شعراء نے میر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن اثر کے یہاں یہ صرف خراج عقیدت تک محدود نہیں ہے۔ اثر، میر کی سادگی، تاثیر، جذبے کے خلوص اور صفائی کے گرویدہ ہیں۔ رنگ میر ان کا پسندیدہ رنگ ہے۔ ان کے کلام پر میر کا بہت گہرا اثر ہے اور بار بار وہ اپنی شاعری میں میر کا حوالہ دیتے ہیں

وہ جو ہے میر کی غزل میں، اثر
سلکِ گوہر میں آب و تاب کہاں

اور اکثر اثر، میر کے اس ڈھب کو اپنے اشعار میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

شاد تو کیا برباد کرو گے
لو، دل لو کیا یاد کرو گے

اثر انھیں سیدھے سادے لفظوں میں ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پھولوں کی ڈالیاں لہرا رہی ہیں جیسے کوئی "سرمستِ مئے ناب" دنیا سے بے خبر جھومتا ہوا چل رہا ہو ؎

امرت بھری آنکھوں میں دھر آنکھ کی پتلی
رادھا ہے کہ گاگر لیے پنگھٹ پہ کھڑی ہے

فارسی کے ایک جدید شاعر ہوشنگ شفا کی ایک نظم میں سیاہ آنکھوں کے لیے بہت خوبصورت تشبیہ دیکھی تھی ؎

چشمے کہ چوں عصارۂ شب ہا سیاہ بود
چشمے کہ سائبانِ ہزاراں گناہ بود

اسی طرح اثر نے محبوب کی سیاہ زلفوں اور ان کی لمبائی کے لیے جو استعارہ استعمال کیا ہے وہ مجھے کسی دوسری جگہ نظر نہیں آیا ؎

آبشار اک سیاہ بجلی کا
گیسوئے تابدار ارے توبہ

لکھنؤ کی تہذیب کی ایک خصوصیت مذہبی رواداری، میل و محبت اور دوسروں کے جذبات کا احترام ہے۔ آج بھی اس مٹے ہوئے لکھنؤ میں اس کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں گو کہ اسے ہر سطح پر مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ اسی تہذیب میں ممکن تھا کہ شیعہ علماء کی تعلیم فرنگی محل میں ہو اور سنی علماء اور طلباء درس کے لیے خاندانِ اجتہاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی ایسی رواداری اور ایسا احترام کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئے گا جس کا نتیجہ ہے کہ سارے ملک میں ہنگامہ و فساد کے باوجود لکھنؤ میں کہیں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ آثر لکھنوی اسی تہذیب کے نمائندے ہیں جو کہتے ہیں ؎

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے ہوئے انساں دیکھا

اثر کی شاعری غزل کی شاعری ہے اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔ اثر غزل میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں تغزل کے ساتھ جو بے ساختگی ہے وہ بڑی اثر انگیز ہے۔

اک اچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیٔ دل
حال پوچھے کوئی اس وقت تو مشکل ہو جائے

تیری نگاہ ناز کے قربان جائیے
دل کی جگہ اب اک خلشِ جاں نواز ہے

اثر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تشبیہ اور استعارے سے براہِ راست کم کام لیتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے سے عام طور پر اس جگہ کام لیا جاتا ہے جہاں براہِ راست کسی بات سے گریز کر کے اسے حوالے اور اشارے میں بیان کیا جائے تاکہ شعر میں ندرت اور تاثر پیدا ہو سکے۔ لیکن اثر لکھنوی مشابہت اور مماثلت سے کام لیتے ہیں اور واقعاتی رنگ دے کر اس سے ایسا امیج بناتے ہیں کہ اس کی اثر انگیزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اثر کا ایک شعر ہے ؎

ان پہ ہنسیے شوق سے جو مائلِ فریاد ہیں
ان سے ڈریئے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

اثر کے اس شعر میں سادگی، سلاست اور دل نشینی کے ساتھ جو معنی خیز تہ داری اور اثر انگیزی ہے وہ بہت کم کہیں ملتی ہے۔ اس بیان میں اثر کی تہذیبی شناخت نمایاں ہے۔

اثر لکھنوی تہذیب اور شائستگی کی ایسی تصویر تھے جس کی دوسری مثال کیا اب اس تصویر کی دل کشی اور دیدہ زیبی بیان کرنے والے بھی نہیں رہے لیکن وہ تہذیب آج بھی اثر کی شاعری میں اسی دل کشی اور دلفریبی کے ساتھ زندہ ہے۔ انھوں نے سچ کہا تھا ؎

ابھی تو نہیں جب اثر ہم نہ ہوں گے
بہت یاد آئیں گی باتیں ہماری

نامی انصاری

اودھ پنچ کی خدمات

غالب کی وفات (فروری ۱۸۶۹ء) کے نو سال بعد ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں "اودھ پنچ" کا اجرا عمل میں آیا جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ آٹھ صفحے کا یہ اخبار "لندن پنچ" کے طرز پر جاری ہوا تھا۔ جس کا خاص مقصد طنز و ظرافت کی راہ سے ملک کے سماجی اور سیاسی رجحانات کو ایک نیا رخ دینا تھا۔ اس اخبار کی اردو دنیا میں پر جوش پذیرائی ہوئی اور بقول ڈاکٹر مصباح الحسین قیصر:

"عوام و خواص نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ہم عصر اخباروں نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ گورنمنٹ نے شک و شبہ سے بھرپور نگاہیں ڈالیں اور مسخرا سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن ان تمام باتوں سے بے پروا، اپنی دھن میں مست، دیوانہ وار آگے بڑھتا رہا چنانچہ ہر گھر میں اس کا ذکر اور ہر محفل میں اس کے چرچے ہونے لگے۔"

اودھ پنچ کی سیاسی پالیسی انگریزی حکومت کی مخالفت، کانگریس پارٹی کی ہم نوائی، سرسید تحریک کی تردید اور قومی اتحاد کی حمایت پر مبنی تھی۔ اس نے ملک میں انگریزوں کے خلاف بے باکانہ سیاسی طنز کی بنا ڈالی اور ظرافت کے چھینٹوں سے اسے موافقین اور مخالفین دونوں کے لئے خوشگوار بنا دیا۔ غالب، نذیر احمد اور سرسید کی چند ظرافت آمیز تحریروں سے قطع نظر، اودھ پنچ کے ذریعہ اردو میں پہلی بار طنزیہ مزاحیہ صنف ادب کا آغاز ہوا اور درجنوں مضمون نگار اور شاعر طنز و مزاح کے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اودھ پنچ کے خصوصی نامہ نگار تو چھ ہی سات تھے یعنی اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزاد، منشی احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور منشی جوالا پرشاد برق مگر کچھ اور نامہ نگاروں نے بھی وقتاً فوقتاً فرضی ناموں سے اودھ پنچ کے لئے خصوصی مضامین لکھے مثلاً مولانا نادکنی، مسٹر لافر، زاغ بدایونی، سلطان ظریف، ش۔ ع کاکوروی مدہوش بمبئی، حضرت لکھنوی، ع۔غ فیض آبادی، ع۔ د فاروقی، ڈاکٹر ندیم اور ظریف بند وغیرہ

اودھ پنچ کے معاونین میں سب سے پہلا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہونا چاہئے مگر کچھ عرصہ تک اودھ پنچ سے وابستہ رہنے کے بعد وہ اس سے الگ ہو کر منشی نول کشور کے اخبار "اودھ اخبار" کے نہ صرف ایڈیٹر ہو گئے بلکہ اودھ پنچ کے مخالف بھی ہو گئے۔ سرشار بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور مزاح نگاری میں تو اس دور میں ان کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ ان کی تصنیف فسانۂ آزاد کلاسیکی ادب کا درجہ رکھتی ہے۔

اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی نمایاں خصوصیت ان کی بے خوفی اور بے باکی ہے۔ انگریزی اقتدار کے عروج کے زمانے میں بھی وہ کانگریس پارٹی کے رکن اور انگریزی حکومت کے زبردست نکتہ چین تھے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کے سیاسی مسائل پر بے باکانہ رائے زنی کی اور بڑے کلّے ٹھلے والے انگریز حاکموں اور عہدے داروں کو نشانۂ مشق بنایا۔ کھلے خطوط اور "سربستہ مضامین" کے علاوہ وہ چٹکلوں اور لطیفوں سے اپنے مضامین میں طرحداری پیدا کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں جدت پسندی بھی بہت تھی۔ جس کی وجہ سے اودھ پنچ عوام و خواص میں یکساں طور سے مقبول تھا۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تصنیفات میں) حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، اور احمق الدین کو کافی شہرت ملی۔ انکی طنزیہ سیاسی تحریروں میں سے۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم سر گلیڈ اسٹون کے نام ان کے ایک خط کا اقتباس:۔

"مولوی گلیڈ اسٹون صاحب! دعائے خیر نصیب شما باد!

تم پولیٹکل دسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا، تیار ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول، بکائن کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون سا مسالہ کیوں کر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے گلاوٹ آتی ہے۔ پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں۔ فارن پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیا پی کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔"

(ماخوذ از کھلے خط اور سربستہ مضامین)

منشی سجاد حسین کا یہ اسلوب اگرچہ نیا بھی ہے اور اودھ کے تہذیبی رنگ میں ڈوبا ہوا بھی ہے مگر اس میں کوئی دیرپا چاشنی نہیں ہے۔ آج یہ اسلوب بذات خود مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف گلیڈ اسٹون کو مولوی کہکر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف ان کو باورچی بنا دیا ہے۔ دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے اور یہ مزاح کی کوئی من بھاوتی تصویر نہیں پیش کرتا ان کے سیاسی مزاحیوں کا یہ عمومی رنگ ہے جس سے انکی جودت طبع تو ظاہر ہوتی ہے مگر ان کے تخیل کی اڑان محدود ہے اور وہ کوئی باقی رہنے والا کارنامہ نہ پیش کر سکے۔ البتہ انھوں نے اودھ پنچ کے گرد لکھنے والوں کا ایک با اثر حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ اس سبعہ سیارہ میں سب سے اہم نام نواب سید محمد آزاد کا ہے۔ ان کی ظرافت کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ "مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلنشیں پیرایہ میں طنز کی ہے اس کا جواب بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے۔ کینہ پروری اور زہرناکی عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے اس اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔"

نواب سید محمد آزاد کے علاوہ اودھ پنچ کے دیگر نامہ نگاروں کے طرز تحریر میں آورد اور تکلف زیادہ ہے۔ وہ زیادہ تر زبان کی بندش، الفاظ کے الٹ پھیر، محاوروں کی شوخی اور چرب زبانی سے مزاح پیدا کرتے ہیں مگر ان میں متانت اور ٹھہراؤ کی کمی سے ادبی چاشنی نہیں پیدا ہو پاتی۔ منشی احمد علی شوق، تربھون ناتھ ہجر، مرزا ستم ظریف اور جوالا پرشاد برق کے اسالیب میں کوئی نمایاں انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کے موضوعات میں بھی کوئی ندرت یا تازگی نہیں ملتی۔ ان مزاح نگاروں کی حیثیت ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔

شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ اکبر الہ آبادی نے اودھ پنچ میں نثری مضامین بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر مصباح الحسین قیصر نے اپنی کتاب "اودھ پنچ کے معاونین" میں اکبر کے ۴۲ مضامین کی فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ مضامین موضوع یا مواد کی نوعیت کے اعتبار سے اکبر کی شاعری کی تفسیر ہیں۔ اکبر کی نظمیں ان کے جن خیالات، عقائد اور مقاصد کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ مضامین نثر بھی انھیں کی وضاحت کرتے ہیں۔" اودھ پنچ کی ۲ / اپریل ۱۸۹۶ء کی اشاعت میں "تم بھی برطرف" کے عنوان سے اکبر کا جو مضمون شایع ہوا ہے اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

"لوگ سچ کہتے تھے کہ حضرت خضر کی عمر بڑی ہے۔

مدت دراز سے سید صاحب اپنی تحقیق کی تلوار سے بہت سی مذہبی چیزوں کو ملک عدم کی طرف کھٹا کھٹ بھیج رہے تھے لیکن حضرت خضر ابھی تک بچے ہوئے تھے۔ نہیں معلوم سید صاحب کی فروگذاشت تھی یا حضرت خضر کی روپوشی بہرحال وہ بھاگے ہوئے ضرور تھے۔ تہذیب الاخلاق کی پہلی جلد میں ایک مضمون دیکھا کہ خضر کوئی چیز نہیں۔ لیجئے اتنے دنوں تک تو حضرت خضر زندہ رہنے پائے اور صرف اب عالم موجودات سے سدھارنے پر مجبور ہوئے۔ اس پر ہم کو بھانڈوں کی وہ نقل یاد آئی جس کو وہ تخفیف اعمال پر اعتراض کرنے کیلئے محفلوں میں کیا کرتے تھے۔"

اکبر الہ آبادی نے اودھ پنچ کے لیے کچھ سیاسی اور کچھ ادبی مضامین بھی لکھے ہیں مگر اصلیت یہ ہے کہ ان مضامین میں اکبر کی جودت طبع نہیں کھلی۔ ان میں وہ مزاح اور نشتریت ہرگز نہیں ہے جو ان کی نظموں میں۔ سیاسی مضامین میں انکا انداز بڑا محتاط اور سنبھلا ہوا ہے۔ نیز ان میں طنز و مزاح دونوں کی چاشنی بہت پھیکی ہے۔ قدرت نے ان کو نثر نگاری کے لئے پیدا ہی نہیں کیا تھا وہ محض منشی سجاد حسین کی مروت میں اودھ پنچ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتے تھے اکبر کے اصل جوہر تو ان کی شاعری میں کھلتے ہیں۔

اودھ پنچ کے دور میں ممتاز ترین شاعر طنز و ظرافت اکبر الہ آبادی

اور ممتاز ترین نثر نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے جن کی ادبی قدر و قیمت آج بھی مسلم ہے۔ ان دونوں کی نظم و نثر کی تازگی اور شگفتہ کاری آج بھی دامن دل کو کھینچ لیتی ہے۔ رتن ناتھ سرشار اگرچہ اودھ پنچ سے بہت کم متعلق رہے تاہم وہ تھے اسی دور کے پروردہ اس لئے ان کا شمار بھی اودھ پنچ کے دور میں ہی کرنا چاہئے۔ سرشار کا سب سے زیادہ اور توانا کارنامہ فسانۂ آزاد ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات کو محیط ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:-

"یہ ایک ایسے دیوانہ کا کارنامہ ہے جس سے دنیا نے انکار کر دیا جس نے خود بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا اور جو اپنے افسانے کے ہیرو کو بھی نہ سنبھال سکا لیکن اس کے باوجود ہمیشہ زندہ رہے گا"

رتن ناتھ سرشار اپنی ذکاوت اور ذہانت کے لحاظ سے اپنے تمام معصروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ فسانۂ آزاد انھوں نے قلم برداشتہ لکھا مگر ان کا جادو خوجی کی شکل میں آج بھی زندہ ہے۔ بیشتر نقادوں کا خیال ہے کہ خوجی کا کردار لکھنؤ کی مٹتی بگڑتی کھوکھلی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے مگر یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں کہ سرشار کے ذہن میں یہی خیال رہا ہو۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے لکھنؤ میں کسی ایسے مضحک کردار کو دیکھا ہو اور اس کو فسانۂ آزاد میں خوجی کی شکل دے دی ہو۔ خوجی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"دراصل خوجی کا کردار نواب کے مصاحب یا مسخرے کا کردار ہے اور اس کا کام ہی نواب کے لئے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ کسی زمانے میں بدقسمتی سے انشا کو بھی نواب سعادت علی خاں کی کچھ اسی قسم کی خدمات انجام دینا پڑی تھی لیکن ذکر خوجی کا تھا۔ بعض اوقات خوجی کی چالاکی اسکے تصنع اور ہزار پردوں میں خود کو چھپانے کی کوشش کے باوجود جب ایک جھلک دکھاتی ہے تو ناظر کو فوراً اس کے مسخرے پن کا احساس ہو جاتا ہے"

یہاں خوجی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشا کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ خوجی احساس کمتری کا شکار ہو کر مضحک بن جاتا ہے مگر انشا صاحب کمال شخص تھے جو مضحک نہیں حاجت مند تھے اور حاجت اکثر اوقات اچھے اچھوں کو نہ جانے کتنے کنویں جھکوا دیتی ہے۔ دراصل خوجی کی خود فریبی ہی اس کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ اس کی قرولی بھی ایک علامتی ہتھیار ہے جس کا کبھی کوئی استعمال نہیں ہوتا مگر ذکر ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتا ہے۔

سید سجاد حسین کے مضحک کردار حاجی بغلول کے مقابلے میں خوجی زیادہ دلچسپ، متنوع اور جاندار کردار ہے۔ حاجی بغلول کی جسمانی اور دماغی کمزوریوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش مستحسن نہیں کہی جا سکتی تاہم جب حاجی بغلول اپنی فطری ناہمواریوں کے باعث نشانۂ تمسخر بنتا ہے تو اس کا مضحک کردار زیادہ قابل توجہ بن جاتا ہے۔ خوجی اور بغلول دونوں بعض اوقات عملی مذاق کی وجہ سے مضحکہ خیز بنتے ہیں مگر اس سے مزاح نگار کا اعتبار بڑھتا نہیں۔ گھٹ جاتا ہے۔

اودھ پنچ کی حیثیت تاریخی تھی، ادبی نہ تھی۔ اس نے شائستہ ظرافت کا کوئی اعلیٰ معیار قائم نہیں کیا۔ یہ شائستہ ظرافت تھی بھی نہیں بلکہ مہذب لوگوں کی اجتماعی اچھل کود تھی جس نے ماحول کو ایک حد تک جگایا تو ضرور مگر کوئی دیرپا اثر قائم نہ کر سکی۔ طنز و مزاح اگر مہذب قوموں کی فہم و دانش کا پیمانہ ہوتا ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اودھ پنچ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔ یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی کے آخر ربع میں اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا جو اودھ پنچ نے پیش کیا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اودھ پنچ کو ایسے اعلیٰ پائے کے نثر نگار میسر ہی نہیں آئے جن سے اس کو وقار اور اعتبار حاصل ہوتا البتہ اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ مزاحیہ شاعری استثنا کی حیثیت رکھتی ہے اور اودھ پنچ کا یہی ایک کارنامہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے کہ اس نے اکبر الٰہ آبادی جیسے بہترین طنزیہ و مزاحیہ شاعر کو اردو دنیا سے روشناس کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اب تک اردو شاعری اکبر کا جواب نہیں پیدا کر سکی۔ اگر اکبر ہی کے معیار کے دو ایک شاعر اور بھی اودھ پنچ کو میسر آجاتے تو اردو کی طنزیہ مزاحیہ شاعری میں اودھ پنچ کی خدمات کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا۔ پھر بھی اودھ پنچ نے اپنے محدود دائرے کے اندر جو کام کیا ہے اس سے اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ صرف نظر نہیں کر سکتی۔

□□

عبدالقوی دسنوی

اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے ٹھیک بیس سال بعد جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ کی سرزمین سے ایک طنز و مزاح سے بھرپور اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ اس اخبار کو اردو طنز و مزاح کے تیسرے دور میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین اپنی شگفتہ مزاجی اور طنزیہ و مزاحیہ تحریر کے لیے مشہور رہے

"اودھ پنچ" سے قبل سب سے پہلے ۱۸۵۵ء میں رام پور سے اس رنگ کا اخبار "مذاق" کے نام سے حکیم احمد رضا لکھنوی نے جاری کیا تھا، پھر ۱۸۵۹ء میں "مدراس پنچ" کے نام سے اردو کا دوسرا مزاحیہ اخبار نکلا تھا جس کے مالک شاہ محمد صادق حسینی شریف تھے۔ یہ اردو کا پہلا پنچ اخبار تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاخبار" "روہیلکھنڈ پنچ" مراد آباد اور پٹنہ سے "اپنچ" جاری ہوئے۔

اودھ پنچ نکالنے کی غرض و غایت مالی فائدہ کے بجائے طنز و مزاح کے ذریعہ قوم میں پیدا شدہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح، ذہنی بیداری پیدا کرنا اور انگریزوں کی لائی ہوئی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش تھی۔ بلاشبہ اس اخبار نے نہایت ہی جرأت مندی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انگریزی ذہن و فکر اور تہذیب کا مذاق اڑایا۔ اور ان کی سیاست کو نشانہ بنایا۔ مغربی تہذیب جسے بغیر سوچے سمجھے اہل ہند اختیار کیے جا رہے تھے اور اپنے ماضی و مستقبل سے بے خبر ہوتے جا رہے تھے جس کے نتیجہ میں بھیانک تباہی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ایسے وقت میں اپنچ نے ہنستے ہنساتے اور طنز کے وار سے مضطرب کرتے ہوئے ہمیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پنچ کی اسی خصوصیت کی طرف اپنی اس تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

"پنچ نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو مشرق کے لیے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بنا پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے۔" [1]

اودھ پنچ نے اصلاحی مقصد کے لیے طنز و ظرافت کا استعمال صرف نثر و نظم کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ کارٹون کی مدد سے بھی اپنے اصلاحی کاموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی جس میں انھیں بہت حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی باگ ڈور منشی سجاد حسین کے ہاتھ میں تھی جو ایک زندہ دل اور بے باک صحافی اور نڈر اور محب وطن ہندوستانی تھے۔ جن کی ظرافت میں عام طور سے دل آزاری نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صحتمند انداز سے برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں ہوتی تھیں جس کے نتیجہ میں اس کی طنزیہ مزاحیہ شمولات اور کارٹونوں کو اس زمانے میں بڑی مقبولیت رہی ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک تقریباً ۳۵ سال تک اس اخبار نے کبھی اپنی ظرافت سے قہقہہ لگانے اور مسکرانے پر مجبور کیا اور کبھی اپنے طنز کے تیر سے لہولہان اور مضطرب کرتے ہوئے اردو ادب کے طنز و ظرافت کے سرمایہ کو مالامال بھی کیا اور اہل اردو کو اپنی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ بلاشبہ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں اودھ پنچ کی ہمیشہ اہمیت رہے گی اور اس کی زبان اد

اور ملک کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

پنڈت برج نرائن چکبست نے اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت سے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ پوٹ رہتے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی۔"

اور انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے:

"آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔"

اس اخبار کی خوبیوں کے پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی معترف تھے انھوں نے اس کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی تھی:

"...... اس میں شک نہیں کہ پنچ، ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اس بے پناہ آلہ نے زندگی کے کسی شعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا۔ اردو ادب میں اودھ پنچ اپنے قسم کا اولین پرچہ تھا اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و ظریفات کے رائج الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔"

اودھ پنچ میں لکھنے والے اس زمانہ کے اردو کے تقریباً تمام معروف طنز و مزاح نگار تھے۔ خود منشی سجاد حسین اس میدان میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور ان کی تہذیب کی مخالفت کرتے رہے اور مشرقی اقدار کی ہمنوائی ان کا شیوہ رہا۔ اس اخبار کا موٹو تھا (LIFE IS PLEASURE) یعنی زندگی مسرت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ مزاحیہ صحافت کو اردو میں اسی اخبار کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی سیاسی اور سماجی مسائل پر اس نے ہمیشہ نہایت تیکھے انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بے لوث آواز بلند کرتا رہا۔ یہ اودھ پنچ کی مقبولیت ہی تھی جس کی وجہ سے اردو میں اور بھی بہت سے اخبارات اس طرز کے نکلے جن میں پنجاب پنچ (لاہور) کلکتہ پنچ (کلکتہ) انڈین پنچ (لکھنؤ) دہلی پنچ (لاہور) بنگال پنچ (کلکتہ) باوا آدم پنچ (بنارس) راجپوتانہ پنچ (اجمیر) میرٹھ پنچ (میرٹھ) سرپنچ (میلاپور) کشمیر پنچ (بدایوں) ہریانہ پنچ (جھجر) تانک پنچ (رائے بریلی) دکن پنچ (حیدرآباد) [illegible] پنچ (الہ آباد) فتح گڑھ پنچ (فتح گڑھ) برار پنچ (کولہاپور) گجرات پنچ (گجرات) فیروز پور پنچ (فیروز پور) سرپنچ (میرٹھ) دکن پنچ (جالندھر) آگرہ پنچ (آگرہ) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اودھ پنچ نے جہاں مزاحیہ صحافت کو فروغ دیا وہاں پھکڑپن اور ابتذال سے نہ صرف دامن نہیں بچا سکا بلکہ اس کی وجہ سے اسے فروغ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تحریر کیا ہے:

"جس زمانہ میں اودھ اخبار روزنامہ کی حیثیت سے نکل رہا تھا ہندوستانی صحافت میں پنچ اخبارات کا بڑا چرچا تھا۔ یہ اخبار مزاحیہ اخبار تھے لیکن جب پھکڑپن پر آجاتے تو حدود سے تجاوز ہو جاتے اور خوب گندگی اچھالتے ان میں سب سے نمایاں اودھ پنچ تھا۔"

آگے ایک جگہ اپنی اس بات کو انھوں نے اس طرح بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

"اودھ پنچ سے اردو صحافت کو نقصان بھی پہنچا ہے اس نے مزاح میں ابتذال اور پھکڑپن کو فروغ دیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہی رنگ اختیار کر لیا اور پھر اس کی تقلید میں جو پنچ اخبار ہندوستان کے طول و عرض میں نکلے انھوں نے پھکڑپن ابتذال اور فحش نگاری میں انتہا کر دی۔ یہ رنگ صحافت میں تیس پینتیس سال تک مسلط رہا۔"

رام بابو سکسینہ بھی اودھ پنچ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن نرم لہجہ کے ساتھ:

"اودھ پنچ یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے علاوہ جو فسانۂ آزاد، حالی، داغ، گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر

پھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اس کے صفحات میں درج ہوتے رہے ہیں۔ ؎۲۱

ان اقتباسات کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اودھ پنچ نے کبھی کبھی حالات اور ماحول سے متاثر ہو کر اردو کے طنز و مزاح کے معیار اور مزاج کو نقصان پہنچایا ہے لیکن اس کا اعتراف تقریباً تمام اہلِ نظر نے کیا ہے کہ اس کے وجود سے طنز و مزاح کے خزانے میں نمایاں اضافہ بھی ہوا ہے خاص طور سے اردو طنزیہ اور مزاحیہ شاعری نے اودھ پنچ کے زیر سایہ نئی کروٹ لی تھی اور بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اودھ پنچ نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعروں کا اپنے گرد جمگھٹا تیار کر لیا تھا۔ ان شعراء نے ان پینتیس سال میں اپنے خوب خوب جوہر دکھلائے ان میں منشی سجاد حسین کے علاوہ احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، بابو جوالا پرشاد برق، الانسان ضاحک اور اکبر الہ آبادی اہم ہیں۔

منشی سجاد حسین کے یہاں طنز و مزاح میں اصلاحی مقاصد کی اہمیت زیادہ رہی ہے لیکن ان مقاصد کے حصول میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ عبدالغفور شہباز نے قوم اور مذہب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا لیکن نرم لہجہ کے ساتھ سطحیت کو قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف نے کئی سال تک اودھ پنچ میں بول چال کی زبان میں مضامین لکھے۔ تربھون ناتھ ہجر تحریف نگاری میں نمایاں ہوئے الانسان ضاحک اودھ پنچ کے نامہ نگار رہے۔ اخبار کے ماحول نے انھیں بھی اسی رنگ کا شاعر بنا دیا تھا۔ احمد علی شوق نے معاشرہ کی خرابی اور بری عادتوں کے خلاف آواز بلند کی اور طنز کے وار کیے اور اکبر الہ آبادی نے جو مغربیت سے اس قدر متنفر تھے کہ اس کی ہر اچھی بری چیز کی مخالفت میں تسکین محسوس کرتے تھے۔ اپنی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ یہاں چند شعراء کے کلام کے نمونے درج کیے جاتے ہیں تاکہ اس دور کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے مزاج و معیار کا اندازہ ہو سکے۔

تن ہو گیا ہے سوکھ کے کانٹا ہول کا | اپنے توحق میں عشق اجیل ہو گیا

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں رسن

دو ایک ہاتھ چاہ میں جب ڈول رہ گیا

سجاد حسین

تہذیب قیس

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے | لکھوایا نام نجد کے انگلش اسکول میں

اے بی کے بعد پڑھنے گیا ایسی ریڈریں

تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں

شہباز

وہی محبوبہ ہماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے | وہی نہنگا وہی ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی کھانا نہ پینا دس بجے جانا کچہری کا | نصیبوں کی وہی خواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ستم ظریف

وہ کہہ رہے ہیں ہند میں تکلیف کچھ نہیں

ہم کہہ رہے ہیں ہند میں آرام جھوٹ ہے

الانسان ضاحک

لیکن اس اودھ پنچی جمگھٹے میں سب سے بڑا اور نمایاں نام اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا ہے جنھوں نے نہ صرف اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت میں اضافہ کیا بلکہ اردو طنزیہ مزاحیہ شاعری کا وقار بہت بلند کیا۔ ان کا اپنا ایک رنگ مزاج اور انداز فکر تھا جو قابل تقلید نہ تھا۔ بعض شعراء نے ان کے رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے انھیں میں علامہ اقبال بھی تھے۔

اکبر الہ آبادی مشرقی مزاج رکھتے تھے لیکن تنگ نظری پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اودھ پنچ کے ذریعہ سرسید تحریک کی مخالفت محض مغربیت سے نفرت کی وجہ سے اس انداز سے کی کہ وہ سرسید کے مخالفوں میں شمار کیے جانے لگے۔

اکبر الہ آبادی کے طنزیہ مزاحیہ کلام میں ایک خاص قسم کی سنجیدہ شوخی اور طنز کی تیزی پائی جاتی ہے لیکن انھوں نے کہیں شدت اختیار نہیں کی بلکہ ہمیشہ درمیانہ روی ہی کو پسند کرتے رہے اور سادگی

زندگی نہایت احتیاط سے کام لے کر اس میدان میں آگے اور بہت آگے بڑھتے رہے اور تندی و تلخی سے پرہیز کرتے رہے جس کی وجہ سے ہر معیار اور مزاج اور نقطۂ نظر کے لوگوں میں پسند کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔

در اصل اکبر کا مقصد مذاق اڑانا کبھی نہیں رہا۔ وہ اصلاح چاہتے تھے اور قوم کو مغربیت کے اثرات سے محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی کو انھوں نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسرے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور قوم کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر کے یہ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مے خانۂ ریفارم کی چکنی زمین پر   واعظ کا خاندان بھی آکر پھسل گیا
کیسی نماز، بال میں ناچو جناب شیخ   تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

کہاں کی پوجا، نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زم زم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب

اکبر الٰہ آبادی اردو طنز و مزاح کے میدان میں تنہا شاعر ہیں۔ جن کا کلام ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ آج بھی ان کے یہ اشعار صحافیوں کی تحریروں میں، رہنماؤں کی تقریروں میں، تقاریب اور سنجیدہ محفلوں میں گونجتے اور محظوظ کرتے محسوس ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اردو کے پژمردہ خیموں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں   اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

یہ اور اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں جو مختلف اوقات میں فضا میں گونجتے رہے ہیں اور اودھ پنچ کی یاد تازہ کرتے رہے ہیں یہ اودھ پنچ ہی ہے جس نے اودھ کو طنز و مزاح کی دنیا میں نمایاں مقام دلا کر اپنی پہچان بنائی ہے۔

□□

حواشی:

۱؎ طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص۹۰

۲؎ مضامین چکبست ص۲۲۸   ۳؎ مضامین چکبست ص۲۲۹

۴؎ طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص۸۸

۵؎ دیکھیے صحافت پاک و ہند میں ص۲۴۸ از ڈاکٹر عبدالاسلام خورشید

۶؎ صحافت پاکستان و ہند میں : ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص۱۹۹

۷؎ " " " ص۲۴۷

۸؎ تاریخ ادب اُردو : رام بابو سکسینہ ص۱۰۲ - ۱۰۳

"پھبتی کا تعلق شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے ھے لیکن اس میں خصُوصیت یہ ھے کہ یہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے، اس کے عیب نمایاں کرنے اور برجستہ کوئی انوکھی، ھنسانے والی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ھے۔ مثلاً: ایک بُوڑھے دُولھا خِضاب کر کے دُلھن بیاھنے کو آئے اور بڑی دُھوم کی برات لائے۔ زنانے سے نکل کے وہ محفل میں آرھے تھے۔ جوتا اُتارنے کے لئے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا: دُولھا کہاں ھیں —؟ شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مُجرا کر رھی تھی، ھنس کے بولی: اے وہ مَنیوں مَنیوں چلا تو آتا ھے۔"

گزشتہ لکھنؤ : عبدالحلیم شرر

اسلم محمود

اودھ اور اطراف کی
چند انوکھی اُردو مطبوعات

> اسلم محمود صاحب ادبی تحقیق میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے جتنی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ سب ان کے پاس موجود ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ کتابیں خاص اہمیت کی حامل نہیں ہیں لیکن زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی بے شمار گوشے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض گوشوں سے متعلق کتابیں ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ خصوصاً نثر میں صناعی پر یہ کتابیں بہت اہم ہیں اور ان کو اسلم محمود صاحب کے پاس دیکھا بھی جا سکتا ہے۔
>
> ایڈیٹر

اُردو کی پُرانی مطبوعات کی ابھی تک کوئی اہم وضاحتی فہرست نہیں چھپی ہے۔ اشاعت گھروں کی فہرستیں بیشتر بے ترتیب چھاپی گئی ہیں کتاب یا مصنف کے نام سے اکثر موضوع کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ ادب میں جن کتابوں کو جگہ پانا چاہیے ان کا ذکر بالکل غائب رہتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ شعری ادب، تذکرۂ ادبا، اور علمی نثر کے علاوہ اور کسی موضوع پر کتابوں کو ادب کی تاریخ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

بہت سی علمی و ادبی کتابیں ایسی ہیں جو اُردو ادب کی کڑی ہیں لیکن سرسری طور سے ان کے بارے میں لکھ کر بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے کتاب کو دیکھا ہی نہیں اور صرف ناواقف قاری کو مرعوب کرنے یا ببلیوگرافی کو بھاری بنانے کے لیے اس کا نام لیا جاتا ہے اس طرح مصنف اندھیرے میں تیر چلاتا ہے اور متن کے بارے میں اپنی بے بنیاد رائے دے دیتا ہے جو بعد میں دوسرے مصنفین اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب "نوابی دربار" تھی جس کو نثر کی کتاب سمجھ کر کئی لوگوں نے حوالہ دیا۔ جب یہ کتاب چند سال پیشتر دوبارہ چھپی تو معلوم ہوا کہ نثری قصہ نہیں ڈراما ہے۔

نول کشور پریس لکھنؤ، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے کتابوں کی طویل فہرستیں چھاپی تھیں جن میں کتابوں کو موضوع وار تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کی فہرست میں ادیبوں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ یہ اُردو میں غالباً اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی اور اس کے بعد شاید اُردو میں کوئی ایسی فہرست نہیں چھپی، جس میں تصویریں اتنی تعداد میں دی ہوں۔ اب یہ فہرستیں بھی بالکل نایاب ہیں۔

انگریزی اور دوسرے مغربی اشاعت خانوں کا عام رواج ہے کہ آنے والی کتابوں کی وضاحتی فہرست سال میں دو بار یعنی بہار (مارچ، اپریل) اور خزاں (ستمبر، اکتوبر) میں شائع کرتے ہیں۔ زیادہ تر کتابوں کا سرورق یا مصنفوں کی تصویریں موضوع وار درج رہتی ہیں۔ کوشش یہ بھی رہتی ہے کہ متن کی خصوصیت اور مختصر سا کسی تبصرے سے اقتباس نمائندہ چھپنے والی کتابوں پر شامل ہو۔ یہ فہرستیں عمدہ کاغذ دیدہ زیب طریقے سے اور بہت سلیقے سے شائع ہوتی ہیں۔

اُردو میں اچھی فہرستوں کی کوتاہی نجی طور پر کتابوں کو چھاپنے کی روش اور قاری کی عدم دلچسپی سے بہت سی [illegible]

گمنامی میں پڑی ہیں اور اچھا حصّہ تو ان کا نا پید ہو گیا ہے۔ کیاب و نایاب کتابوں کے کتب فروش بھی عنقا ہوتے جا رہے ہیں جس بے احتیاطی سے اُردو والوں کے گھروں میں کتابیں رہتی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت کی بات ہے کہ اب بھی کبھی کبھی بازار میں انیسویں صدی کی چھپی ہوئی کچھ کتابیں نظر آجاتی ہیں کیوں کہ انفرادی طور پر اُردو کتابیں جمع کرنے والے بہت کم ہیں اس لیے زیادہ خرید لائبریریوں میں ہی ہوتی ہے۔ لائبریریوں کے لیے خریدنے والے عام طور سے یا تو واقفیت زیادہ نہیں رکھتے اور یا پھر دل چسپی نہیں لیتے۔ شعری مجموعوں، ناول، افسانے اور عام ادبی و علمی کتابوں کے علاوہ ایسے اہم موضوعات جیسے صنعت و حرفت، لطائف، خطاطی و موسیقی وغیرہ پر کتابیں مشکل ہی سے خریدی جاتی ہیں۔ خدا بھلا کرے ان ناواقف کاروں کا کہ ہم جیسوں کو بھی اس دریا میں ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے اور چند ڈگر سے ہٹی کتابیں ہم کو بھی مل جاتی ہیں۔

ان ہی میں سے پندرہ بھولی بسری کتابوں کا مختصر جائزہ آگے لیا جائے گا۔ یہ کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں لیکن بہر حال گمنامی میں پڑی ہیں۔ زیادہ تر ان میں نایاب ہیں اور ان کا کسی بھی قیمت پر ملنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس انتخاب میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جن کو ان کی خصوصیت کی بنا پر اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

(۱) آتش خانہ یا خُمارِ کیفیات

مصنف: خام۔ مطبع کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں
۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء صفحات ۹۰، رنگین تصاویر

"آتش خانہ" ایک سو پچاس اشعار کی نظم ہے جو عورتوں کے پستان کی تعریف میں ۱۹۳۸ء میں کہی گئی تھی۔

اسی انداز کی ایک غزل شیخ امداد علی بحر لکھنوی کے دیوان میں بھی ملتی ہے مگر خام کی یہ نظم اسی طور پر ڈیڑھ سو اشعار پورے کرتی ہے۔

اس نظم کی تقریظ جگر مرادآبادی نے لکھی ہے جو فرماتے ہیں کہ "مُصنف کے تعارف سے زیادہ نظم کو ضروری سمجھتے ہیں۔" یہ نظم کتابی شکل میں جیبی سائز پر چھپی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ قمیص کی جیب میں بآسانی سما جائے۔ کتاب میں سات رنگین تصویریں عورتوں کی ہیں، لیکن معمولی آرٹ کا نمونہ ہیں۔ کتاب غالباً بازار میں نہیں آئی اور مصنف نے صرف اپنے حلقۂ احباب میں تقسیم کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اس عجیب نظم کا خالق کون تھا؟ فرضی نام "خام" کتاب پر پڑا ہے۔ اس نام کے حروفِ تہجی 'خ'، 'الف' اور 'م' ہیں یعنی الٹا پڑھنے سے 'م'، 'الف' اور 'خ' ہوتے ہیں، اسی سے نظم کے شاعر کا نام نکلتا ہے یعنی محمد اصطفےٰ خاں جو عطریات کے مشہور کارخانے اصغر علی محمد علی کے مالک تھے۔ شاعری میں محمد اصطفےٰ خاں اصطفےٰ لکھنوی سید عبدالحکیم سیف شاہجہاں پوری کے شاگرد تھے۔ اصطفےٰ لکھنوی کا ایک مجموعۂ کلام "آئینہ" کے نام سے بھی چھپا ہے۔

"آتش خانہ" ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں شاید اب بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے یہاں تک کہ اصطفےٰ خاں کے پوتے جو حیات ہیں ان کے پاس بھی نہیں ہے اور نہ ہی انھیں اس کا علم تھا۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی اور زبان میں اس نوعیت کی کتاب نہیں چھپی ہے۔

(۲) انتخابِ نقص

مصنف: ابو محمد عبدالغفور خاں نسّاخ مطبع نظامی کان پور
ماہ محرم ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء۔ صفحات ۳۲

یہ رسالہ اعتراضاتِ کلام مرزا سلامت علی دبیر و میر ببر علی انیس پر مبنی ہے۔ جب ان مشہور شاعروں کا کلام طبع ہوا تو اس میں مصنف نے "عجب طرح کا بے ربط پایا، چنانچہ معنی اور اسلوب ترکیب اور مراعاتِ الفاظ ایک طرف، بعض اشعار کے وزن و قافیہ و ردیف میں بھی فتور نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ ماہرینِ فن جو ان کے کلام میں سلامتیِ سقم سے خاموش تھے، بے جا نہ تھا اور گاہ گاہ راقم کو جو شبہات سُننے میں واقع ہوئے تھے، اصل سے خالی نہ تھے۔"

مرزا دبیر کے کلام کو نسّاخ نے پہلے نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مصرعے لیجیے:

وہ تیغیں ذوالفقار کے نعروں میں آگئیں

جوہر کی تنگ چشمی سے آنکھیں چرا گئیں
یکسر شکستِ فاش سرِ دست کھا گئیں
تھیں آپ کم حیا کہ عرق میں نہا گئیں

ناسخ نے یہاں اعتراض یوں کیا ہے :

"کم حیا ہو کر عرق میں نہانا کیا معنی ؟ کیوں کہ عرق لازمۂ خجالت ہے اور خجالت اس کو ہوتی ہے جس کو حیا ہو۔ لہٰذا اگر باحیا لکھتے تو معنی درست ہوتے لیکن یہ بھی استادی کے خلاف تھا"۔

دبیر کے اِن مصرعوں میں بھی دلچسپ نقص نکالا ہے :

آنکھوں کی تری روغنِ بادام سے بہتر
عارض کا پسینہ ہے گلابِ گلِ احمر

ناسخ لکھتے ہیں :

گلابِ گل کسی کو کہتے سُنا نہ لکھتے دیکھا۔ اس کی سند چاہیئے۔ البتہ بعضے عوامِ بے سواد شبِ برات و شبِ قدر کی رات اور آبِ زمزم کا پانی بولتے ہیں ــــ گلابِ گل بھی اسی قسم میں داخل ہے۔"

اعلاطِ مرثیہ میر انیس ۲۳ کے آخر سے شروع ہوتے ہیں۔ انیس کے اِن مصرعوں پر بھی ناسخ کو اعتراض ہے :

یہ سُن کے ضعیفہ کا لگا کانپنے اندام
بولی یہ بھلا آنے کا ہے کون سا ہنگام

ناسخ سمجھاتے ہیں کہ :

" خوف اور ہراس کی جگہ اندام کانپنے لگے بصیغہ جمع بولا جاتا ہے اور جہاں اندام کا بافراد مذکور ہوتا ہے اس سے اور ہی اندام مُراد ہوتا ہے "۔

جب "انتخابِ نقص" چھپی تو لکھنؤ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کسی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ناسخ جیسا بنگال کا رہنے والا لکھنؤ کے شعرا پر انگلیاں اُٹھائے نتیجہ یہ ہوا کہ جوابی کتابیں چھپیں اور ایک ادبی معرکے کی صورت اختیار کر لی۔ لکھنوی جوابوں پر یہ کتابیں سامنے آئیں :

- تطہیر الاوساخ نسخ النّاسخ۔ مرزا محمد رضا تجر (شاگردِ شیخ ناسخ)
مطبع شعلۂ طور کان پور۔ ۲ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۱۵۱
- گستاخی معاف۔ سید مرتضیٰ گستاخ امروہوی
مطبع شعلۂ طور کان پور ۲۵ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۸۰
- تفضیح۔ آغا علی
اودھ پریس لکھنؤ۔ ۱۲۹۹ھ صفحات ۲۳۸
- مسکتِ شائستہ۔ مظفر علی ہنر (یہ کتاب چھپی مگر ضائع ہو گئی صرف اس کی تقریظ باقی رہی جو الگ سے چھپی)
- تقریظ مُسکتِ شائستہ۔ سید محمد تقی فیض لکھنوی
مطبع قادریہ عمر محمد ناخدا کلکتہ ۱۳۰۱ھ۔ صفحات ۲۸
- سنانِ دل خراش۔ سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی۔ یہ کتاب قلمی ہے لیکن معجز نے اپنی کتاب میں اس سے کام لیا ہے۔

ناسخ کے ایک شاگرد عصمت اللہ انتخ نے بھی اپنے استاد کی طرفداری میں ایک کتاب "طومار اغلاط" آگرہ سے ۱۲۹۰ھ میں شائع کی۔

"انتخابِ نقص" اُردو کے ادبی معرکوں کی ایک اہم کڑی ہے لیکن یہ تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اس صدی میں شاید ہی کسی اُردو ادیب نے اس کتاب کی زیارت کی ہو۔ بہت سے ادیبوں نے صرف حوالہ دیا ہے اور وہ بھی اس معرکے کی دوسری کتابوں سے جن میں "انتخابِ نقص" کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اس لئے کہ یہ کتاب قطعی نایاب ہے گو کہ تاریخِ اردو ادب میں اس کتاب کو جگہ دی گئی ہے۔

(۳) بادشاہ نامہ

مصنف : نواب صدر محل صدر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ
ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء صفحات ۲۰۲

یہ نواب صدر محل صدر جو بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کی منکوحہ بیگم تھیں، کا دیوان ہے اس میں کل ۱۱۱ غزلیں ہیں۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ہر شعر میں واجد علی شاہ اختر کی تعریف ہے اور کسی نہ کسی طور سے ان کا نام یا خطاب آتا ہے۔ اپنی طرز کا عجیب دیوان ہے۔

چند اشعار حاضر ہیں ؎

بڑھا رتبہ شہِ واجد علی کا
بجے ڈنکا شہِ واجد علی کا

حسین سبزہ رو غنچہ دہن محفل میں حاضر ہیں
پھلا پھولا ہوا سارا چمن ہے جانِ عالم کا

زندگی بھر یہ عداوت یہ مزا باقی رہا
جان ہاتھ آئی گر پایا الفِ آخر میں خط

دیکھو یہ سامنے کا نشانہ نہ چوکنا
دل پر ہمارے تیر لگاؤ شہِ اودھ

"آتش خانہ" کی طرح یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں ہر شعر میں معشوق اپنے محبوب کا نام لیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں شاید اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

(۴) تحریرِ عاشق

مصنفہ : نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم حجاب۔ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ۔ جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء صفحات ۸۰

یہ حیرت کی بات ہے کہ اگر ہم انیسویں صدی میں چھپے اردو دواوین شاعرات کا جائزہ لیں تو ایک درجن سے زیادہ ہرگز موجود نہیں۔ بدقسمتی سے شاعرات کا کلام سنجیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور یہ غلط فہمی آج تک رائج ہے کہ خواتین اپنا کلام دوسروں سے کہلواتی ہیں۔ کچھ شاعرات پر یہ الزام شاید صحیح ہو مگر یہ تو بہت سے شاعروں پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ شاعرات کے خلاف اس تعصب ہی کی وجہ سے اُردو ادب میں کوئی بہت بڑی شاعرہ نہ ہوئی تھی۔

حجاب کا دیوان "تحریرِ عاشق" شاعراتِ اُردو کے اولین مطبوعہ دواوین میں سے ہے۔ ہر غزل کی ابتدا میں بحر اور وزن درج ہیں۔ حجاب کے والد کا نام داروغہ اعظم علی خاں دیا ہے اور شاعرہ کا لکھنؤ سے تعلق تھا۔

نمونے کے چند اشعار یہ ہیں ؎

جب ہم نے تجھی سے تری الفت کو چھپایا
پھر اور کے آگے ہمیں اظہار سے مطلب

ڈیوڑھی پہ حجاب اس کے ہیں درباں کی طرح ہم
دربار سے ہے کام نہ سرکار سے مطلب

آگے سے بھی ہے زیادہ بے قراری اِن دنوں
شکل پہچانی نہیں جاتی ہماری اِن دنوں

عزت تو کیسی ؟ دیتے ہیں ذلت مجھے حضور
یہ آپ آپ، آپ کی تُو تُو سے کم نہیں

اشکِ غم حدتِ دوزخ کو بُھلا دیتا ہے
گرچہ پانی ہے مگر آگ لگا دیتا ہے

(۵) تعلیم النستعلیق

مصنف : شیخ عابد علی الہ آبادی۔ مطبع آصفی کان پور ۱۸۶۲ء
صفحات ۸

نستعلیق طرزِ خطاطی پر یہ مختصر ترین رسالہ اُردو میں پہلی مطبوعہ کوشش ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ حروف نستعلیق میں بکثرت چھپی وصلیوں سے اگر کوئی اہلِ شوق طرز تحریرِ حروف کی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو خوش خط تو لکھ لے گا مگر استادوں کے قواعد و ضوابط سے بے بہرہ رہے گا۔ شیخ عابد علی خلف شیخ ذاکر علی انصاری الہ آبادی نے یہ رسالہ بابو مادھو پرشاد، تحصیل دار کھاگا، ضلع فتحپور کی فرمائش پر لکھا تھا۔

اس رسالے میں فنِ نستعلیق نویسی کے اصول و ضوابط بتائے گئے ہیں۔ اس میں تاریخ خطِ نستعلیق، اس کے موجد اور ان کے شاگردوں کا بھی تذکرہ ہے۔ اس خط کی دو قسموں یعنی بیضادی اور آفتابی کی تفصیل اور قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ قلم کی ساخت سے لے کر حروف "الف" سے "ے" تک کے خوش خط لکھنے کے طریقے کو بھی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مختصر انداز میں خطوطِ طلسمات و عملیات کو بھی داخل کیا گیا ہے۔

۱۸۶۲ء سے قبل کی کوئی اور چھپی کتاب اس فن پر اردو میں نہیں ملتی۔ اس کتابچے کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اسلامی خطاطی کی تاریخ میں کوئی حوالہ۔ کتب خانوں میں بھی یہ بالکل غائب ہے۔

(۶) خزینۃ الامثال

مصنف : سید حسین شاہ حقیقت مطبع مصطفائی کان پور
محرم ۱۲۷۰ھ صفحات ۲۲۴

یہ عربی فارسی و اُردو ضرب الامثال کا مجموعہ ہے جس کو سید حسین شاہ

حقیقت کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سید محسن علی (صاحب تذکرہ سراپا سخن) نے چھپوایا۔ حقیقت کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۳۴-۱۸۳۳ عیسوی میں ہوئی، اور یہ کتاب محرم ۱۲۷۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اُردو ضرب الامثال پر ایک ہندستانی کی مرتب کی ہوئی تیسری مطبوعہ کتاب تھی۔ اس صنف کی پہلی مطبوعہ کتاب "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" تھی جس کو مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان تپش دہلوی نے مرتب کیا اور مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹-۱۸۴۸ء میں پہلی بار چھپی۔ تپش دہلوی کی وفات شعبان ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے کچھ عرصے بعد ہوئی۔ اس سلسلے کی دوسری مطبوعہ کتاب حقیقت ہی کی "صنم کدہ چین" تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اسی کتاب میں فارسی کی مشہور مثل یوں درج ہے:

کبوتر با کبوتر قاز با قاز   کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کیوں کہ قاز غول میں اُڑتے ہیں اور باز غول میں نہیں اُڑتے اس لیے مثل کی یہ شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اُردو مثلوں کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

- دشمنوں میں یوں رہیئے جیسے بتیس دانتوں میں زبان
- رات تھوڑی سانگ بہت۔ خلق کا حلق کس نے بند کیا ہے۔
- سسکتے گئے بلکتے آئے۔ بالے پن کی عاشقی گلے پڑے زنجیر۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال پُرانا یہ ضرب الامثال کا ذخیرہ نہایت اہم ہے دوسری بار یہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ پھر یہ بالکل نایاب ہوگیا۔ خوش قسمتی سے تیسری بار ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہوا۔ بعد کے مرتب مثلوں کے مجموعوں پر حقیقت کے انتخاب کو فوقیت حاصل ہے۔

(۷) درخت خرد

مصنف: قمر علی۔ مطبع فیضی بریلی

سنہ اشاعت درج نہیں   صفحات ۴۸

یہ کتاب صنعت مقلوب میں اُردو میں پہلی اور ابھی تک آخری کتاب ہے۔ صنعت مقلوب کو انگریزی میں PALINDROME کہتے ہیں یعنی وہ لفظ یا جملہ جو اُلٹا پڑھنے سے بھی وہی رہتا ہے جو سیدھا پڑھنے میں جیسا کہ اس کتاب کے نام "درخت خرد" سے ظاہر ہے۔ مصنف قمر علی مرحوم بریلی میں ایڈوکیٹ تھے۔

اس کتاب میں ایک فرضی بزرگ کا قصہ ہے جن کا نام تلق ہے یہ صاحب بات چیت میں صرف صنعت مقلوب[1] میں جملے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ دل چسپ نمونے یہ ہیں:

— نام رب کا اکبر مان   — تیری غیرت

— اے وہ تو فوت ہوئے آہ۔ — لے اہل حرم مرحلہ آیا

— یہ بلاغت غالب ہے   — یہ یک بات کتاب کی ہے

— لے بابا ابابیل   — رکن بن کر

— اے اہلِ فاقہ قافلہ آیا — شاباش

— یہ نان ہے یہ کیک ہے — یہ شکل دل کش ہے

— یہ ولایتی اُلو ہے   — لاہورا رومال

کتاب پر چھپا ہے کہ ایک ہزار کاپیاں اس کتاب کی چھپیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لگ بھگ پچاس برس قبل شائع ہوئی تھی لیکن اب کہیں بھی دستیاب نہیں۔

(۸) دستور الملاقات

مصنف: جواہر سنگھ جوہر لکھنوی۔ مطبع خاص علوی محمد علی بخش خاں (مقام اشاعت درج نہیں) سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۳۴۴

"دستور الملاقات" تقریباً سو فرضی ملاقاتوں پر مشتمل ہے ہر گفتگو دو شخصوں کے درمیان ہے۔ سماج کے مختلف افراد ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جیسے ہندو مسلمان سے، شیعہ سُنی سے، استاد شاگرد سے، عالم جاہل سے، سخی جوزس سے، ملحد خدا پرست سے، باپ بیٹے سے، مرشد پیر سے، حکیم مریض سے، مومن مجتہد العصر سے، کاشتکار تحصیل دار سے اور ایک نواب وثیقہ دار مہاجن سے قرض لینے کے لیے۔ غرض یہ کتاب ایسی ہی ملاقاتوں سے بھری پڑی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو مکالمے اور طریقۂ گفتگو اختیار کیا گیا ہے وہ

---

[1] شاعری میں یہ صنعت مرزا دبیر اور میر انیس کے یہاں خصوصیت سے

ان ہی افراد کے حسب مراتب ہے۔ ان ملاقاتوں سے اس زمانے کے آداب و تہذیب ملاقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب کے مکالموں میں اردو زبان کے قواعد کے دریا بہا کر زبان پر دسترس کا ثبوت دیا گیا ہے اور زبان کے رموز و نکات کی تعلیم دی گئی ہے۔ "دستور الملاقات" معلومات ادب وغیرہ کا ایک انمول خزانہ ہے جو ملاقاتوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ جواہر سنگھ جوہر یقیناً ایک غیر معمولی آدمی تھے۔

جواہر سنگھ جوہر لکھنؤ ہی ناطق مکرانی کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب حسب ارشاد مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ والی بلرام پور و تلسی پور وغیرہ تحریر کی گئی تھی۔ اس میں ایڈورڈ ہفتم کا اس وقت کا ذکر ہے جب وہ پرنس آف ویلز تھے اور عہد وکٹوریہ میں ہندوستان آئے تھے۔ ایک مجلس کا بھی ذکر ہے جس میں آغا حسن امانت لکھنؤی نے مرثیہ پڑھا تھا۔ گو کہ کتاب پر سنہ طباعت درج نہیں ہے لیکن اس کی اشاعت ۱۸۷۵ء کے آس پاس کی لگتی ہے۔

ملاقات کے آداب پر خاص طور سے نسوانی تعلیم کے سلسلے میں اردو میں کئی کتب ہیں لیکن گفتگو کے نمونوں پر اپنے انداز کی پہلی ضخیم کتاب "دستور الملاقات" ہے جو پڑھنے میں دلچسپ اور مفید ہے۔

(۹) دیوانِ چرکین

مصنف : شیخ باقر علی چرکین

مطبع کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں۔

۱۲۷۳ھ صفحات ۴۴

یہ چرکین کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے۔ دیوان حوض دار حاشیے میں چھپا ہے۔ سرورق اور ترقیمہ میں مطبع کا نام درج نہیں کیا گیا ہے البتہ کاتب کا نام جیت رام ہے جس کا قطعۂ تاریخ طباعت دیوان کتاب کے آخری صفحے پر شامل ہے۔ ایک قطعۂ تاریخ میر یار علی جان صاحب نے بھی کہا ہے جس کے ذیل کے مصرعۂ تاریخ سے سال ۱۲۷۳ھ نکلتا ہے:

سنا بی جان باجی کل چھپا چرکین کا نسخہ

یہ دیوان ۱۲۷۳ھ مطابق ۵۷-۱۸۵۶ء کا چھپا ہوا ہے اور قیاس ہے کہ غدر سے کچھ قبل چھپا ہوگا۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ:

"عرصہ پچیس برس کا ہوا کہ مصنف لکھنؤ سے زیارت کربلائے معلیٰ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور دوران سفر جہاز اختلاف آب و ہوا سے بیمار ہونے، کسی جزیرے پر جہاز رکا گیا اور وہاں کے ایک انگوری باغ میں چرکین کی موت ہوئی۔ صاحب باغ نے رحم کھا کر دفن فرمایا"۔

چرکین غالباً دنیا کا واحد شاعر ہے جس نے بول و براز کے متعلق شاعری کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور اس میدان میں جولانئ طبع دکھائی۔ اس رنگ میں اٹھارھویں صدی کے انگریزی ادیب جون ایتھن سوئفٹ (JONATHAN SWIFT) نے بھی تھوڑی بہت شاعری کی تھی۔ لیکن چرکین کے صاحب کمال ہونے میں شک نہیں۔ کلام کے نمونے آزادی کے ساتھ نہیں دیئے جا سکتے۔

اس دیوان چرکین کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیشتر کلام ایسا ہے جو بعد کے عام بازاری ایڈیشنوں میں نہیں ہے یا حذف کر دیا گیا ہے ہاں کچھ قلمی نسخوں میں اس دیوان سے زیادہ بھی کلام ملتا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ چرکین ایسے عجیب و غریب شاعر کو مکمل طور سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اردو میں شاید سنجیدگی سے کوئی مضمون بھی اس پر نہیں چھپا۔

(۱۰) رسالہ آئینِ بدر سازی

مصنف، محمد علی بدر ساز مطبع مشرق الانوار لکھنؤ

سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۸ اور ۳۱ تصاویر

بدری ظروف دکن میں، بیدر اور اس کے اطراف میں بنائے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۸ء) کے عہد میں بھی اس کام کی ترقی ہوئی مگر کاریگر باہر سے آئے تھے۔ بدری ظروف سیہ فام ہوتے ہیں اور ان پر چاندی کا کام پیوست ہوتا ہے۔ بنیادی دھات جستہ، سیسہ و تانبہ وغیرہ ملا کر بنتی ہے اور برتنوں کو مٹی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے، ڈھلے برتن پر تین قسم کے آہنی قلموں سے کھود کر چاندی کی پتی یا تار کو بٹھاتے ہیں تاکہ پھول یا ڈیزائن وغیرہ بن جائیں۔ کئی چیزوں سے برتن کو رگڑا جاتا ہے جس سے جستہ کالا ہوتا ہے اور چاندی صاف



ہوتی ہے۔ نوسادر، پُرانی دیوار کی لونی مٹی اور قلمی شورے کو پانی میں اُبال کر پچارے سے برتن پر خوب پھیرتے ہیں اور بعد میں صاف پانی سے دھو ڈالتے ہیں۔

یہ رسالہ بڑے سائز پر چھپا ہے اور طباعت انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے۔ بدری ظروف بنانے پر شروع میں دو صفحات ہیں پھر اکانوے ظروف وزر بلند جیسے: صُراحی، تھالی، کاغذ تراش، آب خورا، حقہ، پیچوان، گڑگڑی، اگالدان، خاصدان، گملا، مُنہال، رکابی اور پیالی وغیرہ کی فہرست۔ انکے میں ناپ، کیفیت اور قیمت درج ہیں۔ کتاب میں بڑے پیمانے پر پورے صفحے اور بعض دوہرے صفحات (جو موڑ دیئے گئے ہیں) پر ۲۵ خوبصورت برتنوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ بھی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محمد علی بدرساز کو ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیان لکھنؤ، کلکتہ اور جے پور کی صنعتی نمائشوں میں تمغے بھی ملے تھے جو ان کے کامل استاد ہونے کا ثبوت ہے۔

اُردو میں یہ کتاب صنعتی آرٹ پر گنی چُنی کتابوں میں سے ہے اور خصوصاً بدرسازی کے بارے میں شاید واحد کتاب ہے۔ اب یہ کتاب گمشدہ اور ناپید ہے۔

(۱۱) رسالہ بٹیر بازی

مصنف: مرزا محمد وزیر بیگ رعایت لکھنوی

مطبع اعجاز محمدی لکھنؤ۔ ۱۸۸۸ء صفحات ۱۲

اس رسالے میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ فن بٹیر بازی عقلمندوں کے نزدیک بہت خراب ہے اور سوائے دل لگی اور واہ واہ کے کوئی نتیجہ اس سے نہیں نکلتا ہے۔ بہرحال اودھ کے مشاغل میں بٹیر بازی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور یہ کتابچہ اس شغلے سے متعلق معلومات کا ذریعہ ہے۔

اس رسالے کے مطابق بٹیر قدآور، بڑی چونچ، چوڑا سینہ اور باریک پر والا اچھا مانا گیا ہے۔ بٹیروں کو پہچاننے کے طریقے دیئے ہیں۔ بٹیر کی بیماریوں کے علاج کے نسخے بھی فراہم کیے ہیں۔ بیماریوں میں بلغم، لاغری، کھانسی اور ہچکی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بہت کم لوگ اب فن بٹیر بازی سے واقف ہیں اور یہ نایاب رسالہ ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

(۱۲) سُدامار (مثنوی)

مصنف: لچھمن پرشاد صدر لکھنوی مطبع بہار اودھ لکھنؤ

۱۹۲۹ء صفحات ۱۶

یہ مختصر مثنوی غیر منقوط لکھی گئی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ حرف "ی" یا "ے" بھی کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں "مرقع علم" کے نام سے سید وقار الحسین حلم بنگلوری کا غیر منقوط دیوان چھپا ہے مگر شاعر صاحب "ی" اور "ے" کے استعمال سے بچ نہ سکے۔

مثنوی کرشن جی کے بچپن کے مفلس دوست سُداما پر ہے جو اپنی بیوی کے کہنے پر اپنے ہم مکتب کرشن جی کے پاس اپنی حالت پیش کرنے کے تحفے میں کچھ چاول لے کر جاتے ہیں۔ کرشن جی کہتے ہیں کہ اپنی زوجہ کی دی ہوئی سوغات جو تمھارے پاس موجود ہے ہم کو دو۔ ایک بار چاول کھا کر کرشن جی نے ایک عالم کی دولت بخش دی اور دوبارہ کھانے پر دوسرے عالم کی دولت عطا کی۔ تیسری بار چاول کھانے جا رہے تھے کہ کرشن جی کی بیوی رکمنی جی نے ان کی کلائی تھام لی۔ سداما کرشن جی سے کچھ نہیں مانگتے اور اپنے گھر واپس لوٹتے ہیں جہاں ان کا جھونپڑا غائب ہے اور اس کی جگہ ایک بلند محل ان کے لیے تیار کھڑا ہے۔

صدر لکھنوی وہی ہیں جن کی اُردو میں منظوم گیتا مشہور ہے۔ مثنوی "سُداما" کی زبان ثقیل اور غیر مانوس ہے۔ یہ کوشش ایک ادبی ریاضت ہے کیوں کہ اُردو حروف تہجی کے تقریباً بیس منقوط حروف کو ترک کرنا پڑا ہے۔ اگرچہ بعض مرثیے اور غزلیں اس صنف میں کہی گئی ہیں لیکن کسی ایک صنف سخن میں یہ غالباً واحد مسلسل اور مستقل کتاب ہے۔

(۱۳) صنمکدۂ چین

مصنف: سید حسین شاہ حقیقت۔ مطبع مصطفائی، کانپور

رجب ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء صفحات ۴۳

حقیقت کی یہ کتاب ان کی دوسری تصنیف "خزینۃ الامثال" کی

سے الگ جگہ چھاپ دی گئی تھی۔ اس میں اردو بھاشا، فارسی اور عربی ضرب الامثال کے علاوہ کہت، دوہے، پہیلیاں اور اشعار بھی ہیں اشعار خود حقیقت، مرزا جعفر علی حسرت، شیخ قلندر بخش جرأت، سید حسن شاہ ضبط (مصنف کے بڑے بھائی) اور مرزا قتیل وغیرہ کے ہیں۔

کچھ کہاوتیں بہت دل چسپ ہیں:—

——— چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ

——— جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی

——— وہ دن گئے کہ خلیل خاں فاختہ مارتے

دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مواد بھی بہت پہلے تیار ہو گیا تھا۔ تپش دہلوی کی اس صنف کی کتاب کے بعد یہ اردو میں ایک ہندستانی کی لکھی ہوئی دوسری مطبوعہ کتاب ہے۔ اس کے دوبارہ چھپنے کی جہاں تک مجھے علم ہے نوبت نہیں آئی۔ اردو امثال اور پہیلیوں کی ڈیڑھ سو سال پرانی صورت اس کتاب میں محفوظ ہے۔ کتاب کو اچھے طریقے سے ایڈٹ کر کے چھاپنے کی ضرورت ہے۔

(۱۴) کشف اللماس فی صبغ اللباس

مصنف: خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی مطبع نامی لکھنؤ

باردوم ۱۸۸۸ء صفحات ۱۶

یہ کتابچہ رنگریزی کے فن پر ہے جس میں رنگوں کی قسمیں ان کے بنانے کی ترکیبیں اور ان کے شرعی استعمال کو بیان کیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ زیادہ تر رنگ قدرتی یعنی غیر کیمیاوی اجزا سے بنائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں کپڑا رنگنے کے تقریباً چالیس رنگوں کو تیار کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ رنگوں کو بنانے میں جو چیزیں ملائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

——— گل انار کا رنگ، شہاب (جو زعفران سے نکالا جاتا ہے) اور ہلدی کو ملا کر پانی میں جوش دیتے ہیں۔

——— نارنجی رنگ: ہارسنگھار کے پھولوں کو پانی میں ابالتے ہیں

——— زرد رنگ: ہلدی کو آم کی چھال وغیرہ کے ساتھ ملاتے ہیں۔

——— سیاہ رنگ: تخم پنوار سوکھا بھون کر تیل میں ملا کر تیار کرتے ہیں

——— طوسی (بھورا) رنگ: ببول کی چھال اور مازو کا پھل ملا کر بناتے ہیں۔

——— کاہی (گھاس والا سبز) رنگ: نیل، ہلدی اور انار کا پوست مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں

بعض رنگوں کے نام بھی عام واقفیت کے نہیں ہیں جیسے شربتی (ہلکا پیلا)، کرنجوہ (ہلکا بھورا)، کاکریزی (تیز بیگنی) اور کوکئی (سلیٹی) ان کے علاوہ صابری، جیلانی، عاقل خانی اور عباسی رنگوں کا بھی ذکر ہے۔

رنگ سازی اور رنگ ریزی اودھ کے خاص فن تھے اور اس غیر معروف اور نایاب کتاب سے اس صنعت کے رموز کھلتے ہیں۔

(۱۵) معیار الاملا

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی۔ پہلی بار: مطبع نظامی کانپور

۱۲۸۴ھ / ۶۸-۱۸۶۷ء صفحات ۱۶

(۱۶) رسالہ معیار الاملا (بعد تصحیح و نظر ثانی)

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی دوسری بار: مطبع نول کشور لکھنؤ

۱۸۷۶ء صفحات: ۵۴

کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے: "چوں کہ علم رسم الخط و املا کا سیکھنا ہر طالب علم کو اکثر علوم کی تحصیل پر مقدم ہے مگر اس زمانے میں اکثر شخص اس کے قواعد و ضوابط سے بعض ناواقف ہیں لہذا راقم آثم نے اس کے قوانین ضروری کو کتب معتبرہ مثل رسالہ مولوی انور علی صاحب و دیگر کتب لغات مثل غیاث اللغات و برہان قاطع وغیرہ سے جس قدر طلبار فارسی و اردو کو مفید ہو انتخاب اور ترجمہ کر کر معیار الاملا نام کیا۔"

املا کے اصول سمجھانے کے بعد الفاظ کی طویل فہرست دی ہے چند نمونے دیکھیے:

لفظ غلط العام	صحیح
آتو	آتون
بغیچہ	باغیچہ
تابعدار	تابع

حاطہ | احاطہ
کُپّہ | کلیچہ (چھوٹی روٹی)

لفظ	اعراب غلط	اعراب صحیح
آتش	فتح ثانی	کسر ثانی
برادر	بکسر اوّل	بفتح اوّل
رکاب	بفتح	بکسر
سوال	فتح اوّل	ضم اوّل
عربی	بسکون ثانی	بفتح ثانی
عصمت	فتح اوّل	کسر اوّل
عیادت	"	
عنقا	ضم اوّل	فتح اوّل
تلف	بفتح	بکسر اوّل و سکون ثانی
مشاط	ضم اوّل	فتح اوّل و ثانی مشدد

تحر بدایونی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خطاط بھی تھے۔ انھوں نے اسلامی خطاطی، ہزار رنگ چمن (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۲ھ) اور نظم پروین (نیج کمار پریس لکھنؤ۔ ستائیسویں بار ۱۹۶۳ء) کتابیں لکھیں۔ "لطائف ہندی" ان ہی کی کتاب ہے۔

اُردو املا پر تحر بدایونی کی کتاب اُردو میں اس سلسلے کی اولین تنظیم میں سے ہے جس کے دو ایڈیشن اوپر نوٹ کیے گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج املا و تلفظ کی جو غلطیاں عام ہیں ان میں سے متعدد پرانے زمانے میں بھی عام تھیں۔ اس اہم کتاب کو لوگ بھول چکے ہیں اور شاید ہی کہیں اس کا ذکر ملتا ہو۔ □□

"نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک گھوڑے کے مقابلے میں شیروں کو بڑی زک اُٹھانا پڑی۔ یہ عجیب و غریب گھوڑا تھا جو مردم آزاری میں درندوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی اس کے پاس جائے، دانہ دُور سے اس کی طرف بڑھا دیا جاتا تھا، جب چھوٹ جاتا تو بہت سے آدمیوں کو ہلاک کر ڈالتا، ہڈیاں پسلیاں چبا ڈالتا اور لاش ایسی بگاڑ دیتا کہ پہچانی نہ جاتی۔ مجبوراً تجویز ہوئی کہ اس پر شیر چھوڑ دیے جائیں چنانچہ بھوریا شیر جو بادشاہ کو عزیز تھا اور اکثر بازیاں لے چکا تھا، اس پر چھوڑ دیا گیا۔ گھوڑا بجائے شیر سے خوف کھانے کے، لڑنے کو تیار ہوگیا اور جیسے ہی شیر جست کر کے اس پر آیا، گھوڑے نے اس طرح اگلا جسم جھکایا کہ شیر پشت پر گرا... ساتھ ہی گھوڑے نے اس زور سے دولتی ماری کہ شیر قلابازیاں کھاتا ہوا دُور جا گرا، مگر پھر سنبھلا اور چند منٹ اِدھر اُدھر تاؤ کے پھر جست کر کے گھوڑے پر جا رہا۔ گھوڑے نے پھر وہی حرکت کی کہ اگلا جسم جھکا دیا۔ شیر پٹھوں پر جا پڑا اور ارادہ کیا کہ اسے پنجوں سے گرا کے مار ڈالے، مگر گھوڑے نے اب کی اس زور سے دولتی جھاڑی کہ شیر کے جبڑے ٹوٹ گئے اور چاروں خانے چت دُور جا گرا۔ لیکن اس چوٹ سے شیر نے ایسی ہمت ہار دی کہ گھوڑے کی طرف پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگا اور تماشائی حیران رہ گئے۔ تب دوسرا اس سے بڑا شیر چھوڑا گیا، مگر اس نے رُخ ہی نہیں کیا مجبوراً وہ شیر بھی ہٹالیا گیا۔"

گذشتہ لکھنؤ از عبدالحلیم شرر

اُردو صحافت اور لکھنؤ

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پردے میں جبر و استبداد کے ذریعہ برٹش اقتدار کی جڑوں کو مضبوط بنانے اور مختلف رجواڑوں میں منقسم اس ملک پر اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنے کی سازشوں کا پردہ سب سے پہلے ایک انگریز صحافی ولیم بولٹس نے چاک کیا تھا۔ اُس کے اِس اقدام پر اسے ہندوستان سے نکال دیا گیا تھا اور جب وہ کلکتہ سے براستہ مدراس انگلستان واپس ہو رہا تھا تو اس نے پانچ سو صفحات کی ایک کتاب شائع کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی استبدادی حکمت عملی کو طشت از بام کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کے ہندوستان سے جانے کے بعد ایک اور انگریز جیمز آگسٹس ہکی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اس کام کو آگے بڑھایا اور ۲۹ر جون ۱۷۸۰ء کو "ہکیز بنگال گزٹ" عرف کلکتہ ایڈورٹائزر کے نام سے کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ اُس کی تحریروں سے ایسٹ انڈیا کمپنی آتش زیر پا ہو گئی اور ہکیز کے قلم کو توڑ کر رکھ دینے اور کمپنی کو بدنامی سے بچانے کے لیے اُس وقت کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کے ذریعہ سرکاری ڈاک خانہ سے اس کی ترسیل کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ دو سال تک ہکیز ایسٹ انڈیا کمپنی سے برسرِ پیکار رہا اور صحافت کی آبرو کے تحفظ کے لیے مختلف طریقوں سے کمپنی کے ظلم و ستم اور استحصالی سازشوں کے پردے چاک کرتا رہا۔ بالآخر مارچ ۱۷۸۲ء میں اس کے دارالاشاعت کو بحق سرکار کمپنی بہادر ضبط کر لیا گیا اور ہمیشہ کے لیے اس کے اخبار کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس کے بعد انڈیا گزٹ، کلکتہ گزٹ، ایشیاٹک مسیلنی، بنگال رجسٹر، بنگال جنرل، انڈین ورلڈ، اورینٹل میگزین، بنگال ہرکارہ، ایشیاٹک ہیرلڈ، مارننگ پوسٹ، ٹیلی گراف اور اورینٹل اسٹار جیسے اخبارات خود انگریزوں کی ملکیت میں کلکتہ سے جاری ہوئے۔ ان اخبارات کی تحریروں سے انگریزی اقتدار کے سرپرستوں کی نیندیں حرام ہوتی رہیں۔

اُدھر مدراس سے بھی انگریزی اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مدراس کوریئر وہاں کا پہلا اخبار تھا جو ۱۷۸۵ء میں جاری ہوا۔ ۱۷۹۳ء میں مدراس ہرکارہ، ۱۷۹۵ء میں مدراس گزٹ اور ۱۷۹۴ء میں انڈیا ہیرالڈ منصۂ شہود پر نمودار ہوئے۔

بمبئی کا پہلا اخبار "بمبئی گزٹ" تھا جو ڈبلو، ایس کوپر نے ۲۵ر جون ۱۷۹۰ء کو جاری کیا تھا۔ دوسرا اخبار بمبئی گزٹ تھا اور تیسرا اخبار بمبئی کوریئر۔ اسی اخبار کو کثیر الزبان اخبار ہونے کا شرف بھی حاصل تھا کیونکہ اس میں انگریزی کے علاوہ کنڑ، گجراتی، مراٹھی اور اردو زبان میں بھی اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد ۱۷۹۱ء میں بمبئی آبزاور کے نام سے بھی ایک اخبار جاری ہوا۔ ان تمام اخبارات نے کمپنی کی چیرہ دستیوں کی مذمت میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کیا۔ بمبئی کوریئر کو اس اعتبار سے اردو کی مطبوعہ صحافت کا نقش اوّل قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں اردو زبان میں بھی اشتہارات شائع ہوتے تھے۔

جب میسور فتح ہو گیا تو وائسرائے لارڈ ویلزلی کی ہیبت بڑھ گئی اور انھوں نے مطبوعہ صحافت کو پابند کرنے کے احکامات جاری کیے۔ اخبارات پر روز بروز پابندیاں سخت ہونے لگیں مگر ۱۸۱۸ء میں کلکتہ سے جیمس سلک بکنگھم کی ادارت میں جاری ہونے والے اخبار کلکتہ جرنل اور فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" کے ایڈیٹر راجہ رام موہن رائے آزادیٔ حکم پر برٹش سرکار کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ اردو کے پہلے اخبار جام جہاں نما (اجرا ر ۲۷ر مارچ ۱۸۲۲ء) کے ایڈیٹر سدا سکھ لال نے بھی اخبارات اور چھاپہ خانوں پر لگائی گئی پابندیوں کے خلاف احتجاجی مضامین لکھے۔

جام جہاں نما ہندوستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار تھا جس کے شائع ہوتے ہی اردو صحافت کی راہ سے اردو کے نثری اور شعری ادب کے

فروغ کے دروازے کھل گئے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سدا سکھ لال مرزا پور (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) کے رہنے والے تھے جس کو آزادی کے بعد اتر پردیش (یوپی) کا نام ملا۔ اس لیے ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستان میں اردو صحافت کے آغاز کا سہرا یوپی کے سر بندھتا ہے۔ اس اخبار نے اودھ کے حالات پر خاص توجہ دی اور اودھ کے حکمرانوں، رؤسا اور حکام ہی کے تعلق سے نہیں بلکہ اودھ کی تہذیبی زندگی کے تعلق سے بھی بہت سی خبریں شائع کیں۔ ان خبروں سے جہاں بارگاہِ سلطانِ اودھ کے سیکولر افکار کی نشان دہی ہوتی ہے وہیں یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اودھ کے امرا ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ وہ نہ صرف ہولی، دسہرہ اور دیوالی کے "تیوہار" کے وسیلے سے فرقہ وارانہ اتحاد کو فروغ دیتے تھے بلکہ وہ اپنی رعایا کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے اور قحط و گرانیِ اجناس کے دنوں میں محتاجوں، فقیروں اور غریبوں کی دست گیری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس اخبار سے اودھ بالخصوص لکھنؤ کی تہذیبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہاں کے اربابِ نشاط کی عیش کوشی بھی سامنے آتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان خبروں سے ۱۸۲۵ء کے لکھنؤ کی تہذیبی "قدروں" پر کافی روشنی پڑتی ہے جو ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

(۱) "ایک دن میستا بیگ کو توال کو حکم دیا کہ جتنی لونڈیاں شہر میں بکیں انھیں حضور کی ڈیوڑھی پر حاضر کیا کرو۔"

(جام جہاں نما یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء)

(۲) "ایک عرضی پہنچی کہ احسان علی بردہ فروش چار کنیزیں لایا ہے اور اس نے آٹھ کنیزیں مرزا میستا بیگ کو توال کو بھیجی تھیں وہ بھی درِ دولت پر حاضر ہیں۔ حکم ہوا کہ احسان علی کے پاس روانہ کر دو جو کنیزیں سلطان کے پاس آئی تھیں ان میں تین بہت چھوٹی عمر کی تھیں اُن کو مسترد کر دیا گیا۔" (جام جہاں نما ۲۳ مارچ ۱۸۲۵ء)

(۳) "مرزا محمد تقی آغا نصیر کے بھائی جو ناراض ہو کر کانپور کی طرف روانہ ہوئے ان کی طوائف چالیس رنڈیوں کے ساتھ گیروے کپڑے پہنے اور علم ہاتھ میں اٹھا کر حضرت عباسؑ کی درگاہ کو گئی۔" (جام جہاں نما ۲۲ مارچ ۱۸۲۵ء)

جام جہاں نما کی زبان اودھ کی عام بول چال کی زبان تھی۔ اس کی ۱۸ اپریل ۱۸۲۰ء کی اشاعت میں ایک اینگلو انڈین شاعر ڈی کاسٹا کی اردو غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع یہ تھا؎

کل ہم تمھارے کوچہ میں آئے چلے گئے
ہے ہے ہزار اشک بہائے چلے گئے

شاہانِ اودھ کی انصاف پروری اور غربا نوازی پر بمبئی کے آئینۂ سکندری (مدیر فضل حق) کی تحریروں سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ ۲۶ اپریل ۱۸۲۲ء کو فارسی میں جاری ہونے والے اس ہفت نامہ میں ۱۸۳۴ء میں اردو ضمیمہ کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ اس اخبار کی خوبی اردو اشعار کے برجستہ استعمال سے تعلق رکھتی ہے۔ خبر دار السلطنت لکھنؤ کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے؎

مالکِ ملک شاہِ عالی جاہ
رہے قائم ہمیشہ شاہ پناہ

سلطان نصیر الدین حیدر بن غازی الدین حیدر ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے اور ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی انسان دوستی کی ایک مثال آئینۂ سکندری کی اس خبر سے ملتی ہے:

"حضور کا حکم اشرف روشن الدولہ بہادر کے نام سے یوں ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؑ کی شہادت کے روز تابوت جو حضرت عباس (ع) کے روضے میں لے جاتے ہیں اثنائے راہ میں بہ سبب مذہب کے دونوں فرقوں سے جنگ و جدل ہمیشہ ہوا کرتا ہے ایسا بند و بست کیجو کہ کوئی بات بے موقع نہ ہونے پاوے اور کسی زبان سے بری بات نہ نکلے چنانچہ بموجب ارشاد خوب ہی کار پردازان کا اہتمام عمل میں آیا اور ساری رعیت کو امن و امان کا منھ دکھلایا۔"

اودھ یعنی (اتر پردیش کا وہ علاقہ جو گھٹتے گھٹتے واجد علی شاہ کے زمانہ میں بہت محدود ہو گیا تھا) نے روزِ اوّل ہی سے اردو صحافت کے فروغ میں فائدہ کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں منشی سدا سکھ لال مرزا پوری (جام جہاں نما کلکتہ)، فضل حق (اخبار سکندری بمبئی)، منشی امان اللہ لکھنوی (کشف الاخبار کاشف الاسرار بمبئی) منشی غلام حسین لکھنوی اردو صحافت کے آغاز ہی سے ہندوستانی عوام کے بہی خواہ اور والیان اودھ کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافیوں کے ناقد تھے۔ وہ کمپنی بہادر کے ظلم و جبر کے خلاف برابر آواز اٹھاتے رہتے تھے۔

جب سرکاری زبان، فارسی کی جگہ پر اردو بن گئی تو دہلی، آگرہ اور لکھنؤ صحافت کے مضبوط مرکز بن گئے تھے مگر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے جن میں لکھنؤ کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع کی

اس سلسلہ میں مدراس کے اردو اخبار جامع الاخبار کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کے مدیر سید رحمت اللہ تھے اور جو ۱۸۴۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس اخبار کی اودھ پر حیدرآبادی اردو کی زبردست چھاپ تھی۔ اس کی لکھنؤ کی یہ خبر ملاحظہ کیجیے:

"منیر الدولہ وزارت پر آئے تب سے وہاں (اودھ) کا
کام بدستور چلتا ہے۔ انھوں نے محرم کے ایام میں شہر کے درمیان
جابجا سپاہ کو تعین (متعین) کیے (کیا) تاکہ شیعہ (شیعہ) و اہل سنت و
جماعت کے درمیان مناقشہ نہ ہووے۔ غرض اس ضبط سے
لکھنؤ میں تو ایام محرم خیریت سے گذر گئے پر اطراف کے پرگنات
کا بندوبست کما ینبغی نہیں ہوا۔"

یہ اخبار اگرچہ انگریز پرست تھا اور دربار اودھ کی مذمت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیا کرتا تھا مگر اس کو بھی اودھ کے حکمرانوں کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوششوں کا اعتراف کرنا پڑا۔

دہلی کے پہلے اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" کا اجرا ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ مولوی محمد باقر کا یہ اخبار دہلی ہی کا نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کا پہلا اردو اخبار تھا۔ ان کے فرزند شمس العلماء محمد حسین آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ:

"..... ۱۸۳۶ء میں جب پریس کو آزادی ملی تو انھوں
نے (مولوی باقر نے) دہلی سے پہلا اردو اخبار جاری کیا اس کے ساتھ
ایک مطبع بھی قائم کیا جس میں مولانا کی تصنیفات اور دوسری کتابیں
شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس پریس کا نام پہلے جعفریہ اور پھر اردو اخبار
پریس رکھا۔"

جس مکان سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا وہ درگاہ پنجہ شریف (کشمیری گیٹ دہلی) سے متصل ہے اور آج بھی موجود ہے جو پہلے ایک یتیم خانہ اور امام باڑہ کی شکل میں تھا مگر اب اس کے بیشتر حصے کو تجارتی اغراض کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے اور ۱۰ محرم کو شیعہ جامع مسجد سے علم، تابوت اور ذوالجناح کا جلوس اس کے اندرونی حصہ میں آتا ہے۔ اس اخبار نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے نامہ نگار مقرر کیے تھے اودھ میں بھی اس اخبار کے کئی نامہ نگار تھے مگر افسوس کہ ان کے نام نہ معلوم ہو سکے۔ دہلی اردو اخبار کی ۲۹ مارچ ۱۸۵۳ء میں اس کے ایک مکتوب نگار کی یہ خبر اودھ کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے

"واضح ہو کہ ان دنوں بسبب عدم خبرگیری کے ملک شاہ اودھ
کا بہت ابتر ہے اور ظلم سے عاملوں کے رعایا تباہ ہو گئی ہے اور کون سی
شب ہوتی ہے کہ جس میں خاص لکھنؤ میں ایک دو نقب اور چوریاں
نہیں ہوتیں۔ کہتے ہیں کہ عدل میں شاہ اودھ کے کچھ خطا نہیں مگر کارکنانِ
سلطنت محض ناکردہ کار اور خائن ہیں کوئی شخص حالِ ظلم عاملوں کا
بارگاہِ سلطانی تک نہیں پہنچاتا۔ افسوس کہ کارکنان ناآزمودہ کار
اختیارِ سیاہ و سفید رکھتے ہیں جس سبب سے کہ ابتری ملک کی روز
بروز نمایاں ہوتی ہے۔"

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جس کو غدر کا نام دیا گیا 'دہلی اردو اخبار' نے اہم کردار ادا کیا۔ مولوی باقر نے اپنے قلم کو تیشہ بنا لیا۔ اور ان کی یہی جرأتِ رندانہ ان کی شہادت کا عنوان بنی۔

دہلی میں لکھنؤ کے ایک اور اخبار نویس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے یہ تھے لکھنؤ کے مصطفیٰ خاں۔ جب ۱۸۴۹ء میں شاہی حکم سے لکھنؤ کے مطابع بند کر دیے گئے تو مطبع مصطفائی کے مالک مصطفیٰ خاں نے اپنا مطبع لکھنؤ سے کانپور منتقل کیا اور پھر اسی نام سے ایک مطبع دہلی میں بھی کھولا۔ انھوں نے دہلی والے مطبع پر زیادہ توجہ دی اور خطبات و تاسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصطفیٰ خاں نے ۱۸۵۳ء میں صادق الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا جو مصطفائی پریس دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ مطبع مصطفائی سے وابستہ ایک کاتب جمیل الدین خاں ہجر نے بھی مصطفیٰ خاں سے علاحدہ ہو کر جمیل المطابع کے نام سے اپنا ایک مطبع محلہ چوڑی والان دہلی میں قائم کیا تھا اور صادق الاخبار کے نام ہی سے ایک اخبار کی اشاعت شروع کی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے دہلی کا سب سے بااثر اور کثیر الاشاعت اخبار بن گیا تھا کیونکہ ان کے اخبار میں انگریزوں کے خلاف تفصیلی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں اپنے آبائی وطن سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار اس خبر سے ہوتا ہے:

"الٰہ آباد سے ایک دوست کے پاس سے ایک آدمی آیا
وہ خبر لایا کہ لکھنؤ کے جمیع انگریزوں کو وہاں کی فوج نے تہِ تیغ بے دریغ
کیا اور مچھی بھون مکانات اودھ میں قبضہ اپنا کر لیا....."

پنڈت رام چندر دہلوی نے یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو دہلی سے خیر خواہ ہند جاری کیا مگر بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ مرزا پور (یوپی) سے اسی نام سے ایک اخبار نکلتا ہے اس لیے انھوں نے خیر خواہ ہند کا نام بدل کر مُحبِ ہند رکھ دیا خیر خواہِ ہند

دہلی کے علاوہ دو شمارے شائع ہوئے تھے۔ میرے محترم دوست اور مخلص کرم فرما مولانا امداد صابری (مرحوم) نے اس کا دوسرا شمارہ مجھے دکھایا تھا۔ چونکہ میں اودھ کا باشندہ ہوں اس لیے خیر خواہ ہند میں نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی تصویریں دیکھ کر اور تاریخ ملک اودھ کے تحت سعادت علی خاں، شاہ امجد علی خاں، نواب صفدر جنگ نواب شجاع الدولہ، نواب غازی الدین حیدر، محمد علی شاہ اور شاہ امجد علی خاں کے حالات کا مطالعہ کر کے بہت خوشی ہوئی تھی۔ مولانا امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو میں تاریخ اودھ کے ذیل میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اودھ کی زمین زرخیز تھی۔ دریاؤں اور نہروں سے آبپاشی کا انتظام تھا اس لیے بہت کم قحط پڑتا تھا اور ۸۰ برس تک اودھ امن و امان کا گہوارہ بنا رہا۔ اس وقت ملک اودھ کی آمدنی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ روپے تھی اور اس آمدنی کی تحصیل کا انتظام اس طور سے ہوتا تھا کہ وزیر ہر چکلے کو اس شخص کے سپرد کر دیتا تھا جو سب سے زیادہ روپیہ دینے کا اقرار کرتا مگر ان چکلہ داروں کا طریقہ کار ظالمانہ اور جابرانہ تھا جس کی وجہ سے ہزارہا دیہات برباد ہو گئے اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور یہ سب انگریزوں کی سوچی سمجھی حکمت عملی کے نتیجہ میں ہوا کیونکہ وہ بادشاہ کو رعایا کی نظر میں گرانا چاہتے تھے تاکہ ان کے مکمل اقتدار کی منزل آسان ہو جائے۔

شمالی ہند کا سب سے پرانا اخبار زبدۃ الاخبار ہے جو ۱۸۳۳ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔ یہ فارسی زبان کا اخبار تھا اور اس کے مالک و مدیر منشی واجد علی خاں تھے۔ تجارتی اعتبار سے یہ ایک کامیاب اخبار تھا اس کی تعداد اشاعت ۱۵۰ تھی۔ اس کی اشاعت و طباعت پر صرف چالیس روپے خرچ ہوتے تھے اور اخبار کی بکری سے ماہانہ ۱۴۰ روپے کی آمدنی تھی۔ اشتہارات سے ہونے والی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ منشی واجد علی خاں کو صرف اخبار نویسی ہی میں ملکہ نہ حاصل تھا بلکہ وہ اردو اور فارسی میں بلند پایہ کی شاعری بھی کرتے تھے۔ انھوں نے گلدستہ انجمن کے نام سے اردو زبان کی ایک تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کے ایک ہم عصر اسعد الاخبار آگرہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے گلدستہ انجمن میں ایک باب مراسلات و مکاتبات پر بھی تحریر کیا تھا اور انھوں نے ایک کتاب مطلع العلوم و مجمع الفنون بھی تصنیف کی تھی جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جملہ علوم و فنون سے بحث کی گئی تھی اور اس کی قیمت دس روپے فی جلد تھی۔ زبدۃ الاخبار کا ایک نمائندہ لکھنؤ میں بھی تھا جو اودھ کی رپورٹیں ارسال کیا کرتا تھا۔ اسعد الاخبار آگرہ میں جو اردو کا اخبار تھا ان رپورٹوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا تھا ان خبروں کا انداز اگرچہ پرسنی والا ہے۔ ان خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اور ان کے حاملوں کو بدنام کرنے کی ایک منظم سازش پر عمل ہو رہا تھا۔ مثلاً ایک خبر میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "حضرت بادشاہ سلامت معاملات سلطنت سے دست بردار ہو کر رات دن محل میں عیش کرتے ہیں۔" ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ "حضرت سلطان وزیر الممالک کے گھر محفل جشن میں گئے، وہاں جو حرکات بدرزبانی حضرت سلطانی سے ہوئیں اُن کے لکھنے کی ادب و حجاب رخصت نہیں دیتے۔ یعنی جو کچھ مطرب لوگ کرتے ہیں اس سے ہزار درجے بہتر بندگان عالی نے کیا۔" ایک اور خبر میں سرفراز کنچنی کے گھر مستی کی تقریب میں حضرت سلطان کی وزیر الممالک سمیت شرکت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ (انھوں نے) "شہر کی تمام کنچنیوں میں اُس کی (سرفراز کنچنی کی) قدر و منزلت بڑھائی فی الحقیقت حضرت سلطانی کا مرتبہ تو کچھ کم نہ ہوا مگر اس کنچنی کا مرتبہ بلند ہو گیا بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ "زقدر و شوکت سلطاں نہ گشت چیزے کم الخ" جب حضرت سلطانی وہاں سے مراجعت کر آئے تو باغ دلکشا میں اس کنچنی کو بلوا کر عیش و سرور کی خوب داد دی۔"

آگرہ کا پہلا اردو اخبار صدر الاخبار تھا جو آگرہ کالج کے ایک انگریز پروفیسر سی فنک نے ۱۸۴۶ء میں جاری کیا تھا۔ غالباً اردو کا یہ پہلا اخبار تھا جو کمپنی کے حصّے فروخت کر کے جاری رکھا گیا تھا۔ پروفیسر سی فنک نے آگرہ کالج سے منسلک دو سو افراد کو ۵۔۵ روپے کے حصّے فروخت کیے تھے۔ صدر الاخبار کے اجرا کے دوسرے سال یعنی ۱۸۴۷ء میں اردو کا ایک اور اخبار اسعد الاخبار کے نام سے جاری ہوا تھا یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کے مالک منشی قمر الدین تھے۔ اسعد الاخبار میں ہر ہفتہ ادارہ تحریر کی جانب سے یہ اعلان شائع کیا جاتا تھا:

> "جناب رسالت مآب صلی اللہ و آلہ و اصحابہ وسلم کے زمانۂ متبرکہ کا حال واقعہ اصحاب فیل سے شروع کر کے تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھاپا جاتا ہے۔ جب بفضلہ یہ حال تمام ہو چکے گا تو اہل بیت طاہرین اور خلفائے راشدین اور معرکہ جگر سوز کربلا اور دوازدہ امام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات بے کم و کاست بہ تدریج و تفریق لکھے جائیں گے تاکہ خلائق کو ان حالات فیض سمات پر بخوبی آگاہی ہو۔"

اس اعلان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اُس زمانہ میں سوادِ اعظم کے عقائد

اردو کا پہلا پریس دہلی کا مطبع عبدالرحمٰن تھا جو ۱۸۱۳ء میں قائم ہوا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کے عہد میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایک ٹائپ کا پریس کھولا گیا۔ اس پریس میں سب سے پہلے ہفت اقلیم شائع کی گئی پھر عربی میں مناقب حیدری چھپی (۱۸۱۹ء) محاورۂ حیدری فارسی میں (۱۸۲۲ء) چھپا۔ ۱۸۳۰ء میں آرچر نامی ایک انگریز نے کانپور میں لیتھوگرافک پریس لگایا جو بعد میں لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ اختر شہنشاہی میں جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی تھی ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء تک لکھنؤ کے جن اخباروں، رسالوں اور چھاپہ خانوں کے نام گنوائے گئے ہیں ان کی تعداد ۳۰ ہے ان میں جلالی اور خیالی کے علاوہ علوی (۱۸۴۱ء) افضل المطابع (۱۸۴۳ء) میر حسن پریس (۱۸۴۴ء) محمدی (۱۸۴۵ء) مولائی (۱۸۴۵ء) حسینی (۱۸۴۶ء) سکینہ (۱۸۴۶ء) محمدیہ (۱۸۴۶ء) احمدی (۱۸۴۷ء) لکھنوی (۱۸۴۹ء) اور فضل المطابع (۱۸۵۰ء) کے نام شامل ہیں۔

لکھنؤ کا پہلا باقاعدہ اخبار لکھنؤ اخبار تھا جو ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر لال جی تھے۔ "لکھنؤ" کا طلسم لکھنؤ ۱۸۵۶ء میں نکلا۔ جلد ہی اس کا شمار اہم اخباروں میں ہونے لگا اس کی زبان مقفیٰ و مسجع تھی۔ یہ اخبار لکھنوی تہذیب و معاشرت کا عکاس تھا۔ اس کی ایک خبر ملاحظہ کیجیے:

"لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔ چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے۔ جو
سانحہ ہے عجائب ہے۔ آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے ~
میر صاحب زمانہ نازک ہے دونوں ہاتھوں سے تھامو دستار"

طلسم لکھنؤ کے ایڈیٹر فرنگی محل کے مولوی محمد یعقوب انصاری تھے۔ اس اخبار کی اشاعت کے ۵ ماہ بعد ۱۱ر نومبر ۱۸۵۶ء کو سحر سامری ہفت روزہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس کے ایڈیٹر گھسیر زائن عیاش اور پنڈت برج ناتھ تھے۔ اس کا اسلوب بیان بھی طلسم لکھنؤ جیسا تھا۔ ایک خبر ملاحظہ ہو: "ان دنوں غلّہ کی گرانی ہے۔ گرانیِ خاطر کی ارزانی ہے۔۔۔۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہے۔ خونِ دل بجائے شراب ہے۔ طرزِ جگر کباب ہے۔۔۔۔" اسی زمانہ کا ایک اخبار مخزن الاخبار تھا اور دوسرا تاج الاخبار تھا۔ لکھنؤ کے جس اخبار کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ اودھ اخبار تھا جسے ۱۸۵۸ء میں منشی نولکشور نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۷۱ء تک یہ ہفت روزہ سے سہ روزہ ہوا اور سر سید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۷۷ء سے اودھ اخبار روزنامہ بن گیا۔ اس کی پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔ بڑے بڑے شاعر، ادیب اور انشاپرداز اس اخبار سے وابستہ تھے جن میں مولوی غلام علی خاں تپش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی احمد حسن شوکت، عبدالحلیم شرر، سید امجد علی اشہری، مرزا حیرت دہلوی اور مولانا جالب دہلوی۔ اس اخبار کا شہرہ لکھنؤ سے لندن تک تھا۔ مگر اخبار کے ایڈیٹر غلام محمد خاں تپش سے اختلاف کی بنا پر منشی نولکشور نے اُن کو علاحدہ کر دیا۔ سرسید کی تحریک پر ان کو دوبارہ لایا گیا لیکن یہ سلسلہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور تپش پھر ہٹ گئے۔ ان کی جگہ پنڈت رتن ناتھ سرشار ایڈیٹر بنائے گئے۔ ان کے عہدِ ادارت میں فسانۂ آزاد قسط وار اس اخبار میں شائع ہوا۔ جس کو ۱۸۸۰ء میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ منشی سجاد حسین نے اپنے اودھ پنچ میں اودھ اخبار کے خلاف قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ سرشار کی مدتِ ملازمت ختم ہونے کے بعد فروری ۱۸۸۰ء میں خود منشی نولکشور نے اودھ اخبار کی ادارت سنبھال لی۔ اودھ پنچ ایک مزاحیہ اخبار تھا جس کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔ اس اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الٰہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی شوق اور منشی احمد علی کسمنڈوی کی تخلیقات کے علاوہ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور نواب سید محمد آزاد (بنگال) کی خدمات بھی اودھ پنچ کو حاصل تھیں۔ اودھ پنچ مزاحیہ انداز میں حکمرانوں سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتا تھا اُس کی تحریر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

"مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان کی راحت اُن ہی کے واسطے ہے۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لیے رنجیدہ ہیں کیونکہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی۔ مبارک وہ جو قوم کے لہو کے پیاسے ہیں کیونکہ پادریوں کی بدولت مسیحی مذہب سے مشرف ہوں گے۔ مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار رحمدل کہیں گے۔ مبارک وہ جو راست بازی کے لیے دھکیلے جاتے ہیں کیونکہ ان کی سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔"

کچھ لوگ اودھ پنچ کو اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار سمجھتے اور لکھتے آئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مزاحیہ صحافت کا آغاز اودھ پنچ سے نہیں ہوا اور منشی سجاد حسین پہلے مزاحیہ صحافی بھی نہ تھے بلکہ پہلا مزاحیہ اخبار رام پور کا مذاق تھا جس کے مالک حکیم احمد رضا لکھنوی اور ایڈیٹر عبدالجلیل نعمانی تھے۔ ان پنچ اخباروں نے اردو کے مزاحیہ ادب میں زبردست اضافہ کیا۔ سرپنچ (۱۸۷۷ء) انڈین پنچ (۱۸۸۰ء) بھی لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ اب جو یوپی کا خطہ ہے اس کے مختلف شہروں سے متعدد پنچ اخبارات نکلتے تھے۔ مثلاً بادا

(باقی صفحہ ۲۴۰ پر)

حسن واصف عثمانی

لکھنؤ کے چند اخبار

لکھنؤ میں اُردو صحافت کی تاریخ اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ تحقیق اور خالص علمی تحقیق بن جاتا ہے۔ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں لکھنؤ سے بے شمار رسالے، اخبار اور ماہنامے نکلے۔ ان کے ناموں کی پوری فہرست مرتب کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ بڑے بڑے اہم اخباروں، رسالوں اور ماہناموں کے فائل ناپید ہیں۔ قدیم اخباروں کے متفرق شمارے کہیں کہیں مل جاتے ہیں، مگر اودھ اخبار، اودھ پنچ اور روزنامہ ہمدم کے مکمل فائل دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ لکھنے یا اس سلسلے میں تحقیق اسی لیے ناممکن اور محال نہ بھی ہو تو ہر حال میں ادھوری اور نامکمل ضرور رہے گی۔

اس کے باوجود لکھنؤ کی اُردو صحافت کا ایک عمومی جائزہ اس لیے ممکن ہے کہ لکھنؤ میں اُردو صحافت کی روایت کے بعض امتیازات ایسے ہیں جن کو باہم مربوط کیا جائے تو لکھنوی صحافت کا انفرادی چہرہ نکھر کر سامنے آسکتا ہے۔ اس انفرادیت میں اولیت زبان کے بارے میں اہلِ لکھنؤ کے رویّے کو حاصل ہے۔ لکھنؤ کے اہلِ زبان کا لسانی رویّہ اردو کے مزاج کو ابتدا سے ایک خاص نہج پر لے جانے کا تھا۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں کے اثرات سے اردو تنقید میں اب انکار کا رویہ بھی نظر آنے لگا ہے۔ لیکن لکھنؤ کے مخصوص لسانی رویّے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جس نے شعر و شاعری کی طرح نثر نگاری میں لب و لہجہ پر دھیان دیا۔ لکھنؤ میں یہ لسانی رویّہ تاریخ اور جغرافیہ کے دو بڑے عوامل سے پیدا ہوا۔ دہلی سے آنے والی کھڑی بولی کا جو روپ ریختہ کے نام سے لکھنؤ آیا اس پر لکھنؤ کی شہری تہذیب اور شہری سماج نے اپنا تصرف کیا۔ لکھنؤ اودھی بھاشا کے علاقے میں بسا تھا اس لیے لکھنؤ نے زبان کے سلسلے میں ناسخ اور اور ان کی پیروی کرنے والوں کی اصلاحِ زبان کی تحریک کو پوری طرح قبول کر کے الفاظ کے اپنے کینڈے بنائے اور زبان کی نحوی ساخت کے دائرے میں سے امکانات تلاش کیے۔ لکھنؤ کی نثر کا یہ ارتقا جس معراجِ کمال پر پہونچا وہ طلسم ہوش رُبا کی داستانوں میں نظر آتا ہے، جو ۱۹ویں صدی میں لکھنؤ کی زندہ اور رائج زبان کے بے مثال نمونے فراہم کرتی ہیں۔

لکھنؤ کی اُردو صحافت کے ابتدائی نقوش بے شمار مذہبی اور نیم مذہبی رسالوں میں ملتے ہیں لیکن اس میں مطبع نول کشور کے اودھ اخبار اور پھر منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ کو اپنے اثرات اور ہمہ گیری کی وجہ سے بنیادی اہمیت دینا ہوگی۔ دونوں نے پڑھنے والوں کا وہ عوامی طبقہ پیدا کیا جس کے بغیر صحافت وجود میں نہیں آسکتی۔ اودھ اخبار اور اودھ پنچ دونوں جس زمانے میں نمودار ہوئے وہ داستانوں کا دور اور طلسم ہوش ربا کی ہمہ گیری کا زمانہ تھا، لیکن دونوں نے ادب اور صحافت کی نئی زبان پیدا کرنے کا بنیادی کام کیا۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر توجہ اور تحریر کی روایت قائم کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسین کا ادبی مرتبہ سب تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انھوں نے لکھنؤ میں اُردو صحافت کو شعر و شاعری، انشا پردازی یا مزاح نگاری کے تفریحی دائروں سے باہر نکالنے کا فرض بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انجام دیا۔ اودھ اخبار نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل پر انھیں تحریروں کے ذریعے غور و فکر کی دعوت دی۔ اودھ اخبار نے اودھ کے زمینداروں اور اودھ کے عوام کے مسائل پر بہت تعمیری اظہارِ خیال کیا۔ اودھ پنچ نے ملک کی سیاست اور بین الاقوامی سیاست پر بھی تیکھے پن کے ساتھ

اپنی تحریروں میں شوخی کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا رنگ شامل رکھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کو صرف فسانۂ آزاد یا سیر کہسار جیسی ادبی کتابوں کے حوالے سے یاد کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سرشار نے جدید فلکیات پر اردو میں پہلی بار ایک کتاب انگریزی سے منتقل کی۔ یہ کتاب "شمس الضحیٰ" اردو میں جدید عصری علوم کو منتقل کرنے کی تاریخ میں جامع و وقیع اور اہم کوشش ہے۔

لکھنؤ کی اردو صحافت میں ایک اہم باب "مسلم گزٹ" کی اشاعت ہے۔ میر جان صاحب کے اس رسالے نے سنجیدہ فکری اور علمی تحریروں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا، خاص طور پر اس دور میں جب اس کی ادارت وحید الدین سلیم کے سپرد رہی۔ وحید الدین سلیم نے "مسلم گزٹ" کو ملک گیر شہرت اور وقار کا حامل بنا دیا۔ سماجی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل پر مسلم گزٹ میں شائع ہونے والی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے نئے اور عصری خیالات کو ادا کرنے کے لیے زبان کو نئے الفاظ اور اصطلاحیں بھی ملیں۔ جمہوریت، نمائندگی اور قوم پرستی یا وطن دوستی جیسے بے شمار الفاظ جدید معانی کے حامل تھے جو اصطلاحوں کی شکل میں روشناس اور رائج ہوئے۔ وحید الدین سلیم اصطلاح سازی کے ماہر تھے بعد میں وہ پروفیسر وحید الدین سلیم کے روپ میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ اور اس کے دار الترجمہ و تالیف کے ذریعے اصطلاح سازی کی بے مثال خدمات کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن ان کے کام کی ابتدا "مسلم گزٹ" سے پوری طرح وابستہ ہے۔

فسانۂ عجائب اور طلسم ہوش رُبا کی نثر سے نکل کر عصری خیالات اور جدید حیات کی ترجمانی کرنے والی سادہ علمی نثر تک پہونچنے میں لکھنؤ کی اردو صحافت نے اس لسانی رویّے سے کبھی انحراف نہیں کیا جو الفاظ، محاوروں اور جملوں کی ساخت میں کسی انحراف کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ میں صحافت پر شعر و ادب کی گرفت برابر قائم رہی اور اخبار نویسی میں زبان و بیان کی ایک معیاری سطح کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی برابر ہوتی رہی۔

بیسویں صدی میں روزنامہ "ہمدم" کی اشاعت نے ایک عام قبول عام اور کثیر الاشاعت اخبار کی ضرورت پوری کی۔ "ہمدم" سید جالب دہلوی کی سربراہی میں نکلا تھا جو باکمال نثر نگار، بہترین مترجم اور قدیم و جدید زمانے کی قاموسی معلومات رکھتے تھے۔ دہلوی ہونے کے باوجود سید جالب دہلوی نے "ہمدم" میں زبان و بیان کے کلاسیکل لکھنوی اسلوب کی پیروی کی۔ روزنامہ "ہمدم" نے ایک اور تاریخی کارنامہ بھی انجام دیا، جس زمانے میں وہ نکلا اس زمانے پر مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" اور ظفر علی خاں کے "زمیندار" کا گہرا اثر تھا۔ "الہلال" اور "زمیندار" دونوں سیاست میں مذہب کی گرمی پیدا کرتے تھے۔ اردو صحافت پر جذباتیت کا خول چڑھانے میں الہلال اور زمیندار کی ہمہ گیر کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن یہ زندگی اور سماج کے بارے میں زیادہ بالغ نظری اور گہرائی کے رویے کو عام کرنے کا وہ کام زیادہ اہم تھا جو لکھنؤ میں "مسلم گزٹ" اور "ہمدم" جیسے اخباروں نے کیا۔ اُردو صحافت میں مذہب، ہنگامی سیاست اور جذباتیت کی جگہ فکر و نظر کو روشن کرنے میں "مسلم گزٹ" اور "ہمدم" نے لاہور کے "پیسہ اخبار" کی طرح عصری تصورات کو فروغ دیا۔ عصری معلومات فراہم کرنے کو اپنا مقصد اور مشن بنایا، پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار رکھنے اور ان کی ذہنی تربیت کے لئے ادبی نثر پارے بھی شائع کئے اور مزاحیہ کالم شروع کیے۔ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں تک لکھنؤ کی اردو صحافت اپنے اسی ڈھنگ پر چلتی رہی۔ افسوس ہے کہ اس کے بے شمار نمونے اب ہماری دسترس سے باہر ہیں چند مشہور ناموں کے سوا بہت سے اخباروں اور رسالوں کو فراموش کرنا پڑا ہے۔

لکھنؤ میں انیس احمد عباسی کے روزنامہ "حقیقت" اور پھر عبد الرؤف عباسی نے روزنامہ "حق" کے ذریعہ اسی روایت کو پروان چڑھایا انیس احمد عباسی، سید جالب دہلوی کی طرح قاموسی علم رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں علم و فکر کی فراوانی ہوتی تھی۔ ان صحافیوں نے معیاری اخبار نویسی کی راہ سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ادبی اور علمی میدان میں ادیب اور بہت سے رسالوں کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن اہم مقام ظفر الملک علوی کے "الناظر" کو دینا پڑتا ہے جس نے جدید مسائل، شعر و ادب اور عصری تحریکوں پر سنجیدہ اور مقصدی نثر نگاری کے نمونے پیش کیے۔

ہفتہ وار اخباروں میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کے سچ، صدق اور صدقِ جدید کے سلسلے کو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ تینوں کا اوڑھنا بچھونا پرانی

مشرقی تہذیب کا دفاع اور مغرب پر جارحانہ حملہ کرنا تھا۔ ان میں مولانا آزاد کا وہ مذہبی طنطنہ نہیں تھا جو سیاست پر مذہب کا خول چڑھا سکتا یہ صرف خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ ممکن ہے جو ذہن و فکر کی جگہ جذبات کو مخاطب بناتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں ادب اور شاعری سے چاشنی آتی تھی مگر ان کا ذہن قدیم کی حمایت کے باوجود بہت جدید تھا۔ انھوں نے صحافت میں جذباتیت کے عمل دخل کو کم کرنے کا فرض بہر حال انجام دیا جس سے فکر و شعور میں روشنی پیدا ہوئی۔

الناظر کی طرح ایک اور رسالے "ہندوستانی" کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشہور ہفتہ واروں کی طرح "سرفراز" کو بھی یاد کرنا ضروری ہے جو شیعہ کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے ملک گیر اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا میدان عام نہیں خاص تھا۔ پھر بھی ایک فرقہ یا جماعت کے مخصوص مسائل کے علاوہ "سرفراز" نے سیاسی اور سماجی مسائل کے وسیع تر پہلوؤں پر ہمیشہ توجہ رکھی۔ یہ اصلاح احوال کے مقاصد اپنے سامنے رکھتا تھا۔ قدیم و جدید کے مناسب امتزاج کا علمبردار تھا۔ "سرفراز" نے تعلیمی کو آگے بڑھایا اور اجتماعیت کے شعور کی آبیاری کی۔ سرفراز کی برسہا برس کی فائلوں میں لکھنؤ کی تاریخ، تہذیب، لکھنؤ اور اودھ کی نامور شخصیتوں اور عزاداری اور مرثیہ گوئی کے بارے میں معلومات کا ایک بڑا خزانہ دفن ہے۔

اسی طرح حیات اللہ انصاری اور ان کے ساتھیوں کے اس کارنامے کا ذکر ضروری بلکہ فرض ہے جو روزنامہ "قومی آواز" کی شکل میں اردو دنیا کے سامنے آیا تھا۔ یہ اُردو صحافت کو اپنے عصر اور اس کی ترقی یافتہ صحافت سے ہم آہنگ کرنے اور ہم پلہ بنانے کی ایک ایسی کوشش تھی جو حوصلے، امنگ اور ذہانت تینوں کی طلب گار تھیں۔ حیات اللہ انصاری کی سربراہی میں قومی آواز کے بانی صحافیوں نے اخبار کی تزئین، ترجمے میں عام فہمی، سلاست اور اُردو کے مزاج پر زور دینے کے کامیاب تجربے کئے۔ تزئین کاری کو اہمیت دے کر سرخیوں کی کتابت کے ڈھنگ مقرر کیے۔ ٹیلی پرنٹر سروس سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ خبروں کی اشاعت کا طریقہ اختیار کیا، جس میں خبریں گڑھنے یا خبروں کی جگہ ذاتی خیالات کو خبر کی طرح پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ "قومی آواز" نے ہفتہ وار میگزین کے ذریعہ شعر و ادب اور تنقید کو بھی اخباریت کا ایک جز بنایا۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے بے تکلف انداز میں جو اداریے لکھے ان میں زبان کا لطف اور ہلکے ہلکے طنز کے پہلو بہ پہلو ایک مجموعی فکر کی عکاسی ہوتی تھی۔ "قومی آواز" نے اُردو صحافت کا معیار بلند کرنے کا تاریخی فریضہ انجام دیا اور اس کا اعتراف ہندوستان اور پاکستان میں اخبار نویسوں کی برادری عام طور پر کرتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسا سنجیدہ، جدید اور زمانے کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اخبار صرف لکھنؤ میں ہی نکل سکتا تھا جہاں اودھ اخبار، اودھ پنچ، مسلم گزٹ، ہمدم اور حقیقت جیسے اخباروں نے اردو صحافت میں ہمہ گیری کی وہ روایت پیدا کی اور پروان چڑھائی تھی جو اُردو کے کسی اور مرکز میں موجود نہیں تھی۔۔ بیسویں صدی کے وسط تک لکھنؤ کی اردو صحافت کا یہ امتیازی وصف بالکل سلامت رہا اور جہاں بھی اچھے اخبار نکلے وہ کسی نہ کسی طرح اس وصف کو لکھنؤ سے مستعار لیتے رہے۔ لکھنؤ کے اہل زبان کے اثرات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی اردو صحافت نے بھی غیر محسوس طریقے پر ساری اردو صحافت کو متاثر کیا ہے۔

لکھنؤ کی سنجیدہ صحافت کی روایت اس صدی کے نصف ثانی میں دو ہفتہ واروں نے قائم رکھی۔ ہفتہ وار "ندائے ملت" کے رُوحِ رواں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی تھے۔ "ندائے ملت" کے معیار کو انھوں نے جدید مغربی صحافت کے معیار کے برابر رکھنے کا خاکہ بنایا تھا اور شعوری طور پر وہ برابر یہی کوشش کرتے رہے کہ "ندائے ملت" زبان و بیان، ترتیب اور اظہارِ خیال یا اظہارِ فکر میں جذباتیت سے پرہیز کرے۔ ندائے ملت نے عصری معلومات کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے قومی، ملی اور بین اقوامی مسائل پر نہ صرف اپنے ادارتی شعبہ کی سنجیدہ تحریروں کی اشاعت کی بلکہ لکھنے والوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کیا۔ ندائے ملت ملک بھر میں مقبول تھا اور کثیر الاشاعت ہونے کے باوجود عوامی یا بازاری نہیں تھا وہ جذبے کی جگہ غور و فکر کی ترجمانی کرتا تھا۔

دوسرا ہفتہ وار "عزائم" تھا جو جمیل مہدی نے شروع کیا اور آگے چل کر روزنامہ بھی ہو گیا تھا۔ ہفتہ وار عزائم بھی سنجیدہ اور فکری صحافت کی راہ پر ثابت قدم رہا۔ لیکن جمیل مہدی بنیادی طور پر ایک

انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریروں میں زبان کی چاشنی اور شعری نثر کی شان ہوتی تھی۔ اپنے منفرد اسلوب کی تحریروں کی وجہ سے عصرِ امروز بھی بہت مقبول ہوا۔ روزنامہ ہونے کے بعد جمیل مہدی کے اداریے اس میں خاصے کی چیز ہوتے تھے۔

"ندائے ملت" اور "عصرِ امروز" طے شدہ مقاصد کو سامنے رکھ کر نکالے گئے تھے اور انھوں نے اپنے مقاصد کی کامیاب تکمیل کی۔ ان کی اثر انگیزی، شہرت اور وقار نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُردو میں معیاری اور سنجیدہ صحافت کی بڑی گنجائش ہے اور ایسی صحافت کے قدردانوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد آصف ندوائی نے فکر، منطق تجزیے اور مربوط نثر کو اور جمیل مہدی نے رنگین وسیال انشاپردازی کی اس روایت کو آگے بڑھایا جو اُردو صحافت میں ابتدا سے دو الگ الگ دھاروں کی طرح نظر آتی ہے لیکن صحافت کو نثر سے یا ادب سے وابستہ کرنے کے لیے یہ دونوں دھارے اہم ہیں۔ لکھنؤ میں صحافت ان دونوں دھاروں کی ہمیشہ ترجمان رہی ہے۔

□□

"میاں امانت نے ایک رہس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی، اس میں بجائے امانت تخلص استاد قرار دیا تھا اور اس نے مثنوی غزلیں اور ہولی و ٹھمری اور چھند زبان بھاکا میں کہی تھی چنانچہ جگر سنگھ پنڈت کشمیری اور بہاری کہار اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امردان مہ جبین خوبصورت جمع کرکے اور ان لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم رنگ اور ناچ دلوا کے الگ رہس کھڑا کیا تھا اور وہ پندرہ روپیہ روزینہ پر مجرے کو بھی جاتے تھے چنانچہ خلائق نے یہ جلسہ دیکھ کر بہت پسند کیا اور ہزار لوگ بازار میں جمع ہونے لگے۔ ایک روز مؤلف تذکرہ ہذا بھی اس جلسۂ رہس اندر سبھا میں گیا۔ دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردان حسین پر مفتوں و شیفتہ ہیں۔ بقول شعر حسب حال ہے
ہجوم ماہ رویاں اس قدر تھا   کہ مجھ کو دل کے لٹ جانے کا ڈر تھا

اُردو صحافت اور لکھنؤ

صفحہ ۲۳۶ کا بقیہ

آدم پنچ (۱۸۸۱ء) بنارس، بنارس پنچ (۱۸۸۱ء) بنارس، ظریف (۱۸۸۲ء) بنارس، میرٹھ پنچ (۱۸۸۱ء) میرٹھ، ظریف الہند (۱۸۸۶ء) میرٹھ، فتنہ (۱۸۸۲ء) گورکھپور، کشمیر پنچ (۱۸۸۳ء) بدایوں، کرڑا پنچ (۱۸۸۵ء) الٰہ آباد، پرکار آتش المعروف قنوج پنچ (۱۸۸۵ء) قنوج۔

اگر ایک طرف اردو صحافت میں طنز و مزاح کا زور تھا تو دوسری طرف علوم جدیدہ پر بھی توجہ دی جانے لگی تھی۔ سر سید احمد نے جنوری ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کے بعد مارچ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا۔ بعد میں سہ روزہ ہوگیا اور سر سید احمد کے انتقال کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کی پالیسی رعایا اور حکمراں طبقے میں مفاہمت کی خوشگوار فضا پیدا کرنا اور سر سید کے سماجی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظریات کی تبلیغ کرنا تھا۔ سر سید نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق بھی علی گڑھ ہی سے جاری کیا یہ دس روزہ اخبار تھا جس کا مقصد اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب و اخلاق سے روشناس کرانا تھا۔ سر سید احمد کے تہذیب الاخلاق کے مقابلہ میں سر سید کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے بھی کئی اخبار نکلے مثلاً کانپور سے نور الآفاق اور نور الانوار۔ مراد آباد سے لوح محفوظ اور آگرہ سے تیرہویں صدی۔ ان اخبارات میں سے اگر کسی اخبار میں سر سید پر چوٹ نہ ہوتی تھی تو وہ متعجب ہوتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہوگیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی: "کیا آج بازار کے سارے لونڈے مر گئے"۔"

جب ہندوستان میں انجمنوں کے اخبارات نکلنا شروع ہوئے تو لکھنؤ بھی پیچھے نہ رہا۔ ان اخبارات کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں لکھنؤ کے اخبار انجمن ہند (۱۸۶۲ء) گونڈہ کے ماہنامہ انجمن رفاہ عام شاہجہاں پور کے اخبار انجمن شاہجہاں پور، لکھنؤ کے رسالہ انجمن اسلام اور کانپور کے رسالہ انجمن تہذیب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فنون

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

فن

نام ہے اجتماعی شخصیت کے اظہار کا
اودھ نے
اپنے فنون میں اپنی تاریخی شخصیت
کا وہ اظہار کیا ہے جس سے ہر فن
خونِ دل کی سرخی سے تابناک نظر آتا
تھا

احمد حسین

لکھنؤ کی گائکی
لکھنؤ کا کتھک

مولانا حالی نے یہ شعر لکھنؤ دلی مرحوم کے لیے کہا تھا لیکن حرف بہ حرف صادق آتا ہے لکھنؤ کے ان ماہرین موسیقی پر جن کا فن یا تو ان ہی کے ساتھ قبروں میں دفن ہوگیا یا ان کی جاگیروں کے کھنڈروں میں جل کر راکھ ہوگیا۔

ذرّے ذرّے میں ہے یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

افسوس کہ یہ خزانہ یعنی لکھنؤ کا گائکی گھرانہ موسیقی کی تاریخ میں اس طرح محفوظ نہ رہ سکا جس طرح مثال کے طور پر گوالیار یا آگرہ کا گھرانہ رہا۔ حالانکہ اس شہر نے ایسے ایسے باکمال فن کار پیدا کیے جنھیں اپنے دور میں فن کی آبرو اور انتہا قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم تک ان کی زندگی کی چند کہانیاں ہی پہونچی ہیں۔ ان کا فن نہیں پہونچ پایا۔

اگر آج بہت سے لوگوں کو ان بے مثال فن کاروں کے نام بھی نہیں معلوم تو اسکے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن ارباب نشاط کے سپرد یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے تاریخی ورثہ کو لوگوں کے دلوں میں اور کاغذ کے سینے پر محفوظ کرادیں۔ انھوں نے فن موسیقی کو وہ رتبہ ہی نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے۔ سماج میں بڑے اور چھوٹے پن کو ناپنے کے اپنے معیاروں اور چھوٹے پیمانوں کی وجہ سے موسیقاروں، گلوکاروں اور رقاصوں کو ہمیشہ تیسرے درجے کا شہری سمجھا۔

عجب ستم ظریفی ہے کہ جو معاشرہ اپنی تقریبات میں موسیقاروں، گلوکاروں اور رقاصوں کی شمولیت کو وجہ امتیاز قرار دیتا تھا اور اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اپنے وقار تک کو داؤں پر لگا دیا کرتا تھا وہی معاشرہ ان فن کاروں کی سماجی حیثیت سے منکر رہا اور انھیں محض سامان تفریح سمجھتا رہا۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق ان کا فن ہی ان کے لئے باعث محرومی بنا رہا۔

ایسا نہیں ہے کہ فن کار اپنی سماجی کیفیت میں کسی سے کم رتبہ رہے ہوں۔ ان میں سے بیشتر کا نسبی اور خاندانی پس منظر شرافت اور نجابت کا آئینہ دار ہوا کرتا تھا اور یہ بھی نہیں کہ فن کار سماجی ذمہ داریوں سے عاری اور معاشرہ کے لیے بے فیض رہے ہوں۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ فن کار اپنے فن کی دنیا میں اتنے گم تھے کہ انھیں سماجی رتبوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اپنے فن سے ان کا تعلق وہی تھا جو عابد کا نماز سے ہوتا ہے

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعے و امام شد فلانے

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان فن کاروں میں سے بیشتر اپنی دینداری اتقا اور پارسائی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ان میں جو ہندو تھے وہ اپنے پوجا پاٹھ کے پابند ہی نہیں تھے اور انھیں اپنے دھرم کا گیان شاید پنڈتوں سے بھی زیادہ تھا اور جو مسلمان تھے وہ نہ صرف اسلام کی اعلیٰ اقدار سے بخوبی واقف تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ صوم و صلوٰۃ، تسبیح اور حب اہلبیت، عزاداری اور احترام شہادت ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بھلا کون کافر اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر بسم اللہ خاں کی

سے بجی ہوئی تان سنگیت کی عظمتوں کی قسم کھاتی ہے تو ان کے ماتھے پر سجدوں کا نورانی نشان ان کے روحانی تقدس اور زہد و تقویٰ کی گواہی دیتا ہے۔

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

زمانے کے معیار اب بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ فن کاروں کی ناقدری آج بھی ہے، لیکن بہرحال وہ بے حسی کم ہو چکی ہے جو فن کاروں کو جیتے جی مار دیا کرتی تھی۔ گزرے ہوئے کل کے فن کار کی قسمت میں صرف فراموشی تھی۔ اس لیے جن آنکھوں نے ان فن کاروں کو دیکھا اور جن کانوں نے ان کے گرانمایہ فن کا فیض اٹھایا، صرف وہی ان کے گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں استثنیٰ صرف ایک کتاب "معدن النغمات" ہے، جس کے مصنف راجا نواب علی تھے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل تھی اور اُردو کی شاید پہلی ایسی کتاب تھی جس میں فن موسیقی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں بعض فن کاروں کا ذکر بھی تھا۔ یہ کتاب برسوں سے دوبارہ نہیں چھپی۔ شاید اب بھی اس کی کوئی کاپی امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ یا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہو۔ اس کتاب سے ایک عرصہ تک ہندستان بھر کے گائک مستفید ہوتے رہے اور اگر دوبارہ شائع ہو جائے تو تمام برصغیر کے اُردو داں آج بھی اس سے فیض اُٹھا سکتے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے جن فن کاروں کے بارے میں جانکاری ہوئی وہ اپنے استاد یوسف علی خاں کے توسط سے ہوئی، جو ستار نوازی میں شہرۂ آفاق تھے چنانچہ ان ہی کے مطابق آزادی سے قبل کے لکھنؤ میں گائکی کے سب سے مستند خلیفہ احمد حسین صاحب تھے۔ ۱۹۳۰ء کے دہے میں ان کی سارے ہندستان میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ افسوس کہ ان کی گلوکاری کے ریکارڈ نہ بن سکے۔ اس زمانے میں ویڈیو کا چلن نہ تھا کہ ان کا فن محفوظ کر لیا جاتا۔

ایک اور عظیم فن کار اُستاد چھنو خاں تھے۔ بڑی پُر اسرار کہانیاں ان سے منسوب تھیں۔ وہ سرود بجانے میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ غریب ذی تھے۔ نہ جانے کیسے ایک سرود حاصل کر لیا تھا۔ وہ جب بجاتے بجاتے کہیں سے ٹوٹ جاتا تھا تو اس پر پھلی یا کسی اور چیز کا پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ دن بھر لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتے تھے اور نہ جانے کیا راز تھا کہ دکانوں پر سائن بورڈ لگا ہوتا تھا انھیں جھک کر سلام کرتے تھے۔

سرود کے علاوہ انھیں جس دوسری چیز سے عشق تھا، وہ افیم تھی۔ دن بھر بھٹکنے کے بعد رات کو کسی مسجد میں سو جاتے تھے۔ لیکن لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا تھا اور کہتا تھا کہ سرود استاد چھنو خاں کے لئے ہی ایجاد ہوا تھا۔

ان کے ایک دوست برکت خاں صاحب نے ان کے لیے ایک نفیس جوڑا بنوا دیا تھا جو صرف اس وقت پہنتے تھے جب کسی نواب یا رئیس کی محفل میں سرود نوازی کے لیے بُلائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ افیم اس قدر کھاتے تھے کہ اکثر محفلوں میں سرود بجاتے بجاتے پینک میں غافل ہو جاتے تھے۔ طبلے والا طبلہ بجاتا ہی رہتا تھا اور سرود اچانک خاموش ہو جاتا تھا۔ پھر جب برکت خاں انھیں ٹہوکا دیتے تو وہ چونک کر سرود بجانا شروع کرتے تھے اور مزا یہ کہ غفلت سے چونکنے کے بعد بھی ٹھیک سم پر ہی آتے تھے۔ لوگ جو پیسہ نذر کرتے تھے وہ برکت خاں کی جیب میں جاتا اور افیم کا ایک بڑا سا گولا اُستاد چھنو خاں کے حصے میں۔

دراصل یہ افیم بازی بھی اس بے حسی کی وجہ سے ہوتی تھی، جو معاشرہ میں ان کے فن کے تعلق سے عام تھی۔ یہ فن کار جانتے تھے کہ دنیا ان کے فن کی وہ قدر نہیں کرتی جو کرنی چاہیے اس لیے وہ اپنی اس دنیا میں کھوئے رہنا چاہتے تھے جہاں وہ آپ ہی فن کار تھے اور آپ ہی قدرداں۔ اس دُنیا پر ان کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہوتا تھا۔ اس دنیا میں داخلے کا واحد دروازہ اس زمانے میں افیم کی کنجی ہی سے کھلا کرتا تھا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اپنے استاد ہی سے میں نے ایک اور استاد کی کہانی سنی تھی جن کا نام نامی بھی کہیں فراموشی کی گرد تلے دب کر رہ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ استاد بھی اپنے وقت کے خلیفہ تھے۔ لیکن کسی کو شاگرد نہیں بناتے تھے۔ مگر فن کا دیوانہ ایک لڑکا کچھ اس طرح ان کے پیچھے پڑا کہ انھیں پہلی بار ہار ماننا پڑی۔ استاد نے اس شرط پر اسے شاگردی میں لینا قبول کیا کہ وہ گانا سیکھ تو لے گا لیکن کسی محفل میں کبھی گائے گا نہیں۔ عجیب شرط تھی، مگر شاگرد کو ماننا پڑی۔

استاد نے اسے اپنے بچوں کی طرح گھر میں رکھا، پالا پوسا اور برسوں سکھایا۔ شاگرد ایسا تیار ہوا کہ چاروں طرف اس کے گلے کی دھوم مچ گئی۔

ایک بار کوئی ایسی محفل جمنے والی تھی جس میں بڑے بڑے باکمال استادانِ فن آنے والے تھے۔ یار دوستوں نے لڑکے کو چڑھایا کہ اگر اس محفل میں گا دے گا تو دنیا بھر میں ڈنکا بج جائے گا۔ شاگرد بھی اپنے فن کا کمال دکھانے کو بے تاب تھا۔ استاد کے پاس گیا اور گانے کی اجازت مانگی، ہاتھ پاؤں جوڑے اور بڑی منت سماجت کے بعد استاد نے پھر اس شرط پر گانے کی اجازت دی کہ وہ خود بھی محفل میں شریک ہوں گے۔ اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں شاگرد فوراً راضی ہو گیا۔ استاد اور شاگرد محفل میں گئے۔ شاگرد کی باری آئی تو استاد اس کے آگے فرش پر اپنا گمچھا بچھا کر بیٹھ گئے۔ گانے پر غلغلہ بلند ہوا اور لوگوں نے داد کے ڈونگرے برسائے، اسے استاد اپنے ہاتھوں سے یوں گوچتے تھے جیسے مداری سکوں کو یا کرکٹ کا کھلاڑی گیند کو گوچتا ہے۔ گوچ کر اسے گمچھے میں ڈالتے تھے۔ گانے کے خاتمے پر انھوں نے گمچھے کی گٹھری باندھی اور اسے اپنی پیٹھ پر یوں لادا جیسے مزدور گیہوں کی بوری لادتا ہے۔ شاگرد کے پوچھنے پر انھوں نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ اس گٹھری میں اس کے فن کا صلہ بند ہے اور اب اس سے ضروریاتِ زندگی پوری کی جائیں گی، آب و دانہ خریدا جائے گا، کپڑے سلوائے جائیں گے اور گھر بنایا جائے گا۔ پھر ڈانٹ کر کہا کہ اسی لیے محفل میں گانے سے منع کیا تھا۔ یہاں صرف فن کو داد ملتی ہے، فن کار کو روزی نہیں۔

دراصل اسی بے حسی نے بہت سے فن کاروں کو استاد چھنو خاں کی روش پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بہت سے استادانِ فن ان حوصلہ شکن حالات کے باوصف کسبِ کمال میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں استاد بڑے آغا خاں کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ موسیقی کے پروفیسر اور میرٹ کالج کے پرنسپل تھے اور انھوں نے اس فن کو سماجی مرتبت دلانے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ انھوں نے ہی لکھنؤ میں گائکی کا چلن بھی عام کیا۔

طبلہ نوازی میں اُستاد عابد حسین کے لیے یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے وقت میں سارے ملک میں کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ اچھے اچھے رقاص اور موسیقار ان کی سنگت سے گھبراتے تھے۔ ان کی گدی ان کے داماد واجد حسین کو ملی جن کے نام کا آج تک شہرہ ہے۔

اُستاد عابد حسین کا ایک قصہ بہت مشہور ہوا۔ ان کے زمانے میں کتھک کے ایک رقاص استاد بھورے خاں (راجستھان) کی سارے ہندستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، اچھے اچھے طبلہ نوازوں کو ان کا نام سُن کر پسینہ آجاتا تھا۔ ایک بار وہ لکھنؤ آئے اور انھوں نے چیلنج کیا کہ جس کو اپنی طبلہ نوازی پر ناز ہو، وہ سامنے آئے اور جسے اپنی آبرو رکھنی ہو بہتر ہے طبلہ لے کر رخصت ہو جائے۔ محفل میں استاد عابد حسین موجود تھے اور جانتے تھے کہ بھورے خاں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے غرور نہیں بلکہ خود اعتمادی اور برسوں کا ریاض ہے۔ لوگوں نے ان سے چیلنج قبول کرنے کے لیے کہا۔ واجد حسین اس وقت تک نوآموز تھے اور تعلیم سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔ استاد عابد حسین نے بھورے خاں سے دوست ہونے کے ناطے گزارش کی کہ پہلے وہ اس بچے کا دل بڑھانے کے لئے ایک چھوٹا سا موقع دیں تاکہ بچہ تازندگی اپنے نصیب پر ناز کر سکے کہ اسے بھورے خاں جیسے عظیم رقاص کے ساتھ سنگت کا موقع ملا تھا۔

بھورے خاں راضی ہو گئے۔ بچے کا دل رکھنے کے لیے انھوں نے دو چار توڑے پیش کر دیے۔ پھر اُستاد عابد حسین سے کہا:

"آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ اب آپ میدان میں آئیے۔"

استاد عابد حسین اس اثنا میں بھورے خاں کے توڑوں کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اسٹیج پر آئے اور اپنے طبلے پر ایک چکردار پرن بجائی اور کہا کہ "بھورے خاں کا سارا کمالِ رقص اس پرن کے دائرے میں اسیر ہے۔ اب وہ چاہے جہاں سے آغاز کریں، ہم پر یہیں آئیں گے۔"

بھورے خاں نے انھیں گلے لگا لیا اور کہا کہ صرف اُن کا سا باکمال استاد اس ترکیب سے ان کے رقص کی حدوں کو بندی بنا سکتا تھا۔

ستار نوازی میں استاد مروت حسین خاں کی دھوم تھی۔ انھوں نے ستار ہی پر ٹھمری اور دادرے کے ایسے بول بنائے تھے جنھیں ہر گانے والا گاتا تھا۔ لائے بریلی کے رہنے والے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے لکھنؤ جب کبھی آتے تھے صرف کسی مسجد ہی میں ٹھہرتے تھے۔

ایک بار کسی محفل میں پاس ہی ایک ہارمونیم والا بیٹھا تھا۔ بات کرتے اس کے ہارمونیم پر انگلیاں پھیرنے لگے۔ اس نے طنز سے کہا:

"استاد! یہ ستار نہیں ہارمونیم ہے، ہر کوئی نہیں بجا سکتا۔"

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ڈاکٹر حبیب نثار

شاہانِ اودھ اور موسیقی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہوتی چلی گئی اور ایک سو پچاس برس بعد ختم ہوگئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے پندرہ برس بعد محمد امین نیشاپوری، سعادت خان برہان الملک نے ۱۷۲۲ء میں سلطنتِ اودھ کی بنیاد ڈالی۔ برہان الملک نے بنگلہ، فیض آباد کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ انھیں اپنی نو تعمیر سلطنت کے انتظام و انصرام ہی سے فرصت نہ ملی تھی کہ موت کا بلاوا آگیا۔

اودھ کی سرزمین یوں بھی فنونِ لطیفہ کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی تھی۔ بلگرام کے علاقے سے نہ صرف معتبر شاعر پیدا ہوئے بلکہ معروف موسیقاروں نے بھی جنم لیا۔ عہدِ شاہجہاں میں مدلا نائک نے بلگرام ہی کی سرزمین سے اٹھ کر موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کیا تھا۔ موسیقی میں نائک کا درجہ رکھتے تھے۔ شاہجہاں کے لاکھ چاہنے کے باوجود دربار کا رُخ کرنا پسند نہ کیا۔ میر عبدالواحد بلگرامی عہدِ عالمگیر میں معروف تھے موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی کو موسیقی میں اس حد تک دسترس حاصل تھی کہ انھیں خسروِ ثانی کہا جاتا تھا۔ اس فن سے ان کی واقفیت کا ثبوت ان کی مثنوی "دو کتخدائی فرخ سیر" سے ملتا ہے۔ لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل بھی موسیقی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"بحرالعلوم کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فن موسیقی میں اُن کا رسوخ عام طور پر مسلّم تھا۔"

برہان الملک کے بعد ان کے داماد صفدر جنگ تخت نشین ہوئے۔ صفدر جنگ کو بھی اپنی سلطنت کے در و بست نے فرصت نہ دی علاوہ ازیں ان کا زیادہ وقت دہلی میں گزرا جس کی وجہ سے اپنی سلطنت کی تعمیر پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ لیکن تاریخ کے پوشیدہ اوراق شاہد ہیں کہ صفدر جنگ موسیقی سے اچھی طرح واقف ہی نہ تھے بلکہ خود بھی اس میں دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ موسیقی سننا ان کا معمول تھا۔ صفدر جنگ کے لیے موسیقی سے محظوظ ہونا صرف ایک شغلہ نہ تھا بلکہ روح کو تازگی بخشنے کا ایک وسیلہ بھی تھا بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

"صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔"

صفدر جنگ کی وفات کے بعد شجاع الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں سلطنتِ اودھ کی تہذیبی زندگی پر بہار آنے لگی۔ دہلی کے بار بار لٹنے کی وجہ سے وہاں کے فنکار اودھ کا رُخ کرنے لگے۔ سعادت خان برہان الملک اور صفدر جنگ نے مغل شہنشاہ سے ربط ضبط برقرار رکھا تھا اور ان کی سلطنت ایک طرح سے نیم آزاد تھی۔

———— جس زمانے میں مغل شہنشاہ افغانوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں دہلی کے برباد ہونے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ شجاع الدولہ بہادر اپنی سلطنت کی خوشحالی پر نازاں تھے۔ ان کے عہد میں موسیقی کے فنکار ہندوستان کے گوشے گوشے سے فیض آباد چلے آرہے تھے اور حقیقتاً شجاع الدولہ بہادر موسیقی کے فنکاروں کو نوازنے میں شہنشاہ دہلی پر سبقت لے جا رہا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے شجاع الدولہ کی نوازشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سلطنتِ اودھ کے سماجی پس منظر کا بیان کیا ہے اور موسیقی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لا کے اکٹھا کر دیا۔ یہاں اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پرانے اسکول قائم ہی تھے۔ جونپور کے مشرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگاریں بھی باقی تھیں۔ ان میں جب دہلی کے باکمال گویے اور تانسین خاندان کے مستند اُستادانِ موسیقی بھی آکے مل گئے تو خاص شان

پیدا ہو گئی اور موسیقی کا دراصل ایک نیا دور شروع ہو گیا۔"

دہلی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اور شاہ عالم کے عہد سے قبل فن موسیقی میں جو ابتذال آگیا تھا اس کی وجہ سے اس فن کے ماہرین (جنھیں فن کی پاکیزگی عزیز تھی) ہجرت پر مجبور ہو گئے، علاوہ ازیں محمد شاہ نے نادر شاہ کے حملے کی بنا پر جب موسیقی سننے سے پرہیز کیا تو بیشتر فنکاروں نے اودھ کا رُخ کیا۔ کچھ پنجاب گئے، کچھ بڑودہ اور کچھ نے اورنگ آباد کا رُخ کیا۔ شرر نے متذکرہ بالا اقتباس میں دہلی سے، ہجرت کرنے والے انہی فنکاروں کا بیان کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صفدر حسین خود شجاع الدولہ بھی فن موسیقی میں ماہر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک ہم عصر کا بیان ہے کہ شجاع الدولہ موسیقی کے شوقین ہونے کے علاوہ خود بھی اس فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔"

موسیقی اور عہد شجاع الدولہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شہر میں تمام رات گھنگھروؤں کی جھنکار سُنائی دیتی تو صبح سویرے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی دھول اور گرد و غبار سے آسمان ڈھک جاتا۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ بارہ سو طائفے شجاع الدولہ کی سواری کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان میں بیشتر سازندے گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔

میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں شہزادہ بے نظیر کی سواری کا بیان کرتے ہوئے شہزادہ کے ہمراہ گھوڑوں پر سازندوں کا ہونا بیان کیا ہے ملاحظہ ہو:

"وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی   قدم با قدم بالباس زری
بجاتے ہوئے شادیانے تمام   چلے آگے آگے ملے شادکام"

میر حسن کا یہ بیان دراصل شجاع الدولہ بہادر ہی کے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ شہزادہ کی سواری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا کہ میر حسن اپنی مثنوی سحر البیان شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ سحر البیان میں عہد شجاع الدولہ کے بزم کا بیان ملتا ہے اور سودا کے قصیدہ میں عہد شجاع الدولہ کی رزم آرائیوں میں موسیقی کے سُروں کی چلت پھرت کا بیان ملتا ہے۔ ان تخلیقات کے بہ غور مطالعے سے عہد شجاع الدولہ میں موسیقی کے وجود اور ترقی و ترویج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ موسیقی کے یہ والد وشیدا تھے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے موسیقی کو دربار کے ایوانوں سے نکال کر تہواروں کے سٹیج پر عوام سے روشناس کرایا۔ انھوں نے موسم اور تہواروں کے موقع پر رقص اور موسیقی کی محفلیں آراستہ کیں۔ چنانچہ ہولی، بہار، بسنت پر جشن منائے جاتے۔ عوام نے اس جدت کو پسند کیا۔ اور روایت کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ان محفلوں میں عوام کے ہر طبقہ کے لوگ جوش و خروش سے شریک ہوتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ آصف الدولہ کی یہ کوشش آج کی اصطلاح میں قومی یک جہتی کو مضبوط بنانے کا عمل تھا۔ اس موقع پر راگ / راگنی کے تحت بسنت لکھے جاتے جنھیں، موسیقی کے سازوں کے ساتھ گایا جاتا۔ ہولی کے موقع پر ہولی لکھی جاتی اس کا خصوصی موضوع کرشن کنھیا اور رادھا کے عشق کی داستان ہوتی اور حیدر خاں انھیں گاتے تو آسمان پر پرندے پرواز بھول جاتے۔ آصف الدولہ کی ہولی کے بیان میں استاد محترم پروفیسر سید مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں:-

"نواب آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ تمام رعایا ہولی کھیلتی ہے...... جب یہ سماں طاری ہوتا ہے تو نواب کی نذر کے لیے اہل فرنگ آتش بازی لے کر آتے ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان حکمراں صرف رسمی طور پر ہولی نہیں مناتے تھے بلکہ اسے اپنا خاص تیوہار مانتے تھے۔"

آصف الدولہ کے زمانے میں موسیقی پر بیشتر کتابیں لکھی گئیں جن کے صرف نام ہی ہم تک پہونچے ہیں۔ لیکن جو سب سے اہم کتاب آصف الدولہ کے عہد میں لکھی گئی اور ان ہی کے نام سے منسوب کی گئی وہ آج بھی مل جاتی ہے یعنی "اصول النغمات الآصفیہ" کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں اس کتاب کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو چھوٹی تقطیع پر بہت ہی دبیز تحریر میں نقل ہوا ہے۔

"اصول النغمات الآصفیہ" وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس پر آج کا تمام فن موسیقی انحصار کرتا ہے۔ جس پر موجودہ موسیقی کے نظریات اور گائیکی کا دارومدار ہے۔" یہ کتاب جتنی مشہور اور معروف ہے اس کے مصنف کے بارے میں معلومات اتنی ہی کم دستیاب ہوتی ہیں۔" صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد رضا خاں تھے اور اس کا سنہ تصنیف

۱۸۱۳ء سے:

محمد رضا خاں نے موسیقی کا فن خواجہ حسن مودودی سے حاصل کیا تھا۔ جو نواب آصف الدولہ کے عہد میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے — نواب آصف الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ اس فن میں اپنے عہد کے یکتائے تنہا سمجھے جاتے تھے کہ "بڑے بڑے قوالوں اور کلاونتوں سے بازی لے جاتے تھے" عہد آصفی کی مشہور خواتین موسیقاروں کے ضمن میں بڑی مصدی اور شمشیر رحان کا نام لیا جاتا ہے جو خیال گانے میں بے نظیر تھیں۔

خواجہ حسن مودودی نے کافی طویل عمر پائی چنانچہ عہد نواب سعادت علی خاں میں انھیں دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شجاع الدولہ بہادر اور آصف الدولہ ہی کی طرح سعادت علی خاں بھی سرود و نغمہ کے شائق تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ جس کمرے میں کاغذات دیکھتے تھے اس میں ایک طرف طوائفوں اور رقاصاؤں کی چوکی بھی ہوتی تھی چنانچہ جب سعادت علی خاں کاغذات دیکھتے دیکھتے تھک جاتے یا اکتا جاتے تو موسیقی و رقص کے سُر اور لے سے دل و دماغ کو تازہ کرتے تھے۔

اس زمانے میں راگنی بھیرویں بہت مشہور ہوئی تھی اس سلسلہ میں مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

"سعادت علی خاں کے زمانے ہی سے بڑے بڑے عالم و فاضل بھیرویں سننے کے شیدائی تھے۔ راقم کے مورث اعلا خان علامہ نواب تفضل حسین خاں نمازِ صبح کے بعد بھیرویں سنتے تھے"

اور مولانا ابوالکلام آزاد تفضل حسین خاں کے ذوق موسیقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اودھ کی نوابی کے دور میں تفضل حسین خاں علامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی، شوستری صاحب 'تحفۃ العالم' کلکتہ میں ان سے ملا تھا جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے وہ لکھتا ہے — تمام علوم عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی بدرجہ اجتہاد رکھتے ہیں اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں — ایک ماہر فن ساز نواز صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خوابگاہ میں خواب آور گیت چھیڑ دیا کرے"

شوستری کی تحریر اور مرزا جعفر حسین کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ نہ صرف موسیقی کے علمی پہلو ہی سے واقف تھے بلکہ موسیقی کے فلسفیانہ نکات پر بھی ان کی نظر تھی۔ شب کو خواب آور گیت سننا اور صبح بھیرویں سننے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علامہ "راگ مالا" سے بھی واقفیت رکھتے تھے کیونکہ بغیر راگ مالا کے نکات سمجھے کسی فرد کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سُروں کی کیفیات کو جان لے۔

غازی الدین حیدر کا عہد حکومت مختصر تھا لیکن اودھ کی موسیقی کے باب میں یہ زمانہ بڑا مبارک و مسعود قرار دیا جائے گا کیونکہ غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت میں میاں شوری نے سرحد کے لوک گیت ٹپہ کو ہندستانی موسیقی سے روشناس کروایا اور اس صنف کو پروان بھی چڑھایا۔ غازی الدین حیدر ہی کے زمانے میں بڑے حیدر خاں جیسا خیال گانے والا گذرا ہے جس نے نواب اودھ کو دوبارہ دربار میں مدعو کرنے سے باز رہنے کی التجا کی تھی۔ حیدر خاں اپنے فن میں انتہائی پختگی رکھتا تھا اسی لیے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بڑے موسیقی کی دنیا کا عام لقب ہے جو مرہٹی سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'خود سرا استاد فن' کے ہوتے ہیں یعنی ایسا فن کار جسے اپنے فن کی خوبیوں کا علم ہو اور جو دوسروں کی فنی کمزوریوں کو ایک لمحہ برداشت نہ کرتا ہو۔

غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا بھی رواج ہوا اور مرثیہ خوانی و سوز خوانی اب موسیقی کے اصولوں کے موافق اور مطابق ہونے لگی۔ اس زمانے میں ایسے ایسے اہل فن، سوز خواں پیدا ہوئے کہ بڑے بڑے موسیقی کے فن کار انھیں سُن کر کان پکڑتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور 'فسانۂ عجائب' میں لکھتے ہیں:

"مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلّم الثبوت اُستاد کہا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا اس طرح کا دھرپد، خیال، ٹپہ گایا اور بتایا کہ کبھی کسی نائک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا پھولا پھلا وہ اس کا پیرو ہوا۔ اور جس نے ڈھنگ جُدا کیا وہ ٹکسال باہر بے ڈھنگ

ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا ...... بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا، مولوی سب میں برنزاد ہوا۔"

جناب امداد امام اثر نے اپنی تصنیف کاشف الحقائق میں بھی میر علی سوز خواں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ علاوہ ازیں شاد عظیم آبادی نے میر علی سوز خوان کے علاوہ میر علی حسن و میر بندہ حسن لکھنوی سوز خوان کا ذکر کیا ہے۔ میر علی سوز خواں کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جب میر ضمیر کا مرثیہ ع
پسیدۂ صبح کا جب رن میں آشکار ہوا۔ الخ بھیروں میں پڑھا تو سیکڑوں کو غش آگیا۔ اور برسوں تک لوگ اس کا مزا لیتے رہے۔"

شاد عظیم آبادی نے جو کچھ لکھا ہے وہ صد فی صد صحیح ہو سکتا ہے اور اس مرثیہ کے جادو نے سننے والوں کے سر پر چڑھ کر اس لیے اثر کیا ہوگا کہ میر ضمیر نے اپنے مرثیہ کے چہرہ میں صبح کا منظر بیان کیا ہے اور بھیروں صبح گائی جانے والی راگنی ہے۔ راگنی کا تور سُر اور صبح کے منظر نے یقیناً "سماں اور سماع" باندھ دیا ہوگا۔ شاد عظیم آبادی کے بیان کے تناظر میں مرزا جعفر حسین کی تحریر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس عہد میں بھیروں کا چلن بہت ہو گیا تھا اور خان علامہ تفضل حسین بھیروں بڑے ذوق و شوق سے سُنا کرتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سوز خوانی کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

"سوز خوانوں کا اصول تھا کہ جب ابتدا میں وہ کسی کا مرثیہ پڑھتے تھے تو پھر دوسرے شاعر/ مرثیہ نگار کے سوز کو ہرگز نہ پڑھتے تھے۔"

گویا کتاب ناجو اور بینی کے مصنف کا دور آتے آتے مرثیہ خوانی نے موسیقی کو تقدس اور پاکیزگی عطا کر دی تھی ـــ اور اس کا اصطلاحی نام سوز پڑ گیا تھا۔ یہاں مذہب کی طرف سے موسیقی کو سندِ اعتبار ملی تھی۔ چنانچہ سوز خوانی اپنے عروج پر پہونچی ـــ

اس پس منظر میں واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موسیقی اپنی اصلی کیفیت و ماہیت کی طرف واپس آگئی تھی۔ دربار سے وابستہ فنکاران موسیقی اس فن کو اس کی پوری پاکیزگی و طہارت کے ساتھ برت رہا تھا جبکہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر اُسے آسان اور پُر لطف بنانے میں مصروف تھے۔ واجد علی شاہ نے فن موسیقی اپنے وقت کے نامور استاد باسط خاں سے سیکھا تھا۔ واجد علی شاہ اختر، فن موسیقی پر اس حد تک دسترس رکھتے تھے کہ ان کے ہم عصر مصنفین انھیں اپنے عہد کا سب سے بہتر فنکار قرار دیتے ہیں اور ان کی مہارتِ فن کا بیان کرتے جاتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"عہد واجد علی شاہ میں پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں اور محمد علی خاں، خاندانِ تان سین کے افراد تھے۔ (یہ تمام فنکار) نعمت خاں اور باسط خاں کے شاگرد تھے۔ گوہر جان لکھنوی مٹیا برج کی ایک محفل میں تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو بجایا کی کہ تمام اہل کمال دنگ رہ گئے۔ نجبن، ٹپّہ گانے میں فرد تھی۔ نظام الدین احمد خاں، محمد احمد خاں، حیدر علی خاں، جھو خاں عہدِ واجدی میں موسیقی کے ماہرین شمار ہوتے تھے۔ شوری ٹپّہ گانے میں بے مثل تھا۔ والا قدر نواب وزیر مرزا بہادر ٹھمری گانے میں مشہور تھے۔ ڈولے خاں لکھنوی، ہوری اور دھرپد گانے کا استاد تھا۔ نواب گیتی آرا بیگم، نواب حضور عالم، وزیر اعظم کی صاحبزادی تھی، جلترنگ بے مثال بجاتی تھی۔ مہدی حسن خاں ...... بین بجانے میں برصغیر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسماۃ شرعی دریا آبادی، حسین بخش لکھنوی کی شاگرد تھی۔ موسیقی دانی کے ساتھ سارنگی بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔"

مٹیا برج میں واجد علی شاہ اختر اور ان کے فنکاروں کے بارے میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"مٹیا برج میں احمد خاں، تاج خاں، غلام حسین خاں باکمال گویے تھے۔ ولی خاں اپنے سحر آفرین گلے کی وجہ سے کلکتہ میں مشہور تھا۔ زہرہ اور مشتری گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ بی حیدر کا سوز سننے کے لیے محرم میں لوگ گھنٹوں انتظار کرتے تھے۔ محمد جی کے مقابل میں سارے ہندوستان میں کوئی کامل طبلہ نواز نہیں تھا۔"

واجد علی شاہ کتھک بہت اچھا کرتے تھے۔ اپنی تصنیف بجو

انھوں نے نغمۂ جات بناتے ہوئے کتھک کے بھاؤ قلم بند کیے ہیں" طبلہ خوب بجاتے تھے۔ لے کاری میں ان کا جواب نہ تھا۔ "کتاب ناجو اور بنی" میں شاہ اختر نے طبلہ کی مختلف گتیں اور تالیں درج کیے ہیں۔ "ٹپّہ" ٹھمری، خیال ایسا گاتے کہ اگر تان میں ہوتا کان پکڑتا اور وہ مرنا سیکھ کبھی رچھتا۔ موسیقی کے ان تمام اصناف نغمہ و ساز کے باج کی تفصیل واجد علی شاہ نے اپنی تصانیف "کتاب ناجو" "دُلھن" اور "بنی" میں درج کی ہے۔ جن کے مطالعہ سے واجد علی شاہ کے فن اور ان کی جانکاری پر روشنی پڑتی ہے۔

اودھ میں موسیقی کی ترقی و ترویج اور موسیقی کا ارتقاء ہندوستانی موسیقی کے لیے بیش بہا اضافہ ہے۔ اودھ نے ہندوستانی موسیقی کو ٹپّہ، ٹھمری اور دادرا جیسے اصناف نغمہ عطا کیے اور فن طبلہ کو پورا ایک دبستان فرخ آبادی باج عطا کیا۔ علاوہ ازیں سوز خوانی کی صورت میں موسیقی ہند پر سے مذہبی قیود کو ختم کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ہندوستانی موسیقی کی تاریخ کا کوئی بھی طالب علم یا مؤرخ ـــ اودھ میں موسیقی کے ارتقاء کو بیان کیے بغیر ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ قلمبند کر ہی نہیں سکتا۔

کتابیات :

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد "غبار خاطر" مرتبہ مالک رام
۲۔ مولانا عبدالحلیم شرر "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"
۳۔ ڈاکٹر صفدر حسین "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" ــ تاریخ تمدن اور تہذیب
۴۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ"
۵۔ میر حسن دہلوی "سحر البیان"
۶۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی "اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر"
۷۔ مرزا جعفر حسین "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار"
۸۔ عزیزہ بیگم "اصول النغمات الآصفیہ" مضمون مشمولہ ... "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" فارسی ادب جلد سوم
۹۔ مرزا رجب علی بیگ سرور "فسانۂ آزاد" مرتبہ محمود اکبرآبادی
۱۰۔ امداد امام اثر "کاشف الحقائق" مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی
۱۱۔ شاد عظیم آبادی "فکر بلیغ" مرتبہ نقی محمد ارشاد

لکھنؤ کی گائکی ـــــ ص ۲۴۵ کا بقیہ

بس رال کو لگ گئی۔ خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا۔ چھت کے کنڈے سے بال باندھ کر، ہاتھ میں گرو ڈال کر جو ہارمونیم کا ریاض شروع کیا تو چار سال اسی عالم میں گزار دیے۔ چار سال بعد حال یہ ہوا کہ کثرت ریاض سے ہاتھ ٹیڑھا ہو گیا لیکن ہارمونیم غلام بن چکا تھا۔

ستار نوازی میں میرے استاد محترم یوسف علی خاں صاحب کا نام ایک روایت کی حیثیت رکھتا تھا۔ سرود نوازی میں سخاوت حسین خاں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو فن کو دولت بٹورنے کا ذریعہ نہ بنا سکے۔ انھیں تو صرف یہ دھن تھی کہ اپنے اپنے فن میں یوں ڈوب جائیں کہ "من تو شدی تو من شدم" کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

لکھنؤ کے ساتھ اگر بنارس اور رقص کا نام نہ لیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ جہاں گائکی کے میدان میں سدھیشوری بائی اور رسولن بائی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ چوکھٹ چومے بغیر چھوڑی جا سکتی ہے کہ بیگم اختر فیض آبادی ان ہی کے لگائے چمن کا معطر پھول ہیں۔ رقص میں جادوگری کا درجہ پانے والا ایک گھرانہ تھا جس کے چشم و چراغ آج بھی زندہ ہیں۔ خدا انھیں لمبی عمر دے۔ یہ گھرانہ کالکا بندادین کا تھا۔ کتھک کا یہ گھرانہ اختر پیا کی اندر سبھا کا صحیح وارث بھی تھا اور اس نے خود کو اس تاجداری کا حقدار ثابت بھی کیا۔

ہندوستان میں رقص کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہندو روایات میں اس کا درجہ زمین نہیں آسمان ہے۔ بھارت ناٹیم، کتھاکلی، کچی پڑی اور منی پوری رقص دیوی دیوتاؤں کی پاکیزہ زندگی کا آئینہ ہیں۔ واجد علی شاہ نے کتھاکلی کو آسمان سے زمین پر اتارا، اس کی پاکیزگی میں انسانی جذبات اور احساسات کا رس گھولا اور اس کا نام کتھک رکھا۔

اس روایت کو آگے بڑھایا کالکا بندادین کے گھرانے نے۔ اسی گھرانے کی وجہ سے کتھک میں ٹھمری کے رنگ بھاؤ دکھانے کا چلن نکلا۔ کتھک کے میدان میں کالکا بندادین کا درجہ جگت گرو کا ہے۔

کاش آج کا لکھنؤ اس وراثت کو سنبھال سکتا۔

تجمل خاں

اودھ کے سِتار نواز ▫ لکھنؤ گھرانہ

جناب تجمل خاں صاحب ستار کے ماہر ہیں اور فی الوقت لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہاودیالیہ کے پرنسپل ہیں۔ ان کی ولادت ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ موسیقی کی تعلیم اپنے والد اُستاد رحمت حسین خاں اور بڑے بھائی اُستاد بشارت حسین خاں سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُستاد کرامت اللہ خاں کے شاگرد خاص الٰہ آباد کے پروفیسر بنواری لال جی اور بمبئی کے اروند پاریکھ صاحب سے بھی ستار بجانا سیکھا۔ ۱۹۵۶ء میں استاد کی حیثیت سے سنگیت کی دُنیا میں قدم رکھا اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پریاگ سنگیت سمیتی الٰہ آباد بعد ازاں بی۔ آر۔ پی کالج جونپور میں تین برس تک قیام رہا ہے۔

والد کی وفات کے بعد آکاش وانی لکھنؤ میں اور پھر شملہ میں اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔

سپتک تنتریکا (सप्त तंत्रिका) دو جلدیں اور سنگیت کے قدیم وجدید تاریخ (संगीत युग युग) پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دادا کی تصنیف 'معلّم نغمات' کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ گھرانے دار کلاکار ہوتے ہوئے بھی سنگیت کے اہم ترین شعبے یعنی شاشتر کے ہر پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ (ا۔ ح)

جب ۱۷۷۵ء میں فیض آباد سے اودھ کی راجدھانی لکھنؤ منتقل ہوئی تو ملک کے بہت سے صاحبِ کمال فنکار سرپرستی کے لیے لکھنؤ آ گئے۔ جن میں پیار خاں، باسط خاں (رباب نواز) نعمت اللہ خاں (سرود نواز) جونپور کے باشندے محمد غلام رضا خاں (ستار نواز) لکھنؤ والے محمد حسین خاں (بین کار)، لکھنؤ کے استاد دولھے خاں (سادرہ گایک) وغیرہ کو نواب آصف الدولہ اور بعد میں نواب واجد علی شاہ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی حاصل ہوئی۔ [1]

اس کی بدولت لکھنؤ سنگیت کا مرکز بن گیا۔ مذکورہ بالا فنکاروں کی مشترکہ کوششوں سے لکھنؤ میں موسیقی کی خوب مقبولیت ہوئی اور سنگیت کے کئی نئے گھرانے وجود میں آئے۔ جیسے پیار خاں کے شاگرد برکت علی سانولیا خاں کا گھرانہ جو فرخ آباد گھرانہ تسلیم کیا گیا۔ استاد نعمت اللہ خاں کا گھرانہ، استاد محمد حسین خاں کا گھرانہ، جو لکھنؤ گھرانے کے تحت شمار کیا گیا۔ اِن کے علاوہ استاد عبدالغنی خاں اور یوسف علی خاں سے لکھنؤ میں ستار نوازی کی علیحدہ روایت قائم ہوئی۔

اِن کے علاوہ اُس عہد کے دیگر ستار نوازوں میں غلام محمد خاں، سجاد محمد خاں، غلام محمد خاں کے شاگرد نبی بخش ڈیرے دار، بریلی کے قطب الدولہ، نواب حشمت جنگ، نواب علی نقی خاں، پنا لعل باجپئی، ویدا رجن داس، بالو اپشٹو دی، پرساد، چھنے خاں، شری بنواری لال شریواستو اور استاد رحمت حسین خاں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فنکاروں نے ستار کے باج کو ترقی دینے اور مقبول بنانے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

محمد غلام رضا خاں

استاد محمد غلام رضا خاں جونپور کے باشندے تھے اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ آ کر بس گئے تھے۔ انھوں نے اُسی زمانے میں ایک کتاب ـــــ نغماتِ آصفی ـــــ تصنیف کی تھی۔ انھوں نے ستار کے

کی ابتدائی تعلیم بے پورے استاد سید خاں جی سے حاصل کی تھی۔

نوابوں کے درباروں اور رئیسوں کی محفلوں میں منعقد ہونے والی موسیقی کی بزم طرب میں استاد محمد غلام رضا خاں کو متواتر شرکت کرنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ ان محفلوں میں عموماً دھروپد یا خیال کی ٹھمری گائن کو زیادہ اہمیت اور اعزاز حاصل ہے۔ دُور رس صلاحیت کے مالک استاد محمد غلام رضا خاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب لکھنؤ کے نواب اور روسا سنجیدگی اور دھروپد کے ضابطوں کی پابند مسید خانی طرز سے مطمئن نہیں ہیں۔ اسی عوامی مقبولیت کی تبدیلی نے تیز رفتار دیگر گت شیلی ([illegible]) کے تصور کو جنم دیا۔ سامعین کی پسند اور ذہنیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے استاد محمد غلام رضا خاں نے ٹھمری اور ترانے جیسی چنچل شیلیوں ([illegible]) کی بنیاد پر درمیانی تین تال دستار خانی ٹھیکہ میں بجانے کے لائق ایک نئی گت شیلی ([illegible]) ایجاد کی جو انھیں کے نام سے یعنی رضا خانی باج کے نام سے آج بھی رائج ہے۔

کچھ ستار نوازوں کا خیال ہے کہ رضا خانی باج یا پوربی باج کی ایجاد ترقی شہرت و مقبولیت کا اعزاز صرف محمد غلام رضا خاں ہی کو حاصل نہیں ہے۔ ان کے ہی زمانے میں غلام محمد خاں سجاد محمد خاں پیار خاں، باسط خاں بالو ایشوری پرساد نواب حشمت جنگ قطب الدولہ لکھنؤ کے استاد محمد حسین خاں نعمت اللہ خاں وغیرہ متعدد ایسے فنکار بھی تھے جو رس باج کو پوری طرح فروغ دینے میں مشغول تھے اور ان سبھی کلا کاروں نے ستار خانی کے ٹھیکے کے تحت کئی گتوں ([illegible]) کی تخلیق کی تھی جو آج بھی ان لوگوں کے نام سے رائج ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے اس طرح کے باج کا تصور محمد رضا خاں نے کیا تھا اس لیے اس طرز ([illegible]) کا نام رضا خانی طرز پڑا۔ چونکہ پورب کے کئی فنکاران کمال کا بھی اس طرز کے فروغ میں ہاتھ تھا اس وجہ سے اسے پوربی باج بھی کہا گیا۔

ڈاکٹر لعل کانت رائے چودھری نے صاحب کی سالہ بجد مسید خاں نے مسید خانی باج کو اپنے گھرانے کے لئے محفوظ رکھا اور صادق علی خاں نے رضا خاں کا ایک نئی گت شیلی کی تخلیق کی جو بعد میں رضا خانی باج کے نام سے مشہور ہوئی۔

استاد محمد حسین خاں

استاد محمد حسین خاں کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۷۰ عیسوی میں ہوئی تھی۔

ان کے والد کا نام استاد دولھے خاں تھا، جو دھروپد، سادرہ، ہوری اور خیال گائیک تھے۔ استاد محمد حسین خاں کے بزرگوں میں مہدی حسن خاں، فدا حسین خاں، غلام عباس خاں اور غلام وارث علی خاں وغیرہ کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

استاد محمد حسین خاں کو اپنے ماموں استاد مہدی حسن خاں (جو حسن خاں انیٹھے ([illegible]) والے کے شاگرد تھے) سے بین کاری تعلیم ملی تھی اور گائن کی تعلیم اپنے والد استاد دولھے سے لی تھی۔ کچھ مدت تک الور ریاست میں رہے مگر دل نہیں لگا اور کچھ ہی دنوں بعد واپس لکھنؤ آگئے اور پھر یہیں رہے۔ استاد محمد حسین خاں خوددار اور آزاد مزاج تھے۔ لکھنؤ کے تھوڑے سے ہی رئیس ایسے تھے جن کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ٹھاکر نواب علی خاں نے بارہا ان کو اپنی محفلوں میں مدعو کیا اور ان کی بین نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ استاد محمد حسین خاں گاتے بھی بہت اچھا تھے۔ ٹھاکر نواب علی خاں نے اپنی کتاب معارف النغمات کی دوسری جلد میں ان کی بنائی ہوئی متعدد بندشوں کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر تخلیقات استاد محمد علی خاں (ننکو میاں ابن باسط خاں) کی ہیں۔ لیکن گائیک محمد حسین خاں (لکھنؤ) کے نام سے جو بندشیں ہیں وہ محمد حسین خاں بین کار کی بنائی ہوئی ہیں۔

استاد محمد حسین خاں لاولد تھے۔ اپنے بھائی خلیفہ احمد حسین کے بیٹے رحمت حسین خاں کو گود لے کر بیٹے کی طرح تعلیم دی تھی۔ انھیں بین بجانے اور گانے کے علاوہ ستار نوازی پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی۔ بین کار ہونے کے ناطے انھوں نے کبھی کسی محفل میں ستار بجانے کا فن پیش نہیں کیا بلکہ بہت سے لوگوں کو ستار بجانے کی تعلیم دی تھی جن میں استاد رحمت حسین خاں، ذی وین، سانیال، بشیر خاں، ٹوٹو دتہ (ستار سکھانے کی استاد شستی بھون، امر کالج لکھنؤ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ ہی میں ۱۹۶۲ عیسوی میں رحلت کی۔

رضا حسین خاں

دولھے خاں صاحب کے دوسرے بیٹے استاد رضا حسین خاں پہلے لکھنؤ میں اور پھر رام پور ریاست میں رہے۔ رام پور کے ذرائع نے بتایا کہ استاد رضا حسین خاں رام پور ریاست میں استاد کے عہدے پر تھے۔ وہ اپنے زمانے کے اچھے خیال گائیک تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے

عباس حسین خاں عرف اتن خاں ہی نے سنگیت کو پیشہ بنایا۔ یہ بھی خیال گایک تھے۔ ان کی بھی ایک بندش راجہ نواب علی خاں نے معارف النغمات جلد دوم کے صفحہ ۶۴ پر درج کی ہے۔ اتن خاں صاحب کے بیٹوں نے سنگیت کو بطور پیشہ نہیں اپنایا۔ ان کے خاص شاگردوں میں لکھنؤ کے سکندر حسین اور نواب و خاں (دونوں شہنائی نواز) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

استاد دولھے خاں کے تیسرے بیٹے باقر خاں بھی اعلیٰ پایہ کے گایک تھے۔ نوجوانی ہی میں فوت ہو گئے۔

استاد دولھے خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے خلیفہ احمد حسین خاں تھے۔ انھوں نے گانے کی تعلیم بڑے بھائی رضا حسین خاں اور والد سے حاصل کی۔ خلیفہ احمد حسین خاں اپنے زمانے کے اولین مسلمان استادوں میں سے تھے جن کو صوتی تحریر (स्वर लिपि) کا مکمل علم تھا۔ انھوں نے مروجہ راگوں میں دو سو استھائیاں (स्थायी) حفظ کی تھیں۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر اس زمانے کے صاحبانِ کمال نے انھیں لکھنؤ گھرانے (استاد دولھے خاں کا گھرانہ) کا خلیفہ قرار دیا تھا۔ انھوں نے متعدد لوگوں کو سنگیت کی تعلیم بھی دی تھی جن میں جلی نور رشید اللہ رکھتی بڑی اور چھوٹی مشتری بائی، قمر جہاں اور محمدی کی سلطی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان طوائفوں کو موسیقی کی تعلیم دینے ہی کی وجہ سے پیشہ ورانہ رقابت رکھنے والوں نے خلیفہ احمد حسین خاں کو یہ کہہ کر مشہور کر دیا کہ وہ صرف بائیوں ہی کے استاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹھاکر نواب علی خاں صاحب کے اٹھا نا تھ ٹلی اور دوسرے شوقین ناگر بھات کھنڈے کی خواہش پر ایک عرصے تک لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہاودیالیہ میں استاد کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں لکھنؤ کے اسّی فیصد پیشہ ور کلاکاروں کو گانے کی تعلیم دی تھی جن میں بسم اللہ خاں (شہنائی)، اقبال خاں، امجد خاں، امجد حیا پریا، مشرف خاں، تیغے خاں، جونپور کے محتشم حسین (مصنف انڈین میوزک، اردو) اور جہانگیر آباد کے راجہ اعزاز رسول صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ راجہ جہانگیر آباد کی فرمائش پر ایک کتاب "مُعلّم نغمات" تصنیف بھی کی تھی۔ انتہائی باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد غصے ور بھی تھے جس کی وجہ سے اس زمانے کے زیادہ تر با اثر لوگوں اور فنکاروں سے ان کی ان بن رہتی تھی اور یہی سبب ہے کہ خلیفہ احمد حسین خاں کو تاریخِ موسیقی کے صفحات میں جگہ نہیں ملی۔ ان کے اکلوتے بیٹے استاد رحمت حسین خاں تھے۔

استاد رحمت حسین خاں اچھے موسیقی نواز، اچھے معلّم اور اچھے موجد بھی تھے۔ ٹھمری انگ کی بنیاد پر ستار کے لئے موزوں مدھید لَے کی کئی گتوں کی بندش کی تھی۔ یہی نہیں ٹھمری انگ کی اُن گتوں کو بجانا بھی جانتے تھے جن میں زیادہ بول نہیں ہوتے۔ اُن کے بجانے میں خاص طور پر مَند سُوروں (मन्द स्वरों) کے آلاپ کی کثرت ہوتی تھی اور گت کاری میں مدھید لَے کی گتیں ہی زیادہ بجاتے تھے۔ ان کی گتوں کی خصوصیت گت کی تہائی بن کر آنا تھی۔ خاں صاحب نے بھی بہت سے لوگوں کو تعلیم دی تھی جن میں دل شاد پاوُلا، سرکار گوری شنکر، سپنا بھٹا چاریہ، بھولا ناتھ (دربھنگہ)، سورج نارائن لال، وِملا قالو، گمو اور بال کرشن نائر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں بعمر ۷۵ برس وفات پائی۔

بشارت حسین خاں (ستار)

اِن کی ولادت ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ستار بجانے کی تعلیم اپنے والد اور دادا خلیفہ محمد حسین خاں سے حاصل کی۔ محض بارہ برس کی عمر میں ستار نوازی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۲ء تک آکاش وانی کیندر لکھنؤ کے کلاکار رہے۔ بعد میں دس برس تک بمبئی فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اُس کے بعد نیروبی (کینیا، مشرقی افریقہ) میں ستار سکھانے کا ادارہ چلا رہے ہیں۔ پورے یوروپ میں ستار نوازی کے پروگرام پیش کر چکے ہیں۔ ستار نواز ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی ہیں۔ اہم شاگردوں میں لکھنؤ کے گوپال چکرورتی، نجون موہنی، نگم، مسز پارسی وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسیکل موسیقی کے علاوہ ہندوستانی سُگم سنگیت کے موجد ہیں اور دھن بجانے کے ماہر ہیں۔ ترانہ انگ کی رضاخانی گت نواز ہیں۔

حواشی

۱ معدن الموسیقی - کرم امام صفحہ ۲۵ - ۴۴ ۲ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶ [illegible] سنگیت بودھ صفحہ ۱۴۳ ۳ خسرو تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ ۲۰۳

۴ [illegible] کا ثبوت ہے۔ ۵ [illegible] سنگیت [illegible] صفحہ ۴ ۶ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶ ۷ معارف النغمات جلد دوم طبع اول [illegible]

۱۲۳ صفحہ ۲۵ [illegible] ۸ خسرو تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ [illegible]

سید مسعود

اودھ میں فنِ سپہ گری

انگریز سیاح ولیم ناٹن نے نصیر الدین حیدر کے عہد کا لکھنؤ دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"ڈریسڈن، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے، مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب کار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔

اوّلاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں، برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اور کچھ نہ نظر آئیں گے ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو کاروبار روز مرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار قبضے در باندھتے ہیں اور کچھ حضرات جب سیر و گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کریں، جیب و پہلو میں طمنچے کی جوڑی اور ڈھال ضرور لگائے ہوں گے۔ گینڈے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس پر چاندی کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر پشت جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے خوبصورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کی شکل سے پٹھانوں کی خود پسندی اور جوش خیر د آزمائی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

اگر کہیں اہل لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع کے ہیں، تعجب خیز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کمپنی کے فوجی جمعیت میں اودھ کے ہی پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطہ بنگالہ کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

باشندگان لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر کہ انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے طمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔"

اودھ کی جس پر تکلف، نرم و نازک تہذیبی فضا کا نقش ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، ناٹن کی پیش کی ہوئی فضا اس سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فن سپہ گری سے دلچسپی اور واقفیت اودھ کی تہذیب کا ایک اہم عنصر تھی اور یہاں کے بیشتر شہری اس فن میں دخل ضرور رکھتے تھے خواہ وہ اہل قلم ہوں یا اہل علم ہوں یا اہل حرفہ۔ اسی لیے یہاں کے ادب، خصوصاً داستان اور مرثیے میں رزمیہ عناصر کو بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس پرانے دور کے کئی ادبی مشاہیر فن سپہ گری سے خاص ربط رکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنے بارے میں بتاتے ہیں:

"ہم بھی کبھی ڈھال تلوار باندھتے تھے اور وہ کام کرتے تھے جس میں صدہا مرتے تھے، ہاتھ منہ کٹتے تھے۔"

غالباً [illegible] تھا کہ سرور قتل کے الزام میں ماخوذ ہو گئے تھے اور ان کو لکھنؤ سے جلاوطن ہونا پڑا تھا۔

خواجہ آتش کی سپاہی مزاجی اور بانکی طبیعت مشہور تھی۔ ایک بار وہ ایک مشاعرے میں بھری ہوئی قرابین لے کر گئے تھے اس لیے کہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ اس مشاعرے کے بانی نواب صاحب اس موقع پر ان کے ادبی حریف ناسخ کو خلعت دیں گے اور اس طرح آتش کی سبکی ہوگی۔ آتش کے تیور دیکھ کر نواب صاحب کو اسی وقت ان کے لیے بھی خلعت کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ ایک اور موقع پر انھوں نے تلوار کھینچ کر نصیر محمد خاں گویا کے سے زبردست سپہ گر کو مقابلے کے لیے للکار دیا تھا۔

خود گویا اودھ کے نامور ترین سپہ گروں میں تھے۔ نصیر الدین حیدر کی بادشاہی اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی وزارت کے زمانے میں فوجی افسروں کو ہتھیار باندھ کر دربار میں آنے کی ممانعت ہوئی تو گویا نے کہا،

"میں اہلِ جنگ کے زمرے میں ملازم ہوں، اگر ہتھیار کھول دوں گا تو کیا طبلہ اور سارنگی لے کر دربار میں حاضر ہوا کروں گا؟" اور دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ آخر ان کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا۔

میر انیس فنِ سپہ گری میں کمل مہارت رکھتے تھے۔ شہسواری اور سیف زنی کے علاوہ وہ بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ اس فن میں ان کے استاد میر امیر علی کا کہنا تھا کہ "اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں مدو شاہی یا بھوپال کے چار پیسے ڈال دیا جائے ... تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ بچا سکتے تھے اور ان کی چوٹ کو بنوٹ جاننے والوں کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا۔"

سید مسیح الحسن نقوی نے مراثی انیس کے رزمیہ حصوں کا مطالعہ کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انیس تمام رائج الوقت ہتھیاروں اور ان کے استعمال سے واقف تھے۔ اس زمانے کے پسندیدہ ترین ہتھیار تلوار کی تعریف انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں اس طرح کی ہے جیسے غزل میں معشوق کی تعریف کی جاتی ہے۔ ایک مجلس میں انیس نے خواجہ آتش کو خاص طور پر متوجہ کرکے جب تلوار کی تعریف میں یہ بیت پڑھی ؎

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

تو آتش وجد میں آکر نصف قد سے کھڑے ہوگئے۔

علمائے دین بھی سپہ گری کے ذوق سے بے بہرہ نہیں تھے اور ان میں سے کئی اس فن میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے وہ اس کی برسرِ عام نمائش نہیں کرتے تھے۔

بعض خواتین نے بھی سپہ گری میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ لکھنؤ کی ایک بیگم کا قصہ مشہور ہے کہ رات کو ان کے گھر میں چور اتر آئے تھے۔ انھوں نے مزاحمت کی تو چوروں نے ان پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بیگم نے لوٹنے پر وار کو روک کر ایسی ضربیں لگائیں کہ ایک ایک چور بے ہوش ہو گیا۔

لیکن سپہ گری میں افسانوی شہرت حاصل کرنے والا طبقہ بانکوں کا تھا۔ ان کی وضعداریوں اور سدھ بدھ کے بہت واقعات مشہور ہیں۔ بانکوں کا اس سماج میں بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار بھی ان کو طرح دے جاتے تھے۔ بانکوں کی یہ ساکھ ان کی سپہ گری پر قائم تھی۔

اودھ میں جس طرح ہر فن میں باریکیاں پیدا کی گئیں اسی طرح فنِ سپہ گری میں بھی طرح طرح کے کمالات دکھائے گئے۔ میرے لڑکپن تک ایسے بزرگ موجود تھے جو ان کمالات کے چشم دید گواہ تھے۔ کمان سے ایک تیر چلانا اور دوسرے تیر سے اسے ہوا ہی میں اڑا دینا۔ چارپائی کے نیچے جنگلی کبوتر کو چھوڑ کر چارپائی کے ہر طرف اس تیزی سے لاٹھی چلانا کہ کبوتر کسی بھی طرف سے باہر نہ نکل سکے۔ لکڑی کے تختے پر پان کا پتّا رکھ کر اس پر تلوار کا ایسا سدھا ہوا ہاتھ لگانا کہ پتا کٹ جائے لیکن تلوار تختے سے چھونے نہ پائے۔ تلوار سے دوسرے کی آنکھ میں لگا ہوا سرمہ نکال دینا۔ لیموں پر ... رکھ کر اسے اوپر اچھالنا اور ٹھیک خط کے مقام پر اس کے دو ٹکڑے کر دینا۔ کھیرے کو ہوا میں اچھالنا اور اسے زمین پر گرنے سے پہلے پہلے چھیل دینا وغیرہ اودھ کی بادشاہی ختم ہونے کے بعد تک کے عام تماشے تھے۔

سپہ گری کے آخری کامل استاد مبارک حسین (وفات جون ۱۹۹۵) نے اپنی کتاب "فنِ سپہ گری" میں اس فن کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے ... تیر اندازی، نیزہ بازی، خنجر کی لڑائی، شمشیر زنی، بانک (خنجر کی لڑائی)، لاٹھی، بانا، بنیٹھی، جھنڈا، رومال کی لڑائی، ...

کشتی، پٹا، گرز کی جنگ، گکری یا بھجالی، شیر پنجہ۔ اُستادوں نے ان شعبوں کے داؤں پیچ بھی لکھے ہیں۔[9]

اسلحہ سازی میں بھی اودھ کو امتیاز حاصل تھا۔ قدیم زمانے میں یہاں کے بنے ہوئے بتر ہندستان بھر میں مشہور تھے۔[10] ۱۸۸۵ء میں اودھ کی صنعت و حرفت کی نمائش کے لیے اشیاء کی طلب میں ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے:

"اودھ مدتوں سے ڈھالوں اور بھالوں اور برچھوں اور توڑے دار بندوقوں کے واسطے مشہور ہے...۔ اب بھی بہت سے عمدہ نمونے اودھ اور ممالکِ مغربی و شمالی میں ہیں۔"[11]

مطلوبہ اسلحہ کے ذیل میں لکھا ہے:

"کل اسلحہ اور زرہ جو کہ نہایت مشہور زرہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں یا جو کہ بڑے نامی جنگ جو اور سر آزما بہادروں اور تواریخی معزز اشخاص کے ہوں، زیادہ مطلوب ہیں۔ نیز ایسی زرہ بکتر (بکتر) اور چار آئینے وغیرہ جن پر طلسماتی اور سحری تحریر کندہ ہو...۔ ایک کامل عمدہ مجموعہ کل ایسے آلات کا جو کہ مختلف اودھ کے مشہور اسلحہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں، نہایت پسندیدہ اور دل چسپ ہوں گے۔"[12]

اس اپیل میں مطلوبہ ہتھیاروں اور سپہ گری کے دوسرے لوازم کی فہرست بھی دی گئی ہے اور اس سے پہلے یہ صراحت کر دی گئی ہے:

"ہم اس موقع پر بطور اختصار صرف چند اسلحہ کے نام لکھنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ایک پوری فہرست لکھنے میں بہت وسعت چاہیے۔"[13]

یہ فہرست (چند اضافوں کے ساتھ) درج ذیل ہے:

"کمان۔ تیر۔ تبر۔ ترکش۔ ترسول۔ گرز۔ چکمہ۔ پیش قبض۔ بچھوا۔ چھری۔ سروہی۔ جمدھر۔ خنجر۔ قرولی۔ چاقو۔ نیمچہ۔ بھجالی۔ کھکری (بیالی بھجالی)۔ کھلواڑی۔ بانکا۔ بھرسا۔ تیغہ۔ دودھمی تیغہ۔ کھانڈا۔ بلم۔ برچھا۔ بھالا۔ نیزہ۔ برچھی۔ شمشیر۔ کٹار۔ کٹاری۔ گپتی۔ کورا۔ پیشہ۔ سوسن پٹا۔ تلوار۔ بندوق توڑے دار۔ بندوق جوہردار۔ بندوق پتھردار۔ طپنچہ۔ شیر پنجہ۔ قرابین۔ سنگین۔ کمربستہ۔ رنجک دانی۔ بارود کے سینگوڑے۔ زنبورک۔ بگھنگ (شیر پنجہ)۔ کمند۔ بانا۔ پٹا۔ بنیٹھی۔ لاٹھی۔ پھری۔ گدکا (گتکا)۔ غلیل۔ چلک۔ پتھری۔ ڈھال۔ ناگ پھنی ڈھال۔ مارو۔ ٹوپ۔ خود۔ دستانہ۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ۔ جوشن۔ پیٹی۔ جھلم۔ چلتہ۔ تحت الحنک۔ لیزم۔ مگدر۔ کھڑگ۔ رام داؤں۔ تیغ جلاد۔ "چھوٹے چھوٹے اوزار جو قوم مرہٹہ کی عورتیں اور لڑکے استعمال کرتے تھے۔" رومال۔ توپ۔ شترنال۔ (ہاتھی، گھوڑے اونٹ کو بھی سامانِ سپہ گری میں شمار کیا جاتا تھا)۔

ان اسلحہ وغیرہ کی مختلف قسمیں، وضعیں اور الگ الگ حصے ہوتے تھے، اور ان سب کے الگ الگ نام تھے۔ ان کی تفصیل کاغذات میں درج کی جاتی تھی اور دفتری اصطلاح میں "چہرہ" کہلاتی تھی۔ کچھ اشیاء کے چہرے دیکھیے:

تلوار کا چہرہ

(۱) "تیغہ انگریزی، طرح المانی، ہر دو جانب نقاشیِ آبِ طلا، قبضہ مع دو قرص طلا مرصع یاقوت، زمرد و الماس، برنجمی نقرہ ملمع طلا، تہنال و دو حلقہ مینا کاری، سلک آہنی کوفت طلا، درستگی قور نقرہ۔"[15]

(۲) "تیغہ ولایتی، طرح جنوبی، دونوں طرف اوپر بیٹھ کے خط ہندسی اور نادِ علی اور آیۃ الکرسی تمام سونے سے طغری میں لکھی ہے اور قبضہ ولایتی، سادہ یا پولادی یا ملمع کار یا کوفت مینا کاری کا، یا تہنال فولادی ملمع سونے کا۔"[16]

کمان کا چہرہ

"کمان لاہوری، سبز رنگ، دوٹانک، بند سرخ، شگرفی لاہوری، چلہ ریشم سرخ و سفید، بالا پیچ طلال و در گوشہ نم دار، قبضہ گرد خوش آیند یکساں۔"[17]

(ایک ٹانک، ساڑھے تین سیر۔ دو ٹانک کی کمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے چلّے میں سات سیر کا وزن لٹکا دیا جائے تو کمان کے دونوں سرے آپس میں مل جائیں گے۔ ۱۸؎)

بندوق کا چہرہ

"نال آہنی یا برنجی، دَر دَر یا ہشت پہل، رومی یا لاہوری یا داغستانی یا رام پوری یا ولایتی یا انگریزی، توڑے دار، گل ہاتھی دانت یا شاخ آہنی یا نقرہ یا برنجی، یا مسی، سات بند یا دس یا گیارہ بند، برنجی یا نقرئی یا کسواری، دو کڑی برنجی یا آہنی ملمع کی یا کوفت کی یا فولادی یا نقرہ، تسمہ چرمی مع غلاف بانات یا مخمل یا اطلس کے، یا بندوق چقماقی، ولایتی یا رومی یا انگریزی یا عملی، کندے میں ایک ڈبیا کھدی ہوئی۔" ۱۹؎

بکتر کا چہرہ

"بکتر زرہ آہنی، گریبان مخمل سرخ مع تسمۂ چرمی، دامن از عقب چاک، وزن دس سیر۔" ۲۰؎

خنجر کا چہرہ

"تیغۂ فولادی، دستہ سنگ یشم، مرصع کاری طلا، دانۂ یاقوت چوں دانہ ہائے زمرد کوچک سفید، دانہ ہائے یاقوت پیوستہ خانہ و دو خانہ خالی و یک پیوستہ طلا۔" ۲۱؎

گھوڑے کا چہرہ

"اسپِ سرنگ دور کابہ و چار سال، سیاہ چشم، شاہ گام، داغ سنگ ریزہ بر کلّہ جانب راست و داغ سفید مقدار برگِ پان بر پیشانی و مقدار دو انگشت متصل سم پائے راست پیشین و داغ سین بر کفل جانب چپ۔" ۲۲؎

سید اسرار حسین خاں نے اپنی کتاب "قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ" میں اودھ کے مندرجۂ ذیل مشہور سپہ گروں کا ذکر کیا ہے:

۱. مرزا محمد امیر خیرآبادی (بانک)، ۲. مرزا ذوالفقار بیگ (لکڑی، بنوٹ)، ۳. بھوانی سنگھ چھتری (لکڑی)، ۴. محمد خاں (بانا، پٹا)، ۵. بادل خاں (بانا، پٹا)، ۶. سردار سنگھ چندیر (بانا، پٹا)، ۷. شیخ محمد مہدی (بانک)، ۸. میر لنگر باز (رستم خانی)، ۹. میر نجم الدین (لکڑی)، ۱۰. میر علی (پھکیت)، ۱۱. اصالت خاں بکیت، ۱۲. خلیفہ للّھے پٹیت، ۱۳. گوری پٹے باز، ۱۴. میر فضل علی (بانک)، ۱۵. منصور علی خاں (بانک)، ۱۶. یحییٰ خاں (بانک، رستم خانی)، ۱۷. نواب فتح یاب خاں (رستم خانی)، ۱۸. شیخ نجم الدین (بانک)، ۱۹. ولی محمد خاں (بانک)، ۲۰. میر بہادر علی (بانک)، ۲۱. میر جعفر علی (بانک)، ۲۲. محمد مہدی (بنوٹ)، ۲۳. محمد علی خاں (علی مد)، ۲۴. مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا (تلوار)، ۲۵. میر ولایت علی ڈنڈا توڑ (پٹا)، ۲۶. وزیر علی فرزند آصف الدولہ، ۲۷. میر عشرت علی (پھکیت)، ۲۸. شیخ ببر فنا (پھکیت)، ۲۹. مرزا جیب (بانک وغیرہ)، ۳۰. بھوانی بخش دریا بادی (کشتی)، ۳۱. سید مشرف علی عرف جھنڈا میاں (کشتی)، ۳۲. مہاراجا ڈگبجے سنگھ (نیزہ بازی وغیرہ)، ۳۳. میر کلو (نیزہ بازی)، ۳۴. میر اکبر علی (نیزہ بازی)، ۳۵. نواب قائم خاں بنگش (نیزہ بازی)، ۳۶. طالب شیر خاں (تلوار)، ۳۷. فیض بخش (تیر اندازی)، ۳۸. نواب آصف الدولہ (تیر اندازی وغیرہ)، ۳۹. نواب علی محمد خاں روہیلہ (تیر اندازی)، ۴۰. ہادی یار خاں (تیر اندازی)، ۴۱. میرن صاحب نیچ بھیجے (بندوق)، ۴۲. ٹھاکر فضل علی خاں (بندوق)، ۴۳. نواب جہاں پناہ محل (بندوق، شہ سواری)، ۴۴. شہزادی سمان آرا بیگم (شہ سواری، بندوق)، ۴۵. پرنس مرزا محمد سکندر قدر تیموری (بندوق)، ۴۶. حکیم محمد رشید فتح پوری (بندوق)، ۴۷. راجا محمد کاظم حسین خاں (طمنچہ)، ۴۸. نواب سعادت علی خاں (شہ سواری)، ۴۹. نواب حیدر خاں بنگش (شہ سواری)، ۵۰. فتح خاں (شہ سواری)، ۵۱. دلاور خاں (شہ سواری)، ۵۲. نواب علی نقی خاں وزیر اودھ (نیزہ بازی، شہ سواری)، ۵۳. رجب خاں (شہ سواری)، ۵۴. شیخ ببر علی (شہ سواری)، ۵۵. ممن خاں (شہ سواری)، ۵۶. سید صادق حسین (شہ سواری)، ۵۷. پورن لکھنوی (شہ سواری)، ۵۸. پہاڑ خاں لکھنوی (شہ سواری)، ۵۹. سلطان العلما مولانا سید محمد مجتہد (شہ سواری وغیرہ) ۲۸؎

اودھ میں سپہ گری کے اخلاقی ضابطے بھی تھے۔ اچھا سپہ گر بظلم

خوش اخلاق، منکسر مزاج، غصہ کو ضبط کرنے والا اور مظلوموں کا حمایتی ہوتا تھا۔ اظہارِ عایت اور اپنے کمال کو جتانا اوچھا پن سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً چوٹ کے ماہر اپنی وضع قطع یا کسی بھی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس فن میں دخل رکھتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں ثقہ اور سیدھے سادے لوگ ہوتے تھے، ہتھیار کے نام پر رومال میں بندھا ہوا پیسا یا تسبیح میں ایک بڑا دانہ لوہے کا رکھتے تھے اور اپنے فن کا استعمال صرف اسی وقت کرتے تھے جب زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو جائے۔ ایسے موقعوں پر خاموشی کے ساتھ پیسے یا تسبیح کے دانے کی ایک ہلکی سی ضرب سے حریف کو مفلوج بلکہ ہلاک تک کر دیتے تھے اور گردن جھکائے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

اودھ کے سپہ گروں کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ کچھ لکھے بھی گئے ہیں۔ مثلاً کتاب "وضع داران لکھنؤ" میں مفتی گنج کے میر مصطفےٰ حسین خاں کا واقعہ لکھا ہے کہ انتزاعِ سلطنتِ اودھ سے کچھ پہلے ایک دن چوک میں ان سے کچھ لوگوں سے تکرار ہو گئی، بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں۔ میر مصطفےٰ حسین تن تنہا اس پوری جماعت کے مقابلے پر ڈٹ گئے لیکن مخالف جماعت کے ایک صاحب نے کہا "بھئی ایک سے ایک ہی کو لڑنا چاہیے" اور خود میر صاحب کے مقابلے پر آ گئے۔ لڑائی میں میر صاحب زخمی ہو کر گر گئے۔ اس عرصے میں وزیرِ اودھ نواب علی نقی خاں کے بہنوئی محمود حسین خاں کو اس فوجداری کی خبر ہو گئی۔ وہ میر مصطفےٰ حسین خاں کے عزیز ہوتے تھے، فوراً ہاتھی پر سوار ہو کر سپاہیوں کی ایک پلٹن لیے ہوئے موقع واردات پر آ پہونچے لیکن میر صاحب نے انھیں کوئی کارروائی کرنے سے روک دیا اور کہا کہ مجھ سے صرف ایک آدمی نے مقابلہ کیا ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا تو خود اس سے بدلا لوں گا۔ اگر اس وقت تم لوگوں نے مداخلت کی تو مجھے ایسا صدمہ پہنچے گا کہ زندہ نہ بچوں گا۔

"آخر یہ لوگ حریفوں سے بغیر کچھ باز پرس کیے میر مصطفےٰ حسین خاں کو گھر اٹھا لائے۔ ابھی وہ اچھے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مخالف صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے ...... بعد حجت کے پردہ ہوا۔ میر صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور مزاج پرسی کی۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اب اچھا ہوں اور ان شاء اللہ ایک ہفتے میں صحتِ کلی ہو جائے گی، پھر میرے آپ کے مقابلہ ہوگا۔ حریف صاحب نے کہا کہ بھائی اب تو میں تمھاری بہادری اور منصف مزاجی کا قائل ہو چکا۔ تم پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکتا، یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ بعد غسلِ صحت خود میر صاحب اُن کے مکان پر گئے اور بہت کچھ تانا، لیکن انھوں نے سوائے سر جھکا دینے کے کوئی جواب نہ دیا۔ ہمیشہ یہی کہا کیے کہ یہ سر حاضر ہے، میں تو آپ کو بھائی کہہ چکا۔ آخر میر صاحب نے بھی بھائی کہہ کر گلے سے لگا لیا اور جب تک زندہ رہے بھائی ہی سمجھتے رہے۔" ۳۲

گزشتہ سطور میں استاد سیّد مبارک حسین اور ان کی کتاب "فنِ سپہ گری" کا ذکر آیا ہے۔ لکھنؤ میں سپہ گری کے واقف کاروں کا کہنا تھا کہ عہدِ شاہی میں بھی، جب سپہ گری کا دورِ عروج تھا، مبارک حسین صاحب کا سا کامل استاد شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ اُستاد سپہ گری کے قریب قریب سب شعبوں میں منتہی کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور ہلکے ڈیل ڈول کے آدمی تھے اس لیے بھاری گرز اور بڑا کھانڈا تو شاید نہ چلا سکتے ہوں، باقی تمام ہتھیاروں کے استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ میرے چچا ڈاکٹر سید آفاق حسین رضوی صاحب نے گھر پر ایک ورزش خانہ اور اکھاڑا بنا رکھا تھا جہاں شریف نوجوانوں کو کسرت کرانے کے علاوہ سپہ گری اور کشتی سکھائی جاتی تھی، عمدہ قسم کے ہتھیار بھی بہت تھے (جو ۱۹۴۷ء کے بعد اسلحہ پر پابندیوں کی وجہ سے زمین میں دفن کر دیے گئے اور زنگ انھیں کھا گیا) یہاں استاد مبارک حسین بھی تعلیم دینے آتے تھے اور میں نے اس زمانے میں ان کے ایسے ایسے کمالات دیکھے ہیں کہ آج ان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ استاد کا تفصیلی تذکرہ ان شاء اللہ کسی علاحدہ مضمون میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف دو تین واقعات درج کیے جاتے ہیں:

ایک بار کسی دوسرے شہر کے ایک صاحب سجادہ بزرگ اپنے مریدوں کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ ان کو سپہ گری کا ایسا ذوق تھا کہ اس

شخص کو مُرید نہیں کرتے تھے جو اس فن میں کسی شعبے سے عملی واقفیت نہ رکھتا ہو۔ انھوں نے لکھنؤ کے کسی سپہ گر کا کمال دیکھنے کی خواہش کی۔ ان کو اُستاد مبارک حسین کا نام بتایا گیا، اور ہمارے ہی گھر پر استاد کا مظاہرہ قرار پایا۔ شاہ صاحب اپنے آٹھ دس مُریدوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اُستاد نے ان سے پوچھا: آپ کو زیادہ دل چسپی کس ہتھیار سے ہے؟ شاہ صاحب نے نیزے کا نام لیا اور بتایا کہ ان کے سب مُرید نیزہ بازی سے واقف ہیں۔ اُستاد نے سب مُریدوں کو ایک ایک لاٹھی تقسیم کرادی اور کہا کہ لاٹھیوں کو نیزوں کی طرح استعمال کیجیے۔ میں خود چوٹ نہیں کروں گا، لیکن آپ لوگ اس کا خیال رکھیے گا کہ آپ کے ہاتھ سے آپ کا کوئی ساتھی چوٹ نہ کھائے۔ اس کے بعد اُستاد خالی ہاتھ دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مُریدوں نے حملہ کیا۔ اُستاد بجلی کی طرح چمکے۔ کبھی لاٹھیاں دیوار پر پڑ کر رہ گئیں، ایک حریف کی لاٹھی اُستاد کے ہاتھ میں نظر آئی اور خود اس حریف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے پیچھے کی طرف اس طرح جھکایا کہ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا اور اُستاد اس کے پیچھے تقریباً چھپ گئے۔ حریفوں نے دوبارہ حملہ کیا تو کچھ کے سامنے یہ انسانی ڈھال آگئی اور کچھ کے وار اُستاد نے اپنی چھینی ہوئی لاٹھی سے کاٹ دیے۔ اس کے بعد اُستاد نے اس حریف کو چھوڑ کر لاٹھی اسے واپس کردی اور کہا کہ ابھی تک میری پشت پر دیوار کی حفاظت تھی، اب میں کھلے میں نہتا آتا ہوں، اور دیوار کے پاس سے ہٹ کر بیچ احاطے میں کھڑے ہوگئے۔ اب حریفوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ کیا۔ اُستاد پھر بجلی کی طرح چمکے اور آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں دو حریفوں کی گردنیں آگئیں۔ ایک پہلے کی طرح ان کے سامنے اور دوسرا ان کی پیٹھ پر ڈھال بن گیا۔ اُستاد نے آواز لگائی:

"خیال رہے یہ دونوں آپ کے آدمی ہیں۔"

اس کے بعد اُستاد پر جتنے وار ہوئے ان کے نشانے پر یہی دونوں آدمی آتے اور حریفوں کا ہاتھ رُک جاتا۔ شاہ صاحب کو یہ مظاہرہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اپنے گلے سے منکوں کی ایک مالا اُتار کر اُستاد کو پہنا دی، اعتراف کیا کہ ایسا باکمال انھوں نے ہندستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا اور فرمائش کی کہ اُستاد ان کی خانقاہ میں رہ کر ان کے مُریدوں کو کچھ سکھائیں۔

علی ظہیر عرف پیارے جانی لکھنؤ کے نامی زور آور تھے۔ وہ ہمارے یہاں ورزش کرنے آتے تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک بھینسے کے برابر قوت رکھتے ہیں۔ ایک بار اُستاد نے ان کے ہاتھ میں خنجر دے کر اس کی دھار چٹکی سے پکڑ لی اور کہا کہ خنجر کو میرے ہاتھ سے چھڑا لو۔ پیارے جانی نے خنجر کو طرح طرح سے جھٹکے دیے، اُستاد کے ہاتھ کو مروڑنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ جس طرح دھوبی کپڑے کو پھٹکتے ہیں اسی طرح استاد کو پھٹکنے لگے لیکن خنجر کو ان کی چٹکی سے چھڑا نہیں سکے۔

استاد مبارک حسین نے لمبی عُمر پاکر انتقال کیا۔ بڑھاپے میں ان کی صحت خراب اور بینائی بہت کمزور ہوگئی تھی۔ اُسی زمانے میں ایک دن جھٹ پٹے کے وقت ہم لوگوں نے دیکھا کہ استاد سڑک کے کنارے کھڑے کچھ بڑبڑا رہے ہیں اور ان کے پیروں کے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کسی سائیکل سوار نے ان سے ٹکرا کر انھیں اندھا کہہ دیا تھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ میں تو واقعی اندھا ہو رہا ہوں۔ تم کو اللہ نے بڑی بڑی آنکھیں دی ہیں، تم نے کیوں نہیں دیکھا کہ بڈھا آدمی راستے میں ہے۔" سوار کو اور غصہ آیا۔ آخر اس نے اُستاد پر بائیسکل چڑھا دی۔ ہم لوگوں نے حیرت سے پوچھا:

"اُستاد، آپ پر بائیسکل چڑھا دی؟ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا" اُستاد نے جواب دیا۔ "بائیسکل یہ پڑی ہے اور خود بدولت اُدھر کپڑے جھاڑ رہے ہیں۔"

اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ واقعی سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک ہٹا کٹا جوان کھڑا کپڑے جھاڑ رہا ہے۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا ہم لوگوں کی طرف آیا، خاموشی سے بائیسکل اٹھائی اور اُستاد سے کترا کر نکل گیا۔ اُستاد نے معلوم نہیں کیا داؤں کیا تھا کہ غریب نے سڑک کے اُس پار جا کر پٹخنی کھائی تھی۔

عہدِ شاہی کے اودھ کی سپہ گری اور فنِ سپہ گری سے عام واقفیت کا ذکر شروع میں آ چکا ہے۔ اس وقت یہاں بہت بڑی تعداد میں ایسے افراد موجود تھے جو انفرادی طور پر اس فن میں مہارت کمال کو

پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن یہ انفرادی کمال اجتماعی قوت کا بدل نہیں بن سکتا تھا۔ ایک بانکا شہر کی فوجداریوں میں دس حریفوں کو ضرور مار گرا سکتا تھا لیکن میدانِ جنگ میں دو سو بانکے ایک منظم دستے کی طرح یک جان ہو کر دو سو تربیت یافتہ فوجیوں کی پلٹن کو شکست نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اجتماعی فوجی تربیت حاصل نہیں تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد انگریزوں نے ایک لشکری قوت کی حیثیت سے اودھ کو پنپنے نہیں دیا۔ یہاں کے حکمرانوں کو صرف "بقدرِ ضرورت" تھوڑی سی فوج اور سامانِ جنگ رکھنے کی اجازت تھی۔ اس صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں پورے ہندستان کی طرح اودھ بھی انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ البتہ اس پر تعجب کیا جا سکتا ہے کہ اس جنگ میں انگریزوں کی سب سے سخت مزاحمت اودھ نے کی بلکہ کچھ عرصے کے لیے ان سے اپنی سلطنت واپس چھین کر یہاں برجیس قدر کی حکومت قائم کرا دی۔

اس سلسلے میں اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کا پس پردہ کردار بڑا پُراسرار معلوم ہوتا ہے۔ سلطنتِ اودھ کا خاتمہ انھیں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا نام عیش کوشی اور ناکارگی کی علامت بنا دیا گیا۔ لیکن واجد علی شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی کوشش شروع کر دی تھی کہ اودھ کی فوجی قوت انگریزوں سے بڑھ جائے۔ برائے نام فوج رکھنے کے بجائے وہ بڑی تعداد میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے لگے۔ وہ خود روزانہ کئی گھنٹے تک ان سپاہیوں کو فوجی مشقیں کراتے تھے۔ آخر گورنر جنرل کو رپورٹ کی گئی کہ بقدرِ ضرورت تھوڑے آدمیوں اور سامان کی جگہ اب واجد علی شاہ کی افواج میں چار سو توپیں، پانچ ہزار توپچی، چار ہزار سوار اور چوالیس ہزار پیادے ہیں۔ گورنر جنرل نے مداخلت کر کے اس فوج کی تعداد میں بہت تخفیف کرا دی۔[۲۴]

واجد علی شاہ نے اپنے بعض فوجی دستوں کے عجیب غیر سپاہیانہ نام رکھے تھے مثلاً "ترچھا رسالہ"، "گلابی پلٹن"۔ کچھ کے نام پھولوں پر رکھے مثلاً: داؤدی، جعفری، عباسی۔ ان کے سپاہیوں کی وردیاں بھی عام فوجی لباس کے برخلاف رنگ برنگے مخمل اور بانات وغیرہ کی تھیں۔ فوجی علم بھی خوب رنگین اور زرنگار تھے۔[۲۵] غرض ان دستوں پر فوج سے زیادہ کسی برات کا دھوکا ہوتا تھا۔ شاید اسی لئے انگریزوں نے ان میں سے کچھ دستوں کو بے ضرر سمجھ کر شاہی ملازمت میں باقی رہنے دیا تھا لیکن اس رنگین پردے کے پیچھے تربیت پانے والے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی حربی لیاقت دکھائی اور اپنی شجاعت اور مہارت سے انگریزوں کو عاجز اور حیران کر دیا۔ واجد علی شاہ نے حبشی سپاہیوں کا بھی ایک دستہ تیار کیا تھا۔ کرنل سلیمن نے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو اودھ میں فوجی مداخلت کا مشورہ دیتے ہوئے اس دستے کا یوں ذکر کیا ہے:

"سب سے مقدم یہ ہے کہ (واجد علی شاہ کی) حبشیوں کی فوج کو، جو تین سو آدمی ہیں، غیر مسلح کرنا پڑے گا ....
ان حبشی قاتلوں کی لکھنؤ میں موجودگی سے نہ ریزیڈنٹ اور نہ ریجنسی (کا کوئی رکن) محفوظ ہو گا۔"[۲۶]

ولی عہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اپنے پہرے کے لیے تیس عورتوں کو ملازم رکھ کر انھیں فوجی تربیت دی تھی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو سکندر باغ کے خونیں معرکے میں "لیفٹننٹ کرنل گورڈن الگزنڈر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مقتولین میں کچھ قوی ہیکل حبشنیں تھیں جو جنگلی بلیوں کی طرح لڑی تھیں اور جب تک وہ ہلاک نہ ہو گئیں یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ عورتیں تھیں۔ سارجنٹ فوربس میچل ایک عورت کا ذکر کرتا ہے ــــ جو سکندر باغ کے صحن میں پیپل کے ایک بڑے درخت پر بیٹھی ہوئی کئی انگریز فوجیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکی تھی، اور آخرکار خود بھی گولی سے ہلاک ہوئی۔"[۲۷]

□□

حواشی:

[۱] شبابِ لکھنؤ (ترجمہ پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ: ولیم نائٹن) مترجمہ محمد احد علی۔ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۲۰۳

[۲] انشائے سرور: مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء رقعہ ۴۹

[۳] رجب علی بیگ سرور: نیر مسعود۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۷ء ص ۸۵

[۴] آبِ حیات: محمد حسین آزاد۔ آزاد بکڈپو لاہور ص ۶۵-۳۶۴

[۵] کربلا صاحبِ سیف و قلم: جعفر ملیح آبادی۔ ناشر مصنف لکھنؤ ۱۹۴۸ء ص ۱۰۶

[۶] تاریخ اودھ (حصہ چہارم) نجم الغنی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء ص ۷۱-۲۷۰

[۷] حیاتِ انیس: امجد علی اشہری۔ مطبع آگرہ اخبار، آگرہ ۱۳۴۳ھ ص ۲۳



۸ے مضمون: ببر اینس اور فن سپہ گری: سید علی حسن نقوی۔ ماہی گیری۔ دہلی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء

۹ے واقعات انیس: سید مہدی حسن احسن لکھنوی۔ اصح المطابع لکھنؤ ص ۹۱-۹۵

۱۰ے فن سپہ گری: سید مبارک حسین۔ ناشر مصنف۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء

۱۱ے تذکرہ ہفت اقلیم (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی) امین احمد رازی

۱۲ے قطرہ محیط بحر ہند: منجانب کمیٹی نمائش صنعت و حرفت بہ مقام قیصر باغ لکھنؤ ۱۸۸۵ء۔ ترجمہ منشی درگا دیال۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۸۸۵ء ص ۳۰

۱۳ے قطرہ محیط بحر ہند ص ۳۰

۱۴ے ایضاً ص ۲۸

۱۵ے سیاق نامہ: منشی آنند رام مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۹ء

۱۶ے مکتب نامہ مسمّٰی بہ علم الحساب: بہ اہتمام محمد عبدالرحمٰن ابن حاجی محمد روشن خاں، بار دوم۔ مطبع نظامی کان پور، رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ

۱۷ے انشائے دل کشا: سید نثار علی بخاری بریلوی۔ فخر المطابع ۱۲۷۰ھ

۱۸ے و ۱۹ے

۲۰، ۲۱ے سیاق نامہ

۲۲ے انشائے دل کش

۲۳ے وضعداران لکھنؤ: سید محمد ہادی لکھنوی۔ تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۹۰۸ء ص ۴۵-۴۴

۲۴ے سلطان عالم واجد علی شاہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب، نیر اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۳۹

۲۵ے وزیر نامہ: وزیر السلطان امیر علی خاں۔ مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۳ھ ص ۲۲-۱۱۷

۲۶ے اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ: مرزا علی اظہر برلاس۔ اودھ اکادمی (؟) کراچی ص ۲۹

۲۷ے ایٹین نفلی ڈسیون: سر ہندر ناتھ سین (بحوالہ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۴۴-۴۳

۲۸ے قدیم ہنر و ہنرمندان لکھنؤ: سید اسرار حسین خاں۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۳۶ء ص ۱۱۷-۱۱۳ و ص ۱۷۴ تا ص ۱۸۴

نصیر الدین حیدر بادشاہ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے جو نیپال کی ترائی سے پکڑ پکڑ کے لائے جاتے۔ اُن میں سے بعض بہت بڑے تھے۔ بعض مختلف لڑائیوں میں غالب آ کے بادشاہ کو بہت عزیز ہو گئے تھے۔ لڑائی کے لئے ان کے کٹہرے میدان کے حصار کے پاس لا کے کھول دیئے جاتے۔ دونوں حریف چھوٹتے ہی غرّا کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور دانتوں اور پنجوں سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے۔ باہم گتھ جاتے۔ کبھی یہ اُس کو گرا کے اوپر چڑھ بیٹھتا۔ کبھی وہ اس کو زیر کرتا۔ دیر تک ایک نہایت ہولناک لڑائی ہوتی رہتی جس میں کبھی تو ایک حریف جان سے مارا جاتا اور کبھی سخت زخمی ہو کے ہمت ہار جاتا اور کثرت سے خون نکل جانے کے باعث کمزور ہو کے بھاگتا اور حریف غصے سے اس کا پیچھا کرتا ——— اُس وقت اُن دونوں کے سنبھالنے اور قابو میں لانے کے لیے لڑانے والوں کا کمال، ان کی دوڑ دھوپ اور کارستانیاں دیکھنے کے لائق ہوتیں۔

شیر اکثر تیندووں سے لڑائے جاتے۔ مگر یہاں ایسے ایسے زبردست تیندوے تھے جن سے شیر بہت ہی کم جیت سکتا۔ ان کی لڑائی کی شان بھی وہی ہوتی جو شیروں کے باہم لڑنے کی ہے۔ تیندوہ چھوٹے پیمانے کا شیر ہوتا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں شیروں سے اکثر لڑنے والے تیندوے ہی تھے جو قیامت کی لڑائی لڑتے اور اکثر شیروں پر غالب آجاتے۔ مغلوب حریف کبھی تو وہیں میدان میں گر کے مر جاتا ہے اور کبھی دشمن سے ہار کے بھاگ جاتا ہے۔"

(گذشتہ لکھنؤ)

دانش لکھنوی

خوشنویسانِ اودھ

احوال و آثار

جو ہاتھ تھام کے لکھے تو کتبہ ہو خورشید
شبیہ برق کھینچے گر چلے شتاب قلم

مغلیہ دورِ حکومت سے عروجِ سلطنت اودھ تک مختلف بادشاہوں کے زمانے میں ماہرینِ فن جمع ہوتے رہے۔ ان میں فن خوش نویسی کے ممتاز افراد بھی تھے جو یہاں باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں آصف الدولہ کے سے سخی معتمد الدولہ آغا میر سے فیاض، جانِ عالم مرزا واجد علی شاہ اختر جیسے جوہر شناس اور حوصلہ مند بادشاہ نصیب ہوئے جنھوں نے بیک وقت مختلف فنون کے ماہروں کو یکجا کر دیا تھا۔

واجد علی شاہ کے دور میں خوشنویسوں کو جواہر رقم خاں' یاقوت رقم خاں' گوہر رقم خاں، میر بندہ علی، مرتعش رقم، حامد علی مرصّع رقم جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ اس عہد میں بیضاوی لکھنے والے الگ' آفتابی لکھنے والے الگ تھے۔ مطبع سلطانی کی چھپی اور قلمی کتابوں میں ان کے قلم کی معجز نمائیاں آج بھی موجود ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ امرار و رؤسانے بھی اس فن کے جاننے والوں کی قدردانیاں کیں۔ نواب آغا علی خاں المعروف بہ آغائی صاحب (ناظم سلطان پور) کی فیاضیاں اور سرپرستیاں فنکاروں کے شاملِ حال رہیں۔

ان تمام صاحبِ کمال افراد کے مورثِ اعلیٰ عہد شجاع الدولہ میں محمد خلیل تھے جن کے بارے میں اب تک تحقیق نہ ہو سکی کہ وہ اس فن میں کس کے شاگرد تھے۔ خلیل بیک وقت اٹھارہ خطوں پر عبور رکھتے تھے اور خدا نے انھیں وہ قدرت عطا کی تھی کہ جب وہ میر علیؒ میر عماد، حداد اور یاقوت رقم خاں کا خط دیکھتے تو اس کی نقل اس طرح فرماتے کہ بانظر ماہرین فن بھی اصل اور نقل میں تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔

محمد خلیل کے بعد اگر کسی کا ذکر ملتا ہے تو وہ آقا عبدالرشید تھے جو شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور اپنے لازوال فن کی بدولت مشہور و مقبول ہوئے۔ صاحب "تحفۂ خوشنویساں" مولوی احترام الدین شاغل عثمانی نے آقا عبدالرشید کو میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (اوّل) کا بھانجہ اور شاگردِ سعید تحریر کیا ہے۔

آقا عبدالرشید کے شاگرد قاضی نعمت اللہ لاہوری شہزادوں کی اصلاح پر معین تھے اور حافظ نوراللہ درباری ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تصویروں میں سنہری بیلیں بنانے کا رواج تھا۔ چنانچہ عہد آصفی کی بعض تصاویر میں متذکرہ ماہرین فن کی قلم کاریاں موجود ہیں۔ حافظ نوراللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر مسجد آصفی کے کنوئیں کی جگت اور مسجد کی روکار پر بہ صورت قطعات اب بھی موجود ہے۔ تحسین علی خاں کی مسجد واقع چوک لکھنؤ کا قطعۂ تاریخ بھی نوراللہ نے لکھا ہے۔ اودھ میں عبدالرشید دیلمی کے کئی شاگرد تھے مگر خصوصیت سے میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (دوم) نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عماد عہد محمد شاہ میں ہندستان آئے اور لاتعداد شاگرد بنائے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیل گئے۔ ان کے نامور شاگردوں میں حافظ نوراللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباد اللہ بیگ اودھ کے حصے میں آئے۔

حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں میاں وجیہ الدین' محمد عباس بال چند، سید احمد طباطبائی، حافظ ابراہیم، سرب سکھ لال دیوانہ، عبدالستار سندیلوی' محمد میرزا انس' حسین میرزا عشق نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عشق کے ہاتھ کا لکھا ہوا طویل قطعۂ تاریخ آصف الدولہ کی قبر کے سرہانے آویزاں ہے۔ اسی طرح حافظ ابراہیم نے ۱۲۳۵ھ میں معتمد الدولہ آغا میر کی فرمائش پر محتشم کاشی کا مرثیہ کتابت کیا جسے مختار الملک نواب سید محمد کو پیش کیا گیا۔ یہ مرثیہ شیخ ممتاز حسین جونپوری (مصنف "تعلیم خط و املا") کے پاس تھا۔ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کہاں گیا۔

نعمت اللہ کے شاگردوں میں محمد اشرف' مولوی قبل احمد تھے جنھوں نے لکھنؤ میں کافی شہرت حاصل کی۔ اسی عہد میں منشی کالکا پرشاد تحقیق' کالکا پرشاد موحد نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ان دونوں حضرات نے عہد آصفی سے محمد علی شاہ



تک کا زمانہ دیکھا۔ کالکا پرشاد نخیف کو نواب سعادت علی خاں نے اپنا میر منشی بنا لیا تھا۔ عہد بادشاہ غازی الدین حیدر تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔

مصنف "فسانۂ عجائب" رجب علی بیگ سرور اور صاحب "قیصر التواریخ" سید محمد میر معروف بہ کمال الدین حیدر بھی لاجواب خوشنویس تھے۔ ان کا لکھا ہوا جلی کتبہ بہ صورت صغریٰ درگاہ حضرت عباس لکھنؤ میں موجود ہے۔

اسی عہد کے ایک باصلاحیت استاد نواب سید محمد علی عرف نواب دولہا (متوفی ۱۲۹۴ھ) بھی تھے۔ جن کی شادی اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر نصیر الدین حیدر کی دختر جعفری بیگم سے ہوئی۔ وہ ۱۲۵۴ھ میں مع اہل و عیال لکھنؤ سے شمس آباد ہجرت کر گئے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں مجرم اور بعد کو انور تخلص اختیار کیا۔ فن خوشنویسی میں وہ شیخ بہادر علی بن شیخ خلیل "مروارید رقم" خاں فیض آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے نسخ یاقوت رقم خانی شیخ بہادر علی سے سیکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب "مرغوب دل" قلمی صفحہ ۱۰۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

"...... شیخ بہادر علی خوشنویس مرحوم بن شیخ خلیل مروارید رقم خاں فیض آبادی یہ بزرگوار گورے، بڑی آنکھ، گرد ڈاڑھی، چھوٹے قد کے صاحب علم و شیعہ و خلیق و بے پروا و پرہیزگار و عادی افیون اور خوشنویس۔ اکثر خطوں خصوص نسخ یاقوت رقم خانی کے تھے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان سے اسی خط کو چھ مہینے لکھنؤ میں جب کہ بادشاہ مغفور غازی الدین حیدر کا عہد تھا حاصل کیا تھا۔"

نواب سید محمد علی اپنی مشق کے متعلق "مرغوب دل" کے صفحہ ۵۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اور میں نے بفضل سوائے داہنے ہاتھ کے کبھی کبھی گاہی اور بائیں ہاتھ اور داہنے پاؤں سے بھی کلماتِ مناسب لکھے ہیں۔ اور خط غبار کو بعونہ تعالیٰ ایسا لکھا کہ ایک رُخ پر چنے کی دال کے ساری سورت قل ھو اللہ کی مع بسم اللہ و اکثر اعراب علاوہ انا اعطینٰک الکوثر کے آ گئی۔ مگر پہلے طریق کو بفضلہ داہنے ہاتھ کے ہوتے ہوئے فالِ بد اور دوسرے کو ترکِ ادب سمجھ کر چھوڑ دیا۔"

سید محمد علی قرآن مجید کی کتابت روزانہ فرماتے تھے۔ ایک صفحہ یا ایک سطر یا ایک لفظ ہی سہی۔ سید محمد علی کا لکھا ہوا قرآن مجید ان کے اخلاف میں سید محمد صادق صفوی کے پاس موجود ہے۔

میر انیس کے تلامذہ میں آغا وزیر حسین خاں عطا فیض آبادی خط نسخ بہت اچھا لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی حیات (ولادت ۱۸۹۰ء۔ وفات ۱۹۱۲ء مدفن نجف اشرف عراق) میں کئی قرآن لکھے۔

خویش میر انیس میر ضامن علی بھی عربی خط بہترین لکھتے تھے۔ ان کا لکھا ہوا قرآن مجید (۱۲۰۲ھ نبوی)، خاندان انیس میں موجود ہے۔ اس قرآن کی جدولیں سبز و سرخ روشنائی سے کھینچی گئی ہیں۔ اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر جگہ سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔

سید محمد مہدی تاثیر نقوی (خویش آرزو لکھنوی) نے چاول پر پوری سورت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ خطِ نسخ میں لکھی تھی جو تعلقدار بہوا راجہ غلام حیدر صاحب مرحوم کے خاندان میں اب بھی محفوظ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

عہد واجد علی شاہ کے معتبر خوشنویسوں میں مولوی باقر علی "جادو رقم" مصنف پنج نگارین (مطبوعہ ۱۳۱۲ھ) فقیر محمد حامد علی مصنف "قطعات الجواہر" در خط نسخ (مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۴ء) مولوی گلشن علی جونپوری، اصغر حسین جونپوری، اکبر حسین جونپوری، عبد الحکیم، حافظ ابو الحسن، میر کرم علی، سید مہدی علی، حافظ مسعود عنایت اللہ، آل حسن، میر امام علی، میر جلال الدین، حکیم محمد حسین، وزیر علی، میر زین العابدین، عطا حسین، میر مہدی، شاہ وارث علی، محمد مراد، محمد صالح، محمد حسن سید ابو الحسن فرقتی امروہوی، نور محمد، معظم علی، شرف الدین، اشرف علی، میر سید علی، مرزا جعفر، محمد اکبر، محمد موسیٰ، لال خاں، مرزا محمد علی، مرزا احمد طباطبائی، غلام علی، مرزا حاتم بیگ، محمد نور خاں، حیات علی، غلام مجتبیٰ، امام الدین، ابو البرکات خاں، رونق علی، منشی احمد حسن خاں عروج، منشی امیر اللہ تسلیم، الٰہی بخش، میر احمد حسن، منشی عبد الحی عرشی، محمد علی خوش رقم، علامہ تفضل حسین خاں، تجمل حسین خاں، حامد حسین حافظ محمد باقر، محمد احمد، مرزا محمد ہادی اکبر آبادی، وزیر علی انجم، محمد مبین علی، معین علی، مولوی ہادی علی "بعنت قلم" نثار احمد بریلوی تھے۔

غیر مسلم خوشنویسوں میں کنور چندی سہائے نہال، پیارے لال، شیام بخش، رام دیال، کنور پریم کشور، منشی ہیرا لال مونس، چیت رام، راجہ آنند رام، لچھمی سنگھ، پنڈت لچھمی نرائن، راجہ نند رام پنڈت، رائے سدھ رائے، سرب سکھ رائے، شنکر ناتھ، نرائن داس، امید سنگھ، رام چندر نظر جواہر رقم، شیو پرساد، بالک رام چندر رتھان برہمن، لالہ درگا پرشاد مضطر، راجہ درگا پرشاد مہر تھے۔ ان شخصیتوں کے علاوہ منشی دیبی پرشاد شگفتہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع بدایوں نے بڑی عرق ریزی سے حسب فرمائش مسٹر ٹی بی کین صاحب بہادر ایک کتاب "نظر پرون"

اودھ آئینۂ ایام میں

میں اصول خوشنویسی پر بھی تحریر کی۔

خط نستعلیق کے علاوہ خط نسخ کے بھی بعض ماہرین پیدا ہوئے جن میں محمد خلیل کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں ہم کر چکے ہیں۔ وہ عبدالباقی حداد "یاقوت رقم" کے پائے کے استادِ فن تھے۔ اس کے بعد منشی ہادی علی لکھنوی خوش نویس تھے جنھیں طغرانویسی میں مہارت حاصل تھی۔ ہادی علی کے شاگردوں میں حامد علی اور شمس الدین ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی میں فن خوشنویسی کی بقا اور حیاتِ دوام کے یہی امانت دار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ حامد علی کے ہاتھ کی تحریروں میں خط نسخ کی جلی چیزیں راقم کی نظر سے گذریں مگر خفی خط فراہم نہ ہو سکا۔

۱۱ رمارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء رونما ہوئی۔ مختلف فنون کے ماہران دانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور مجبوراً دیار و امصار کے سفر اختیار کیے۔ اللہ نے منشی نول کشور کی صورت میں ایک باحوصلہ انسان پیدا کیا جس نے ادبا، شعرا، حکما اور ماہر مصوروں اور خوشنویسوں کی امکانی ہمت افزائی اور سرپرستی کی۔ شعرا کے دواوین، حکما کی علم طب کی کتابیں، داستان گوروں کی داستانیں اور ماہر خوشنویسوں کے فن پارے اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ منشی نول کشور کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں خصوصاً رائے بہادر منشی پراگ نرائن جی نے بڑی لگن سے کام کیا اور محمد شمس الدین "اعجاز رقم" سے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں جو فن خوشنویسی سے تعلق رکھتی ہیں قلم بند کروائیں جن میں کاپی بک کے پانچ حصے تنویر شمس (مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۰ء) مرقع نگارین، گلدستہ رباحین، پنجہ نگارین، نظم پروین، آئینۂ خوشنویسی اعجاز رقم (مطبوعہ نول کشور ۱۹۱۰ء) گلستان بوستان، دیوان حافظ، کریما وغیرہ دیکھنے کے لائق ہیں۔

منشی شمس الدین شمس لکھنوی کی تحریر کردہ جلی چیزوں میں کتابوں کے علاوہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ کے صدر دروازے کی عبارت اور مسجد حیدر بخش چوک کے بالائی حصے کی مغربی دیوار پر موجود مسجد سے متعلق وصیت نامۂ حیدر بخش (۱۲۹۳ھ) کا پتھر جس کی لمبائی ۵ فٹ اور چوڑائی ۲½ فٹ ہے۔

منشی شمس الدین نے اپنی حیات میں لاتعداد شاگرد بنائے۔ جس میں جتنی صلاحیت تھی کسب فیض حاصل کیا۔ ان کے نامور شاگردوں میں منشی محمد افضل، محبوب علی، عاشق علی، لیاقت علی، شیخ زائر حسین، شیخ محمد باقر جونپوری، شیخ علی یاور (ذوالقدر اول)، منشی الطاف، منشی عبدالحکیم، منشی آغا شباب، منشی سید علی حسین، سید محمد محسن، مرزا علی حسین، منشی نورالحسن، منشی شاہ میرزا، منشی بندہ حسن، منشی محمد نواب، منشی احمد حسین، منشی رضا حسین، منشی ساجد حسین، اشرف علی، منشی حسن مرزا، منشی حامد حسین، منشی محمد صادق غیور، منشی حمید الحسن عیش، جمیل الحسن، منشی ابوالقاسم زیدی، ابو طالب زیدی، منشی انوار احمد، سید احمد (خویش شمس الدین صاحب) منشی یاور حسین، منشی مساجد حسین، سید غلام حسین عرف نادر آغا، ابراہیم لکھنوی، منشی عبدالرحیم، منشی مرزا محمد جواد صاجان ہوئے۔ □□

حواشی:-

۱؎ بہ عہد شاہ عباس صفوی ۱۶۱۵ء/۱۰۲۴ھ آپ کو ایران ہی میں قتل کر دیا گیا۔ شاہجہاں کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو بے حد افسوس کیا اور کہا کاش اس کو میرے پاس بھیج دیا جاتا۔ (ملاحظہ ہو، تذکرہ خوش نویسان ص ۱۶۵)

۲؎ "مرغوب دل" تالیف نواب سید محمد علی خاں کے قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر خاتمہ کی تاریخ یہ ہے: بفضلہ شب شنبہ ۲۳ر صفر ۱۲۸۳ھ مطابق ۹ر جولائی ۱۸۶۶ء از تصحیح ایں کتاب الفراغ حاصل گردید، الحمد للہ علی ذلک الاتمام۔ اس خطی نسخہ کی فراہمی کے لیے راقم سید ظہیر حسین الخبیر رئیس بہوہ کا ممنون ہے۔





ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی رُدولوی

لکھنؤ کی دست کاری

لکھنؤ کے رئیسوں۔ تعلقداروں۔ راجاؤں۔ نوابوں۔ اور بڑے زمینداروں نے جس طرح شاعری۔ موسیقی۔ رقص۔ مصوری۔ پہلوانی۔ اور دیگر تفریحی فنون (بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ کبوتر بازی۔ پتنگ بازی وغیرہ) کی قدردانی اور سرپرستی کی اور اُنھیں معراجِ کمال پر پہونچایا اس طرح فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور فن کی پرورش کر کے لکھنؤ کی دستکاری کو بھی قبولیتِ عام اور شہرتِ دوام بخشی۔

لکھنؤ کے دستکار جو چیزیں تیار کرتے تھے وہ بہت ہی نفیس دیدہ زیب اور بے مثل تھیں۔ مثلاً چکن۔ کامدانی۔ کارچوب۔ مٹی کے برتن اور کھلونے، سونے چاندی کے زیورات۔ تانبے کے برتن، رضائی لحاف کی چھپائی، لکڑی کے چھاپے اور رجوتے جوتیاں وغیرہ کے علاوہ گودڑ کی گڑیاں، دستی پنکھے، بیلن پٹڑے، جھلنے، ٹاپے، ٹوکریاں، ابرک کے نرکل، بید کے پٹارے، لکڑی کی کھڑاویں، اچار چٹنی، کھپیاں، باندھو، ستلی، مونڈھے، نخل، چوگوشیہ ٹوپی، چمڑے کے ڈول، مشکیں، گودڑ کی گیند، پٹاخے، آتش بازی، بھانوے، چربی کی شمعیں، کاٹھ کی ڈبیاں، کلہیاں۔ کٹھرے۔ کونڈے۔ لاکھ کی شہانی چوڑیاں۔ حقے۔ چلم۔ تمباکو خوردنی وکشیدنی۔ عطر۔ پھولوں کے گہنے۔ ٹاٹ کے بورے۔ کھجور کی چٹائیاں۔ چاندی کے ورق۔ جھاڑو کی سینکوں کی خوبصورت اور رنگین کابکیں۔ بانس کی تیلیوں کے پنجڑے۔ ہنر، غلیل۔ کمان۔ ہاتھی دانت کی مصنوعات وغیرہ دستکاریوں کے نمونے تھے۔

لکھنؤ کی جتنی دستکاریاں تھیں اُن میں بقول سید اسرار حسین خاں ہر دستکاری میں اہلِ فن نے ہنرمندی کے دریا بہا دیئے۔

چکن

چکن سازی نے لکھنؤ کو امتیازی شان بخشنے میں اہم کردار ادا کیا روسائے لکھنؤ کے ذوق و شوق کی آسودگی کے لئے چکن سازی میں نئے نئے تجربات ہوتے رہے اور نئی نئی وضعیں نکلتی رہیں۔ اب چکن ذوق و شوق کی منزل سے آگے بڑھ کر تجارت کی منڈی میں داخل ہو گئی ہے۔ یہاں کے بنے ہوئے چکن کے ملبوسات کلکتہ۔ مدراس۔ پونا، بمبئی اور دہلی کے علاوہ امیریکہ اور آسٹریلیا میں بھی کافی مقدار میں جاتے ہیں۔ یہاں چکن کے بڑے تاجروں میں سیٹھ نرائن داس (چھاچھی کنواں) بھگوت داس (ڈیوڑھی آغا میر)۔ چھنگا مل (چوک)۔ بیر دھیین (پھول والی گلی) لال بہاری ٹنڈن (چوک)۔ پنا لال (نادان محل روڈ)۔ بھارتی چکن (نادان محل روڈ) کھنا چکن (چوک) انل کمار رستوگی (سبھاش مارگ) وغیرہ تھوک فروش ہیں۔ اِن کے علاوہ خوردہ فروشی کی تقریباً دو ہزار دوکانیں پورے لکھنؤ میں پھیلی ہوئی ہیں بالخصوص چوک، نظیر آباد، امین آباد اور ڈیوڑھی آغا میر خوردہ فروشی کے گڑھ ہیں۔ مجموعی طور سے بیس لاکھ روپے یومیہ کی کھپت ہے۔

قدیم چکن کے فینسی اور دیدہ زیب نمونے پرتاپ چند لکھن لال (تھوک وخوردہ فروش ڈیوڑھی آغا میر) کے یہاں آج بھی موجود ہیں۔ اِن کے کام کی قیمت بہت ہوتی ہے۔ لون (نفیس تنزیب) کے کرتے تین سو اور پانچ سو روپے کے اور انگرکھا پندرہ سو روپے کا اِس دوکان سے لوگ خریدتے ہیں انگرکھا پہننے والے اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ اس دوکان سے معلوم ہوا کہ اب بھی بیس پچیس انگرکھے ہر سال بک جاتے ہیں۔

کپڑے :- پہلے چکن صرف باریک تنزیب پر انگلینڈ کے بنے ہوئے دھاگے سے بنتی تھی۔ اب نہ وہ تنزیب ملتی ہے اور نہ وہ دھاگا۔ اب یہ کام لون (موٹی نفیس تنزیب یا ادھی) کیمبرک، ٹیری روبیا، ٹیری وائل، دوریا، سوئز کاٹن (ٹانڈہ، فیض آباد) وائل، شلفن (ٹانڈہ) وغیرہ پر بنتا ہے۔ سنچری پرنس اور سنچری سوئز کاٹن پر بھی کام ہوتا ہے۔

مرکز :- چکن سازی کے آج بھی وہی محلے مرکز ہیں جن میں نادر

آباد میں مثلاً چوک۔ حسین آباد۔ کشمیری محلہ۔ خاس۔ مفتی گنج۔ احاطہ مرزا علی خاں اور محمود نگر وغیرہ۔ یہ کام پرانے لکھنؤ میں از آغاز تا این دم ہوتا چلا آیا ہے۔

چکن کے چند مشہور کاریگر:۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں حاجی میاں اور امیر حسن چکن سازی میں بہت مشہور تھے۔ پیمن، شمشاد، دولہا صاحب اور عثمان علی اچھے فنکار تھے۔ مفلوک الحال شرفاء کی پردہ نشین عورتیں عام طور سے چکن سازی کرتی ہیں۔ کچھ شریف خاندانوں کا تو ذریعہ معاش یہی ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں کام بھی اچھا کرتی ہیں اور اجرت بھی کم لیتی ہیں۔ صالحہ بیگم (ڈالی گنج) قومی انعام یافتہ چکن ساز ہیں۔ اُن کے شوہر بابو خاں بھی استادوں میں ہیں۔ تاجران چکن سے معلوم ہوا کہ عباس علی خاں (ڈالی گنج) مرزا محسن (حسین آباد) جو بغیر چھاپے ہی چکن سازی کرواتے تھے نامی چکن ساز تھے۔

چکن کی قسمیں:۔ چکن کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم کی چکن کے بنانے والے الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

آ۔ مُرّی کے کام میں حسینہ بانو اور قمر جہاں (خوشحال گنج۔ موراواں روڈ) ماہر ہیں۔

ب۔ پیچی (اس کا سیدھا نہیں ہوتا) بنانے میں شاہ جہاں بیگم (کھدرا) مشہور ہیں۔

ج۔ پھندا سازی میں بی فاروق جہاں (اناکر روڈ نزد ڈیری) مہارت رکھتی ہیں۔

د۔ جالی اور ہتھکٹی میں نور جہاں (ٹھاکر گنج۔ بی بی اسپتال کے سامنے گلی میں) لاجواب ہیں۔

ہ۔ بخیہ کی چکن میں قمر النساء، عصمت جہاں اور افسر جہاں (دھنیا مہری کا پل) ماہر ہیں۔

چکن کے ملبوسات کی ترپائی بھی مہارت اور محنت کا کام ہے۔ ترپائی سادہ اور درج دار ہیں۔ جمن (درزی بغیہ) بہت مشہور ہیں۔ سادی ترپائی میں بھی وہ ترپائی مانی جاتی ہے جو ایک مہین ڈوری جیسی لگتی ہے۔ درج کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً سنگھاڑا درج، مچھلی درج، مکمل درج، کوچی درج، سنگھاڑہ درج وغیرہ۔

کامدانی

کامدانی چکن اور زردوزی کے بیچ کی دستکاری ہے۔ یہ روپہلے اور سنہرے تاروں سے بنتی ہے۔ ان تاروں کو بادلہ کہتے ہیں۔ پہلے مردانے کرتوں اور ٹوپیوں پر کامدانی بنتی تھی مگر اب صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوپٹوں، ساریوں، جمپروں اور شلوار سوٹ پر کامدانی بنتی ہے۔ عموماً یہ کام جارجٹ شیفان اور سلک پر کیا جاتا ہے۔ اب یہ کام ٹیری گروپ (ٹیری کاٹ۔ ٹیری لین۔ ٹیری روبیا۔ ٹیری وائل) پر بھی ہوتا ہے۔

کارخانے:۔ پرانے لکھنؤ میں بالخصوص حسین آباد اور شیش محل میں کئی کارخانے ہیں۔ کامدانی کا کام ۷۵ فیصدی شریف پردہ نشین عورتیں کرتی ہیں۔

ڈیزائنس یا وضعیں:۔ ڈیزائنس پہلے بندکیوں سے بنائی جاتی ہیں۔ ان بندکیوں کو دانہ فردی کہتے ہیں۔ ان سے بنی ڈیزائنوں کے نام بھی رکھ لیے جاتے تھے۔ جیسے ٹکی، بادلی، اور ریہ پٹ، ستخانی، کرن، جالی سات رنگ، چاند اور ناخونی وغیرہ۔

کامدانی کے چند مشہور کاریگر:۔ مشہور کامدانی سازوں میں عسکری حسن (نخاس) ننھن صاحب (مفتی گنج) عباس حسین (ہردوئی روڈ) گوہر آغا (مفتی گنج) شہنشاہ حسین (رستم نگر) باقر حسین مرحوم (سندیلہ ہاؤس) وغیرہ۔ بقول اصغر حسین صاحب زری والا (سبھاش مارگ) سرفہرست ہیں۔ چکن کی طرح اس کو بھی مقبولیت حاصل ہے۔ تقریباً ایک لاکھ روپے یومیہ کی کھپت ہوتی ہے۔

کارچوب

جس کپڑے پر کارچوب بنتا ہے وہ پہلے ایک لکڑی کے چوکھٹے پر کس دیا جاتا ہے تاکہ کام بناتے وقت کپڑے میں ذرا بھی جھول نہ آنے پائے۔ چوب (یعنی لکڑی) سے مراد وہی لکڑی کا چوکھٹا ہے۔

قسمیں:۔ کارچوب کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ آری، ۲۔ زردوزی

۱۔ آری:۔ اس کام میں آری کے دندانوں کے طرز پر محرابیں، بیلیں اور کٹاؤ بنتے ہیں۔ آری کے کام میں کلابتو، ریشم اور دھاگے استعمال ہوتے ہیں۔ کپڑے پر چھپائی کرنے کے بعد یہ کام ہوتا ہے۔ پہلے چھاپے لکڑی کے

ہوتے تھے مگر اب ڈزائن کاغذ پر بنا کر کپڑے پر اُتار لیتے ہیں چھاپے کے مقابلے میں یہ طریقہ آسان بھی ہے اور سستا بھی۔ آری کا کام ہلکا بھی ہوتا ہے اور بھاری بھی۔ رئیس اور صاحب حیثیت کی فرمائش پر بھاری سے بھاری کام بنتا ہے اب اس میں طرح طرح کے نقش و نگار بننے لگے ہیں۔ بیرونجات میں اس کی مقبولیت بہت بڑھ رہی ہے۔ ۲۔ زردوزی:۔ زردوزی کا کام پہلے مخمل پر بنتا تھا جس کو شہنول کہتے تھے۔ عروس کے لئے اسی مخمل کے شہانی جوڑے تیار کئے جاتے ہیں اور ان پر زردوزی کا ہلکا یا بھاری کام خریدار کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ شادی بیاہ یا خوشی کے موقعوں پر مستورات بالعموم زردوزی کے بنے ہُوئے ملبوسات پہنتی آئی ہیں۔

زردوزی کے لئے چاندی کے مہین تاروں پر سونا چڑھا دیا جاتا تھا وہی سونے کے تار کہلاتے تھے۔ چاندی کے تار بھی استعمال ہوتے تھے۔ یہی کلابتو کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سلمی ستارہ ریشم اور موتیوں کا استعمال ہوتا ہے۔ گرانی کی وجہ سے سچے موتیوں کی جگہ چھوٹے موتی یعنی لکڑی کا شیشے اور پلاسٹک کے موتی آ گئے ہیں۔ ریشم کی جگہ ایک قسم کی گھاس استعمال ہوتی ہے جسے جاپانی گھاس کہتے ہیں۔ مختلف رنگوں میں رنگ کر بہت دیدہ زیب ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت حسین پھول پتیاں بنتی ہیں۔ اب سلمی ستارہ اور کلابتو وغیرہ بھی مصنوعی ہوتے ہیں۔ البتہ ڈیزائنوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ کشیدہ کاری جو چکن کے ساتھ وابستہ تھی اب کارچوب میں بھی ہونے لگی ہے۔

چند مشہور کاریگر:۔ کارچوب سازی مشکل کام ہے۔ کافی توجہ سلیقہ اور جمالیاتی ذوق چاہتا ہے۔ لکھنؤ نے کارچوب میں بھی لاجواب صنعت کار پیدا کئے ہیں۔ مثلاً اکبر حسین اور امیر حسین (بلوچ پورا) صفدر حسین (ترمنی گنج)، عاشق حسین (منصور نگر)، اعظم حسین (مرزا علی خاں کا احاطہ) اور بنّو صاحب (بھدلیاں) مشہور صنعت کار گذرے ہیں۔ اس وقت مرتضیٰ علی عرف منّا (بھاش مارگ) اور احمد حسین (مصاحب گنج) اچھے فنکار ہیں۔

کارخانے:۔ لکھنؤ کے کئی محلوں میں اس کے کارخانے قائم ہیں۔ درگاہ حضرت عباس، چوک، نور باڑی، چوپٹیاں، مفتی گنج، کاظمین، حسین آباد شیش محل، معظم نگر، یٰسین گنج، اشرف آباد اور منصور نگر محلوں میں مجموعی طور پر تقریباً چار ہزار کارخانے ہوں گے۔

کارچوب کے ملبوسات:۔ پہلے کارچوب کا رواج بہت تھا۔ عائدین کی مسندیں، شامیانے، خیموں کے جھنڈے، ہاتھیوں کی جھولیں، کہار، سائیسوں اور دوسرے عہدیداروں کی وردیاں کارچوب کے کام سے بھری ہوتی تھیں۔ دوپٹے، شلوار، غرارے، چھپر، شال، ساری، شلوار سوٹ جیکٹ، میکسی، بیج اور پرس وغیرہ پر یہ کام اب بھی ہوتا ہے۔ پہلے جوتوں پر بھی یہ کام بہت ہوتا تھا مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

سونے چاندی کے زیورات

لکھنؤ کے روسا، مزاج کی نفاست، جمالیاتی ذوق، دولت و ثروت کی افراط کے ساتھ سخاوت و فیاضی کی بدولت لکھنؤ میں اعلیٰ درجہ کے سونے چاندی کے دستکار پیدا ہو گئے۔ ہر رئیس کا اپنا ایک مخصوص سنار رہتا تھا جو اُس کے مزاج کو خوب پہچانتا تھا۔

نمونے:۔ سُنار زیورات سازی میں طرح طرح کے نمونے ایجاد کیا کرتے تھے جس پر روسا انھیں زیورات کی قیمت کے علاوہ انعام و اکرام دیا کرتے تھے مثلاً کندن کا کام، مینا کاری، نقاشی، مرصع سازی (جڑاؤ کام) امبوسنگ اور لاکھ بھرائی وغیرہ۔

سنار:۔ سناروں کے دو طبقے تھے۔ ایک مرصع سازی کرتا تھا اور دوسرا نقاشی وغیرہ۔ مرصع سازوں کو رنگ سے رنگ اور پتھر سے پتھر ملانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ بقول مرزا جعفر حسین دارالشفا کے سامنے ایک مرصع ساز رہتا تھا اس نے ایک پتھر میں جوف کر کے سونے کے باریک تاروں سے ہیرے کا نگینہ اس طرح جڑ دیا جیسے لال پتھر سے سفید نگ نکل آیا ہو۔ شرر لکھتے ہیں۔

"غدر سے پیشتر لکھنؤ سے اچھے سنار اور کاریگر کہیں نہ مل سکتے تھے" (گذشتہ لکھنؤ) پتھروں کی تراش و خراش بھی لکھنؤ میں ہی ہوتی تھی۔ جواہرات کی کھریں باہر سے آتی تھیں۔ مثلاً نیلم (کشمیر سے) اور یاقوت لنکا سے آتے تھے۔ انھیں کھڑوں سے نگینہ ساز مختلف سائز کے نگینے تراش لیتے تھے۔ درِ شہوار، درِ غلطاں، یاقوت رُمانی، عقیق یمنی اور فیروزہ نیشاپوری بڑے مہنگے ہوتے تھے۔

مردوں میں زیورات پہننے کا رواج بہت کم تھا صرف انگوٹھیاں یا کچھ لوگ گلے میں بہت ہلکی سونے کی زنجیر پہنتے ہیں۔ عورتوں کے سر سے لے کر پاؤں تک کے ہر عضو کے لیے زیورات ایجاد ہو گئے۔

زیورات:۔ سر کے لیے چھپکا، ٹیکا، جھومر، سنگار پٹی۔ ماتھے کے لئے ٹیکا جڑاؤ اور سادہ۔ گلے کے لیے نکلس۔ مورنی مالا۔ گلوبند۔ چمپا کلی تلسی مالا، چندن ہار۔ طوق۔ ہنسلی۔ مٹر مالا۔ کنٹھا۔ تختیاں۔ مثل اعظم ہار۔ چاند۔ زنجیر، لاکٹ اور جگنو۔ ہار میں بہت سی ڈیزائنیں ایجاد ہو گئی ہیں اور برابر ہو رہی ہیں۔ ناک کے لئے نتھ۔ نتھنی۔ کیل اور بلاق۔ بلاق دونوں نتھنوں کے بیچ کے پردے میں چھید کر کے پہنا جاتا تھا۔ اس کا رواج اب عموماً دیہاتوں میں رہ گیا ہے۔ نتھ سہاگ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس میں دو موتی بیچ میں مرّی پڑی رہتی ہے جو بہت قیمتی ہوتی ہے۔ کیلیں بھی کئی طرز کی ہوتی ہیں۔ سادی، نگ دار اور لونگ نما۔ زیورات میں سب سے چھوٹا زیور یہی ہے۔ اس میں بھی لکھنؤ کے دستکار اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شرر لکھتے ہیں:۔

"سبک ناک کی کیلیں لکھنؤ کے سناروں اور سادہ کاروں کے سوا اور کہیں کے کاریگر نہیں بنا سکتے۔" (گذشتہ لکھنؤ)

کانوں کے لئے پتے۔ ٹاپس۔ بالیاں۔ بجلیاں۔ اتراج۔ انتیاں۔ کرن پھول۔ بندے۔ گوشوارے۔ جھالے۔ کٹیاں اور جھمکے وغیرہ۔ کسی زمانے میں کانوں پر ایک چاندی کا خول چڑھا کر اس میں زیورات آویزاں کئے جاتے تھے۔ اس خول کو کان سین کہتے تھے۔ یہ بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ لہٰذا جلدی اس کا رواج ختم ہو گیا۔ ہاتھوں کے لئے آرسی۔ انگوٹھیاں۔ چوڑیاں۔ کڑے۔ کنگن۔ جہانگیریاں۔ پٹریاں۔ پہونچیاں۔ دست بند۔ شوق بند۔ نورتن۔ چوہے دتیا اور موتیوں کے گجرے۔ بازوؤں کے لئے جوشن۔ بازو بند۔ نورتن اور ریکہ وغیرہ۔ پیروں کے لئے چھلے۔ بچھیا۔ پھاگل۔ کڑے۔ چھڑے۔ پچھے۔ جھانجھ۔ پٹریاں۔ توڑے۔ پازیب۔ پیری جھپک۔ جھانوریاں۔ چاند تارے۔ رام جھول۔ پیری اور گھونگرو وغیرہ پیر کے زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔ سونا احتراماً پیروں میں نہیں پہنا جاتا تھا۔

ماہر صنعت کار:۔ جڑاؤ کام کرنے والوں میں بابو بنگالی (ماڈل ہاؤس) کا جواب نہیں تھا۔ اب اشرف صاحب (جھوائی ٹولہ دریا نیہ) کندن کا جڑاؤ کام کرنے میں فرد واحد ہیں۔ نقاشی میں ادمکار سونار (راجہ بازار) کے بزرگ مشہور تھے۔ ملمع سازی میں صدیق مرحوم استاد تھے محمد اسمٰعیل خاں دو دکانداروں میں شمار رہے (سادہ کاری میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ اور پان کا ڈبہ بنانے والے ماہر فن ذکی مرحوم تھے۔ حضور میاں (ٹھاکر گنج) اور منے صاحب کندن کے کام میں بہت مشہور ہیں۔ حمید (کپتان کا کنواں) اور محمد عمر (سرائے معالی خاں) چاندی کی انگوٹھی بنانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ آری کٹنگ جویلری کے ماہر عبدالستار تانبے کے فرمے بناتے تھے۔

تانبے کے برتن

تانبے کے برتنوں کے لیے لکھنؤ میں یحییٰ گنج محلہ مخصوص ہے۔ پیتل کے برتنوں اور لوہے کی بنی ہوئی اشیاء کی تھوک کی دوکانیں اسی محلے میں ہیں۔ لوہے اور پیتل کے مصنوعات کے لئے لکھنؤ مشہور نہیں ہے اگرچہ پیتل کے لوٹے وغیرہ کی ڈھلائی کا کام یہاں بھی ہوتا ہے۔

تانبے کے برتن لکھنؤ کے علاوہ شاید ہی کہیں بنتے ہوں۔ یہاں تانبے کے برتنوں کی بہت پرانی دوکان کنھیا لال پراگ داس کی ہے۔ اُن کے پر پوتے ہری ادم جی سے معلوم ہوا کہ یہ دوکان ۱۸۸۰ء میں قائم ہوئی تھی مگر اس وقت بھی دو چار دوکانیں پہلے سے موجود تھیں۔

تانبے کی چادریں دہلی، ہاپڑ، جگادری (پنجاب)، شاملی (مظفر نگر) وغیرہ سے آتی ہیں۔ اِن چادروں سے لوٹے۔ پتیلی۔ دیگ۔ پاندان۔ سینی۔ لگن۔ کفگیر اور چمچے وغیرہ بنتے بھی ہیں ڈھالے بھی جاتے ہیں۔ ظروف سازی میں خوب خوب کمالات دکھائے گئے تھے۔ ڈھلائی۔ نقاشی اور میناکاری سے برتن بہت دیدہ زیب ہو جاتے تھے۔

ڈھلائی:۔ یہ کام لکھنؤ میں بہت صاف اور نفیس ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔ لوٹے کی موجودہ ساخت خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ بقول شرر

"یہ لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے جس سے زیادہ خوشنما اور سڈول لوٹے ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں بنتے اور ہر جگہ شوقین فرمائشیں کر کے لکھنؤ سے منگوایا کرتے ہیں۔ جو تناسب لوٹوں میں یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ چھوٹی لٹیا سے لے کر بڑے سے بڑے لوٹے تک سب میں نظر آتا ہے۔" (گذشتہ لکھنؤ)

نقاشی:۔ نقاشی میں زیادہ تر پھولوں، پتیوں، اور بیلوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ نقاشی کے بعد ان پر جلا ہوتی ہے۔ پہلے ان پر رانگے کی بڑی اچھی قلعئی ہوتی تھی۔ قلعی کے بعد ان کی نظر نوازی معراجِ کمال پر پہنچ جاتی تھی۔ مگر اب پہلے جیسی نفیس نقاشی ہوتی ہے نہ قلعئی۔

میناکاری:۔ ایک قسم کا چمکتا ہوا مسالہ میناکار بناتے تھے جس کی

وضع موم بتی جیسی ہوتی تھی۔ یہ کالے، لال، نیلے اور ہرے رنگ کی بنائی جاتی تھیں۔ تانبے کے قلعی دار ظروف کے نقوش کی گہرائیوں میں میناکار یہ مسالے بھرتے اور انگلیوں سے برابر کرتے اور رگڑتے جاتے تھے۔ برتن چکنے سطح اور چمک دار ہو جاتے تھے۔ میناکاری کی رنگ برنگ کی ڈزائن عجب لطف پیدا کر دیتی تھی۔ امراء کے یہاں سونے چاندی کی چیزوں پر بھی میناکاری ہوتی تھی۔ اب میناکاری کا فن بالکل ختم ہو چکا ہے۔

گنگا جمنی :۔ میناکاری جیسی یہ بھی ایک طرز تھی۔ روپہلی اور سنہری ڈزائن بنائی جاتی تھی۔ دونوں رنگ ساتھ ساتھ چلتے تھے اور ڈزائن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ یحیٰ گنج کے صنعت کار ایک پان کی ڈبیہ میں ہی اپنی کارگری کے جوہر دکھا دیتے تھے۔ نہایت خوبصورت سجل خوش وضع دیدہ زیب اور مختلف وضعوں کی ہوتی تھیں۔

چند صنعت کار :۔ نقاشی کرنے میں سالک رام مشہور تھے۔ اس وقت گھن شیام راج کمار اور پرشوتم وغیرہ نقاشی کرتے اور سب یحیٰ گنج ہی میں رہتے ہیں۔ بلوچ پورا، سعادت گنج اور گڈھی کنوا وغیرہ میں کاریگر موجود ہیں۔

مٹی کے برتن اور کھلونے

لکھنؤ کے گراں قدر اور بیش بہا مصنوعات میں مٹی کے برتن اور کھلونے بھی شامل ہیں۔ لکھنؤ کے روسا فن کے پرستار تھے۔ اُن کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی نے مٹی کو بھی رنگ روپ دیکر فردوسِ نظر بنا دینے والے فنکار پیدا کر دیے۔ شرر لکھتے ہیں :۔

"کمہاروں اور کسگروں دونوں نے اپنے کام میں وہی ذہانت و طباعی اور جدت طرازیاں دکھانا شروع کیں جو ایک مصور تصویروں میں اور ایک شاعر اشعار میں دکھایا کرتا ہے ..... حسنِ اتفاق سے لکھنؤ کی مٹی اس فن کے لئے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاریگری کو اظہار کمالات کا موقعہ دینا شروع کیا اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے بننے لگے جیسے کہیں نہیں بن سکتے۔ (گذشتہ لکھنؤ ص۲۸)"

برتن :۔ مٹی کی رکابیاں جن میں کھانے کی چیزیں رکھی جاتی تھیں تین قسم کی ہوتی تھیں۔ (۱) سادی (۲) لاکھی (۳) روغنی۔ سادی رکابیاں پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے رکھنے کے لئے ہوتی تھیں۔ لاکھی رکابیوں کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ ان کا استعمال غم کے موقعوں پر ہوتا تھا۔ روغنی رکابیوں کا رنگ ہرا، نیلا، زرد اور سنہرا ہوتا تھا۔ ان میں روغن جذب نہیں ہوتا تھا۔ ان کا استعمال ہی اس لئے ہوتا تھا کہ غذا کا رنگ و روغن اپنی اصلی حالت پر رہے۔ پلاؤ، زردہ، کباب اور متنجن انھیں رکابیوں میں اعزا اور احباب کے یہاں بھیجا جاتا تھا۔ سالن اور کھیر کے لئے ہانڈیاں اور پیالے بھی بنتے تھے۔ یہ چیزیں بہت چکنی صاف سڈول ہلکی نازک اور خوبصورت ہوتی تھیں۔ ایسے ہلکے اور باریک برتن کاغذی کہے جاتے تھے۔

کاغذی صراحیاں اور آبخورے بہت سوندھے ہوتے تھے۔ گرمیوں میں صراحیوں میں رکھا ہوا پانی آبخورے میں پیا جاتا تھا تو روح تازہ ہو جاتی تھی۔ آبخورے چھوٹے اور بڑے ہوتے تھے۔ بڑے آبخوروں کے بنانے میں بالو کی مقدار زیادہ رکھی جاتی تھی اس میں پانی جلدی ٹھنڈا ہوتا تھا۔ سستا ہونے کی وجہ سے امیر غریب سب ہی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

دوکاندار کاغذی آبخوروں میں شربت، کاغذی پیالوں میں کھیر کاغذی ہانڈیوں میں مٹھائیاں بیچتے تھے۔ کاغذی آبخوروں میں ملائی کی برف کاغذی چمچوں سے کھائی جاتی تھی۔ کھیر اور مزعفر کھانے کے لیے کاغذی چمچ الگ الگ مخصوص وضع وقطع کے ہوتے تھے۔ پان رکھنے کے لئے کاغذی ہانڈیاں ڈھکنے دار بہت ہی خوبصورت بنتی تھیں۔ ڈھکنوں پر شاہانہ کا منقش لگا ہوا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اندر سرخ رنگے تر کپڑوں میں پان کی گلوریاں رکھی جاتی تھیں۔

نصف صدی پہلے حقہ پینے کا رواج بہت زیادہ تھا۔ سگریٹ اور بیڑی کا چلن زیادہ نہیں تھا۔ حقہ بھی لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ اس کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ سب سے نیچے پیندا ہوتا ہے جو زمین پر رہتا ہے اس پر نیچہ رکھا جاتا ہے اور نیچے پر چلم رکھی جاتی ہے۔ پیندے سونے چاندی تانبے پیتل اور مٹی کے بنتے تھے۔ ان پیندوں کو حقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اُمراء حقوں کی سج دھج پر کثیر رقم خرچ کرتے تھے۔ چلم پر سرپوش چاندی پیتل یا تانبے کا ہوتا تھا اس سے گنگا جمنی نازک زنجیریں لٹکتی رہتی تھیں۔ نیچے میں چھوٹا دست پناہ چاندی تانبے یا پیتل کا پڑا رہتا تھا۔ نیچے نرکل سے بنتے تھے۔ یہ کئی قسم کے

ہوتے تھے۔ مدار بہ عظیم اللہ خانی سیدھی نعل والے جلیبی دار نعلی والے شک یا پچوان ایجوان واجد علی شاہ کی ایجاد ہے۔ نیچے کے نرکل پر پہلے کالا یا لال تاگہ لپیٹ کر نرکل ڈھک دیا جاتا ہے پھر کلا بتو سے اس پر طرح طرح کی خوبصورت ڈیزائنس بنا دی جاتی ہیں۔ چپندے (حقے) بھی بہت خوبصورت گنگا جمنی اور مینا کاری کے کام سے دیدہ زیب بنا دیے جاتے تھے مگر ان قیمتی حقوں کے سامنے مٹی کے کاغذی حقے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

گرمیوں میں امرا بھی ان مٹی کے حقوں کو استعمال کر کے ان کے سوندھے دھوئیں سے اپنی روح بالیدہ کیا کرتے تھے۔ شرر نے لکھا ہے کہ انگریزی شاعر ٹینی سنا (Tennyson) مٹی کے بنے ہوئے پائپ پیا کرتا تھا۔ اسے مٹی کا سوندھا پن بہت عزیز تھا۔ اسے اگر یہ حقے مل جاتے تو شاید وہ پائپ کو کبھی منہ نہ لگاتا۔ چلمیں بھی کاغذی اور روغنی بنتی تھیں۔

تمباکو کشیدنی بھی (حقہ میں پینے کے لئے) لکھنؤ میں بہتر سے بہتر خوشبودار تیار ہونے لگی۔ بقول اسرار حسین :-

"تھانا لکھنوی نصیری عہد میں اعلیٰ درجہ کا تمباکو کشیدنی بناتا تھا کہ اس میں مشک وغیرہ وغیرہ کی خوشبو آتی تھی۔ جس نے ایک گھونٹ کھینچا دم بھرنے لگا۔" (ہنر و ہنر مندان اودھ صفہ ۱۹)

ان ظروف کے علاوہ مٹی کے گھڑے، جھجر، کپ، لوٹے، ڈنر سٹ، ٹی سٹ، ٹیمن، شکی، مشکا اور کلہیاں، گلدان، شمع دان، اگردان وغیرہ بہت خوشنما بنتے تھے۔

کھلونے :- مٹی کے برتنوں سے زیادہ گراں قدر مٹی کے کھلونے ہوتے تھے اور ہوتے ہیں، ان کی دلکشی بیان سے باہر ہے۔ گاۓ بنائی تو چہرے سے معصومیت برس رہی ہو۔ شیر بنایا تو دیکھنے والا ڈر کر پیچھے ہٹ جائے۔ کبوتر اور طوطے کے جوڑے ایسے کہ لگتا تھا پاس کوئی گیا کہ یہ اُڑے۔ کٹا ہوا انار یا تربوز۔ لال مرچ۔ پرور۔ کھیرا دیکھئے کیا مجال ان کی اصلیت پر دیکھنے والا شک کر سکے۔

اکبری گیٹ کی قدیم آمنے سامنے کی دو دو دکانوں میں سے ایک ابھی موجود ہے۔ اس کے مالک کافی سن رسیدہ ہو چکے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ پہلے نوابوں۔ رئیسوں۔ انگریزوں۔ راجاؤں اور تعلقہ داروں کی وجہ سے مٹی کا کام زندہ تھا اب صرف دیوالی زندہ کئے ہوئے ہے۔

جوتے اور جوتیاں

لکھنؤ کے ایجادات میں گھیتلے جوتے، خورد نو کے، ادگھیا، کفش اور زیرپائی وغیرہ بھی ہیں۔ گھیتلے جوتے کسی زمانے میں بہت مقبول تھے۔ بقول شرر :-

"یہاں ایک گھیتلا جوتا مروج تھا۔ اس کی نوک ہاتھی کی سونڈ کی طرح ..... اودھ کے اگلے بادشاہوں، وزرا، امرا سب کے پاؤں کی زینت ہوا کرتا۔ غدر ہوتے ہوتے فقط عورتوں کے پاؤں میں رہ گیا جن کے نازک پاؤں کا وہ عام لباس تھا۔"

سید اسرار حسین ہنر و ہنر مندان اودھ صفہ ۱۹ پر فسانۂ عبرت کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

"ببر علی لکھنوی نصیری عہد میں گذرے ہیں۔ خورد نو کا گھیتلہ جوتا اس نوک جھوک کا بناتے تھے دنیا میں اس کا جواب نہ نکلا۔"

کفش :- بقول شرر کفش اپنی اصلی صورت میں آج تک باقی ہیں جو شیعان علی کے اتقیا و صلحا، خصوصاً مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (گ ل صفہ ۲۳۹) مگر ایک شیعہ متقی مصلح اور مجتہد مولانا آغا مہدی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اب کفشوں کا رواج بھی باقی نہیں رہا۔ آپ لکھتے ہیں :-

"کفش عالم اور بوڑھے عبادت گذار پہنتے تھے۔ نیچے کی طرف سے چوڑی کناروں پر چمڑے کی گوٹ اور مخمل یا کیمخت۔ ٹو میں نخرطوی انداز نہ تھا مگر ایڑی میں ایک خاص طرح کا نعل ہونا ضروری تھا۔ کفش بنانے والا اللہ رکھو پہلا کاریگر تھا پھر رمضان خان، ذاکر حسین اور آخر میں آغا حسن جعفت فرد شش فرمائش آنے پر تیار کرتے تھے۔ پہننے والے نہ رہے تو یہ کام بھی بند ہو گیا۔" (تاریخ لکھنؤ صفہ ۳۳)

زیرپائی :- تربوز کے چھلکے کو دانت سے کھٹکنے پر دو رخوں میں سے ایک رخ کا آدھا حصہ اگر کتر لیں تو جو حصہ باقی رہے وہی زیرپائی کی شکل ہے۔ ذاکر حسین اور رمضان خاں اس کے آخری کاریگر تھے۔ براؤن چمڑے یا زرد مخمل کی بنتی تھی۔ اب اس کا بھی رواج نہیں رہا۔

خورد نو کا :- شرر گذشتہ لکھنؤ کے صفہ ۲۸۱ پر لکھتے ہیں :- (مختصر کر کے اپنے لفظوں میں لکھ رہا ہوں)

"خورد نو کے لال فری کے نہایت سبک اور صاف بنائے جاتے

اگلے مذاق نے اس کو یہاں تک سبک کر دیا کہ چار پانچ پیسوں بھر سے زیادہ نہ ہوتا۔ دیہاتوں کے لئے اسی وضع کے چمڑو دھے جوتے سیر سیر ڈیڑھ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے۔ سرسوں کا تیل پلانے سے اور بھی وزنی ہو جاتے۔ خورد نو کے گرمیوں کے لئے کاشانی مخمل اور برسات کے لئے کیمخت (گھوڑے یا گدھے کی کھال) کے بننا شروع ہوئے ... بانات کا جوتا نہایت نفیس سادہ سبک اور خوشنما ہوتا ہے۔ جوتے کی آرائش میں اور ترقی ہوئی اور سلمے ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے جن میں مقیش کے پھندے لگا کر عجیب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی (گذشتہ لکھنؤ صلہ۲۸)

ڈاکٹر سید صفدر حسین "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" کے صلہ۵ پر رقمطراز ہیں:۔
"لکھنؤ کے معرف خورد نو کے جوتے مخمل، کمخواب، بانات، زربفت اور کیمخت وغیرہ کے عام طور پر بنتے تھے جن میں کلابتو، کامدانی اور سلمی ستارے وغیرہ کا حسین نازک کام ہوتا تھا۔"

اودھیا:۔ "گذشتہ لکھنؤ" کے صلہ۲۸۳ پر شرر لکھتے ہیں:۔
"اودھی کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو زنانے یا مردانے جوتوں پر لگائے جاتے ہیں۔ اودھیاں یہاں بہت ہی نفیس زرق برق اعلیٰ درجے کی ایسی بنتی تھیں جیسی کہیں نہ بن سکتی تھیں اور ان کی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی کا ایک معتد بہ حصہ انھیں کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا۔"

محلہ رانی گنج (رکاب گنج سے چارباغ جانے والی سڑک پر ناکہ ہنڈولہ سے پہلے) میں رہنے والے کاریگروں کے آبا و اجداد یہ جوتے بناتے تھے۔ مگر اب ان کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ عورتوں اور لڑکیوں کے لئے بیلی جوتے بنا رہا ہے۔ محلہ رانی گنج جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تقریباً دو سو گھر اس محلے میں جوتا بناتے ہیں مگر سب کے سب بیلی جوتے بنا رہے ہیں۔ گھیتلے، خورد نو کے کفش، زیرپائی اور اودھیاں کا بننا لکھنؤ میں بالکل بند ہو گیا۔ رؤسائے لکھنؤ کے ساتھ فن اور فنکار سب رخصت ہو گئے۔

رضائی اور لحاف کی چھپائی

لکھنؤ میں چھپائی کی ایجاد:۔ کلن خاں نامی ایک شخص نے ۱۸۵۶ء کے قریب مشک گنج میں ایک مکان خریدا۔ ۱۸۶۰ء کے آس پاس انھوں نے تعزیوں میں لگانے اور گردوں کو سجانے کے لئے کاغذ کی چھپائی شروع کی۔ رنگ خود ہی بناتے تھے۔ کسیس (لوہا) پانی اور لونیا نمک وغیرہ سال بھر تک پڑا رہتا تھا اور انتہائی پختہ کالا رنگ بن جاتا تھا۔ پھول پتی گل انار اور جڑی بوٹیوں سے لال رنگ، ہلدی میں توتیا وغیرہ ملا کر ہرا رنگ اور ہلدی سے پیلا رنگ بناتے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں جرمنی کے ریپڈ فاسٹ کلر (Rapid Fast Colour) کا پتہ چلا اور کپڑوں پر چھپائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے کلن خاں رسول بخش فرم نے یہ کام شروع کیا۔ کلن خاں لکھنؤ کی چھپائی کے پہلے کاریگر ہیں۔ پھر انھوں نے اور لوگوں کو سکھایا اور فن عام ہونے لگا۔ چھپائی کے لئے کپڑے مانچسٹر اور دوسرے یوروپین ممالک سے آتے تھے۔

۱۸۹۰ء سے رسول بخش نے غلطے پر چھپائی شروع کی۔ غلطہ ایک کپڑا تھا جس میں نیچے کی بنائی سوتی اور اوپر کی بنائی ریشمی ہوتی تھی۔ غلطے پر چھپائی پھر دوسرے کارخانوں میں بھی شروع ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ رضائی، لحاف، غلاف تکیہ، پردے، شیروانی کے کپڑے، پرنٹ میز پوش، پلنگ پوش وغیرہ غلطے پر چھپنے لگے۔

ایکسپورٹ:۔ ۱۹۱۲ء کے قریب رسول بخش نے جرمنی، جاپان اور انگلینڈ سے رابطہ قائم کیا اور مال بھیجنے لگے۔

ایک انکشاف:۔ ۱۹۴۷ء میں جرمنی سے اشفاق رسول (مشک گنج) کے پاس ایک اشتہار ڈائرکٹری آئی جس میں لکھا تھا کہ آپ کے اشتہارات میرے یہاں سے نکلتے تھے۔ اب میرے ریٹ یہ ہیں۔ آپ کہیں تو اشتہار دے دیا جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کی چھپائی بین الاقوامی سطح پر مشہور ہو چکی تھی۔

کارخانے:۔ ۱۹۵۰ء تک لکھنؤ میں چھپائی کے پینتیس کارخانے تھے ہر کارخانے میں لگ بھگ (۱۵) پندرہ کاریگر رہتے تھے صرف اشفاق رسول (مشک گنج) کے یہاں پینتیس کاریگر تھے۔ یہ کارخانے مشک گنج، درو جے گنج کی سرائے، ڈالی گنج، عنبر گنج، ٹکیت گنج، جھنوائی ٹولہ، امین آباد، لال باغ، بارود خانہ اور رکاب گنج وغیرہ میں تھے۔ اب صرف چار کارخانے رہ گئے ہیں جو چوک، راجہ بازار، امین آباد اور مشک گنج میں ہیں۔

چھپائی کے کپڑے:۔ غلطہ کی بنائی بھی اودھ کی کاریگری تھی

رخ آباد) میں بنتا تھا۔ ایک ہی خاندان کی دو شاخیں یہ کام کر رہی تھیں ایک شاخ پاکستان چلی گئی اور دوسری نے غلطے کا کام بند کر کے ریشمی ساریوں کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے غلطے کی چھپائی بند ہو گئی پھر شاموس، کھدر، لانگ کلاتھ، سلک، تنزیب اور دوسرے سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی چھپائی ہوتی رہی۔ اب اونی اور ریشمی کپڑوں کی چھپائی بھی تقریباً بند ہو چکی ہے۔ نہ کاریگر رہے اور نہ وہ صاحب مذاق جو اس کی قدر کرتے تھے۔ اب صرف سوتی کپڑوں کی چھپائی چل رہی ہے۔

چھپائی کی چیزیں:۔ رضائی، لحاف، دسترخوان، چھینٹ، پلنگ پوش، میز پوش، ساری، غلاف تکیہ، رومال شال (اونی سوتی) اونی چادرے وغیرہ۔

دستکار:۔ اس میں دو قسم کے کاریگر ہوتے ہیں۔ ایک حاشئے کی چھپائی کرتے ہیں دوسرے ڈٹائی یعنی ڈزائن کی بھرائی کرتے ہیں۔ حاشئے کے کام میں قادر بخش اور عبدالرحیم بھیا (مشک گنج) دین محمد (وزیر گنج) منی لال (نکیٹ گنج) وغیرہ بہت مشہور تھے۔ بہت سے کاریگر اب بھی موجود ہیں جو اچھا کام کرتے ہیں۔

چھپائی کی ڈزائن:۔ ڈزائن تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) اور نیشنل پھول پتی بیلیں اور نیچر سے تعلق رکھنے والی چیزیں (۲) ماڈرن (آدمی، جانور، نراج، کرشن، کنھیا، لیلیٰ مجنوں، کسان، مکڑی کا جال، چوخانے اور گول جال وغیرہ) (۳) کیری دار (Pazly) یہ ڈزائن نوابی دور کی پسندیدہ ڈزائن ہے۔ اسی سے جامے دار (قیمتی کپڑے کی ایک قسم) وجود میں آئی۔ یہ اتنی مقبول ہوئی کہ انگرکھے، شیروانی، عمامے اور شال وغیرہ پر بننے لگی۔ کیریاں بھی کئی وضعوں میں ایجاد ہو گئیں جو اپنے موجد کے نام سے موسوم ہوئیں۔ مثلاً شبراتی کاریگر نے ایک نئی طرح کی کیری ایجاد کی اُسے شبراتی کیری کہتے ہیں۔ اسی طرح بلاقی کیری، نواب کیری اور رحیم کیری وغیرہ وجود میں آئیں۔

رنگ:۔ ریپڈ فاسٹ (Rapid Fast) انڈیگوسول (Indigosol) اور انڈن تھرین (Indane Threna) یہ رنگ پہلے جرمنی سے آتے تھے۔ اب یہیں تیار ہونے لگے ہیں۔

لکڑی کے چھاپے ٹھپے یا بلاک

لکڑی کے بلاکوں کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اگر ان کی ایجا

لکھنؤ کے فنکاروں نے مدد کی ہوتی تو چکن، کارچوب اور چھپائی کی صنعتیں بُری طرح متاثر ہوتیں۔ چکن اور کارچوب میں اب لکڑی کے ٹھپوں کا کام کاغذ سے لیا جاتا ہے مگر چھپائی آج بھی انھیں ٹھپوں سے ہوتی ہے۔ شیشم کی پرانی سوکھی اور سیدھے ریشے والی لکڑی پر بہت محنت دیدہ ریزی اور مہارت سے نقاشی ہوتی ہے۔

چھاپہ یا بلاک ساز:۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۳۰ء تک لکھنؤ میں چھاپہ سازی کا کام ہوتا رہا۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجے کے کاریگر رہے۔

آج اس فن کے ماہرین سے بھی لکھنؤ خالی ہو گیا۔ اب بارہ بنکی کے عطاءاللہ لکھنؤ والوں کو چھاپے فراہم کرتے ہیں۔ فرخ آباد میں عبدالرزاق اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن چھاپے سازی کرتے ہیں۔ بنارس۔ جے پور اور احمد آباد میں بھی چھاپے بنتے ہیں۔

لکھنؤ کی کچھ دستکاریاں آج اپنی مٹی ہوئی حالت میں بھی دنیا کے کونے کونے میں اپنی مقبولیت کے ڈنکے بجا رہی ہیں اور داد تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ لکھنؤ کی دستکاری آج بھی شہرۂ آفاق ہے۔

□□

گلشن عجب بہار کہ ہر قصر رشکِ خلد
اور گومتی غضب کی ہے دریائے لکھنؤ
حور و پری کو رشک تھا اک ایک شخص پہ
بے مثل تھے سبھی مہ سیمائے لکھنؤ

واجد علی شاہ اختر


تہذیب و معاشرت

کسی عہد کی
پہچان و شناخت تہذیبی مظاہر
و معاشرتی اقدار سے ہوتی ہے۔
اودھ نے جن تہذیبی
و معاشرتی اقدار کو جنم دیا تھا، اُن میں
نفاست، شائستگی، لطافت اور
ہم آہنگی تھی

امجد حسین

پروفیسر جعفر رضا

اودھ میں عزاداری

ہندوستان میں عزاداری کا اہم ترین مرکز اودھ رہا ہے۔ اودھ میں عزاداری کو دہلی یا دکن کے مقابلہ میں مختلف و متنوع جہات حاصل ہوئے۔ انھیں حکمرانوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سماج کے مختلف طبقوں کے لوگ اپنے طور پر عزاداری کرتے، جس میں کسی خاص عقیدہ کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ اہل اسلام ہی نہیں غیر مسلموں میں بھی انتہائی خلوص و عقیدت سے عزاداری کا رواج تھا۔ اودھ میں عزاداری کو قومی شناخت حاصل تھی۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی عزاداری کا آغاز ہو جاتا اور دسویں محرم کو تکمیل کو پہنچتا۔ نوابینِ اودھ نے ایام عزا کو سرکاری تعطیل قرار دے دیا تھا۔ اس دوران کسی طرح کی تقریبات مسرت منعقد کرنے کی ممانعت تھی۔ اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے ذیل میں بعض حقایق پر توجہ کی جاسکتی ہے۔

شمالی ہند میں تبرکات عزا کے طور پر علم حسینی برآمد کرنے کا سلسلہ حضرت شاہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار محرم کے موقع پر علم حسینی برآمد کیا اور اس کے زیر سایہ قیام کیا۔ ان کا دستور تھا کہ سبز دار کے طریقے پر علم اور زنبیل تیار کرتے۔ زنبیل کے ساتھ سادات اور متقی و پرہیز گار لوگوں کو اطراف و جوانب میں بھیجتے۔ بسا اوقات یہ فرض اپنے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ سید علی قلندرؒ کے سپرد کرتے۔ حضرت شاہ سمنانیؒ ۱۳۸۰ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح علم برآمد کرنے کا سلسلہ اس کے گرد و پیش شروع ہوا ہوگا۔ ان کے ملفوظات میں درج ہے کہ موصوف درمیان عشرہ محرم اچھا لباس زیب تن نہیں کرتے تھے، کسی تقریب مسرت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ آٹھویں اور دسویں محرم کے درمیان کی تاریخوں میں آرام ترک کر دیتے تھے۔ تیس برس تک خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کبھی غم حسینؑ سے غافل نہیں ہوئے۔

اودھ میں عزاداری کی ابتدا فیض آباد کی مشہور بابری مسجد کے چبوترے سے ہوئی۔ عشرۂ محرم کے دوران مسجد کے چبوترے پر ایک تعزیہ بنا کر رکھا جس کے بعد فیض آباد میں عزاداری شروع ہو گئی تھی لیکن یہ صرف نقش اولین تھا۔ عزاداری کا باقاعدہ رواج اس وقت ہوا کہ جب فیض آباد میں پہلا امام باڑہ نواب صفدر جنگ کی اہلیہ صدر جہاں بیگم نے شہر کے مشہور موتی باغ کے عقب میں ۱۷۴۴ء میں تعمیر کرایا اور اسی سے ملحق ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ یہ عمارتیں ہنوز موجود نہیں۔ فیض آباد میں دوسرا امام باڑہ شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم کا تعمیر کردہ ہے جس کی شہ نشین اور دیواریں عظمت پارینہ کی داستان کہتی ہیں۔ شجاع الدولہ نے بیاد تشنگان کربلا سبیل تعمیر کرائی جرأت نے تاریخ کہی:

پانی جو اس کا قاسم کوثر کو ہے نثار
جب ہوئے اس کو ہر دو جہاں میں اصل ہے
جرأت نے کی جو فکر میں تاریخ چاہ کی
دی ندا کہ "ذکرِ حسینی سبیل ہے"

۱۱۷۵ھ (مطابق ۱۷۶۱ء)

نواب شجاع الدولہ کو عزاداری سے خصوصی شغف تھا۔ اگر کسی جنگی مہم کے دوران عشرۂ محرم پڑ جاتا تو ایام عزا میں جنگ کو ملتوی رکھتے۔ فوجی خیموں میں مجلس عزا ہوتی۔ سپاہی تعزیے بنانے کے لیے بانس اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک بار ۱۷۶۰ء میں پانی پت کی مہم درپیش ہونے کی بنا پر شجاع الدولہ ... نوا...

دہلی میں تھا کہ محرم شروع ہوگیا۔ موصوف سیاہ پوش ہوگئے۔ دیگر ماتم داروں کے ہمراہ علم بردوش سروپا برہنہ ماتم کرتے ہوئے احمد شاہ کی قیام گاہ کے سامنے سے گزرے۔ اس واقعہ کا بیان سید غلام علی خاں کی زبانی سنیے

"سیہ پوش شدن نواب والا قدر است در محرم الحرام و
گذشتن با جماعہ سیہ پوشان از پیش در خانہ بادشاہی بایں ہیئت
کہ ہر یک از انہا سر و پا برہنہ علم بردوش گرفتہ سر و سینہ می زد۔ نواب
ہم بہمیں صورت شریک حال شان بود۔"۵۸

نواب شجاع الدولہ کے مقربین میں نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ حسن رضا خاں کو عزاداری سے جذباتی وابستگی تھی۔ اولاً اپنے مکان پر مجالس عزا منعقد کرتے رہے بعدہٗ ایک عالی شان امام باڑہ تعمیر کرایا جو زیارت گاہ خاص و عام بن گیا۔ قیام فیض آباد کے دوران عزاداری میں منہمک رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ بعد نماز پنجگانہ امام باڑے میں ضریح کے سامنے زیارت پڑھتے۔ مرزا سودا نے امام باڑہ میں علم استادہ کرنے کی تاریخ کہی:

چل قلم کہہ حسن رضا خاں ہے	ور دولت سرا جو بیرا ہے
ہے عجب طرح کی زیارت گہ	جس سے تحصیل دین و دنیا ہے
یاں علم نذر حضرت عباسؑ	صدق دل سے ترا جو برپا ہے
اے خوشا حال وہ کہ اس سے غرض	مخلصی آخرت کی کھا ہے

سال تاریخ اس علم کی ہے یہ
سر تو ہے سایہ اک علم کا ہے۵۹

اس دور کے فیض آباد میں جواہر علی خاں خواجہ سرا کی بدولت عزاداری میں خصوصی رونق پیدا ہوئی۔ جواہر علی خاں طبعاً مذہبی تھے۔ انھیں کی کوششوں سے فیض آباد میں باجماعت نماز جمعہ کا رواج ہوا حالانکہ نواب شجاع الدولہ کا حکم تھا کہ نماز باجماعت پڑھی جائے لیکن یاران طریقت عذر پیدا کرلیتے۔ جواہر علی خاں نے نماز پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک دستہ مرتب دیا جو لوگوں کو نماز پنجگانہ کے وقت مسجد میں لے آتے تھے۔ موصوف بہو بیگم کے خزانے کے وزیر تھے جو انھیں نواب ناظر کہتی تھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ جواہر علی خاں نے ایک امام باڑہ تعمیر کیا تھا جس میں بڑے خوشنما تھے عزاداری کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد داراب علی خاں نے امام باڑہ کی توسیع کی اور عمارت کو پختہ کردیا۔ یہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے اور اس میں عزاداری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ نے اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو عزاداری کی رونق سمٹ کر لکھنؤ آگئی حالانکہ بہو بیگم کی موجودگی کی بنا پر فیض آباد میں قدیم روایات کے مطابق عزاداری ہوتی رہی جسے کسی طرح کے زوال کا شکار نہیں ہونا پڑا لیکن لکھنؤ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ آصف الدولہ نے اپنے دست مبارک سے سرزمین لکھنؤ میں نہال عزاداری نصب کر کے خلوص و محبت سے اس طرح سیراب کیا کہ وہ تناور درخت بن گیا۔ موصوف نے لکھنؤ کے باہر دوسرے اضلاع میں عزاداری کے لیے کئی املاک وقف کیے۔ طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے حالانکہ بعد میں آصف الدولہ کی سی بات نہیں رہی مگر عزاداری سے اودھ کے ہر حکمراں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، نتیجے میں عزاداری کو لکھنؤ میں ایسا عروج حاصل ہوا کہ شاید و باید۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے لکھنؤ کے امام باڑوں کی سیر کی جاسکتی ہے، جو اپنی کہانی خود کہہ دیں گے کہ اتنے شاندار امام باڑوں میں کتنی عظیم الشان عزاداری ہوتی رہی ہوگی ان میں شاہی امام باڑے ہیں۔ امراء و روسا کے امام باڑے ہیں، بیگمات کے امام باڑے ہیں، عوام کے امام باڑے ہیں، مسلمانوں میں دونوں فرقوں کے امام باڑے ہیں، غیر مسلموں کے امام باڑے ہیں۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں کیوں کہ لکھنؤ میں گھر گھر امام باڑے رہے ہیں جن میں علم و تعزیے استادہ کیے جاتے۔ بعد محرم انھیں ایک جگہ دفن کر دیتے، جنھیں کربلا کہا جاتا ہے۔

امام باڑہ آصفی کو نواب آصف الدولہ کے عزاداری سے غیر معمولی شغف کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے، جو لکھنؤ میں ان کا تعمیر کردہ عظیم الشان امام باڑہ ہے، جو اودھ کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس امام باڑہ کی تعمیر کے لیے نواب موصوف نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ماہرین سے نقشے طلب کیے۔ کفایت اللہ کا تیار کردہ نقشہ پسند خاطر ہوا۔ اس کے اعتبار سے تعمیر کا کام شروع ہوا۶۰ اتفاق سے اودھ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں زبردست قحط کا شکار ہوگیا۶۱۔ تعمیر امام باڑہ کا سلسلہ دن کے علاوہ رات میں بھی جاری رہتا۔ عام لوگ دن میں مزدوری کرتے اور رات کی تاریکی میں غریب و فاقہ کش شرفائے شہر۔ یہ امام باڑہ دس سال کی

مدت میں ۵۰ لاکھ روپیے کی لاگت سے ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں مکمل ہوا۔ دالان کا طول ۱۶۰ فٹ عرض ۹۰ فٹ اور چھت ۲۰ افٹ چوڑی بالکل لداؤ کی بنی ہوئی بے ستون استادہ ہے۔ ہم عصر مورخ مرتضیٰ حسین بلگرامی لکھتے ہیں:

"ہیچ ملک را از املاک ہفت اقلیم بانی آں در رفعت و متانت وسعت پیدا نیست۔"

ایک یورپی سیاح ڈبلو ہیبر نے اس امام باڑہ کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ لکھتا ہے کہ:

"میں نے اس سے بہتر کسی دوسری عمارت کا نقشہ نہیں دیکھا جو ایسے نفاست، تنوع، تناسب اور خوش ذوقی کے اصولوں پر تیار کیا گیا ہو۔"

میرزا ابوطالب لندنی امام باڑہ آصفی کے ساز و سامان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اب تک ہر سال چار پانچ لاکھ روپے امام باڑہ کی آرائش پر صرف ہوتا ہے۔ سیکڑوں چھوٹے بڑے، سونے اور چاندی کے تعزیے بنائے گئے اور اس قدر کانچ کے جھاڑ فانوس اور سونے چاندی کی سادہ و رنگین قندیلیں خریدیں کہ جن کا حساب شمار سے باہر ہے۔ چنانچہ اس کشادگی کے باوجود دالان چھت سے زمین تک بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس کی صفائی کرنے والوں کو اپنے کام میں دشواری ہوتی ہے اور تعزیہ داروں کی آمد و رفت کے لیے مشکل سے جگہ نکل پاتی ہے۔ اس کے باوجود وزیر کا دل نہیں بھرا۔ جس وقت ڈاکٹر بلین ولایت (لندن) جارہے تھے تو نواب نے کانچ کے دو تعزیوں کی فرمائش کی جو جھاڑ فانوس اور دیگر لوازمات کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سبز رنگ کا ہو۔ ایک لاکھ روپے اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ ۱۲۱۱ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں ایک تعزیہ موصول ہوا اور دوسرا اگلے سال آنا طے ہوا۔"

بدقسمتی سے اگلے سال نواب موصوف کا انتقال ہوگیا اس لیے کہنا دشوار ہے کہ دوسرا تعزیہ لندن سے آیا بھی یا نہیں۔ امام باڑہ آصفی کے زیب و زینت کے متعلق اسی طرح کے بیانات مورخین میں سید عبداللطیف خاں شوستری، مرزا محمد کاظم وغیرہ نے کیا ہے لیکن سب کچھ لٹ چکا ہے ان تبرکات میں محض صندل کا ایک تعزیہ اور چند جھاڑ فانوس باقی رہ گئے ہیں، جو امام عزا میں استادہ کر دیے جاتے ہیں۔

درگاہ حضرت عباس کی پہلی تعمیر دور آصفی میں ہوئی۔ روایت ہے کہ باشندۂ منصور نگر (لکھنؤ) صوفی درویش مرزا فقیر بیگ کو حج کے موقع پر خواب میں بشارت ہوئی کہ لکھنؤ جاکر درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کریں۔ انھوں نے لکھنؤ واپس آکر نواب آصف الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ کئی مورخوں کا بیان ہے کہ آصف الدولہ نے درگاہ کے لیے اینٹوں کا گنبد تعمیر کرایا، ایک ہزار روپے انتظامات کے لیے عطا کیے اور وہاں ایک علم نذر کیا۔ حاجت مندوں نے حاضری شروع کر دی۔ درگاہ کی دوسری تعمیر و توسیع نواب سعادت علی خاں کے ہاتھوں ہوئی۔ انھوں نے فرش و فروش، جھاڑ فانوس و دیگر آلات شیشہ، چاندی کا منبر، چاندی کا صندوق اور سونے چاندی کے علم استادہ کیے۔ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں طلائی گنبد تعمیر کرایا۔ بارہ اماموں کے نام سے بارہ دروازے تعمیر کرائے۔ مرزا محمد حسن قتیل نے تاریخ کہی؛ ع

"ایں جدید بنائے سعادت است"

۱۲۱۷ھ

غازی الدین حیدر نے درگاہ میں نقار خانہ بلند تعمیر کرایا، نوبت اور گھڑیال لگائے۔ دیگر سامان آرائش کے علاوہ اندرون درگاہ چاندی کا دروازہ بنوایا اور چاندی کا منبر نذر کیا۔ عہد نصیر الدین حیدر میں ملکہ زمانیہ نے درگاہ کا باورچی خانہ بنوایا۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد ہجرت کے وقت واجد علی شاہ نے اپنی تلوار اور تاج درگاہ پر نذر کر دی۔ غدر کی لوٹ میں سب کچھ جاتا رہا۔ درگاہ بھی نزول میں آگئی۔ شرف الدولہ غلام رضا نے نزول سے واگذاری کرائی اور کچھ سامان نذر کیا۔

عزاداری سے متعلق متذکرہ بالا تفصیلات کی توثیق دربار آصفی کے منتخب خبرنامہ "انتخاب اخبار نواب وزیر بہادر و انتخاب دربار معلی و اطراف" سے ہوتی ہے جس کی دو جلدیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ لندن میں محفوظ ہیں۔ ان میں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء) سے ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ (نومبر ۱۷۹۶ء) تک کے دربار آصفی کے حالات اور آصف الدولہ کے کوائف درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آصفی امام باڑہ کو عزاداری میں مرکزیت حاصل تھی، لیکن نواب موصوف، بیگمات، امراء و رؤسا

کے امام باڑوں کے علاوہ سماج کے مختلف طبقوں کے افراد کے امام باڑوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ تعزیوں اور مجالس عزا کا سلسلہ محرم کا چاند دیکھتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ ذیل میں دونوں سال کے محرم کے کوائف کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء): اطلاع دی گئی کہ لکھنؤ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریذیڈنٹ مسٹر چیری امام باڑہ میں حاضری کے لیے آئے ہیں۔ نواب وزیر نے راجہ جھاؤلعل کو حکم دیا کہ فوراً جائیں اور مسٹر چیری کو امام باڑہ اور دیگر عمارتیں دکھائیں

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۸ جولائی ۱۷۹۴ء): منجموں نے مطلع کیا کہ آج کی تاریخ میں ہندوؤں کے دو دن پڑ رہے ہیں۔ چاند دکھائی پڑے گا۔ شام کو چاند دیکھنے کی بہت کوشش کی گئی۔ اطراف و جوانب میں خبر دی گئی کہ اگر کسی نے چاند دیکھا ہو تو مطلع کرے۔ لوگوں نے واپس آکر بتایا کہ کہیں بھی چاند نہیں دیکھا گیا۔ نواب نے کہا کہ شدید ابر باد کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جا سکا۔ انشاء اللہ کل دکھائی دے گا۔ بہر صورت کل ۳۰ ذی الحجہ ہے، جو ماہ کی آخری تاریخ ہے۔ علم، ضریح اور تعزیہ برآمد کرنا درست نہیں۔ ماتم، مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی ملتوی رکھی جائے۔ البتہ کل صبح ماتمی تقریبات ہوں گی۔

۳۰ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۹ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر امام باڑہ تشریف لائے، فاتحہ پڑھا اور جھاڑ فانوس اور آئینے ملاحظہ کیے۔ بعدہٗ محل کو واپس لوٹ گئے۔ مسٹر چیری کے امام باڑہ آنے کے دوران اعلان کے بعد تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ سیتل سنگھ کا فوجی دستہ ریذیڈنٹ کی خدمت میں سلامی پیش کرے۔ نواب وزیر بہ ہمراہ تحسین علی خاں امام باڑہ تک گئے تاکہ تعزیوں سے متعلق انتظامات کا بہ نفس نفیس معائنہ کر سکیں۔ نواب سرفراز الدولہ بہادر، مہاراجہ ٹکیت رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ نرمل داس بھی شامل ہو گئے۔ نواب وزیر نے امام باڑہ میں مسٹر چیری سے گفتگو کی۔ نواب نے تحسین علی خاں کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل سر جان شور کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ بعد عاشورہ نواب وزیر بہ نفس نفیس ان کے استقبال کے لیے شہر کے باہر تک جائیں گے۔ راجہ جھاؤلال نے تعزیہ پر نذر کے لیے اصلی زردوزی کے تبرکات پیش کیے۔ نواب نے انھیں پگڑی، دوشالہ، کان کے بالے، کمربند اور چہار پارچہ خلعت سے نوازا۔ نواب نے تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ فوج دار خاں کو تعزیہ کی تیاری کے لیے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے جائیں۔ غروب آفتاب کے قبل نواب وزیر نے غسل کیا، سیاہ ماتمی عمامہ زیب تن کیا تاکہ امام حسن و امام حسین کی یاد منا سکیں۔ انھوں نے چائے نوش کیا پھر مرثیہ خوان اور روضہ خوان طلب کیے گئے۔ تمام امراء کو باریابی عطا ہوئی۔ تحسین علی خاں کو مرثیہ خوانوں کے لیے بارہ دوشالے اور ایک بڑی رقم روضہ خوانوں کے لیے مرحمت ہوئی۔ بعدہٗ نواب وزیر اپنے محل سرا سے جانب امام باڑہ پاپیادہ گئے۔ برج طلائی کے نزدیک گھوڑے پر سوار ہوئے اور امام باڑہ کے دروازے پر اترے۔ طلائی علم اور پنجے تیار تھے۔ نواب امام باڑہ میں داخل ہوئے تو فوجی باجوں نے ماتمی دھن بجائی، نواب نے تعزیوں پر فاتحہ پڑھا اور اس کے گرد چکر لگایا۔ روضہ خوانی اور مرثیہ خوانی کے لیے حکم ہوا۔ مجلس کے بعد تحسین علی خاں کو حکم ہوا کہ مرثیہ خوانوں کو دو شالے اور روضہ خوانوں کو پانچ سو روپے فی کس دیے جائیں۔ آدھی رات کے بعد نواب وزیر محل سرا کو لوٹ گئے امراء درو سار بھی اپنے گھروں کو گئے۔ نواب وزیر نے محل سرا میں روضہ خوانوں کو طلب کیا۔ انھوں نے خوش گلوئی سے دردناک واقعات بیان کیے۔ موصوف نے دلی طور پر پسند کیا اور انھیں مزید پانچ پانچ سو روپے عطا کیے۔

یکم محرم ۱۲۰۹ھ (۳۰ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر علی الصباح بیدار ہوئے، غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور چائے نوش کی۔ سہ درہ محل میں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے (ضروری امور سے متعلق احکامات دیے)۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ امام باڑہ عتیق اللہ پر حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، احترام سے پانچ سو روپے تعزیہ پر نذر کیے۔ دیگر غربا و فقراء کے تعزیوں کی زیارت کی۔ اہل تعزیہ کی ضرورت کے پیش نظر کچھ روپے ہر ایک تعزیہ پر نذر کیے۔ اس کے بعد اپنے محل سرا کو لوٹ گئے۔ نواب وزیر کو اطلاع دی گئی کہ امام حسن و امام حسین کو خراج عقیدت کے طور پر ڈھول تاشوں کا شور مسٹر چیری کو پسند نہیں آیا۔ ریزیڈنسی چھوڑ کر اطراف میں بی بی پور چلے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی تیوہاروں کے منانے میں لغویات کے شکار ہیں۔ اب محرم کے بعد ہی

بی بی پور سے لکھنؤ واپس لوٹیں گے۔

۲ محرم ۱۲۰۹ھ (۳۱ جولائی ۱۷۹۴ء): سہ پہر کے بعد نواب وزیر بیدار ہوئے۔ محل کے تالاب میں غسل کیا۔ لباس تبدیل کر کے کرم صاحب کی بارہ دری گئے۔ وہاں سے فوجی چھاؤنی گئے، جہاں ہر ایک تعزیہ کے سامنے نذر گذاری۔ اس کے بعد اشرف علی خاں اور ان کے بھائیوں کے امام باڑہ گئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شریک ہوئے۔ ایک ہزار روپے نذر کیے۔ سواری پر پنج محلہ گئے اور خورد محل میں داخل ہوئے، جہاں خواتین کے تعزیوں پر بڑی رقم نذر کی۔ وہاں سے اپنے امام باڑہ میں واپس آئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ نواب نے انھیں دوشالہ اور زر نقد پیش کیا۔ معظم چیلا کو سیاہ دوشالہ، راجہ مشرا کے ندیم کو ہرا دوشالہ عطا کیا۔ راجہ کا تربیت یافتہ ملازم بھی دوشالے سے سرفراز ہوا۔

۳ محرم ۱۲۰۹ھ (یکم اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں ہتھنی گئے۔ غرباء کے تعزیوں پر زر نقد نذر کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔

۴ محرم ۱۲۰۹ھ (۲ اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں نواب حسن رضا خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر پانچ اشرفیاں نذر کیں بعدہٗ امام باڑہ حسن رضا خاں میں حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپے تعزیہ پر نذر کیے۔ حسن رضا خاں نے ایک حاجی کا تعارف کرایا جو عتبات عالیات کی زیارت سے واپس آیا تھا۔ اس نے کربلا کے تبرکات پیش کیے۔ نواب وزیر نے اسے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے۔ سواری میں میاں تحسین علی خاں کی حویلی آئے۔ امام باڑہ میں درود پڑھا، عقیدت سے پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ روضہ خواں کو دوشالہ عطا کیا۔ امراء و روساء کے ہمراہ ماتم میں شرکت فرمائی۔ شام کو محل سرا کو واپس ہوئے۔ وہاں مرثیہ سنا اور خوب روئے۔ راجہ جھاؤ لعل کے امام باڑہ میں حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ پھر الماس علی خاں کے مکان پر آئے۔ الماس علی خاں نے پندرہ اشرفیاں اور دو ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا کو لوٹ آئے۔ مرثیہ خواں طلب کیے گئے، جنھوں نے امام حسینؑ کے مصائب پر کلام پیش کیا۔ آدھی رات کے بعد بستر پر آرام کے لیے گئے۔

۵ محرم ۱۲۰۹ھ (۳ اگست ۱۷۹۴ء): دریائے گومتی عبور کر کے نواب وزیر فوج دار خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر ایک ہزار روپئے نذر کیے۔ وہاں سے مستان شاہ کے تعزیے کی زیارت کے لیے گئے۔ ایک صد روپے نذر کیے۔ مدے خاں نے نواب وزیر کی خدمت میں ایک ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا لوٹ آئے جہاں مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی سن کر متاثر ہوئے۔ ماتم میں شرکت کی۔ بعدہٗ خورد محل کی حرم سرا گئے اور بیگمات کی تنخواہ کی ادائیگی کے احکامات صادر کیے۔ وزیر علی خاں کے تعزیہ پر درود و سلام کے بعد اپنے امام باڑہ میں واپس آ گئے۔ مرثیہ خوانی، روضہ خوانی اور ماتم میں شریک ہوئے۔ بعدہٗ محل سرا کو واپس ہو گئے۔ نواب وزیر نے حکم دیا کہ تعزیوں کے گرد و پیش حفاظتی دستے مامور کر دیے جائیں اور نقص امن کے ملزموں کو ان کے روبرو پیش کیا جائے۔

۶ محرم ۱۲۰۹ھ (۴ اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر درگاہ حضرت عباسؑ پر حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپئے نذر کیے۔ اطلاع دی گئی کہ کل مرزا بہلو قتل اور تین افراد زخمی ہوئے۔ نواب وزیر نے قاتلوں کو قید خانہ بھجوا دیا۔ بعدہٗ تعزیہ نعیم علی خاں کی زیارت کو گئے اور زر نقد نذر کیا دیگر تعزیوں پر نذر گذارنے کے بعد اپنے امام باڑہ آئے، روضہ خوانی سنی، ماتم کیا اور محل سرا کو لوٹ گئے۔ راجہ نرمل رائے اور بلاس رائے نے مطلع کیا کہ کل درگاہ حضرت عباسؑ پر فساد کرنے کی بنا پر دو ہندوؤں کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان کی رہائی کی سفارش کی، جو قبول کی گئی۔ نواب وزیر اسیہ مئو گئے، جہاں تعزیہ پر نذر کی۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے کے تعزیہ کی زیارت کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ چار سو روپے نذر کیے۔ مہاراجہ اور ان کے عیال نے نواب وزیر کی خدمت میں نقد تحائف پیش کیے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ بعد میں محل سرا کو لوٹ آئے۔ اسی درمیان مسٹر چیری اور دیگر انگریز وارد ہوئے۔ انھوں نے نواب وزیر کے ساتھ روضہ خوانی میں شرکت اور ماتم کیا۔ حملہ آور دو کو پابہ زنجیر پیش کیا گیا، جو ہندو سنگھ کی تحویل میں دیے گئے۔ نواب وزیر پھر محل سرا سے وزیر باغ گئے اور تعزیوں پر نذر گذاری۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد حویلی مرزا جمعہ گئے۔ تعزیہ پر تین سو روپے نذر کیے اور

اودھ
آئینۂ ایام میں

کو لوٹ آئے۔ رات میں کھانا نہیں کھایا ماتم کرتے رہے۔

(۸ر محرم سے ۹ر محرم کا خبرنامہ مہیا نہیں ہے)

۱۰ر محرم ۱۲۰۹ھ (۸ر اگست ۱۷۹۴ء) : جلوس تعزیہ نے کشتی کے پل سے گومتی پار کیا۔ نواب وزیر بہ نفس نفیس دریا پار گئے اور حویلی فوج دار خاں کے قریب قیام کیا۔ تو تعمیر کربلا میں تعزیے دفن کرنے کے احکامات دیئے گئے۔ حویلی مرزا سلیمان شکوہ کے محافظ دستے کے سپاہی آئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ گذشتہ رات مرزا سلیمان شکوہ بے حد پریشان رہے اور اپنی اہلیہ ثانی کے مکان میں بند رہے۔ محافظ رات بھر گولہ باری کرتے رہے۔ کسی طرح فتنہ رفع دفع ہوا۔ نواب وزیر نے ماتمی لباس اور دو سو یا تین سو روپے سادات کو نذر کیے۔ ایک اہم سید میر محمد علی نمو نمائی کو ماتمی لباس اور ایک ہزار روپے دیے گئے۔

اسی طرح دوسرے سال کے محرم کے حسب ذیل کوائف ملتے ہیں:

۲۹ر ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ (۱۷ر جولائی ۱۷۹۵ء) : ابر باد کی بنا پر محرم کا چاند نظر نہیں آیا۔

یکم محرم ۱۲۱۰ھ (۱۸ر جولائی ۱۷۹۵ء) : شام کو امام باڑہ میں سونا اور چاندی کے تعزیے استادہ کیے گئے۔ نواب وزیر نے ماتم کیا۔

۲ر محرم ۱۲۱۰ھ (۱۹ر جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر نے حکم دیا کہ مداح علی خاں سے ۲۵ ہزار روپے حاصل کر کے تحسین علی خاں کے سپرد کر دیئے جائیں، جو فی کس پانچ روپے کے حساب سے غریب تعزیہ داروں میں تقسیم کر دیں۔ بعد میں فوج دار خان کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ ایک سو روپے نذر کیے۔ دکن اور کابل کی خبریں پڑھنے کے بعد اپنے امام باڑہ میں گئے اور تعزیوں کی زیارت کی۔

۳ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۰ر جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر نے راجہ جھاؤلعل کو حکم دیا کہ نجف اشرف میں روضۂ حضرت علی پر نذر کرنے کے لیے دو سو طلائی کمر بند اور ایک لاکھ روپے کی مالیت کے دیگر سامان روانہ کیے جائیں۔ نواب وزیر راجہ جھاؤلعل کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ [illegible] روپے نذر کیے۔ راجہ موصوف نے پانچ سو روپے نذرانہ میں پیش کیے۔

۴ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۱ر جولائی ۱۷۹۵ء) : کل نواب [illegible] علی خاں کے امام باڑہ کی زیارت کو گئے، سو روپے نذر کیے۔

غربا کے تعزیوں کی زیارت کی اور پانچ روپے فی تعزیہ نذر کیا۔

۵ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۲ر جولائی ۱۷۹۵ء) : کل نواب وزیر نے دین محمد چودھری کے تعزیہ کی زیارت کی اور سو روپے نذر کیے مزید سو روپے وارث علی کے تعزیہ پر نذر کیے۔ مسٹر چیری اور دیگر انگریز افسران ملاقات کے لیے نواب وزیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے امام باڑہ میں تعزیوں کی زیارت بھی کی۔

۶ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۳ر جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر نے راجہ بھوانی مشرا کے تعزیہ پر پانچ سو روپے نذر کیے۔ راجہ نے تحفہ میں دو ہزار روپے پیش کیے۔

۷ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۴ر جولائی ۱۷۹۵ء) : درگاہ حضرت عباس پر حاضر ہوئے اور پانچ سو روپے نذر کیے۔ وہاں سے مہاراجہ ٹکیت رائے کی حویلی گئے اور تعزیہ پر پانچ سو روپے نذر کیے۔ مہاراج نے پانچ اشرفیاں اور پانچ ہزار روپے نذر کیے۔ اس کے بعد نواب وزیر گھوگھٹ گئے اور میر مسیتا کے تعزیہ پر پانچ سو روپے نذر کیے۔

۸ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۵ر جولائی ۱۷۹۵ء) : شام کو نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ میاں عالم علی خاں کی حویلی سے حضرت قاسم ابن حسن کی یاد میں جلوس مہندی برآمد ہوا۔ نواب موصوف نے روضہ خوانی سماعت فرمائی اور ماتم کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔ چندے آرام کے بعد سواری میں امام باڑہ آغا باقر گئے، تعزیہ پر نذر گذاری اور محل سرا کو لوٹ آئے۔

۹ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۶ر جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر قدم رسول کی زیارت کو گئے اور تعزیہ پر سو روپے نذر کیے۔

۱۰ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۷ر جولائی ۱۷۹۵ء) : شب عاشور نواب وزیر کو متلی ہوئی، معالج حاضر ہوئے، دوائیں دی گئیں۔ صبح عاشور نواب وزیر بیدار ہوئے۔ امرا سلامی کے لیے حاضر ہوئے۔ نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ اپنے وزیروں کے ہمراہ ماتم کیا۔ اس کے بعد دریائے گومتی کے پار جلوس تعزیہ میں شریک ہوئے۔ بعد دفن تعزیہ محل سرا کو لوٹ آئے۔ بارہ گھنٹے مکمل آرام کیا، پھر بیدار ہوئے۔ ماتمی لباس زیب تن کیا۔ محمد علی نمو نمائی کو ایک لاکھ روپے

دیے۔ تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ شہزادوں، سادات اور ان کی خواتین میں ماتمی لباس تقسیم کیا جائے۔ امام حسن و امام حسین کے نام پر پانچ ہزار روپے غریبوں اور ناداروں میں خیرات کیے گئے۔ رات کے کھانے کے بعد نواب وزیر آرام کے لیے بستر پر گئے۔

۱۲ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۸ جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر حسب معمول بیدار ہوئے۔ امرا تعظیم بجالائے۔ مسٹر چیری بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ چونکہ ابر باد تھا، مسٹر چیری کو شال اوڑھنے کو دی گئی۔ انھوں نے نواب وزیر سے گفتگو کی۔

۱۳ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۹ جولائی ۱۷۹۵ء) : کل تحسین علی خاں کو حکم دیا گیا کہ ائمہ کرام کی یاد میں بڑے پیمانہ پر کھانا پکوا کر غربا و مساکین میں تقسیم کرائیں۔ محرم کے اخراجات کی تفصیل مع تعزیہ اور روشنی پیش کیے گئے۔ نواب وزیر نے ملاحظہ کیا۔

مذکورہ بالا کوائف کی روشنی میں آصفی دور کی عزاداری کا اجمالی خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے جن سے کئی اہم و معنی خیز معلومات حاصل ہوتے ہیں اولاً یہ کہ شہر لکھنؤ میں متعدد امام باڑے تھے جن میں نفاست سے قیمتی تعزیے و علم استادہ کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر گھر میں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنی توفیق کے اعتبار سے تعزیہ استادہ کرتا تھا۔ نواب آصف کی سیر چشمی کسی کو مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ بہ نفس نفیس چھوٹے بڑے امیر و غریب ہندو و مسلمان سب کے تعزیوں کی زیارت کے لیے جاتے اور زر نقد نذر کرتے۔ دوئم یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی صاحب اقتدار ہونے کے باوجود عزاداری میں مخل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے عملہ بھی عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔ سوئم یہ کہ نواب وزیر کی زرپاشی کا بہاؤ شیعوں کے مقابلہ میں سنیوں کی طرف اور سنیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی طرف زیادہ ہوتا تھا۔ روضہ خوانوں کو پانچ سو روپے فی کس ملتے تھے۔ لیکن مرثیہ خواں (جس میں مرثیہ نگار بھی شامل ہیں) کی قدر افزائی محض عطیہ دوشالہ تک محدود تھی۔ کسی کو زر نقد نہیں دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ مرثیہ گویوں کے احترام کے پیش نظر کیا جاتا ہو، بہر حال نواب آصف الدولہ کی زرپاشی سے سارا شہر فیض یاب ہو رہا تھا، علاوہ مرثیہ گویوں کے۔ اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ نوابین اودھ کی زرپاشی سے مرثیہ نے اودھ میں عروج حاصل کیا۔ چہارم یہ کہ عزاداری محض عشرہ محرم تک محدود تھی۔ گیارہویں محرم سے معمولات شروع کر دیے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دور آصفی میں عزاداری کو عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی مختلف العقائد کے برگ و بار میں یہ تناور درخت فطری نشو و نما پا رہا تھا۔ اس کی جڑیں عصری سماجی زندگی میں پیوست تھیں۔ آصف الدولہ نے اظہار محبت و مودت اہل بیت اطہار میں باہمی ہم آہنگی کو رشتہ جاں بنا دیا تھا۔ اس کے مخالف کو عتاب آصفی کا شکار بننا پڑتا تھا۔ آصفی سرپرستی ابر نیساں کی طرح عام تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت کے بادشاہ عراق کی لاپروائی کی بنا پر زائرین کو کربلائے معلٰی میں پانی کی قلت سے شدید تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ نواب موصوف نے حاجی محمد طہرانی کی معرفت ۷ لاکھ روپے صرف کر کے فرات کی ایک نہر تعمیر کرائی جو "نہر آصفی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب یہ نہر معدوم ہو چکی ہے لیکن اس سے آصف الدولہ کے عقاید محبت و مودت اہل بیت اطہار کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آصف الدولہ فدائے محمد و آل محمد کی حیثیت سے زندہ رہے اور انھیں کی محبت و مودت میں موت سے ہم کنار ہوئے۔

آصف الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب وزیر علی بخش کو بے دخل کر کے انگریزوں کی امداد سے نواب شجاع الدولہ کی دوسری بیوی کے بیٹے سعادت علی خان کو نواب وزیر کا عہدہ حاصل ہوا۔ نواب سعادت علی خان میں آصف الدولہ کی طرح کی داد و دہش کی اعلا صفات نہیں تھیں لیکن انھوں نے دربار کے آصفی ماحول کو برقرار رکھا۔ لکھنؤ کو فنون لطیفہ اور شعر و شاعری میں مرکزیت عطا کرنے کی کوشش کی۔ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے دربار کو آراستہ کیا گیا۔ عزاداری میں فروغ ہوا۔ درگاہ حضرت عباس میں ہر جمعرات کو خوب گہما گہمی ہوتی۔ سال بھر مجلسیں، نذر و نیاز اور فاتحہ و درود کا سلسلہ رہتا۔ محرم میں شہر بھر سے ہزاروں کی تعداد میں علم برآمد کیے جاتے، جو درگاہ حضرت عباس میں نذر کیے جاتے۔ دور نواب سعادت علی خاں میں عزاداری کے جوش و خروش کے متعلق سید انشا بیان کرتے ہیں:

اس کی مدد کو ہیں حسنین [illegible]   ہوتی ہے اس میں تعزیہ داری امام کی

دورِ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء۔۱۸۱۴ء) کو عزاداری میں اس بنا پر بھی امتیاز حاصل ہے کہ اسی زمانہ سے لکھنؤ میں چہلم کی ابتدا ہوئی۔ اس کے قبل عشرۂ محرم کے بعد عزاداری کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا جو آئندہ سال ہلال محرم دیکھنے کے بعد شروع ہوتا۔ اس دور کے ایک ممتاز مرثیہ خواں میر احسان علی نے عشرۂ عزا کی توسیع کر کے چہلم کی ابتدا کی۔ اس کے بعد غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء۔۲۷ء) کی حکومت نوابی سے بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو عزاداری میں بھی فروغ ہوا۔ نجف اشرف میں روضہ حضرت علی کی شبیہ کے طور پر ایک نیا امام باڑہ شاہ نجف تعمیر کیا گیا، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کے قریب ہی قدم رسول بھی ہے۔ غازی الدین حیدر کے دور میں شاہ نجف کو شاہی عزاداری کی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے شاہ نجف میں عزاداری کے لیے کافی دولت وقف کی تحریری معاہدہ کے مطابق ایک خطیر رقم ایسٹ انڈیا کمپنی میں جمع کر دی تاکہ سال بہ سال عزاداری ہوتی رہے۔ غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ جو ایک کنیز کے بطن سے تھے لیکن غازی الدین حیدر کی اہلیہ بادشاہ بیگم نے اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے دور میں بادشاہ بیگم کے اثرات بہت بڑھ گئے۔ موصوفہ مذہبی مزاج رکھتی تھیں اور عزاداری میں خصوصی شغف تھا۔ انھوں نے عزاداری سے متعلق مختلف و متنوع مراسم کی ابتدا کی۔ ایام عزا میں مزید توسیع کی گئی۔ ۸ ربیع الاول تک جلوس عزا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے نصیر الدین حیدر کے جلوس کے پہلے سال ہی ایک فرمان جاری کر کے چہلم تک تقریب مسرت کرنے پر پابندی عاید کر دی۔ انگریز ریزیڈنٹ نے مداخلت کی، جس کے نتیجے میں نصیر الدین حیدر نے ماتم داری کو اختیاری قرار دے دیا لیکن عزاداری کی جڑیں اودھ کی عوامی زندگی میں اس طرح پیوست ہو چکی تھیں کہ ہر عام و خاص بہ رضا و رغبت چہلم تک خوشی کی کوئی تقریب نہیں کرتا تھا، نہ اس میں شرکت کرتا تھا۔

اس دور کی عزاداری کی تفصیلات ولیم نائٹن اور مسز میر حسن علی نے بیان کیے ہیں۔ یہ بیانات تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ولیم نائٹن ساڑھے تین برس تک نصیر الدین شاہ کا مصاحب رہا۔ روزانہ کے واقعات بطور یادداشت لکھتا رہا۔ مسز میر حسن علی انگریز خاتون تھیں، جنھوں نے کسی امیر حسن علی سے شادی کر لی تھی۔ دونوں کے بیانات پایۂ اسناد رکھتے ہیں۔ دورِ نصیر الدین حیدر میں لکھنؤ کی عزاداری کے متعلق ولیم نائٹن نے اپنی کتاب میں ایک باب رکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس زمانے میں امام باڑوں میں روشنی کی یہ بہتات اور اسی روشنی میں کارچوبی کام کی چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی ہے کہ آدمی کی نظر کو جیسے چکا چوندھ لگ جاتی ہے۔ علموں کے طلائی و نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ۔ زردوزی کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور ان کی وجہ سے در و دیوار آب و تاب بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا...... ایام محرم میں برابر تعزیوں کے گرد بڑی بڑی سرخ و سبز رنگ کی موی توغیں روشن رہا کرتی ہیں اور شب و روز دو مرتبہ مجالس عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی ہیں جس میں شام کی مجلس زیادہ دلچسپ ہوتی ہے...... (شاہی) جلوس میں سب کے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے جن پر مغرق جھولیں پاکھریں پڑی، نقرئی، طلائی ہودے، عماریاں اور گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکتی ہوئی ہوتی تھیں ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے اور ان کے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارد ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھڑی سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھڑ کے اوپر ایک الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے ان کے گرد و پیش خاندان شاہی کے لوگ مقرب، مقرب علمائے مذہب ہوتے تھے۔"[۵۳]

مسز میر حسن علی شب عاشور کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

"غریب ہو یا امیر، ہر ایک عزادار اپنے امام باڑے کو حتی الوسع آراستہ کرتا ہے۔ اتنی روشنی کی جاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ رات پھر لوگ روشنی دیکھنے کے لیے

پھرتے رہتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں میں گریہ وزاری کرتی ہیں۔ رات بھر مجلس و ماتم کرتی ہیں۔"[۲۳]

ہندؤوں کی عزاداری کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

"ہر شیعہ کے گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ ہندؤوں میں بھی تعزیہ سے عقیدت عام ہے۔ وہ لوگ تعزیہ کو دیکھ کر مودبانہ جھک جاتے ہیں۔ مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بخوشی اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ امام باڑہ میں کوئی بھی شخص داخل ہونے سے قبل اپنے جوتے اتار دیتا ہے۔ یہ اس قدر عام ہے کہ اب یورپین لوگوں کے علاوہ کسی سے جوتے اتارنے کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"[۲۵]

اپنا ایک دلچسپ تجربہ لکھتی ہیں:

"میرا باورچی ایک مجوسی تھا۔ عزاداری میں چالیس روپے خرچ کرتا تھا اور مسلمانوں کی جوش وخروش کا اظہار کرتا تھا۔ روز عاشورہ دفن تعزیہ کے بعد اپنے دھرم کرم میں لوٹ آتا تھا۔"[۲۶]

بادشاہ نصیر الدین حیدر کی عزاداری کے متعلق مولوی نجم الغنی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ہر امام کی ولادت کی تاریخ میں حسب قاعدہ مجلس عزا برپا ہوتی تھی اور بارگاہ پھولوں سے نہایت خوشنما تیار ہوتی تھی۔ باغات سلطانی میں جتنے خوشبودار پھول ہوتے وہ اور ان کے سوا بازاروں سے پانچ ہزار روپے روز کے پھول عشرہ محرم تک مول آتے تھے۔ اس زمانے میں خوشبودار پھول بڑے آدمیوں کو بھی مشکل سے ملتے تھے۔ اس بارگاہ کا طول سو قدم سے کم نہیں ہوتا تھا اور عرض پندرہ بیس قدم سے زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی طلائی کبھی نقرئی مقیش اور ستاروں اور بادلے کی جھالریں پھولوں کی جگہ کام میں لائی جاتی تھیں۔ عطریات سے وہ مکان بسایا جاتا تھا۔ غرضیکہ ہر امام کی ولادت کی تقریب میں پہلے دن سے چھ دن تک برابر اور ہر امام کی وفات کے دنوں میں کئی روز تک اور محرم کی پہلی تاریخ سے چہلم تک بادشاہ نے اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ بہ نفس نفیس وہاں کی خدمت ہزار دل و جان سے فرماتے تھے۔ وفات و شہادت کے دنوں میں مرثیہ خوانی ہوتی اور شربت اور مٹھائی اور میوہ جات صرف ہوتا تھا۔ ان مصارف میں چار پانچ لاکھ روپوں سے کم خرچ نہ ہوتے بلکہ زیادہ تصور کرنا چاہیے۔ بادشاہ محرم کی پہلی تاریخ کو سو پچاس تعزیے در دولت سے مقام معہود تک اپنے سر پر پہنچاتے تھے۔ ہر مرتبہ کی آمد و رفت میں کئی کوس زمین پا پیادہ طے ہوتی تھی اور آنا جانا کنکریوں کی زمین پر برہنہ پا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ تلووں سے وہ کنکریاں کانٹوں کی طرح کھٹکتی تھیں۔"[۲۷]

دور محمد علی شاہ ۱۸۳۷–۴۲ء میں امام باڑہ حسین آباد کی تعمیر کے بعد یکم محرم کو جلوس ضریح کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ضریح امام باڑہ آصفی میں لے جائی گئی۔ وہیں سے جلوس برآمد ہوتا۔ اس جلوس نے عزاداری میں مزید شان پیدا کردی۔ اس کے پہلو بہ پہلو شیخ خدا بخش کے جلوس چہلم کی شہرت تھی۔ عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک باشندہ نجات حسین خاں خاص طور پر لکھنؤ کا جلوس چہلم دیکھنے آیا۔ اس نے جلوس چہلم کی متحرک تصویر پیش کی ہے کہ "سہ پہر کو جلوس دارالشفا کی مسجد (اب وجود نہیں ہے) کے قریب سے گذرا۔ آگے آگے سات روٹیاں سیاہ کپڑوں میں ڈھکی ہوتی تھیں، ان کے سوار بھی سیاہ پوش تھے۔ اس کے بعد سترہ سیاہ پوش ہاتھی تھے، جن پر بلند پرچم اور علم استادہ تھے۔ سیاہ و سرخ پھریرے کے علم تھے، جن پر اللہ اور پنجتن محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین کے نام سونے اور چاندی کے تاروں سے بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد سرکاری لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے ماہی مراتب تھے۔ جلوس ایک میل سے زیادہ لمبا تھا۔ پیچھے ماتمی دھن بجاتے ہوئے دستے تھے۔ اس کے پیچھے "آب خوارہ" (پانی شربت وغیرہ) تھا، جو سرکار کو سیر و سیراب کررہا تھا۔ اس کے بعد دو تین ذوالجناح اور تابوت تھے۔ تابوت پر تیر آویزاں تھے۔ ذوالجناح پر خون کے دھبے تھے۔ ان کے پیچھے سیکڑوں لوگ سروں پر تعزیے اٹھائے تھے۔ سب کے آخر میں شیخ خدا بخش کا تعزیہ تھا۔ تعزیوں کے گرد و پیش ہزاروں ماتم دار تھے جو پیادہ

آنکھوں سے آنسو جاری. مختلف قوموں کے الگ الگ گروہوں میں شامل تھے ماورالہندی مغل وغیرہ الگ ماتم کرتے تھے. عجب عالم تھا کہ اگر امام حسین کا قاتل شمر آجائے تو تڑپ اٹھے. [18]

سید امجد علی شاہ (۴۷-۱۸۴۲ء) انتہائی مذہبی تھے. ان کے دور میں عنان سلطنت دو علمائے شیعہ سلطان العلماء سید محمد مجتہد اور سید العلماء سید حسین مجتہد کے ہاتھوں میں تھی. فطری طور پر عزاداری میں خصوصی دلچسپی لی گئی. امام باڑہ سبطین آباد تعمیر ہوا، جس کا ذکر ہو چکا ہے. امام باڑہ کو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا. ایام عزا میں روشنی کا خاص اہتمام کیا جاتا. بڑی شان و شوکت سے عزاداری ہوتی. امجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب امین الدولہ بھی بڑے دیندار اور متقی و پرہیزگار تھے. انھوں نے بھی اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا۔ بادشاہ کے معتمد اور داروغہ عمارات جگن ناتھ اگروال (بعدہٗ غلام رضا خاں) نواب شرف الدولہ نے بھی شاندار امام باڑے تعمیر کرائے جن کا ذکر آچکا۔ ان میں بھی شاندار عزاداری ہوتی تھی. عزاداری سے امجد علی شاہ کے غیر معمولی شغف کا ذکر کرتے ہوئے مولوی نجم الحسن لکھتے ہیں:

"ایک بار مرزا حیدر شکوہ شاہزادہ تیموریہ نے امجد علی شاہ سے عرض کیا کہ ایک رات میرے تعزیہ خانہ میں شعاع آفتاب سے بھی تیز نور حضرت امام حسین کی ضریح پر ظاہر ہوا. در و دیوار و چھت بھی زیادہ چمکنے لگی اور حضرت عباس کا علم جو ضریح کے پاس کھڑا تھا، وہ ضریح پر جھک گیا. بادشاہ نے یہ سن کر ڈھائی ہزار روپے دے کر شاہزادے سے وہ ضریح و علم خرید کے اپنے تعزیہ خانے میں رکھوا لیے...... اسی طرح ایک دن میر ذکی مرثیہ خواں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میرے مکان میں حضرت امام حسین کا پنجہ موجود ہے. بادشاہ نے وہ مانگ لیا اور انعام بخشا..." [19]

شاہی محل میں بھی بڑے جوش و خروش سے عزاداری ہوتی تھی جس میں ملکہ انشار کی تین نواسیاں مرثیہ پڑھتی تھیں! [20]

آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے دور میں بجھتی ہوئی شمع کی لَو اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں.

واجد علی شاہ مختلف علوم و فنون کی سرپرستی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ خود ماہرانہ دسترس رکھتے تھے. وہ خود مرثیہ گو و مرثیہ خواں تھے. عزاداری سے بے پناہ شغف تھا. اہلبیت اطہار اور خاص کر امام حسین پر دل و جان سے نثار تھے۔ انھوں نے بھی قصر العزا کے نام سے قیصر باغ میں عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کرایا، جس کا ذکر آچکا ہے. انتزاع سلطنت اودھ تک لکھنؤ میں انتہائی جوش و خروش سے عزاداری کرتے رہے. بعدہٗ قید فرنگ نے مٹیا برج میں ڈالا تو وہاں بھی سب کچھ عزاداری پر نثار کرتے رہے. شرر لکھنوی لکھتے ہیں:

"مٹیا برج میں بادشاہ کی محرم کی خاص طور پر تیاریاں کی جاتیں سب امام باڑے آراستہ ہوتے. گھروں میں اندر باہر قلعی کر دی جاتی. بادشاہ کے یہاں ۲۹ ذی الحجہ کو ضریح کے ساتھ ماہی مراتب، شاہی جلوس، جھنڈی بردار اور باجے والے ہوتے. کہیں کہیں ۳۰ ذی الحجہ یا پہلی محرم کو تعزیے آتے. بادشاہ ۲۹ ذی الحجہ سے ماتمی لباس پہن لیتے جو اکثر سبز ہوتا اور کبھی سیاہ. محرم میں مٹیا برج میں جگہ جگہ لنگر جاری ہو جاتا. شاہی مجلسیں روزانہ ہوا کرتیں، جن میں پلاؤ، شیرمال یا باقرخانیاں تقسیم ہوتی. مقامی ذاکرین کے علاوہ دیگر مقامات اور زیادہ تر لکھنؤ سے ذاکر آتے اور بادشاہ کی طرف سے انعام اور خلعت لے کر واپس جاتے.... ساتویں محرم کو مہندی اٹھتی تھی اور اسی روز نواب نشاط محل بادشاہ کو منت کا چھلا اور ناڑہ پہناتی تھیں. مغرب کے وقت بادشاہ بھی مہندی کے ساتھ ہوتے بڑے کروفر باجے اور جلوس سے جاتی.... دسویں محرم کو علی الصبح سب سے پہلے سبطین آباد کی شاہی ضریح ہوتی. اس کے بعد محلات کے تعزیے اور دولہاؤں کے تعزیے پوری شان و شوکت اور جلوس سے اٹھائے جاتے اور غلام عباس کی کربلا جاتے. سبطین آباد کی ضریح نو یا سوا نو بجے کربلا پہنچ جاتی پھر دن بھر دوسرے تعزیوں کا سلسلہ جاری رہتا. بادشاہ ابتدا میں کربلا تک ضریح کے ساتھ پیادہ پا جاتے تھے مگر آخری عمر میں ضعف کی وجہ سے تھوڑی دور جا کے واپس آجاتے. مجلسوں کا سلسلہ چہلم تک جاری رہتا. سوم، دسویں، بیسویں اور چہلم کی مجلسیں بڑے پیمانے پر ہوتیں۔"

مذکورہ بالا جائزہ اودھ میں عزاداری کا محدود خاکہ پیش کرتا ہے

اودھ آئینہ ایام میں

جس میں سلطنت اودھ کے دو مراکز فیض آباد اور لکھنؤ کی عزاداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مراکز حکمرانوں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کے باہر عوامی سطح پر عزاداری کو مقبولیت حاصل تھی۔ اودھ کا کوئی علاقہ ایسا نہیں رہا ہوگا جس میں عزاداری نہ ہوتی رہی ہو، خواہ وہ نواب سعادت علی خاں کے معاہدۂ الہ آباد (۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء) کے قبل کا اودھ ہو یا بعد کا۔ ان میں بعض مقامات کی عزاداری اپنے اطراف و جوانب میں مشہور و معروف رہی ہے۔ شہروں میں خاص طور پر الہ آباد، بنارس، جونپور، بہرائچ، اناؤ، غازی پور وغیرہ اور قصبات میں زید پور اور رودولی (بارہ بنکی) محمود آباد (سیتاپور) مچھلی شہر (جونپور) اتراؤں (الہ آباد) جائس و نصیر آباد (رائے بریلی) وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اودھ کے تقریباً ہر شہر اور زیادہ تر دیہاتوں میں عزاداری ہوتی رہی ہے۔ ان میں سلطنت اودھ کی عزاداری کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن مقامی ضرورتوں کے اعتبار سے ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہی ہے۔ ان شہروں اور دیہاتوں میں بھی مرثیہ نگار ہوئے ہیں لیکن عام طور پر مشہور مرثیہ نگاروں کے مراثی کی خواندگی پر زور رہا ہے۔ جلوس ہائے عزا کے متعلق بھی ضابطے مقرر رہے ہیں۔ کس منزل پر کون مرثیہ پڑھا جائے گا اور کون پڑھے گا اس کی بھی پابندی کی جاتی رہی ہے۔ عوام میں نوحہ کے طرز پر "دھنوں" کا رواج ہوا۔ 'ڈہے' اپنے آپ میں ایک صنف شاعری ہے۔ جلوس کے ساتھ عام طور سے دیہاتی عورتیں لحن سے کہتی ہوئی گزرتی تھیں، جس کو اصطلاحاً 'ڈہارنا' کہتے ہیں۔ ان مباحث پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، جس کا متحمل یہ مضمون نہیں ہو سکتا۔

حواشی :

۱۔ سیّد اطہر عباس رضوی اے سوشیو انٹلکچول، ہسٹری آف اثنا عشری شیعز ان انڈیا۔ ج ۱ ص ۳۰۸۔

۲۔ لطائف اشرفی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۸

۳۔ ایضاً ایضاً

۴۔ سید کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ ج ۲۔ ص ۱۱۰

۵۔ فیض گزٹیو ص ۲۱۵

۶۔ کلیات جرأت (مخطوطہ) ورق نمبر ۲۱۰ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

۷۔ محمد خاں شاہجہاں پوری "ملفوظات رزاقی" ص ۱۰۴

۸۔ سید غلام علی خاں "عماد السعادت ص ۸۳ ۹۔ کلیات سودا (مخطوطہ) نسخہ محمد آباد

۱۰۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۱۔ لکھنؤ گزیٹیر ص ۲۰۲

۱۲۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۳۔ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۵

۱۴۔ ڈبلو ہیبر، نیریٹو آف دی جرنی ۱۵۔ مرزا ابو طالب لندنی تفضیح الغافلین ص ۱۱۵

۱۶۔ سید عبد اللطیف خاں شوستری "تحفۃ العوام ص ص ۵۳۳۔۵۳۴

۱۷۔ مرزا محمد کاظم، رسالہ سوانح عمری ص ۴۸۔۴۷

۱۸۔ سید غلام علی خاں "عماد السعادت ص ۱۷۲، تحا ص ولیم بیل مفتاح التواریخ ترجمہ حص نجم الغنی "تاریخ اودھ ج ۳ ص ۳۰۰

۱۹۔ سیّد اطہر عباس رضوی، ہسٹری آف اثنا عشری شیعز ان انڈیا ج ۱ ص ۳۰۹

۲۰۔ ڈاکٹر اکبر حیدری (اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص ۹۲) نے کربلا کی بجائے نجف لکھا ہے جو غیر صحیح ہے۔ ج۔ر۔

۲۱۔ سید خیرات حسین تنویر امامت ص ۵۴ (مخطوطہ) محمد علی جونپوری رفیق الزائرین ص ۵۵

۲۲۔ کلیات انشا، مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۴۴ھ

۲۳۔ ولیم ناٹن، دی پرائیوٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ (اردو ترجمہ، شباب لکھنؤ محمد احمد علی) ص ص ۱۴۶۔۱۴۹ (لکھنؤ ۱۹۱۳ء)

۲۴۔ مسز میر حسن علی، آبزرویشن آن دی مسلمان آف انڈیا ص (سنہ اشاعت ۱۸۳۲ء)

۲۵۔ ایضاً ایضاً ص ص ۱۷۔۲۸

۲۶۔ " وان ڈورنگ آف پل گرمس ان سرچ آف پکچرس ڈیورنگ فور اینڈ ٹوینٹی ایرس ان دی ایسٹ ج ۱ ص ۲۹۶ (سنہ اشاعت ۱۸۵۰ء)

۲۷۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۴ ص ص ۳۹۶۔۳۹۷

۲۸۔ سیّد حسن، چند تحقیقی مقالے ص ۷۔۹ (پٹنہ ۱۹۷۶)

۲۹۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۵ ص ۲۴ ۳۰۔ عبدالحلیم شرر، جان عالم ص ص ۷، ۵۹

> "قدیم لکھنؤ میں بیسنی روٹی بڑی پسندیدہ غذا تھی۔ آخری تاجدارِ اودھ کو بیسنی روٹی سے عشق تھا"۔
>
> لکھنؤ کا دسترخوان۔ مرزا جعفر حسین

ڈاکٹر نیر مسعود

لکھنؤ کی یادگار مجلسیں

پُرانے دنوں کی جو مجلسیں مجھے آج بھی یاد ہیں ان کا سلسلہ تقسیم ہند کے کچھ قبل سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اودھ میں زمین داریوں، جاگیرداریوں اور وثیقوں کی کمی نہیں تھی۔ لکھنؤ کے پُرانے رئیسوں اور وثیقہ داروں کے پاس دولت گھٹ جانے کے بعد بھی بہت تھی اس لیے مجالسِ عزا میں بڑے اہتمام ہوتے تھے جن کا اظہار امام باڑوں کی آرائش اور اس سے بھی زیادہ تبرک کی تقسیم میں ہوتا تھا۔ پُرانے گھروں کے بہترین نوادر، خواہ وہ جھاڑ فانوس ہوں یا گھڑیاں، یا قیمتی آئینے یا تاریخی اسلحہ یا خطاطی کے اعلیٰ نمونے، دیوان خانوں اور ملاقاتی کمروں سے زیادہ امامباڑوں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ تبرک بھی حسبِ توفیق بہتر سے بہتر ہوتا تھا۔ میرے یہاں تانبے کی ایک بڑی قلعی دار لگن تھی جس میں تین چار کلو آٹا گوندھا جا سکتا تھا۔ اس لگن میں کسی تعلقے سے کھیر کا تبرک آیا تھا۔ شاہی اوقاف اور بڑے رئیسوں کے یہاں کی مجلسوں کا تبرک اصل مجلس سے بہت پہلے دعوتی رقعوں کے ساتھ تقسیم ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر خاصگی کھانوں کے پورے پورے خوان ہوتے تھے اور یہ شہر کے خاص خاص لوگوں کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ اصل مجلس میں الگ سے تبرک کی عام تقسیم ہوتی تھی۔

عشرۂ محرم کی مجلسوں میں حسینیۂ غفران مآب، مدرسۂ ناظمیہ، تعزیہ حسینی، حسینیۂ سید تقی صاحب وغیرہ کی مجلسیں بہت مقبول تھیں۔ حسینیۂ غفران مآب میں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین عرف کبّن صاحب مرحوم پڑھتے تھے۔ لکھنؤ کی فصیح زبان کے ساتھ ان کی پختہ آواز جو کبھی گرفتہ نہیں ہوتی، مجلس میں ایک شان پیدا کرتی تھی۔ عاشورے کا دن گزر کر اسی امامباڑے میں وہ شامِ غریباں کی مجلس کو خطاب کرتے تھے جو ننگی زمین پر اندھیرے میں ہوتی تھی۔ یہ مجلسیں آج بھی ہوتی ہیں اور آج بھی ان میں بڑا مجمع ہوتا ہے۔

مدرسۂ ناظمیہ میں مولانا ابرار حسین صاحب پاروی مرحوم پڑھتے تھے۔ مجلس سے پہلے سامعین میں تازہ بھرے ہوئے حقے گردش کرتے رہتے تھے اور عمدہ لکھنوی تمباکو کی خوشبو سے عمارت کے دالان بھر جاتے تھے۔ مجلس شروع ہونے کے وقت حقے ہٹا دیے جاتے تھے اور پاروی صاحب منبر پر بیٹھتے۔ سفید ململ کے انگرکھے میں ان کا بدن خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ذاکری میں بھی ایک کیفیت تھی۔ مصائب پڑھنے میں کبھی کبھی ان کی آواز تقریباً غائب ہو جاتی تھی لیکن ان کے چہرے کے تاثرات اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

تعزیہ حسینی کی مجلس سہ پہر کو ہوتی تھی۔ اس کے بانی مرحوم اکبر حسین زری والے تھے۔ یہاں مجلس سے قبل نفیس کشمیری چائے تقسیم ہوتی تھی۔ یہاں سید نجم الحسن نثار مرحوم پڑھتے تھے جو نثر خوانی کے آخری کامل استاد تھے۔ نثر خوانی کی مجلس میں نثر کے جملوں کے ساتھ، مگر ان سے کچھ زیادہ اشعار، خصوصاً مرثیوں کے بند پڑھے جاتے تھے۔ نجم الحسن مرحوم کی آواز ہمیشہ گرفتہ رہتی لیکن پوری مجلس کو بخوبی سنائی دیتی تھی۔ وہ نثر کے جملے آہستہ آہستہ ہموار لہجے میں ادا کرتے، پھر اچانک ان کے تیور بدل جاتے، آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور وہ پوری قوت اور عجب کیفیت کے ساتھ مرثیوں کے بند پڑھتے۔ میں نے مرثیوں کی بہترین خوانندگی انھیں سے سُنی۔ (ایک بار میں نے اپنے ایک بزرگ مرثیہ خوان سے دریافت کیا کہ آپ لوگ نجم الحسن صاحب کے سے زور و شور کے ساتھ مرثیہ کیوں نہیں پڑھتے۔ انھوں نے

کہا کہ ایک تو نثر خوانی کی مجلس مقابلۃً مختصر ہوتی ہے، دوسرے نثاروں کو نثر کے فقروں کی وجہ سے سستانے کا موقع مل جاتا ہے اور لگاتار پانچ چھ بند سے زیادہ نہیں پڑھنا پڑتے اس لیے وہ پوری قوت سے پڑھ کے نثر کے فقروں میں آرام کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ اگر سو ڈیڑھ سو بند کا مرثیہ مسلسل اسی زور اور قوت کے ساتھ پڑھیں تو کلیجہ پھٹ جائے")۔

قصرِ حسینی کی ان مجلسوں میں عزادار بڑے شوق سے آتے اور ہر مجلس سے پہلے انھیں تجسس رہتا تھا کہ آج نجم الحسن صاحب کیا پڑھیں گے۔ کسی کسی دن وہ پوری مجلس دیہاتی بولی میں پڑھتے، مرثیوں کے بند اور دوسرے اشعار بھی اسی بولی میں اور اسی فراوانی کے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی مجلس میں وہ حسینی جماعت کے مجاہدوں اور یزیدی لشکر کے سپاہیوں اور سرداروں کے نام گنانے پر آتے تو قریب قریب پوری مجلس اسی میں ختم ہو جاتی تھی۔ صرف شروع اور آخر میں فضائل، مصائب اور اشعار ہوتے۔ یہ اسرار سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی تعارف کے بغیر محض ناموں کی فہرست سناتے چلے جاتے اور مجلس پر ایک جوش کا عالم طاری ہو جاتا۔ کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ منبر پر ان کے بیٹھنے کے ذرا ہی دیر بعد عزاخانے کے باہر تک خبر پھیل جاتی کہ آج کی مجلس میں وہ زعفر جن کا حال پڑھ رہے ہیں، اور دور دور سے لوگ قصرِ حسینی کی طرف لپکتے دکھائی دیتے۔ یہ نثار مرحوم کی بہترین اور مقبول ترین مجلس تھی اور لوگ بے چینی سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ زعفر جن کے حال میں میر عشق کا شاہکار مرثیہ "عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو" اس کی بنیاد بنتا تھا۔ مرثیہ کا ڈرامائی بیانیہ اور نثار مرحوم کے چہرے کے تاثرات ابتدا ہی میں ایک حزن اور ہراس کی فضا قائم کر دیتے تھے۔ ایک مسافر سمندری سفر میں طوفان کا شکار ہو کر تختے کے سہارے بہتا ہوا ایک ویران جزیرے میں پہونچتا ہے:

عجیب عالمِ عبرت اِدھر اُدھر دیکھا   کوئی درخت نہ آدم نہ جانور دیکھا
خموش بیٹھے ہوئے اس کو خاک پر دیکھا   بڑھا جب آگے عجب شخص پر خطر دیکھا

رواں تھے اشک برابر زمین پر اُس کے
پڑے تھے بال سراسر زمین پر اُس کے

یہ زعفر جن ہے جو کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی نصرت کو پہونچا تھا لیکن امام نے اسے واپس کر دیا تھا۔ اب وہ سیکڑوں برس سے اس غیر آباد جزیرے میں سوگ نشین ہے۔ وہ مسافر سے کہتا ہے:

خبر کسی کو نہیں ہے وہ عالم ودانا   کہاں تھی راہ، ہُوا کس طریق سے آنا
بدن میں روح کو بس شاق ہے ٹھہر جانا   مگو ہے سرحدِ ملکِ عدم یہ ویرانا

اُداس دھوپ، اُندھی چاندنی نکلتی ہے
ہوا ہمیشہ یہاں ڈر سے تیز چلتی ہے

میدان کربلا کا منظر بیان کرتا ہے:

عجب طرح کا مرقع، عجیب عالمِ نور   اُدھر ستم تو اِدھر صبر، شانِ حق کا ظہور
کھلے ہوئے درِ افلاک دشت کیں معمور   ہر ایک سمت کو فوجیں مگر حسینؑ سے دور

سپاہِ شام نے مہرِ علیؑ کو گھیرا تھا
چراغ بیچ میں چاروں طرف اندھیرا تھا

اور اس بند سے مجلس میں گریے کا سلسلہ شروع ہوتا جو آخر تک نہ رکتا تھا:

پیمبرانِ اولوالعزم تھے حسینؑ کے پاس   جنابِ آدمؑ و نوحؑ و خلیلؑ رتبہ شناس
کلیمؑ و حضرتِ عیسیٰؑ میانِ عالم یاس   محمدؐ عربی پیشِ ذوالجناح اداس

لپٹ لپٹ کے رسولِ جلیلؐ روتے تھے
رکاب تھامے ہوئے جبرئیلؑ روتے تھے

نثر خوانی کی جس مجلس میں لٹے ہوئے حسینی قافلے کی مدینے میں آمد کا حال بیان ہوتا تھا وہ بھی سننے والوں کے کانوں میں کئی دن تک گونجتی رہتی تھی۔ میر مونس کے مرثیے "وطن میں قافلۂ کربلا کی آمد ہے" کے بند اس مرثیے کی جان ہوتے تھے۔ اہلِ مدینہ کو شہادتِ حسینؑ کی خبر نہیں، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ امام اپنے انصار و اعزا اور اہلِ حرم کے ساتھ وطن واپس آ رہے ہیں۔ مدینے میں استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اس وقت اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ:

نہ وہ رفیق، نہ وہ بھائی بند آتے ہیں
جھکائے گردنیں کوتل سمند آتے ہیں

پھر شہیدوں کے بے سوار گھوڑے نظر آتے ہیں، سب سے آگے عباسِ علمدار کا گھوڑا ہے جس کے ساتھ سپاہِ حسینی کا علم بھی ہے:

لہو کے چھینٹوں سے دامن علم کا افشاں تھا
علم وہ کیا تھا کہ درد و الم کا ساماں تھا
فرس بھی راکبِ بے کس کے غم میں گریاں تھا

ہر ایک زخم بدن مثلِ گل نمایاں تھا

سلامت اس کا جوڑ اک نہ تھا زمانے میں
چپا تا آتا تھا کھی زباں دہانے میں

اور آخر میں ذوالجناح، امام حسینؑ کا مرکب ؎

یہ نوحہ پڑھتا تھا گھوڑے کے آگے آگے بشیر
مدینہ لٹ گیا، جنگل میں مر گئے شبیرؑ
گلے پہ دلبرِ زہراؑ کے چل گئی شمشیر
کیا شہید غریب الوطن کو بے تقصیر

یہ ذوالجناح شہنشاہِ خوش خصال کا ہے
یہ قاشِ زیں پہ لہو فاطمہؑ کے لال کا ہے

حسینیہ سید تقی صاحب کی مجلسوں میں مختلف ذاکر پڑھتے تھے اور آٹھویں محرم تک ان میں مجمع بھی کم ہوتا تھا لیکن نویں محرم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر اس امام باڑے میں اُمڈ آیا ہے۔ یہ وہاں مولانا سید احمد صاحب مرحوم کی اشاروں والی ذاکری اور شبیہیں اٹھنے کا دن ہوتا تھا لوگ سویرے سے امام باڑے میں جمع ہوتا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیتے تھے جہاں سے ذاکر کو دیکھ سکیں۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے پہلے امام باڑے کے کشادہ دالانوں اور وسیع میدان میں سر ہی سر نظر آنے لگتے۔ پھر بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس مجلس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں شہر کے تقریباً سب ذاکر اور مجتہد شرکت کرتے تھے۔ یہ مجلس کے معزز ترین حاضرین تھے جن میں سے ہر ایک کی آمد پر نعرہ صلوات سے امام باڑا گونج اٹھتا تھا۔ مجلس کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کچھ پیش خوانوں کے بعد اچانک پورے مجمع میں سناٹا پھیل جاتا اور اصل ذاکر منبر پر بیٹھتے۔ وہ کچھ دیر خاموشی کے ساتھ مجمع پر نظریں دوڑاتے رہتے اور جدھر نگاہ کرتے ادھر سے رونے کی صدائیں بلند ہوتیں، یہاں تک کہ مجلس شروع ہونے سے پہلے ہی ہر طرف ایک گریہ ہونے لگتا جیسا دوسری مجلسوں میں مصائب خوانی کے نقطہ عروج پر ہوتا ہے۔ مجلس شروع ہوتی۔ مولانا کمزور آواز میں کچھ فقرے ادا کرتے جو دور کے لوگوں تک ٹھیک سے سنائی بھی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ آواز کے بجائے صرف اشاروں سے مجلس شروع کرتے۔ مجاہدوں کا میدان میں جانا، جنگ کرنا اور شہید ہونا۔ امام حسینؑ کا علی اصغرؑ کے لئے پانی طلب کرنا، حرملہ کا چلّہ کمان میں تیر جوڑنا، تیر چلنا اور گردنِ اصغرؑ پر تیر لگنا، بچے کا امام کے ہاتھوں پر منقلب ہو جانا۔ امام حسینؑ کا جہادِ آخر کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا، میدان جنگ میں آکر جہاد کرنا، تیروں، تلواروں نیزوں کے زخم کھانا، گھوڑے سے زمین پر آنا۔ یزیدی سپاہیوں کا حسینی خیموں میں داخل ہونا، عورتوں کی ردائیں اور ننھی سکینہ کے گوشوارے چھیننا۔ یہ سب منظر زندہ ہو ہو کر نگاہوں کے سامنے آتے اور امام باڑے میں صرف رونے کا شور سنائی دیتا رہتا۔ آخر لوگ دیکھتے کہ ذاکر نے اپنا گریبان چاک کر لیا ہے۔ اسی کے ساتھ امام باڑے کے کسی دور اُفتادہ حصے سے نقارے اور جلاجل کی ڈراونی آواز آنا شروع ہوتی اور سارے عزادار شبیہوں کی زیارت کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اچانک بھرے مجمع میں تیرتے ہوئے تابوت نظر آتے جن کے اندر تیروں سے چھدے ہوئے خون آلود بدن دکھائی دیتے۔ لوگ ہر تابوت کو چومنے کے لئے ٹوٹے پڑتے۔ ذرا دیر بعد اندازہ کرنا ممکن نہ رہتا کہ کب کدھر سے کون سی شبیہ برآمد ہو گی۔ مجمع جا بجا سے پھٹتا، پھر اکٹھا ہوتا۔ گہوارۂ علی اصغرؑ آتے آتے فضا اتنی ہیجانی ہو جاتی کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہتا۔ اسی رستاخیز کے عالم میں اونٹ اور ذوالجناح مجمع کو چیرتے پھاڑتے دالانوں کے اندر اور صحن میں ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے۔ ان جانوروں پر بھی ایک جوش ساطاری ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ایک قدم میں کئی کئی عزاداروں کو کچل ڈالیں گے لیکن اس افراتفری کے باوجود کوئی سنگین حادثہ نہیں ہوتا تھا۔

آٹھویں اور نویں محرم کو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے یہاں "ادبستان" میں سید العلماء، مولانا سید علی نقی نقوی صاحب مرحوم پڑھتے تھے۔ اس وقت تک سید العلماء مرحوم نے باقاعدہ ذاکری نہیں شروع کی تھی اور لوگوں کو کبھی کبھار ان کے صرف وعظ سننے کا موقع ملتا تھا اس لیے ان دو مجلسوں میں بڑا مجمع ہو جاتا تھا۔ یہ مخلوط مجمع ہوتا تھا جس میں شہر کے دانشوروں کی بڑی تعداد نظر آتی تھی۔ فرنگی محل کے علماء اور کبھی کبھی مولانا عبدالماجد دریا بادی اور جوش ملیح آبادی بھی سامعین کی صفوں میں ہوتے تھے

سید العلماء کا بیان کسی مخصوص موضوع پر ہوتا تھا جس کا تعین ادیب مرحوم کرتے تھے۔ بیان ڈھائی تین گھنٹے سے کم کا نہیں ہوتا تھا اور کبھی کبھی چار گھنٹے تک پہونچ جاتا تھا۔ ایک بار رُباعی "شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ" کو موضوع بنایا گیا۔ ایک سال کی مجلسوں میں ابتدائی دو مصرعوں اور دوسرے سال کی مجلسوں میں بقیہ دو مصرعوں کی تفسیر بیان ہوئی۔ آخری مصرعے "حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ" والی مجلس میں امام حسینؑ کو جس وضاحت اور استدلال کے ساتھ کلمۂ لاالٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد ثابت کیا گیا تھا اسے یاد کر کے لوگ برسوں وجد کرتے رہے۔ ان مجلسوں کی فضا روایتی مجالسِ عزا سے مختلف ہوتی تھی۔ مصائب خوانی کا بھی بہت التزام نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ عام عزاداروں کے لیے بہت دل پسند نہیں ہوتی تھیں۔ ایک بار پس پردہ بیٹھی ہوئی ایک خاتون جو بڑے شوق سے مجلس سننے آئی تھیں بیچ ہی میں یہ کہتی ہوئی رخصت ہو گئیں کہ " ہماری سمجھ میں یہ گلستان بوستان نہیں آتی "۔

بڑی مجلسوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی مجلسیں بھی یادگار تھیں جو بعض اماماڑوں میں ایک کے بعد ایک مسلسل ہوتی رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں دن بھر عزاداروں کے آنے جانے کا سلسلہ رہتا تھا۔ ان میں خوا ندگی اور تبرک کی رنگارنگی دیدنی ہوتی تھی۔ یہ مجلسیں مختلف لوگوں کی طرف سے ہوتی تھیں اور ان میں حاضرین کو تبرک حاصل کرنے کے لئے اماباڑے کے دروازے سے باہر نہیں نکلنا پڑتا تھا بلکہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تبرک مل جاتا تھا۔ ایک مجلس کے تبرک کی تقسیم ختم بھی نہ ہونے پاتی کہ دوسری مجلس کا مہتمم اپنے ذاکر کو منبر پر بٹھوا دیتا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر یہ مجلس ختم ہوتی اور تیسری مجلس نئے ذاکر، نئے تبرک والی شروع ہو جاتی۔ ان مجلسوں میں پڑھنے والے عموماً غیر معروف اور بیشتر بوڑھے لوگ ہوتے تھے۔ اس وقت تک مرثیہ خوانی کا زوال ہو چکا تھا اور موجودہ طرز کی ذاکری نے مجلس کی دوسری قسموں کو قریب قریب ختم کر دیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی مجلسوں کے یہ بوڑھے پڑھنے والے انھیں متروک اقسام کے آخری نمائندے تھے۔ ان میں سے کوئی کتاب میں سے دیکھ دیکھ کر مجلس پڑھتا اور کوئی زبانی نثر میں پڑھتا، لیکن باقاعدہ ترنم کے ساتھ۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں سید نصرت علی دہلوی نے اپنی کتاب "تاج التواریخ" میں مجلس پڑھنے والوں کی مندرجہ ذیل قسمیں بتائی تھیں:

۱. تحت اللفظ خوان

یہ حضرات مجلس میں مرثیہ پڑھتے ہیں اور یہی ذریعۂ معاش ہے .... اب بھی اس فن کو جاننے والے لکھنؤ میں بہت ہیں۔

۲. حدیث خوان

یہ حضرات علم دینیات سے ماہر ہوتے ہیں، احادیث پر بھی عبور ہوتا ہے...... محرم میں منبر پر بیٹھ کر حالاتِ آلِ عباؑ بیان کرتے ہیں۔

۳. کتاب خوان

یہ لوگ بھی مثل حدیث خوانوں کے مگر ان سے نیچے درجے کے ہیں ذکرِ مصائب حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کرتے ہیں۔ ان کا فن حدیث خوانوں سے جدا ہے۔

۴. بنثر خوان

یہ حضرات منبر پر بیٹھ کر ذکرِ مصائب حضرت امام حسینؑ بیان کرتے ہیں اور مقاماتِ مناسب پر اشعارِ اردو فارسی بھی شامل کرتے ہیں۔

۵. سوزخوان

اس فن کے لوگ علم موسیقی کے زیادہ ماہر ہوتے ہیں اور مجالس میں مرثیہ نہایت سوز و گداز سے پڑھتے ہیں.... ان کی ذاکری کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص جس کو "صاحب بستہ" کہتے ہیں بیچ میں بیٹھتا ہے اور دو آدمی دونوں پہلوؤں میں بیٹھتے ہیں۔ داہنی طرف والے کو "بازو" اور بائیں طرف والے کو "ہوائی" کہتے ہیں، ہم آواز ملا کر پڑھتے ہیں۔

۶. واقعہ خوان

یہ حضرات محرم میں ذکرِ مصائب حضرت امام حسین علیہ السلام منبر پر بیٹھ کر بیان فرماتے ہیں۔ ان کے پڑھنے کی ترکیب مثل اہل عجم کے ہوتی ہے۔"

محرم کی ان چھوٹی چھوٹی مجلسوں میں یہ سب اور ان کے علاوہ عزاداری کے دوسرے شعبوں کے پڑھنے والے بھی مل جاتے تھے۔

مجلسوں کی رونق اور رواج میں آج بھی کمی نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ لیکن اوپر جن مجلسوں کو یاد کیا گیا ہے وہ اپنی کیفیتوں سمیت ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر اختر بستوی

تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت

فرماں روایانِ اودھ کے دور سے مراد وہ عہد ہے جو اودھ میں اٹھارہویں صدی کے ربع اول میں سعادت خاں برہان الملک کی صوبے داری سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط میں واجد علی شاہ کی سلطنت کے انتزاع پر ختم ہوا۔

تقریباً ایک سو چونتیس سال کی مدت پر مشتمل فرماں روایانِ اودھ کا یہ دور کئی اعتبار سے تاریخ ساز ہے۔ اس نے ہندوستان کو کچھ انتہائی قیمتی تحفے عطا کیے ہیں، جن میں سب سے بیش قیمت چیز وہ تہذیب ہے جسے ہم "اودھ کی تہذیب" کہتے ہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب ہے جس میں ان دونوں کے معاشرتی اجزا نے تحلیل ہو کر ایک دلکش گنگا جمنی صورت اختیار کر لی ہے۔ اودھ کی تہذیب متعدد صفات کی حامل ہے، لیکن اس کی سب سے نمایاں اور سب سے جاندار صفت اس کا مشترکہ تمدنی پہلو ہی ہے۔ یہ مشترکہ تہذیب اودھ کے حکمرانوں کے دور میں اس صوبے کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔

اودھ کے علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہار ہمیشہ بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے رہے ہیں۔ فرماں روایانِ اودھ کے دور میں تیوہاروں کی دھوم دھام اور شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ثقافتی پہلوؤں کو بھی زبردست تاب و توانائی ملی۔ اس عہد میں تیوہاروں کے منانے کے انداز میں ایک بہت ہی اہم خوبی یہ نمایاں ہوئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے تیوہاروں کے طور طریقے اودھ کی گنگا جمنی تہذیب کے رنگ میں بھرپور طور پر رنگ گئے اور ان کی مشترکہ تہذیبی نوعیت بہت ہی نکھر گئی۔

اودھ کے فرماں رواؤں کے زمانے میں تیوہار صرف عوام کی سطح ہی پر نہیں منائے جاتے تھے بلکہ حکومت کی جانب سے بھی انھیں منانے کا دور دار اہتمام ہوتا تھا۔ تمام اہم تیوہاروں کے مواقع پر دربار میں بھی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں اور حکومت ان پر کثیر رقم خرچ کرتی تھی۔ فرماں روایانِ سلطنت خود ان میں شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں تفریق سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ جس طرح مسلمانوں کے تیوہاروں پر حکومت کی طرف سے تقریبات کا انعقاد ہوتا تھا اسی طرح ہندوؤں کے تیوہاروں پر بھی ہوا کرتا تھا۔ چونکہ حکمرانانِ اودھ مسلمان تھے اس لیے مسلمانوں کے تیوہاروں کا حکومت کی سطح پر منایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن مسلم حکمرانوں کا ہندوؤں کے تیوہاروں کو دربار میں منانا اور سرکاری خزانے سے ان کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنا ایک بہت ہی اہم بات تھی۔ یہ مذہبی وسیع النظری اور رواداری کی شاندار مثال تھی۔

اس دور میں تیوہاروں کے موقع پر ان سے متعلق مذہبی رسوم بھی ادا کی جاتی تھیں، لیکن ان کے منانے کا عام طرز مذہبی سے زیادہ ثقافتی ہو گیا تھا۔ تمام تیوہاروں میں ہر طرف رنگ و سرود کا سماں چھا جاتا تھا۔ شہر کی آرائش و زیبائش ہوتی تھی۔ اور چراغاں و آتش بازی کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ امرا، عمائدین اور شرفا کے طبقے کے افراد ایک دوسرے کے یہاں جاتے اور مبارکباد دیتے تھے۔ اور ان کے اثر سے عوام میں بھی یہ طریقہ بڑے پیمانے پر رائج تھا۔

مذکورہ دور میں تیوہاروں کو منانے کے سلسلے میں ایک خصوصی اہمیت کی بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ تیوہاروں کے ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی پہلو میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک کی صورتیں فروغ پذیر ہوئیں۔ ہندوؤں کے بعض تیوہار ایسے تھے جن کی کچھ مذہبی رسوم کو مسلمان بھی اپنے طور پر ادا کرتے تھے اور مسلمانوں کے کچھ تیوہاروں کی مذہبی رسوم کو ادا کرنے کا چلن ہندوؤں میں بھی تھا۔

تیوہاروں میں ہولی، متذکرہ دور میں بڑے ہی ولولے اور جوش و خروش

کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ دربار میں بھی ہولی کے جشن کا زبردست اہتمام ہوتا تھا۔ حکمرانانِ اودھ خود ہولی کھیلتے تھے۔ آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر میر تقی میرؔ کی مثنوی "دربیان ہولی" میں بھی ملتا ہے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

آصف الدولہ اور سعادت علی خاں ہولی کا جشن مناتے تھے اور اس جشن پر لاکھوں روپے صَرف کرتے تھے۔ اس میں رنگارنگ تقریبات ہوتی تھیں اور درباریوں کو قیمتی خلعت تقسیم کیے جاتے تھے۔ اودھ کے دوسرے حکمرانوں کے دربار میں بھی ہولی کے موقع پر جشن کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور کسبیوں، طوائفوں اور دوسرے فنکاروں کو نقد اور قیمتی زیورات کے انعامات دیے جاتے تھے۔ عوامی سطح پر "ہولیکا دہن" (ہولی جلنے) کے دوسرے دن صبح گلال، عبیر، زعفران اور کُم کُم سے اور پچکاریوں میں رنگ بھر کر ہولی کھیلی جاتی تھی۔ طرح طرح کے سوانگ بھرے جاتے تھے اور کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔ شام کو چراغاں اور آتش بازی کی بہار ہوتی تھی۔

ہولی ہی کی طرح بسنت کا تیوہار بھی اس عہد میں ہندو اور مسلمان یکساں جوش اور جذبے سے مناتے تھے۔ فرماں روایانِ اودھ بسنت کے جشن کے سلسلے میں بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ آصف الدولہ کے دربار میں اس تیوہار کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور اس پر بھی وہ ہولی کے جشن کی طرح لاکھوں روپے خرچ کیا کرتے تھے۔ دیگر حکمرانانِ اودھ بھی بسنت کے جشن کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس روز لوگ زرد لباس پہنتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں شہر کے باہر جمع ہو کر زرد کاغذ کی پتنگ زرد رنگ کی ڈور سے اڑاتے تھے۔ اس تیوہار کے دن مسلمان گانے والے، دیگر لوگوں کے ساتھ، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے، مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور "گل شریف" ڈال کر کسی بزرگ کے مزار پر جاکر بسنت کی تہنیت اور اس بزرگ کی مدح میں اشعار گاتے تھے۔

دسہرے کی بھی، اودھ کے فرمانرواؤں کے دَور میں بڑی دھوم ہوتی تھی۔ اس تیوہار میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی "نیل کنٹھ" کے درشن کے لیے مختلف مندروں میں اور دیگر مقامات پر جاتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شہر کا حاکم اپنے گھوڑے اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگوا کر، نقرئی اور طلائی ساز و سامان اور زرنگار جھول اور عماریاں لگا کر، اپنے فوجی دستے اور ذی مرتبہ مصاحبوں کے ساتھ "نیل کنٹھ" کے درشن کرتا تھا۔ شام کے وقت رقص و سرود کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ دسہرے کے ایام میں مُسلم بچے بھی ہندو بچوں کی طرح ٹیسو رائے کی مورت بنا کر اور اسے لکڑی پر لٹکا کر شام کے وقت روزانہ ہندی کے اشعار پڑھتے ہوئے دروازے دروازے جاکر پیسہ مانگتے تھے اور جو رقم جمع ہوتی تھی اس سے خاص دسہرے کے دن مٹھائی خرید کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔

دیوالی بھی فرمانروایانِ اودھ کے زمانے میں بڑی رونق اور چہل پہل کا تیوہار ہوا کرتا تھا۔ شہر کی زور دار آرائش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں سارے بڑے محلے دلھن کی طرح سجائے جاتے تھے۔ لکشمی اور گنیش کی پوجا ہوتی تھی۔ "چوک پورا" جاتا تھا اور "دیوالی بھری" جاتی تھی۔ گھر کے آنگن میں مختلف رنگ کے چاول وغیرہ سے خوبصورت نقش و نگار بنانے کو "چوک پورنا" کہا جاتا تھا۔ دیوالی کی شب کو عورتیں بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتی تھیں اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھانڈ کے کھلونے ان کے ساتھ کر کے، پہلے سارے گھر میں چراغاں کرتی تھیں اور پھر مکان کے اس حصے کو جہاں کھلونے مٹھائیوں کے ساتھ رکھے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ دیپکوں سے سجاتی تھیں۔ اس کو "دیوالی بھرنا" کہتے تھے۔ اور بچوں کی حفاظت کے لیے اسے اچھا شگون مانا جاتا تھا۔ دیوالی کے تیوہار میں چراغاں اور آتش بازی سب سے اہم اور خاص چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ تمام گھروں میں چراغاں ہوتا تھا اور ہر طرف آتش بازیاں چھوٹتی تھیں۔ شام کو ہندو مسلمان خواص اور عوام گھر سے نکل کر روشنی دیکھنے جاتے تھے۔ دیوالی کے موقع پر قمار بازی کا رواج عام تھا۔

کرشن جی کی پیدائش کا تیوہار جنم اشٹمی بھی ان تیوہاروں میں شامل تھا جنھیں اودھ کے حکمرانوں کے دَور میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ جنم اشٹمی کے دن لوگ گھر گھر کنھیا جی کے جنم کا جشن مناتے تھے۔ جگہ جگہ "رہس" کھیلے جاتے تھے۔ جن میں کرشن جی کے حالات، رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں اوپیرا کے انداز میں پیش کیے جاتے تھے۔ انھیں دیکھنے کے لیے جو لوگ اکٹھا ہوتے تھے ان میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہوا کرتے تھے اور یہی نہیں بلکہ ان میں پارٹ ادا کرنے والوں میں مسلمان بھی شامل ہوتے تھے۔ اس تیوہار کے موقع پر ہندوؤں کی تقلید میں مسلمان کنس کا مجسمہ

اس کے پیٹ میں شہد بھر دیتے تھے اور پھر اسے چاک کر کے شہد کو اس کا خون کہہ کر پیتے تھے۔

ہندوؤں کے تہواروں کی طرح مسلمانوں کے تہوار بھی فرمانروایانِ اودھ کے دور میں بڑی آن بان اور بڑے ہی ولولے کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے بھی زوردار اہتمام ہوتا تھا اور عوام بھی زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تہواروں کی بھی مشترکہ تہذیبی نوعیت اس عہد میں بے حد روشن تھی۔

اسلامی تہواروں میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو جنھیں عرفِ عام میں عید اور بقر عید کہا جاتا ہے، مذکورہ دور میں شاندار جشنِ مسرت کے طور پر منایا جاتا تھا۔ عید کے چاند کا اعلان کرنے کے لیے بندوقیں داغی جاتی تھیں۔ اور فرطِ مسرت میں بگل اور نقارے بجائے جاتے تھے۔ عید کے دن اودھ کے حکمراں ایک پُرشکوہ جلوس کے ہمراہ نمازِ عید ادا کرنے کے لیے عیدگاہ جاتے تھے۔ اس جلوس میں قیمتی لباس میں ملبوس امرا، گھوڑ سوار اور پیدل فوجی، اونٹوں پر بیٹھے ہوئے بندوقچی، توپ خانے اور ہاتھیوں کے دستے ہوتے تھے اور ان کے پیچھے کئی ہاتھی گاڑیوں کے درمیان چار ہاتھیوں والی ایک گاڑی میں فرماں روائے اودھ کی سواری ہوتی تھی۔ نماز کے بعد اسی طمطراق اور کر و فر سے اس جلوس کی واپسی ہوا کرتی تھی۔ عید گاہ سے واپس ہونے کے بعد دربار ہوتا تھا جس میں امرا مبارکباد اور نذریں پیش کرتے تھے اور شعرا تہنیت نامے سُناتے تھے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی "تہنیتِ عید" میں، جو انھوں نے فیض آباد میں کہی تھی اور جس میں آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کے ناظر جواہر خاں کی تعریف شامل ہے، اس عہد کی ایک عید کا حال بیان کرتے ہوئے "تیاریٔ عید" "ہنگامِ عید" اور عید کی "جاہ اور حشمت" کا تذکرہ اور عید کے دن خوشی کے ہر طرف "ترقی میں" ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ ہے آج دن عید کا میری جاں — خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
یہ تیاریٔ عید و ہنگامِ عید — یہ جاہ اور حشمت یہ اکرامِ عید

عید کے دن امرا، خواص اور عوام سب آپس میں گلے ملتے تھے اور ایک دوسرے کے گھر جاتے تھے اور سب کے گھروں پر مہمانوں کی ضیافت سویوں سے کی جاتی تھی اور انھیں عطر اور پان پیش کیا جاتا تھا۔ گلے ملنے مبارکباد دینے، لوگوں کے گھروں پر جانے، سویاں کھانے اور دیگر قسم کی ضیافتوں میں ہندو حضرات بھی شامل ہوتے تھے۔ عید کے دن کی کئی رسمیں ہندوؤں کے اثر سے رائج ہوئی تھیں۔ مثلاً سویّیں کا چلن ہندوؤں ہی کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ہندو لوگ "شراونی" اور "اننت چترودشی" کو سویّیں کھاتے ہیں۔ یہ دونوں تہوار خوشی کے ہیں، عید کے روز ایک دوسرے کے گھر جانے اور کچھ کھانے کھلانے کا رواج بھی بعض محققین کی رائے کے مطابق ہندوؤں ہی کے اثر کا عطا کردہ تھا۔ یہ دونوں رسمیں ہندوؤں کے تہوار ہولی میں عرصہ دراز سے مروج تھیں اور عید میں ان کا چلن اسی کے اثر سے ہوا تھا۔ عہدِ مذکور میں بقر عید کا جشن بھی عید ہی کے طرز کا ہوتا تھا۔ اس روز بھی عید کے دن کی طرح شاندار جلوس کے ساتھ اودھ کے حکمراں کی سواری عیدگاہ جاتی تھی اور نماز ادا کر کے اسی انداز میں واپس ہوتی تھی۔ نماز کے بعد عیدگاہ میں حکمرانِ اودھ اونٹ کی قربانی کرتے تھے۔ اور اس کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا۔ عیدگاہ سے واپس آکر عید ہی کی طرح دربار ہوتا تھا اور اس دربار میں بھی نذریں پیش کی جاتی تھیں اور تہنیت نامے پڑھے جاتے تھے۔ اس روز لوگوں کے گھروں پر بھی قربانی ہوتی تھی جس کا گوشت بھی بٹتا تھا اور اس گوشت سے تیار کی ہوئی لذیز غذاؤں کے تورے بھی اعزا و احباب میں بانٹے جاتے تھے۔ گھر گھر دعوتوں کا انتظام ہوتا تھا۔ عید ہی کی طرح آپس میں گلے ملنے مُبارکباد دینے، اور ایک دوسرے کے گھر جانے کے سلسلے چلتے تھے۔ جن میں ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔

مسلمانوں کا تہوار شبِ برات بھی اودھ کے فرمانرواؤں کے زمانے میں بہت ہی اہم تہوار تصور کیا جاتا تھا۔ یوں تو یہ ایک ایسا تہوار ہے جس کا تعلق تاریخِ اسلام کے مختلف واقعات اور مختلف اسلامی عقائد سے جوڑا جاتا ہے، مثلاً کچھ لوگ اس کا سلسلہ جنگِ احد میں پیغمبر اسلامؐ کے دندانِ مبارک کے شہید ہونے سے اور کچھ اشخاص، حضرت امیر حمزہ کی شہادت سے جوڑتے ہیں، اور بعض حضرات اس کو اِن عقائد سے منسلک کرتے ہیں کہ اس رات کو حکمِ الہٰی سے ملائکہ رزق کی تقسیم اور عمر کا حساب لگاتے ہیں اور ہر شخص کا اعمال نامہ لکھوا جاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تہوار کے ہندوستان میں رائج ہونے کے سلسلے میں بعض لوگوں نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے

کہ اکبر اعظم نے جب اپنی ملکہ جودھا بائی کو اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو کھانا دیتے ہوئے دیکھا تو وہ اس رسم سے بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اسلام میں بھی اسی طرح کی کوئی رسم ڈھونڈی جائے، اور اس کے نتیجے میں ایک مُجتہد نے شبِ برات کی بنیاد قائم کی جو مسلمانوں میں سارے ہندوستان میں رائج پا گئی۔ اودھ میں مذکورہ دَور میں شبِ برات کا تیوہار بڑے اہتمام اور بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ اس روز لوگ میٹھی چیزوں پر اپنے اپنے مردوں کے نام فاتحہ دلاتے تھے۔ حلوا پکانے اور اس پر فاتحہ دلانے کا عام چلن تھا۔ یہ حلوا عزیزوں اور دوستوں میں تحفے کے طور پر بھی بانٹا جاتا تھا۔ حلوے کے علاوہ مختلف قسم کی روٹیاں، میٹھے چاول اور دوسرے کھانے پکانے کا بھی رواج تھا جن پر مرحومین کی روح کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ ہوتا تھا۔ غربا و مساکین میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ شبِ برات کے سلسلے میں پکنے والے کھانوں میں گوشت کسی بھی صورت میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس تیوہار کے موقع پر دن میں لوگ فاتحہ دلانے اور حلوے وغیرہ کو احباب واعزا اور غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کرنے میں مصروف ہوتے تھے اور شام کو جوق در جوق قبرستانوں میں جا کر اپنے بزرگوں کی قبروں پر روشنی کرتے تھے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ چونکہ اثنا عشری فرقے کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق یہ امام مہدی کی ولادت کا دن بھی ہوتا تھا اس لیے اودھ میں اس کی اور بھی دھوم ہوتی تھی اور اس تیوہار کو خوشی کے ایک جشن کا روپ مل گیا تھا۔ گھر گھر میں چراغاں ہوتا تھا اور طرح طرح کی آتشبازیاں چھڑائی جاتی تھیں۔

شبِ برات میں چراغاں کرنے اور آتشبازی چھڑانے کا دستور ہندوؤں کے زیر اثر رائج ہوا تھا۔ یہ دونوں باتیں ہندوؤں کے تیوہار دیوالی کے اثر سے مسلمانوں کے اس تیوہار میں آئی تھیں۔ اس روز کھانے پینے چراغاں دیکھنے اور آتشبازی چھوڑنے اور اس کا نظارہ کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہوتے تھے۔ شبِ برات کے ساتھ ہی نیمۂ شعبان کا جشن بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں لکڑی کی ایک کشتی بنائی جاتی تھی جسے رنگین ململ یا ریشمی زربفت کے ایسے سنہرے اور نقرئی کپڑوں سے جن کے کنارے پر زری کے کام کے کاغذی گوٹ لگی ہوتی تھی، ڈھک دیا جاتا تھا اور اس کشتی میں مٹی کے دیے جلائے جاتے تھے۔ اسے "الیاس کی کشتی" کہا جاتا تھا اور اس کو ایک بڑے جلوس کے ہمراہ، جس میں ہر مرتبے اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے تھے، باجے گاجے کے ساتھ دریا تک لے جایا جاتا تھا۔ جیسے جیسے جلوس دریا کے نزدیک پہنچتا جاتا تھا اس میں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جاتی تھی۔ اس کشتی کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ پانی میں چھوڑا جاتا تھا اور اس کے ساتھ منت کی عرضیاں بھی ڈالی جاتی تھیں۔ نیمۂ شعبان کے اس جشن میں کئی باتیں، بالخصوص مٹی کے دیے جلانے اور جلوس میں باجے گاجے کی شمولیت کی رسمیں، ہندوؤں کے اثر کی دین تھیں، اور اس جشن میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھرپور طور سے شریک ہوتے تھے۔

فرماں روایانِ اودھ کے دور میں سب سے زیادہ شان و شوکت اور زور شور سے جس کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ تھا امام حسین کی شہادت کی یادگار کے طور پر منایا جانے والا محرم۔ یوں تو اس علاقے میں محرم اس دَور سے پہلے بھی منایا جاتا تھا لیکن اودھ کے فرماں رواؤں کے زمانے میں اس کو جو وسعت ملی اور اس میں جو تزک و احتشام اور جوش و خروش پیدا ہوا اس سے قبل کبھی نہیں تھا۔ حکمرانانِ اودھ چونکہ شیعہ تھے، اور شیعوں میں محرم کو بے حد اہمیت حاصل ہے، اس لیے ان کی حکمرانی کے عہد میں اس کی دھوم دھام نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ لیکن متذکرہ دور میں اسے منانے والوں میں صرف شیعہ فرقے کے لوگ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ سنّی اور ہندو بھی اس کو اتنے ہی جوش اور جذبے سے مناتے تھے۔ جس طرح ہندوؤں کے تیوہار ہولی اور بسنت اس عہد میں ہندوؤں کے تیوہار صرف ہندوؤں ہی کے تیوہار نہیں رہ گئے تھے بلکہ سب کے تیوہار بن گئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا محرم بھی ہر مذہب اور ہر فرقے سے تعلق رکھنے والوں کا ہو گیا تھا۔ دورِ مذکور میں امام باڑوں کی تعمیر بڑے پیمانے پر ہوئی۔ مختلف فرمانرواؤں نے بھی متعدد امام باڑے بنوائے اور رؤسا و عمائدین نے بھی بہت سے امام باڑوں کی تعمیر کروائی۔ ان تمام امام باڑوں میں محرم کا جو اہتمام ہوتا تھا اس سے اس کو اودھ میں بے حد فروغ حاصل ہوا۔ مذکورہ عہد میں محرم کی دھوم دھام کا سلسلہ ماہ محرم کی پہلی تاریخ سے شروع ہو جاتا تھا اور دسویں تاریخ تک چلتا رہتا تھا۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی خواتین چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیورات اُتار دیا کرتی تھیں۔ لوگ سبز اور سیاہ رنگ کے لباس پہن لیتے تھے۔ جگہ جگہ مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے جلوس نکلتے تھے۔ مجلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے اور تعزیوں کی زیارت کرنے کے لیے ماتمی لباس پہنے ہوئے لوگوں کا

بھی ہر طرف رواں دواں نظر آتی تھی۔ ہندو اور مسلمان عورتیں یکجا ہو کر پرسوز آواز میں نوحے گاتی تھیں۔ عزاداری اور ماتم کرنے والوں کے لیے ہر فرقے کے لوگ سبیلیں لگاتے تھے اور شربت اور سنترے وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ محرم کے دنوں میں امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ قندیلیں اور لال ہری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ اور روشنی اور کارچوبی کے کام کی چمک دمک، سونے اور چاندی کے علموں اور پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے پٹکوں کی سجاوٹ، زردوزی کے کام، رنگا رنگی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور در و دیوار کی آب و تاب سے امام باڑے بقعۂ نور بن جاتے تھے۔ خصوصاً شب عاشور کو امام باڑوں کی آرائش اور روشنی کا اہتمام اتنا شاندار ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ محرم کے ایام میں امام باڑوں میں روزانہ دو مرتبہ مجالس عزا منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں اودھ کے حکمراں بھی ماتمی لباس پہن کر اور سر پر طاؤس کے پروں کا تاج رکھ کر بیٹھتے تھے۔ تمام فرمانروایانِ اودھ محرم کی مختلف تقریبات میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ شجاع الدولہ بڑی عقیدت اور بڑے احترام کے ساتھ عزاداری کیا کرتے تھے۔ آصف الدولہ نہایت دھوم دھام سے تعزیہ داری کرتے تھے۔ اور اکثر ماتم کرتے کرتے لہولہان ہو جاتے تھے۔ وہ کم سے کم پانچ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے ہر بار تعزیے کی زیارت کے وقت نذر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد سبز لباس پہن لیتے تھے۔ اور تمام مراسم عزا بھرپور طور پر ادا کرتے تھے۔ عاشور کی شب کو وہ عوام کے گھروں میں جا کر تعزیے خانوں کی زیارت کرتے تھے اور ہر ہر جگہ کچھ چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ محرم کے جلوس میں وہ خود تاشہ بجاتے تھے ـــ یوں تو اس دور میں محرم کے موقع پر عزاداری اس ماہ کے ابتدائی دس دنوں میں برابر جاری رہتی تھی، لیکن یکم سے دہم تک کی تاریخوں میں سے بعض تاریخیں کچھ خاص رسوم اور جلوسوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مثلاً پانچویں تاریخ کو بچوں کو امام حسینؑ کے نام پر فقیر بنایا جاتا تھا۔ یہ رسم کافی عام تھی اور بہت سے گھروں میں اسے ادا کیا جاتا تھا۔ محرم میں اس رسم کی شمولیت ہندوؤں کے اثر کی بنا پر ہوئی تھی، کیونکہ بچوں کو فقیر اور جوگی بنانا بنیادی طور پر ہندوانہ رواج ہے۔ ساتویں محرم حضرت قاسم کی شادی کے جشن کا جلوس اٹھتا تھا جو "مہندی کا جلوس" کہلاتا تھا۔ فرمانروایانِ اودھ کے عہد میں مہندی کا جلوس شاہانہ شان سے اٹھتا تھا۔ اس میں آگے ہاتھیوں اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ جلوس امام باڑے کے باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ سپاہی جلوس بردار اور باجے والے، امام باڑے کے صحن میں بائیں طرف چلنے سے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے کہ بیچ میں راستہ بن جاتا تھا۔ پہلے اندر داخل ہونے والے سامان میں چاندی کی کشتیوں میں مٹھائیاں، خشک میوے اور پھولوں کے ہار ہوتے تھے۔ اس کے بعد جھل جھل کرتے لباس پہنے ہوئے چند ملازمین سر پر سہری رکھے اور کچھ لوگ ہاتھوں میں گل دستے لیے ہوئے آتے تھے۔ ان کے پیچھے دلھن کی نقرئی پالکی ہوتی تھی، جس کے ہمراہ خوبصورت وردیوں میں ملبوس مشعلچی تھالوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے چلتے تھے۔ اور ان کے ساتھ قرنا اور نفیری بجانے والوں کی چوکیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس پالکی پر سے روپے اور چاندی کے دیگر سکے نچھاور کیے جاتے رہتے تھے۔ پیچھے پیچھے ماتمی لباس پہنے عزاداروں کی ایک جماعت آتی تھی۔ کچھ لوگ حضرت قاسمؑ کا تابوت کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے اور کچھ اشخاص ماتم کرتے جاتے تھے۔ اس تابوت کے ہمراہ زری کے چتر کے نیچے گھوڑا ہوتا تھا، جس پر حضرت قاسم کا عمامہ، خنجر، کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش رکھا رہتا تھا۔ جب یہ گھوڑا امام باڑے کے صحن میں داخل ہوتا تھا تو اس پر سونے اور چاندی کے پھول نچھاور ہوتے تھے جن کو غربا لوٹ لیتے تھے آخر میں مجلس عزا منعقد کی جاتی تھی۔

محرم میں مہندی کا جلوس اٹھانے کی رسم بھی ہندوؤں اور ہندوستان کے اثر کی مرہونِ منت تھی، کیونکہ شادی کے سلسلے میں مہندی کا رواج خالص ہندوستانی تھا۔ جس طرح محرم کی ساتویں تاریخ کو حضرت قاسم سے منسوب کر دیا گیا تھا اسی طرح آٹھویں تاریخ حضرت عباس سے منسوب ہو گئی تھی۔ اس تاریخ کو حضرت عباس کا علم نکلتا تھا، اور اس میں خاص بات یہ ہوتی تھی کہ امرا، رؤسا اور عوام، سب کے جلوس میں حضرت عباس کا علم تانبے کا ہوتا تھا۔ دسویں محرم کو تعزیے اٹھتے تھے۔ تعزیہ ہندوستانی چیز ہے۔ اس کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی اور اسی ملک میں اس کو مقبولیت ملی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ تیمور ہر سال محرم کے موقع پر امام حسینؑ کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا۔ جب اس نے ہندوستان پر حملہ کیا تو جنگ کے دوران ہی محرم کا چاند نمودار ہوا، اور چونکہ اس وقت اس کے لیے مرقدِ حسینؑ پر پہنچنا ناممکن تھا اس لیے اس نے اپنے مشیروں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے امام حسینؑ کے روضہ کی شبیہ

بنوائی اور اُس کے سامنے سوگ مناکر اپنی عقیدت مندی کو تسکین دی۔ وہی شبیہ تعزیے کی بنیاد بنی۔ تیمور نے جو شبیہ بنوائی تھی وہ روضۂ حسینؑ کی ہو بہو نقل رہی ہوگی، لیکن آگے چل کر تعزیے کی شکل وصورت میں تبدیلی آئی اور اس کی ساخت میں ہندوانہ طرز نمایاں ہوا۔ لکھنؤ میں عہدِ قدیم میں جو تعزیے مروج تھے ان کا اوپری حصہ یعنی قبہ، مندر سے ملتا جلتا ہوتا تھا اور نیچے کی منزل میں تربت کی شکل کا ایک نمونہ الگ سے بناکر رکھ دیا جاتا تھا۔ تعزیے کی اس شکل کے وجود میں آنے کے سبب کے متعلق یہ قیاس ہے کہ جب ہندوؤں نے محرم منانا شروع کیا ہوگا تو انھوں نے پہلے پہل اسی قسم کا تعزیہ بنایا ہوگا اور پھر اسی کا عام طور سے چلن ہوگیا۔ اودھ کے حکمرانوں کے زمانے میں بالعموم اسی شباہت کے تعزیوں کا رواج تھا۔ اس دور میں مختلف حیثیت کے لوگ مختلف چیزوں کے تعزیے بنواتے تھے۔ چاندی سے لے کر لکڑی اور کاغذ تک کے تعزیے بنتے تھے۔ کچھ لوگ ہاتھی دانت اور صندل اور صنوبر کی لکڑی کے تعزیے بھی بنوایا کرتے تھے۔ دسویں محرم یعنی یومِ عاشورہ کو طلوعِ آفتاب ہی سے تعزیے اٹھنے لگتے تھے۔ ہر طبقے کے افراد تعزیہ داری کرتے تھے اور تعزیے اٹھاتے تھے۔ ہندوؤں کے تعزیے بھی بکثرت ہوتے تھے۔ طوائفیں بھی تعزیے کا جلوس نکالتی تھیں جس میں وہ خود مرثیے اور نوحے پڑھتی تھیں اور انھیں کے لیے لوگ بڑی تعداد میں اُن کے جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ تعزیوں کے تمام جلوسوں میں زبردست بھیڑ ہوتی تھی۔ شیعہ، سنی، مسلمان ہندو، امیر غریب، عورت مرد، چھوٹے بڑے، سب کا ہجوم تعزیوں کے جلوسوں کو دیکھنے اور ان میں شامل ہونے کے لیے اُمنڈ پڑتا تھا۔ سارے تعزیوں کو بڑی دھوم دھام سے ڈھول، تاشے، جھانجھ کے ساتھ کربلا لے جایا جاتا تھا۔ معمولی تعزیے کربلا میں دفن کر دیے جاتے تھے اور دولت مندوں کے قیمتی تعزیوں کو واپس لاکر امام باڑوں میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ کربلا میں تعزیے دفن کرتے وقت تجہیز و تکفین کی تمام رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ وہاں سے واپس اپنے گھروں پر آکر تعزیہ دار بلاامتیاز مذہب وملت غربا ومساکین میں خیرات تقسیم کیا کرتے تھے۔ مذکورہ عہد میں محرم کے تیوہار میں ہندوستانی عناصر اور ہندوؤں کے اثرات کی جلوہ سامانیوں، اور اس کی تمام مذہبی اور دیگر نوع کی رسوم میں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کی بھرپور شرکت کی بنا پر اس کا مشترکہ تہذیبی رنگ روپ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔

فرماں روایانِ اودھ کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام اہم تیوہاروں کے منانے کا جو انداز تھا اس نے ایک طرف تو خود ان تیوہاروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت کو زبردست نکھار بخشا اور دوسری جانب اس سے اودھ کی مشترکہ تہذیب کو بھی بڑی آب وتاب ملی۔

□□

کتابیات:

۱۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار۔ از مرزا جعفر حسین

۲۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ میر کا عہد۔ از ڈاکٹر محمد عمر

۳۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ از ڈاکٹر سید صفدر حسین

۴۔ تاریخ اودھ۔ جلد دوم، سوم از نجم الغنی

۵۔ سیر المتاخرین۔ جلد ۲ از غلام حسین

۶۔ سوغاتِ سلاطین اودھ۔ جلد اول از کمال الدین حیدر

۷۔ عادت السعادت از غلام علی

۸۔ ہفت تماشا از مرزا محمد حسین قتیل

۹۔ شبابِ لکھنؤ از محمد احمد علی

۱۰۔ گذشتہ لکھنؤ از مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

۱۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ابواللیث صدیقی

۱۲۔ کلیاتِ میر

۱۳۔ فرہنگِ آصفیہ۔ جلد دوم۔ از مولوی سید احمد دہلوی

۱۴۔ فرہنگِ شفق۔ از منشی لالتا پرشاد شفق۔

۱۵۔ اسلامی تیوہار اور اتسو از مہیش پرشاد

اشفاق احمد خاںؔ

نوابینِ اودھ کے زیورات اور لباس

اپنے ارتقاء سے لے کر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آج تک زیورات کی تاریخ ایک دلکش داستان ہے۔ یہ ایک طرف انسان کے شوق، ذوق، مہارت اور دست صناعی کی کہانی ہے تو دوسری طرف کسی قوم کی علمی، ادبی اور جمالیاتی ذوق کے ساتھ ساتھ سیاسی، اقتصادی عروج اور زوال کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

زیورات انسان کے تخیل کا وہ پیلا اُگلی جادو ہے جسے اس نے تہذیب کے اولین دور میں اپنی محبوبہ کے تئیں محبت، خلوص اور اعتماد ظاہر کرنے کا پہلا پہلا ایک خوبصورت ذریعہ بنایا ہوگا۔ شروع میں ان گہنوں یا زیوروں کے لئے اس نے بھلے ہی آج کی طرح سونے، چاندی، ہیرے اور موتیوں کا استعمال نہ کیا ہو مگر جسم کی آرائش و زیبائش کے لئے اس کے اپنے آس پاس دستیاب قدرتی چیزیں تو تھیں ہی جیسے پھول، چڑیوں کے رنگین پر، رنگ برنگے پتھر، سوکھے اور ہرے رنگین پھل، گھاس، ہڈیاں اور دانت اور جانوروں کے ناخن وغیرہ۔ شروع میں عورت مرد دونوں ہی اپنے کو قدرت کی ان خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتے تھے۔ اس طرح سے ایک اندازہ ہو سکتا ہے کہ زیور کی ایجاد انسان نے تواریخ کے دھندلکے میں کب اور کیسے کی ہوگی۔ یہ زیورات اس کی زندگی میں تہذیب کی پہلی منزل سے ہی زمین کے ہر خطے اور ہر نسل و قوم میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان نے زیور پہلے پہنا، کپڑا بعد میں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو زمانۂ قدیم کے قبرستانوں میں پائی گئی لاشوں کے ڈھانچہ کے گلے میں پر کم کسی نہ کسی قسم کا ہار ملتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زیورات کی اہمیت اور اس کا تصور دنیا کے ہر خطے میں تھا، چاہے وہ ہندوستان ہو، مصر، روم، بابل اور چین کی تہذیبیں ہوں یا افریقہ اور یورپ کے براعظم ہوں۔ ہر جگہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو کھدائی میں زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے غاروں میں رہنے والے انسانوں کے ذریعہ غاروں کی دیواروں پر بنائی گئی تصویروں میں Rockcare Painting میں بھی اسی دور کے انسانوں کے گلے میں اکثر زیورات کے قسم کے ہار جیسی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان میں زیورات کی اہمیت انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک یکساں ہے۔ ایک طرف اس کا استعمال مذہبی رسموں، ٹوٹنے ٹوٹکوں کے لئے ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کا مقصد جسم کی آرائش بھی ہے ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے تعویذ کی صورت میں قیمتی اور نیم قیمتی پتھر گلا اور ہاتھ میں پہنے جاتے ہیں۔ یہی ضعیف الاعتقادی اور روحانیت بھی مختلف اقسام کے زیورات کی ذمہ دار ہے۔ اکثر دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے، بیماروں کے مضر اثرات سے بچنے، بیماری اور دیگر مصیبتوں سے حفاظت کی خاطر ہی قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان تعویذوں نے ہی آگے چل کر زیورات کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم بابل کی پہاڑیوں پر بنے مندروں کے پجاری بری روحوں اور دیوتاؤں سے بچنے کی خاطر ہار کی شکل میں اکثر قیمتی پتھروں سے جڑے حفاظتی تعویذ گلے میں پہنا کرتے تھے۔ آج بھی قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کی اہمیت میں کمی نہیں آسکی ہے۔

ہندوستان میں عورتیں سہاگ کی نشانی کے طور پر گلے میں منگل سوتر پہنتی ہیں، اسی طرح ماتھے کا ٹیکہ نتھ اور چوڑیاں بھی سہاگ کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں تاریخی دور کے زیورات کے ثبوت سانچی، امراوتی و بھار ہوت کی مورتیوں اور اجنتا کے غار میں دیواروں پر بنی تصویروں سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پہلے ہڑپہ، موہن جوداڑو اور تکشلا میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے زیورات کے نمونے ملے ہیں۔

مغل دور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں دور مانا جاتا ہے۔ خاص طور سے شہنشاہ اکبر سے شہنشاہ شاہجہاں تک کا زمانہ ہندوستان

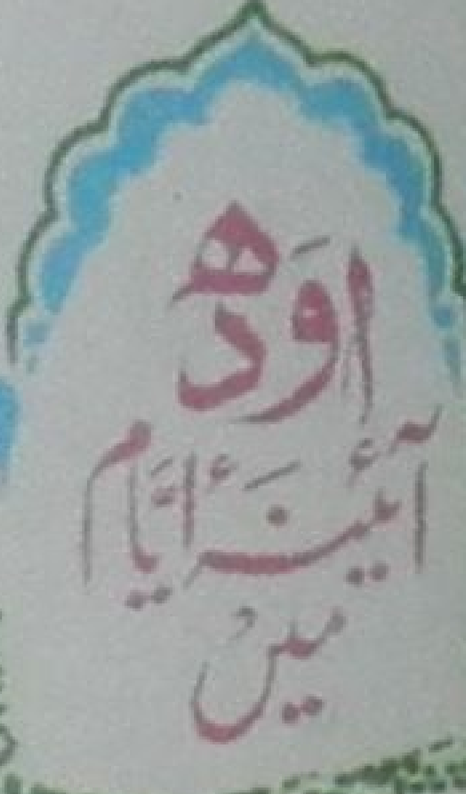
کا سبز اور کہا جاتا ہے، اس دور میں مغل دربار میں نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ایشیا، خاص کر ایرانی اور مغربی ایشیا کے عظیم المرتبت فنکار اکٹھا ہو گئے تھے۔ سبھی فنون کی قدر دانی کی گئی۔ ادب، فلسفہ، موسیقی، فن تعمیر، مصوری فنون لطیفہ غرض کہ کوئی بھی فن ایسا نہ تھا جس کے پائے کے ماہرین دربار مغلیہ سے فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ اس عیش و طرب اور خوشحالی کے زمانے میں زیورات کہاں اچھوتے رہ سکتے تھے۔ مغل بادشاہوں، امیروں، رؤسا و دیگر بڑے منصب دوران یہاں تک کہ درمیانی طبقہ کے اہل کاروں کو اپنی شان و شوکت، شاہی دبدبہ اور نام و نمود کا بے انتہا احساس تھا۔ اپنے اپنے مرتبہ حشمت اور دولت کی نمائش کے لئے زیورات بھی ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ اس فن کو بھی سبھی فنون کی طرح ہر اعتبار سے سراہا گیا۔ آئینہ اکبری کے مطابق اکبر اعظم کے پاس ہر فن کے الگ الگ کارخانے تھے۔ فنکاروں کی حسین تخلیق کا بادشاہ بذات خود معائنہ کرتا اور فنکاروں کو انعام و اکرام سے نوازتا۔ شاہی بیگمات و دیگر امرا کی عورتیں اکثر سونے کے ہی زیور پہنتی تھیں۔ چاندی پہننا عموماً ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا۔ طلائی زیورات کو مزید پرکشش اور خوبصورت بنانے کے لئے زیورات پر ہیرے جڑے جاتے اور مینا کاری سے سجایا جاتا، اس دور میں بھی زیورات کے استعمال کا عام رجحان لگ بھگ پہلے جیسا ہی رہا۔ مگر شاہی بیگمات اور دیگر رؤسا، اور امرا میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے اس کی طرز بناوٹ، نمونے اور وزن وغیرہ میں تبدیلی آئی، اس دور کے زیورات پہلے کے مقابلے ہلکے مگر بہت خوبصورت، نازک اور سبک بنتے تھے۔ اب زیورات بنانے کا تصور دولت کو زیور کی شکل میں بدل کر محفوظ رکھنا نہیں، بلکہ جسم کی زیبائش کا ذریعہ مانا جانے لگا۔ ان کو ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھی سجایا جانے لگا۔ اس طرح جڑاؤ زیورات زیادہ بننے لگے اور ان میں ایرانی و مغربی ایشیا کے فیشن کے طرز جھلکنے لگے۔

زیوروں پر اوپری سجاوٹ پر زیادہ دھیان دیا جاتا، اکثر سونے کے زیور پر اوپر کوئی قیمتی پتھر اور نیچے کی طرف مینا کاری کا کام ہونے لگا۔ ہندوستان میں آگرہ اور دلی کے علاوہ جے پور، بنارس اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی یہ فن زندہ رہا مگر بعد کے دنوں میں جے پور اس فن کا خاص مرکز بن گیا۔ اودھ میں نواب آصف الدولہ کے دور میں قیصر آغا نام کے فنکار نے گلابی مینا کاری کی شروعات کی تھی۔

مغل بادشاہوں کے زوال کے شروعات کے ساتھ نوابین اودھ کے عروج کی داستان شروع ہوتی ہے۔ نوابین اودھ کا خاص دور ۱۷۲۲ء سے ۱۸۵۶ء تک کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ یہ عہد ہندوستان کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اس دور میں ایک عجیب انداز کی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا۔ اودھ کی تاریخ جہاں ایک طرف نوابوں کی مذہبی رواداری، اخلاق، رعایا پروری نفاست و نزاکت کی کہانی ہے تو وہیں دوسری طرف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، مخبری اور سیاسی عیاریوں، نوابوں کی مجبوری اور لاچاری کی ایک پرسوز داستان بھی ہے۔

نوابین اودھ کے جد اعلیٰ محمد امین نیشاپوری دلی دربار کی طرف سے نواب برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہو کر سنہ ۱۷۲۳ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور انھوں نے اجودھیا شہر کے پاس اپنی حکومت کا مرکز بنایا، جو بعد میں فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ انہی کے وارثوں نے اودھ پر انگریزی حکومت کے تسلط سے پہلے یعنی ۱۸۵۶ء تک حکومت کی اور نوابین اودھ و شاہان اودھ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ ان نوابوں کے ساتھ ان کی اور ان کے درباریوں کی مستورات بھی دلی سے اودھ آئیں جن کے لباس اور دیگر آرائش کا سامان جیسے زیورات وغیرہ عام طور سے مغلوں کے ہی جیسے تھے۔ ان کے زیورات میں بھی فقط زینت اور آرائش کا خیال باقی رہ گیا تھا۔ نزاکت اور نفاست میں ہر قسم کے زیورات بتدریج سبک، ہلکے، نازک اور خوشنما ہوتے گئے۔ آخر وقت میں دولت مند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ شاید ہی بغیر گوٹے پٹے کے کپڑے پہنتیں اور دو ایک نہایت ہلکے اور نازک زیوروں پر ہی اکتفا کرتیں جو بہت ہی نفیس، سبک اور قیمتی ہوتے۔ گلے، ناک، کان میں اگر زیور پہننا ہوتا تو وہ بھی بہت سبک ہلکے قسم کے ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا ہلکا زیور بننا شروع ہوا جس کی مثال ہندوستان کے کسی اور مقام پر نہیں ملتی۔ ہندوستان میں نتھ پہننے کا کافی رواج تھا، مسلم عورتوں نے بھی اسے اپنایا مگر لکھنؤ کی مستورات نے نتھ کی جگہ پر ہلکی و باریک اور خوشنما کیل کو زیادہ ترجیح دی، جو انتہائی نفیس اور خوبصورت زیور ثابت ہوا۔ نازک پسندی نے ان کیلوں کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ اس قسم کی کیلوں کے کاریگر لکھنؤ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

محرم کے مہینہ میں مسلمانوں میں اور خصوصاً شیعہ حضرات کی مستورات میں



ساڑے زیورات تن سے جدا کر دیئے جاتے کیوں کہ محرم غمی کا مہینہ مانا جاتا ہے یہاں تک کہ ہاتھوں کی کلائیاں بھی چوڑیوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ چوڑیوں کی جگہ کلائیوں میں ریشم کی سیاہ پہونچیاں اور کانوں میں سیاہ اور زرد رنگ کے ریشم کے کرن پھول استعمال کیے جاتے۔

ملبوسات

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل سلے ہوئے لباس کا رواج نہ تھا۔ عورتیں اور مرد دونوں بے سل چادر، ساریاں اور دھوتیوں سے اپنی ستر پوشی کرتے تھے۔ عربوں کے بھی لباس اور وضع یہاں کے لوگوں سے کچھ خاص مختلف نہ تھے۔ لباس میں تبدیلی کے ساتھ تہذیب کا براہ راست نتیجہ ہے جس کا اثر بغداد کے عباسی خلفاء پر پڑا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔ دہلی کے دربار مغلیہ کا اور ساتھ ہی اودھ میں آنے والے نوابوں کا آخری لباس یہ تھا کہ سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ، جامہ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، کمر میں جامہ کے اوپر پٹکا اور پیروں میں جوتا۔ جامہ جو کہنی تک آدھی آستین کا شلوکہ ہوتا تھا عموماً باریک ململ اور جامدانی کا ہوا کرتا تھا۔ اسے خوشنما بنانے کی خاطر سفید ململ پر چکن کا باریک اور خوبصورت کام بنایا جاتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور جامدانی اور اودھ میں ٹانڈہ کی جامدانی بادشاہوں و دیگر عالی مرتبت امیروں کے لیے مخصوص تھی۔ بعد میں ایرانی قبا سے جامہ توڑ کر کے بالابر ایجاد ہوا۔ اس میں گریبان بالکل کھلا ہوتا تھا۔ آگے چل کر اسی بالابر کو ترقی دے کر انگرکھا ایجاد ہوا۔ انگرکھا دراصل بالابر اور جامہ دونوں کو ملا کر بنایا گیا تھا اس طرح ایک نئی قطع پیدا کر دی گئی۔ اس میں بائیں جانب سینہ تھوڑا کھلا رہتا تھا، چولی اور دامن نیچے رہتے تھے۔ لکھنؤ آنے پر اس انگرکھے میں زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی۔ چولی گول، اونچی اور کھینچی ہوئی چست ہو گئی۔ بغلوں کی چنٹیں بالکل غائب ہو گئیں۔ انگرکھے کی مقبولیت نے نیمہ کا رواج ختم کر دیا۔ اس میں بائیں جانب سینہ کا کھلا رہنا اس دور میں معیوب سمجھا جاتا۔ لکھنؤ میں انگرکھے کے نیچے نیمہ کے بجائے شلوکہ کا استعمال رائج ہوا۔ بعض حضرات رنگین شلوکہ بھی پہنتے اس لیے کہ اس کے بیل بوٹے اور رنگ تن زیب کے سفید انگرکھے کے نیچے اپنی رنگین جھلک دکھا کر ایک خاص لطافت پیدا کرتے تھے۔ بالابر میں دوسری ترمیم لکھنؤ میں یوں ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔ یہ چپکن کسی بھاری کپڑے کی ہوتی جو جاڑے کے موسم کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ یہی چپکن اہلکار، باریاب دربار سلطنت کا موزوں لباس بن گئی۔ اس کے بعد آخر عہد میں انگرکھا اور چپکن دونوں کو ترتیب دے کر اچکن ایجاد کی گئی یہ اچکن لوگوں کو بہت بھائی اور اس کا رواج شہر سے نکل کر دیہاتوں اور ہندوستان کے دیگر حصوں تک پہونچ گیا۔ یہی اچکن حیدرآباد پہونچ کر تھوڑی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی طرح کر دی گئیں۔ انگرکھے کے نیچے شلوکہ پہنا جاتا تھا، اس کے عوض آگے چل کر پہلے ڈھیلا کرتا ایجاد ہوا، اور بعد میں مغربی اثر کے تحت قمیص نے اس کی جگہ لے لی۔

ابتداً میں مسلم حکمران کے عمامے بڑے بڑے ہوا کرتے تھے اور اسی کی مناسبت سے امراء اور درباریوں کی پگڑیاں بھی بڑی ہوا کرتی تھیں۔ سلطنت مغلیہ کے عہد میں یہ پگڑیاں چھوٹی اور ہلکی ہوتی گئیں۔ اکثر جدت طراز امراء نے اپنی خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کیں۔ آگے چل کر ان پگڑیوں کو مزید مختصر اور ہلکا کرنے کی خواہش نے ٹوپیوں کی ایجاد کی۔ چند روز میں ان ٹوپیوں میں بھی ترمیم تنسیخ کا عمل شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ٹوپیوں کی باڑھ سی آگئی۔ پگڑیاں چھوڑ کر ٹوپیوں کو اس طرح اپنایا گیا کہ اب کے سر پر ٹوپیاں ہی نظر آنے لگیں۔ چوگوشیہ، پنچگوشیہ اور دوپلی ٹوپیاں زیادہ مقبول ہوئیں۔ چوگوشیہ ٹوپی مہذب اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے مخصوص تھیں۔ دوسری ٹوپی دوپلی تھی جسے شہزادوں سے لے کر ادنیٰ طبقہ کے لوگ بھی کچھ ترمیم کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ نواب نصیر الدین حیدر کے وقت میں ایک گول ٹوپی کا بھی رواج تھا جو مندیل کہلاتی تھی۔ اس ٹوپی کو دربار میں بھی جگہ دی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تک چوگوشیہ، مندیلوں اور دوپلی ٹوپیوں کا خوب دور رہا، بعد میں ترکی ٹوپی نے بھی زور پکڑا، اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ہیٹ صاحب قسم کے ہندوستانی لوگ استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی انگریزوں کے اثر میں آ کر مندیل کی فیلٹ کیپ بھی ایجاد ہوئی، جسے انگریزوں نے "بالوز کیپ" کا نام

دے رکھا تھا۔ ٹوپیاں چاہے جتنی قسم کی رہی ہوں دوپلی ٹوپیوں کی مقبولیت کو کوئی نہ پہونچ سکی۔ سبھی لوگوں نے اس ہلکی پھلکی ٹوپی کو اپنے سروں پر بٹھایا۔

ٹوپی کی مقبولیت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ لکھنؤ کی نازک پسندی نے پگڑیوں کو فنا کر دیا۔ خود یہاں کے حکمرانوں کے سروں پر پرانی دستار نواب سعادت علی خاں کے زمانے تک رہی۔ پہلے نواب برہان الملک، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سروں پر وہی دہلی کے عہدیداران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی تھی۔ جس پر درباری موقعوں پر جواہرات کی قلغیاں، مرصع چوغے اور سرپیچ لگا دیے جاتے تھے۔ اکثر قلمی تصویروں میں نواب سعادت علی خاں کے سر پر ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جسے اہل لکھنؤ شملہ کہتے ہیں۔ یہی شملہ نواب نے دربار کے دیگر سبھی امراء اور وزیروں کو پہنایا۔ غازی الدین حیدر کو انگریزوں نے نواب سے بادشاہ بنا کر ان کے سر کو ایک عدد تاج کا حقدار بنا دیا۔ یہ تاج یورپ کے بادشاہوں کے تاج جیسا تھا۔ اس عہد کے شہزادے خاص موقعوں پر بھاری کام کی نوک دار ٹوپیاں پہنتے تھے۔ مگر سلطنت کے عہدیداران کو حکم تھا کہ شملہ پہن کر دربار میں حاضر ہوں۔ شملہ ٹوپی کا چلن واجد علی شاہ کے زمانے تک رہا۔ دربار کے مختلف درجہ کے اہلکاروں کے لئے الگ الگ رنگ اور قسم قسم کی پگڑیوں کے پہننے کا حکم تھا۔ سنی علماء دین عام طور سے سر پر عمامے پہنا کرتے تھے۔ شیعہ علماء بیشتر دوپلی ٹوپی ہی پہنتے ہے مگر عام لوگوں کے خلاف ان کی سیون بجائے آگے سے پیچھے آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ بدن پہ لمبا کرتا مگر اس کے گریبان کا چاک سینے کے بیچ کے بجائے بائیں شانے کے پاس ہوتا ہے۔ جو علماء ایران و کربلا ہو آتے ہیں، ان کے کرتے کے اوپر طیلسان ہوا کرتی ہے۔ جو دوپٹہ یا رومال ہوا کرتی ہے، جسے واعظ خطبہ کے وقت پہنتے ہیں پاؤں میں چھوٹے پائچوں کا پاجامہ ہوتا ہے اور پیروں میں ایک خاص جوتا (قفشہ) ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں میں دھوتی کی جگہ پائجاموں کا رواج تھا۔ اس کے پہلے صرف دھوتی ہی پہنی جاتی تھی، پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ آگے چل کر پائجاموں کی قطع میں اتنا تغیر ہوا کہ پائجامہ کی مہری پنڈلی سے لپٹی رہتی۔ بعد میں مہری کسی قدر نیچی اور لمبی ہو گئی۔ مگر ٹخنوں سے آگے نہ بڑھی۔ لکھنؤ میں ڈھیلے موہری کا پاجامہ شروع ہوا آگے چل کر آسی کاٹ کا تنگ اور چست پائجامہ پہننے کا رواج چل نکلا جسے گھٹنا (چوڑی دار) کہتے ہیں۔ یہ گھٹنا سبھی طبقوں میں یکساں مقبول ہوا۔

ہندوستان میں عورتوں کا قدیم لباس صرف بے سلی چادر تھی جو کمر سے باندھ کر آدھی اوپری حصہ پر لپیٹ لی جاتی تھی اس کے علاوہ سینہ کے اوپر باندھنے کا ایک اور لباس تھا جسے انگیا اور چولی کہتے تھے بٹے ہوئے کہتے پاجامے مسلمان اپنے ساتھ لائے، مسلمان عورتیں ڈھیلے پاجامے ساتھ لائیں جو بعد میں گھٹنے بن گئے مگر ان کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں اوپر کا گھیر کم ہوتا گیا اور پائنچہ کی مہریاں بہت تنگ ہو گئیں۔ لکھنؤ میں مسلمان بیگمات تنگ مہری کا پائجامہ، سینے پر تنگ آستین کی کھنچی ہوئی انگیا اور دھڑ چھپانے کے لئے ایک کرتی اور دوپٹے کا استعمال کرتی تھیں۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے سے گھٹنے کی جگہ بڑے بڑے گھیر دار پائنچوں کے کلی دار پائجاموں نے لے لی تھی جو کمر سے بالکل تنگ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس باریک کپڑوں اور آدھی آستین کے تنگ شلوکوں کا بھی رواج نکلا۔ اسی کے ساتھ نیچے کرتے کا بھی چلن شروع ہوا۔ جاڑے کے لباس خصوصاً امراء میں موٹے اور اونی کپڑوں کے ہوا کرتے تھے جنھیں زردوزی کے کاموں سے سجا کر ان کی خوبصورتی کو دوبالا کیا جاتا۔

خاص خدمت گار مردوں اور عورتوں کی پوشاکیں ان کے مالکان کے جیسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خدمت گار اپنے مالکوں کی اتری ہوئی پوشاکیں ہی پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے دیگر خدمت گاران جیسے محل داروں، مغلانیوں، کہارنوں وغیرہ کی وضع قطع مختلف ہوا کرتی تھیں اور انھیں آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

اودھ میں خصوصاً لکھنؤ اور اس میں بھی خاص کر شیعہ حضرات کے یہاں محرم کی ایک الگ اہمیت ہے اور چونکہ یہ غم کا مہینہ مانا جاتا ہے اس لئے اس ماہ میں زندگی انتہائی سادگی سے گذاری جاتی ہے۔ اظہار غم کرنے کے لئے بھڑکیلے فیشن دار کپڑوں کو ترک کر سادے کپڑے جو اکثر کالے، نیلے یا سبز رنگ کے ہوتے ان کا استعمال کیا جاتا، کیوں کہ یہ رنگ غم اور سوز کا رنگ تصور کئے جاتے ہیں۔ سبز رنگ کے کپڑے اس لئے استعمال

کئے جاتے تھے کہ بنی عباس کے عہد میں بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا۔

نوابین اودھ کا زمانہ دنیا کی پریشانیوں سے دور چین سکون امن، عیش وطرب کا زمانہ تھا۔ یہاں کے نوابین، رؤسا، امراء و دیگر ذی حیثیت حضرات کو اپنی کفالت کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وقت گذارنے کا ذریعہ گھر سے باہر ادبی محفلیں، یا گھر کے اندر بیگمات اور باندیوں کی صحبتیں ہوتیں۔ نتیجہ کے طور پر اکثر مردوں پر عورتوں کی وضع غالب آنے لگی اور لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ میاں اور بیوی کی رضائیوں، دوشالوں پائجاموں وغیرہ میں بھی کوئی فرق باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ گوٹہ، پٹہ اور زیور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگوں کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹے کے پہننے لگے۔ لیکن آگے چل کر انگریزی اثر سے یہ کیفیت کم ہونے لگی۔

آج کل کے برخلاف گذشتہ نوابی عہد میں بھی گھر اور باہر ایک ہی جیسے کپڑے پہننے کا چلن نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت انگرکھا، چپکن، پائجامہ وغیرہ پہنا جاتا تھا مگر گھر کے اندر ایک ہلکی سی لنگی، تہبند بھی استعمال کی جاتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر ایک دھلا ہوا لباس مہینہ بھر چل جاتا جیسے آج ہی دھل کر آیا ہو۔

دھوبی کے یہاں سے دھلے ہوئے انگرکھے کا دامن، گوٹ اور آستین چنٹ دے کر سجائی جاتیں جن کا اثر کافی عرصہ تک باقی رہتا۔ عورتوں کے گھریلو اور باہری لباس میں کوئی فرق نہ تھا۔ گھر میں پہننے کا جوڑا صرف تھوڑا ہلکا اور باہر مہمانداری میں جانے کا جوڑا بھاری قیمتی اور کامدار ہوا کرتا تھا۔ مہمانداری میں مرد عورتیں اور بچے سبھی اپنے حسب اوقات نفیس اور قیمتی لباسوں میں جایا کرتے جس سے محفلیں بھڑکیلی اور بارونق نظر آتیں۔

لباس کے ساتھ ساتھ مغل فیشن کے جوتوں میں لکھنؤ کے لوگوں نے تراشش خراش کر نئی جوتیاں پیدا کیں۔ اکثر جوتے سبک، ہلکے اور انتہائی نفیس بنے ہوتے اور انھیں سجانے کے لئے کارچوبی اور بروکیڈ وغیرہ استعمال کئے جاتے۔ بعد میں ان جوتوں اور جوتیوں کی جگہ سلیپروں، چپلوں اور انگریزی طرز کے شوز نے لے لیں۔



□□

حاشیہ :

لہ زیورات اور دوسری قیمتی دھات کی اشیاء کی اوپری سطح کو مختلف قدرتی رنگوں سے سجانے کے فن کو مینا کاری کہتے ہیں۔ اس کی ہلکی پھلکی مثال تو ٹکشلا کی کھدائی سے حاصل قدیم عہد کے زیورات میں بھی ملتی ہے، مگر اس فن کو نکھرنے کا پورا موقع مغل دور میں ہی حاصل ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولتِ انگلشیہ نے بادشاہ بنا کے تاج پہنا دیا جو دراصل ہندوستان اور ایشیا کا تاج شاہی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا تاج تھا۔ اس وقت سے فرمان روایانِ لکھنؤ نے شملہ یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ تمام شاہزادوں نواب زادوں اور عمائدینِ شہر نے بھی پگڑی کو خیر باد کہہ دی۔ شاہزادے خاص موقعوں پر تو تاج، مگر علی العموم مسالے دار بھاری کام کی لٹکے دار ٹوپیاں پہنتے اور انھیں کی تقلید شہر کے دیگر معززین بھی کرتے۔ لیکن عہدہ دارانِ سلطنت، وزراء اور اہلکاروں کو حکم تھا کہ شملہ پہن کے سلاطین کے و وزراء کے دربار میں آئیں۔

غازی الدین حیدر کے زمانے سے امجد علی شاہ کے عہد تک تمام عہدے داروں کے سر پر وہی شملہ رہا کرتا تھا۔

گذشتہ لکھنؤ : عبدالحلیم شرر

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

طلسمِ ہوش رُبا میں نسوانی مُعاشرہ

خُدا مغفرت کرے نواب مرزا شوق کی۔ ہو سکتا ہے ان کے عہد میں کچھ عورتوں کا "حال پوشیدہ" نہ رہا ہو اور انھیں عورت "آفت اور قیامت" نظر آئی ہو۔ اور اللہ معاف کرے مرزا رُسوا کو! انھوں نے اتنا اچھا ناول لکھا کہ آج کے پڑھنے والے کو انیسویں صدی کے لکھنؤ میں صرف امراؤ جان، بسم اللہ جان، خورشید جان، خانم اور آبادی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اُس دور کے نسوانی معاشرے کا تشخص طوائفیت اور جسم فروشی سے ہی کیا گیا، لکھنؤ کی عیاشی کی کہانیاں انیسویں صدی کے لکھنؤ کی پہچان بنا دی گئیں۔! تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ اور ماہرین سماجیات کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک چھوٹے سے طبقے پر پورے معاشرہ کا قیاس کر لیا گیا۔!

حالاں کہ انیسویں صدی کا معاشرہ صرف امراؤ جان ادا اور فریب عشق کا معاشرہ نہیں تھا، یہ مرثیوں کا بھی معاشرہ تھا، جس کے کرداروں کے تقدس کی خود پاکیزگی بھی قسم کھاتی ہے اور جہاں عصمت و عفت کے کبھی نہ بجھنے والے چراغ روشن ہیں!

پھر ایک اور رُخ سے اس مسئلہ کو دیکھئے!

کیا تاریخ میں کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہے جب معاشرہ میں جسم فروشی نہ رہی ہو؟ کسی زمانے میں بھی ــــــ لیکن کیا اس زمانے کی پہچان یا اس علاقے کی شناخت آوارگی یا جسم فروشی سے کی گئی ہے؟ کیا آج کال گرلس نہیں ہیں؟ امراؤ جان میں کسی نے کسی کو ایڈس کا تحفہ نہیں دیا۔ اور آج نائٹ کلب ہو یا ہوٹل ہوں یا کیبرے ہو یا گلیاں ہوں شاعر کو کہنا پڑتا ہے ؏

جسم امراض کے نکلے ہوئے تنوروں سے

توکیا آج کے معاشرے کی یہ پہچان بنے گی۔؟

آج اسکرین پر نظر آنے والی اداکارہ آرٹسٹ ہے، فن کار ہے۔ آج تو اس کے جسم کی اسکرین سے لے کر معمولی کاغذ تک پر نمائش ہوتی رہتی ہے، تو ہمیں کیا حق ہے کہ گزرے ہوئے کل کی رقاصہ اور مغنیہ کے فن کی نمائش کو عصمت فروشی کے تختہ دار پر لاکر کھڑا کردیں۔ اس کی پیشانی پر بدچلنی کی کیلیں ٹھونک دیں اور اس کے پورے جسم میں عیاشی کا تمغہ جڑ دیں۔!!

شریف اور شائستہ مزاج لکھنؤ ــــ تہذیب کا دلدادہ، تمدن کا رسیا، اعلیٰ ترین اقدار کا پاسبان و امین، اپنی شخصیت کو قربان کرکے دوسروں کی شخصیت کو "پہلے آپ" کہہ کر اُبھارنے والا لکھنؤ ــــ اور اپنی تاریخ پر کوئی آہنی پردہ نہ ڈالنے والا لکھنؤ ــــ ان تمام اہل قلم سے پوچھنا چاہتا ہے جو طوائف کو لکھنؤ کی "زوال آمادہ تہذیب" کی علامت قرار دیتے آئے ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ دشمن انگریزوں کے زر خرید اور متعصب لکھنے والوں کی تحریریں پڑھتے ہوئے اپنے ذہن کے دریچے کیوں بند کر لیے۔ یہ صداقت فکر سے کیوں محروم ہو گئے؟

بے شک تخلیق کار کا قلم کیمرے کی آنکھ ہوتا ہے لیکن انیسویں صدی کے لکھنؤ میں اگر آپ انیس و دبیر، ضمیر و تعشق کے مرثیے نہیں بھی دیکھنا چاہتے تو داستانیں ہی پڑھ لیجئے کہ ان داستانوں میں ایک مکمل سماجی نظام موجود ہے اور اس سماجی نظام میں عورت بہت اہم ہے اور یہ عورت مضبوط کردار کی مالک، باحیا، صاحب عصمت ہونے کے ساتھ بہادر، کارزار حیات میں معرکہ آرا، منظم، اپنی کمزوریوں کے ساتھ مکمل

لطافتوں اور رعنائیوں کا پیکر ہے۔

اودھ کی داستانوں میں بوستانِ خیال کے ترجمے، ملک محمد گیتی افروز وغیرہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے فسانۂ عجائب کی ہی سیر کر لیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماہ طلعت پکی عورت ہے کج بحثی کرتی ہے، ہٹ دھرمی کرتی ہے۔ خود پسند ہے لیکن شوہر سے محبت میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، باحیا ہے۔ مہر نگار تو غیرت و عفت کی دیوی ہے، عقل و دانش کا پیکر ہے۔ انجمن آرا خوبصورت ہے مگر بدچلن نہیں۔ بنی اسرائیل کی عورت یعنی قاضی کی بھاوج عصمت مآب ہے۔ غرض کہ ایک جادوگرنی کو چھوڑ کے ساری خواتین اپنی کمزوریوں کے ساتھ عصمت و عفت کی علامتیں ہیں۔ کیا مجال ہے جو ان میں سے کبھی کسی کے دل میں اپنے محبوب کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال بھی آیا ہو۔!

لیکن اس داستان سے قطع نظر طلسم ہوش رُبا کی اگر سیر کریں تو ہر گزرگاہِ خیال پر محبتوں کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ اس طلسم کی عورتوں کی کچھ خصوصیات پر غور کیجیے۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ شہزادہ اسد کو طلسم ہوشربا کو فتح کرنا ہے۔ اس میں افراسیاب سے محاربات کا تذکرہ ہے اور اسد مہ جبیں پر عاشق ہے جو افراسیاب کی لڑکی ہے۔

داستانوں کے ماحول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سماج میں مرد حاوی نہیں ہے بلکہ مرد و عورت دونوں برابر سے ایک دوسرے کے شریک کار نظر آتے ہیں۔ لاچین و بلقیس ثانی، افراسیاب و ملکہ حیرت، بہار و قباد، مخمور و نور الدہر، برق و ایرج، عمرو عیار و صرصر، قرآن و صبا رفتار، اسد و مہ جبیں، غرض صنفی اعتبار سے طلسم ہوش رُبا میں توازن ہے۔ نہ عورت مرد کی کنیز ہے اور نہ مرد مطلق العنان۔!

سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو طلسم ہوش رُبا میں اقتدار کی تقسیم تقریباً برابر کی ہے۔ جادوگروں میں بے شک مختارِ کل افراسیاب ہے لیکن اس کی ایک وزیر ملکہ صنعت سحر ساز ہے۔ اس کی نانی اور دادی یعنی ملکات چہار دست اور ماہیان زمرد پوش محافظ سلطنت ہیں۔ حجرۂ ہفت بلا کی ایک بلا تاریک شکل کش ہے اور حجرۂ پنج سم کی یاقوت سخندان جس کے ساتھ ہر وقت دو نہریں بہا کرتی ہیں اور پھر بے شمار جادوگرنیاں ہیں [illegible] حکومت کا کل پرزہ سمجھنا چاہیے۔ پھر مخبری اور سراغ رسی کے لیے عیار بچیاں یعنی صرصر، صبا رفتار، تیز نگاہ خنجر زن، شمیمہ نقب زن اور صنوبر ہیں ـــــ لیکن ان سب سے بالاتر افراسیاب کی بیوی ملکہ حیرت ہے جو منتظم اعلیٰ بھی ہے اور جو سکہ خطبہ افراسیاب کا مگر عمل دخل ملکہ حیرت کا ہے۔

ان تمام عورتوں میں کوئی بھی نہ طوائفیت رکھتی ہے نہ بدچلن ہے نہ کسی پر مرزا شوق کے مصرعے صادق آتے ہیں اور نہ ہی یہ رُسوا ہیں۔

ان کے اور نقائص ہوں گے اور ہیں لیکن جو معاشرہ ان عورتوں کا ہے اس سے محمد حسن عسکری، عزیز احمد یا خورشید الاسلام یا از ایں قبیل صرف نادم ہو سکتے ہیں یا اپنے ذہنی تعصب پر تاسف کر سکتے ہیں۔ غیظ سے اپنی انگلیاں کاٹ سکتے ہیں ـــــ! مگر اس معاشرہ کو طوائفیت کا نام نہیں دے سکتے۔

اور یہ جادوگروں کا معاشرہ تھا جس معاشرے سے نہ مصنف کی ہمدردیاں وابستہ ہیں نہ سننے والوں کی۔ لیکن اس معاشرہ میں نہ کہیں عدم توازن ہے اور نہ بدچلنی ـــــ نہ عورت خود جلتی ہے نہ مرد کو جلاتی ہے۔ مصور اور صورت نگار میں کبھی کبھی خوش فعلی کے طور پر مار پیٹ ہو جاتی ہے چنانچہ مصور نے صورت نگار کو طمانچہ مارا تو صورت نگار نے بھی ہزاروں گالیاں دیں۔ دو ہتھڑ رسید کیا۔ صرصر عیارہ نے عمرو عیار سے محبت کے باوجود اسے ایک لات بھی رسید کر دی۔ یہ ایک رُخ ہے۔ دوسری طرف عورتیں بڑی اچھی منتظم ہیں۔ ایک ملکہ گلزار عنبر مو ہے۔ اس کے یہاں سب قیدیوں کو کھانا تو ملتا ہی ہے، آٹھویں دن مٹھائی بھی ملتی ہے چنانچہ بدیع الزماں کو بھی مٹھائی ملی تھی۔ اسی طرح ملکہ حیرت کے ایک انتظام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"عمرو نے شہر ناپرساں کو خوب لوٹا۔ ملکہ حیرت نے شاہی خزانے سے سب کے نقصان کی تلافی کر دی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ آئندہ حکومت کسی نقصان کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ لوگ اپنی حفاظت آپ کریں۔"

حالتِ جنگ میں جب ایمرجنسی ہو، ایک اچھا انتظامیہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے ـــ؟

یہ جادوگرنیاں اپنے عہد کی سائنس (جادو) سے واقف ہیں ان میں سے

ہر ایک اپنے فن کی ماہر ہے۔ بدچلنی یا بدکرداری کا کیا ذکر! کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ تو دیر سے پانی کی طرح بہہ جائیں!

ان عورتوں میں فوجی مہارت اور جنگی صلاحیت ہے۔ یہ اپنے اپنے صوبوں کی گورنر (قلعہ دارنیاں) ہیں۔ کوئی موقع پڑتا ہے تو فوج لے کر نکلتی ہیں۔ ان میں نہ بزدلی ہے اور نہ زندگی کی حقیقتوں سے فرار اور ان تمام باتوں کے ساتھ یہ جس کی ہیں اس کی ہیں ۔۔۔ بستر کی چادر کی طرح مرد بدلنے کی قائل نہیں ہیں ۔۔۔۔۔!

یہ تو ہوا جادوگروں کی مملکت کا حال جہاں عورت بڑے وقار، دبدبے اور کلّے ٹھلّے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ عورت کی ایک صحت مند معاشرے میں کیا حیثیت ہونی چاہیے۔ وہ ان جادوگروں کے دیس میں ہے ۔۔۔ جو آج کے اعلیٰ ترین نسائی حیثیت کے علمبردار ممالک میں نہیں۔!

اب اس کے مقابل جو معاشرہ ہے اس کے لیے داستان گو لفظ اسلام یا خدا پرستوں کے لشکر کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ یہاں دو طرح کی خواتین ملتی ہیں:

۱۔ وہ خواتین جو امیر حمزہ کی رشتہ دار ہیں، جن کی جھلک چشم فلک نہیں دیکھ سکتی، وہ خوش رہتی ہیں، سکون سے چراغِ خانہ بن کر رہتی ہیں۔

۲۔ وہ خواتین جو جادوگرنیاں تھیں اور جو اب اسد کے لشکر میں ہیں اور افراسیاب سے لڑ رہی ہیں، ان میں اور افراسیاب کے لشکر کی جادوگرنیوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ علوم متداولہ سے یہ دونوں واقف اور باخبر ہیں۔ اپنے فن کی ماہر ہیں۔ بزدل نہیں بہادر ہیں۔ گو کہ افراسیاب کے ساتھ والی خواتین کی غالب اکثریت بدچلن نہیں ہے اور ملکہ حیرت افراسیاب کے مرنے کے بعد جس شوہر پرستی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ لیکن خدا پرستوں کے لشکر کی جادوگرنیاں یا شہزادیاں کردار کے اعتبار سے ایک روشن مینار ہیں۔ شوہر پرست، باوفا، صاحب ایثار ہیں، ایک کی ہو کر رہنے والی، دُنیاوی عیش و آرام کو ٹھکرانے والی ۔۔۔۔ زمرد شاہ باختری عرف خداوند لقا کی لڑکی لالان غوں قبا ثابت قدم کوئے محبت بننے کے لیے جس جگہ وارث نے بٹھایا وہیں جان دینا چاہتی ہے۔" مہ جبیں افراسیاب کی لڑکی ہے۔ افراسیاب نے اسے ہر طرح کی لالچ دی ہے۔ اس پر دباؤ ڈالا ہے۔ سمجھایا ہے کہ وہ اسد کی محبت سے باز آجائے لیکن مہ جبیں ؏

ہم ان سے اچاک دور رہ کر اگر جئے بھی تو کیا کریں گے

ذرا اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ان کے (شہزادہ اسد) ساتھ تڑپ تڑپ کے مر جاؤں گی کہ یہی لطفِ زندگی ہے۔"

بہار اور مخمور دونوں کے لیے افراسیاب نے ہر طرح کی لالچ اور طلسمی جنت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر ناممکن ہے کہ ذرا سی لغزش بھی ہو جائے۔

ان عورتوں کا ایک اور نفسیاتی پہلو ہے جو معاشرت کا حسن ہے یعنی ان عورتوں میں باہم ایک دوسرے کے خلاف حسد کا جذبہ نہیں ہے اسد پر بہت سی عورتیں عاشق ہیں مگر یہ سب ایک دوسرے سے اس لیے محبت کرتی ہیں کہ ہم ایک ہی شمع کے پروانے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے وقت پر کام بھی آتی ہیں۔ مثلاً بہار، یا مخمور یا ملکہ براں۔ ان سب کے محبوب الگ الگ ہیں۔ مگر یہ سب شہزادہ اسد کے لیے اور ایک دوسرے کے لیے خلوص کے خزانے رکھتی ہیں۔ جان دینے سے گریز نہیں کرتیں۔ انھیں میں ملکہ محبوب کاکل کشا بھی ہے جس کا کردار ایثار و قربانی کی معراج ہے صورت حال یہ ہے کہ عفریت طلسم بڑھتا چلا آرہا ہے اور وہ صرف ملکہ محبوب کا دل کھا کر مطیع ہو سکتا ہے۔ محبوب اپنی کوکھ پر خنجر مارتی ہے۔ دل نکال کر پیش کرتی ہے اور عفریت کی مصیبت سے اسد کو چھٹکارا دلاتی ہے۔

یہ عورتیں پیکر مہر و وفا ہیں۔ یہ نہ آفت ہیں نہ قیامت بلکہ یہ ایک مثالی معاشرہ کی وہ خواتین ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں ہندستانی تاریخ کے صفحات میں اپنا وجود رکھتی تھیں۔ رضیہ سلطان، چاند بی بی۔ حیات بخشی بیگم۔ مخدومہ جہاں، علی مردان خاں کی بیٹی۔ رانی دُرگا وتی۔ اہلیہ بائی ۔۔۔ خواتین کا یہ زرّیں سلسلہ تھا جس کا منطقی نتیجہ بیگم حضرت محل تھیں اور طلسم ہوش رُبا کی یہ خواتین انھیں روایات کا روشن اور تابناک عکس تھیں۔

ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ساری شہزادیاں عاشق مزاج ہیں تو حق یہ ہے کہ عورت کا عشق کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے اگر وہ ایک کی

ہوکر رہے۔ یہ شہزادیاں ایک ہی بار عشق کرتی ہیں جس سے عشق کرتی ہیں اسی کی ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے اپنے کفو سے عشق کرتی ہیں۔ کمتر درجہ کے آدمی کی ان کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے اگر کسی کمتر نے ان کے بارے میں سوچا بھی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایسا نہیں ہے کہ طلسم ہوش رُبا میں جو معاشرہ ہے اس میں خواتین صرف شہزادیاں یا پریاں ہیں بلکہ ایک طبقاتی سماج ہے جس میں ہر طبقے کی عورت نظر آتی ہے اور لباس و زیورات سے پہچانی جاتی ہے۔

شہزادیاں اور ملکہ "انگیا گوکھرو کی یا کامدانی کی، پرزور کرتیاں سبز بادلے کی، ململ اور آب رواں کی پیشواز، زردار پاجامے، پائینچے گلبدن کے لچکے دار مشجر اور زربفت کے لہنگے، شبنم کے دوپٹے اور زیورات میں ٹیکہ، کنگن، چمپاکلی، کرن پھول، چاند ٹیکی، جھومر، یاقوت اور احمر کے جھپکے، جگنو کا توڑا، ناک میں نتھ، کان میں بجلیاں، بالے، جھمکے، مُندرے، اُدراج، بازوبند، نوگری، جوشن، دست بند، پازیب، چھڑے، جھانجھ، گھنگھرو، خلخال، پیر میں زردوزی کی زیرپائی، آرام پائی"۔

یہ ہے وہ متمدن معاشرہ خوش حال لوگوں کا مگر اسی کے ساتھ کنیزیں، جلیسیں، خواصیں، آتوجی، چھوچھو، ماما، اصیلیں، مغلانی، قلماقنی بھی نظر آتی ہیں۔ ملکہ حیرت کے سرپر وزیرزادیاں مگس رانی کرتی ہیں۔ تین چارسو خوبصورت چتر بردار ہیں۔ دیہات کی عورتیں البتہ غربت کا شکار ہیں۔ ان کے "لہنگے پھٹے ہوئے ہیں، پیتل کی بالیاں پہنتی ہیں، گاڑھے کی کرتیاں" ہیں۔ شہر میں ساقنیں حقہ پلاتی ہیں۔ ہزار بنا ڈُکے دلائی سفید اودی گوٹ کی اوڑھے، آگے پیلے طوق سونے کا دکھانے کو گلا کھولے، پائینچے پاجامے کے نیچے تخت پر دھرے"۔

ان کے آگے بڑھ کر کبڑنوں اور سکڑنوں کی بہار دیکھئے کہ :

"لہنگے قیمت کے پہنے سامنے ٹوکروں میں ترکاریاں، انار، امرود، شریفے، چنے تھے۔ گنڈیریوں کے لیے لگے، بوندے جھلتی تھیں"۔

ساری عورتیں نفاست پسند ہیں۔ ان میں شوخی ہے لیکن بدکاری نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ ترین معیار کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ ان کے پاس عقیق کی دانی ہے۔ دانتوں میں مسّی لگاتی ہیں۔ گلگونہ، غازہ تو ہوتا ہی ہے پورپور مہندی رچی ہوتی ہے۔

"بی گل رنگ! تم کو اپنی صورت کی قدر نہیں۔ ابٹنا منہ پر ملا کرو، چند دنوں میں رنگت کھل جائے گی"۔

یہ خواتین حقہ اور پان سے شغل کرتی ہیں۔ ہوادار تخت رواں، محافہ، پالکی نالکی جیسی سواریاں استعمال کرتی ہیں۔ ان کے یہاں دسترخوان بھی دیبا کا ہوتا ہے۔ ان کے بستر جب بچھتے ہیں تو

"چار گھڑی دن رہے حکم دیا کہ پلنگ ہمارا بالائے بام بچھاؤ کہ چاندنی کی کیفیت دیکھیں گے اور وہیں آرام کریں گے۔ بموجب حکم پلنگ کوٹھے پر آراستہ ہوا اور اوٹ پھولوں کے کھڑے کر دیئے۔ گلاب اور کیوڑے کے قرابوں اور عطر کے شیشوں کے منہ کھول کر رکھ دیئے۔ گلدستے جا بجا چُن دیئے کنیزوں نے کہا وادی خواب گاہ آپ کی درست ہے"۔

ان کی نفاست اور ایک سحرکار ماحول کی تخلیق وہ چاہے باغ کا نقشہ ہو، جشن ہو ساز ہوں، موسیقی کے مختلف راگ ہوں، جو بھی ہو ان سب میں نفاست ہے لیکن آوارگی اور بدچلنی نہیں ہے۔ بیشک شہزادیاں شراب پیتی ہیں لیکن یہ "ماڈرن ڈرنک" نہیں ہے یہ کوئی بھی مشروب ہو سکتا ہے جس سے سرور آتا ہے اس کے نشہ میں خرمستی، بدمستی نہیں۔

یہ عورتیں ان تمام باتوں کے ساتھ ہمدرد بھی ہیں، ذہین بھی ہیں۔ ان ہی عورتوں میں ملکہ آسمان پری ہے جس نے امیر حمزہ کو مرہم سلیمانی دیا تھا جس سے ہر زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ ان میں جہاں طب کا یہ پہلو ہے وہاں ٹونا ٹوٹکا بھی ہے کہ۔ "اگر سات جمعرات سرت کا نام لیکر نیم کی پتی اور نمک کنوئیں میں چھوڑ دیا جائے تو وہ مال زادی فوراً نکل جائے گی۔!!"

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ داستان گو عوامی زندگی سے باخبر نہ تھے۔ عوامی زندگی سے اگر مُراد یہ ہے کہ بیل کس طرح ہنکائے جاتے ہیں، سیار کس طرح بھگائے جاتے ہیں۔ ہڑتال کیسے ہوتی ہے تو یقیناً یہ معاشرہ تو داستانوں میں نہیں ہے، اس لیے کہ داستانوں کی فضا شرفائے شہر کی ہے مگر اس شہر میں گھیارے، لکڑہارے، بھٹیے، چڑیمار، کپڑا بننے والے اور ان سب کے ساتھ کھارے اور گاڑھے کی لنگیاں اور انگرچھے ملتے ہیں لیکن

یہ سب ہے تھوڑے سے فرق کے ساتھ — عمرو کی زنبیل سے کلوار برآمد ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ کٹنی مہترانی بھی دکھائی دیتی ہے، جو ٹوکرا بغل میں رکھے بالیاں اور جھمکے پہنے نظر آتی ہے۔ یہ مہترانیاں مخبری بھی کرتی ہیں۔ داروغہ ان سے گھر گھر تلاشی لینے کا بھی کام لیتے ہیں۔

یہ ساری باتیں ہیں لیکن ان میں کہیں بھی نہ "زوال آمادہ تہذیب" ہے، نہ "بدکار معاشرہ" نہ بدچلن عورتیں۔ لکھنؤ کا یہ خوددار معاشرہ، متنوع معاشرہ بہرحال طوائف سے خالی نہیں ہے۔ مگر ذرا طوائف کا تذکرہ دیکھیے:

"کسی طرف ساقنوں کی بناوٹ ہے، رنڈیاں طرحدار چکلہ چوک میں آباد، تماش بین دلشاد، عورتیں جوان، لہنگے زربفت کے، دھوتی کے انداز میں کسے"۔ کہیں کہیں اس طرح کہیں کہیں اس طرح کے فقرے مل جاتے ہیں مگر اہمیت طوائف کی نہیں ہے بلکہ عالم یہ ہے کہ اگر ملکہ نسرین عنبریں مو محفل میں آگئی تو اجلال جادو اسے بے غیرت کہتا ہے۔

تخلیق کار کا قلم کیمرہ ہوتا ہے — اس فقرہ کی تکرار صرف اس لیے ہے کہ اگر شرر کے بیان، فریب عشق اور امراؤ جان ادا کی تصویر کشی کی بنا پر لکھنؤ کی پہچان اور اس کا تشخص کچھ یرقان زدہ اذہان نے طوائفیت سے کیا تو انیسویں صدی کی اس داستان کے واضح بیان سے لکھنؤ کا تشخص اور اس کی پہچان بہادر، باعفت اور ہشت پہل شخصیت کی مالک خواتین سے ہونا چاہیے۔

طلسم میں علم کی قدر ہے۔ "تم نے زہرخت کو ہماری صاحبزادی کی دیکھا۔ بے شک پڑھنے لکھنے سے آنکھیں چار ہو جاتی ہیں"۔ ملکہ ہوشنگ نے کہا۔

یہ ایک پہلو ہے۔ اب ایک رُخ ملاحظہ ہو۔ طلسم میں شہزادیاں ہوں یا جادوگرنیاں، یہ سب خلا میں نہیں رہتیں۔ ان سب کے ایک دوسرے سے رشتے ہیں اور وہ ان رشتوں کے مطابق رہتی ہیں۔ مثلاً بہار افراسیاب کی سالی ہے۔ برّان کوکب کی بیٹی ہے۔ مہ رخ مہ جبیں کی نانی ہے، آفات چہاردست اور ماہیان زمرد پوش افراسیاب کی نانی اور دادی ہے۔ لعل سخن داں یاقوت سخنداں کی حقیقی بہن ہے۔ ان رشتوں میں کبھی تصادم ہوتا ہے۔ مثلاً لعل سخن داں اسد کی طرف دار ہے یاقوت سے لڑتی ہے۔ اسد کے بازو پر اگر باندھتی ہے۔ بہار بھی اپنی بہن حیرت سے لڑتی ہے مگر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب حیرت کو شہنشاہ کوکب تلوار کے سائے میں لیتا ہے تو بہار بے چین بھی ہو جاتی ہے۔

ہندستانی سماج میں جتنے امکانی رشتے ہو سکتے ہیں اور ان رشتوں کی جو نزاکتیں ہیں وہ سب اس معاشرے میں ملتی ہیں البتہ یہ حقیقت ہے کہ مہابھارت کی طرح اصول پر رشتے قربان کر دیے جاتے ہیں۔

محبت اور فرض کی کشمکش میں بھی فرض کی فتح ہوتی ہے۔ پانچوں عیار بچیاں مخالف کے لشکر کے عیاروں سے عشق کرتی ہیں لیکن افراسیاب کی حیات تک ان کی وفاداریاں افراسیاب کے ساتھ ہیں اور موقع پڑنے پر وہ مخالف لشکر کے بڑے سرداروں کو قید بھی کرتی ہیں اور فرض اور وفاداری کا جو تقاضا ہے اس کے مقابل اپنے عاشقوں کو بھی ڈاج دینے سے نہیں چوکتیں۔

طلسم ہوش ربا کے سلسلے میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ تمام اہم شہزادیوں کے جادو دراصل عورت کے مزاج کی مختلف کیفیتیں ہیں۔ بہار بیگم رنگ و بو، مخمور زشتہ دستی، برق خنداں و گریاں رونے اور ہنسنے کی کیفیت، برّان کا اختر مردار یہ فضا کی بیکراں وسعتوں تک عورت کی پہونچ، حیرت کے بال حسین جال مجلس کی گڑیاں، عورت کا بھولا پن اور کھیل کی کیفیت وغیرہ۔ لیکن یہ پہلو ضمناً عرض کیا گیا۔ موضوع نسوانی معاشرہ ہے۔ یہ معاشرہ صحت مند ہے اس میں بدچلنی نہیں ہے، بدکرداری نہیں ہے۔ آزاد خیالی ہے، لطافت ہے، شوخی ہے، بذلہ سنجی ہے۔ عورت بہادر ہے منتظم ہے۔ اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے۔

— ایک داستان کی مثالی عورت دیکھیے:

"یہ اپنے باپ کی جانشین ہے۔ اس کی نسبت تلاش کی جا رہی ہے، ایسے سے جو رنگ سنگ ڈھنگ رکھتا ہو، رنگ علم و ہنر کا، سنگ شریفوں کا، ڈھنگ غیرت کا۔ اگرچہ یہ لائق و فائق عورت ہے مگر جے پال شاہ عورت کی اطاعت کو دل گوارا نہیں کرتا۔ ہاں ایک صورت ہے نکاح کر لے"۔

اور نکاح شریف زادیاں کرتی ہیں، طوائفیں نہیں — اس لیے انیسویں صدی کے لکھنؤ کی عورت کا تشخص اور پہچان فریب عشق، بہار عشق، ساقی (ص ۳۰۴)

حسن واصف عثمانی

لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان: چند پہلو

بازیافت نہ سہی، بازخوانی فرض

کھانا کھلانا اور پکانا روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد صرف شکم سیری نہیں ہے نہ پیٹ بھرنے اور بھرنے کا ڈھنگ ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی عمل ہے اور کام و دہن کی تربیت سے وابستہ اور حواس خمسہ کی تہذیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر ایک ثقافت زندگی کے ہر پہلو اور زندگی کی ہر سطح پر جمالیات کا اپنا منفرد شعور پیدا کرتی ہے۔ کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش مزہ ہوتا ہے تو وہ شکم سیری ہی نہیں کرتا بلکہ لذت اور ذائقہ کے اس معیار پر کھرا اترتا ہے جو کسی نہ کسی مخصوص ثقافت نے صدیوں کی روایتوں کے سلسلے سے بنائے ہوتے ہیں۔ اس کی افادیت شکم سیری کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ کھانے کھلانے کے سارے عمل کو انہیں خصوصیات اور نفاست و لطافت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس صدی میں مغربی دنیا کے ایک عظیم دانشور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اسی لیے یہ بصیرت انگیز بات کہی ہے کہ جب کسی تہذیب پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان اُلٹتا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب کے زوال میں کوئی شک نہیں۔ یہ المیہ بھی ایک کڑوی سچائی کی طرح سب کو تسلیم ہے۔ پھر کیا تعجب کہ لکھنؤ کا دسترخوان بھی اُلٹ گیا ہے۔ یہ دسترخوان صرف شاہی دربار، امیروں کے محلوں اور رئیسوں کے درباروں اور ڈیوڑھیوں تک محدود نہیں تھا۔ شاہی دسترخوان بھی تھے اور رئیسوں کے دسترخوان بھی تھے مگر گلی کوچوں، بازاروں اور عام گھروں میں بھی لکھنؤ کا دسترخوان اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود تھا۔ یہ ایک مشترکہ سماجی عمل تھا۔ بازار میں شیرمال، کباب، قورمہ، پلاؤ اور فیرنی کا رواج تھا۔ طباخی کے فن کاروں کا ایک طبقہ تھا جس نے نمکین اور میٹھے کھانوں کی تیاری اور فراہمی میں اپنی فن کاری کے کمال دکھائے تھے وہ دربار، بازار اور گھروں کی ضرورتوں کو یکساں مہارت سے پورا کرتے تھے۔ ان فن کاروں کا احترام سماجی اور تہذیبی زندگی میں شامل تھا۔ لکھنؤ میں ان کی شہرت اور ان کے نام اہمیت سے لینے اور یاد رکھنے کی روایت کا پتہ رجب علی بیگ سرور اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ اور اس کی جانب بے ساختہ اشارے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی کیے۔ شعری اور نثری کتابوں میں اس کا براہ راست کم لیکن بالواسطہ حوالہ اور تذکرہ بہت ملتا ہے۔ شاید لکھنؤ کے دسترخوان کی پوری بازیافت بہت دشوار ہے لیکن اس کی تاریخ، اس کی نفاست اور لطافت کے معیاروں کی تاریخ کی بازیافت بے شمار منتشر تحریروں کے جائزے سے ضرور ممکن ہے اس سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی لکھنؤ والوں کے اجتماعی حافظ میں اپنے دسترخوان کی انفرادیت اور امتیاز کا شعور باقی ہے، بہت سے نام زندہ ہیں اور باورچیوں اور طباخوں کی گزشتہ فن کاری کے وارث بھی موجود ہیں جو بہت بھول جانے کے باوجود بہت کچھ نہیں بھول سکے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی، تہذیب کے زوال اور ناقدری نے ان کو اپنے بزرگوں کی فن کاری سے دور کر دیا ہے۔

لیکن نفاست و لطافت کا شعور و احساس لکھنؤ کے ماہر باورچیوں اور طباخوں کی سب سے خصوصیت اور انفرادیت ہے۔ پکانے کے ڈھنگ،

مسالوں کے انتخاب اور ان کے استعمال میں ایک خاص تناسب کا لحاظ آج بھی لکھنؤ کے دسترخوانوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ نفاست و لطافت کے معیاروں کی بازیافت کی ضرورت بالکل نہیں کیوں کہ یہ تو اب بھی سلامت ہیں۔

خود ہماری نسل نے اس بزرگ نسل کی بیگموں، خواتین اور گھر والیوں کو دُنیا سے رُخصت ہوتے دیکھا ہے جو اپنے ہاتھ سے ہانڈی پکانے کو فرض سمجھتی تھیں۔ کھانوں کو مزے دار اور لذیذ بنانے کے گُر جانتی تھیں۔ ان کا ذوق نفاست و لطافت کو روز مرہ کے کھانوں میں بھی برقرار رکھتا تھا۔ ہماری نانیوں، دادیوں اور ناؤں تک اپنی ثقافت کی روایت سلامت رہی۔ کسی کے پکائے ہوئے کھانے میں لذت، ذائقہ اور لطافت نہ ہو تو یہ بڑی بوڑھیاں کس حقارت سے کہتی تھیں کہ کیا چھچھوندر ماری تھی کہ ہاتھ میں ذائقہ ہی نہیں۔

لکھنوی دسترخوان کے ایک سرسری جائزے سے نفاست و لطافت کی دو بنیادی خصوصیات، بنیادی اصول اور بنیادی رجحان نظر آتی ہیں۔ عرب و عجم سے لے کر ہندستان تک تنور کی گرم بازاری صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ تنوری روٹی، نان خمیر اور نان فطیر کا رواج صدیوں سے چلا آتا ہے۔ لکھنؤ کے دسترخوان نے اس میدان میں ایک طرف باریک ہلکی اور آسانی سے ہضم ہونے والی چپاتی کا اضافہ کیا تو دوسری طرف میدے، گھی اور دودھ کی آمیزش سے شیرمال ایجاد کی جس کی لذت بے مثال تھی۔ تافتان بھی لکھنوی ایجاد ہے مگر اس میں شیرمال کی طرح خستگی نہیں ہوتی۔ شیرمال قورمہ اور کباب کی لذت کو دو بالا کرتی ہے۔ لکھنؤ نے تافتان سے زیادہ فن کاری پُوری اور پراٹھے کی تیاری میں دکھائی۔ پُوری کا آٹا گوندھتے وقت اس میں گھی دے کر اس کو خستہ بنا دیا۔ پراٹھے گرم رہنے تک نرم رہتے تھے پھر ان میں سختی آجاتی تھی۔ لکھنؤ کے باکمالوں نے ورقی پراٹھے ایجاد کیے اور ان کے آٹے میں زیادہ سے زیادہ گھی کھپانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

کلچہ ایران اور افغانستان سے آیا تھا اور ہندستان میں ہر جگہ پھیل گیا تھا لیکن ہر جگہ اس میں مقامی اثر غالب ہوا۔ لکھنؤ والوں نے بھی کلچہ میں تصرف کیا اور اس کی تکونی شکل متعین کی اور اس کے اندر پرت پیدا کیے اور اس طرح اس کو نہاری سے وابستہ کیا۔ آج بھی لکھنؤ کا کلچہ سارے ہندستان میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے اس کی لذت اور نفاست دونوں بے مثال ہیں۔ نہاری بھی اپنے مخصوص مسالوں اور ان کے امتزاج سے جداگانہ لذت رکھتی ہے جو اور کہیں نہاری میں نہیں ملتی۔ بلا شبہ الٰہ آباد کی مشہور نہاری بے حد لذیذ ہوتی ہے لیکن اس کی لذت کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ پائے اور اس کی ہڈیوں کے روغن سے تیار ہوتی ہے۔ لکھنؤ والے پائے کی نہاری بہت کم پسند کرتے ہیں لکھنؤ کی نہاری اپنے خاص مسالوں اور گوشت کی بوٹیوں سے تیار ہوتی ہے۔ دہلی کی طرح اس میں بے تحاشا سُرخ مرچ نہیں ہوتی جو اپنی تیزی سے اصل ذائقے ہی کو غارت کردے۔

لکھنؤ کے ماہر باورچیوں کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا رہا ہے کہ:

"اصل کھانا تو بس قورمہ چپاتی ہے باقی سب امیروں کے نخرے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے دسترخوان نے قورمہ اور چپاتی کی نفاست اور لطافت کو آسمان تک پہونچا دیا تھا۔ چپاتی کا باریک، نرم اور سُرخ چتی دار ہونا لازمی شرط تھا۔ ماہر باورچی پاؤ بھر آٹے کی سولہ چپاتیاں توے سے آتار لیتے تھے جو ٹھنڈی ہونے پر بھی نرم رہتی تھیں ان کا جوڑ قورمہ تھا جو عمدہ قسم کے گوشت سے تیار کیا جاتا تھا۔ قورمہ میں تیاری کے بعد بھی شوربہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مخصوص مسالے، گوشت کا جوہر اور گھی کے تار کی وجہ سے قورمہ بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ قورمہ کا تار اور مسالہ لعاب دار، خوش رنگ اور خوشبودار رکھا جاتا تھا۔ لعاب پیدا کرنے میں دھیمی آنچ میں پکنے کو بھی دخل تھا اور بالائی، بادام اور گھی کے تار کو بھی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایک کردار نے لکھنوی ذوق کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑے مزے سے کہا ہے کہ:

"یہاں تو جب تک قورمہ میں شیرۂ بادام نہ ہو وہ حلق سے نہیں اترتا۔"

لکھنوی دسترخوان پر شوربہ دار سالن بھی نظر آتے ہیں جن کا ذائقہ

الگ شان رکھتا تھا۔ قورمے میں ہلدی نہیں پڑتی تھی۔ سالنوں کے مسالے میں ہلدی شامل تھی۔ درباروں سے زیادہ عام گھروں میں سالن کا چلن تھا۔ پھر بھی ترکاری دار سالن سب پسند نہیں کیے جاتے تھے۔ تلی اروی اور تلے آلو کے سالن خاصے کی چیز سمجھے جاتے تھے ان کے پکانے میں اہتمام اور مہارت سے کام لیا جاتا تھا۔

قیمہ، کوفتہ اور کباب خاص و عام کے دسترخوان کی زینت ہوتے تھے۔ قیمہ سادہ، دو پیازہ، سیم کے بیج، ٹماٹر اور آلو کے ساتھ پکتا تھا اور چنے کی دال کے ساتھ بھی۔ مگر اہمیت دو پیازہ قیمہ کو حاصل تھی۔ پراٹھے، شیرمال اور چپاتی تینوں ہی دو پیازہ قیمہ کے جوڑ تھے۔ کوفتے کا خستہ اور نرم ہونا ضروری تھا اور یہ لعاب دار شوربے میں گھی کے تار کے ساتھ دسترخوان پر پیش ہوتا تھا۔ اس کے مسالوں میں گرم مسالہ شامل تھا۔

لکھنؤ میں شامی کباب، سیخ کے کباب، گلاوٹ کے کباب گھروں کی طرح بازار میں بھی عام طور پر تیار ہوتے تھے۔ لکھنوی کبابوں میں بہت باریک پسے ہوئے قیمے اور کباب کے خاص مسالوں کے استعمال کی وجہ سے لذت اور ذائقہ کا ایک نیا اور بلند معیار قائم ہوا اور لکھنؤ کے کبابچیوں کے نام، ان کی شہرت اور ان کے کمال کا اعتراف سارے ہندستان میں کیا جانے لگا۔ تاریخ کے صفحوں پر ان باکمالوں کے نام درج ہوئے جن کے حالات معلوم نہیں مگر ان کی فن کاری اور مہارت کی داستان زندہ ہے۔

بہتر سے بہتر کی تلاش نے جو ذوق پیدا کیا تھا وہ پلاؤ کو بریانی پر اور فیرنی کو کھیر پر ترجیح دینے کا سبب بنا۔ بریانی میں چاولوں پر گوشت کی تہ پر تہ لگا کر اس کو دم دیا جاتا ہے۔ اس میں رنگ اور خوشبو کے لیے زعفران کے استعمال کے باوجود لکھنوی نفاست کو بریانی چاول اور گوشت کا ملغوبہ نظر آتی تھی۔ اس لیے لکھنؤ میں پلاؤ اور اس کی بے شمار اقسام لکھنؤ کے ذوق کی علامت بن کر سامنے آئیں۔ پلاؤ بھی عرب و عجم سے آیا تھا مگر لکھنؤ نے پلاؤ کی لطافت کو پروان چڑھایا اور پلاؤ کو بریانی سے بالکل الگ کرنے کے لیے سادی یخنی پلاؤ پر کی، جس میں چاول میں گوشت کا جوہر اور ذائقہ حل ہو جاتا ہے۔ پلاؤ کی اس خاص لذت کو بڑھانے کے لیے دو گوشتہ اور سہ گوشتہ پلاؤ کا رواج ہوا۔ کم از کم مقدار کے چاول میں گوشت کی زیادہ سے زیادہ مقدار کے جوہر، ذائقہ اور مزے کو شامل کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ عملی طور پر پلاؤ یخنی میں تیار ہو۔ پلاؤ کی حقیقی لذت لکھنؤ والے ہی جانتے تھے اور اسی لیے وہ بے یخنی کے تیار ہونے والے پلاؤ کو جو بریانی کے قریب ہوتا ہے، بڑی حقارت سے دھو بیا پلاؤ کہتے تھے۔

لطافت کی تلاش میں لکھنؤ والوں نے ملائی کو بالائی کا نام دیکر بالائی کو دسترخوان کی زینت بنایا اور کھیر میں دودھ، چاول اور شکر کی آمیزش اور پکانے کے طریقے کو مزید ترقی دے کر فیرنی رائج کی۔ فیرنی میں دودھ کی زیادہ مقدار میں پسے ہوئے چاول کم مقدار میں ڈال کر یوں پکائے جاتے ہیں کہ وہ باہم ایک ہو جائیں اور ٹھنڈا ہونے پر جم سکیں۔ فیرنی مٹی کے پیالوں میں سوندھے پن اور لطافت کی وجہ سے لکھنوی ذوق کی پوری طرح تسکین کرتی تھی، اور گلی کوچوں اور بازاروں میں بالائی کی طرح عام طور پر ملتی تھی۔ یہ رواج اب بھی ہے اور بالائی اور فیرنی کی قدر دانی میں لکھنؤ والے سب سے آگے ہیں۔

نفاست اور لطافت کے ترقی یافتہ شعور نے لکھنؤ میں مٹھائیوں مربّوں اور حلووں کی تیاری پر پورا اثر ڈالا۔ یہاں برفی، قلاقند، گلاب جامن، امرتی، جلیبی، لکھتی اور لڈّو جیسی عام مٹھائیوں کی لذت، رنگت اور ذائقہ کا معیار کاریگر حلوائیوں نے ایسا بلند کیا کہ سارے اودھ بلکہ شمالی ہند سے دکن تک ان کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ ان ماہروں کی بڑی تعداد لکھنؤ سے نکل کر ملک میں پھیلی اور لکھنؤ کا نام روشن کیا۔ ان مٹھائیوں کی طرح مربّہ سازی بھی لکھنؤ میں اہمیت رکھتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ شباب میں باورچیوں، طباخوں، مربّہ سازوں کے گھرانے، محلے اور علاقے شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنے خاندانی فن کی ترقی پر پوری توجہ دیتے تھے اور جدتوں سے کام لے کر عوام و خواص سب کو متاثر کرتے تھے۔

مربّہ سازی کے میدان میں سیب، بہی، آنولا جیسے

مُربّوں کو دل و دماغ کی فرحت اور ہاضمہ کی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ حکیموں کے نسخوں میں سیب کے مُربّے کو ہمراہ ورق نقرہ یا ہمراہ ورق طلا استعمال کرنے کی ہدایت عام طور پر کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے لذیذ حلوے بھی طبّی نقطۂ نظر سے تیار ہوتے تھے ان کو طاقت و توانائی عطا کرنے والی غذا کا درجہ حاصل تھا اس لیے ان میں بادام، پستہ اور دیگر خشک میوے، زعفران اور کبھی کبھی مشک بھی شامل کی جاتی تھی، یا بعض یونانی دواؤں کو حلوے کے اجزا میں شامل کیا جاتا تھا۔

غذائیت کے صحت اور جسم کی طاقت اور توانائی کے تعلق کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ہر موسم میں پیدا ہونے والی سبزی ترکاری بھی بڑے اہتمام سے استعمال کی جاتی تھی۔ اس میں سستی اور آسانی سے دستیاب ہونے والی ترکاریوں سے پرہیز بالکل نہیں تھا بلکہ بطور خاص ان کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے پکانے میں لکھنؤ کے ماہر باورچیوں نے اپنے فن کی پوری مہارت سے کام لیا۔ ہر ایک ترکاری کو کئی کئی ڈھنگ سے پکانے کے طریقے کر کے سبزی خوری میں نئی لذّت پیدا کر دی۔

حامد علی خاں بیرسٹر نے اس صدی کی پہلی دہائی میں اپنے ایک ماہر باورچی کا تذکرہ کیا ہے جو صرف بھنڈی کی ترکاری کو آٹھ الگ الگ طریقوں سے پکاتا تھا اور ہر ہانڈی کا ذائقہ الگ ہوتا تھا۔

لکھنوی دسترخوان کی سرسری جھلک اس کے متنوع، رنگارنگی اور فن کارانہ وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ بلا مبالغہ سیکڑوں اقسام کے نمکین اور میٹھے کھانوں سے آراستہ تھا۔ مشرقی تمدن اور تہذیب کی صدیوں سے چلی آنے والی روایتوں نے اس کو ہمہ گیر بنا دیا تھا۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش رُبا اور دوسری داستانوں میں کھانوں کے سیکڑوں نام ملتے ہیں، ہر کھانے کی بے شمار اقسام کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ لکھنوی دسترخوان، اس کے کھانوں، اور ان کی تیاری کے ماہرانہ طریقوں، مسالوں اور ان کے امتزاج کے ضابطوں کی پوری بازیافت آسان یا ممکن ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو ممکن ہے اور اسی لئے اس تہذیبی سرمایے کی بابت تحریری ذخیرے کی بازخوانی لکھنؤ والوں پر فرض ہے۔

□□



طلسم ہوش رُبا میں نسوانی معاشرہ

صفحہ ۳۰۵ کا بقیہ

اور امراؤ جان نہیں۔ کسی حد تک فسانۂ آزاد بھی نہیں بلکہ داستانیں ہیں یا 'طلسم ہوش رُبا' ہے جو داستانوں کے کوہ عتیق گیان چند کے لفظوں میں:

• داستانیں اودھ کی تہذیب کا ایک ارژنگ ہیں، یہ اس تہذیب کے روشن اور چمکتے ہوئے نقوش ہیں، جو آج کے دور میں بھی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ وہ تہذیب۔ جس کے پس منظر میں اس کے ماضی کی وراثت تھی، حال کی لطافت تھی اور مستقبل کی طرف خوش گوار، صحت مند اور روشن اشارے تھے۔

اب اس کے بعد بھی ساری داستان میں کسی کو یاد رہ جائے کہ اودھ، لکھنؤ کی پہچان عیاشی تھی تو پھر کہنا پڑے گا۔

نہتاب میں دھبّے ہیں گلوں میں کانٹے
بدبیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے

استفادہ: طلسم ہوش رُبا۔ ایک مطالعہ از ڈاکٹر راہی معصوم رضا

وقار ناصری

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل

حکومت اودھ کے عروج و زوال کی تاریخ جیسی بھی رہی ہو لیکن اس حکومت نے جس تہذیب کو پروان چڑھایا اس کی مثال ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ تہذیب یہاں اس طرح پھولی پھلی کہ دور دور تک اس کے حسن و دلکشی نے دلوں کو مسخر کیا۔ زندگی گزارنے کا یہ فن ہر پہلو سے اتنا روشن تھا کہ لوگ آج تک اسے فراموش نہیں کرسکے۔ لکھنؤ اس تہذیب کا وہ مرکز تھا جس نے اپنی نفاست اور وضع داری سے زبان، رہن سہن، لباس، بول چال حتیٰ کہ تفریحی مشاغل کو بھی ایک ایسے معیاری رنگ میں ڈھال دیا جس کے نقوش یادگار بن گئے۔

یہ تفریحی مشاغل عوام سے خواص تک کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ ان کے بغیر لکھنؤ کی شناخت ممکن نہیں۔ ہر چند کہ ان مشاغل میں کافی دولت صرف ہوتی رہی ہے لیکن اس کے پس پشت ایک مثبت مقصد بھی رہا ہے۔ اگر یہ مشاغل نہ ہوتے تو وہ لوگ ہاتھوں پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے جن کو اس وسیلے سے روزگار فراہم ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ تفریحی مشاغل ذہن و دل اور جسمانی سکون کا سبب بھی تھے اس لیے لوگوں کو جو فرحت ان مشاغل سے میسر تھی وہ کسی اور طریقے سے نہیں حاصل ہوسکتی تھی۔ ان تفریحات کو معیار کمال بنانا بھی ایک مقصد تھا جو اسی صورت میں ممکن تھا کہ لوگ اس میں طرح طرح کی اختراع اور ایجاد کرکے اس منزل پر پہنچادیں جو لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ کو دوسروں کے بمقابل ممتاز کرسکے۔

لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے لیے یہ تفریحی مشاغل برائے تفریح نہ تھے بلکہ یہ اس تہذیب کا ایک حصہ تھے جس کی رنگارنگی میں بھی ایک سلیقہ تھا۔ اور یہ وہ سلیقہ تھا جس نے ان تفریحات کو وہ معیار دیا جو سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہیں مل سکتا

داستان گوئی

لکھنؤ میں داستان گوئی کا عام رواج تھا۔ عورتیں اور مرد بالخصوص امرا اور بیگمات کو داستانیں سننے کا بہت شوق تھا۔ مسز میر علی حسن کا بیان ہے کہ "اونچے مردوں کی اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ بستر استراحت پر دراز ہوجاتے ہیں تو انھیں نیند کے لیے قصے سنائے جاتے ہیں۔"

عموماً یہ داستانیں بہادرانہ قصوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ عشقیہ داستانوں کا بھی رواج تھا۔ فسانۂ عجائب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے: "حسب اتفاق ایک روز مع چند دوستِ صادق و محبان صفا کیش و موافق بیٹھا تھا مگر نیرنگیٔ زمانۂ ناہنجار و کجروی فلک سفلہ پرور دوں نواز جفاشعار سے سب بادل حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرت حرمان و افکار سے کہ ہر دم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے انھوں نے کہا...... اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی ہو۔"

لکھنؤ میں داستان گوئی کے بارے میں رتن ناتھ سرشار رقم طراز ہیں: "لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یاران صادق اور داستان موافق شب کے وقت کہ پردہ دارِ عاشقاں ہیں ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر ہاتھ تیز کر رہا ہے جا بجا پیالیوں میں افیون گھل

رہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنّے چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب پہ لمن داؤدی فرما رہے ہیں" اور خوں خوار طلاقی ..... ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرش بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے"۔

سید احسان حسن بن میر حسن نے داستان گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ لکھنؤ کے دو باکمال داستان گو میر احمد علی اور میر قاسم علی تھے۔ حکیم سید اصغر علی خاں بھی مشہور داستان گو رہے ہیں جو بعد میں دربار رامپور سے متوسل ہو گئے۔ ان کے بیٹے سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی بھی کمال کے داستان گو تھے۔ منشی انبا پرشاد رسا شاگرد میر احمد علی، حیدر مرزا تصور شاگرد حکیم سید اصغر علی نے داستانوں سے بڑی شہرت حاصل کی۔

مولانا سید آغا مہدی نے "تاریخ اودھ" میں لکھا ہے: مرزا علی نقی خاں داستان گو بنجاری ٹولہ میں رہتے تھے اور شہر کے آخری داستان گو تھے۔ ان کے بعد زبانی قصہ کہنے والا کوئی نہ رہا"۔

اگر یہ داستان گو نہ ہوتے تو اردو ادب کو فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا جیسی داستانیں نصیب نہ ہوتیں۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہفت پیکر کا وجود نہ ہوتا اور نہ ہی گل و صنوبر کی کہانی پڑھنے یا سننے کو ملتی۔

ہاں کس طرح وہ قصہ صنوبر بہ گل چہ کرد
اے قصہ خواں ادھوری نہ یہ داستاں چھوڑ (انشا)

شطرنج

لکھنؤ میں شطرنج کھیلنے کا بھی عام رواج تھا۔ اس فن کے ایک ایک، باکمال لکھنؤ میں موجود تھے۔ تاریخ اودھ میں مولانا سید آغا مہدی نے لکھا ہے: "پرنس دارا قدر تیموری شہزادہ سکندر کے چھوٹے بھائی تھے شطرنج میں اس قدر مہارت تھی کہ یوروپین انگریز ان کے کمال کے معترف ہوئے اور شکست کھائی۔ یہ عہد واجدی کے پیدا شدہ صاحب فن تھے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں شطرنج کے کھیل کا مفصل ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے پوری ایک غزل شطرنج کی ردیف میں لکھی ہے۔

چوپڑ

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں چوپڑ کو بھی کافی اہمیت تھی۔ عوام اس سے اچھی طرح آشنا تھے۔ انشاؔ اور دیگر شعراء کے کلام میں چوپڑ کھیلنے کے بارے میں کثرت سے اشعار موجود ہیں۔

یوں لگی کونے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری
ستی ہو جائے دستی مرتا راجہ نل جائے (انشا)

اسی طرح تاش کھیلنے اور پچیسی کھیلنے کا عام رواج تھا۔

پتنگ بازی

لکھنؤ کے عوام و خواص کے ہر طبقے میں پتنگ بازی کا شوق پایا جاتا تھا اور پتنگ بازی کو ایک فن بنا دیا تھا۔ ڈور، مانجھا اور پتنگ بنانے میں لکھنؤ والوں نے جو کمال دکھائے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ یہیں کے لوگوں نے پتنگ میں تبدیلیاں کر کے کنکوا بنایا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ پتنگ بازی کو کنکوا بازی کہنے لگے۔ شررؔ کے بقول: "کنکوے کی موجودہ صورت ابو تراب خاں کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے کنکوا انھوں نے بڑھایا"۔

آصف الدولہ گول دروازے کی چھت پر تکل اڑاتے تھے۔

عموماً کنکوے کھلی ہوئی چھتوں یا وسیع میدانوں میں اڑائے جاتے تھے۔ کنکوے باز ڈور کی چرخیاں اور کنکوے لے کر آجاتے۔ مسلسل نہ پیچ کاٹنے والے کو نوشیرواں کہتے تھے۔ اکثر لوگ شرط بد کر کنکوے بازی کرتے تھے۔ حکماء کے نزدیک کنکوا اڑانے سے نگاہ تیز ہو جاتی ہے اور اسے ایک مقام پر قیام کرنا آجاتا ہے۔ کنکوا بازی ایک طرح کی کسرت ہے جس میں جسم کے سارے اعضا حرکت میں رہتے ہیں۔ ہاتھ اور انگلی کہ جس سے ڈور کو پکڑا جاتا ہے اس کی حرکت سے دوران خون میں تیزی اور رگ و پٹھے میں توانائی آتی ہے۔

مسز میر حسن علی نے لکھا ہے: "پتنگ لڑانے کا یہ طریقہ تھا کہ لوگ مانجھا والی ڈور سے اپنے پڑوسی کے پتنگ سے اپنا پتنگ لڑاتے تھے۔ جب ہوا میں پتنگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو دونوں پتنگ باز اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ڈور اوپر آجائے۔ اوپر والی ڈور نیچے والی ڈور کو کاٹ دیتی ہے۔ پتنگ کٹنے کے موقع پر ان میں سے فاتح اور تماشہ بینوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بچے شور وغل کرتے ہوئے کٹی پتنگ کو لوٹنے کے لیے دوڑتے ہیں لیکن کسی ایک شخص کے ہاتھ وہ پتنگ نہیں آتا بلکہ اس کے پرزے پرزے ہوجاتے ہیں۔ اپنی پتنگ کی ڈور کو اوپر کرنے کے لیے بڑی جد وجہد کی جاتی ہے تاکہ وہ طرف ثانی کی پتنگ کاٹنے میں کامیابی حاصل کرسکے۔"

ممکن ہے پتنگ اس وقت اسی طرح لڑتی ہو جیسا مسز میر حسن علی نے لکھا ہے مگر اب کنکوے باز اوپر نیچے ہر رخ سے پیچ لڑاتے ہیں اور کنکوے کاٹ دیتے ہیں۔ یہ تو صرف ان کی مہارت اور ہوشیاری پر منحصر ہے کہ وہ کس رخ سے اچھا پیچ لڑا سکتے ہیں۔ کنکوے بازی کے لیے لکھنؤ میں بہت سی اصطلاحیں رائج ہیں جن کو صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اس شغل سے شغف ہے۔

آج بھی لکھنؤ میں کنکوے بازی کے لیے باقاعدہ ایک جگہ مقرر ہے جسے "کائٹ پارک" کہا جاتا ہے۔ یہاں کنکوے بازی کے ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے شہروں سے بھی لوگ کنکوا لڑانے یہاں آتے ہیں۔ کچھ برس قبل تک عیش باغ کے میدان میں کنکوا لڑایا جاتا تھا۔ وہاں انگریزوں کا بنوایا ہوا ایک قلعہ تھا جو بعد میں منہدم کرا دیا گیا۔ ظریف نے عیش باغ کے قلعہ کے میدان کی کنکوے بازی کے لیے یہ شعر لکھا ہے۔

ڈور کے گولے چرخیاں لے کر ہیں قلعہ میدان میں دن بھر

لکھنؤ کے مشہور پتنگ باز بخشو اور سالاری تھے۔ اس عہد کی پتنگ بازی کا اندازہ انشا کے اس شعر سے بخوبی ہوسکتا ہے:

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ
واں سارے ڈور پر نہیں اڑتا پتنگ سرخ

موجودہ لکھنؤ میں مشہور کنکوا لڑانے والے مرحوم سکندر نواب مرحوم، منجھو نواب، منّے نواب، صادق حسین عرف اغن، ریاست ذکی مرحوم، حنیف محمد، لالہ رام داس اور سدھ ناتھ ملہوترا عرف سدھو ہیں۔ ان لوگوں کے بہت سے شاگرد کنکوے بازی میں نام پیدا کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں پتنگ بہت خوشنما اور مختلف سائز کے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں اور کمسن لڑکوں کے لیے چھوٹی پتنگوں کا رواج ہے۔ لکھنؤ کے ڈور سونتنے والے اور پتنگ بنانے والے کاریگر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس فن کی بدولت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ احمد آباد، دہلی، جے پور وغیرہ میں لکھنؤ کے بہت سے کاریگر موجود ہیں۔

مرغ بازی

لکھنؤ میں مرغ بازی بھی مرغوب ترین کھیل رہا ہے۔ عبدالحلیم شرر "گذشتہ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں: "مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغز کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امرا، دربار درکنار اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے انھیں بھی یہی شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن.... اول درجے کے مرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں سے بازی بد کر مرغ لڑاتے تھے۔"

میر تقی میر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ میر کی پہلی ملاقات بھی نواب آصف الدولہ سے اس وقت ہوئی جب وہ ایک مقام پر مرغ بازی میں مصروف تھے۔ میر نے ایک مثنوی مرغ بازوں کے لیے لکھی ہے۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے گرم پرخاش مرغ یہاں پائے

... ...

میر ان کا نہ ہووے گو قائل مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مصحفی نے "مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی فیض آبادی" میں مرزا تقی کے مرغوں اور مرغ بازی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مرزا تقی کو اس فن کی اچھی مہارت تھی۔

انشاء اللہ خاں انشاء کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ انشا نے ایک مثنوی "مرغ نامہ" کے نام سے لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا	کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا

... ...

ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ	ہے بجا کہیے اگر انھیں سیمرغ

بٹیر بازی

گذشتہ لکھنؤ میں شرر نے بٹیر بازی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ شرر لکھتے ہیں: "بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ وہاں کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کیا کرتی تھیں۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ وارد ہوئے اور گھاگھس بٹیر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو وہ لڑاتے تھے۔ چونکہ بٹیر لڑانے کے لیے کسی میدان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے معاشرے نے اس کو بہت پسند کیا۔"

لکھنؤ والوں نے بٹیر بازی میں بھی خاصہ اہتمام کیا۔ بٹیر بنانے اور لڑانے میں طرح طرح کی جدتیں کیں۔ بٹیر کا دانہ اور غذا کے نسخہ بھی ایسے تیار کیے جو اس سے پہلے کہیں استعمال نہ ہوئے۔ بٹیر کی چونچ اور ناخن پر خاص توجہ کی اور ان کے لیے ایسی کابکیں بنائیں جن کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یادش بخیر اب سے کچھ برس پہلے تک نخاس کے چائے خانوں میں لوگ بٹیریں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بابا ہزارہ باغ اور شیش محل میں بٹیر باز جمع ہوتے تھے اور بٹیریں لڑاتے تھے۔

مصحفی نے بٹیر بازوں کے لیے لکھا ہے:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث
رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

کبوتر بازی

لکھنؤ میں کبوتر بازی کے شوق کا آغاز نوابین کے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ اچھی اچھی نسل کے کبوتر خریدے اور پالے جاتے تھے۔ بعض کبوتر کی نسلیں اڑانے کے لیے اور بعض لڑانے کے لیے ہوتی تھیں۔ عہدِ شجاع الدولہ میں یار علی نے جو بریلی کا باشندہ تھا، کبوتر بازی کو بڑا عروج دیا۔ نواب شجاع الدولہ کے کبوتر خانے میں دو ہزار کبوتر تھے۔ نواب آصف الدولہ کے کبوتروں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی۔

نواب واجد علی شاہ نے باقاعدہ ایک کوٹھی کبوتر خانے کے طور پر موتی محل کے نزدیک بنوائی تھی جس میں ایک سے ایک نادر کبوتر موجود تھا۔ چھوٹے خاں رئیس الدولہ کبوتر خانے کے داروغہ اور شیخ محمد ان کی پیش دستی میں کام کرتے تھے۔

عہد غازی الدین حیدر میں میر عباس کبوتر بازی میں استاد تھے۔ میر امان علی تخلی علی بھی کامل فن کبوتر باز تھے۔ عہدِ واجدی میں مرزا تقین مشہور کبوتر باز تھے۔ یہ زیادہ تر کبوتریاں پالا کرتے تھے۔ یہ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔

محلہ نواز گنج کے مرزا علی عباس کبوتر بازی میں کامل فن تھے۔ عموماً لڑانے کے لیے گولا نسل کے کبوتر کام میں لائے جاتے ہیں لیکن اسی لکھنؤ میں ایک کبوتر باز نواب پایہ تھے جو گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح لڑاتے تھے۔

لکھنؤ میں صرف کبوتر لڑائے ہی نہیں جاتے تھے بلکہ بعض امراض میں علاج کا ذریعہ بھی تھے۔ اطبا ان کے ذریعہ فالج کا علاج بھی کرتے تھے۔ کبوتر کے پر کی ہوا کئی بیماریوں میں کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ جراح اس کی بیٹ سے زخموں کے بھرنے میں مدد لیتے تھے۔ میدان جنگ میں پیغام رسانی کے لیے بھی کبوتر کام میں لائے جاتے تھے۔

اردو شاعری میں بھی کبوتر نے مضامین کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔

احباب کی صحبت سے دل اپنا نہ اٹھے گا
چھتری کا کبوتر ہے یہ تنہا نہ اٹھے گا

——— امان علی سحر

شریک رنج غیر اس طرح سے ہونا مناسب ہے
مری آنکھوں میں سرخی رہ گئی خون کبوتر کی

——— بندہ کاظم جاوید لکھنوی

کبوتر کی قسمیں بہت ہیں جو مختلف قد و قامت اور مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کبوتروں کی پیوندکاری کرکے بھی کبوتر بنانے کا ہنر لکھنؤ میں رائج تھا۔ گرہ باز، گولا، لقا، شیرازی، لوٹن، نسورے وغیرہ کبوتر کی مشہور قسمیں ہیں۔ گو کہ کبوتر بازی کو زوال ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی لکھنؤ میں کبوتر پالنے اور لڑانے کا رواج اس عہد کی یاد دلاتا ہے جب کبوتر بازی کے فن کو [illegible]

عروج حاصل تھا۔

دیگر پرندوں کی لڑائیاں

مرغ بازی اور بٹیر بازی کے علاوہ لکھنؤ میں تیتر بازی، لوٹوں کا لڑانا، گلدم لڑانا، لال لڑانا اور طوطے بازی کا شغل بھی تفریح کا اہم ذریعہ تھا۔ طوطوں کو بولنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ گھروں میں مینا چڑیا پالنے کا رواج تھا لوگ اسے بولنا بھی سکھاتے تھے۔ کچھ لوگ کوئل اور بلبل بھی لڑاتے تھے شکرے اور باز پالنے کا رواج تھا انھیں شکار کے لیے سدھایا جاتا تھا۔

عہد محمد علی شاہ میں میر محمد علی طوطوں کو کبوتر کی طرح اڑاتے تھے۔ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی ان کی سیٹی کی آواز پر کبوتر کی طرح اڑتی اور چھت پر اترتی تھی۔

موجودہ زمانے میں بھی تیتر بازی کا رواج اودھ کے اکثر اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

شکار

لکھنؤ میں شکار بھی تفریحی مشاغل میں تھا لیکن یہ شوق امرا اور روسا اور نوابین کا شوق تھا کیونکہ اس شوق میں دولت بہت صرف ہوتی تھی لہٰذا عوام کو اس شوق سے وہ نسبت نہ تھی جو دوسرے مشاغل سے تھی۔

نواب شجاع الدولہ کو شکار کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے باقاعدہ جنگل میں ہرن، بارہ سنگھے، چیتے اور چیتل وغیرہ چھوڑے گئے تھے جن کا نواب شکار کرتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کو شکار سے بہت شغف تھا۔ سال میں دو بار وہ ضرور شکار کھیلنے کے لیے جاتے۔ دو مرتبہ میر تقی میر بھی نواب کے ہمراہ گئے اور مفصل شکار نامے لکھے۔ نواب سعادت علی خاں شکار کا ذوق رکھتے تھے۔ انشا نے نواب کے لیے شکار نامے لکھے ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور رئیس آغا ابو صاحب مانے ہوئے شکاری تھے۔ یہ ہمیشہ گورنر یا وائسرائے کے ساتھ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ ان کا نشانہ لاجواب تھا۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی

تفریحی مشاغل میں یہ شوق عام طور پر خواص میں پایا جاتا تھا۔ عبد الحلیم شرر گذشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں، "جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ میں لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کر جانبازی و خوں ریزی کا تماشہ دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت ہر جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ اور سنگ دلی کی دلچسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجہ کمال کو پہنچا دیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا تھا۔"

لکھنؤ میں اس تماشے کے لیے شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، بارہ سنگھے، مینڈھے اور سانڈ لڑائے جاتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کو جنگ فیلان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ نواب آصف الدولہ کے فیل خانے میں دو ہزار ہاتھی تھے۔ وہ دو تین دن کے بعد ہمیشہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتے تھے۔

دریا اس پار جہاں آج کل ندوۃ العلماء اور آرٹ کالج کی عمارتیں ہیں وہاں جانوروں کے لیے باقاعدہ رمنہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ نصیر الدین حیدر کے وقت اس مقام پر ہاتھی، گینڈے اور بارہ سنگھے لڑائے جاتے تھے۔

اسی رمنہ میں واجد علی شاہ فوج کی قواعد اور فنون جنگ کی مشاقی دیکھتے تھے اور باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے تھے۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں آصف الدولہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے بھیلوں کے بن میں شیر مارا سودا کو خبر ہوئی تو برجستہ یہ شعر کہا ؎

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

فنون حرب

سپہ گری کے فنون کے علاوہ لکھنؤ میں کشتی، لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ، برچھا، بانا، تیراندازی، کٹار بازی اور جل بانک کا عام رواج تھا جن کے باکمال استاد اپنے اپنے شاگردوں کو یہ فنون سکھاتے تھے۔

کشتی گیری

کشتی اور پہلوانی کے لیے لکھنؤ میں بہت سے اکھاڑے تھے۔ یہاں

کشتی میں داؤ پیچ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور پہلوانوں اور شہزوروں میں احمد حسین شہ زور، میر لٹو، میر تقی خاں، استاد سکندر، نواب پٹھان دریابادی، شیدی فولاد، شیدی فضل علی، شیدی عنبر، شیدی غلام علی، نواب صادق علی خاں عرف شہنشہ دولہ اور غالب علی نمایاں تھے۔ چھوٹے سید اور بڑے سید بھی نامی پہلوانوں میں تھے۔ ان کا اکھاڑا بہت مشہور تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ بڑے سید کے انتقال کے کچھ برس بعد چھوٹے سید بھی ۱۹۳۳ء میں فوت ہوئے۔ اخبارات نے نوٹ لکھے۔

کہیں اکھاڑے میں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر
کہ ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

مصحفی کہتے ہیں ؎

فنِ کشتی میں قیامت ہے وہ بت کا در کا
دھوم دیتا ہے مچا آوے ہے جب دھوبی پاٹ

بانک

یہ فن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس فن کی ابتدا اس مقصد سے ہوئی کہ چھڑیوں کی مدد سے حریف کا مقابلہ کیا جائے اور وہ پسپا ہو جائے اودھ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ زیادہ تر شرفا اس فن کے قدرداں تھے اور وہی اس فن کو شوق سے سیکھتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں منصور علی خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں شیخ نجم الدین کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ آغا مرزا بانک کے فن کے باکمال استاد تھے۔ عبدالحلیم شرر نے بانک جاننے والوں میں پرنس مرزا ہمایوں قدر کا بھی ذکر کیا ہے۔

بنوٹ

اس فن کے جاننے والے اپنے ہاتھ سے یا ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوتا تھا اپنے حریف کو چاہے وہ کوئی حربہ لیے ہو ایسے کارگر طریقے سے زک پہنچاتے تھے کہ اس کا کام تمام ہو جاتا تھا۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے باکمال استاد تھے۔ محمد ابراہیم خاں رامپوری اور طالب شیر خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب معشوق محل کے داروغہ محمد مہدی اس فن کے باکمال استاد تھے۔ اس فن کے ماہرین کا ادنیٰ کرشمہ کمال یہ ہے کہ جنگلی کبوتر چوکی کے نیچے چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ باہر نہیں آپاتا تھا۔

آخری دور کے ایک استاد حسین بخش تھے جن کو اس فن میں بہت مہارت تھی۔ لکھنؤ میں استاد ابو صاحب اس فن کے آخری جاننے والے تھے۔

کٹار

اپنی جان کی حفاظت کے لیے عام طور پر لکھنؤ کے لوگ کٹار اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کٹار چلانا بھی باقاعدہ ایک فن ہے۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے ماہرین تھے۔

اس زمانے میں یہ سپاہی نہیں بیکاری ہے
نہ تو تلوار بھی ہے نہ کٹاری تیار (آتش)

جل بانک

یہ شناوری کا فن تھا۔ اس فن کا مقصد گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کرنا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں میر کرجان اس فن کے استاد تھے۔ لکھنؤ کے محلہ شریف منزل کے خلیفہ رضا حسین جل بانک کے ماہرین میں سے تھے۔ کیونکہ جل بانک کا تعلق پیراکی سے ہے لہٰذا اس فن کے ماہرین باکمال پیراک بھی ہوتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے استاد میر مچھلی باکمال پیراک تھے۔ عہد واجدی میں بدلو نائی پیراکی میں ماہر تھا۔ شیخ عابد علی پیراکی کے باکمال استاد تھے۔ خلیفہ رضا حسین کے والد میر صفدر علی پیراکی کے ماہر تھے جو شیر دہج ملاحی اور جل بانک میں لاجواب تھے سینکڑوں شاگردوں کو انھوں نے پیراکی کے فن سے آگاہ کیا تھا۔ حکیم سید محمد نواب جل بانک اور لکڑی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

شہسواری

لکھنؤ میں شہسواری بھی تفریحی مشاغل میں شامل تھی۔ عموماً روسا اور امرا اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ عمدہ عمدہ نسل کے گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے۔ سپاہیانہ زندگی کے علاوہ سفر اور شکار کے لیے بھی شہسواری ضروری ہے لہٰذا لکھنؤ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

نواب سعادت علی خاں شہسواری کی بڑی مہارت رکھتے تھے ان کے اصطبل میں ایک سے ایک عمدہ نسل کے گھوڑے موجود تھے۔

میں ممن خاں اور شیخ ببر علی شہسواری کے باکمال لوگ تھے۔ آغا ابو صاحب بھی اپنے زمانے کے مشہور شہسوار تھے۔

تلوار چلانا

کیونکہ اس دور میں تلوار کو جنگ میں اہمیت حاصل تھی اس لیے نوجوں اور شہزادوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جو لوگ مگدر چلانے کے مشاق ہوتے تھے وہ تلوار چلانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بانکے تو آج تک تلوار چلانے کے لیے مشہور رہیں جو ذرا ذرا سی بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے۔ مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا زبردست بانکے تھے' ایک تلوریے اور ان سے تلوار چلی۔ اپنے سینے پر احمد بیگ نے تلوار کے اس قدر وار روکے کہ زخموں کے نشان کی ہیکل بن گئی۔ اسی دن سے مرزا صاحب کٹیا کٹیا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بھانڈ' نقال' لطیفہ گو

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں یہ لوگ بھی شامل تھے۔ عموماً شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں میں دل بہلانے کے لیے یہ لوگ بلائے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے بھانڈوں میں تمام علی مشہور بھانڈ گذرا ہے جس کی حکایتیں آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ نخاس کے پاس کی گلی میں آج بھی بھانڈ طبقہ کے لوگ موجود ہیں۔ نقالوں کی نقل اور لطیفہ گویوں کے لطیفوں سے ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ لوگ کم ہوتے گئے' یا دوسرے پیشوں میں چلے گئے اب ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

رقص و سرود

دربار اودھ کی سرپرستی کی وجہ سے اس فن کو فروغ حاصل ہوا۔ نواب شجاع الدولہ بذات خود فن موسیقی میں دسترس رکھتا تھا۔ نواب آصف الدولہ' نواب وزیر علی خاں اور دوسرے نوابین اودھ کو رقص و سرود سے بڑی دلچسپی تھی۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں بالخصوص ہندوستانی موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں محمد رضا خاں نے اصول النغمات الآصفیہ عشرت الآرا کتاب لکھی۔ انشا نے سندیلہ کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے جو فارسی راگوں کے علاوہ ہندوستانی راگوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ لکھنؤ کے سازندوں اور گویوں کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں لکھا ہے: "کلاونت قوال بے مثال' چھجو خاں' غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال۔ حصول شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے پٹے کا موجد ہے۔ سب کو معلوم ہے بخشو اور سالاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو بھی شرمایا۔"

اس عہد کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند بخش' شجاعت خاں' محمد خاں' دیبی داس' جون خاں' صاحب خاں' ہستو خاں اور میر ضاحک مشہور و معروف موسیقی داں تھے۔ واجد علی شاہ نے اس فن کی بہت قدر دانی کی۔ رقص و سرود کی تعلیم کے لیے پری خانہ کی بنا ڈالی۔ کتھک کو فروغ دیا۔ طبلہ بجانے اور نے کاری میں واجد علی شاہ کا جواب نہ تھا دھرپد' پٹہ اور خیال ایسا گاتے تھے کہ اچھے اچھے گانے والوں کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ بنی' ناجو اور دلھن میں واجد علی شاہ نے بہت کچھ موسیقی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ کتھک کے بھاؤ' طبلہ کی گتیں اور تال کے بارے میں یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ' خواجہ حسن مودودی' علامہ تفضل حسین خاں موسیقی کے نامور ماہرین میں سے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حیدر خاں' خیال گانے میں بے مثال تھا۔ غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت میں سوز خوانی کا بھی رواج ہوا۔ میر علی نے اس میں بڑی شہرت پائی۔ عہدِ واجد میں پیار خاں' جعفر خاں' حیدر خاں' محمد علی خاں' نظام الدین احمد خاں' محمد احمد خاں' حیدر علی خاں' جھمو خاں موسیقی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ٹھمری گانے والا قدر نواب وزیر مرزا بے مثال تھے۔ ڈولے خاں دھرپد اور ہوری گانے میں استاد تھا۔ کتھک میں کالکا اور بندا دین جیسے فنکار تھے۔

مرد ماہرین کے علاوہ عورتوں کو بھی ناچ گانے میں کمال تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے عزیز طوائف اور مہتاب کے رقص و سرود کا بڑے پرلطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ میر حسن نے ایک مثنوی میں ماہ رتن' ننھی' پنا' مصری اور بہت سی طوائفوں کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قتیل نے لکھنؤ کی طوائفوں میں جگیا' امیر بخش کے علاوہ اور کئی نام لکھے ہیں۔ چونے والی حیدر اپنی آواز کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں بی بنی کو ناچ گانے میں کمال

حاصل تھا۔ لکھنؤ کی کچھ اور مشہور ناچنے گانے والیاں حیدر جان، حسین باندی، پیازو، امیر بخش تھیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جدن، ہرمزی، ننھوا، گوہر، چودھرائن اور اس کی لڑکیاں رشکِ منیر، بدر منیر بعد کی وہ گانے والیاں ہیں جن کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی۔

کچھ برس قبل تک لکھنؤ میں استاد یوسف علی خاں، خلیفہ احمد حسین، چنو خاں، بڑے آغا خاں (میوزک کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں) استاد عابد حسین، استاد مروت حسین خاں، سخاوت حسین خاں، لچھو مہاراج اور راجہ نواب علی جیسے فنکار موجود تھے۔ راجہ نواب علی کا ایک بڑا کارنامہ ان کی تصنیف "معروف النغمات" ہے جو فن موسیقی پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ تفریحی مشاغل صرف لکھنؤ کا طرۂ امتیاز نہ تھے بلکہ اودھ کے دیگر قصبات میں بھی ان کا چلن عام تھا۔ اگر ان قصبات کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہاں کے لوگ بھی لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور جو کچھ لکھنؤ میں ہوتا تھا وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ اودھ کے راجگان اور تعلقدار کا طرزِ حیات لکھنؤ کے نوابین کی تقلید کرتے کرتے بالکل لکھنوی ہو گیا تھا۔

بعض مورخین نے ان تفریحی مشاغل میں دولت کے بیجا اسراف کا شکوہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات کسی حد تک درست ہو لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت اودھ کی رعایا خوشحال تھی اور لوگوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ صرف کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ مشاغل روزگار کی ایک بڑی صورت بھی تھے کیونکہ اس وقت نہ آج کی طرح بڑی بڑی صنعتیں تھیں اور نہ ہی دوسرے وسائل۔ لہٰذا اس صورت میں تو یہ ہی ہو سکتا ہے کہ ضرورت مند افراد کو کسی نہ کسی طرح فیض پہنچایا جا سکے اور ان کو کسی حد تک ایسا روزگار کا ایک بہانہ تھے اور ہزاروں لوگ اسی بہانے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے یہ تفریحی مشاغل بھی قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ لے دے کے پتنگ بازی اور کبوتر بازی اور کچھ دوسری تفریحات بچی کھچی سانسیں لے رہی ہیں اور یہ بھی کب نظروں سے اوجھل ہو جائیں اس کا کوئی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مشینی دور اب کمپیوٹر اور الیکٹرانک کے عہد میں قدم رکھ چکا ہے۔ اب کس کو فرصت ہے جو مڑ کر یہ دیکھے کہ لکھنؤ اور اس کی تہذیب و تفریحی مشاغل کہاں گم ہو چکے ہیں۔

□□

ماخذ: آب حیات۔ محمد حسین آزاد

اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ ڈاکٹر محمد عمر

تاریخ لکھنؤ۔ مولانا سید آغا مہدی

گذشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔

❋

سنہ ۱۸۵۷ء کے قریبی عہد میں زخمی ہندوستان اور تحریکِ آزادی کی ناکامی کا مرثیہ، حالات کی گھٹن اور جبر کبھی غزلوں میں علامت کے ذریعہ ظاہر ہوا، اور کبھی شہر آشوب کے ذریعہ اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اردو شاعری کو ہندوستان کے مختلف مذہبی مکتبہ ہائے فکر کے افراد نے اپنی کاوشوں کا میدان بنایا۔ رامائن بھی لکھی گئی اور مدو جزر اسلام بھی۔ لیکن ان مذہبی نظموں کا کوئی ایک شعر بھی بطورِ مثال پیش نہیں کیا جا سکتا جس پر مذہبی منافرت یا تفریق پسندی کا لیبل لگایا جا سکے...... اردو شعراء نے اپنے دامن پر تفریق پسندی کا دھبہ نہ لگنے دیا بلکہ وطنی شعور کے پھول کھلائے اور ان عناصر کی رہنمائی کی جو متحدہ قومیت اور مشترکہ کلچر کے علمبردار تھے۔"

——— "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ص ۲۰-۳۱۹

اظہر مسعود

لکھنؤ کے پھیری والے

اودھ کے آخری تاجدار سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کی معزولی کے تقریباً چار برس بعد ۱۸۶۰ء میں غالب نے اپنے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا تھا:

"لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔"[1]

مذکورہ بالا خط میں جس لکھنؤ کی تعریف کی گئی ہے اب اس کے آثار بھی تقریباً مٹ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک لکھنؤ ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی نقشے پر نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کے بعد انحطاط کی رفتار بہت تیز ہو گئی یہاں تک کہ پانچویں دہائی کے اختتام پذیر ہوتے ہی صحبت یافتہ بزرگوں کے حافظے میں محض اس کی دھندلی سی تصویر باقی رہ گئی اور اب وہ بزرگ بھی نظر نہیں آتے۔

لکھنوی تہذیب کے عناصر ترکیبی میں شاعری اور موسیقی کا بہت اہم مقام تھا حتی کہ یہاں کے آداب معاشرت اور نشست و برخاست کے طور طریقوں میں بھی ایک طرح کی موزونیت اور لے داری کا احساس ہوتا تھا۔ یہ صفات محض مخصوصین سے وابستہ نہیں تھیں جاہل عوام تک اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محمد باقر شمس لکھتے ہیں:

"آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہیں وہ دوسری جگہ علماء نہیں کر سکتے جب کہ مات میں جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز میں کہتا ہے 'کالی گھٹا کے کالے پھلیندے' تو ہزاروں شعر نثار کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر گرمیوں میں برف کی قلفی بیچنے والے کا یہ کہنا، 'یہ کس کی محبت میں گھل رہی ہے' اپنے اندر جذب و اثر کا ایک عالم رکھتا ہے (تو) گنڈیریوں والے کی آواز، 'برفی کی ڈلیاں کون لے گا؟' بلاغت کی جان ہے؟ اور گولر بیچنے والے کی صدا، 'گولر کیا ہیں شہد کی کپیاں ہیں' بیر بیچنے والے کی آواز 'پیوندی بیر ٹکے سیر' پان بیچنے والے کا یہ مصرعہ، 'کرتی ہے سرخ رو وہ گلوری ہے پان کی' دماغ کی ادبی شاعرانہ شاخ کا پتہ دیتی ہے۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباس میں لکھنؤ کے کئی پھیری والوں کا ذکر آ گیا ہے اور یہ پھیری والے ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہیں۔

لکھنؤ کے پھیری والوں کی صدائیں کسی موزوں مصرعے، نقرے نظم یا تک بندی کی شکل میں اور مترنم ہوا کرتی تھیں۔ حمد، نعت، منقبت وغیرہ سنا کر پیسے مانگتے پھرنے والے بالعموم بہت خوش گلو ہوتے تھے شرر کا بیان ہے۔

"بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکوں اور گزرگاہوں میں گاتے پھرتے ہیں وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچے سُروں میں ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے راگنی اور لے گلے میں اتری ہوئی ہے۔ ..... لے داری یہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔"[3]

پھیری والے گھروں پر عموماً صبح کے وقت یا سہ پہر کو مغرب سے قبل لے آتے تھے۔ دوپہر یا رات میں آنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس طرح اوقات کی پابندی میں غالباً یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ صاحب خانہ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

کچھ پھیری والوں کے اوقات بھی مخصوص تھے. مثلاً دودھ، دہی، بالائی وغیرہ بیچنے والے ہمیشہ صبح کے وقت اور قلفی، چاٹ، مٹھائی، بسکٹ وغیرہ بیچنے والے سہ پہر کو آتے تھے. پھیری والوں کے ذیل میں حسب ضرورت ان کے اوقات بھی بنا دیے گئے تھے.

نفس موضوع پر آنے سے پہلے اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ ایسا نہیں ہے کہ اب پھیری والے نہیں رہے البتہ اگلے سے رکھ رکھاؤ، شائستگی، سلیقے اور نفاست کا فقدان ہے. اقتضائے حال نے سودا رکھنے کے ظروف بھی بدل دیے ہیں اور صدائیں بھی. سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی پھیری والا گھر کے دروازے پر آواز لگاتا ہے. وجہ یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں شرفا گھر کے باہر وہ بھی سرِ راہ کچھ کھانا تو در کنار گھر کے اندر بھی کھانے کے لیے مخصوص جگہ کے سوا کہیں اور کچھ نہیں کھاتے تھے. خواتین گھر میں ہی رہتیں. ایسی کوئی ضرورت درپیش ہوتی تو سات پردوں کے اندر گھر سے نکلتیں اور لوٹ کر سیدھی گھر آتیں. یہی سبب ہے کہ کنجڑنیں گدنیں، سنہارنیں، کہارنیں، رنگریزنیں، دھوبنیں وغیرہ گھر گھر جاتی تھیں اب نہ وہ تہذیب ہے نہ وہ تکلفات، نہ وہ نشست و برخاست کے انداز، نہ وہ خورد و نوش کے آداب، نہ وہ باکمال، نہ وہ قدردان کہ جن سے کمال فن کی داد حاصل کرنے بلادِ غیر سے بھی لوگ آتے تھے. اب تو زندگی مجسم بازار ہو کر رہ گئی ہے جہاں ہر طرح کا مال بکتا اور خریدا جاتا ہے.

لکھنؤ میں بعض کھانے کی چیزوں کو ان کے نام کے بجائے محض ان کی صفت بیان کر کے بیچا جاتا تھا. مثلاً ”کڑوے کرارے“ کی آواز سنئے تو سمجھ لیجئے کہ سلو نے سیو والا ہے. ”مزے لو بادام کے“ سے مراد مونگ پھلی ہے. ایک خاص لحن میں آواز سنائی دے ”آٹھ آنے سیر لیو جلیبہ“ کے معنی ہیں شکر قند بکی جا رہی ہے. ”کیا پٹرے ہیں“ کا مطلب ہے امرود. ”لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں“، یعنی پتلی پتلی کچھے دار ککڑیاں ہیں.

سید حسن نام کا ایک پھیری والا تیل کے لڈو یوں بیچتا تھا ”کل پھُس پھُسے تھے آج کرارے ہیں میاں!“

لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں پر ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے.

ایک دفعہ الٰہ آباد کے محلہ سبزی منڈی میں ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم کے یہاں میرا قیام تھا. سہ پہر کے وقت نہایت بھونڈی آواز سنائی دی ”لیلیٰ کی انگڑیاں ہیں مجنوں کی پسڑیاں ہیں“. لکھنؤ کی اس صدا کا دیہاتی کرن پہلی بار سنا تھا جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک پھیری والا موٹی موٹی ککڑی بیچ رہا ہے. میں نے سوچا کہ واقعی اگر لیلیٰ مجنوں اس تن و توش کے مالک تھے تو اردو کے ہزاروں اشعار کی صحت مشکوک قرار پائے گی.

کچھ اشیائے خورد و نوش کسی دوسری چیز سے تشبیہ دے کر بیچی جاتی تھیں. آج بھی یہ آواز برابر سنائی دیتی ہے. ”مزہ سیب کا ہے امرود ہیں“ یا بقول سرور ”مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں“.

مقامات سے بھی نسبت دے کر پھیری والے آواز لگاتے تھے جیسے الٰہ آباد کے امرود ہیں، خربوزے شہد پور کے ہیں، کانپوری کیلے ہیں انگور چمن والے ہیں، سہارنپوری پونڈے ہیں، جونپوری تربوز ہیں. سیب کہیں کا بھی ہو، کشمیر کی نسبت سے بیچا جاتا تھا. پیٹھے کی مٹھائی اور موتی چور کے لڈو آج بھی سندیلے اور آگرے کی نسبت سے فروخت ہوتے ہیں. چارباغ ریلوے اسٹیشن پر سندیلے کے لڈو، لکھنؤ کی ریوڑی اور بنارس کے چوبی کھلونے کے لیے پھیری والے ٹرین کے ساتھ آواز لگاتے پھرا کرتے تھے.

کھانے کا کچا اور پکا دونوں طرح کا سامان لے کر پھیری والے نکلتے تھے. مچھلی والے در دروازے آواز لگاتے گھومتے. ”تازہ رہو ہے پڑھن مچھلی“. والد مرحوم مسعود حسن رضوی ادیب سے ایک مچھلی والے نے بتایا کہ اس نے پورے ملک کی مچھلی کھائی ہے مگر جو مزہ گومتی کی مچھلی میں ہے اور کہیں نہیں. صبح سویرے ہی مچھلی والے بہنگی لیکر پھیری پر نکلتے تھے. آج مچھلی بازار میں رہو، تور، موہ، پڑھن مہاشیر، گرئی، بام غرض جو بھی مچھلی چاہیے مل جائے گی. کیونکہ نقل و حمل کے ذرائع اتنے ہو گئے ہیں کہ ملک کے کونے کونے سے قیصر باغ کی منڈی میں مچھلی آجاتی ہے جب یہ ذرائع مفقود یا بے انتہا محدود تھے تو مچھیرے گومتی میں رات بھر جال ڈالتے اور جو مچھلیاں ہاتھ لگتیں انہیں لے کر منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوتے.

گوشت والے جھانکڑ کی بانکل، جھلی ڈلیا میں گوشت بیچنے لگے

تھے۔ روایتی مٹھائی کے علاوہ کئی گجک، پھپڑ اور حلوہ، گزک، ریوڑیاں وغیرہ بکتے تھے۔

ککڑی والے ڈھونڈے پر آتے اور ککڑی والیاں جو نالموں کے انداز میں گاتی تھیں اب ککڑی والیوں نے گانا بند کر دیا ہے۔ ککڑی والے اب بھی جب چلتے ہیں تو سڑکوں اور گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہیں۔

خشک میوے اور چنے والے بھی گھر گھر جایا کرتے تھے۔ چنے والے، چنیں گرم، کباب سیخی کے، پلاؤ گرم، اکی کل کی صدائیں عام ہوتی تھیں۔ چاٹ والے بھی اپنا خوانچہ سر پر اٹھائے سہ پہر کے وقت آیا کرتے تھے۔ چاٹ آج بھی بکتی ہے مگر خوانچے والوں کا رواج اور گھر جانے کا دستور ختم ہو گیا ہے۔ اگلے وقتوں میں چاٹ میں ایک چیز ونگ پڑا بھی ہوتی تھی یہ آلو کے پتے میں لپٹی ہوئی چھوٹی چھوٹی گول شکل کی ٹکیاں ہوتی تھیں خدا جانے اب وہ کہاں گئیں۔ اب اس کا نام جاننے والے بھی مشکل سے ملیں گے۔

سردیوں میں گرم گرم چائے سماوار میں اور کلھڑ کی کٹوروں سے پانی کی ٹوکریوں سے کر پھیری والے لگایا کرتے تھے۔ کشمیری چائے کی تو یہ منٹیں خاص ریوان کی جاتی تھیں۔ اب سب ہی ... اب نہ رہیں۔

دودھ، دہی اور دیسی گھی والے بھی گھروں پر جاتے تھے۔ دیسی گھی عام طور پر گھروں کے اندر بنائی جاتی تھیں اگر گھی کے خالص ہونے میں شک ظاہر کیا جاتا تو فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتیں۔ "ککی قسم، بچوں کی قسم، بالکل خالص ہے"۔

دودھ دہی، بالائی اور ربڑی والے بھی گرمیوں میں برف کی قلفیاں بھی لے کر آتے تھے۔ شورہ کی برف ہوتی تھی، گرمی کے موسم کی خوب چھپے ہوئے دودھ کی ملائی کی قلفیاں بڑی ذائقہ دار اور فرحت بخش ہوتی تھیں، کھوئے کیوڑے اور فالسے کی قلفیاں بھی جاتی تھیں۔ مٹی کے کٹوروں میں قلفیاں جمائی جاتی تھیں یہ اسپیشل آرڈر کی ہوتی تھیں۔ ان میں مال بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اور انھیں صرف خاص میں تحفہ کیا جاتا تھا ... کے بیچ میں آتے تھے۔ لکھنؤ کی نقل کے بارے میں سرور کا بیان بھی

'' وہ پیسے کو برف کی اور کھلائے، بدن ٹھنڈائے، زیادہ ہو کا کرے تو سے ہاتھ ہی مرے۔'' ھ

گنے کی گنڈیریاں بھی پھیری والے کبھی ہنڈیوں میں اور کبھی جھاڑی کی پہلی ڈلیا میں رکھ کر بیچتے تھے۔ نفاست سے چھیلی ہوئی، برابر سے کٹی ہوئی اور سلیقے سے چنی ہوئی گنڈیریوں کو چاندی کے ورق اور گلاب کے پھولوں سے سجایا اور بسایا جاتا تھا۔

سالم گنا بھی بکتا تھا مگر اب پہلے جیسا خوش رنگ، موٹا، نرم اور رسیلا گنا بازار میں نہیں آتا جس کے بارے میں سرور لکھتے ہیں:

'' بنی کا پونڈا، نرم گدہ، قند و شہد کا سینچا۔ اگر پوپلا بھی مسوڑھوں سے چبائے شربت کا گھونٹ حلق سے اتر جائے۔''

سالم گنے کی بات چلی ہے تو ذرا شرر کا بیان بھی دیکھتے چلئے۔

'' ایک کنجڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی کہ "ارے لگی یہ لنکوے کون لوٹے گا؟" کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے ...... نہ پونڈے کا نام لیا نہ گنے کا جس سے لنکوے لوٹے جاتے ہیں صرف اتنا کہہ کر "لنکوے کون لوٹے گا" یہ بتا دیا کہ پونڈے لنکوں کے برابر ہیں۔'' ھ

مرزا جعفر حسین مرحوم لکھتے ہیں:

'' اس ترانے میں اتنی کشش تھی کہ مولانا کے محترم (شرر) اپنے گھر سے ...... بے تابانہ ننگے پاؤں باہر آ گئے اور کچھ قدم سڑک پر گنڈی گنے والے کے ہمراہ نکل گئے۔'' ھ

بسکٹ صاحب بسکٹ والے بڑے سے ٹین کے بکس میں بسکٹ لاتے تھے۔ ان کے بکس کے اندر ایک کشتی بھی لگی تھی جس میں پیسٹری، نان خطائی، کریم رول وغیرہ سلیقے سے چنے ہوتے اور کشتی کے نیچے بکس کے گہرے حصے میں گول بتاشے رکھتے۔ تھے تو مسلمان مگر وضع قطع ہندوؤں جیسی تھی۔ دھوتی کرتے میں ملبوس رہتے۔ چھنی چھنی آواز میں بسکٹ بسکٹ کی صدا لگاتے گھروں پر جایا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے تو غالباً بالکل نہیں تھے مگر گفتگو اچھی لگاوٹ میں بھر کر کیا کرتے تھے۔ خود زندگی بھر پھیری لگائی لیکن اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ لڑکے پڑھے لکھے ہوئے تھے



لی پر گری کا کوئی قدر داں مل جاتا تو پہلے کٹوں کا عکس رکھ کر اس کے ہاتھ دکھا دیتے۔ وہ ایک پیپر پر سے پہلے گی بنا سکتے تھے۔

پاپڑ ہندو حضرات کے کھانے کا ایک خاص جزو ہے لیکن مسلمانوں میں اس کی طرف کوئی خاص رغبت نہیں پائی جاتی ہے شاید اسی وجہ پاپڑ بیچنے والوں میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ان میں ایک طاہر صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔ نہایت سیدھے شریف اور نرم گفتار انسان تھے جل گرم کاٹ کا پائجامہ اور کرتا پہنتے۔ کبھی برہنہ سر دکھائی نہیں دیتے۔ سر پر ٹوپی ہمیشہ ہوتی۔ مونگ اور ماش کے چھوٹے چھوٹے تلے ہوئے پاپڑ اور پاپڑ کے چٹ پٹے چورے کی پڑیاں بیچتے تھے۔ پڑیاں کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے میں ہوتیں اور پاپڑ بیچنے والی بانس کی ٹوکری میں اردو میں خوشخط "طاہر پاپڑ والا" لکھا ہوا ایک موٹا کاغذ ٹوکری پر چسپاں رہتا۔ یہ گویا اس چلتی پھرتی دکان کا سائن بورڈ تھا۔ بڑی شائستگی کے ساتھ آواز بھی یہی لگاتے۔ "طاہر پاپڑ والا"

شیشے کے صندوق نما شوکیس میں بنگالی مٹھائی بیچنے والے بھی دروازے دروازے جاتے تھے رس گلے اور چم چم ملائی ان کی خاص مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے ایک خاص طرح کی چمٹی سے پکڑ کر نکالتے تھے اور ڈھاک کے تازہ پتے کے دونے میں دیتے تھے۔

بنگالی مٹھائی کی طرح شیشے کے شوکیس میں ہی فینسی قسم کے بسکٹ بیچنے کا رواج بھی تھا مگر ان کا شوکیس مستطیل کے بجائے ہشت پہل ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنا شوکیس زمین پر کبھی نہیں رکھتے تھے۔ سودا دینا ہوتا تو پہلے بغل میں دبے ہوئے ڈھائی تین فٹ اونچے بید کے اسٹینڈ کو زمین پر رکھتے پھر اس پر اپنا شوکیس ٹکاتے۔

چنا جور گرم والے مزے دار چٹپٹے چنوں کے علاوہ اپنے آواز لگانے کے مخصوص انداز کی بدولت بھی خاصے مقبول تھے۔ ایک آدمی بڑی تیز اور باریک آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر صدا لگاتا۔ آگئی چنے کی بہار، میرا چنا ذائقہ دار۔ ایک دوسرا پھیری والا مخصوص لحن میں اس طرح تک بندی کرتا:

میرا چنا بنا ہے اعلا　　اس میں پڑا ہے گرم مسالہ
جس کو کھائیں بندے کے لالا　　جس کو کھائے بوڑھا بالا
جس کو کھائے افسر اعلا　　چنا جور گرم

یہ چنے والا اور دو کوئی منظوم کتبہ بھی سنایا کرتا تھا۔

ایک پھیری والا آلو کے بھنے بھنے بھی لایا کرتا تھا۔ ان بھنوں کا ذائقہ گھروں پر بھنے بھنوں سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ وہ بھنوں کو گرم رکھنے کے لیے انھیں روئی کے گدے میں لپیٹے رہتا تھا۔

ایک شخص حلوا پراٹھا بیچتا تھا۔ پیتل کے تسلے میں تھرتھراتا ہوا روے کا حلوا اور رنگ جھلک تین فٹ قطر کا پرت دار پراٹھا۔ پورا پراٹھا کھانا کسی معتدل انسان کے بس کی بات نہیں تھی تول کر بکتا تھا اور چار آنے میں سیری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک پھیری والے تمام دنوں میں کھویا پٹی، سلونے سیو ڑی کے لڈو، گزک بیچنے والی پھیری وغیرہ کا خوانچہ لگاتے اور عشرۂ محرم کے دوران مجلس کا تبرک مثلاً نکیاں، ٹکیاں، نمک پارے، الائچی دانے شکر پارے، اندرسے کی گولیاں وغیرہ بیچتے۔ بارہ محرم کو امام کے تیجے کے دن پھولوں کے پیالے جن میں سوگ بڑھانے کی اشیاء ہوتی تھیں اور چھوٹے بڑے الائچی دانے اور میٹھی کھیلیں لیکر آتے تھے۔ بڑی نرم اور دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ انھوں نے بعد میں پھیری لگانا بند کرکے آری زردوزی کا کارخانہ کھول لیا تھا۔

کڑکڑاتے جاڑوں میں تاروں کی چھاؤں تلے دودھ کو متھ کر نمش بنائی جاتی ہے۔ ایک زمانے میں چین کی شکل میں اس مٹھائی پر پستے، بادام کی ہوائیاں بھی نظر آتی تھیں۔ نمش والے صبح تڑکے پھیری پر نکلتے تھے۔ بڑے سے پیتل کے تھال میں نمش کا کونڈا کسی کپڑے یا سینی سے ڈھکا ہوا رکھا ہوتا اور تھال کے تین طرف پرانے روپے کے سکے سے یا ہتھیلی کے برابر نمک کی کوری سکوریاں اور پیالے رکھے ہوتے۔ نمش کو ایک زمانے میں نان تنکی سے کھایا جاتا تھا۔ صبح کے وقت اکثر نمش والوں کی پرکشش آواز "ملائی مکھن ہے!" سے آنکھ کھلتی تھی۔ بالائی والے بھی صبح ہی سے نکلتے۔ نمش والوں کے بعد ان کا پھیرا ہوتا۔ اس بالائی کی غربال نما اوپری پرت اتنی خشک ہوتی تھی کہ ہاتھ لگائیے تو بجز چکنائی کے ذرا سی بھی نمی ہاتھ میں نہیں چھوٹتی تھی بالکل

میں سے دودھ چھوٹتا ہوا سے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی بالائی کے لئے رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

"بے قند و شکر خدا اگر چھری سے کاٹی اور کھائی سنئے

اور شرر لکھتے ہیں کہ:

"بالائی کی تہوں کو نفاست اور خوش نمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی شہر کے لوگوں کو آتا ہوگا۔"..؎

ایک بالائی والے نے ناپ تول کا جھنجھٹ ہٹانے کے لیے مٹی کے کورے پیالوں میں چھٹانک چھٹانک بھر بالائی رکھ کر بیچنا شروع کی۔ اس کی بالائی اوپر سے بہت خشک، اندر سے خوب چکنی اور خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ بالائی کے پیالے بیں کی پاٹ دار آواز کے ساتھ ہی گھروں کے دروازے کھل جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا خوانچہ خالی ہو جاتا۔

افغانستان کے لوگ خشک میوے، ہینگ، سلاجیت اور شیر کی چربی لے کر سردیوں کے موسم میں آتے تھے اور سال بھر کی روزی روٹی کا حساب کر کے واپس اپنے ملک چلے جاتے تھے۔ کچھ لوگ سود پر روپیہ بھی چلاتے تھے۔

کچھ پھیری والے جگہ جگہ رک کر پہلے اپنے چاروں طرف مجمع اکٹھا کرتے اس کے بعد اپنے مال کی تشہیر کرتے۔ ایسے ہی ایک دانت کا منجن بیچنے والے تھے جو اپنی چرب زبانی کے علاوہ اپنی ہیئت کذائی سے بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ کبھی دانتوں کے سرجن کا بھیس بدلے ہیں۔ کبھی یونان کے قدیم فوجی لباس میں سکندر اعظم کا بہروپ بنائے ہوئے ہیں۔ بڑے وجیہہ اور تندرست تھے۔ اس لیے ہر روپ ان کے اوپر کھپتا تھا۔ ان کے دانت بالکل برابر کے، سڈول اور موتیوں جیسے چمکدار تھے۔ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی ان کے اسسٹنٹ کے طور پر ساتھ رہتا تھا۔

ایک اور منجن والے تھے یہ اپنے دانتوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے تانبے کے سکے کو دانت سے پکڑ کر دوہرا کر دیا کرتے تھے بغیر تکلیف اور اوزار کے دانت اکھاڑتے بھی انھیں دیکھا وہ انگوٹھے کے پیٹ پر کچھ پڑھ کر دم کرتے پھر وہی کونا دانت سے مس کر کے الگ ہٹ جاتے دانت اپنی جڑیں خود بخود چھوڑ دیتا اور درد میں مبتلا شخص اپنی ہی چٹکی سے دانت کو گویا مسوڑھے پر سے اٹھا لیتا۔ اس میں حقیقت کہاں تک ہے واللہ اعلم۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب تھے۔ جو لال مرہم بیچا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ پہلے تو پولیس انسپکٹر تھے۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے لگتے بھی تھے۔ تیز سے تیز درد ہو مرہم کی ایک انگلی لگانے سے اڑنچھو ہو جایا کرتا تھا۔ خیال تھا کہ چارہ گری کرانے والے انھیں کے گرگے ہوتے تھے جو ان کا مرہم لگتے ہی ہشاش بشاش لگنے لگتے تھے مگر اب PAIN KILLING SPRAYS کو دیکھتے ہیں منٹوں میں درد کا رفع ہو جانا بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔

بانو شاہ کا سُرمہ بیچنے والے بھی اسی طرح بھیڑ لگا کر کاروبار کیا کرتے تھے نخاس کی طرف اتوار کی بازار میں ضرور آتے تھے یہ دو ننگ دھڑنگ آدمی تھے جو، کوئی بھی موسم ہو لباس کے نام پر صرف ایک سیاہ رنگ کی لنگوٹی باندھے رہتے تھے۔ یہ لوگ بانس کے ڈنڈوں کے سہارے ایک پوسٹر ٹانگ دیتے جس پر سرمے کے خواص لکھے ہوتے اور بانو شاہ کی روغنی رنگ سے ایک تصویر بنی ہوئی، خود بانو شاہ بھی لمبی کاکلوں اور ریش دراز کے ساتھ ایک لنگوٹی کسے مگدر کاندھے پر رکھے نظر آتے تھے۔ یہ دونوں لنگوٹ بند سرمے والے پاٹ دار آواز میں مخصوص دھن سے ایک نظم پڑھتے جاتے اور راہ گیروں کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر ایک ہی سلائی سے سب کے سرمہ لگاتے اور ہاتھ میں دبے ہوئے کثیف رومال سے آنسو خشک کرتے جاتے۔ ان کی نظم کی یہ تین لائنیں یاد رہ گئی ہیں۔

لگا لو پیاری آنکھوں میں یہ بانو شاہ کا سُرمہ
نہ لگتا ہے نہ جلتا ہے کرے آنکھوں کو یہ ٹھنڈا
عجب تاثیر لاتا ہے یہ بانو شاہ کا سُرمہ

ایک چوبے جی ہوا کرتے تھے۔ یہ قوت مردمی کی دوا بیچتے تھے یہ اپنے ساتھ پٹاریوں اور تھیلیوں میں بند درجنوں قسم کے سانپ بھی رکھتے تھے اور ہر سانپ سے وابستہ کوئی نہ کوئی قصہ بھی بیان کرتے تھے۔ یہ چٹکلے بھی سناتے جو ان کی دوا کی مناسبت سے ہی ہوتے اور

جنھیں مہذب محفل میں نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مجمع بڑی دلچسپی اور انہماک سے ان کی باتیں سنتا۔ بیچ بیچ میں لوگوں کو خبردار بھی کرتے رہتے۔ بھائیو جیب پاکٹ سے ہوشیار۔ دنیا میں بڑا اچکا گٹھ کٹا پڑا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بٹوے کو ہلکا کر دے۔ ان کے پاس بچھو بھی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ انچ لمبے اور بالکل سیاہ۔ کہتے تھے کالے ناگ کا ڈسا جیسے اس کا کاٹا پانی نہ پئے۔ کبھی کبھی بھیڑ خالی کے لیے سانپ کو زمین پر چھوڑ دیتے وہ مجمع کی طرف جانے لگتا تو ایک کھلبلی مچ جاتی۔ اس سے پہلے کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں یہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی پتلی سی چھڑی سے اسے اس طرح اٹھا لیتے جیسے سانپ نہ ہو کپڑے کا ازار بند ہو۔

بزاز اور چکنہ، گوٹا کناری والے لوگ بھی گھروں پر آتے اور آواز لگاتے۔ ان میں سے بعضوں کی تو خاصی بڑی دوکانیں چوک میں تھیں بزاز کپڑوں کے تھان کو مارکین کی چادر میں باندھ کر کندھے سے اس طرح لٹکاتے کہ سارا وزن کولہوں اور کمر پر آجاتا۔ یہ لوگ جھکے جھکے لوہے یا لکڑی کا گز زمین پر ٹیک ٹیک کر چلا کرتے تھے۔ کچھ بزاز کپڑے کا گٹھر اٹھانے کے لیے مزدور بھی کر لیا کرتے تھے۔

ایک زمانے میں سرحد پار سے چینی تاجر اپنے یہاں کی مصنوعات لے کر یہاں آتے اور پھیری پر نکلتے۔ صاحبان استعداد سے انھیں اپنے مال کی اچھی قیمت ملتی۔ چین کا ریشمی کپڑا خصوصاً ساٹن اور کڑھائی کا کام بہت نفیس ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہاتھ کی بنی تصویریں بھی لاتے تھے جو موقلم کی باریکی اور رنگوں کے امتزاج و تناسب کے اعلا شعور کی گواہی دیتی تھیں۔ یہ لوگ ہندوستانی اور انگریزی کو مخلوط کر کے عجیب و غریب زبان بولتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہنا ہے کہ ”یہ کپڑا دھوئے دھوئے دبیز ہوتا ہے“ تو کہتے ”یہ کپرا واشے واشے تھک اوتا اے“

دھات اور شیشے، چینی کے برتن بھی پھیری والے گھروں پر لاتے تھے۔ کچھ عورتیں صرف کامدار پرانے کپڑے کے بدلے میں برتن دیتی تھیں۔ آج کی طرح پہلے جھوٹا پھکا پھٹا تو ہوتا نہیں تھا۔ کامدانی زردوزی، سلمی، ستارہ، کرن، تقیش، جوا، مرمرا، زربفت، جامہ دار جو چیز بھی تھی اس میں سونا یا چاندی ضرور ہوتی تھی۔

پھیری والوں میں ایک قسم لال سوداگروں کی ہوا کرتی تھی یہ لوگ ایسی چیزیں بیچا کرتے تھے جن میں کوئی باہمی ربط نظر نہ آتا ہو۔ ایک لال سوداگر کو میں نے بھی دیکھا ہے وہ شاید آخری لال سوداگر تھے۔ مرحوم نہایت کڑوے بڑے میاں تھے۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے کمر خم کھا کر تقریباً دوہری ہو چکی تھی۔ وضع قطع ثقات جیسی۔ سن سفید پٹے روئی کا گالا جیسی داڑھی، نورانی چہرہ، صاف رنگت مگر تیور ہمیشہ بیلے ٹرک کے آوارہ گرد لڑکے انھیں چھیڑا کرتے۔ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کیوں چھیڑ رہے ہیں۔ لہٰذا جواباً ان کی ماں بہنوں تک کو نواز کر رکھ دیتے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب	گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

وہ تو کب کے اپنا اسباب لٹا کر راہ عدم کے سفری ہوئے مگر ان کی آواز آج تک کانوں میں گونجتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ”ہوادار پنکھے، نرید آباد کی مہندی، نوحے ماتم کی بیاضیں!“

حواشی:

۱؎ غالب کے خطوط (جلد دوم)، مرتبہ خلیق انجم طبع ۱۹۸۵ ص ۵۲۴/۵۲۳

۲؎ لکھنؤ کی زبان۔ طبع ۱۹۷۶ ص ۴۴

۳؎ گزشتہ لکھنؤ۔ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۱۹۸

۴؎ فسانۂ عجائب۔ مرتبہ رشید حسن خاں۔ متن ص ۷

۵؎ ایضاً	۶؎ فسانۂ عجائب متن ص ۹

۷؎ گزشتہ لکھنؤ	طبع قدیم ناقص الاول ص ۹۹

۸؎ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں طبع ۱۹۷۸ ص ۱۰

۹؎ قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ۔ از سید اسرار حسین خاں ۱۹۳۶ ص ۱۴۸

۱۰؎ فسانۂ عجائب	مرتبہ رشید حسن خاں متن ص ۸

۱۱؎ گزشتہ لکھنؤ	مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۲۵۱

لکھنؤ کی بازیاں

کنکوے بازی

لکھنؤ کی بازیاں بہت مشہور ہیں، ان میں سے کچھ خاص کے نام ہیں: پتنگ بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی اور تیتر بازی۔ ان بازیوں میں یہاں صرف پتنگ بازی کے بارے میں تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

اس صدی کی شروعات میں کنکوا بازی کا فن لکھنؤ میں اپنے عروج پر تھا۔ نوابین، شرفا اور رئیس لوگ اس شوق کے دلدادہ تھے اسی زمانے میں کنکوے بازی کے بڑے بڑے کلب بنے، اس کے اصول قائم کیے گئے اور کوشش یہ کی گئی کہ کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کی طرح اسے بھی مستقل قسم کے کھیلوں میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۵۲ھ میں "ہوائی شغل" کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی اور اس میں بھی مانگ دہرائی گئی۔ لکھنؤ کی پتنگ بازی پر لکھی گئی شاید یہ واحد کتاب ہے اور اسے سید احمد معتمد اعزازی نے مرتب کیا تھا اور اس کی تاریخ باقر حسن شہرت اور آرزو لکھنوی نے سید محمد حیدر کے نام سے تصنیف کی تھی۔

پتنگ کا لفظ پتنگا سے نکلا ہے اور پتنگا چونکہ چھوٹا ہوتا ہے اس لیے چھوٹے کنکوے کو جسے عموماً کنکیا کہتے ہیں، اسے ہی پتنگ کہا جاتا ہے اور بڑے سائز والے کنکوے کہلاتے ہیں۔

خطۂ یونان کے ایک مشہور حکیم عرقیطس طرطری نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چار سو سال قبل اس کی ایجاد کی تھی لیکن مگر لکھنؤ میں پتنگ بازی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں بھی پتنگ، کنکوا زیادہ تر جھل جھل دار لڑا کرتا تھا، لیکن باقاعدہ کنکوے بازی کا رواج نہ تھا۔ نہ کثرت سے یہ شغل ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ڈور موٹی، پتنگ بہت بھاری اور ٹھس ہوتی تھی۔ واجد علی شاہ کے زمانے تک تکل، پتنگ، کنکوے، بابکی اڑا کرتے تھے۔ آخر عہد شاہ مرحوم میں بیگموں اور خواجہ سراؤں میں چند ماہ پتنگ بازی کا شغل ہوا۔ یہ لوگ مینا بازار میں رہتے تھے کچھ بدمزگی پیدا ہو جانے سے شغل بند ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ اس کے تین سال بعد مشہور کنکوے بازی لکھنؤ میں شاہزادوں اور نواب زادوں میں ہوئی۔

ایک فریق شاہزادہ مرزا ولی عہد بہادر خلف شاہزادہ مرزا حیدر صاحب دہلوی، دوسرے فریق نواب علی محمد خاں صاحب بہادر ساکن احاطہ مرزا علیخاں لکھنؤ تھے۔ یہ کنکوے بازی ڈھائی سال تک جاری رہی۔

لکھنؤ میں آصف الدولہ کے وقت سے ہی تکل، مکڑ، آدم اور اژدہا شکل کی پتنگ اڑانے کا شوق تھا مگر لڑانے کا طریقہ اس وقت تک رائج نہیں تھا۔ باقاعدہ طور پر پینچ لڑانے اور کلب وغیرہ بنانے کا سلسلہ انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد شروع ہوا۔

کوئی بھی شوق جب فن بن جاتا ہے تو اس کے تمام اصول مرتب کرنے میں ہنرمندی درکار ہوتی ہے۔ چناں چہ کنکوا بنانا، سادی تیار کرنا، مانجھا سونتنا اور چرخی ٹھرانا وغیرہ لکھنؤ کا ہنر بن گیا۔

پرانے زمانے میں مجیم کا بدیسی کاغذ کنکووں میں استعمال ہوتا تھا ہر رنگ کے تاؤ ہوتے تھے اور پچاس برس قبل اس کی قیمت دو روپیہ فی رم ہوتی تھی۔ اس رنگین کاغذ پر کوڑیاں گھس کر اس پہ پھکیاں بنائی جاتی تھیں اس سے کاغذ پر ایک طرح کا نقش ابھر آتا تھا اور اس طرح کے نقش

کہ جب دوسرے رنگ کے کاغذ سے ملا کر پتنگ بنائی جاتی تھی تو وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

یہ فن اتنا ترقی پذیر ہوا کہ سادہ کاغذ چار خانہ دار، لہریا دار اور دوسری طرز کی لکیروں سے دیدہ زیب بن جاتا تھا۔ یہی فن آگے بڑھا تو ہمارے بعض ہنرمند اچھے سے اچھے نقوش اور اناردانہ قریب قریب لکیریں کھینچ کر تیار کر دیتے تھے۔

آجکل یہ فن ختم ہو گیا ہے اور اب دیسی کاغذ سے ہی رنگ برنگ اور پٹی سے پٹی جوڑ کر ڈیزائن بنایا جاتا ہے۔ کچھ پرانے اور کچھ نئے ڈیزائن کے کنکوؤں کے نام اس طرح مشہور ہیں:

پرانوں میں: انگاریہ، ابابیلیا، ایک کلا، بٹھیا، بھیڑیا، بگلا، پہاڑیا، پٹی دار، بڑھی دار، بہروپیا، تپیتا، جینویا، جم، جھر، چپ، چوبرہ، جھنڈے دار، چاند تارا، جتن، خربوزیہ، دوگکا، دوبازہ، دوپرہ، زیرپرہ، سلیمانیہ، شطرنجیا، مڑی دار، طوقیہ، کروندیا، کٹ مانگیا، گل پتہ، گوٹیا، گیند دار، مانگ دار، لل پتہ، منتھے دار، مردنگیا، مکھی (نعل دار طوقیہ) وغیرہ مشہور تھیں۔

نئے ڈیزائنوں میں اب صرف چند ہی نام ہیں مثلاً مانگ دار، لیٹے دار، چپ، گیند دار، طوقیہ، پٹی دار، بڑھی دار، چاند تارا اور منتھے دار وغیرہ۔

اس صدی کی پتنگ کی موجودہ شکل میں اس کے آٹھ حصے ہوتے ہیں: ٹھڈا، مڈھا، کانپ، پتہ، کیدہ، پٹھا، کنا اور ڈور۔

پتنگ سازی کے جو مشہور ماہر فن اور باکمال استاد ہوئے ہیں، ان میں کچھ پرانے نام یوسف حسین، اچھے صاحب، اسماعیل، منوہر لال، محو نواب صاحب، آغا صاحب، چھٹن صاحب، جو مولوی صاحب بھی کہلاتے تھے، لیکن ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۰ء تک جس شخص نے پتنگ سازی میں اپنا لوہا منوایا اس کا نام تھا آغا جن کاشمیری، جنھوں نے یہ فن اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔

زمانۂ حال میں کنکوا مانجھے اور ڈور کے ذریعے اڑایا اور لڑایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مانجھے کو ڈور کہتے تھے اور ڈور کے بجائے سادی کا لفظ مستعمل تھا۔ کنکوا لڑانے میں مانجھا بقدر ضرورت باندھا جاتا تھا اور پیچ کی لمبائی کا تعین سادی سے ہوتا تھا۔ اصل سادی تقریباً پچاس برس قبل ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ پر جرمنی اور جاپان کی ہر کیسا ڈور استعمال ہونے لگی تھیں اب وہ بھی دستیاب نہیں ہیں، بمبئی ریل کا بنا ڈور استعمال ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں مانجھا اور سادی بنانے والوں کے محلے الگ الگ تھے اور ہیں۔ گومتی کے اس پار ڈور والے رہا کرتے تھے اور وہ ڈور والا محلہ کہلاتا تھا۔ سادی بنانے کے لیے سوت کے تار گن کر انھیں بٹ لیا جاتا تھا اور پھر چاول کی پیچ کا اس میں کلف دیا جاتا تھا اور پھر اسے سائے میں ایک ہفتہ تک سکھایا جاتا تھا۔ سادی کے درجات اس میں بنے ہوئے تاروں سے مانے جاتے تھے۔ عام طور پر تین تار والی سادی معمولی درجہ کی ہوتی تھی بہت سے رؤسا ۷، ۹، ۱۱ اور ۱۳ اور کبھی کبھی ۱۷ تاروں کی سادی بھی بنواتے تھے۔ اس طرح کی مانجھا چڑھی ہوئی سادی بہت اچھی مانی جاتی تھی۔

کسی بھی فن میں جب گراوٹ آجاتی ہے تو سماج میں ان فن کاروں کی حیثیت بہت گھٹ جاتی ہے اور ایسے وقت میں یہ فن کار اپنے آپ کو اور اپنے فن کو زمانے سے چھپانے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ہوا ہے لکھنؤ کے ڈور اور مانجھا سوتنے والے فن کاروں کے ساتھ۔ کشمیری محلہ کے پیچھے ایک محلہ ہے جسے گڑھیا اعظم بیگ کہتے ہیں۔ یہاں کے مانجھا سوتنے والے لکھنؤ کی ناک کہے جاتے تھے، ان میں بہت سے شرفا بھی تھے جو اسی محلے کے رہنے والے تھے۔ گڑھیا اعظم بیگ کا سوتا ہوا مانجھا لکھنؤ سے احمد آباد تک اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

وقت کے ساتھ سارے فن کار اور فن کے طریقے بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ مانجھا بنانے یا سوتنے کا فن لکھنؤ میں بہت کم ہو گیا ہے اور اچھے اچھے فن کے جاننے والے لکھنؤ سے باہر چلے گئے۔ گڑھیا اعظم بیگ کے ہی بتن نواب صاحب، منن نواب صاحب اور اتو نواب صاحب تین بھائی اس صدی کے اوائل میں مانجھا سوتنے والوں میں بے مثل تھے مگر قدردانی نہ ہونے کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑ کر احمد آباد چلے گئے اور وہاں مانجھا سوتنے کا پورا کارخانہ کھول لیا جس سے ان کو وہاں بہت عزت اور شہرت ملی اور لکھنؤ کی ایک الگ پہچان بھی۔

پہلے گھر کی چھتوں پر سے پتنگ لڑانے کا رواج نہیں تھا

اس زمانے میں کنکوے بازی کے مقابلے دریائے گومتی کے کنارے یا چار باغ ریلوے اسٹیشن کے قریب یا حسین گنج جامع مسجد کے پاس یا گولا عقب شیش محل میدان میں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تعداد لڑانے والوں اور پیچوں کی مقرر کر لی جاتی تھی اور کس قسم کا کنکوا لڑے گا یہ بھی طے کر لیا جاتا تھا۔ چھوٹے پیچ میں سوا کے تین سے اچھے دس تک جس کا قد ۱۰ انچ سے زائد نہ ہو اور بڑے پیچ میں پون تاوے سے لے کر پچ کم تاؤ کے کنکوے جس کا قد ۲۹ انچ سے زائد نہ ہو، لڑائے جاتے۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ چھوٹے پیچ میں لڑانے والوں کا درمیان کا فاصلہ دو سو فٹ [illegible] ہوتا ہے۔ پیچ لڑانے والوں کو عموماً دس گز اور عرضاً پانچ گز جگہ مقرر کر دی جاتی تھی جس کی حد بندی فرش یا کسی نشان سے ہوتی تھی۔ ہر پیچ میں تین منصف (امپائر) بھی ہوتے تھے۔ مگر اب یہ سارے سلسلے بدل گئے ہیں پہلے بڑے پیچ میں آٹھ سو گز سے کم کا پیچ نہیں ہوتا تھا جس میں دو سو گز مانجھا باندھا جاتا تھا۔ مگر تجربہ کار اور شائق حضرات سو گز مانجھا کافی خیال کرتے تھے۔

شاہزادہ مرزا سلطان بخت مرحوم نے کبھی دو گز سے زائد مانجھا نہیں باندھا اور کسی وقت ان کا کنکوا استادی سے نہیں کٹا۔

کنکوا کس طرح لڑایا جاتا ہے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی جیومیٹری ہے اور اسی کے اصولوں پر آسمان میں انگلی کے اشارے پر لڑائی ہوتی ہے۔ پیچ اوپر سے گر آمار کر یا نیچے سے کھینچ کر یا دابے اور بائیں سے ڈھیلی مار کر کس طرح لڑایا جاتا ہے یہ بتانا یہاں بے محل ہے لیکن یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ پیچ دو طرح کے ہوتے ہیں اکہرا اور دوہرا۔ عام طور پر لوگ اکہرا پیچ ہی لڑاتے ہیں کیوں کہ دوہرا پیچ لڑانا بہت مشکل اور تجربہ کا کام ہے۔ دوہرا پیچ ڈالنے اور اسے لڑانے کے لئے بہت صحیح زاویہ اور مناسب وقت پر بھرپور خط مارنا بہت ضروری ہے۔ جس وقت فریقین کے کنکوے قریب آ کر اور دوہرا پیچ ڈال کر ایک جیومیٹری کے زاویے پر آ جاتے ہیں اس وقت دماغ آنکھ، ہاتھ، پیر، سانس سب پر قابو ہونا چاہیے بس یہی کام کرتا ہے [illegible] پیچ لڑانے والوں میں شاہزادہ مرزا سلطان بخت اور وزیر گنج کے نواب سید حسین (خاقان منزل والے) کا جواب نہیں تھا۔

کنکوے بازی ایک ایسا کھیل ہے جس میں اعلا سطحی مقابلہ ہوتا ہے اور یہ دنیا کے دوسرے کھیلوں کی طرح عروج پر آ سکتا ہے اور آج بھی ہوتا مگر انگریزوں کی سیاست ہمیشہ انگریزی کھیلوں کو بڑھانے اور دیسی مشغلوں کو دبانے کی رہی اور اسی وجہ سے انھوں نے ان سارے مشغلوں کو عیاشی قرار دیا اور اپنے کھیلوں کو فروغ دیا مگر اس کے باوجود لکھنے والوں نے کنکوے بازی کو ایک مقابلہ، ایک پیچ اور ایک اعلا سطحی کھیل بنانے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے باقاعدہ اس کی مہم شروع ہوئی اس وقت یہاں چھ یا سات کلب موجود تھے۔ نواب کلب، نخاس کلب وزیر گنج کلب، مولوی گنج کلب، معز کلب (امین آباد کلب)، ہیرو کلب چوک کلب اور اشرف آباد کلب وغیرہ۔ سب نے مل کر یہ مہم چلائی کہ کنکوے بازی، کرکٹ یا ہاکی کے کھیل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس بات کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کے لیے یہ طے ہوا کہ اس کے سارے اصول وغیرہ وضع کیے جائیں اور یہ کام اراکین وزیر گنج کلب کو سونپا گیا۔

اراکین وزیر گنج کلب نے کھیل کے سارے اصول اور میدان کی لمبائی چوڑائی وغیرہ طے کر کے انگریزی سرکار کے حوالے کر دیے اور انھیں اصولوں پر ہی سب کلب کے اراکین گامزن رہے۔ اس کے لئے چار باغ اسٹیشن کے پیچھے اور گومتی کے کنارے دو میدان Stadium بنانے کی بھی تجویز رکھی گئی، مگر فرنگی حکومت نے ایک کان گونگا ایک بہرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کے بعد ملک کا بٹوارہ ہو گیا اور یہ فن لکھنؤ سے ختم ہو گیا اور رہ گیا صرف مذاق۔

پرانے زمانے میں جو رئیسا اور نوابین کنکوے بازی کرتے تھے وہ اپنے کنکوے میں چاندی کا مقیش لگا دیتے تھے جس کی قیمت اس زمانے میں بھی پانچ روپے ہوتی تھی، بعد میں کچھ کنکوے بازوں نے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ چاندی کے چھلے پتنگ کے پیچھے میں باندھ دیتے تھے اس سے پتنگ کا وزن اچھا ہو جاتا تھا اور اس سے پتنگ لوٹنے والے غریب لوگوں کی مدد بھی ہوتی تھی۔ اس طرح اس شوق اور شغل سے سیکڑوں لوگوں کی روزی روٹی چل رہی تھی۔ یہ طریقہ ۱۹۵۰ء کے بعد ختم ہو گیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق

چھوٹے آغا صاحب کٹیری محلے والے نے ۱۹۶۰ء تک یہ روایت قائم رکھی۔
گزشتہ ۲۵-۳۰ برسوں سے لکھنؤ کے بازوں میں ایک طبقہ اور پیدا ہو گیا ہے جو مانجھے کی جگہ تار باندھ کر پتنگ اڑاتا ہے اور ہوا میں ہی کٹی ہوئی پتنگ کو اپنی پتنگ میں لپٹا لیتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے اسے اتار کر لے آتا ہے پھر بہت سی پتنگیں جمع ہو جانے کے بعد وہ انھیں اُڑا کر لڑاتا ہے۔

لکھنؤ کی پان والیاں

پان یوں تو سارے ہندستان میں کھائے جاتے ہیں مگر لکھنؤ اور بنارس کے پانوں کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ بنارس اور لکھنؤ کے پان کھانے والوں میں ایک فرق ہے۔

بنارسی پان کھانے والے انگلی یا تنکے سے چونا چاٹتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ والوں نے اپنی تہذیب میں اسے اچھا نہیں سمجھا کہ چونا الگ سے چاٹا جائے۔

لکھنؤ کے پان بہت مشہور ہیں۔ شاہی دور میں ہر فن کو عروج ہوا، پان لگانا بھی ایک فن قرار پایا۔ چنانچہ اس فن کو بھی ترقی ہوئی۔ لکھنؤ کی ہر محفل میں پان جزو لاینفک بن گیا اور خواتین کی محفل میں پان والیوں کا ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور ہوتا تھا۔ عوام ہی میں نہیں، یہ پان والیاں شاہی درباروں میں بھی بہت مقبول تھیں۔ ان پان والیوں نے شاہی درباروں میں اپنے اپنے انداز کے پان لگانے میں مہارت دکھا کر اپنی ایک الگ جگہ بنالی تھی۔ لکھنؤ کی ہر محفل میں دسترخوان ہو یا نہ ہو، پان کا ہونا ایک رواج بن گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پان والیوں کا نام بھی جڑا ہوا تھا۔ پان کے لئے شاعروں نے غزلیں لکھیں۔ پان والیوں نے انھیں گایا اور پان کو ادب میں بھی جگہ مل گئی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ـ

یہ قیامت کا شوخ و پرفن ہے
یہ حسینوں کے لب کا جوبن ہے

لچھمن پرشاد وردا مارگ پر ایک پان والی ہے شوتن۔ بہت مزے دار باتیں کرتی ہے۔ جملہ کسنے میں کبھی چوکتی نہیں ہے۔ اس کی ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً ۱۵ برس ہے، باتوں میں جتنی تیز ہے اس سے زیادہ پان لگانے میں۔ ایک بار ایک عاشق مزاج نوجوان نے اس سے کہا، "آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

اس نے فوراً اپنی دوکان پر لگے شیشے کے اوپر لکھی اس عبارت کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا،

"یہاں صرف پانوں ہی سے منہ لال نہیں کیا جاتا!"

یہ ہیں آج کی پان والیاں ــ جو لکھنؤ کی تہذیب پر فاتحہ پڑھ چکی ہیں۔!!

شاہی زمانے میں چوک کی بعض طوائفوں نے اپنی جوانی ڈھلنے کے ساتھ ہی رقص و موسیقی سے اپنا ناطہ توڑ لیا اور کوٹھے سے اتر کر پان لگانے کا شغل اختیار کر لیا ــــ بشیرن پان والی کی کہانی بھی کچھ ایسی رہی تھی۔

بشیرن پان لگانا اچھا جانتی تھی۔ بہت کم وقت میں لوگوں نے اس کا نام پان کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ لکھنؤ کے شریف زادے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے رات کی تاریکی میں سب کی نظریں بچا کر کوٹھوں پر آتے تھے مگر وہ بشیرن کی نظروں سے نہیں چھپ سکتے تھے اور بشیرن اس سے فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ پان دیتے وقت ایک جملے میں سب کچھ کہہ دیتی تھی اور ایسا جوکر شریف زادے گھبرا جاتے تھے۔

"میاں! وہ جمن آپ کے گھر کا نوکر توشہ لگانے والا ہر کوٹھے پر جا جا کر آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ آپ کی والدہ نے آپ کو ڈھونڈوایا تھا۔"

"اچھا۔؟!" شریف زادے کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔ "تو کیا تم نے بتا دیا۔؟"

"نہیں حضور، آپ کی پرانی نمک خوار ہوں۔ میں نے تو اسے ان سیڑھیوں کے نزدیک نہیں آنے دیا۔ مجھے معلوم تھا آپ اوپر تشریف رکھتے ہیں" ـــــ دو چار چکنی چپڑی باتیں کیں اور میاں کی جیب خالی کروالی۔!

بشیرن کی بہن جس کا نام معلوم نہ ہو سکا، وہ بھی پان لگانے میں مشاق تھی اور روز ایک نئے پان کا نام کا لنا اور اس کے الگ مسالے تیار کرنا ہی اس کی تجارت تھی۔ اس کے بنائے ہوئے پانوں میں مغلائی، نوابی، نصیری، عہدی اور بیگمی وغیرہ بہت دنوں تک چلتے رہے۔

کئی طرح کے خوشبودار مسالے ڈال کر اور اسے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا تھا اسے نصیری پان کہتے تھے۔ اس طرح کے پانوں کا رواج نصیرالدین حیدر کے وقت سے چلا۔ پان میں زعفران کھانے کا رواج بھی اسی زمانے سے ہوا۔ زعفران پان کے ساتھ کھانے سے دو فائدے بتائے جاتے ہیں ایک یہ کہ پان کے ٹکڑے اور بھیگی ہوئی ڈلی کی کرچیں دانتوں میں نہیں پھنستیں دوسرے یہ کہ منھ میں لس بنا رہتا ہے۔ اس پان کا نام اس نے "رسمی" رکھا تھا۔

محلوں میں اور نوابین کے دولت کدوں پر خاصہ بردار عورتیں ایک ہی نام سے پکاری جاتی تھیں، انھیں "مغلانی" کہتے تھے۔ انھیں مغلانیوں کی ادا کے نام پر ایک پان کا رواج تھا جسے مغلائی پان کہتے تھے۔

پان کھانے کی شروعات دلّی میں مغلوں کے زمانے سے ہوئی تھی لیکن صرف چونے کے پان سے۔ نورجہاں نے اس میں کتھے کا اضافہ کیا اور لکھنؤ والوں نے پان کے ساتھ سیکڑوں مسالے جوڑ دیئے۔ کچھ صاحب فہم حضرات اسی لیے چونے کے پان کو مغلائی کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے دونوں ہی باتیں صحیح ہوں، لیکن لکھنؤ کے شاہی محلوں میں چونے کے پان کھائے جانے کا کوئی واقعہ سننے کو نہیں ملتا۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

پان کھا کر جمائی ہے مستی

سرخ ہے مگر شفق باقی

مستی کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے اور شفق کا رنگ سرخ۔ مستی کے باوجود پان کا سرخ رنگ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ پان میں آنے والی یہ سرخی بغیر کتھے کے نہیں آسکتی اس لیے پہلی بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک تیسری روایت اور بھی ہے کہ نصیرالدین حیدر کے محل میں مغلانی بیگم نام کی بھی ایک عورت تھی۔ ہوسکتا ہے نصیرالدین حیدر نے اسی کے نام پر کسی خاص پان کو مغلائی پان کا نام دیا ہو۔

بشیرن نے اپنی بیٹی کو نصیرالدین حیدر کے محل میں پان کھلانے کی ملازمت دلوائی تھی جہاں اس نے بادشاہ کو ایک "ریسوری نوابی" پان کھلا کر ہیرے کی انگوٹھی حاصل کی۔ جب تک زندہ رہی روز نئے نئے نام اور نئے نئے مسالوں کے بنانے کے طریقے ایجاد کرتی رہی۔

چوک کے بازار میں یا مسافر خانہ میں یا بھٹیار خانہ کے باہر اس طرح کی پان والیاں اکثر دکھائی دیتی تھیں۔ کوٹھا چھوٹنے کے بعد بھی محفل کی تمنا ان عورتوں کے دلوں میں رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ پان کے بہانے ہی سہی لوگ ان کے پاس آتے رہیں اور کچھ نہیں تو ان کی دکان پر ہی محفل جمی رہے۔ محفل جمائے رکھنے میں سب سے مشہور پھلوا تھی جس کی صاحب گنج میں نوروزی کے بھٹیار خانے کے پاس اس کی دکان تھی۔ اس کے چاہنے والے چوک چھوڑ کر یہاں آتے تھے۔ دمڑی کا پان کھاتے اور گھنٹوں بیٹھے اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنا کرتے۔ ایسی ہی پان والیوں کے یہاں سے پان میں افیم اور کوکین کھانے کا چلن ہوا۔

ان پان والیوں نے ہی پان میں جان ڈالی اور اسے سماج کا ایک رواج بنا دیا۔ پانوں میں کتھے اور تمباکو کے مسالے کھائے جانے لگے۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی پہلی بیگم سلطان محل عالم آرا کے پاس کئی عدد پان والیاں نوکر تھیں اور ان کا خرچ دو ہزار روپیہ ماہوار تھا۔

دعوتِ عام ہو یا دعوتِ خاص، اگر کھانا کھانے کے بعد پان پیش نہیں کیا گیا تو میزبان جاہل اور بدتمیز مانا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں پان اس کا ایک حصہ تھا۔

جس معاشرے میں پان کھانا اس حد تک ضروری ہو اس معاشرے میں پان والیوں کی کیا حیثیت ہوگی یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ شاہی محل میں پان والیوں کی حیثیت سے کمپنی بہادر کے چھپے ہوئے وفاداروں نے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ شاہی حکم سے نظر بچا کر ان کے نام کا استعمال کیا اور پان والیوں کو لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا۔ تمباکو، ٹی پتی جسے بعد میں چائے کا نام دیا گیا، انڈا، سنکھیا، توتیا، بادام اور دھتورے کے ہرے پتے سے ملا کر بادشاہِ وقت کے لئے ایک کشتہ تیار کیا گیا یہ کشتہ بہت ذائقہ دار تھا اور اس میں زعفران ملا کر اسے خوشبودار بنایا گیا تھا۔ اس طرح کے کشتوں کا استعمال عموماً قوتِ باہ کے لئے امجد علی شاہ کے وقت میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ مگر سلطان عالم واجد علی شاہ کے دور میں اُن ہی پان والیوں نے دغا کی اور اس کشتہ کا استعمال کثرت سے بادشاہ کو کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسامی کیفیت ہوگئی اور ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۱ء تک تقریباً دو برس بادشاہ بہت بیمار رہے۔ اور اس طرح انگریز اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگئے۔ □□

انیس انصاری

اودھ کی تہذیب کا عروج اور زوال

اودھ کی تہذیب کا تصور آج کل اس تہذیبی روایت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اس دور حکومت میں پروان چڑھی تھی جس کا سلسلہ سعادت خاں برہان الملک (۱۷۲۲) سے شروع ہو کر واجد علی شاہ (۱۸۵۶) پر ختم ہوا۔ یہ تہذیبی روایت صحیح معنوں میں ہندستانی روایت تھی اگرچہ اس میں پرانی ہندو تہذیب پر ایرانی فارسی تہذیب کا نمایاں اثر تھا۔ اس روایت نے زندگی کے سبھی شعبوں پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ دلی کے مغل بادشاہوں کی روایت سے لے کر چھوٹے طبقوں کے رسم و رواج نے اس کے بنانے میں مدد دی تھی۔

اس تہذیب کے نمایاں اثرات اس علاقے کے لباس پر بھی پڑے اور دو پلی ٹوپی، بشر بتی انگرکھے، چوڑی دار پاجامے، بڑے بڑے ریشمی رومال، ململ اور ریشم کے کڑھے ہوئے کرتوں، سلمے ستارے کی رضائیوں، مخمل کے لحاف اور مخملی جوتوں وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ کھانے پینے کے طریقوں میں پلاؤ، خاسگی، متنجن، مزعفر، شیرمال، پراٹھے، کباب، قورمہ، برفی، بالائی وغیرہ میں تبدیلی آئی۔ بات چیت کے طریقوں اور زبان و ادب میں نئی ڈگر کی شروعات ہوئی مثلاً مرثیہ، مثنوی، غزلوں وغیرہ میں لکھنؤ کا الگ اسکول قائم ہوا۔ تفریحی مشغلوں میں پتنگ بازی، مرغے بازی اور بٹیر بازی وغیرہ کے میدان گرم ہوئے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طوائفوں کو سماج میں بلند مقام ملا۔ رقص و موسیقی میں ٹھمری، خیال کی گائیکی اور رہس میں نئے تجربے ہوئے۔ اس تہذیب کے اثرات مصوری، خطاطی، مشاعروں، مجلسوں، دستکاریوں مثلاً چکن اور کامدانی کارچوبی اور سلمہ ستارہ کے کام، چاندی سونے کے زیورات، پیتل تانبے کے برتنوں مٹی کے برتنوں اور کھلونوں اور علمی ثقافتی اداروں جیسے فرنگی محل، سلطان المدارس خاندان اجتہاد، نولکشور پریس اور اودھ پنچ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

سب سے دیرپا اثر غالباً یہاں کے اس مزاج کو بنانے پر پڑا جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی اس روایت کی مضبوط ترین کڑی بن گئی جو بغیر کسی پروپیگنڈے کے عوام اور خواص کی روزمرہ کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔

اودھ کی تہذیب کی ترقی مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کی دین تھی۔ ایک طرف بکسر کی جنگ (۱۷۶۴) میں شجاع الدولہ کی شکست سے انگریزی تاجروں اور سیاسی رہنماؤں کو دلی کی مغل حکومت کو کمزور کرنے کا سنہرا موقع ملا تو دوسری طرف اودھ کے نوابوں کو اسی مرکزی حکومت سے خود مختاری حاصل کرنے کی گنجائش دکھائی دی۔ انگریز اس بات کو جانتے تھے کہ اودھ کا صوبہ مالی، سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے بیحد کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے شکست خوردہ اودھ کے نوابوں کا استعمال مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کیا۔ ان حالات کا فائدہ اودھ کے نوابوں نے اٹھایا اور اپنے دربار کو دلی کے مغل دربار سے ممتاز کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس کا سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں اودھ کی سلطنت جو مغلوں کی صوبہ دار تھی ۱۸۱۸ سے باقاعدہ خود مختار بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر اودھ کے نوابوں نے مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے بجائے انگریزوں کے خلاف دلی حکومت کا ساتھ دیا ہوتا تو کیا ۱۸۵۶ میں واجد علی شاہ کی معزولی اور ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی میں ہندستانیوں کی شکست کو روکا یا ٹالا جا سکتا تھا۔

سن ۱۸۵۷ کے غدر یا جنگ آزادی نے واضح طور پر ہندستان میں برطانوی حکومت کو استحکام اور بالادستی دے دی۔ اس وقت یورپ دنیا بھر کی کل مصنوعاتی پیداوار کا ۳۳% سے زیادہ پیداوار کر رہا تھا۔ باہری ملکوں میں برطانیہ کی برآمدات تمام ملکوں سے زیادہ تھی۔ تکنیکی اور صنعتی علم بھی برطانیہ کی دسترس میں اور ملکوں کی بہ نسبت زیادہ تھا۔ سن ۱۸۵۷ میں ہندستانیوں کی شکست بنیادی طور پر صنعتی اور تجارتی طور پر بیحد ترقی یافتہ، سائنس اور تکنیک میں سب

آگے برطانیہ کے سامنے پچھڑے ہوئے۔ کھیتی باڑی اور چھوٹی صنعتوں پر منحصر ایشیائی معاشرے کی ہار تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے عوام کو سائنس اور تکنیکی کے میدان میں شعوری طور پر آگے بڑھایا ہوتا تو کیا ۱۸۵۷ کی جنگ میں ہندستان کی شکست کو ٹالا یا روکا جا سکتا تھا؟ یہ سوال آج بھی اہم ہے کیونکہ آج بھی یورپ اور امریکا تکنیکی میں ترقی یافتہ ہیں اور ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں تکنیکی پچھڑاپن موجود ہے۔ جاپان اور کوریا وغیرہ کی مثالیں استثنا ہیں۔ سائنس اور تکنیکی میں پچھڑے طبقے آج بھی کمزور ہیں۔

اودھ کے سماجی نظام میں جاگیردارانہ نظام حاوی تھا۔ پیداواری طبقہ نسبتاً کم تعلیم یافتہ تھا۔ پیداواری طبقہ تعلیم یافتہ ہو تو تکنیکی کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ اس سماج کے شرفا پیداواری شعبے سے سیدھے جڑے نہیں تھے۔ وہ پیداواری طبقوں کو کم حیثیت والا سمجھتے تھے۔ اس سوچ کی وجہ سے شرفا کا طبقہ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی پیداوار کی تکنیک میں سدھار لانے کی فکر یا حیثیت میں نہیں تھا۔ انگریزوں اور انگریزی تعلیم سے نفرت اور خوف کی وجہ سے شرفا صنعتی ترقی کے لیے پیداواری طبقے کی رہبری نہیں کر سکے۔ آج بھی پیداواری طبقہ نسبتاً کم پڑھا لکھا ہے۔ کیا ہمیں اس معاملے میں ایسا انتظام نہیں کرنا چاہیے کہ پیداواری طبقوں کو نئی تکنیکی جانکاری آسانی سے مل سکے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ اور اس کی منصفانہ تقسیم ہو سکے۔

اودھ کی تہذیب بنیادی طور پر درباروں اور درباداری سے متاثر تھی۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ براہ راست اس روایت کی تعمیر اور ترقی میں شامل نہیں تھا۔ اگرچہ عوام اس تہذیب سے متاثر تھے۔ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ تہذیب بڑے پیمانے پر عوام کے طبقوں کے موثر اشتراک سے بنی ہوتی تو کیا یہ تہذیب اور زیادہ مدت تک قائم رہ سکتی تھی۔

اودھ کی تہذیب نے جذباتی ہم آہنگی کو عوام و خواص کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا۔ اس تہذیب کے زوال پذیر ہونے سے ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی ہر مذہب کے بیچ فاصلوں کو بڑھاوا ملا ہے۔ ایک سی میٹھی زبان، یکساں رہن سہن ایک سی سوچ نے مختلف فرقوں کے فرق کے باوجود سب کو ایک ہندوستانیت کے رشتے میں پرو رکھا تھا۔ آزادی کے کچھ پہلے اور آزادی کے بعد عمل میں لائی گئی تقسیم کی پالیسی، جمہوریت میں حکومت حاصل کرنے کے لیے عوام کو موبی لائز کرنے کی ضرورت اور مادی وسائل کی نابرابر تقسیم نے شہریوں کے درمیان فرق کو نمایاں زیادہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم حکومت حاصل کرنے، اسے چلانے اور باقی رکھنے کے طور طریقوں اور سماجی و اقتصادی اداروں میں کیا ایسی تبدیلی نہیں کرنا چاہیں گے جس سے عوام کے طبقوں میں آپسی بھائی چارہ بڑھے اور عوام خوشحال ہو سکیں۔

اودھ کے زوال کی وجہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے اور نمائشی زندگی گزارنے کا وطیرہ بھی تھی۔ ہم آج بھی کئی معاملوں میں قومی سطح پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اگر اودھ کی حکومت بیجا اسراف کی وجہ سے کمزور ہوئی تو ہم آج کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے غیر ضروری اخراجات کا خراب اثر ہماری سماجی تنظیم پر نہیں پڑے گا۔ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

اودھ کے زوال کے پیچھے انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی بھی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں شیعہ سنی اور دیگر مسلک کے لوگوں کے بیچ اختلافات ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے سماج میں بکھراؤ پیدا ہوا اور اس کے خراب اثرات آج تک دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مذہب اور دھرم کے کٹر پنتھی رجحان کا اثر ہمارے موجودہ سماج پر بھی پڑ رہا ہے تو اسے کیسے روکا جائے۔ لکھنؤ کی تہذیب آپسی بھائی چارے، نفاست، شرافت نفس، وضعداری، فراخ دلی اور انسانیت کے رجحانات سے عبارت تھی۔ اودھ کی تہذیب کا محض یہ پہلو اسے احترام کے لائق بنانے کے لیے کافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ان پرانی لیکن بابرکت روایت کو کیا ہم لوگ دوبارہ زندگی کے ایجنڈے میں مرکزی جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اودھی تہذیب کا یہ رخ بیحد مفید اور سودمند ہے اور ہمیں اسے فروغ دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔

□□

"لکھنؤ کی کبوتر بازی، بٹیر بازی عام طور پر مشہور ہے جس پر آجکل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلدادہ اکثر تمسخر کیا کرتے ہیں وہ اس سے واقف نہیں کہ ان شوقوں اور کھیلوں میں سے ہر ایک کو ان لوگوں نے درجۂ کمال پر پہونچا کے ایک مستقل فن بنا دیا تھا۔"

عبدالحلیم شرر

بلاد و امصار

اودھ کے علاقے میں
صرف لکھنؤ ہی نہیں تھا
بلکہ اُس کے بلاد و امصار
میں بھی
وہ شمع روشن رہی، جس کی
تیز روشنی لکھنؤ میں
نظر آتی تھی۔

امجد حسین

جسٹس مرتضیٰ حسین

فیض آباد: ماضی اور حال کے آئینے میں

فیض آباد مشرقی اتر پردیش کے قلب میں واقع ہے جو لکھنؤ سے ایک سو چھبیس ۱۲۶ کلو میٹر پورب دریائے گھاگرہ کے اس حصہ کے دکھنی کنارے پر بسا ہوا ہے جو سرجو ندی کہلاتا ہے اجودھیا فیض آباد شہر سے چھ کلو میٹر پورب ہے۔ آبادی کے اضافے اور بہت سی نئی عمارتیں بن جانے کے سبب یہ فاصلہ اور بھی کم ہو گیا ہے۔ اس وقت فیض آباد اور اجودھیا ایک ہی میونسپلٹی کے حلقے میں ہیں۔

فیض آباد اور اجودھیا در حقیقت ایک ہی داستان کے مختلف حصے ہیں۔ اس لیے اجودھیا کے ذکر کے بغیر فیض آباد کا تذکرہ ادھورا رہے گا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں اودھ کا سارا علاقہ اجودھیا کہلاتا تھا اور اس کا رقبہ بارہ جوجن یعنی ۴۸ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ اجودھیا صرف ۶ میل کے رقبے میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیض آباد کا ضلع ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دیگر اضلاع کے علاقے عہد قدیم میں اجودھیا میں شامل تھے۔

ہندوؤں کے لیے اجودھیا ایک متبرک زیارت گاہ ہے۔ یہ کوشل خاندان کی راجدھانی تھی۔ بھگوان رام اسی خاندان کے تھے راجہ منو سے ستاون پشت بعد رام چندر جی کا اوتار ہوا اور راجہ ستترا پر جاکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ رام چندر کے زمانے میں اجودھیا کی شان و شوکت کے تذکرے رامائن اور مہابھارت کی مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔

سنت تلسی داس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "رام چرتر مانس" کے "اودھ کانڈ"، میں رام اور سیتا کی نگری اجودھیا کے بارے میں فرمایا ہے ؎

کہی نہ جائے کچھو نگر وبھوتی جنو اینو ورنچی کرتوتی

"نگری خوبی کا حال کچھ نہیں کہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برہما جی کی کاری گری اتنی ہی ہے اس سے پرے سنسار کچھ بھی نہیں ہے۔"

کوشل خاندان کی ایک سو اٹھاون پشتوں نے اجودھیا پر حکمرانی کی تھی۔ جین دھرم والوں کے لیے بھی اجودھیا ایک بڑا تیرتھ استھان ہے۔

اجودھیا مسلمانوں کی بھی زیارت گاہ ہے کیونکہ وہاں ۳ پیغمبروں یعنی حضرت نوحؑ، حضرت شیثؑ اور حضرت ایوب علیہم السلام کے مزار ہیں۔ سورج بنسی راجہ ستترا کے زوال کے بعد اجودھیا اُجاڑ ہوگیا اور اس کی سیاسی اہمیت ختم ہوگئی۔ گیارہویں صدی عیسوی تک اس کا کوئی تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سپہ سالار مسعود وہاں پہونچے۔ اس کے بعد یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کا حصہ ہوگیا۔ اور سپہ سالار مسعود افسانوی کردار بن گئے۔ اجودھیا سے بہرائچ جانے والی شاہراہ کے ایک حصہ کو اس علاقہ کے لوگ بالے میاں کے بے سر کی فوج کے قیام کی جگہ بتاتے ہیں۔

کوئی دو سال بعد جب دہلی سلطنت کا اودھ پر قبضہ ہوا تو اجودھیا اودھ کی راجدھانی بن گیا۔ پندرہویں صدی میں جون پور کے شرقی بادشاہوں نے اس علاقہ کو فتح کر لیا مگر ان کے زوال کے

بعد یہ پھر دہلی کی مرکزی سلطنت کا حصہ ہو گیا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ان کی پوری مملکت بارہ صوبوں میں منقسم تھی جن میں اودھ کے صوبے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت یہ صوبہ مشرق میں بنارس تک اور مغرب میں بریلی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس صوبے کا گورنر اجودھیا میں رہتا تھا۔ عہد اکبری میں ہی یہ صوبہ شیخ زادوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب سلطنتِ مغلیہ پر زوال آنا شروع ہوا تو شیخ زادوں نے جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ اس زمانے میں شیخوں اور پٹھانوں کے درمیان لڑائیوں کے واقعات بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔

فیض آباد کی کہانی نے ۱۷۲۲ء میں اس وقت ایک فیصلہ کن موڑ لیا جب سلطنتِ مغلیہ کی مرکزی حکومت نے شیخ زادوں کی سرکوبی کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر سید محمد امین نیشاپوری کو اودھ کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اجودھیا کی آبادی سے ذرا ہٹ کر لچھمن گھاٹ کے مقام پر سرجو ندی کے کنارے، گھوڑے کے جنگل میں انتظام حکومت کی خاطر خیمے نصب کرائے جنھیں "قلعہ مبارک" کا نام دیا گیا برسات کا موسم آیا تو کچھ اور ہٹ کر ایک وسیع چھپر ڈلوایا۔ اس کے گرد ایک بڑے رقبے میں کچی دیواروں کا بہت بڑا حصار بنوایا جس کے اندر خام دیواروں کی چھپر پوش عمارتوں میں فوجی رسالے اور عملے کے لوگ اور دیگر متعلقین رہنے لگے۔ یہ حصار ایک چھوٹا سا شہر تھا جس میں فوجی اور شہری ضرورتوں کی ہر چیز مہیا تھی چھپروں اور کچی عمارتوں کی وجہ سے اس شہر کا نام "بنگلہ" پڑ گیا۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے اور داماد صفدر جنگ اودھ کے دوسرے نواب ہوئے۔ ان کے زمانے میں برہان الملک کی بنوائی ہوئی کچی عمارتوں کے دن پھرے۔ پھاٹک بنے بازاریں سجیں، حویلیاں کھڑی ہوئیں۔ پر فضا نزہت گاہیں قائم ہوئیں اور بنگلہ کا نام تبدیل ہو کر فیض آباد ہو گیا۔

شجاع الدولہ اودھ کے تیسرے نواب ہوئے ان کا دل فیض آباد سے اچاٹ ہوا اور لکھنؤ پر ریجھا مگر یہ عشق ان کو راس نہ آیا۔ انگریزوں سے ان کی لڑائی ٹھنی ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں انھوں نے شکست کھائی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ کر فیض آباد آئے۔ قلعہ میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا اسے کر راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہونچے اور وہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا ساتھ لیا اور بریلی کی راہ لی تاکہ روہیل کھنڈ کے افغانوں کے ساتھ جا کر پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے کے بعد شجاع الدولہ کی انگریزوں سے صلح ہوئی اور کچھ شرائط و قیود کے بعد ان کو دوبارہ اودھ میں حکمرانی کا موقع ملا۔ صلح سے کچھ پہلے شجاع الدولہ اتفاق سے فرخ آباد پہونچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک تجربہ کار سپہ سالار احمد خاں بنگش سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شجاع الدولہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اب کی جو عنانِ حکومت سنبھالو تو لکھنؤ میں نہ رہنا بلکہ فیض آباد کو دار الحکومت بنانا یہ مشورہ شجاع الدولہ کو پسند آیا اور انھوں نے سترہ سو پینسٹھ ۱۷۶۵ء میں فیض آباد کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ یہاں انھوں نے پھر سے فوجی بھرتی شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کیے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پرانے حصار کو ایک نئے شہر پناہ کی حیثیت سے از سر نو تعمیر کرایا۔ اس حصار کے ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ کر چاروں طرف گہری خندق کھدوا کر قلعہ بندی کرائی اور ملازمین سرکار اور افسرانِ فوج کو حکم دیا کہ اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق قطعاتِ زمین لے کر شہر پناہ اور خندق کے درمیانی میدان میں مکانات تعمیر کرائیں۔

شجاع الدولہ بڑے بیدار مغز حکمراں اور اعلا صلاحیتوں کے انسان تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی عالی شان عمارتوں میں سے کچھ گر گئی ہیں مگر اس دور کی جو عمارتیں اب بھی موجود ہیں ان میں بہو بیگم صاحبہ کے مقبرہ کو چھوڑ کر سب شجاع الدولہ کے زمانے کی ہیں۔ کچھ ان کی خود بنوائی ہیں اور کچھ ان کے متوسلین کی۔

انھوں نے بہت سے باغ بھی لگوائے تھے جن میں سے انگوری باغ، موتی باغ، لال باغ، آصف باغ اور بلند باغ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان باغات میں لال باغ کے حسن و دلکشی کی اتنی شہرت تھی کہ شہنشاہِ دہلی شاہ عالم جب اللہ آباد سے پلٹے تو اس باغ کی سیر کے

شوق میں فیض آباد گئے اور وہاں کچھ روز قیام کیا۔ چوک سے پچھم جانے والی سڑک پر نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں دو رویہ املی کے پیڑ لگے تھے۔ یہ جگہ اب بھی املی کی قطار کے نام سے موسوم ہے۔

نواب شجاع الدولہ کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ وہ صبح و شام سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے تھے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیکران کی سواری کے ساتھ ہوتے تھے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا یا اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دکاندار کو دیکھتے کہ اس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے تو فوراً کھدوا کر برابر اور سیدھا کرا دیتے۔ انھوں نے شعر و ادب، موسیقی رقص اور دیگر فنون لطیفہ کی بھی ہمت افزائی کی۔ صاحبان علم و ہنر کی انھوں نے ایسی قدر شناسی کی کہ اجڑی ہوئی دہلی اور دیگر مقامات کی ساری خلقت فیض آباد کی طرف لوٹ پڑی اور وہاں کی علمی ادبی، ثقافتی اور سماجی عظمتیں اس وقت کے شاہجہاں آباد کو آنکھیں دکھانے لگیں۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش نے عہد شجاع الدولہ کے فیض آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب میں پہلے پہل گھر چھوڑ کر فیض آباد گیا ہوں۔ ستاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر تھا میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے مٹھائیاں، گرم گرم کھانا کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے وغیرہ پک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری کے لیے ان دوکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گذرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں مگر تحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہونچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا جناب شہر کا پھاٹک ابھی چار میل ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور دلچسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشا کر رہے ہیں۔ وہ لوگ طرح طرح کے سیر اور تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک کوئی وقت نہ ہوتا جب نوجوانوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہروں اور گھڑیوں کے جتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیال پر موگریاں پڑتیں جن کے شور و غل سے کان اڑے پڑتے سڑکوں پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں اونٹوں، خچروں، شکاری کتوں گائے بھینسوں، بیلوں، چھکڑوں اور توپوں کے گذرنے کا سلسلہ جاری رہتا جن کا شمار اور حساب اندازے سے باہر تھا اور راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق اور تمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضعداران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف شہزادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلا درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے اور عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنی اور اعلاسب کی جیبیں روپیوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بلکہ ایسا نظر آتا جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو۔ نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی خوشحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد چند ہی روز میں دہلی کی ہمسری کا دعوا کرے گا۔

چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح نواب شجاع الدولہ رہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا تھا کہ کہیں لوگ اس بے جگری سے ہر کام اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو تیار نہیں ہو جاتے تھے اس لیے ہر قسم اور ہر جگہ کے اعلا دست کاروں، صناعوں اور طالب علموں نے وطنوں کو خیر باد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بھاری گروہ موجود رہتا جو علما کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے اور اس سرچشمۂ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا سیراب ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ سال جی جاتے تو گھاگھرا کے کنارے ایک نیا شاہجہان آباد ہو جاتا اور دہلی

ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔“

نو سال کی حکمرانی کے بعد ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا انھیں کی بنوائی ہوئی ایک عمارت ان کی آخری آرام گاہ بنی جو گلاب باڑی کے نام سے آج بھی فیض آباد کی کھوئی ہوئی عظمتوں کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ ان کے چمن کے گلاب دور دراز تک مشہور رہیں۔

آصف الدولہ اودھ کے چوتھے فرماں روا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت بنا لیا۔ اس لیے ان کے تخت نشین ہوتے ہی فیض آباد خالی ہونے لگا۔ حاکم کے ساتھ ہر وہ محکوم چلا گیا جو جا سکتا تھا۔ فیض آباد اجڑتا رہا اور لکھنؤ بستا رہا۔ حتی کہ محلوں، بازاروں اور باغوں کے نام بھی فیض آباد سے لکھنؤ چلے گئے۔ فیض آباد میں رکنے والی ایک گراں قدر ہستی آصف الدولہ کی والدہ محترمہ امۃ الزہرا بیگم صاحبہ کی تھی جن کا خطاب بہو بیگم تھا۔ ۱۸۱۶ء میں ان کی وفات ہوئی اور وہ اس مقبرہ میں دفن ہوئیں جو بہو بیگم کا مقبرہ کہلاتا ہے اور بلاشبہ فیض آباد کی سب سے پُر شکوہ عمارت ہے۔ ادھر عرصہ سے اس کی باہری چونہ کاری نہیں ہوئی ہے جس کے سبب یہ عالیشان عمارت سیاہ پوش ہو کر ذمہ داروں کی تغافل کیشی کا ماتم کر رہی ہے۔

گلاب باڑی کے علاوہ عہد شجاع الدولہ کی عمارتیں جو اب بھی قائم ہیں ان میں چوک کا وہ مرکزی حصّہ ہے جو ترپولیا کہلاتا ہے اس کی مختلف سمتوں میں اونچے اونچے عالی شان در بنے ہوئے ہیں۔ چوک کے بیچو بیچ لوہے کا ڈھلا ہوا گھنٹہ گھر ہے جس کی سوئیاں کبھی وقت کا صحیح طور پر ساتھ نہ دے سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ بلرام پور کے مہاراجہ نے برطانی عہد میں اسے لگوایا تھا۔ گھنٹہ گھر کے مغرب میں ایک عالیشان مسجد نواب شجاع الدولہ کے ایک عہدے دار حسن رضا خاں کی بنوائی ہوئی ہے جو چوک کی مسجد کہلاتی ہے۔ مسجد کے شمال میں ایک بخشتہ سرائے ہے جس میں اب ترکاری منڈی ہے۔ اسی زمانے میں ایک کوٹھی چھاؤنی کے علاقہ میں گپتار گھاٹ کے پاس ہے جو محکمۂ زراعت کے قبضہ میں ہے۔ دوسری کوٹھی دریا کے کنارے دل کشا کوٹھی کے نام سے ہے جس میں محکمۂ افیون کا دفتر ہے۔ امام باڑہ جواہر علی خاں کا مقبرہ موتی مسجد اور وثیقہ اسکول کی مسجد بھی شجاع الدولہ کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔

اب سے قریب ساٹھ سال پہلے جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو چوک کی مسجد کے چاروں طرف اور گھنٹہ گھر کی ہر سمت میں نیچی نیچی دوکانیں تھیں، جن کے آگے ٹین کے سائبان تھے۔ گھنٹہ گھر کے مشرق میں ایک قطار چھپر کی دوکانوں کی تھی جن میں گرمی میں شربت اور جاڑوں میں چائے ملتی تھی۔ انھیں دوکانوں میں اور ان کے آس پاس خونچوں والے مٹی کے سکوروں میں کھیر اور ایک خاص قسم کی چائے کے ساتھ استعمال ہونے والے بسکٹ بیچتے تھے جو ”پاپے“ کہلاتے تھے۔ کھیر کے پیالے فیض آباد کے چوک میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر ”پاپے“ نہیں ملتے۔ جس کا سبب یہی ہے کہ اب نئے نئے قسم کے بسکٹ بنانے کی فیکٹریاں کھل گئیں ہیں۔ مذکورہ بالا چھپر کی دوکانوں سے اُتر لوہے کا ایک گول کٹہرہ تھا جس میں ہفتے کے مقررہ ایام میں عیسائی مبلغین کھڑے ہو کر اپنے مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

مسجد کی اتری دوکانوں میں ایک دوکان بھیکو حلوائی کی تھی جس کی رابڑی بہت مشہور تھی۔ چوک کی مسجد کے سامنے سڑک کی پٹری پر پھولوں کے ہار اور گجرے بکا کرتے تھے۔ بنی خانم کا مقبرہ میں نے ہمیشہ ویران دیکھا۔ خورد محل کے نشانات بھی مٹ چکے۔ وہاں میں نے ایک چھوٹی سی درگاہ دیکھی تھی جس میں ایک کمرخ کا پیڑ تھا۔ اس مناسبت سے وہ کمرخ کی درگاہ کہلاتی تھی۔ اب وہاں ایک بہت بڑی درگاہ بن گئی ہے۔ موتی محل میں قدیم پھاٹکوں اور دیواروں کے آثار اب بھی اپنی زبانِ بے زبانی سے ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنادید عجم را

گُنار ہے ہیں۔

جواہر علی خاں کا امام باڑہ فرقۂ شیعہ کے امور مذہبی کی ادائگی کا مرکز ہے اسی کے احاطہ میں ان لوگوں کی جامع مسجد ہے۔ موجودہ پیش امام مولوی ابن حسن صاحب قبلہ کی کوششوں سے اس مسجد کی از سرِ نو تعمیر اور تزئین ہو گئی ہے۔ حضرات اہل سنت کی جامع مسجد ”ٹاٹ شاہ کی مسجد“ کے نام سے مشہور ہے۔ موتی مسجد کے پاس وسیع احاطہ میں حکیم نواب شجاع الدولہ مرحوم کے خاندان کے لوگ وثیقہ اسکول کی

مسجد کے احاطے میں عرصۂ دراز سے ایک عربی اسکول بہو بیگم صاحبہ کے وثیقہ کی آمدنی سے قائم ہے۔

سرکٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، کچہریوں کی عمارتیں اور مردہ عجائب گھر جس کی عمارت میں اب محکمۂ پلاننگ کا دفتر ہے انگریزی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس طرف آواس وکاس اور محکمہ تعمیراتِ عامہ کے زیر اہتمام بہت سی رہائشی کالونیاں بن گئی ہیں۔

اجودھیا کے تقدس کی ضمانت وہ پرانے مندر ہیں جو رام کوٹ لچھمن مندر، ہنومان گڑھی، منی پربت، سورگ دروازہ اور گپتار گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔

گپتار گھاٹ کی مذہبی اہمیت کے بارے میں کہاوت ہے کہ یہیں پر سرجو ندی میں ڈوب کر بھگوان رام نے اپنی جیون لیلا ختم کی تھی۔

ان تمام متبرک مقامات کی رونق رام نومی، جنم اشٹمی، دسہرہ اور دیگر تہواروں کے موقعوں پر سجاوٹ اور عقیدتمندوں کی آمد نیز مذہبی رسوم کی ادائگی کے ذریعہ دوبالا ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کا مرکز اجودھیا کا ایک قبرستان ہے جس میں کئی لمبی لمبی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر حضرت شیث پیغمبر کی بتائی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی نو گز ہے وہاں ہر سال میلے کی شکل میں عُرس ہوتا ہے۔

فیض آباد اور اجودھیا کے درمیان سڑک سے کچھ دکھن ہٹ کر ایک مقام ہے جہاں ایک بہت پرانی اور وسیع مسجد کے کچھ کھنڈر اور پرانی قبریں ہیں۔ یہ جگہ وہیں کی ایک صاحب قبر "بڑی بوا" کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی عبادت گزار اور اللہ والی بی بی تھیں۔ قدرت نے ان کو حسن ظاہری بھی عطا فرمایا تھا۔ اس زمانے کے شہر کوتوال نے ان سے شادی کرنا چاہی مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ کوتوال نے کچھ عالموں اور بزرگوں کو بیچ میں ڈالا مگر ناکامیاب رہا۔ تب اس نے ان معظمہ سے زبردستی شادی کرنے کی ٹھانی اور انھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے کوتوال سے دریافت کرایا کہ اس کو ان میں کون سی ایسی کشش نظر آئی جس سے وہ اتنا بضد اور ظلم وجور پر آمادہ ہے۔ اس نے جواب کہلایا کہ اس کو ان کی آنکھیں بہت پسند آئیں۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دونوں آنکھیں نکال کر ایک پتّے پر رکھیں اور خادمہ کے ہاتھ کوتوال کو اس پیغام کے ساتھ بھجوا دیں کہ تجھے جو چیز پسند ہے وہ حاضر ہے مگر یاد رکھنا کہ فیض آباد میں اب کوئی عالم رہے گا نہ ظالم۔ کیا عجب کہ ان کے دل سے نکلی ہوئی اس آواز ہی کا اثر ہو کہ فیض آباد کی پوری تاریخ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے بھری ہوئی اور ظلم وستم کی کہانیوں سے خالی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں کے دل کی پکار کا یہ سبب ہو کہ فیض آباد میں پیدا ہونے والا اہلِ صاحب علم وکمال مہر عالم تاب کی مانند ابھرا تو مشرق سے مگر چمکتا ہوا مغرب کی طرف بڑھا اور اسی سمت غروب ہو گیا۔

شعر وادب، موسیقی، کھیل کود اور سیاست کے میدان میں بھی فیض آباد کا بلند مقام رہا ہے۔ ناخدائے سخن میر ببر علی انیسؔ ان کے صاحبزادے میر نفیسؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، نواب سید محمد خاں رندؔ میر علی اوسط رشکؔ، پنڈت برج نرائن چکبستؔ اور امیر اللہ تسلیمؔ وغیرہ مملکت شعروادب کے وہ تاجدار ہیں جن کو جنم دینے پر سرزمین فیض آباد ہمیشہ ناز کرے گی۔ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں میر انیسؔ مرحوم کے مکان میں فیض آباد کی میونسپلٹی نے کانجی ہاؤس بنالیا تھا۔ سید اظہر علی عرف مولوی اچّھو صاحب مرحوم سید اظہر حسین صاحب مرحوم ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور ان کے رفقائے کار کی مساعی جمیلہ کی بدولت وہاں پر ایک ادبی مرکز قائم ہو گیا ہے جس کے ایک حصہ میں فیض آباد کے شمس وقمر انیسؔ وچکبستؔ کے نام سے ایک لائبریری بھی ہے۔

مرزا جعفر حسین جو ادب، صحافت نیز تصنیف وتالیف کے میدانوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے فیض آباد ہی کے تھے۔

ملکۂ غزل اختری بائی بھی جو بعد میں بیگم اختر کے نام سے مشہور ہوئیں فیض آباد کی تھیں۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں میں فیض آباد چھاؤنی کے محلہ لال کرتی کے دو بھائی ولی محمد اور نور محمد اپنے وقت کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ہاکی کے کھلاڑیوں میں براؤن ہیرا اور شین الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ پنالٹی کارنر جانے پر گول کرنے میں متین صاحب کو بڑی مہارت تھی۔ فیض آباد میں ان کھیلوں کا اب بھی چلن ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں بھی فیض آباد کا پورا حصہ رہا

گل رہا ہے۔ فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے ۱۸۵۷ء کی اس لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا مگر دراصل وہ جنگ آزادی کی پہلی لہر تھی۔ وہ ایک درویش تھے اور مولوی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ انگریزی سرکار کو ہلا دیا تھا۔ ان کی قیادت میں باغیوں نے انگریزی فوج سے جگہ جگہ لڑ کر ان کے دانت کھٹے کر دیے تھے بالآخر اپنے ہی ایک ساتھی کی غداری سے ان کا کٹا ہوا سر انگریزوں کو ملا اور انھوں نے اسے شاہجہاں پور کی کوتوالی کے دروازے پر لٹکایا۔ ان کی موت کی خبر جب انگلستان پہنچی تو انگریزوں نے چین کی سانس لی کیونکہ ان کی نگاہ میں شمالی ہندستان میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

علم و سیاست کے میدانوں میں یکساں پیش رفت کرنے والی فیض آباد کی دو نمایاں ہستیاں مولانا حسین احمد مدنی اور اچاریہ نریندر دیو ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب انگریزوں کے خلاف پورے ملک میں نفرت کے جذبات پھیلے ہوئے تھے مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے پیر و مرشد مولانا محمود الحسن کے ساتھ ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ انھوں نے ترکی اور دیگر عرب ممالک میں جاکر ہندوستان کی آزادی کے لیے فضا ہموار کی تھی۔ وہ جمعیۃ علمائے ہند اور دیوبند کے مدرسہ کے بانیوں میں بھی تھے۔ اچاریہ نریندر دیو سوشلسٹ طرز فکر کے حامی تھے۔ جنگ آزادی میں جیل گئے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ ابھی حال میں فیض آباد میں ان کی یاد میں ایک بہت اچھا ہال "نریندر ہالیہ" کے نام سے بن گیا ہے۔ ایک اور کل ہند سطح کی قابل ذکر سیاسی شخصیت ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی تھی جو فیض آباد کی تحصیل اکبر پور کے موضع شہزاد پور میں پیدا ہوئے تھے۔

میرے تعلیمی دور میں فیض آباد شہر میں دو ہائی اسکول اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھے تحصیلوں میں بھی ہائی اسکول تھے۔ اب جگہ جگہ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کالج اور متعدد ڈگری کالج ہیں شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے ایک زراعتی ہے اور وہ آچاریہ نریندر دیو کے نام سے منسوب ہے اس کے علاوہ پالی ٹکنک اور آئی ٹی آئی بھی قائم ہیں۔

فیض آباد کی قدیم صنعتوں میں پہلے قصبہ ٹانڈہ اور اس کے نواح میں جامدانی اور ڈوریا کی بنائی کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اب وہاں پرانی چال کے کپڑوں میں تہبند اور رانگوچھے وغیرہ بنتے ہیں اور نئی قسم کے ٹیریکاٹ اور دیگر اچھے کپڑے بُنے جاتے ہیں۔

فیض آباد شہر میں لکڑی کے صندوقچے، قلمدان، عطردان اور سنگاردان بہت اچھے بنتے تھے جن پر پیتل کے نفیس کام کی پھول پتیاں بنی ہوتی تھیں اب اس کام کا صرف ایک کارخانہ رہ گیا ہے۔ کھانڈ بنانے کا کام پہلے شہر کے محلے کانڈو ٹولہ میں بہت ہوتا تھا اب وہاں رام دانے اور مُرمُرے کی لیّا، شکر کے گٹے اور بتاشے بکثرت بنتے ہیں۔ ناریل کے حقے جنھیں گڑگڑا کہتے ہیں وزیر گنج کے محلے میں بنتے تھے اور چوک میں گھنٹہ گھر کے دکھن میں ان حقوں کی کئی دکانیں تھیں۔ اب یہ کام نسبتاً کم ہو گیا ہے اور چوک میں ناریل کے حقے کی صرف ایک دوکان ہے۔ تمباکو کی کاشت اجودھیا اور اس کے آس پاس بہت کافی رقبہ میں ہوتی ہے۔

قصبہ مبارک پور کی لکڑی کی کھڑاویں پہلے بہت مشہور تھیں فیض آباد میں اب بھی کہیں کہیں لکڑی کی کھڑاویں بنانے کی دکانیں ہیں۔ سینگ کی کنگھیاں پہلے کی طرح اب بھی فیض آباد میں بنتی ہیں اور باہر جاتی ہیں۔ اس طرف فیض آباد میں بیڑی بنانے اور جوتہ و چپل سازی کے کام کو بہت فروغ ہو گیا ہے۔ جوتہ سازی کے لیے فیض آباد مشرقی یوپی کا آگرہ کہا جا سکتا ہے۔ حکومت کا محکمہ انڈسٹریز فیض آباد میں جدید صنعتوں کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ مسودہ میں ایک شکر مل اور اکبر پور میں سوت کی کتائی کی مل کھل گئی ہے۔ ترکاریوں کے بیج کا کام اب فیض آباد میں اعلا پیمانے پر ہوتا ہے۔ سیکڑوں کمپنیاں اس کام کو کر رہی ہیں۔ اور فیض آباد میں تیار کیے ہوئے بیج نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں بلکہ بیرونی ممالک کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔

پھلوں میں امرود، شریفہ اور بیر فیض آباد میں اچھے اور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے ریتی کے علاقے میں ترکاریاں بہت پیدا ہوتی ہیں جن میں بڑے سائز کے بنڈے خصوصیت کے ساتھ

مشہور ہیں۔ وہاں کے تربوز کافی بڑے اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔

فیض آباد کے تذکرے کے ساتھ وہاں کی ضلع جیل بھی قابل ذکر ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑے رقبے میں ہے میرے بچپن میں اس کے چاروں طرف کی سڑکیں زیادہ تر سنسان رہتی تھیں اور رات کو ان سڑکوں پر کھمبوں میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلا کرتی تھیں اب وہ سڑکیں کافی مشغول رہتی ہیں۔ اسی جیل میں عظیم انقلابی اشفاق اللہ خاں کو ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی تھی اور انھوں نے تختۂ دار چومتے وقت اپنی اس آخری خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ؎

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

گورنمنٹ کالج کے ایک استاد مولوی عبد اللہ مرحوم تھے جن کا تعلق افغانستان سے تھا انھوں نے اشفاق اللہ خاں مرحوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جب انھوں نے اشفاق اللہ خاں کی لاش پر ان کے کاندھے سے لٹکا ہوا کلام پاک دیکھا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

سوئے جاناں می روم
پیغام جاناں در بغل

فیض آباد ہی کی جیل میں مولانا حسرت موہانی، لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی، اجیت پرشاد جین، جگن پرشاد راوت، گوپال نرائن سکسینہ، بابا راگھو داس، ٹھاکر وسودھا سنگھ، ڈاکٹر جتیلے، جے رام ورما، ہرگووند سنگھ اور بندا باسنی پرشاد سنگھ وغیرہ نے قید و بند کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔

فیض آباد کی آبادی ہمیشہ سے مخلوط رہی ہے۔ وہاں ہندوؤں مسلمانوں اور کشمیری برہمنوں کے مقتدر گھرانے زمانۂ قدیم سے مل جل کر رہتے ہیں۔ تقسیم وطن کے بعد بہت سے قدیم مسلم گھرانے ہجرت کر گئے اور پاکستانی مہاجرین کثیر تعداد میں آکر آباد ہو گئے۔ ان کے آنے سے نئے مکانوں اور شاندار دوکانوں کا اضافہ ہوا اور ہر قسم کی تجارت کو فروغ ملا۔ ان کے زیر اثر پرانی دکانوں نے بھی نئے چہرے نکال لئے۔ آج کا فیض آباد ہمارے صوبے کی ایک کمشنری ہے وہاں پرانی آبادیاں بھی قائم ہیں اور نئی آبادیاں بھی جھلک رہی ہیں۔

تہذیب

"لکھنؤ میں جس تہذیب کا ارتقا ہوا، اس میں نفاست، دل کشی اور صناعت کمال کے درجے کو پہونچ گئی تھی۔ یہاں کے آداب و اسالیب میں ایسی جادو گرانہ تاثیر تھی کہ پڑھ کر اس سے عقیدت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ان آداب کی کہیں جھلک دکھائی دے جاتی ہے تو بے ساختہ تقلید کو جی چاہتا ہے ___ اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ شائستگی کا ایسا انداز ہے جس کو زندگی کا جزو ہونا چاہیے۔"

رشید حسن خاں
(تعارف گزشتہ لکھنؤ عبد الحلیم شرر)

لئیق اختر فیض آبادی

فیض آباد کی تہذیبی روایات

یادش بخیر — اودھ کا قدیم دارالسلطنت فیض آباد کبھی اپنی گنگا جمنی تہذیب، اپنی بے مثال ثقافت، اپنی شاندار روایات اور اپنی عدیم المثال قومی یکجہتی کا مرکز تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ کوئی تفرقہ تھا، نہ مزاجی تضاد، نہ کوئی بھید بھاؤ تھا، نہ کوئی اُتار چڑھاؤ۔ تیوہار دونوں مل جُل کر مناتے، شادی اور غمی میں دونوں برابر کے شریک ہوتے۔ ہندو کی خوشی مسلمان کی خوشی ہوتی تھی، مسلمان کا غم ہندو کا غم ہوتا تھا۔ شب برات کے حلوے، عید کی سوئیاں، ہندو بھائیوں کے گھر جاتی تھیں، دیوالی کی مٹھائیاں، مٹی کے کھلونے، شکر سے بنی رنگین لوزآتیں مسلمانوں کے گھروں میں آتی تھیں، دسہرے کے جلوس اور بھرت ملاپ دونوں میں بخلوص دل شامل رہتے۔

تقسیم وطن کے بعد ہر طرف بھیانک فساد کے شعلے بلند ہوئے لیکن فیض آباد میں تقسیم وطن کا ہلکا سا بھی اثر نہیں پڑا۔ دونوں طرف کے خواص وعوام کبھی بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کے شکار نہیں ہوئے۔ یہاں امن کا گلشن ہرا رہا اور شانتی کا چمن کھلا رہا۔ نہ سینے تنگ ہوئے اور نہ ذہن محدود ہوئے۔

مجھے یاد ہے کہ جب کچھ مسلمان جانب پاکستان ہجرت کرنے لگے تو ہندو عورتوں نے مسلمان عورتوں کو اور ہندو مردوں نے مسلمان مردوں کو گلے لگا کے اور اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کر کے ترکِ سکونت سے روکنا چاہا۔ جب جانے والے نہ مانے تو لالہ رام داس نے ساتھ میں جانے والی ایک ناکتخدا صاحبزادی کی ماں کو ایک جوڑ خالص سونے کے کنگن، ایک سونے کا نیکلس اور ایک سونے کی نتھ موتیوں سے بھری دے کر کہا،

"بٹیا! جب دیارِ غیر میں میری اس نواسی کا بیاہ کرنا تو میری طرف سے اسے دے دینا۔"

تاریخ اودھ اور وہ محضر نامہ بہ زبان فارسی اس حقیقت کا شاہد ہے کہ ہنومان گڑھی (ایودھیا) کی تعمیر میں نواب شجاع الدولہ کا کتنا ہاتھ تھا، چار محال ہنومان گڑھی کے نام لکھے تھے۔ وہ علمائے کرام، حکمائے وقت اور ساتھ ہی ساتھ سنتوں، سادھوؤں کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔

ایک تھے حکیم حاذق، ماہر نباض، بے مثال شاعر پیارے صاحب مرحوم۔ ان کے مطب میں عوام و خواص کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ بلا تفریق مذہب و ملت راجے مہاراجے، امرا، رؤسا، غربا، مساکین سب ہی ان کے مرہون منت تھے۔ باوضع، ملنسار، رحم دل، خوش مزاج، شیریں زبان۔ غریب مریضوں سے نہ دوا کے دام لیتے تھے اور نہ فیس لیتے تھے بلکہ زیادہ تر مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ خدا نے ایسی شفا ان کے ہاتھ میں عطا کی تھی کہ جس کو بھی ایک چٹکی خاک چٹا دیا کرتے تھے وہ شفایاب ہو کر ہر ایک سے کہتا پھرتا کہ

ایک چٹکی خاک کی کچھ ایسا کام آئی کہ بس

جب حکیم پیارے صاحب مرحوم ٹانگے پر بیٹھ کر نکلتے تھے تو گزرگاہ میں جو بھی ملتا وہ باادب فرطِ عقیدت سے سلام کرتا۔ ان کے دولت کدے

کے قریب ایک محلّا رلی دروازہ ہے جہاں ان کے عہد میں بھی اور آج بھی بڑے بڑے مہاجن رہتے ہیں۔ تمام مہاجن حکیم صاحب مرحوم کو دیوتا کی طرح پوجتے تھے ــــ دوسری طرف عالمی شہرت کے سیاسی رہنما اچاریہ نریندر دیو جی تھے، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا امیر کیا غریب، کیا حکام، کیا حکام رس ــــ سب ہی ان کے پرستار، ان کے نام کی پوجا کرنے والے۔

آنجہانی اچاریہ نریندر دیو جی کے بھائی تھے ڈاکٹر دیوا ــــ صبح سے شام تک ان کے مطب میں مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ غربا کو دوا مفت دیتے گورے چٹے، کم سخن، مسکراتا چہرہ، ہمہ وقت لبوں پر تبسّم۔ ایک باپ، ایک بڑے بھائی اور ایک مُربّی کی طرح ہر مریض سے سلوک کرتے۔ دُور دور سے مریض آتے اور شفایاب ہو کر جاتے تھے ــــ اگر کسی محلّے میں ایک مریض کو دیکھنے جاتے تو محلے کے بہت سے مریض بھی وہاں جمع ہو جاتے۔ ڈاکٹر دیوا ہر مریض کو بڑے چاؤ، بڑے پیار سے دیکھتے۔ نہ ان کے ماتھے پر شکن پڑتی نہ ان کے ابروؤں پر بل۔

میرے ایک عزیز تھے مولوی محمد اختر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب اور محمد اختر دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ روزانہ ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا، آندھی آئے، پانی جائے لیکن کیا مجال جو ناغہ ہو جائے۔ جب میرے انہی عزیز کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر دیوا تصویرِ غم بن گئے تھے۔ عزیز کے گھر سے قبرستان تک ڈاکٹر دیوا نے جو جنازے کو کندھا دیا تو بدلا نہیں، روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"ہائے اختر! اب تمھارے بعد کیسے زندہ رہوں گا۔؟"

مولوی سید محمد اختر صاحب کے جنازے میں ہزاروں سوگوار شریک تھے۔ میں نے فیض آباد کی رواداری، اتحادِ باہمی، قومی یک جہتی اور تہذیبی روایت کو بچشمِ خود دیکھا تھا کہ جب اختر صاحب مرحوم کی میت دفن کی گئی تو ڈاکٹر دیوا نے ایک مٹھی خاکِ قبر اٹھا کر اپنے آنسوؤں سے تر رومال میں یہ کہہ کر باندھ لیا تھا:

"تمھارے بعد اب یہ خاکِ قبر میرا سرمایۂ حیات رہے گی۔"

ایک تھے نواب محمد رضا مرحوم، بوٹا سا قد، ہر بزم کی رونق، ہر محفل کی زینت، ہر دل کے مکین، ہر زبان کے ساکن، ماہرِ علمِ موسیقی، پاٹ دار آواز، جب وہ سُر تال کے عالم میں ہوتے تھے تو شعلے سے لپک جاتے تھے، اچھے اچھے موسیقاروں کا پتّا پانی ہوتا تھا ان کے روبرو، مرحومہ بیگم اختر کی والدہ مشتری ان کا بڑا احترام کرتی تھیں، جہاں جاتے تھے انھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ وہ پیشہ ور موسیقار نہ تھے، احباب کی جب بھیڑ تھی تب وہ آواز کا جادو جگاتے، ایرو غیروں کی محفلوں سے وہ اجتناب کرتے۔ ہر خاص و عام میں مقبول بھی اور محبوب بھی۔ فن کی وجہ سے نہیں حسنِ اخلاق، شرافتِ نفسی، نیازمندی، خاکساری کی وجہ سے۔ مرحوم محمد رضا کے ایک دوست تھے لالہ ستدی ــــ بانکے سجیلے، بلا کے خوب رو، بہت شستہ اور فصیح اُردو بولتے تھے۔ قیمتی دھوتی، کرتا، قیمتی جوتے پہنتے تھے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا میں چاندی کے ورق سے بنی سنوری پان کی گلوریاں ہوتی تھیں ــــ چاندی کی گول مول ننھی سی ڈبیا میں خانہ ساز قوام۔ جدھر سے گزر جاتے وہ راستہ دیر تک قوام کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتا رہتا۔ اودھ کی شام جیسے ہی اپنی چھب ڈھب دکھانے کے لئے فیض آباد میں نمودار ہوتی لالہ ستدی بیلے، چمیلی موگرے کے موٹے موٹے گجرے اپنی کلائیوں میں باندھ لیتے۔

نواب محمد رضا مرحوم اور آنجہانی لالہ ستدی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے، ساتھ اٹھنا، ساتھ بیٹھنا، ہم خیال، ہم مزاج، ہم مشرب ــــ کبھی کبھار اگر کوئی منہ لگا دوست ان دونوں کے یارانے پر مزاحیہ جملہ کس دیتا تو نواب محمد رضا مرحوم مسکرا دیتے لیکن آنجہانی لالہ ستدی نہلے پر دہلا پھینکتے:

"اجی حضرت! آپ کیا جانیں اس یاری کا کیف۔ جب تک ہندو کی "ہ" بے یار و مددگار تھی، بیچاری ہونق ہونق پھرا کرتی تھی۔ یہی حال مسلمان کی "م" کا تھا۔ نہ کوئی اس کا معین تھا نہ کوئی محبت کرنے والا، ماہیِ بے آب تھی۔ جب سے ہندو کی "ہ" اور مسلمان کی "م" ملی ہے "ہم" کی چاندنی دوستی کے کھلے صحن میں چھٹک اٹھی ہے۔"

نوابِ محمد رضا مرحوم اپنی عقبیٰ سنوارنے کے لیے خاص خاص مجالس میں سوز خوانی کرتے اور شہدائے کربلا علیہم السّلام کے چہلم کے دن قلبِ شہر میں واقع چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس ایک مخصوص نوحہ پڑھتے تھے۔ اس نوحے کو سننے کے لئے خلقت امنڈ پڑتی تھی۔ لالہ ستدی و دیگر ہندو رفقا گھنٹہ گھر کے نیچے ایک معز صراف کی دوکان کے تختے پر کھڑے ہو کر بغور نوحے سنتے تھے۔ نواب محمد رضا مرحوم کے بازو بنتے تھے مرحوم کے صاحبزادے نواب [illegible]

نواب سجاد علی خاں، شیخ یوسف حسین چندو صاحب، نواب بنا جانی صاحب (افسوس کہ سب ہی آغوش لحد کی زینت بن چکے ہیں)۔ اس یوم غم کے موقع پر نواب محمد رضا مرحوم جو نوحہ پڑھتے تھے اس کی ابتدا یوں ہوتی تھی،

بولیں زینب اُٹھو بہنا ام کلثوم سے
بھیا کا ہم چہلم کرنے جائیں گے دھوم سے

لالہ سندی و دیگر ہندو احباب نوحے کے ایک ایک مصرعہ پر بے انتہا گریہ کرتے تھے نواب محمد رضا مرحوم کے انتقال کے بعد آنجہانی لالہ سندی مفلس کا چراغ بن گئے تھے۔ کبھی کسی نے اس زندہ دل انسان کو مسکراتے نہ دیکھا۔

خان بہادر مہدی حسین صاحب۔ بڑے وضعدار، پابند صوم صلوٰۃ دیندار، خدا ترس، جھوٹ سے متنفر، سچ کے شیدائی، پہلے مجسٹریٹ بنے پھر ڈپٹی کلکٹر۔ اصل وطن بارہ بنکی تھا، فیض آباد کی تہذیب، میل جول، شرافت انسانیت اتنی پسند آئی کہ فیض آباد کے ہو کر رہ گئے۔ دیوکالی روڈ پر ایک عالی شان کوٹھی بنوائی صبح و شام حاجت مندوں کی حاجت روائی، یتیم پرستی اور غربا پروری میں مصروف رہتے، بے شمار نادار طلبا کی فیس ہر ماہ اپنے پاس سے دیتے۔ کتابیں اور کاپیاں مہیا کراتے۔ عید بقرعید میں پریشاں حالوں کو نئے جوڑے دیتے۔ دینی مدرسوں کی بھرپور مالی مدد کرتے۔ کتنے ہندو اور مسلمان ان کی امداد کے ذریعے غربت کی پستی سے نکل کر دولت، عزت، شہرت کی بلندی تک پہونچے۔ مندر اور مسجد دونوں جگہ سالانہ گراں قدر عطیہ دیتے تھے کہتے تھے "میری ایک آنکھ ہندو ہے دوسری مسلمان"۔ وہ جب تک زندہ رہے انھوں نے غربت، مفلسی، پریشاں حالی، کس مپرسی پر نظر کی، کبھی نہ ہندو دیکھا نہ مسلمان۔ نہ ذات دیکھی نہ برادری ـــ گھر کے اندر مسلم ملازم گھر کے باہر ہندو ملازم۔ سب ہی وفادار، سب ہی جاں نثار دیوالی دسہرے میں ہندو ملازمین کو قیمتی جوڑے اور تہواری دیتے۔ گرمیوں میں سرِ شام اپنی کوٹھی کے سبزہ زار پر جب بیٹھتے تو شیعہ، سنی، ہندو اُمرا اور رؤسا ملاقات کے لئے آتے۔ پاس پڑوس اور شہر کے غربا بھی سیوں پر براجمان رہتے۔ کبھی بھولے چوکے بھی کوئی تفریق کی دیوار انھوں نے کھڑی نہ ہونے دی۔ ان کی شش جہت شخصیت ہمیشہ مسلمان اللہ اللہ برہمن رام رام پر عامل رہی۔ ان کے پرستاروں اور وارفتگاں میں ہندو مسلم دل و جان سے شریک رہے۔ ان کے انتقال پر مسلمانوں سے زیادہ ہندو گریہ کناں تھے۔

خان بہادر بابو محبوب حسین خاں مرحوم ـــ بڑے کلے ٹھلے کے رئیس دُبلے پتلے کچھ دراز قد، جامہ زیب، لائق وید حویلی، صدری پاٹھک پر دربان اندر باہر ملازمین کی ریل پیل۔ رات گئے تک دربار لگا رہتا۔ آنجہانی راجہ صاحب اجودھیا بھی اکثر تشریف لاکر دربار سے لطف اندوز ہوتے۔ ممتاز ہندو مہاجن مسلمان سوداگر، وکلاء، دانشور، ادیب، شاعر سب ہی حاضری کو شرف سمجھتے۔ کبھی بھی کوئی ضرورت مند ان کی ڈیوڑھی سے خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ مرحوم کے عقیدت مندوں اور حاشیہ نشینوں میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو رہتے تھے۔

آنجہانی رائے بہادر بابو پریادت رام ـــ قلب شہر میں واقع محلہ رکاب گنج میں ان کی سفید کوٹھی آج بھی بابوجی کی شان و عظمت کی گواہی دے رہی ہے کیا آن بان والے اور کیا راج پاٹ والے تھے۔ اودھ کی نفاست، اودھ کی ثقافت، اودھ کی سنسکرتی، اودھ کی پرمپرا، اودھ کی مریادا کے مرقع تھے۔ "ان شاء اللہ" اور "ماشاء اللہ" وردِ زبان رہتا، "چشم ما روشن دل ما شاد" ایسے جملے ان کے لبوں پر ہر وقت حاضر رہتے۔ فیض آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے۔ ہندو ان کو بھگوان، مسلمان انھیں اللہ والا کہتے رئیس الامرا تھے، مگر فقیر منش بھی تھے۔ اچھا کھاتے تھے اچھا کھلاتے تھے، خوش لباس تھے، خوش مزاج تھے۔ آخر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے لیکن دیدہ وری آخر تک باقی رہی۔ ہندوؤں کے دیوتا تھے اور مسلمانوں کے ملجا و ماویٰ تھے۔

بڑے استھان کے بڑے مہنت آنجہانی رگھوبر پرشاد ـــ چشم دید ہے ان کی مسلم دوستی۔ ایسا مسلم پرست نہ دیکھا نہ سنا۔ مسلمانوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک۔ کسی انجانے اور ناواقف مسلمان کی بھی پریشان حالی سُن لیتے تو دامے درمے قدمے سخنے خدمت سے کوتاہی نہ کرتے۔ ایک مسلمان مالی مہکتے پھولوں کے گجرے روزانہ صبح صادق کے وقت بلا قیمت لے کر حاضر ہوتا تھا۔ جب اس مالی کا انتقال ہوا تو بڑے مہنت جی نے اس کی تجہیز و تکفین بڑے دھوم دھام سے کرائی۔ مرحوم مالی کے پسماندگان کی تاحیات خبر گیری کی۔ ایک معتبر اور مستند شخصیت نے یہ واقعہ بتایا کہ۔

"اجودھیا میں ایک ہندو نوجوان نے ایک مسلمان بیوہ کی نوجوان

خوب رو بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ بیٹی کی رسوائی اور بدنامی کے پیش نظر وہ بیوہ خاتون روتی پیٹتی بڑے مہنت جی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنی پریشانی بتائی۔ آنجہانی مہنت جی کی پیشانی پر غصّے سے بل پڑ گئے، بڑے استھان کے پجاریوں کو حکم دیا کہ جہاں بھی وہ سنڈا ملے پکڑ کر لے آؤ — لایا گیا وہ نوجوان اور ایسی درگت بنائی گئی اس کی کہ اللہ کی پناہ — پھر بیوہ خاتون کی ناکتخدا بیٹی کا رشتہ طے کرا کے بڑے مہنت نے اس کے ہاتھ پیلے کرا دیئے اور ایک اچھے بھلے مسلمان گھرانے کی بہو بنا دیا۔"

خان بہادر محمد عمر مرحوم — لمبے چوڑے، موٹی موٹی کلائیاں، سر پر گول ٹوپی سیاہ، سفید لمبا کوٹ، سفید ڈھیلی ڈھالی پتلون، شہر اور کنٹونمنٹ ایریا میں لاکھوں بیگھے زمین، بے شمار عالی شان کوٹھیوں کے مالک، اتنی جائداد کے مالک تھے کہ خود کثرتِ جائداد کا ان کو علم نہ تھا۔ مرنجان مرنج اور کڑھی ہوئی شخصیت، انگریزوں کے محبوب نظر، ہندوؤں کے سر کا تاج، مسلمانوں کے دل کا چین۔ ہر طرف ان کا نام، ہر سمت ان کا چرچا۔ کس کے ساتھ کیا حسنِ سلوک کیا، کس کو کیا دیا، کس کی کس طرح خبرگیری کی، دوسرے کیا باخبر ہوتے جب خود خان بہادر مرحوم کو بھی خبر نہ رہتی تھی۔ سخی تھے، مخیر تھے، بلا تفریقِ مذہب و ملت سب کے بہی خواہ تھے۔ کرم نواز تھے، ہمدم و دمساز تھے۔

رائے بہادر شری مادھو پرشاد سنگھ، بابو تلسی رام، ٹھاکر ہری گوبند سنگھ، ٹھاکر کیسری سنگھ، مولانا علی احمد صاحب شاہی پیش نماز، مولوی ابو محمد صاحب، مولوی فقیر حسین صاحب، بابو مہابیر پرشاد جی، بابو سندر لال جی، لالہ نرائن داس جی مہاجن، سید حسن مثنیٰ ایڈووکیٹ، مرزا مجتبیٰ علی ایڈووکیٹ، محمد مہدی تسکین، پنڈت پریشور ناتھ سپرو، پنڈت ڈی۔ این۔ دینا، پنڈت رام ناتھ شانگلو، بابو بال بھدر سہائے اور مولوی اظہر علی۔ یہ چشم دید ہستیاں جنھیں نیستی نے عدم آباد پہونچا دیا۔ یہ دیکھی بھالی پُر بہار شخصیتیں ان میں سے ہر ایک اودھ کی تہذیبِ روایات کا آئینہ دار تھی۔ ان کے چہرے مہرے، بود و باش، شرافت نفسی، بات چیت، نشست و برخاست آدابِ انسانیت سے فیض آباد کبھی آباد تھا۔ جدھر چلے جایئے آداب و تسلیمات، مزاجِ گرامی، بحمدللہ، شرفِ نیاز، خاطر مدارات کے چمن کھلے ہوئے۔

اگر میں اپنی یادداشت اور اپنے حافظے کے سہارے فیض آباد اور اس کے قرب و جوار جیسے اکبر پور، ٹانڈہ، ایریا بھدرسہ وغیرہ کے مثالی کردار والے افراد پر لکھنے بیٹھوں تو ہر فرد ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ ہر شخص چمن زار نظر آئے۔ زمین جن آسمانوں کو کھا گئی، دستِ اجل نے جن فلک مقاموں کو آغوش لحد کی زینت بنا دیا ہے ان کا قلمی حصار میرے لیے مشکل بھی بہت ہے۔

آج بھی درگا پوجا کی جو پانچ مورتیاں قلب شہر میں واقع چوک کے عظیم الشان سال بہ سال بننے والے منڈپ میں رکھی جاتی ہیں ان کو بلا قیمت ایک مسلمان مالی پھولوں کا گجرا چڑھاتا ہے۔ منڈپ بنانے والے اور منڈپ کو سجانے والے زیادہ تر مسلمان ہوتے ہیں۔ آج رؤف، جبار اور وحید مستری موجود ہیں جو اپنی فنی مہارت سے مندروں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

□□

طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

یہ لکھنؤ کی چکن یہ زری کی شام و سحر
ہر ایک تار میں سو بار اُلجھے تارِ نظر
یہ جامدانی ہے یا کہکشاں کی راہ گزر
یا ایک تختۂ گُل رات بھر کی اوس میں تر
سیاہ رات بھی آئے تو صبحِ گلشن ہے
طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

— ڈاکٹر راہی معصوم رضا

خان محمد عاطف

ملیح آباد : اپنی تہذیب و ثقافت کے آئینے میں

نگاہ رَد بر دَا ے طالبانِ شیشہ دل   کہ ہے یہ مدرسہ شاعرِ ملیح آباد

ملیح آباد کی تہذیبی زندگی پر شیوخ، سادات، مغلوں، کائستھوں اور پٹھانوں نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ ملیح آباد اپنے نام کے ساتھ شیخ ملیح کے نام سے منسوب ہے۔

محمد غوری کا منھ بولا بیٹا قطب الدین ایبک اور اس کا ہمسفر بختیار خلجی اپنی صلاحیتوں اور بہادری کے نتیجہ میں محمد غوری کے منظورِ نظر تھے۔ ایک دہلی کے تخت پر بیٹھا تو دوسرا بنگال تک فتح کے ڈنکے بجاتا اور جگہ جگہ بختیار نگر، خالص پور یا بختیار پور آباد کرتا چلا گیا۔ ساتھ ہی ہندوستانی و افغانی تہذیب کے نقوش بھی چھوڑے۔ جن میں علاقوں کی فتوحات کے مقابلہ میں دلوں کو جیتنے کا جذبہ زیادہ تھا۔

ایمن زئی قبائل کے شمشیر خاں جن کا مرکز بختیار نگر اور سنجر خاں جن کا مرکز خاص گڑھی سنجر خاں رہا۔ نواب شمشیر خاں اور نواب سنجر خاں کے قبضہ میں نو سو نواسی گاؤں، تین توپ اور آبپاشی کے لیے باون کنوئیں تھے۔ یہ علاقہ گنگا کے دہانے اناؤ سے شروع ہو کر دریا آباد کو گھیرتا ہوا سرجو ندی تک جاتا تھا۔

بازید خیل قبیلہ کے لوگ جھگڑالو تھے۔ بختیار نگر میں اسی خاندان کے حسین علی خاں تخلص جویا صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اس قبیلہ کا افغانستان کے خرشبین خلف سربنی سے سلسلۂ نسب ملتا ہے۔

ملیح آباد کے سادات نے علم و حکمت و طبابت میں اپنے جوہر دکھائے ان کی بزرگانہ شان کا مرکز دھیول شریف ہے۔ ان میں سے کئی شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ سید حسین احمد صاحب جو مشہور طبیب بھی تھے۔ سید احمد بریلوی کے ساتھ جہاد پر گئے تھے۔ یہ شاہ صاحب کے مدرسہ کے فارغ تھے۔ فقیر محمد خاں گویا ان سے بیعت تھے۔

محمد حسن انصاری صدر پور کے باشندہ تھے۔ یہ ٹونک میں شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولوی قدرت اللہ بیگ رآو نے انھیں سے فارسی پڑھی تھی اور قدرت اللہ بیگ سے جوش ملیح آبادی نے فارسی زبان پڑھی تھی۔ خالص پور میں حکیم سعید احمد خاں بھی بڑے پائے کے حکیم تھے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں قاسم خاں آفریدی پشاور سے ملیح آباد آیا۔ کچھ دن یہاں قیام کیا۔ قاسم گڑھی اس کی یادگار ہے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھا اردو اور پشتو دونوں میں کہتا تھا۔ اس کا پشتو دیوان رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے اور اردو دیوان بنام دیوانِ آفریدی اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں ہے۔

قاسم خاں کا باپ برہان الدین دہلی میں ۱۷۲۱ء اردوئے معلیٰ کا ماہر تھا۔ قاسم خاں نے اپنی کتاب شفاعتِ آفریدی میں ایک منقبت کا بھی ذکر کیا ہے جو تلف ہو چکی ہے۔

آصف الدولہ کا وزیر خزانہ راجہ ٹکیت رائے ملیح آباد کے محلہ منشی گنج کا باشندہ تھا۔ اس زمانہ میں کاکوری کے خاندانِ قلندریہ کی دعا سے ٹکیت رائے کو یہ مرتبہ ملا تھا اور انھیں کے کہنے سے ٹکیت رائے "راجہ" ہو گئے تھے۔

مگر ملیح آباد کو تہذیبی عروج اور سربلندیاں قندھاریوں اور آفریدیوں کی آمد سے نصیب ہوئیں۔ حضرت داؤد کی آٹھویں پشت میں حصروں کی بیوی کا نام افراتہ تھا جو نہایت عقلمند خاتون تھیں۔ آفریدیوں کا نسب کئی وسیلوں سے وہاں تک پہونچتا ہے۔

ملیح آباد کے شمال میں پندرہ کلو میٹر پر راجپوتوں کی بستیاں ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں راجہ کہلائے جاتے ہیں۔ نواب فقیر محمد خاں گویا نے یہ علاقہ راجگان سندیلہ سے حاصل کیا تھا۔ پھر وزیر اودھ آغا میر کی دعوت کی تھی جس کے لیے ایک بارہ دری اور پانچ محلات تعمیر کروائے تھے۔ پھر اپنے

تعلقہ کو اپنے دو بیٹوں محمد احمد خاں اور نسیم خاں میں برابر سے تقسیم کر دیا تھا۔ قندھاریوں کا مرکز خالص پور تھا۔

نواب احمد خاں کے ایک سوتیرہ اولادیں تھیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اسحٰق خاں تعلقدار بنائے گئے تو بڑے بیٹے ملیح آباد چھوڑ کو سندیلہ چلے گئے تھے۔ اسحٰق خاں میں قبائلی زندگی کی بے شمار خصوصیات تھیں۔ بڑے کنبہ پرور اور اپنی بیٹیوں کے لیے جاں نثاری کا جذبہ رکھتے تھے۔ بیٹیوں سے ان کی محبت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ مال کے ٹھاکروں میں ان کے ایک مخالف کی بیٹی رخصت ہو کر ان کے علاقے سے گزر رہی تھی ان کو پتہ چلا تو انھوں نے بارات روک لی۔ بازار کے حلوائیوں کو حکم دیا کہ تین دن تک باراتیوں کے لیے کھانا پکے گا۔ پھر خود تشریف فرما ہوئے اور کہا تو میری بیٹی ہے تیری سسرال والے کیا کہیں گے کہ چچا کی بستی سے گزرے تھے پھر معلوم کیا کر کیا کیا۔ جہیز میں دیا ہے۔ تین دن کے بعد جہیز اور دولھا کو سلام کرائی دے کر رخصت کیا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے بھاگ کر ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی تو انھوں نے کہا۔ اسحٰق خاں صاحب مرد آدمی ہیں وہ اپنی بٹیا کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیں گے اور مجھے جھکنے پر مجبور کر دیں گے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ ان کے بیٹے حبیب خاں صاحب کا ہے۔ جب تک حبیب خاں زندہ رہے ان کے مقابلہ پر تاون ایریا میں کوئی چیرمین نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ انگریز کمشنر بھی موجود تھا۔ نواب محمد علی خاں جو ان کے چچا ہوتے تھے دیر میں پہونچے تھے۔ حبیب خاں کمشنر کے بغل میں بیٹھے تھے۔ کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ حبیب خاں کی جب نظر پڑی تو وہ منزل تھی جہاں نواب صاحب بے عزت ہو جاتے۔ فوراً حبیب خاں نے کھڑے ہو کر کرسی خالی کر دی ان کے کھڑے ہوتے ہی انگریز کمشنر بھی کھڑا ہو گیا تو سب کھڑے ہو گئے۔ خیال رہے کہ ملیح آباد کی ریاست میں دونوں کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ جلسہ ختم ہوتے ہی نواب صاحب نے کہا۔ حبیب جانے سے پہلے مجھ سے بات کر لینا۔ مگر حبیب خاں نے جواب دیا چچا وہاں لڑائی جاری رہے گی۔ یہاں آپ کی عزت نہ کرتا تو میں بے عزت ہو جاتا۔ یہ تہذیبی قدریں آج ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

افغانوں کی حوصلہ مندی، زندگی کی سادگی، یقین کی پختگی اخلاقی قوت و طاقت، قومی و قبائلی روایات اور اپنی تاریخی ثقافت سے رابطہ اور بزرگوں کی روایات کے مطابق مہمان نوازی، غیر کی اطاعت سے ناآشنائی کمزوروں کی مدد پر کمربستہ، دوست داری و غیرت مندی کے خاص جوہر ہیں۔ جس کو جوشؔ نے یوں ادا کیا ہے ؎

ہمیشہ جاگتا رہتا ہوں محنت کی چٹانوں پر
تن آسانی کے بستر پر مجھے سونا نہیں آتا

پٹھانوں میں شاعری کا ذوق شروع سے ہی رہا ہے۔ عورتیں تک منظوم لوریاں دے کر بچوں کو سلاتیں اور ٹپے یا "لنڈی" میں اپنی فکر و خیال کو ادا کرتیں۔ پشتو میں ایک عورت اپنے محبوب سے کہتی ہے۔ وطن پر دشمن چڑھ آئے ہیں تو جا اور دشمنوں سے جنگ کر اور اگر تو کام آ گیا تو اپنی زلفوں کے تاروں سے تیرا کفن بناؤں گی!

بکسر کی لڑائی کے بعد عبد الرحمٰن خاں قندھاری کو چودہ گاؤں معافی کے طور پر ملے تھے۔ چھ گاؤں ملیح آباد میں جس کا صدر مقام خالص پور تھا۔ ان کا تعلق افغانستان میں قندھار کے علاقہ قلات سے تھا۔ شاہ عالم خیل ہیں غلزئی قبیلہ کی شاخ سلیمان خیل سے تھا۔ ان کے والد شہزادہ محمد یوسف نادر افشار سے شکست کھا کر ہندستان آ گئے تھے جن کی حیثیت شاہی مہمان کی تھی۔ اس وقت اودھ کی راجدھانی فیض آباد تھی۔ فیض آباد میں جہاں رہے وہ علاقہ قندھاری بازار کہا جانے لگا جب دار السلطنت لکھنؤ آیا تو لکھنؤ میں ان کا مسکن قندھاری بازار کہلایا۔

مولانا حیدر علی خاں خالص پوری بڑے مرتبہ کے آدمی تھے۔ ان کے علمی مرتبہ کا یہ عالم تھا کہ افغانستان و ایران سے لوگ مثنوی روم کے مطالب سمجھنے آتے تھے۔ علامہ شبلی بھی ان کی زیارت کو نے خالص پور گئے تھے۔

سردار محمد خاں پنجہ کشی کے ماہر تھے۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ جوان کا پنجہ موڑ دے گا۔ اس کو پانچ سو روپیہ انعام ملے گا۔ افغانستان تک سے پنجہ کشی کے ماہران سے پنجہ لڑانے آتے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی ان کو نگاہ عجت سے دیکھا تھا۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف سردار محمد خاں کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور جب مولانا آزاد کو سردار محمد خاں کی موت کی خبر موصول ہوئی تو مولانا آبدیدہ ہو گئے۔ سردار محمد خاں خالص پور ہی میں سکونت پذیر تھے اس وقت خالص پور کے لیے یہ فقرہ مشہور تھا کہ خالص پور قندھار ہے جس میں نو سو جوان کہ کے

محمد خاں خنداعاری نے "شریا محمدی" منظوم لکھی۔ جو ملک دین محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے ۱۹۳۹ء میں چھٹی بار چھاپی۔ سرورق پر لکھا ہے ؎

سب مطابق اصل کے ہو بہو ہیں   فعل کچھ اس میں تفرقت کا نہیں

میر عوض علی عدیل ملیح آبادی ولد میر حامد علی سید حسینی کتب درسیہ سلامت اللہ لکھنوی سے پڑھیں۔ فن خوشنویسی حافظ ابراہیم سے سیکھا۔ نواب محمد سعید خاں والی رام پور نے نواب یوسف علی خاں ناظم کی تعلیم و تربیت کے لیے میر عوض علی کا انتخاب کیا۔ میر صاحب نے رام پور میں خوشنویسی کا ذوق پیدا کیا اور اپنے بہت سے شاگرد چھوڑے۔ چند رسائل بھی تصنیف کیے جن میں رسالہ سہل ممتنع املائیہ، صحت العلوث (طب میں) دستور العمل تدبیرہ معاش مساکین و قحط سالی۔ (فارسی) انتظام السعید (فارسی) مرحوم کی قبر جنرل اعظم خاں کے مقبرہ کے چبوترہ میں آگئی ہے۔

منشی عبدالرؤف خاں لطف نے ایک کتاب بنام نیرنگ خیال لکھی تھی۔ گلدستۂ نجات یا وسیلۂ نجات منظوم اور مولانا روم کی مناجات کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ ملیح آباد میں تین چیزیں عجائبات عالم کی طرح مشہور ہیں۔ غزبے کی "نہیں" منی شیر خاں کا "لٹھ" اور غنی احمد خاں کا "قتل"

جلیل احمد خاں جلیل گڑھی بہو خاں میں رہنے لگے تھے۔ اصل باشندے کھولہاز کے تھے۔ آخری عمر میں بادشاہ ہوگئے تھے۔

نواب محمد احمد خاں کی بیٹی علی بیگم جوش کی پھوپھی تھیں وہ کہتی ہیں ؎

ایک صیاد کی خاطر مرے کنبا مارا
میں وہ بلبل ہوں کہ گلشن میں نہ آؤں گی کبھی

اپنے ہی تہذیبی دائروں میں شعر و ادب کو ہمہ گیر بنانے کا کام بڑے حسن و خوبی سے اہل ملیح آباد نے انجام دیا ہے۔ سائنسدانوں اور فلسفیوں کی طرح طے شدہ راہوں پر نہیں چلتا بلکہ شاعری فلسفہ کے بے روح ڈھانچہ میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔

دلی کمال خاں لکھنؤ یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ انگریزی اور اردو میں ایم اے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور عارف ادیب قلمی نام لکھتے ہیں۔

کوئی نہ [illegible] محمدؐ کے طرز کی   پیدا نہ کر سکی یہ شہادت ہے چرخ کی

سائل ملیح آبادی شاعر و ادیب ہیں دو سو سے زیادہ سماجی، اصلاحی اور تاریخی ناولیں لکھ چکے ہیں۔ ان کا انداز دیکھیں ؎

دربار میں شاہوں کے بھی سرخم نہیں کرتے
دنیا ہی کرتی ہے مگر ہم نہیں کرتے

سید محمد علی عرش ملیح آبادی شیفتہ کنتوری کے شاگرد تھے۔ قیام حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا، ملیح آباد کے واقعات جمع کیے تھے۔ جن میں عرش کے گیت، اپنا شجرہ۔ ملیح آباد کے مدرسوں، طلبار، پیشہ وروں، اسپتال، ڈاکخانوں اور تھانوں کی تفصیلات کے علاوہ اہم لوگوں کے نام شامل ہیں۔ ان کی فارسی کتب (۱) جوھر فرد (۲) دوھۃ الصنائع ہیں۔

فضل اللہ خاں فضل قطعی ان پڑھ تھے۔ غدر کی بربادی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی۔ پھر لکھنؤ سے خالص پور چلے گئے تھے۔ فضل کے یہاں دنیا کی بے ثباتی صوفیانہ نہیں بلکہ سوالیہ نشان ہے ان کے اشعار میں غدر کی بربادیوں کی جھلک ہے ان کا شعر ملاحظہ ہو ؎

زندگی میں جو کہ بے شعل نہ چلتے تھے کبھی   اب نظر آتا نہیں ان کے سر مدفن چراغ

ملیح آباد میں علمی و ادبی دنیا میں چار ہستیاں عالمی شہرت کی مالک ہیں۔

سید امیر علی ملیح آبادی جنھوں نے علم دین میں، عربی ادب میں اور علم حدیث میں علمائے عرب سے خراج تحسین حاصل کیا۔

۱۔ تیس جلدوں میں تفسیر قرآن مواھب الرحمٰن کے نام سے مرتب کی۔ بخاری شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب عین الہدایہ کا چار جلدوں میں ترجمہ کیا۔ فتاویٰ عالمگیری کا بھی ترجمہ کیا۔ اس پر تین صفحات کا عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ عہد اکبری میں فیضی کی تفسیر غیر منقوطہ سواطع الالہام کی تصحیح کر کے عربی زبان میں ویسا ہی غیر منقوط مقدمہ بھی لکھا۔

۲۔ مولوی قدرت اللہ بیگ عربی و فارسی کے عالم بے بدل تھے ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔ انھوں نے چھ ہزار چھ سو اشعار فارسی میں رسول اکرمؐ کی شان میں غیر منقوطہ کہے۔ ایک شاھنامہ اسلام بھی منظوم لکھا تھا جس میں فردوسی کی کوتاہیوں کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ دنیائے شاعری میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی جن کے اندر شاعر شباب، شاعر فطرت، شاعر خمریات اور شاعر خدا شناس اور نہ جانے

(باقی ص ۳۴۹ پر)

احمد ابراہیم علوی

کاکوری حقائق کی روشنی میں

پُرشکوہ بام و در والی لق و دق حویلیوں اور جاہ و جلال والے عظیم الشان محلات اور کوٹھیوں کو حصار میں لیے ہوئے آم کے باغات سے گھرے چھوٹے سے قصبے کاکوری کی داستان طویل اور تاریخ درخشاں اور مستند ہے۔ بات چاہے علم و ادب کی ہو یا تصوف و مذہب کی، ملک کی آزادی کے لئے جان نثار کر دینے والے شہیدان وطن کی ہو یا ملک اور قوم کی ترقی و خوش حالی کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دینے والے عظیم انسانوں کی، کاکوری کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کاکوری کی تاریخ میں ۹ اگست ۱۹۲۵ء کی شام کی دلیرانہ کارروائی سنہرے حروف سے لکھی ہوئی ہے جبکہ اشفاق اللہ خاں، جتیندر بخشی و راجندر لہری اور بسمل نے کاکوری میں جنگ آزادی کی شمع روشن کی۔

کاکوری ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے بارہ تیرہ کلومیٹر دور لکھنؤ ہردوئی شاہراہ پر واقع ہے اپنے رقبے اور حدود کے اعتبار سے یہ جتنا مختصر ہے اپنی ادبی تاریخی اور سماجی حیثیت سے اتنا ہی اہم ہے۔ اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ سہتنا نام کا راجہ کبھی اس کو اپنا دارالسلطنت بنا کر حکمرانی کرتا تھا۔ اس کے شاندار محل اور قلعہ کے نشانات ابھی تک نمایاں ہیں۔

کاکوری علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہر شعبۂ حیات میں نمایاں شخصیتوں میں ایسے نام بھی شامل ہیں جو پورے ملک کے لیے باعث فخر و افتخار ہیں یہاں شجاعت اور دلیری کے کارنامے انجام دینے والے صنعت و حرفت کو فروغ دینے والے اور علم و ادب کی شمعیں فروزاں کرنے والے نیز تصوف و معرفت کے ذریعے ذہنی و قلبی سکون عطا کرنے والے بزرگان ہمیشہ ہی فیض و برکت رہے ہیں۔

ان ممتاز و ناقابل فراموش شخصیات میں قاضی نجم الدین خاں علوی، منشی خلیل الدین خاں، مسیح الدین خاں علوی، امیر حسن خاں بسمل، رضا حسن خاں علوی، مقصود احمد نطق، ارتضا علی شرر، محمد عالم قیصری، نور الدین کیفی، محمد رضا صبر، تاج الدین جذب، حیدر حسن نشتر، رضا الدین احمد خنجر، حافظ علی عسکری بیدل، منشی سجاد حسین، شیخ غلام مینا ساحری، نادر علی خاں عباسی نادر، محسن کاکوری، منشی احمد علی، ڈپٹی امیر احمد علوی، ظفر الملک علوی، نور الحسن نیر اور ناظر کاکوروی کے علاوہ بزرگان دین میں شاہ محمد کاظم قلندر، شاہ تراب علی قلندر، شاہ انور قلندر، شاہ حبیب حیدر قلندر جیسے قابل صد احترام بزرگ بھی شامل ہیں۔ مقام مسرت یہ ہے کہ ان سب کا فیضان جاری ہے اور ان کے پس ماندگان ان کی روایات کو بحسن و خوبی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

"نور اللغات" اردو کی آج بھی سب سے مستند اور معتبر لغت ہے اس کے برابر اہم اور معتبر دوسری لغت بڑی بڑی اکیڈمیاں اور ادارے بھی نہ پیش کر سکے۔ یہ لغت کاکوری کے ہی ایک سپوت نور الحسن کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اردو میں اپنی قسم کا بے مثل نعتیہ قصیدہ کہنے والے مولانا محسن بھی کاکوری کے فرزند تھے۔ اس کے علاوہ اردو میں انگریزی کے مشہور مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" کے طرز پر رسالہ نکالنے والے منشی سجاد حسین کا بھی تعلق کاکوری ہی سے تھا۔

مہمان نوازی کاکوری کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے دستر خوان ہمیشہ وسیع رہے دعوت طعام کا اہتمام بھی قابل ذکر رہا ہے اسی لیے یہاں کے لذیذ کھانے چلتے رہے ہیں یہاں کے سیخ کباب اپنی لذت میں جواب نہیں رکھتے بڑی اہم دعوتوں میں کاکوری سے سیخ کباب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چوک کے ٹنڈے کباب والے کا تعلق بھی کاکوری سے ہی ہے۔

یہاں صنعت وحرفت میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ عورتوں کا سہاگ شہانے یہاں بڑے اہتمام سے بنائے جاتے ہیں لڑکیاں ان شہانوں سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔

کاکوری کے لوگ ہمیشہ ترقی کی دوڑ میں آگے ہی رہے ہیں۔ جب ہندوستان میں حیدرآباد (دکن) اپنی خوشحالی کے لیے مرجع خلائق تھا اور ہندوستان بھر سے لوگ وہیں سمٹ رہے تھے کاکوری والے وہاں جانے میں کسی سے پیچھے نہ رہے وہ کاکوری سے ہجرت کرکے حیدرآباد پہنچے اور انہوں نے آباد ہونے میں سبقت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اپنی خدمات محسوس کرائی اور شہرت وناموری حاصل کی اور چیف سکریٹری کے عہدے تک پہونچے۔ اس سلسلے میں مجاہد علی عباسی کا نام قابل ذکر ہے۔ جب پاکستان بنا تو کاکوری والے بڑی تعداد میں وہاں گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر حق جمالیا، فوج میں بڑے بڑے عہدے پائے کموڈور، میجر، کرنل تک کے عہدوں کو حاصل کیا اور نام پیدا کیا اس کے بعد یورپ کی طرف مراجعت شروع ہوئی تو کاکوری والے بڑی تعداد میں برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں گئے اور رچ بس گئے۔ اس کے بعد جب لوگ بڑی تعداد میں امریکا اور کناڈا جانے لگے تو وہاں بھی کاکوری والے پہونچ گئے۔ اس طرح آج ساری دنیا میں کاکوری والے پھیل کر شہرت وناموری حاصل کررہے ہیں۔

ملک اور قوم کی تعمیر وترقی میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے والے اہالیان کاکوری آزادیٔ وطن کے پرستاروں میں بھی پیش پیش رہے ہیں اس سلسلے میں منشی رسول بخش اور ان کے چہیتے بیٹے حافظ عبدالصمد کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔

کاکوری والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں قلم تو دوسرے میں شمشیر رہی اور انہوں نے دونوں ہی کے جوہر دکھائے ہیں۔ قصبہ ڈپٹی کلکٹروں کے لیے مشہور رہا ہے۔ اس مختصر سے قصبے میں جتنے ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور جگہ رہے ہوں یہاں گھر گھر میں شعر وادب کا چرچا رہا ہے۔ مذہب سے بے پناہ لگاؤ کے ساتھ ساتھ علم وادب سے دلچسپی یہاں کا شعار رہا ہے۔ اسی لیے اس قصبے میں محترم ومعتبر مذہبی وادبی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ اردو کے نامور محقق وناقد ڈاکٹر فرمان فتحپوری قصبہ کاکوری کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں ــــــــ

"کاکوری ایک عظیم تہذیبی مرکز ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔ اہالیان کاکوری نے علم وفن کے ہر شعبے میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں یہاں تک کہ امیر خسرو کے بعد اگر کسی کا مصدقہ کلام اردو میں ملتا ہے جو قابل ذکر ہے اور جسے ریختہ کہا جاتا ہے تو وہ سعدی کاکوری ہیں" مزاحیہ صحافت کے باوا آدم منشی سجاد حسین کا بھی اسی مردم خیز قصبے ہی سے تعلق تھا ان کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں: ــــــــ

"جب میں ادب وشعر کے دوسرے شعبوں میں دیکھتا ہوں تو اردو شاعری اور طنز ومزاح کی پختہ روایت منشی سجاد حسین اودھ پنچ والے کا تعلق بھی کاکوری سے تھا اور اکبر الٰہ آبادی جیسے بڑے شاعر جو اودھ پنچ میں لکھتے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ نے اکبر الٰہ آبادی کو حقیقت میں اکبر الٰہ آبادی بنادیا تو غلط نہ ہوگا۔"

نعتیہ قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کے خالق حضرت محسن کاکوروی تھے

علامہ نورالحسن پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور بڑے کامیاب تھے وکالت کی معروفیت کے باوجود انہوں نے محض سات برس کے عرصے میں چار جلدوں میں اردو کی لغت تیار کی جب کہ پاکستان میں اس کام کے لیے ایک دفتر درکار ہوا اور اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جوش ملیح آبادی جیسے نامور ادیبوں اور شاعروں نے بیس برس تک محنت کی لیکن اس کے باوجود ایسی لغت وجود میں نہیں آسکی جیسی نوراللغات ہے۔ اس سلسلے میں اگر علامہ نورالحسن کاکوری کا کوئی ثانی ہے تو وہ انگریزی کے مستند ادیب ڈاکٹر جانسن ہیں جنھوں نے تن تنہا انگریزی زبان کی پہلی لغت تیار کی تھی لیکن وہ لغت اغلاط سے بھری ہوئی تھی جبکہ نوراللغات کے سلسلے میں ایسی کوئی بات آج تک نہ کہی جاسکی۔

صحافت کے میدان میں بھی کاکوری والوں نے کچھ کم کارنامے نہیں دکھائے ہیں اس سلسلے میں کاکوری اخبار" قابل ذکر ہے جس کا اجراء سنہ ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا اور جو کسی نہ کسی شکل میں نکلتا رہتا ہے اس اخبار کی فائلیں اپنی الگ اہمیت وافادیت رکھتی ہیں۔ اس اخبار میں دنیا بھر میں بسے کاکوری والوں کی خانگی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں بعض تخالیق ایسی ہیں جو اس اخبار کے علاوہ کہیں نہیں شائع ہوتی ہیں ایسے کتنے ہی مضامین یکجا کرکے کتنی ہی کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ ظفر الملک علوی، انیس احمد عباسی، عبدالروف عباسی، ناظم

کاکوروی، فرقت کاکوروی، منشی سجاد حسین کے علاوہ ایسے نام ہیں جو اردو تاریخ صحافت کے جز لاینفک کہلائیں گے۔

اردو صحافت کے علاوہ انگریزی صحافت میں نام پیدا کرنے والوں میں بھی کاکوری کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ دنیا کے سب سے قدیم اور معتبر انگریزی روزنامہ دی ٹائمز "لندن تک رسائی حاصل کرنے والے پہلے مسلمان اور ہندوستانی صحافی قیصر تمکین کا بھی وطن کاکوری ہے۔ ان کی خود نوشت "خبر گیر" خود نوشت سے کہیں زیادہ اُردو صحافت کی مستند تاریخ ہے جبکہ وہ اُردو کے بڑے ہی معتبر مستند و ممتاز افسانہ نگار ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جد وجہد آزادی میں کاکوری کے جیالے سپوتوں نے سب سے پہلے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ اس سلسلے میں مفتی عنایت احمد قابل ذکر ہیں جنھوں نے تحریک آزادی کی رہنمائی کی جس کی پاداش میں انہوں نے کالا پانی کی سزا پائی۔ منشی احترام علی علوی نے نہ صرف قومی تحریکوں کی مدد کی بلکہ بڑے بڑے قومی لیڈروں کو جائے پناہ بھی دی انہوں نے ندوۃ العلوم جیسے بین الاقوامی شہرت کے اداروں کے قیام میں زبردست تعاون دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مالی اعانت کی۔

تعلیم نسواں کے میدان میں بھی کاکوری کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ یہاں عموماً خواتین حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ خواتین میں شعری اور ادبی ذوق رکھنے والیوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ شعر کہنا اور افسانہ لکھنا یہاں کی لڑکیوں کا مشغلہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں وحیدہ نعیم اور زیبا کاکوری نے کافی شہرت حاصل کی۔ کاکوری اخبار نے اکثر خواتین کی ہمت افزائی کی۔

کاکوری کشف و کرامات تصوف و فلسفہ اور صاحبان علم و حکمت اور بزرگوں اور پاکبازوں سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہاں حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کا آستانہ کاظمیہ ہمیشہ ہی مرجع خلائق رہا ہے۔ اور بزرگوں کا سلسلہ آج تک برقرار ہے۔

حضرت شاہ تراب علی قلندر، حضرت شاہ تقی علی قلندر، حضرت شاہ حیدر علی قلندر، حضرت شاہ اکبر، حضرت شاہ انور، حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر کا فیضان ابھی جاری ہے۔ آج بھی آستانہ کاظمیہ سے صبر و سکون کی دولت حاصل کرنے والے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔

حضرت ملا نظام الدین عرف شیخ پنکھو دنیائے اسلام کے مشہور بزرگ تھے حضرت ملا قیام الدین اپنے وقت کے ایسے جیّد بزرگ تھے کہ شہنشاہ اکبر اعظم آپ سے شرف ملاقات کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

کاکوری میں شہنشاہ ہمایوں کے زمانے کا مقبرہ جھنجھری اب بھی عہد مغلیہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس میں نور الحسن نیرؔ کا مدفن ہے۔

کاکوری کے مکمل حالات اور صاحبانِ فن کی حیات اور کارناموں کو جاننے کے لیے دو مستند کتابیں موجود ہیں ایک ہے "مشاہیر کاکوری" اور دوسری "سخنوران کاکوری"۔ "سخنوران کاکوری" حالیہ تصنیف ہے جو بڑی اہم اور مفید ہے جس کو کلیم نثار احمد علوی ساقی کاکوروی نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا تھا۔

□□

ملیح آباد

۳۴۶ کا بقیہ

کتنے شاعر چھپے ہوئے ہیں۔ محتاج تعارف نہیں۔

۴۔ چوتھی جلیل القدر ہستی مولانا عبد الرزاق معروف مولانا ملیح آبادی کی ہے۔ جنھوں نے مصر سے واپسی پر اڑتیس سال مولانا آزاد کے ساتھ گزار ان کے الہلال و البلاغ میں کام بھی کیا۔ مگر ان کا انداز تحریر قطعی اختیار نہیں کیا بلکہ اردو صحافت کو عرش سے فرش پر لے آئے اور عوام کی زبان میں آسان و سادہ انداز اختیار کر کے جدید اردو صحافت کی بنیاد رکھی اور اپنے ہر اخبار کا نام ھند، ہفت وار ھند، روزانہ ھند اور آزادی کے بعد آزاد ہند رکھا ــــ آزاد ھند آج بھی ان کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے نکل رہا ہے۔

مگر ملیح آباد کی اصل شہرت کے مالک پھل ثمر بہشت یعنی آم کا ذکر تو رہ ہی جاتا ہے ــــ موجودہ قلمی آموں کو رواج دینے کا سہرا عبد الحمید خاں قندھاری کو ہے۔ جنھوں نے دسہری کو عالمگیر شہرت دی اور ۱۸۸۶ء میں دو سو بیگھا پختہ پر دسہری کے باغات تیار کیے۔ اس وقت کے دسہری کے درخت اب تک موجود ہیں۔ پھر نئی نئی آم کی اقسام پیدا کرنے کے طریقے ایجاد کر کے سو سے زیادہ اقسام خود پیدا کیں اور پورے ملک سے اعلیٰ درجے کے آموں کے قلم منگوائے۔ نوابین بنگال جنھوں نے آم کی اعلیٰ قسمیں تیار کی تھیں مرشد آباد سے سب قسمیں ملیح آباد منگالیں اور رحمن کھیڑا کو گلزار رحمانی کے نام شہرت دی جو انھوں نے اپنے پیر فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے نام رکھا تھا۔ انہی کے نام کی برکت سے آج رحمان کھیڑا اسوائل کنزرویشن اور مینگو ریسرچ کا بڑا مرکز ہے جس کا تعلق مرکزی سرکار سے ہے۔

اودھ آئینۂ ایام میں

ڈاکٹر نگار فاطمہ ہاشمی

اُردو ادب اور قصبہ سندیلہ

سندیلہ ایک قدیم قصبہ ہے۔ اس قصبہ کا نام سندیلہ کیسے پڑا، اس میں بھی لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سلہا اور حقیقی بھائی تھے جو آرکھ کی قوم سے تعلق رکھتے تھے، انھیں دونوں بھائیوں میں سے ایک نے ملیح آباد اور دوسرے نے سندیلہ آباد کیا۔ راجہ درگا پرشاد مہر اپنی تصنیف "تاریخ سندیلہ" میں اس طرح لکھتے ہیں:

"مخدوم حضرت سید علاء الدین صاحب کو اس سرزمین کی معافی کی سند دربار دہلی یا ایک قول پر ان کے پیر و مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے ملی تھی۔ انھوں نے قریب سندیلہ پہونچ کر وہ نوشتہ دریا میں ڈبو دیا اور کہا کہ سند اللہ کافی ہے اور اس سے سندیلہ بن گیا۔"[1]

اس بات کو "رسالہ ادیبِ اُردو" لکھنؤ ماہ جون ۱۹۲۲ء میں اس طرح لکھا گیا ہے:

"چراغ دہلوی نے عطائے خلافت کے وقت مخدوم صاحب کو ایک سند خرچ خانقاہ کے لئے عنایت کر دی تھی جس میں تین سو ساٹھ بیگہ آراضی درج تھی جو آج تک بدستور آپ کی اولاد میں چلی آتی ہے۔ بارہا سلطنت میں انقلاب ہوئے مگر اس جاگیر میں آج تک تغیر نہ ہوا۔ یہ انھیں بزرگان دین کا تصرف ہے۔ اس امر کی تصدیق کتاب مراۃ الاسرار کے مصنف نے بھی کی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ منجانب بادشاہ دہلی جو سند بنا بر مصارف خانقاہ شریف آئی تھی وہ آپ کے پاس اس وقت پہونچی جب کہ آپ روانہ ہو رہے تھے۔ چوں کہ آپ نے بحری سفر اختیار کیا تھا اور کشتی میں سوار ہو کر روانگی فرمائی تھی، اس سند کو دریا میں ڈال کر سندی اللہ یعنی میرے لئے اللہ سند ہے فرمایا تھا۔ چوں کہ خدا کی ذات پر آپ نے بھروسہ فرمایا تھا اس کا صلہ یہ ہے کہ شہنشاہِ حقیقی نے آپ کو ہمیشہ کے لئے یہ جگہ مرحمت کی۔ القصہ آپ نے وہاں سے روانہ ہو کر جس جگہ قیام فرمایا اس جگہ کا نام سندی اللہ رکھا۔ آخر کثرت استعمال سے سندیلہ ہو گیا۔"[2]

ان تمام باتوں سے یہ بات تو بہر حال ظاہر ہو جاتی ہے کہ سندیلہ میں مسلمانوں کی آبادی مخدوم صاحب ہی کی بدولت ہوئی۔ مخدوم صاحب سندیلہ کے شاہِ ولایت ہیں۔ آپ کا مزار شریف محلہ درگاہ میں واقع ہے۔ کافی تعداد میں سندیلہ اور دیگر شہروں کے لوگ آپ کے معتقد ہیں۔ ہر سال آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔ مسلمان ہی نہیں بلکہ بڑی تعداد میں ہندو بھی مخدوم صاحب کے عقیدت مند ہیں۔

اس طرح سندیلہ کئی صدی تک مخدوم زادگان اور ملا حمد اللہ شارح سلم ان کے اخلاف کے سبب علم و ادب کا مرکز بنا رہا۔ اس زمانے میں بیشتر حضرات فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان میں حضرت جنید روحانی احمد علی خاں، ملک زادہ منشی یوسف علی خاں یوسف، عارف علی شاہ عارف خرامانی اور راجہ درگا پرشاد مہر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ذات سے فارسی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جن صاحبِ دیوان شعراء پر ہماری نظر پڑی ہے ان میں منشی فضل رسول واسطی، میر محمد حسین شگفتہ، مولوی ریاض الدین

امجد ریاض، مولوی نیاز علی پریشان، مولوی عزیز الدین اکرم عرف محمد افضل تجلی مرحومین قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء نے چوں کہ رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی کو بہت حد تک اپنی شاعری کا جُز بنایا ہے اس وجہ سے ان کے کلام میں وہ کیف اور اثر نہیں پایا جاتا ہے جو بعد کے شعراء کے کلام میں دکھائی پڑتا ہے۔ اس دور کے زیادہ تر شعراء خلق، اسیر اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ لیکن پھر بھی ان کا کلام اپنی جگہ پر ایک الگ اہمیت کا حامل ہے۔ بطور نمونہ ان حضرات کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں ۔

منشی فضل رسول واسطی شاگرد مظفر علی خاں اسیر لکھنوی؛

عشق میں اس شعلہ رُو کے دل جلایا جائے گا
ایک دن سرد چراغاں یہ بنایا جائے گا

میر محمد حسن شیفتہ شاگرد اسیر؛

فروغ حسن جس نے بخشا ہے جلوہ ماہِ کنعاں کو
عطا کی مہر تیرے نام کی حق نے سلیماں کو
جو مجھ کو لے گیا جوشِ جنوں صحرائے وحشت میں
بگولے کی طرح چکر دیا سارے بیاباں کو

سید فضل حسین شاعر (خلف واسطی) شاگرد فصاحت لکھنوی؛

نرخ یار کا سینے میں جو غنچہ بیٹھا
ساتھ ہی تیر نگہ آکے جگر پر بیٹھا
یہ بھی اعجاز ہے ادنیٰ کہ ہما بن کے اڑا
قصر جاناں پہ اگر آکے کبوتر بیٹھا

سید فضل رسول واسطی سندیلوی نے ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے منشی سید فضل حسین نے ان کا عرس شروع کیا۔ ان کی وفات (۱۹۰۲ء) کے بعد ان کے خلف منشی سید التفات رسول نے عرس کے ساتھ ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ اس مشاعرہ اور عرس پر ہزاروں روپئے خرچ کرتے تھے۔ اس کے متعلق نفیس سندیلوی اپنے مضمون مطبوعہ "التفات رسول انٹر کالج میگزین، سندیلہ" میں لکھتے ہیں :

"آپ کے صاحبزادے منشی سید فضل حسین مرحوم نے اس پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا جو کئی سال میں تکمیل کو پہنچا۔ مکان کے قریب دو پرشکوہ دالان بنوائے جن کو آپ کے صاحبزادے منشی سید التفات رسول ہاشمی مرحوم نے توڑوا کر ایک ہال تعمیر کرا دیا اور جھاڑ فانوس وغیرہ سے آراستہ کرا دیا۔ حضرت واسطی مرحوم کا سالانہ عرس اور اسی ضمن میں ایک مشاعرہ اس ہال میں منعقد ہوتا تھا۔"[۳۴]

سندیلہ کے اس مشاعرہ میں شمالی ہند کے قریب قریب تمام شعراء اور اساتذۂ فن مثلاً مرزا افضل حسین افضل لکھنوی، محمد احسان علی خاں احسان شاہ جہاں پوری، سید انور حسین آرزو لکھنوی، مولانا محمد احمد بیخود موہانی، سید حسین احمد مبارک شاہ جہاں پوری، سید تہور حسین جادو رامپوری، حمید میرٹھی، فدا علی غنچہ لکھنوی، محمد ضمیر خاں صاحب دل شاہجہاں پوری، نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی، مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی، حکیم سید علی محسن ابر لکھنوی، مولوی معین الدین احقر بنارسی، فخر النساء پردہ نشین حجاب شاہجہاں پوری وغیرہ اپنے کثیر شاگردوں کے ساتھ شریک مشاعرہ ہو کر داد سخن دیتے تھے۔ ان مشاعروں کے کچھ گلدستے بھی چھپتے تھے ۱۹۱۹ء کے گلدستے کے دیباچے میں التفات رسول ہاشمی صاحب نے تحریر فرمایا ہے :

"یہ گلدستہ اس اعتبار سے نہیں کہ کاغذ کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ گلزار ی مضامین کے سدا بہار پھول ہیں جو خزاں کے جھونکوں سے کمھلا نہیں سکتے۔ ہمیشہ بہار بے خزاں رہیں گے۔ یہ کہنا بھی بے موقع نہیں ہوگا کہ سندیلہ میں میری سرپرستی سے ایک مشاعرہ قائم ہے اور ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ گو میرے یہاں مشاعرہ ماہانہ ہوتا ہے مگر یہ سالانہ مشاعرہ اور عرس بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو خود ستائی کرنا ہے کہ اس مشاعرے اور سالانہ عرس کو حد درجہ حوصلے کے ساتھ کرتا ہوں۔"[۳۵]

اس کے علاوہ التفات رسول ہاشمی صاحب ماہانہ مشاعرے بھی کرواتے تھے جن کی غزلیات کبھی کبھی "رسالہ گلچیں" میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ محفل خاص لکھنؤ سے وسیم خیرآبادی شاگرد امیر مینائی نکالتے تھے۔ ہاشمی صاحب اس رسالہ کے مربی بھی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب سید اعزاز رسول صاحب

اس مشاعرہ اور عرس کو چند سال تک قائم رکھا پر اُسے استاد ختم ہوتے گئے ان کی جگہ نئے شاعر مثلاً اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی وغیرہ آتے رہے۔

سندیلہ کے اس دور کے شعراء کا کلام کافی پُرلطف اور اثردار ہے۔ ان شعراء کے کلام میں زیادہ تر آرزو لکھنوی کا انداز دکھائی پڑتا ہے کیوں کہ سندیلہ کے ان سالانہ مشاعروں کی صدارت آرزو صاحب ہی کرتے تھے اور اس دور کے زیادہ تر شاعر انھیں کے شاگرد تھے اور ان شعراء کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو دبستان لکھنؤ کی خصوصیات تھیں۔ اس دور کے شعراء کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

میر منصب علی ھنر سندیلوی:

مری باتوں کا سمجھے مدّعا کیا
سُنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا

چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی:

افسردہ دل کی آہِ رسا کو خبر نہیں
بُجھ بھی گیا چراغ ہوا کو خبر نہیں

چودھری امیر حسین بسمل سندیلوی:

اب تیری محبت کا دل سے افسانہ بھلا کر دیکھیں گے
اپنا تو بنا کر دیکھ لیے بیگانہ بنا کر دیکھیں گے

منّی لال جوان سندیلوی:

نیرنگِ صبح و شام میں الجھی رہی نگاہ
گر گر کے جلوہ گاہ کے پردے اُٹھا کیے

شاہ محمد احمد کوکب سندیلوی:

یوسف بھی اس جمال کا دیوانہ ہو گیا
جو تھا چراغ حسن وہ پروانہ ہو گیا

مولوی نذیر حسن فتنہ سندیلوی:

پھر جان دسرکی ہو پھر سامنا مشکل کا ہے
پھر ارادہ آج پیرا کو چۂ قاتل کا ہے

۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم ہوئی۔ نفیس سندیلوی اس کے صدر اور مولانا حکیم عبدالمجید شفق مرحوم اس کے سکریٹری تھے۔ حکیم صاحب کی حیات تک اُردو کے سلسلے میں میٹنگیں اور مشاعرے ہوتے رہے اور اب بھی برابر سندیلہ میں مشاعرے ہوتے ہیں۔

سندیلہ میں جہاں ایک طرف شاعری کو فروغ مل رہا تھا وہیں دوسری طرف ہمارے ادیب اور شعراء نثر سے بھی بے نیاز نہیں تھے۔ نثر میں سب سے پہلی تصنیف "سَرورِ ریاض" جس کے مصنف مولوی ریاض الدین امجد ریاض ہیں یہ ایک سفرنامہ ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب تذکرہ شعر و سخن جو کہ ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوئی، مولانا نیاز علی پریشاں کی ہے۔ مولانا موصوف کی ایک اور تصنیف قصیدہ موسوم بہ "گلِ رعنا" ہے۔ ان کتابوں سے پہلے ان کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں جن میں ایک مثنوی واسوخت "سرمایۂ عشق" اور دوسری کتاب "افسانۂ عشق" مطبوعہ ۱۸۸۰ء ہیں۔

راجہ درگا پرشاد مہر کی کتاب "تاریخ سندیلہ"، "تاریخ اجودھیا" اور "مہابھارت" بھی قابل قدر کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر سلام اور چودھری وجاہت علی نے بھی کافی تعداد میں کتابیں لکھیں جو اردو زبان کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہیں جن کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

حواشی: ۱ تاریخ سندیلہ ۲ رسالہ ادب اردو ۳ التفات رسول اثر کالج میگزین سندیلہ ۴ گلدستہ بہار عرس مجموعہ غزلیات سالانہ مشاعرہ سندیلہ ۱۹۰۹ء ۵ رسالہ گلچیں




یادوں کے
جھروکے
سے

وہ لالۂ زار، جہاں

کرب و کسک، سوز و ساز، اور

ماضی کے چراغ

روشن نظر آتے ہیں

امجد حسین

یادوں کے جھروکے سے

حیات اللہ انصاری

اودھ کا نیا جنم

پہلی جنگ آزادی کے دو بڑے ہیرو ہوئے ہیں۔ ایک بیگم حضرت محل اور دوسرے مولوی احمد اللہ۔ دونوں نے انگریزی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا لیکن غدار زمانے کے ہاتھوں شکست کھا کر بیگم نے نیپال میں پناہ لی اور مولوی احمد اللہ نے قبر میں استراحت فرمائی۔

حضرت محل پارک

آج لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کے نام پر ایک پارک ہے، جو پہلی جنگ آزادی کی ہیروئن کی یاد دلاتا ہے۔ جب وہ پارک بن کر تیار ہوا تو وہاں صرف چند لوگ گھومتے پھرتے نظر آجاتے تھے اور جنگ آزادی کی یاد دلانے والی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہوتے ہوتے اب وہ پارک سیاسی تحریکوں کا شہر کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے اور جو فرض اس کو ادا کرنا چاہئے تھا وہ ادا کرنے لگا ہے۔ ابھی حالیہ الکشن میں ریاست کے بڑے بڑے جلسے اسی پارک میں ہوئے جن کو پارٹیوں کے بڑے لیڈروں نے خطاب کیا۔ اس طرح یہ مقام، جو اودھ کی یادگار ہے، اودھ کا سب سے جان دار پارک بن گیا ہے۔

سیاسی جلسے ہندستان کی تقسیم کے پہلے امین آباد پارک میں اور پھر امین الدولہ پارک میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جلسوں میں حاضرین کی تعداد بڑھنے لگی اور ہوتے ہوتے ان پارکوں میں ان کی گنجائش نہیں رہی، اس وجہ سے جلسوں نے بیگم حضرت محل پارک کو اپنا لیا۔

پارک کا یہ استعمال ایک لمبی سیاسی داستان سناتا ہے جو ۱۹۱۹ء سے چلی ہوئی اور مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔

اس داستان نے اودھ میں ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی جس سے نوجوان نسل کا بھی اور بعد کی آنے والی نسل کا بھی گہرا تعلق ہے۔ میں اس تاریخ کے ایسے چند واقعات سناتا ہوں جن سے ان منزلوں کا نشان ملے گا جہاں جہاں سے وہ سیاست گزری ہے، جو اب بیگم حضرت محل پارک میں مستقبل سازی کا فرض انجام دے رہی ہے۔

مہاتما گاندھی

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا لکھنؤ میں ایک اجلاس ہونے والا تھا اس میں شرکت کے لئے گاندھی جی آئے، تب ہی میں نے ان کو پہلی بار دیکھا۔ رفاہ عام کے میدان میں بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا۔ اسکے گیٹ کے سامنے چاندنی بچھائی گئی تھی۔ اس پر چلتے ہوئے مہاتما گاندھی معمولی رفتار سے آرہے تھے، جوان سے معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ سفید کھدر کا لمبا سا کرتا تھا اور سر پر گاندھی ٹوپی، پاؤں میں چپل۔ وہ بڑے بڑے قدموں سے چل رہے تھے اور دونوں ہاتھوں سے نمسکار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے کا سکون اور وہ تبسم جس سے وہ سلام کرنے والوں کا جواب دے رہے تھے، لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

خلافت کانفرنس ایک گھرے ہوئے پنڈال میں تھی جہاں داخلہ ٹکٹ سے ہوتا تھا یا پاس سے۔ ٹکٹ یا پاس ہونے کے باوجود اس میں اتنی ہی بھیڑ تھی جتنی کہ آج کسی معمولی کانفرنس میں ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس مجمع کو لوگوں نے بہت بڑا مجمع مانا تھا اور سرکاری وفادار لوگ کافی پریشان تھے کہ مسلمان باغی ہوتے جا رہے ہیں۔ شمس العلماء اور اس قسم کے مولویوں نے اس کانفرنس میں مسلمانوں کی شرکت کو اسلام کے خلاف قرار دے دیا تھا۔ جلسے میں مولانا محمد علی اور چند دوسرے لیڈروں کی تقریروں پر خوب تالیاں بجائی تھیں لیکن گاندھی جی کو دیکھتے ہی مسلمانوں نے جس جوش سے تالیاں بجائی تھیں اس کے سامنے سب تالیاں ماند پڑ گئیں۔

کانفرنس میں ایک طویل نظم پڑھی گئی تھی جس کے ان دو شعروں

پر بہت واہ واہ ہوئی تھی ؎

ایک دل اور جمع ہوں اضداد ناممکن ہے یہ
خوف ہو جس کو خدا کا کیوں ڈرے حکام سے

دوسرا شعر تھا جس میں جلیان والا باغ کی طرف اشارہ تھا ؎

واقعہ پنجاب کا اور یہ ملمع سازیاں
جتنے گورے تھے وہ گورے بچ گئے الزام سے

اس دور میں تغزل میں منطق اور تصنع جتنا گھس آئے تھے یہ نظم اسی کا نمونہ ہے۔ حکیم عبدالقوی صاحب جو کاکلیں بڑھائے ہوئے درویشوں کے لباس میں رہتے تھے، شاعر تھے اور پاٹ دار رسیلی آواز میں اپنا کلام سناتے تھے' انھوں نے ایک نظم سنائی جس کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا:

اسیرو! کرد کچھ رہائی کی باتیں

بڑے جوش سے اس نظم کو واہ واہ کا خراج ملا۔ اس میں قومی جذبات بھرپور تغزل سے ادا کیے گئے تھے

چوک کے پاس مولانا عبدالباری صاحب کی ایک بڑی سی عمارت تھی جو محل سرا کہلاتی تھی، اس میں مولانا نے گاندھی جی کو ٹھہرایا تھا۔ ہم لڑکوں میں مہاتما گاندھی کی دو چیزوں کے بڑے تذکرے تھے، ایک تو یہ کہ ان کے ساتھ دو بکریاں آئی ہیں جن کا دودھ مہاتما جی استعمال کرتے تھے اور دوسرے ایک چرخا آیا جس کو وہ، جب بھی فرصت ملتی، چلاتے تھے۔ مجھ کو خاص دل چسپی ہوئی بکریوں سے' لیکن کیے ان کو اتنا چھیڑنے لگے تھے کہ مولانا نے ایک آدمی بٹھادیا تھا جو بکریوں کے پاس جانے والوں کی روک ٹوک کرتا تھا

میں اجازت لے کر بکریوں کے پاس بہت شوق سے پہونچا اور لکھنؤ کی تہذیب کے مطابق ان کو پان کی دو دو گلوریاں پیش کیں جس میں چکنی ڈلی اور الائچیاں خاص طور سے ڈلوائی تھیں۔ دونوں بکریاں ان کو ایک ایک منھ مار کر بیٹ کر گئیں۔ اور ___ اگر کتا ہوتا تو دم ہلاتا اور پاؤں چاٹنے کی کوشش کرتا لیکن دونوں بکریوں نے گلوریاں کھا کر منھ پھیر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ کتنی حیرت ہوئی تھی کہ مہاتما جی کی بکریاں اور یہ تہذیب۔!!

محل سرا کے پھاٹک پر جو ایک گلی میں کھلتا تھا' ایسے لوگوں کی بھیڑ لگی تھی جو مہاتما گاندھی کے درشن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا نے جو دربان بٹھا رکھا تھا وہ لوگوں کو اندر نہیں جانے دیتا تھا۔ یہ لوگ اگر اندر پہنچ جاتے تو عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ عوام کی بھیڑ گلی سے ہوتی ہوئی سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ خلافت اور کانگریس کو سمجھتے تھے صرف چند نعروں سے۔ ان نعروں کی پشت پر دو باتیں تھیں جو ذہن میں گھسی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہندستانیوں کو انگریزوں نے غلام بنا رکھا ہے، وہ ہمارے ملک کو بڑی بے دردی سے لوٹ رہے ہیں اور انھوں نے اس کو کنگال کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہم سب لوگ غریب ہو گئے ہیں اور یہ کہ گاندھی جی ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔

لکھنؤ میں شاہ مینا کا مزار خاص مرکزیت رکھتا ہے۔ وہاں نوچندی کے دن میلا ہوتا ہے اور مزار پر قوالی بھی ہوتی ہے' کشمیریوں کا ناچ بھی ہوتا ہے اور طوائفیں بھی آتی ہیں۔ خلافت کی کانفرنس کے بعد میں ادھر سے گزرا تو وہی گانا "اسیرو! کرد کچھ رہائی کی باتیں" مزار پر چند نوجوان قوال لہک لہک کر گا رہے تھے اور حکیم عبدالقوی ایک کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تو یہ نظم گلی گلی گائی جانے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد کسی محفل میں ایک دن یہ غزل سُنی ؎

خدا نے چاہا تو اک دن یہ کام کریں گے
فرنگی جتنے ہیں سب کو غلام کریں گے

پھر یہ نغمہ بھی گلی گلی گائی جانے لگی ___ ایک اور نظم جو بہت مقبول ہوئی تھی وہ یہ ہے ؎

بولیں اماں یہ شوکت علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

پہلے ایسی نظمیں سڑکوں اور پارکوں میں گائی جاتی تھیں مگر بیس پچیس برسوں میں زمانہ بدل گیا تھا۔

گیارہ پائی فی کس

چوک کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پارک ہے جو ہرن والا پارک کہلاتا ہے۔ یہ چوک کی سڑک سے قدِ آدم بلندی پر واقع ہے اس طرح کہ اگر اس کے کنارے پر چوک کی طرف رُخ کر کے کوئی شخص کھڑا ہو تو طوائفوں کے کئی بالاخانے سامنے آجاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ پارک رات گئے

تک شوقینوں کا مرکز رہتا تھا۔ وہ لوگ یہاں گاتے تھے، تانیں اڑاتے تھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے کنارے پر جاکر کسی طوائف سے نظارے بازیاں کر لیا کرتے تھے۔ جب خلافت اور کانگریسی تحریکوں کا زور بڑھا تو چوک کے خلافتی اور کانگریسی لوگ اس پارک میں جلسے کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ پارک بالکل سیاسی لوگوں کا اڈا بن گیا۔ اب سہ پہر سے رات گئے تک سیاسی بحثیں ہوتی تھیں۔ ہفتے پیچھے ایک آدھ لیڈر بھی آکر تقریر کر جاتے تھے۔

اس پارک نے چند شاعر بھی پیدا کر دیئے تھے جو فن کے لحاظ سے تو ناقص تھے مگر تھے بڑے حقیقت پسند۔ ان میں ایک کی غزل کہو یا نظم جو بہت چلتی تھی اس کا ٹیپ کا مصرع تھا:

گیارہ پائی فی کس جب ہندستان کمائی ہے

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی پروفیسر نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ ہندستان کا فی کس آمدنی اتنی ہے۔ پھر اس بات کا اس طبقے نے جو ہرن والے پارک میں جمع ہوتا تھا، قوتوں تذکرہ ہوتا رہا اور اس چیز نے متعدد مقرر پیدا کر دیئے تھے کیوں کہ اس چیز نے سیاسی فکر پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس دور میں کسی نے ایک طویل نظم کہی تھی اس میں قابل توجہ بات یہ تھی کہ محبوبہ کہتی ہے ے

میں ہوں لیگی تو ہے کانگریسی جی تیرا میل نہیں

یعنی ان دونوں پارٹیوں کے اختلافات تغزل کی سرحد کو چھونے لگے تھے۔

جواہر لال نہرو

قدیم دور میں فرنگی محل مذہبی تحریکوں کا مرکز رہتا تھا خلافت کی تحریک کا۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سیاست کا بھی دور آگیا اور وہ لائے جواہر لال جی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب میں مسلم یونیورسٹی میں تھا تب وہاں آفتاب ہال قائم ہوا تھا اور ایک نئی یونین بنی تھی "آفتاب مجلس" جس کا میں صدر منتخب ہوا تھا اور تب میں جواہر لال جی کو، جو اس زمانے میں ملک کو سوشلزم کا پیام دے رہے تھے، دہلی سے علی گڑھ لایا تھا۔ اس طرح جواہر لال جی سے کچھ قربت ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں لکھنؤ میں آگیا تھا اور ایک اسٹڈی سرکل بنائی تھی جس میں فرنگی محل کے طلبا اور کچھ ندوے کے طلبا شامل تھے۔ اتفاق سے جواہر لال جی لکھنؤ آئے اور میں نے ان کو فرنگی محل کے اسٹڈی سرکل میں آنے کی دعوت دی جو انھوں نے منظور کر لی۔

جب جواہر لال جی جلسے میں آئے تو جلسے والا مقام فرنگی محل کے لوگوں سے بھر چکا تھا اور چھتوں پر فرنگی محل کی خواتین نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ مجمع بالکل خلاف توقع تھا۔ جواہر لال جی نے اپنی تقریر میں اپنا تازہ پیغام دیا۔ وہ کہنے لگے:

"آزادی کے مطالبے کے لئے یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ آزادی کیا ہوگی اور کس کی ہوگی۔ ہم کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے ہیں جو کسانوں اور زمینداروں دونوں کے لئے، یا والیانِ ریاست اور ان کی رعایا دونوں کے لیے مفید ہو۔ ان گروہوں کے مفاد میں زبردست ٹکراؤ ہے۔ سیاست میں اس بات کو سامنے رکھ کر چلنا چاہیے۔"

جلسے میں کچھ شعرا بھی تھے ان سے غزلیں پڑھوائی گئیں۔ جواہر لال جی نے بہت دل چسپی سے سنیں اور بعض بعض موقع پر تعریف بھی کی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ شاعر حضرات کو اب ایسے لوگوں کے جذبات کی بھی ترجمانی کرنا چاہیے جو ملک و قوم کی خاطر جان اور مال سب لٹا رہے ہیں۔

جواہر لال جی کی تقریر میں جو پیغام تھا وہ اس دور میں بالکل نیا تھا، اس نے بہت جلد مسلم لیگیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

جواہر لال جی اسٹیشن روڈ پر، جو میرے گھر سے تقریباً تین میل ہے، ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ سیدھے چلے آئے تھے میرے یہاں جلسے میں۔ لوگوں نے ان کو آتے دیکھ لیا تھا اور کسی طرح معلوم کر لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔ جب جواہر لال جی واپس آ رہے تھے تو فرنگی محل کے پل سے لے کر امین آباد تک، یہاں وہاں ایسے لوگ اکٹھا ملے جو اپنے نوجوان لیڈر کے درشن کرنے کے منتظر تھے۔

اس دور میں لکھنؤ کی آبادی ساڑھے تین لاکھ تھی اور وہ خطہ جو سیاست میں حصہ لیتا تھا وہ پرانے لکھنؤ سے لے کر امین آباد کے بیرونی سرے تک بستا تھا، شہر کا وسطی حصہ وہ تھا جہاں جواہر لال جی نے تقریر کی تھی اور دوسرا بیرونی حصہ وہ تھا جہاں وہ مقیم تھے۔ اس طرح جواہر لال جی لکھنؤ کے آدھے سیاسی خطے سے گزر گئے تھے اور وہاں کے جوشیلے سیاسی لوگوں نے کسی نہ کسی طرح ان کے درشن کر لیے تھے۔

مولانا شوکت علی

اس بھاری بھرکم لیڈر سے میرا دوسرا قریبی سابقہ پڑا مسلم یونیورسٹی میں۔ وہاں وہ "آفتاب مجلس" کے ایک جلسے میں تشریف لائے تھے۔ اس مجلس کے طلبا جواہر لال جی کی نئی طرز فکر سے کافی متاثر تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندستان کے اصل مسائل ہیں کسان، مزدور اور اوسط طبقے کے بے کار نوجوان۔ اس جلسے میں مولانا نے نوجوانوں کو آزادی کے لیے قربانیاں پیش کرنے کا جوش دلایا۔

تقریر کے خاتمے پر نوجوانوں نے پوچھا،

"ہم کو آزادی سے کیا ملے گا۔؟"

مولانا نے اس کے جواب میں ایک قسم کی شاعری کر دی۔ کہنے لگے کہ "قفس کی چڑیوں سے یہ پوچھو کہ آزادی کیا ہے؟ قیدیوں سے پوچھو کہ رہائی سے کیا ملے گا"... وغیرہ وغیرہ۔

طلبا کے سامنے جواہر لال جی کا سیاسی نظریہ تھا جو بتاتا تھا کہ سچی سیاست جذباتی نہیں ہوتی ہے وہ عوام کے نفع و نقصان کو دیکھتی ہے اور عوام کا مطلب ہے مزدور، کسان اور بے کار نوجوان۔ عوام میں سرمایہ دار زمیندار اور والیان ریاست شامل نہیں۔ اس رو سے طلبا مولانا شوکت علی کی خالص جذباتی تقریر سے اکتا گئے تھے۔

پہلی بار میں نے مولانا کو قریب سے فرنگی محل میں دیکھا تھا، وہ مرید تھے مولانا عبد الباری کے۔ اس لیے ان کے بزرگوں کے عرس میں شرکت ضرور کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک عرس میں ان کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ کھانا نوش فرما رہے تھے۔

دیکھتے دیکھتے وہ پلاؤ کی تین پلیٹیں غارت کر گئے تھے اور اب زردہ کی بھری ہوئی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

میں نوجوان تھا، ورزش کرتا تھا اور میرا قد مولانا کے برابر تھا۔ اس کے باوجود میں نے مولانا کی جو غذا دیکھی تھی، اس کا صرف چھٹا حصہ میرے لیے کافی تھا۔ عرس میں شرکت سے کچھ ہی دن قبل مولانا ایک جلسے میں نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہہ چکے تھے کہ "کم خوردن و کم گفتن و کم خفتن کار خردمندان است" (عقل مند کم کھاتا ہے، کم بولتا اور کم سوتا ہے)

میں نے مولانا کے بارے میں اپنے یہ سب تجربات اپنے ہوسٹل کے طلبا کو سنائے۔ اتفاق سے بعض طلبا خود دیکھ چکے تھے کہ مولانا غذا کے ساتھ کس اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ اس لیے میری باتیں سن کر بڑی سنجیدگی سے یہ بحث چھڑ گئی کہ پیٹ کے رقبے اور عمدہ غذا میں کیا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس بات کو تو سب ہی مان رہے تھے کہ ایک علت ہے اور دوسرا معلول۔ مگر یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ علت کون ہے اور معلول کون۔ آیا اچھی غذا ایذا کرتی ہے کہ پیٹ کے اندر پہنچ کر پھیل جاتی ہے کہ مجھے کہاں کال کوٹھری میں بند کر دیا ہے، بڑھاؤ اس کا رقبہ۔ اور اس طرح وہ دن بدن رقبہ بڑھواتی چلی جاتی ہے۔ یا یہ کہ پیٹ کا رقبہ ایسی شر انگیز چیز ہے کہ جہاں اس کو اچھی غذا ملی وہ مچل جاتا ہے کہ اور لاؤ اور لاؤ۔ جتنا بھی اس کے اندر بھرو، اس کی اور اور کی صدا میں اتنا ہی زور آتا جاتا ہے۔

اس بحث میں ڈاکٹری اور طبی اصول بھی چلے۔ قحط سالی کے تاریخی حوالے بھی چلے، لطیفے اور قہقہے بھی اور چائے کی چسکیاں بھی۔ ایک موقع پر بحث اس نکتے پر دیر تک ٹکی رہی کہ اگر کسی دماغ میں سیاسی خیالات کچے ہوں تو کیا اس کو تکا مرغ راس آسکتا ہے۔؟ آخر دن گزر گیا اور شام ہونے کو آگئی، لیکن فریقین میں سے کسی نے بھی ہار نہیں مانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی برابر کی چھوٹی۔ مگر بحث میں فریقین نے اس بات کا بہت لحاظ رکھا کہ مولانا کی شخصیت کا تذکرہ نہ آئے۔ مگر کنایے کی بات دوسری ٹھہری۔

کچھ ہی عرصے بعد مولانا شوکت علی اپنے ناقص سیاسی خیالات کو لے کر مسلم لیگ میں چلے گئے اور نگینہ جا کر حافظ محمد ابراہیم کے خلاف جو کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیگی امیدوار کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں ایک اور موقع پر جب وہ تقریر کر رہے تھے تو کسی نے ان سے پوچھا کہ

"غریبوں کی روٹی کے لیے مسلم لیگ والے کیا کریں گے۔؟"

انھوں نے جواب میں جو فقرہ کہا اس پر مدتوں تک اخباروں اور جلسوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے کہا——

"روٹی کے لیے لڑتے ہیں کتے!"

مولانا حسرت موہانی

حسرت شاعر بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی۔ لیکن ان کی شاعری ان کی لیڈری میں کہاں تک داخل تھی، یہ بتانا مشکل ہے۔ خود حسرت نے اپنے بارے میں جو کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے ؏

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کی سیاست کا مزاج یہ تھا کہ وہ کبھی کٹر کانگریسی تھے، مگر پھر کمیونسٹ بن گئے، پھر اچانک لیگی بن گئے۔ لیگی بننے کی انھوں نے جو توجیہ پیش کی تھی وہ بڑی زبردست شاعری تھی، اس سے ان کی سیاست کا رنگ واضح ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ میں ایک تقریر میں کہنے لگے:

"لوگ کہتے ہیں کہ تم تو کمیونسٹ تھے، لیگی کیسے بن گئے؟

میں کہتا ہوں دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک ال ہی تو بڑھ جاتا ہے"۔

حسرت اگر کسی چیز میں شروع سے آخر تک پکے رہے تو وہ تھی ان کی اپنے پیر سے عقیدت۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کو آنکھوں کی شکایت ہوگئی اور ان پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس حال میں سفر کرتے ہوئے وہ آرہے تھے۔ جب لکھنؤ قریب آیا تو یہ شعر زبان سے نکل گیا ہے

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

واقعہ تو یہ ہے کہ حسرت کی ساری زندگی جس میں ان کی سیاست بھی آتی ہے شاعرانہ جدوجہد کی تھی۔

مولانا آزاد

ایک مرتبہ لکھنؤ کی فضا میں اچانک بجلی سی چمک گئی۔ یہ یوں ہوا کہ اس شہر میں مولانا آزاد کی پرشکوہ آواز گونج گئی اور اس نے ہندوستان کو جھنجھوڑ دیا۔ کمپنی باغ اس زمانے میں بہت وسیع پارک تھا۔ اس کے بیچ میں ایک عالی شان پنڈال بنایا گیا تھا اور اسی میں آزاد کانفرنس منعقد ہوئی تھی ــــ اس کانفرنس میں، ایک طرف تو ہندوستان بھر کے سابق لیگی تھے جو کسی وجہ سے پاکستان نہیں جا سکے تھے، دوسری طرف تھے وہ مسلمان قوم پرور جن کو یہ دکھ تھا کہ وہ نہ تو ہندوستان کو تقسیم سے روک سکے تھے اور نہ ہندستانی مسلمانوں کو اس بربادی اور قتلِ عام سے بچا سکے تھے جو تقسیم کے ردِعمل میں پھٹ پڑا تھا۔

مولانا آزاد نے اپنی گھن گرج آواز اور پرشکوہ الفاظ میں صرف مسلمانوں کو نہیں سارے ہندستان کو جو پیام دیا تھا وہ کچھ ایسا تھا:

"بوجھ جو سر پر آن پڑا ہے اس کو اٹھانے کی ذمہ داری آج دونوں ہاتھوں پر ہے یعنی ہندوؤں پر بھی ہے اور مسلمانوں پر بھی ــــ اگر اب تک اس ذمہ داری کو نباہنے میں غفلت برتی گئی ہے تو غلطی کی گئی ہے، شدید غلطی کی گئی ہے۔ اب اس غلطی کو جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے بلکہ کفارے کے طور پر زیادہ زور سے کام ہونا چاہیے"۔

مولانا کے اس خیال کی دنوں تک گفتگو، تقریروں اور تحریروں میں بازگشت ہوتی رہی۔

حضرت محل کا مجسمہ

لکھنؤ والوں کی خواہش تو یہ تھی کہ بیگم حضرت محل پارک میں پہلی جنگ آزادی کی ہیروئن کا ایک بڑا مجسمہ لگایا جائے۔ لیکن قدامت پسندوں نے اس کو بے پردگی قرار دے دیا۔ اس وجہ سے مجسمہ نہیں لگایا جا سکا لیکن اس عوامی فتوے اور رواج پر ایک واقعہ نے ایسی ضرب لگائی کہ وہ معقولیت کے حدود سے خارج ہو گیا۔

وہ واقعہ تھا آل انڈیا مسلم لیگ کا لکھنؤ میں جناح صاحب کی صدارت میں اجلاس۔ اس اجلاس میں ایک نئی بات یہ ہوئی تھی کہ لگ بھگ ایک درجن مسلم شریف خواتین نے بلا برقع کے مروجہ لباس یعنی نیم آستین کے بلاؤز اور ساری میں اور ساتھ ساتھ مروجہ لپ اسٹک اور پاؤڈر میں، اجلاس میں شرکت کی تھی۔ ان میں سے تین چار خواتین تو ڈائس پر علماء کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں اور علماء اس بات کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے تھے اب تک پردے کا جو زور تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک سیاسی جلسے میں عورتوں کے لیے چکوں کے پیچھے نشست رکھی گئی تھی، کچھ عورتیں جو برقع میں تھیں وہ ان چکوں سے نکل نکل کر مردانے میں آکر وہاں کی کرسیوں پر بیٹھنے لگیں کیوں کہ زنانے کلاس میں جگہ نہیں رہی تھی۔ مسلمان حاضرین نے عورتوں کی اس حرکت پر شور مچایا۔ وہاں مولانا آزاد موجود تھے۔ انھوں نے کہا:

"اگر خواتین برقع میں ریلوے اسٹیشن جا سکتی ہیں تو اس جلسے میں برقع میں رہ کر کرسیوں پر کیوں نہیں بیٹھ سکتی ہیں؟"

دوسرے دن مسلم اخباروں نے مولانا پر خوب خوب حملے کیے۔ مولانا نے اپنے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ آپ لوگ اپنے اعتراض کو ...

پروفیسر آل احمد سرور

لکھنؤ: کچھ یادیں کچھ باتیں

جنوں ہر دشت و صحرا میں لیے پھرتا تو ہے ہم کو
مگر اک وادیٔ گل کو برابر یاد رکھتے ہیں

اگست ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کی حیثیت سے میں نے کام شروع کیا۔ اس وقت مشہور ادیب اور محقق سید مسعود حسن رضوی صدر شعبہ تھے۔ شعبہ اردو اور فارسی دونوں کا تھا۔ فارسی میں مسعود حسن رضوی کے علاوہ عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی لکچرر تھے اور اردو میں میرے علاوہ سید احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور سید محمد تقی لکچرر تھے۔ تقی صاحب کا چند سال کے بعد انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ عبدالاحد خاں خلیل مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں میرا قیام بیررروڈ (لال باغ) پر تھا۔ یہ حضرت گنج اور یونیورسٹی کے درمیان تھا۔ میں دس منٹ میں سائیکل سے وہاں پہونچ جاتا تھا۔ یونیورسٹی سے پہلے گومتی پر ایک پل تھا جو منکی برج کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام 'ہنومان سیتو' ہے۔ میں جب لکھنؤ پہونچا ہوں تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بشیشور دیال تھے۔ بشیشور دیال ایک تعلقدار تھے۔ سال بھر کے بعد آچاریہ نریندر دیو، وائس چانسلر ہو کر آگئے۔ میرے لکھنؤ یونیورسٹی میں تقرر کے چند ماہ بعد ہی ایران سے ایک ثقافتی وفد علی اصغر حکمت کی قیادت میں آیا۔ اس سے چار یا پانچ سال پہلے جب میں علی گڑھ میں تھا، علی اصغر حکمت ایک اور وفد کے قائد کی حیثیت سے ہندستان آچکے تھے اور ان کے وفد کے ایک رکن پور داؤد کے اقبال کے متعلق ایک جملے کی وجہ سے لاہور میں خاصا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس نشست میں ٹیگور کی بڑی تعریف کی تھی اور انھیں آفاقی شاعر بتایا تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ اقبال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ "اقبال تو ایک مقامی شاعر ہیں۔" بعد میں علی اصغر حکمت کو ایک بیان دینا پڑا تھا جس میں انھوں نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔

غرض جب ۱۹۴۷ء کے شروع میں 'غالباً مارچ میں' علی اصغر حکمت، ڈاکٹر صادقی اور ایک صحافی، ان تین حضرات کا وفد علی گڑھ پہنچا تو وائس چانسلر نے مجھے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اس وفد کا سکریٹری مقرر کیا تاکہ میں لکھنؤ میں ان کی ساری مصروفیات کو منظم کر سکوں۔ علی اصغر حکمت کا یونیورسٹی میں ایک لکچر ہوا تھا جس میں مسعود حسن رضوی صاحب نے فارسی میں ان کا تعارف کرایا تھا۔ شام کو ایک استقبالیہ میں، جو لکھنؤ کے شہریوں کی طرف سے اس وفد کو دیا گیا تھا، شری پرشوتم داس ٹنڈن نے، جو ایک سینیر کانگریسی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت پرجوش حامیوں میں تھے، مجھ سے کہا کہ:

"میں علی اصغر حکمت سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ایران میں عربی الفاظ کو خارج کر کے خالص فارسی الفاظ استعمال کرنے کی جو روش عام ہو گئی ہے اس کے متعلق ان سے بات کروں۔"

وفد کا قیام کارلٹن ہوٹل میں تھا اور میں نے دوسرے دن سہ پہر میں ان کے لیے ملاقات کا وقت طے کر دیا۔ لیکن دوسرے دن صبح ہی حکمت صاحب کو ٹنڈن جی کے متعلق اور زبان کے سلسلے میں ان کے نظریے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دیں۔ بعد میں علی اصغر حکمت نے اس

ملاقات کی رُوداد بتاتے ہوئے کہا کہ "حضرت تو زبان کے معاملے میں بہت کٹر معلوم ہوتے ہیں۔ ایران میں بلاشبہ اس وقت ایک تحریک چل رہی ہے کہ عربی کے ان الفاظ کی جگہ جو فارسی میں استعمال ہوتے آئے ہیں، خالص فارسی کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً شعور، لاشعور، تحت شعور کی جگہ آگہی، ناآگہی، تحت آگہی۔ مگر اس روش کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہو رہی ہے۔ حکمت نے کہا کہ میں تو دوسری زبانوں کے ان الفاظ کو جو ایک عرصۂ دراز سے ہماری زبان میں رائج ہیں، یک قلم خارج کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی مشورہ میں نے آپ کے ٹنڈن جی کو دیا ہے۔

شروع ۱۹۴۷ء میں میں نے شعبہ میں اقبال سوسائٹی قائم کی۔ جس کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عابد حسین نے خیرسگالی کے پیغامات بھیجے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پیغام کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے سفر کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اقبال کے لکھنؤ کے سفر پر جو شبہ ظاہر کیا ہے وہ بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے سپرد انجمن کی خدمت جس طرح کی گئی اس کا حال بھی ملتا ہے۔ پیغام یہ ہے:

انجمن ترقی اُردو ہند

۱۔ دریاگنج۔ دہلی

۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء

۱۹۱۲ء ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا میجر حسن بلگرامی مرحوم اس کے صدر تھے۔ ڈاکٹر اقبال بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ اہلِ جلسہ نے بہت مجبور کیا تو انھوں نے بھی ایک مختصر تقریر کی۔ حضرت صفی کی نظم کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ کانفرنس کے آخری روز شب کے وقت انجمن ترقی اُردو کا جلسہ تھا۔ یہ انجمن کئی سال سے بے غوری کی حالت میں پڑی سسک رہی تھی۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب صدرِ مجلس تھے اور وہی انجمن کے سکریٹری بھی تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی تقریر میں انجمن کے سکریٹری کی خدمت کے لیے مجھے تجویز کیا۔ اس بلا کو سب اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے۔ اب میرے سر منڈھ دی گئی۔ اور بھی دو ایک صاحبوں نے تقریریں کیں۔ سید سجاد حیدر مرحوم نے اپنی تقریر میں بہت افسوس ظاہر کیا کہ ڈاکٹر اقبال جیسا شخص لکھنؤ آیا اور اہلِ لکھنؤ نے کچھ التفات نہ کیا۔ اس پر چند اہلِ لکھنؤ جو اس مجمع میں موجود تھے بہت بگڑے اور اس بحث میں نوک جھونک ہو گئی تھی تھوڑی دیر کے لیے گرمی پیدا ہو گئی۔

اب جو آپ نے مجھے بزمِ اقبال کے قائم کرنے کی اطلاع دی تو معاً یہ واقعہ یاد آ گیا۔ آپ نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ ایک تو ادب کی خدمت کی ہے دوسرے لکھنؤ پر سے الزام رفع ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ دہرے شکریے کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی نگرانی اور ہدایت میں یہ بزم صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔"

—— عبدالحق

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد جو فسادات شروع ہوئے اُن کا اثر لکھنؤ میں زیادہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ جو پنجاب سے لٹ پٹ کر آئے تھے انھوں نے لکھنؤ میں ہنگامہ کرنے کی کوشش کی مگر لکھنؤ والوں نے ان کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ہاں ان لوگوں کو شہر میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر دیا۔ اکتوبر کے آخر میں پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی امداد کے سلسلے میں لکھنؤ کے اُردو دوستوں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مشاعرہ کمیٹی میں میں بھی شریک تھا۔ قرۃ العین حیدر اس وقت انگریزی میں ایم اے کر چکی تھیں اور انھوں نے اس وقت مشاعرہ کے ٹکٹ بھی بیچے تھے۔ لیکن مشاعرہ کے انعقاد سے پہلے ہی وہ اپنی والدہ کے اصرار پر پاکستان چلی گئیں۔ مشاعرہ کے چند روز بعد سردار جعفری مجھ سے ملنے بیرورڈ آئے اور مجھے بتایا کہ دسمبر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک آل انڈیا کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے جس کے لیے ایک

استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل فوراً کرنی ہے۔ سردار نے اصرار کیا کہ میں اس استقبالیہ کمیٹی کا سکریٹری یا یوں کہیے کہ کانفرنس کا کنوینر ہو جاؤں۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ مجھے لکھنؤ آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور ابھی میں لکھنؤ میں ساری اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم نہیں کر پایا ہوں، اس لیے کسی اور کو یہ منصب سونپا جائے۔ اس سلسلے میں میں نے احتشام صاحب کا نام لیا۔ لیکن سردار نے بتایا کہ احتشام صاحب تو کسی طرح اس ذمہ داری کے لیے تیار نہیں ہیں اور آپ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو کانفرنس کے سلسلے میں سارے انتظامات بخیر و خوبی انجام دے سکے۔ بہرحال میں نے ان کی بات مان لی اور انتظامات شروع کر دیے۔ چندہ کی فراہمی کے سلسلے میں تو خود سردار اور سلطانہ دونوں گشت کر رہے تھے اور کانفرنس کے کچھ عرصے بعد ہی دونوں کی شادی کی خبر آ گئی۔ کانفرنس بہت اچھی ہوئی۔ سجاد ظہیر پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری نے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی۔

یہاں یہ لطیفہ بیان کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ جب فراق کانفرنس سے دو دن پہلے مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کا خطبہ تحریری ہو تو اچھا ہے۔ وہ اس پر کچھ برہم بھی ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ اچھی سے اچھی تقریر بات کچھ عرصے کے بعد لوگوں کے دلوں سے محو ہو جاتی ہے جب کہ تحریر کے ذریعہ سے ان خیالات کی تب و تاب باقی رہتی ہے۔ فراق نے میری اس بات کی صداقت کو تسلیم کیا مگر کہنے لگے:

"بھائی مجھے تو مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں لطف آتا ہے۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ فراق کی زبان کے مسئلہ پر یہ تقریر واقعی بڑی شان دار تھی۔ انھوں نے کوئی ایک گھنٹہ تقریر کی ہوگی۔ لیکن لوگ مسحور ہو کر ان کی باتیں سن رہے تھے۔ عرصے کے بعد جب ۱۹۷۳ء میں رام لعل نے غیر مسلم اردو مصنفین کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں کی تو اس میں بھی فراق کی ایسی ہی شان دار تقریر ہوئی۔ اس وقت ٹیپ ریکارڈر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اس لیے افسوس ہے یہ تقریریں ٹیپ نہ کی جا سکیں۔ کانفرنس گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ہوئی تھی۔ عابد سہیل نے نیا دور کے اودھ نمبر (ضمیمہ، جون ۱۹۹۴ء) میں یہ صحیح نہیں لکھا کہ اس کانفرنس کا مشاعرہ امبیسڈر ہوٹل میں ہوا تھا۔ مشاعرہ بھی گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوا تھا اور اس کے صدر آثر لکھنوی تھے۔ اسی مشاعرے میں جگر صاحب نے وہ معرکۃ الآرا غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اسی مشاعرہ میں سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" کا ایک حصہ سنایا تھا مگر لکھنؤ کے قدامت پرست ماحول میں ان کی یہ آزاد نظم چلی نہیں اور ان پر جب ہوٹنگ شروع ہوئی تو انھوں نے یہ سلسلہ جلد ہی ختم کر دیا۔ ویسے یہ مشاعرہ بہت شان دار تھا اور اس میں اثر لکھنوی اور جگر کے علاوہ اختر انصاری، وامق اور بہت سے ترقی پسند شعرا شریک تھے۔ مگر اس مشاعرہ میں جگر کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلا اور اس کا اعتراف سجاد ظہیر نے بھی مشاعرہ کے بعد کیا تھا۔

یاد آتا ہے کہ اردو کانفرنس کے چند روز بعد ہی دسمبر کے آخر ہفتے میں مسلمانانِ ہند کا ایک بڑا اجتماع بھی لکھنؤ میں ہوا تھا جس کے انتظامات میں حافظ ابراہیم اور قاضی عبدالغفار پیش پیش تھے۔ مولانا آزاد نے اسی کانفرنس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فرقہ پرست سیاست کو چھوڑ کر کسی قومی جماعت کے ساتھ ہو جائیں۔ ان کا مشورہ کانگریس میں شمولیت کے لیے تھا۔

بشیشور دیال سیٹھ کا ٹرم جب ختم ہو گیا تو اچاریہ نریندر دیو کا لکھنؤ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اچاریہ نریندر دیو سے پہلے میں ۱۹۳۸ء میں فیض آباد میں مل چکا تھا وہاں ایک لکچر کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو وہاں ایک دوست کے ساتھ اچاریہ نریندر دیو کے گھر گیا۔ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے اور وہاں کے مشہور محلے گلاب باڑی میں ان کا مکان تھا۔ اس زمانے میں وہ کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے۔

۱۹۴۲ء میں ہندستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے ساتھ احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند رہے۔ بعد میں انھوں نے کانگریس چھوڑ دی تھی اور سوشلسٹ پارٹی قائم کی تھی۔

اچاریہ نریندر دیو اُردو سے خاصے آشنا تھے اور انھوں نے ایک گفتگو میں مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں وہ اپنی نانی کے ساتھ فیض آباد کی زنانی مجلسوں میں جایا کرتے تھے جہاں عام طور پر انیس و دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ ان مرثیوں کی وجہ سے وہ اُردو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اچاریہ جی پالی کے ممتاز عالم تھے اور ہندی میں بھی وہ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت رکھتے تھے دلچسپ بات یہ تھی کہ باوجود اس کے وہ ہندستانی کے حامی تھے۔ جب ہندی بولتے تھے تو اچھی خاصی ادبی ہندی ہوتی تھی اور جب اُردو بولتے تھے تو وہ اُردوئے معلّیٰ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ ان سے دریافت کیا کہ یہ تضاد کیوں ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ بھئی میں نظریاتی طور پر ہندستانی کا حامی ہوں لیکن میرا ادبی ذوق کھچڑی زبان کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے اپنی زندگی میں تین ایسے وائس چانسلر دیکھے جنھوں نے اپنے دور میں ان یونیورسٹیوں کو نئی بلندیوں پر پہونچایا جہاں وہ وائس چانسلر رہے۔ اچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سی۔ ڈی۔ دیش مکھ۔ (ڈاکٹر نریندر دیو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ دہلی یونیورسٹی کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) لکھنؤ یونیورسٹی اس زمانے میں ہندستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں گنی جاتی تھی۔ وہاں بیربل ساہنی، بہل اور آر۔ جی۔ مشرا جیسے سائنس داں، سدھانت اور سرینیشت جیسے انگریزی کے استاد اور ڈی۔ پی۔ مکرجی، وحید مرزا، مسعود حسین رضوی، بی۔ این۔ موجمدار جیسے اساتذہ تھے، جن کی شہرت سارے ملک میں تھی۔ ڈی۔ پی۔ مکرجی کے متعلق BEVERLY NICOLS نے کہا تھا کہ انھیں ہندستان میں ایک ہی انٹلکچول ڈی۔ پی۔ مکرجی ملے۔

جب تک میرا قیام ۷، بیرو روڈ لکھنؤ میں رہا، ہر اتوار کو یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ یہ جلسے اتنی پابندی سے ہوتے تھے کہ "نیشنل ہیرالڈ" کے ایڈیٹر کہتے تھے کہ ہم اس جلسے کی اطلاع ضروری نہیں سمجھتے خود ہی اس کی باقاعدگی کی وجہ سے اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ان جلسوں میں لکھنؤ کے بیشتر پرانے اور نئے ادیب شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے استادوں میں جن لوگوں سے میرا ربط و ضبط زیادہ رہا ان میں ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین، نور الحسن ہاشمی، عبد الاحد خاں خلیل اور احسن فاروقی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شعبۂ انگریزی کے شیام کشن نرائن اور دیوکی پانڈے اور شعبۂ اقتصادیات کے ویر بہادر سنگھ اور اودھ کشور شرن اور نصیر احمد خاں اور شعبۂ انگریزی کے ہری کشن اوستھی قابلِ ذکر ہیں۔

شاگردوں میں آل حسن (بی بی سی والے) حنیف فوق، منظر سلیم قاضی عبد الستار، چودھری محمد نعیم، نادر علی خاں، مسعود عالم، امیر احمد صدیقی، احمد جمال پاشا اور عالیہ عسکری (عالیہ امام) یاد آتے ہیں۔

میں جب ۱۹۵۳ء میں بیرو روڈ سے منتقل ہو کر نعمت اللہ بلڈنگ امین آباد میں آ گیا تو ترقی پسند مصنفین کے جلسے یہاں بھی پابندی سے ہونے لگے۔

لکھنؤ کے قیام میں جن ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا، ان میں اثر لکھنوی، آنند نرائن ملّا، کشن پرشاد کول، چودھری محمد علی ردولوی اور حبیب احمد صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اثر لکھنوی سے سب سے پہلی ملاقات چکراتے کے ڈاک بنگلے میں ہوئی تھی۔ اثر صاحب اس زمانے میں دہرہ دون کے کلکٹر تھے اور دورے پر چکراتے آئے ہوئے تھے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے چند ساتھیوں کے ساتھ مسوری سے شملہ کا پیدل سفر کر رہا تھا۔ جب ہم لوگ چکراتے پہونچے تو معلوم ہوا کہ ڈاک بنگلے میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے کیوں کہ وہاں کلکٹر صاحب کا قیام ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلکٹر جعفر علی خاں اثر لکھنوی ہیں۔ ان کا نام سنا تھا اور ان کے مضامین بھی رسالوں میں دیکھے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی کے پاؤں میں چکراتے کے قریب پہونچتے پہونچتے جونکیں لپٹ گئی تھیں اور ان کا موزہ خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ اس لئے ہمیں جلد سے جلد کہیں سر چھپانے کی جگہ کی ضرورت تھی۔ میں نے بالآخر ہمت کر کے اثر صاحب سے کہلوایا کہ "ہم لوگ اس حالت میں یہاں

پہنچے ہیں۔ چکرانے میں کسی سے واقف نہیں ہیں اور آپ کے قیام کی وجہ سے ڈاک بنگلے میں جگہ ملنے کا کوئی سوال نہیں کیا۔ کیا آپ ازراہ مہربانی ایک رات ٹھہرنے کا انتظام کروادیں گے صبح ہمیں اگلے پڑاؤ کے لئے چلنا ہے۔"

اثر صاحب نے نہ صرف ہمارے لئے کمرہ خالی کروادیا بلکہ شام کے کھانے کی دعوت بھی دی تھی اور کھانے کے بعد انھوں نے خاصی دیر تک اپنا کلام بھی سنایا۔ ان سے اس طرح تعارف تو ہو ہی گیا تھا جب میں لکھنؤ پہونچا تو کشمیری محلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور پھر برابر ان سے ملنا ہوتا رہا۔ اس زمانے میں حبیب احمد صدیقی بھی حکومت یوپی میں کسی شعبے کے سکریٹری تھے۔ بجنور کے رہنے والے حبیب احمد صدیقی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ جب وہ اناؤ کے کلکٹر ہو کر چلے گئے تو انھوں نے اثر صاحب کو اور مجھے ایک اتوار کو اناؤ بلایا۔ ہم دونوں کوئی دس بجے کے قریب اناؤ پہونچے۔ کئی گھنٹے میر و غالب کی شاعری پر ہم تینوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور سہ پہر میں ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے۔ اب تک میر کے ایک شعر کی تشریح یاد ہے شعر یہ ہے ؎

لگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

اثر صاحب نے بتایا تھا کہ دستِ بلبل سے مراد وہ ہری پتیاں ہیں جو پھول کے نیچے ہوتی ہیں اور دامانِ گل سے مراد پھول کی پنکھڑیاں۔ یہ ہری پتیاں پانچ ہوتی ہیں اور گویا ایک پنجے کی شکل کی ہوتی ہے اس لیے میر نے ان پتیوں کو دستِ بلبل کہا ہے۔ گویا جس طرح مظلوم کا ہاتھ میدانِ حشر میں ظالم کے گریبان پر ہوگا۔ اسی طرح ان ہری پتیوں کی سی شکل میں بلبل کا ہاتھ پھولوں کے دامن پر ہے۔ اثر صاحب نے اس موقع پر اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ ولی کی مشہور زمین میں ان کا شعر اب تک یاد ہے ؎

مجھے کیا یاد آئے گی کہ ہمدم میں نے دیکھی ہیں
وہ آنکھیں بند ہوتے وقت خواب آہستہ آہستہ

اثر صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ان سے مختلف ادبی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔ میری دعوت پر لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرے میں کئی دفعہ شرکت کی۔ اپنے گھر پر کئی دفعہ میری دعوت کی۔ میرے بعض اشعار کی انھوں نے بڑی تعریف کی اور بعض میں انھوں نے اصلاحیں بھی تجویز کیں۔ میں ان کا باقاعدہ شاگرد تو نہیں رہا لیکن ان سے استفادہ خاصا کیا ہے۔ میر کی عظمت کو انھوں نے ادبی دنیا میں اور واضح کیا، اور "مزامیر" کے ذریعے میر کا ایک بہت اچھا انتخاب پیش کیا۔ جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اقبال سوسائٹی قائم کی تو اس کے افتتاحی جلسے میں انھوں نے اقبال کے اسلوب پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا۔ اثر صاحب نے فیض، سردار جعفری اور بعض دیگر شعراء کے کلام پر قابلِ قدر تنقید بھی کی ہے۔ مجاز کے متعلق ان کا یہ جملہ ایک زمانے میں خاصا مشہور ہوا تھا کہ:

"اردو شاعری نے ایک 'کیٹس' پیدا کیا تھا جسے بعد میں بھیڑیے اٹھالے گئے۔"

میرے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں فراق پر ان کے اعتراضات اور فراق کے جوابات رسائل میں دل چسپی کا مرکز تھے۔ اثر صاحب کو فراق کے کلام کی ناہمواری پر بجا اعتراض تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی رباعیوں میں بعض عریاں اشعار پر بھی۔ فراق صاحب نے سنجیدہ جواب کے بجائے زیادہ تر اثر صاحب کے کلام کے پھیکے پن پر زور دیا تھا اور ان کی شخصیت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ فراق کے کلام میں یہ ناہمواری اور رباعیوں میں کہیں کہیں عریانی مسلم ہے۔ "بہاراں" کے نام سے اثر صاحب کے کلام کا مجموعہ بہت سے جواہر پارے رکھتا ہے۔ "فرہنگِ اثر" کے نام سے نور اللغات کی جو غلطیاں انھوں نے دکھائی ہیں ان کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ لکھنوی تہذیب اس کی نفاست، وضعداری اور دل کشی اثر صاحب پر ختم ہوگئی۔

پنڈت آنند نرائن مُلّا لکھنؤ کی ایک اور اہم شخصیت ہیں جن سے میری خاص قربت رہی ہے۔ وہ میرے یہاں انجمن ترقی پسند

مصنفین کے کئی جلسوں میں شریک ہوئے اور پھر ربط ضبط اتنا بڑھا کہ قریب قریب روزانہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ لکھنؤ کافی ہاؤس کے بڑے دلدادہ تھے۔ جب میرا قیام بیرو روڈ پر تھا تو وہ کسی ٹریبونل کے جج ہو گئے تھے جس کا کام ہندستان و پاکستان کے سابق فوجیوں کے واجبات کا معاملہ طے کرنا تھا۔ انھیں خاصی فرصت تھی۔ بازو خانے سے پہلے دفتر جاتے اور پھر مجھے لیکر کافی ہاؤس کا ایک پھیرا کرتے۔ ملّا صاحب بعد میں لکھنؤ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ لکھنؤ سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب کیے گئے دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے دس سال تک صدر رہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "جوئے شیر" کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ میرا اس پر خاصا مفصل مقدمہ ہے اور میں نے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ چکبست کے بعد جدید لکھنؤ کی شاعری کی بلندی اور عظمت آنند نرائن مُلّا کے یہاں ملتی ہے چکبست کی نظم "خاک ہند" تو مشہور ہے لیکن مُلّا کی نظم "زمینِ وطن اے زمینِ وطن" اپنی غنائیت کی وجہ سے قومی نظموں میں ایک امتیاز رکھتی ہے۔ مُلّا صاحب کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "جوئے شیر" کے علاوہ "کچھ ذرّے کچھ تارے"، "سیاہی کی ایک بوند"، "میری حدیثِ عمر گریزاں" اور "بوضامین نہرو" کے نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کے چند منتخب انگریزی مضامین کا اُردو ترجمہ نیز انجمن ترقی اردو ہند کی کل ہند اُردو کانفرنس منعقدہ جے پور میں ان کا خطبۂ صدارت ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسی خطبے میں انھوں نے کہا تھا کہ ـــــــ

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا"

ان کے یہ اشعار بھلائے نہیں جا سکتے ؎

لبِ مادر سے مُلّا لوریاں جس نے سُنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

"جوئے شیر" کا ایک نسخہ میری نذر کرتے ہوئے انھوں نے یہ رباعی بھی لکھی تھی ؎

یہ حادثہ سالِ چہل و نہ میں ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا
اُردو کے ادیبوں میں جو مقتول ہوئے
مُلّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ مُلّا صاحب نے اقبال کے ان قطعات کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو "لالۂ طور" کے نام سے پیامِ مشرق میں ملتے ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی کے رسالے انڈین لٹریچر میں یہ تراجم چند سال ہوئے شائع ہوئے۔

لکھنؤ میں کئی بار چودھری محمد علی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" عرصہ ہوا شائع ہو چکا تھا۔ ان کی دوسری کتاب "کشکول محمد علی شاہ فقیر" میرے زمانے میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی "نیلم کا نگ" جیسا افسانہ موجود ہے۔ چودھری محمد علی بڑے باغ و بہار انسان تھے۔ عمر تو اس وقت ساٹھ سے متجاوز تھی مگر اپنی زندہ دلی اور شوخیٔ طبع کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے۔ کبھی کافی ہاؤس آجاتے تو تھوڑی دیر کے بعد لوگ اپنی کرسیاں لے کر ان کی دل چسپ باتیں سننے کے لیے پہونچ جاتے اور پھر یہ عالم ہوتا وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ انھوں نے اپنی لڑکی ہما کے نام جو خط لکھے ہیں وہ مکتوب نگاری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چودھری صاحب کے یہاں طنز کے مقابلے میں ظرافت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز پر پرلطف انداز میں تبصرہ کرتے۔ کسی کی دکھتی رگ چھیڑتے تو اس طرح کہ وہ ہنس پڑتا ان کے یہاں طنز کے تیر نہیں ہوتے تھے بلکہ ہلکی سی انجویٔ ملیح کی نوک۔ اسی زمانے میں مراد چودھری کی خود نوشت انگریزی میں شائع ہوئی تھی، اس کے بڑے دانت تھے، اس لیے کہ اس کتاب میں کسی کو بخشا نہیں گیا تھا۔ اقبال کا یہ مصرع ان پر واقعی صادق آتا تھا ؏

عکس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

مولانا عبد الماجد دریابادی سے ملاقات تو رشید صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ ان کے علم و فضل کا قائل تھا لیکن ان کے نقطۂ نظر سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ مولانا عبد الماجد کی ساری زندگی بڑے ... میں گزری۔ انھوں نے فلسفے کی بعض اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ "ہم اور آپ" کے نام سے انسانی نفسیات پر بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ "اکبر کا آخری دورِ شاعری" ... کا ایک

"بدنام شاعر"۔ "محمد علی، ایک ذاتی ڈائری" ان کی یہ تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا اصل کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ ان کی پابندیٔ اوقات اور منظم زندگی قابلِ رشک تھی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب بھی ہے جس میں رعایتِ لفظی کی چاشنی کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک عرصے تک انھوں نے پہلے "سچ" اور پھر "صدق" نکالا۔

'سچ اور صدق' دونوں کے شذرات میں اکثر مغربی تہذیب کے داغ دھبوں کا ذکر ضرور ہوتا اور ان میں عام طور پر جنسی آزادی اور بے راہ روی کے تذکرے ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے کتب خانے میں جنسیات پر بھی خاصا لٹریچر تھا۔ میں جب امریکہ کے سفر سے واپس آیا تو 'ہماری زبان' میں کئی ہفتے تک امریکہ کے قیام کے تاثرات لکھے۔ ایک قسط میں فلپ راتھ کی کتاب PORTNOYS COMPLAINT کا بھی تذکرہ تھا۔ مولانا عبدالماجد نے ایک خط میں اس مصنف کی اور کتابوں کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ میراجی نے اپنی نظم 'لبِ جوئے بارے' میں جس قبیح عادت کا ذکر کیا ہے 'فلپ راتھ' نے اس پر ایک پورا ناول لکھ دیا ہے۔ مولانا کی کتاب "محمد علی: ایک ذاتی ڈائری" پر میں نے لکھنؤ ریڈیو سے تبصرہ کیا تھا اور میں نے گفتگو اس طرح شروع کی تھی:

"یہ ایک پارکھ کا نہیں، ایک پرستار کا کارنامہ ہے۔" اسسٹنٹ ڈائرکٹر اس جملے پر بہت گھبرایا اور مجھ سے کہا کہ "مولانا ہماری مشاورتی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ان کے خلاف یہ جملہ یا تو نکال دیں یا نرم کردیں۔" میں نے جواب دیا کہ حضرت ریڈیو پر فرقہ وارانہ منافرت "پھیلانا" جنس کا برملا اظہار کرنا اور حکومت پر اعتراضات ممنوع ہیں۔ ادبی تنقید کب سے آپ نے ممنوع قرار دے دی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں مولانا محمد علی کو مولانا عبدالماجد جیسے پرستار ملے ویسے خوب پارکھ بھی کسی کو نہیں ملے۔ مجھے اپنے جملے میں ترمیم منظور نہیں۔ چنانچہ یہ اسی طرح نشر ہوا۔

جوش سے بھی لکھنؤ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی بہت دلچسپ تھی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں ایک انجمن "حدیقۃ الشعر" کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ اس انجمن کا میں صدر تھا اور انجمن اردوئے معلٰی کے رشید صاحب۔ جاں نثار اختر اس وقت ایم اے فائنل میں تھے اور وہ ہماری انجمن کے سکریٹری تھے۔ احسان دانش پہلی دفعہ علی گڑھ آئے تھے اور بہت مقبول رہے۔ انھوں نے شاید ایک نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ جوش اس وقت مشاعرہ کے ہال میں داخل ہوئے جب مشاعرہ شباب پر تھا۔ مجاز بھی ان کے ساتھ تھے۔ جاں نثار نے میرے کہنے پر مجاز سے فرمائش کی کہ تم "نذرِ علی گڑھ" پڑھو۔ یہی نظم بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ قرار پائی۔ سب سے آخر میں جوش کا نمبر آیا، انھوں نے ایک قطعہ شروع کیا جس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے ؎

مقامِ شیخ سے واقف ہوں میں بھی
کہ یہ پاپڑ بہت بیلے ہوئے ہیں

خدا کو اور پہچانیں نہ حضرت
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

اس پر ہال میں ایک شور برپا ہوگیا۔ ظفر احمد صدیقی (مرحوم) نے جو فلسفے میں لکچرر تھے، اعتراض کیا کہ جوش صاحب نے بزرگانِ دین کی توہین کی ہے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور کہا کہ اردو شاعری میں زاہد اور شیخ پر طنز کی ایک خاصی پرانی روایت ہے۔ اسی سیاق و سباق میں اس نظم کو بھی دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد مجمع خاموش ہوگیا اور میں نے جوش صاحب سے دوسری نظم پڑھنے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے کہا: نظم کا عنوان ہے "فتنۂ خانقاہ" اور ابھی یہ دو مصرعے پڑھ پائے تھے ؎

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ

زاہد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لاالٰہ

کہ رشید صاحب جو سامنے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہوگئے اور اس ڈر سے کہ کہیں پھر کوئی ہنگامہ نہ ہوجائے، جوش صاحب سے التجا کی کہ آپ کے خزانے میں تو ہر طرح کے ہیرے جواہرات ہیں ایک موضوع پر نظم ہوچکی اب کسی اور موضوع مثلاً فطرت نگاری یا

انقلاب پر کچھ ارشاد ہو۔ رشید صاحب کی بات سن کر جوش صاحب خفا ہو گئے اور کہنے لگے،

"میں یہاں تراویح پڑھنے نہیں آیا ہوں"

اور یہ کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے بعد روش اور احسان دانش دونوں سے باری باری دوسرے دور کے طور پر کچھ سنانے کو کہا۔ احسان دانش نے تو معذرت کر لی۔ روش نے چند شعر میرے کہنے سے سنا دیے اس کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوش صاحب سے پھر ۱۹۳۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں میرے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی ایک دن جب وہ آئیں تو کہنے لگیں کہ جوش صاحب آئے ہیں گھر پر موجود نہیں تھی، چلیے ان سے مل آئیں۔ چنانچہ میں رشید جہاں کے ساتھ مرزا جعفر حسین کے مکان پر بارو دخانے میں جہاں جوش ٹھہرے ہوئے تھے، گیا۔ جوش صاحب بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ مانی جائسی، مرزا جعفر حسین، بسمل شاہ جہاں پوری اور چند اور حضرات موجود تھے ہنسی اور قہقہے کی آواز آرہی تھی۔ رشید جہاں کے داخل ہوتے ہی فضا سنجیدہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رشید جہاں نے ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی اور انھوں نے ایک نظم سنائی۔ نظم سننے کے بعد رشید جہاں نے کہا کہ مجھے اپنے کلینک جانا ہے۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے جوش صاحب دروازے تک ان کو پہونچانے آئے۔ مجھ سے جوش نے کہا "ان کو تو کلینک جانا ہے آپ کی تو ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہے کچھ دیر اور بیٹھیے۔" چنانچہ میں بیٹھ گیا۔

واپس آکر جوش نے اطمینان کی سانس لی اور کہنے لگے "بھئی اب مردانہ ہوا" سب لوگ ہنس پڑے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے مانی جائسی کی شان میں فی البدیہہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔ یہ اشعار فانی کی مشہور غزل ؎

بال سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

کی زمین میں تھے جس کا سامنے کا قافیہ 'مانی' تھا۔

جوش صاحب کئی مرتبہ غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ میرے ہی گھر پر ہونے والا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ جلسے میں شریک ہو جاتے۔ انھوں نے معذرت کی کہ بھائی میں اب سرکاری ملازم ہوں اور آپ کو تو معلوم ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین حکومت کی نظر میں معتوب ہے اس لیے میری شرکت نہ ہو سکے گی۔ کئی ملاقاتوں میں میں نے یہ محسوس کیا کہ جوش صاحب معاصرین کے اعتراف میں زیادہ فیاضی سے کام نہیں لیتے تھے۔

اتفاق سے فیض کے یہ دو شعر حیدرآباد سندھ کے جیل سے سجاد ظہیر کے ایک خط کے ذریعے سے لکھنؤ پہونچے تھے میں نے جوش صاحب کو یہ شعر سنائے اور ان کی رائے طلب کی۔ جوش صاحب نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی اور اتنا کہا 'بہت خوب'۔ ؎

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ایک دفعہ خبر ملی کہ جوش صاحب آئے ہوئے ہیں اور کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں پہونچا تو اتفاق سے اکیلے بیٹھے شغل کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی بوتل اٹھائی اور ایک خالی گلاس میں میرے لیے شراب ڈالنی چاہی۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو پیتا ہی نہیں ہوں۔ بوتل رکھ دی اور سگرٹوں کا ڈبہ اٹھایا۔ میں نے پھر معذرت کی کہ میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ پاس ہی پانوں کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی اب کے انھوں نے ڈبیا اٹھائی اور مجھے پیش کی میں نے آداب کر کے ڈبیا میں سے ایک پان لے لیا تو مسکرا کر بولے:

"شکر ہے کہ آپ نے میرے یہاں کی کوئی چیز تو قبول کی"

وہ آجکل کے ایڈیٹر تھے اور ایسے ایڈیٹر کہ ان کی فرمائش پر میں نے ایک مضمون رسالہ کے لیے لکھا۔ وہ مضمون رسالہ میں چھپ بھی گیا۔ اب لطیفہ یہ ہوا کہ اسی نشست میں مجھ سے شکایت کی کہ آپ کا مضمون اب تک نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مضمون تو چھپ بھی گیا۔ اس پر ہنس کر بولے "ارے آعرشی نے مجھے بتایا ہی نہیں"

۱۹۵۳ء کے شروع میں لکھنؤ ریڈیو سے ایک مشاعرہ ہوا۔ ڈائرکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں جوش صاحب کو اور جگر صاحب کو مشاعرہ میں شرکت کے لیے آمادہ کروں۔ جوش کو لکھا تو انھوں نے پہلے تو ریڈیو والوں کی غفلت کی شکایت کی پھر آنے پر آمادگی ظاہر کی مگر یہ شرط بھی لگائی کہ میں بسمل سعیدی کو بھی دعوت نامہ بھیجوں گا۔ میں نے بسمل سعیدی کے لیے ڈائرکٹر سے بات کی انھوں نے معذرت کی کہ اب کے حسنِ اتفاق سے جتنے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا سبھوں نے آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ اس لیے اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی بات میں نے جوش صاحب کو لکھ دی۔ جوش صاحب نے ذرے برہمی سے مجھے لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے سعیِ بلیغ نہیں کی ہوگی ورنہ ڈائرکٹر آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ خیر میں نے وعدہ کر لیا ہے تو بدرجۂ مجبوری آ ہی جاؤں گا۔"

جوش صاحب آئے، جگر بھی موجود تھے۔ جوش صاحب نے جو نظم پڑھی وہ پہلے سے ڈائرکٹر کو دکھائی نہیں گئی تھی۔ عام طور پر ریڈیو کے مشاعرے میں جو کلام سنایا جاتا ہے اس کی نقل پہلے سے بھیج دی جاتی ہے۔ ڈائرکٹر نے مشاعرہ سے پہلے جوش صاحب سے نظم کی نقل مانگی تو انھوں نے کہا کہ آپ مشاعرہ ہی میں سن لیجیے گا۔ اصرار کرنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ نظم کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

ٹھیکرے بیچنے والوں کو لگے رُانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی
جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اٹھتے ہیں
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

مشاعرے کے بعد جوش تو چلے گئے۔ مگر ڈائرکٹر صاحب بہت گھبرائے ہوئے تھے اور مجھ سے کہنے لگے اب میری خیر نہیں یقیناً مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا۔ دیکھئے صرف تبادلے پر بات ختم ہوتی ہے یا برخاستگی ہوتی ہے۔

میں نے کہا حضرت کچھ نہیں ہوگا۔ آپ گھبراتے نہیں۔ جوش صاحب محکمہ اطلاعات کے ملازم ہیں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھا جائے تو آپ کہہ دیجئے گا کہ آجکل کے ایڈیٹر نے یہ نظم پڑھی تھی۔

بہر حال کچھ نہیں ہوا اور جوش صاحب نے جس دھڑلے سے ریڈیو پر یہ نظم پڑھی اس سے ہم سب کی بڑی ڈھارس بندھی۔ اسی مشاعرہ کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جگر صاحب ایک کونے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا:

"دیکھو! شیر گھاس کھا رہا ہے۔"

اس کے بعد جگر صاحب سے کہنے لگے: "ارے بھائی! اُردو پر یہ برا وقت پڑا اور ہم تم دم بخود بیٹھے ہوئے ہیں۔" جوش صاحب نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس کو میں یہاں دُہرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ صرف مفہوم بیان کیے دیتا ہوں۔

جوش صاحب کے مزاج کا ایک رُخ لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں سامنے آیا۔ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ اچاریہ نریندر دیو وائس چانسلر نے اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ضروری سمجھا اور خاص طور پر جوش اور جگر کو سننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جوش صاحب عام طور پر مغرب کے بعد باہر نہیں آتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے شغل کا وقت ہوتا تھا مشاعرہ نو بجے سے تھا۔ میں نے ان کے دوست حکیم صاحب عالم سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح جوش صاحب کو لے آئیں۔ حکیم صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے اس لئے وہ جوش صاحب کو خود پہنچا گئے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا اتفاق سے جب جوش صاحب پہنچے تو شکیل بدایونی غزل سنا رہے تھے اور داد سے ہال کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ اس پر وہ بہت بدمزہ ہوئے اور کہنے لگے سرور صاحب! آپ نے مجھے کہاں لا کر بٹھا دیا۔ شکیل صاحب کے بعد ساغر نے اپنا کلام سنایا وامق بھی تھے مگر شکیل کے بعد کوئی جما نہیں۔ جب آخر میں میں نے جوش صاحب کو زحمتِ کلام دی تو فرمانے لگے بیاض میں بھول آیا ہوں اور زبانی اس لیے کچھ نہیں سنا سکتا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔ میں نے ان کی کچھ مشہور رُباعیاں یاد دلائیں۔ ایک رباعی یہ بھی تھی ؎

غنچے تیری زندگی پہ دل ہلتا ہے | بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا | یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اسی طرح دو ایک رُباعیاں اور میں نے پڑھیں اور جوش نے

دُہرا دیں۔ بہرحال مجمع میں بے لطفی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اچاریہ جی نے مجھ سے اشارہ کیا کہ اب تم زیادہ اصرار نہ کرو۔ تھوڑی دیر بعد جوشؔ صاحب تشریف لے گئے۔ اب سوچتا ہوں تو شاید جو داد شکیل بدایونی کو مل رہی تھی وہ ان کو ناگوار ہوئی تھی اور ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

جب میں لکھنؤ سے علی گڑھ آ گیا تو ایک دفعہ دہلی جانا ہوا جہاں جوشؔ کے اعزاز میں ایک نشست تھی۔ دہلی کے بعض ممتاز شعرا اور نخشب جارچوی بھی موجود تھے جہاں تک یاد پڑتا ہے شنکر پرشاد اور دلی شنکر کے علاوہ بسمل سعیدی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، ممتاز مرزا سبھی تھے کھانے کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی۔ ہم سب کے بعد جوشؔ صاحب کی باری آئی۔ غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ جب جوشؔ صاحب نے سنانا شروع کیا تھا کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتے رہے۔ متعدد رُباعیاں اور کئی نظمیں سنائیں۔ آواز میں شروع سے آخر تک وہی طنطنہ جو ان کی پہچان تھا۔ نہ کھانسے نہ کھکھارے، نہ بیچ میں پانی پیا۔ ایک توانا لے میں آخر تک اپنا کلام سناتے رہے اور لوگ داد دیتے رہے۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی نیاز فتحپوری اور ان کے رسالے نگار کا قائل تھا۔ جب لکھنؤ پہنچا تو کچھ دن بعد ان سے ملنے گیا۔ صاف ستھرا گھر مردانے میں کتابوں کی الماریاں۔ برآمدے میں ایک کاتب نگار کی کاپیاں لکھ رہا تھا بہت خوش ہوئے نگار میں میرے کئی مضامین شائع ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ مجھ سے اور میرے کاموں سے واقف تھے۔ پھر ان سے متعدد بار ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک انگریزی فلم دیکھنے کی دعوت بھی دی تھی۔ میری کتاب تنقیدی اشارے کا ایک ایڈیشن بھی انھوں نے شائع کیا تھا۔ نیاز صاحب ہمارے لئے ایک بہتر ادیب اور انشا پرداز ہی نہ تھے ان کے رسالے نگار نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔ انھوں نے نگار کے بعض ایسے خاص نمبر نکالے جن کی مستقل ادبی اہمیت ہے۔ وہ چونکہ ہر معاملے میں اپنا ایک مخصوص زاویہ رکھتے تھے اس لئے مومنؔ کو غالبؔ پر ترجیح دینا اور جوشؔ کے مقابلے میں علی اختر حیدرآبادی کو بڑھایا مگر اس کے باوجود نگار کے مضامین اور شعروں کی اہمیت مسلم ہے۔ انھوں نے کتنے ہی لوگوں کے تاج آتارے اور کتنے گمنام شعرا کو تاج پہنائے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے بہت سے علمی مضامین کی انگریزی کتاب میں قاموس کا چربہ ہوتے تھے اور بعض نوجوانوں کے مضامین انھوں نے اپنے نام سے شائع کئے

پھر بھی عربی فارسی اور اردو ادب پر ان کی گہری نظر، زبان و بیان کے اسرار و رموز سے ان کی گہری واقفیت، ان کا قاموسی علم ان کے ادبی قد کی بلندی کا ضامن ہے۔

نیاز صاحب اپنے کو لیے دیے رہتے تھے۔ وہ صرف ایک ادیب ہی نہیں بلکہ دانشور بھی تھے۔ ان کی تصنیف "من و یزداں" اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ انھوں نے اپنی محنت اور کوشش سے یہ ثابت کر دکھایا کہ صرف ادیب کی حیثیت سے بھی انسان ایک باعزت اور کامیاب زندگی گذار سکتا ہے۔ ان کا اپنا پریس تھا جہاں سے رسالہ نگار اور ان کی تصانیف طبع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار وہ دوسروں کی کتابیں بھی شائع کرتے تھے نیاز صاحب کے یہاں ہر کام کا وقت مقرر تھا۔ ایک دفعہ میرے یہاں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ گھڑی دیکھی تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا خیریت۔ بولے کہ میں گوشت خود لاتا ہوں دیر ہو گئی تو جیسا چاہتا ہوں نہیں ملے گا۔ ان کی کچھ مولویوں اور خصوصاً مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہمیشہ جنگ رہی ایک دفعہ تو انھیں ایک معذرت نامہ بھی شائع کرنا پڑا مگر ان کی خو ان سے چھیڑ چھاڑ کی عادت گئی نہیں۔ نیاز کی جوانی کی تحریروں میں بانکپن ضرور ہے مگر وہ اب کچھ مصنوعی سی لگتی ہیں۔ کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ایک زمانے میں انھوں نے بمبئی کے ایک سیٹھ سے مل کر ایک فلم بنانے کی سوچی تھی۔ فلم کا نام آنسو تجویز کیا گیا تھا۔ حضرت گنج میں ایک دفتر کرائے پر لیا گیا اور مسعود علی فروتی گونڈے سے آ کر ان کے معاون ہوئے مگر چند مہینوں بعد ہی یہ ساری اسکیم مالی مشکلات کا شکار ہو گئی۔

مجھے نیاز صاحب کے پاکستان جانے پر سخت تعجب ہوا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے نہیں بلکہ کچھ خانگی معاملات کی وجہ سے ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے خاصی عمر میں اپنی بڑی سالی سے عقد کر لیا تھا۔ ان سے اولاد اور اپنی پہلی بیوی سے اولاد میں اختلاف ہوا اور بالآخر نیاز صاحب کو کراچی جانا پڑا اور جب انھوں نے مجھے اپنے جانے کی اطلاع دی تو میں نے مومن صاحب کا مشہور شعر انھیں یاد دلایا تھا۔ ان کے اور جوشؔ کے جانے کا مجھے اب تک افسوس ہے

سنز نائیڈو سے میری ملاقات پہلے حیدرآباد کی اردو کانفرنس میں ۱۹۴۴ء اور پھر PEN کی کانفرنس میں جے پور میں ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی لیکن جب وہ اتر پردیش کی گورنر ہو کر آئیں تو ان سے ملاقاتیں جلد

جلد ہی ملاقات ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۰ء کے دسمبر میں جامعہ اردو کانفرنس ہوئی تو یوں کہ اسی وقت ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس ہندوستانی اکیڈمی میں ہو رہی تھی۔ اس کے ارکان کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگ کانفرنس کے بعد انھوں نے رات میں ایک مشاعرہ کیا جس میں شعراء کے علاوہ ان ادیبوں کو بھی بلایا تھا جو کانفرنس میں شریک تھے اور اس وقت تک لکھنؤ میں موجود تھے۔ ایک اور لکھنؤ کی نشست یاد آتی ہے جس میں مشہور انگریزی شاعر لوئی میک نیس نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اس نے اپنی ایک نظم I AM NOT YET BORN سنائی تھی اور بعد میں بتایا کہ وہ اب تک کنوارا ہے۔ نظم کا آغاز اس نے بہت دھیمے اور دھیمی آواز میں کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور آخری بند اس نے بڑے جوش سے پڑھا۔ ہمارے شعرا جو ترنم سے اپنا کلام سناتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تحت اللفظ میں شاعر کے جذبے کے اتار چڑھاؤ کی عکاسی جس طرح ہو سکتی ہے وہ ترنم میں نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اس کے مصرعے "شبنم کا قطرہ ہوا نکلا پکارے" کو ترنم سے پڑھنا غلط ہوگا۔ اس کا جادو صرف تحت اللفظ میں کھلتا ہے۔ میک نیس جب اپنا کلام سنا چکا تو اس کے بعد سروجنی نائیڈو نے حاضرین میں سے چند کا اس سے تعارف کرایا۔ مجاز بھی اس نشست میں موجود تھے ان کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے انگریزی شاعر سے کہا Now, meet our poet Majaz

فراق صاحب کسی سلسلے میں لکھنؤ آئے اور مجھ سے ملے۔ تھوڑی دیر میں کہنے لگے سروجنی نائیڈو سے مل آئیں۔ میں نے ان کے سکریٹری سے ٹیلی فون پر وقت مانگا۔ اس نے کہا فوراً آجائیے گورنر صاحبہ منتظر ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دروازے پر ان کے سکریٹری مسٹر گر نے بڑی لجاجت سے کہا۔ گورنر صاحبہ زیادہ وقت نہ لیجئے گا۔ ہمارا سارا کام پڑا ہے۔ دستخط کرانا ہے۔ میں نے کہا جی ہم تو اس وقت اٹھیں گے جب اجازت ملے گی۔ ان سے دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ کوئی پون گھنٹے بعد ہم نے اجازت چاہی تو ارشاد ہوا کہ جلدی کیا ہے۔ ابھی بیٹھو۔ غرض گھنٹہ بھر کے بعد اجازت ملی تو ہم لوگ باہر آئے۔

لکھنؤ کی یاد آتی ہے تو رشید جہاں بھی یاد آتی ہیں۔ رشید جہاں کا کلینک میرے گھر سے قریب لال باغ لکھنؤ روڈ پر تھا۔ ان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں نے ان کے پیشے پر اثر ڈالا۔ ورنہ وہ بہت اچھی ڈاکٹر تھیں بھی وہ آگے تھیں۔ ایک اچھی سیاسی اور سماجی کارکن اور ممتاز افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانی جاتی تھیں۔ رشید جہاں ایک شعلہ جوالہ تھیں اور یہ شعلہ بہت جلد بجھ گیا۔ ان کے یہاں برکھا اور شفقت، محبت اور نفرت دونوں میں بڑی بے ساختگی تھی۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں برستی رہتی تھیں اور تھوڑی دیر بعد محبت کے پھول۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ تھا جس نے جگر صاحب سے شرکت کا وعدہ لے لیا تھا۔ مشاعرہ سے کچھ دیر پہلے میں نے رشید جہاں کو اس کام پر مامور کیا کہ جگر صاحب کو لے کر یونیورسٹی آجائیں اور خود مشاعرہ گاہ کے انتظامات کے سلسلے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں رشید جہاں جگر صاحب کو لے کر پہنچیں۔ بعد میں انھوں نے بتایا کہ جگر صاحب شروع میں کچھ بے نیاز اور کھوئے کھوئے سے رہے اور ان کے چہرے سے معلوم ہوا کہ ان کو میرا آنا پسند نہیں آیا ہے۔ مگر جب میں نے ان کے بعض اشعار جو مجھے یاد تھے پڑھے اور ان کی بڑی تعریف کی تو ان کے چہرے پر شگفتگی بھی آئی اور اپنائیت کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ رشید جہاں نے اپنی شخصیت کے جادو سے جگر صاحب کی بے نیازی کی برف کو پگھلا دیا۔ ایک دفعہ میں ان کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ سجاد ظہیر کمرہ میں داخل ہوئے۔ پیچھے پیچھے رکشہ والا پیسوں کے لئے آ رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے بیٹھ کر نہایت اطمینان سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا پرس نکالا۔ کچھ پیسے گن رہے تھے کہ رشید جہاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جھنجلا کر کہنے لگیں۔ "ارے بنے، یہ رکشہ والے کو پیسے دینے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو۔ جتنی دیر تم نے اسے پیسے دینے میں لگائی ہے اتنی دیر میں تو وہ ایک پھیرا اور کر لیتا۔ تمہاری اسی سستی کی وجہ سے ہی میں نے تم سے شادی نہیں کی۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو یقیناً میں تمہیں قتل کر دیتی۔" میں بہت گھبرایا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے مگر سجاد ظہیر کی طرف دیکھا تو اس طرح مسکرا رہے تھے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رشید جہاں کو کینسر کا موذی مرض تھا۔ علاج کے لئے بمبئی گئیں۔ کچھ دن بعد واپس آگئیں تو مرض نے پھر زور پکڑا۔ اب انھوں نے یہ طے کیا کہ ماسکو جا کر اپنا علاج کرائیں گی۔ دراصل وہ جانتی تھیں کہ ان کا مرض لاعلاج ہے لیکن ان کے ہمراہ جانے کے لئے ان کے شوہر محمود الظفر کو اجازت مل سکتی تھی اس لیے انھوں نے طے کیا کہ ماسکو جا کر علاج کرائیں گی مگر خاصی دیر ہو چکی تھی اور وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

۳۲ء میں جب انگارے کی اشاعت ہوئی تو اس میں سجاد ظہیر، احمد علی اور

مجموعہ 'نظر' کے علاوہ رشید جہاں کے افسانے بھی تھے۔ ان کے افسانے اور ڈرامے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے بار بار نشر ہوتے رہے۔ پھر وہ ... کے نام سے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ اردو افسانے کی تاریخ میں ان کا نام محفوظ ہے۔

لکھنؤ کا ذکر نامکمل رہے گا اگر بیگم اختر کا نام نہ لیا جائے۔ بیگم اختر اس زمانے میں مجمع عام میں نہیں گاتی تھیں۔ صرف ریڈیو پر کبھی کبھار ان کا کلام سننے کو مل جاتا تھا۔ چند بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا اور ان کے شوہر اشتیاق عباسی بیرسٹر سے ملاقات بھی ہوئی۔ بڑے نستعلیق آدمی تھے اور غزل کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا تھا کہ ریڈیو پر کسی شاعر کا کلام سنایا جا رہا ہے اس میں بیس پندرہ منٹ کی بات چیت ہے اور اس کے بعد بیگم اختر پندرہ منٹ ان کا کلام سازوں کے ساتھ پیش کر رہی ہیں۔ ایک دفعہ نظیر اکبرآبادی پر ایک پروگرام تھا۔ میری تقریر کا عنوان تھا نظیر اور عوام۔ تقریر خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ نیاز انصاری پروڈیوسر نے کہا سرور صاحب تقریر لمبی ہے۔ اس کے بعد بیگم اختر ان کی کچھ نظمیں گائیں گی ان کے لیے بھی وقت چاہیے۔ میں نے کہا کہ آخر کا کچھ حصہ چھوڑ دوں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ مگر ہوا یہ کہ میں رو میں بہتا چلا گیا اور تقریر جو پندرہ منٹ میں ختم ہونی چاہیے تھی ۲۳ منٹ لے گئی۔ دیکھا تو شیشے کے پیچھے نیاز انصاری اور بیگم اختر بدحواس کھڑے ہیں۔ میں نے باہر نکل کر معذرت کی کہ مجھے خیال نہ رہا مگر بیگم اختر نے مسکرا کر کہا سرور صاحب کوئی بات نہیں میرا کام آسان ہو گیا اب دو کے بجائے ایک ہی نظم پیش کروں گی۔ ۱۹۶۲ کے آخر میں دہلی میں ہم لوگوں نے لال قلعہ میں بزم ظفر کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کی یاد میں ایک جشن منایا تھا جس کا افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور بڑے جوش سے یہ کہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ مغل باہر کے تھے جب وہ ہندوستان میں بس گئے تو ہندوستانی ہو گئے۔ اس موقع پر بیگم اختر نے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل جس کمال فن کے ساتھ گائی تھی اس نے تمام سامعین پر جادو سا کر دیا تھا۔ یہ دو شعر انھوں نے خاص طور پر بڑی پرسوز لے میں گائے تھے۔ اب تک ان کی یہ پرسوز لے کانوں میں گونجتی ہے۔

عمرِ عزیز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بیگم اختر کی پرسوز لے یاد آئی تو ذہن راجہ محمود آباد کی مرثیہ خوانی کی طرف گیا۔ کچھ عرصہ ہوا نیر مسعود کا لکھنؤ کی مرثیہ خوانی پر ایک بہت اچھا مضمون نظر سے گذرا تھا۔ اس میں صرف یہ کمی تھی کہ راجا محمود آباد کا ذکر نہ تھا۔ راجہ صاحب کے والد مہاراجا محمود آباد کا ذکر مسلمانوں کی سیاست، لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی نمایندگی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جدوجہد کے سلسلے میں بار بار آتا رہے گا۔ ان کے یہ بیٹے سیاست کے ایک اہم رکن بھی تھے مگر ان کی مرثیہ خوانی کے طرز سے یہاں غرض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ فن دولھا صاحب عروج سے سیکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے انھیں علی گڑھ کی ایک مخصوص مجلس میں سنا تھا پھر رام پور میں اور اس کے بعد آل رضا کے یہاں کی مجلس میں۔ لکھنؤ میں جن لوگوں نے ذوالفقار بخاری کو ریڈیو پر اقبال کا کلام اور انیس کے مرثیے پڑھتے سنا وہ کہتے ہیں کہ ذوالفقار بخاری اس فن کے آخری امام تھے۔ مجھے ان سے اختلاف ہے۔ ذوالفقار بخاری یقیناً اس فن کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے مگر راجا محمود آباد کی بات ہی کچھ اور تھی۔ راجہ صاحب موسیقی کے اسرار و رموز سے واقف تھے اور ان کی آواز میں قدرتی لحن تھا۔ میں نے محسن جونپوری کو بھی سنا ہے اور لکھنؤ کی مجلسوں میں بعض دیگر حضرات کو بھی مگر راجہ صاحب کی مرثیہ خوانی میں جو تاثیر اور اس کے ساتھ تلفظ کے امکانات کی جو ترسیل تھی وہ مجھے ان کے معاصرین میں کسی کے یہاں نظر نہ آئی۔ راجہ صاحب کو صحت الفاظ کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ان سے ایک ملاقات میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

راجہ صاحب کہنے لگے سرور صاحب عجز کے بجائے عِجز کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ حضور والا انشاء نے انیسویں صدی کے آغاز میں دریائے لطافت لکھی اس میں ہماری زبان کے لیے آزادی کا یہ صحیفہ موجود ہے کہ کوئی عربی یا فارسی کا لفظ جس طرح اردو میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے۔ خواہ از روئے اصل غلط ہی کیوں نہ کہا جائے۔ اس کے بعد میں نے آتش کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

دختر رز میری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

میں نے مزید کہا کہ آتش کے اس شعر پر کسی نے ان کے سامنے اعتراض کیا اور کہا کہ حضرت صحیح لفظ بیگم نہیں بیگُم ہے۔ آتش نے کہا کہ جب ہم ترکی بولیں گے تو بیگُم ہی بولیں گے اور لکھیں گے اور جب اردو بولیں گے

بیٹھ گئیں اور بجھنے لگیں. راجہ صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے. جس زمانہ میں کرنل بشیر حسین زیدی علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا کہ اب مرثیہ خوانی کے فن کے آخری بڑے نمائندے راجہ صاحب رہ گئے ہیں. اگر کسی طرح یہ ہو سکے کہ وہ آپ کے یہاں ایک مخصوص نشست میں اساتذہ کی تصنیف مرثیہ پڑھیں اور اسے ٹیپ کر لیا جائے تو کتنا اچھا ہو. زیدی صاحب نے راجہ صاحب کو مدعو کیا اور وہ تشریف لے آئے مجلس جب شروع ہوئی اور راجہ صاحب آ کر منبر پر بیٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ فرش پر مائک بھی رکھا ہے بس خفا ہو گئے کہنے لگے کہ زیدی صاحب اس کو ہٹوائیے میری اور مائک کی ازلی دشمنی ہے میں اس طرح مرثیہ نہیں پڑھ سکتا. مجبوراً مائک ہٹا دیا گیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز سے تقریباً ایک گھنٹہ اپنا تمام مرثیہ سنایا. سامعین ہر بند پر داد دیتے رہے. جب مجلس برخاست ہوئی اور سب لوگ چلے گئے تو میں نے راجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی شکایت کی کہ اگر یہ مرثیہ ٹیپ ہو جاتا تو آپ کی آواز بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جاتی. اب تو اس کی گونج صرف فضا میں رہ جائے گی. راجہ صاحب کچھ نرم پڑے اور کہنے لگے اچھا اب کے آیا تو پھر آپ کی خاطر اپنے مرثیے کو ٹیپ بھی کرا دوں گا مگر میں جانتا تھا کہ انھوں نے یہ ٹالنے کے لئے کہا ہے.

یونیورسٹی میں جن لوگوں سے قریب رہا ان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین اور نور الحسن ہاشمی یاد آتے ہیں. مسعود صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۳ میں ہوئی تھی جب میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ڈبیٹ میں شرکت کے لئے گیا تھا. موضوع تھا. شاعری بیکاری کا شغل ہے. ججوں میں جسٹس وزیر حسن اور مسعود حسن رضوی تھے مجھے دوسرا انعام ملا تھا. مباحثے کے بعد ڈاکٹر مسعود حسن صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے میری تقریر کی تعریف کی تھی. میں نے کچھ دن پہلے ان کی کتاب ہماری شاعری پڑھی تھی جو مجھے آگرہ کے مباحثے میں انعام میں ملی تھی اس کی بھی بات ہوئی. اس وقت مسعود صاحب کے داڑھی تھی. یہ یاد پڑتا ہے کہ اس مختصر سی ملاقات میں نہ جانے کس سلسلے میں انھوں نے بیخود موہانی کی خاصی مذمت کی تھی. بعد میں معلوم ہوا کہ شروع میں دونوں کے خاصے گہرے مراسم تھے لیکن پھر اختلاف ہو گیا تھا. ۳۹-۱۹۳۸ء میں جب میرا لکھنؤ کئی بار جانا ہوا تو میں مسعود صاحب سے ملنے کے لئے ایک شاگرد صفدر حسین کے ساتھ ادبستان پہنچا. اطلاع کرائی تو ہم لوگوں کو ایک کمرہ میں بٹھلا دیا گیا. صفدر کے مزاج میں شوخی بہت تھی جب مسعود صاحب کے برآمد ہونے میں کچھ دیر ہوئی اور مجھے بے چین دیکھا تو صفدر نے ہنس کر کہا کہ مسعود صاحب میک اپ کر رہے ہوں گے آتے ہی ہوں گے اور واقعی جب وہ کچھ دیر بعد تشریف لائے تو شیروانی اور ٹوپی میں تھے گویا کسی سے ملنے باہر جا رہے ہوں. دیر تک ان سے دنیا جہان کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی. مسعود صاحب ہر جملہ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح ادا کرتے تھے کہ لفظوں کی معنویت پوری طرح آشکار ہو جائے. اس گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے ادبی ہیرو محمد حسین آزاد، انیس اور واجد علی شاہ ہیں. اس ملاقات کے بعد کانپور کی اردو کانفرنس میں فائز دہلوی پر ان کا مقالہ سنا. ان کے پڑھنے کے انداز میں بھی بڑی دلکشی تھی.

جب ۱۹۴۶ میں میرا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی میں ہو گیا تو ان سے روزانہ ملاقات ہونے لگی. وہ صدر شعبہ تھے شروع میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ مسعود صاحب کچھ مجھ سے کھنچے کھنچے رہتے تھے. وہ صدر شعبہ کے کمرے میں الگ بیٹھتے تھے. دوسرے کمرے میں عبد القوی فانی اور یوسف حسین موسوی فارسی کے استاد اور میں احتشام حسین، نور الحسن ہاشمی اور محمد لقمان سب کی نشست ہوتی تھی. احتشام صاحب سے ۱۹۳۹ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ملاقات ہو چکی تھی. نور الحسن ہاشمی علی گڑھ میں میرے شاگرد رہے تھے. سید محمد تقی نئے نئے آئے تھے. یہ سید محمد حسین صاحب کے صاحبزادے تھے جن کا کچھ مہینے پہلے انتقال ہوا تھا. عبد القوی فانی صاحب اور یوسف حسین موسوی صاحب دونوں کا محبوب مشغلہ مسعود صاحب کو برا بھلا کہنا تھا. تین دن تک تو میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر میں نے کہا کہ میری زندگی کا واحد مقصد مسعود صاحب کی مخالفت نہیں ہے. ہمارا شعبہ اردو اور فارسی کا ملا جلا شعبہ ہے. مسعود صاحب خود اردو کے ممتاز محقق اور ادیب ہیں مجھے توقع یہ ہے کہ اردو کے نصاب و تدریس کے سلسلے میں مجھ سے بھی مشورہ کرتے رہیں گے. اگر میں انھیں کوئی غلط بات کرتے ہوئے دیکھوں گا تو ضرور مخالفت کروں گا. لیکن ویسے ہر معاملے میں ان سے تعاون کروں گا. اس کے بعد ان لوگوں نے میرے سامنے ان کی برائی کرنا چھوڑ دیا. چند مہینے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے مضمون کا نام صرف اردو نہیں بلکہ اردو مع فارسی ہے. بی اے کے اردو کے نصاب میں ایک پرچہ فارسی کا بھی ہے

اور فارسی کے پرچہ میں پاس ہونا لازمی ہے۔ ورنہ طالب علم مضمون میں فیل سمجھا جائے گا۔ میں نے مسعود صاحب سے کہا کہ جہاں تک بی اے کے اردو کے نصاب میں فارسی کے پرچے کا سوال ہے میں بھی اس کا حامی ہوں کیونکہ اردو ادب میں بی اے کرنے والوں کو کچھ فارسی ادب بھی آنا چاہیے لیکن مضمون کا نام اردو مع فارسی نامناسب ہے صرف اردو ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ فارسی کے پرچہ میں اگر فیل ہو تو اس کے معنی یہ نہ ہونا چاہیے کہ پورے اردو کے پرچہ میں فیل ہے۔ مسعود صاحب نے میری تجویز سے اختلاف کیا تو میں نے فیکلٹی کی ایک میٹنگ میں اردو کا الگ شعبہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی مگر اکیڈمک کاؤنسل میں جا کر یہ تجویز سیاست کا شکار ہو گئی مسعود صاحب اس سلسلے میں بالکل خاموش رہے نہ مخالفت کی نہ موافقت احتشام صاحب نے بھی سکوت اختیار کیا لیکن میری تجویز کا اثر یہ ہوا کہ اردو کا ایک الگ بورڈ آف اسٹڈیز بنا دیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس کے لیے بیرونی ممبروں کے نام تجویز کروں۔ میں نے رشید احمد صدیقی اور قاضی عبد الغفار کے نام تجویز کئے۔ مسعود صاحب نے ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کا نام تجویز کیا جو میں نے منظور کر لیا۔ جب اردو بورڈ کی پہلی میٹنگ ہوئی تو اس میں رشید صاحب اور عبد الستار صدیقی دونوں موجود تھے۔ قاضی عبد الغفار تشریف نہیں لا سکے تھے۔ اس میٹنگ میں خود مسعود صاحب نے یہ تحریک پیش کی کہ مضمون کا نام صرف اردو ہوگا اور فارسی کے پرچے میں پاس ہونے کی شرط نہ ہوگی۔

ایک دفعہ اور ممتحنوں کے ناموں کی سفارش پر کچھ معمولی سا اختلاف ہو گیا۔ وائس چانسلر نریندر دیو نے میری تائید کی تو مسعود صاحب نے میرے مجوزہ نام مان لئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مسعود صاحب سے ربط ضبط بڑھنے لگا احتشام حسین اور نور الحسن ہاشمی کا تو ساتھ رہتا ہی تھا۔ ہم تینوں بلا ناغہ لکچروں کے بعد کچھ دیر کے لئے اسٹاف کلب میں جس کی عمارت پاس ہی تھی ہم لوگ ضرور جایا کرتے تھے۔ مسعود صاحب اکثر الہ آباد کی اپنی ملازمت کا ذکر کیا کرتے تھے جہاں ان کا کام سال بھر کی اردو مطبوعات پر تبصرہ لکھنا ہوتا تھا۔ کیننگ کالج کے مشاعروں اور لکھنؤ کی ادبی شخصیتوں کا بھی ذکر رہتا۔ عام طور پر وہ سوٹ میں ہوتے لیکن کبھی کبھی شیروانی میں بھی۔ شیروانی ان پر زیادہ جچتی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ شعبہ میں تشریف لاتے۔ عام طور پر ان کے ساتھ آٹھ دس کتابیں بھی ہوتی تھیں جو چپراسی لا کر ان کی میز پر رکھ دیتا تھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ دو پیریڈ روزانہ پڑھانے کے بعد کچھ دیر ساتھیوں سے بات چیت ہوتی اور ڈھائی بجے کے قریب وہ گھر چلے جاتے۔ میں نے ان کو یونیورسٹی کے کسی جلسے یا فنکشن میں شریک ہوتے نہیں دیکھا صرف فیکلٹی کی میٹنگ میں شریک ہوتے تھے لیکن میں اور احتشام صاحب یونیورسٹی کے بیشتر علمی اور ادبی اجتماعات میں موجود رہتے تھے اور ہم دونوں کا اساتذہ کی ایسوسی ایشن اور طلبہ کی یونین سے بھی ربط ضبط تھا۔

مسعود صاحب لکھنؤ کی بعض صحبتوں اور شخصیتوں کے دلچسپ قصے سناتے تھے اور جب لکھنؤ کے ایک اجتماع میں مولانا عبد الماجد دریابادی نے شوق قدوائی پر اپنا مضمون "اردو کا ایک بدنام شاعر" کے عنوان سے پڑھا تو اس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ نثر کا حصہ تو مولانا ماجد نے پڑھا تھا اور شوق کے جتنے اشعار تھے وہ مسعود حسن رضوی نے پڑھے تھے غالباً یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ شاید مولانا ماجد کے پڑھنے میں شعریت کا خون ہو جاتا تھا اور مسعود صاحب کے پڑھنے کا انداز نہایت دلنشین تھا۔ وہ لکھنؤ کے ایک اور بزرگ کا قصہ بھی سناتے تھے جن کو غالب کی شاعری، گڑمبہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ آرزو لکھنوی اور یاس یگانہ دونوں کے قائل تھے۔ یوسف حسین موسوی صاحب مسعود صاحب پر اس وجہ سے معترض ہوتے تھے کہ وہ میر، غالب، انیس، سعدی، حافظ، صفی، ثاقب سب کے قائل تھے جبکہ موسوی صاحب صرف عرفی کے ماننے والے تھے۔ کہتے تھے کہ سرور صاحب بات کیا ہوئی مسعود صاحب سب کے قائل ہیں۔ مولوی عبد الحق کو مسعود صاحب سے شکایت یہ تھی کہ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کا الگ شعبہ اپنی زندگی میں الگ نہیں بننے دیا۔ جوش کہتے تھے کہ مسعود صاحب کو جدید ادب سے کوئی ہمدردی نہیں ہے وہ صرف قدیم کے عاشق ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں ایک مرتبہ کہنے لگے۔ مسعود صاحب کی گھڑی تو مدت ہوئی بند ہو چکی۔

یہ بات تو صحیح تھی کہ جدید میلانات سے نہ مسعود صاحب واقف تھے نہ ان کو کوئی ہمدردی تھی لیکن ان کی نظر میں کلاسیکی ادب کے سارے اسرار و رموز تھے۔ ایک محقق ادیب اور زبان داں کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ لکھنؤ میں عام طور پر انیس کا اس قدر دبدبہ تھا کہ لوگ صرف انھیں کا کلام پڑھتے تھے۔ مسعود صاحب بھی انیس کے بڑے مداح تھے لیکن میر و غالب کی عظمت بھی ان پر روشن تھی۔ ہاں اقبال اور نظیر اکبرآبادی کے معاملے میں

وہ خاموش رہتے تھے۔ ایک مرتبہ الٰہ آباد کے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بڑا لطف لیکر ثاقب کا یہ شعر سنایا ؂

آپ کا تھا گناہ گار ہیں نہ کہ برق و باد کا
جس پہ مزار تھا مرا اب وہ زمین صاف ہے

میں نے قافیے کے استادی کے ساتھ برتنے کی تعریف کی لیکن یہ مضمون مجھے بہت روایتی معلوم ہوا اور دوسرے دن اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر میں نے مسعود صاحب کو سنائی مطلع اور ایک شعر میں صاف کا قافیہ اس طرح نظم کیا تھا۔ ؂

مجھ کو گلہ نہیں اگر سارا جہاں خلاف ہے
آپ تو مہربان ہیں آپکا دل تو صاف ہے
سود و زیاں کا ذکر کیا جب ہو جنوں کا کاروبار
آج ہیں سب کو الجھنیں میرا حساب صاف ہے

مسعود صاحب نے میرے ان اشعار کی بہت تعریف کی۔

مسعود صاحب کے ذریعے مولانا سید علی نقی سے بھی ملاقات ہوئی اور میں ان کی علمیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اورینٹل سیکشن میں استاد تھے۔ کبھی کبھار مسعود صاحب سے ملنے ان کے گھر میں آجاتے مجھے یاد ہے اقبال کے کلام میں بعض قرآنی آیات کی تشریح مولانا نے بڑے دلنشین انداز میں کی تھی خاص طور پر آیۃ اِنَّ الْمُلُوْکَ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ محرم کو مسعود صاحب کے یہاں مولانا سید علی نقی جو عام طور پر نقن صاحب کہلاتے تھے مجلس پڑھتے تھے۔ ایک بار آئندہ مجلس میں مولانا کی تقریر کا عنوان زیر بحث تھا۔ میں نے اقبال کا ایک شعر تجویز کیا جسے نقن صاحب اور مسعود صاحب دونوں نے بہت پسند کیا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

افسوس ہے کہ یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہوگیا جب نقن صاحب کی کتاب شہیدانِ ملت کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں نے نقن صاحب پر اعتراضات کئے۔ مسعود صاحب کی گفتگو نہ صرف مزے دار ہوتی۔ ان کے یہاں دعوتیں بھی پرلطف ہوتی تھیں۔ ان کے بھائی آفاق صاحب بعض کھانوں کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ مسعود صاحب ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ زندگی اور ادب دونوں میں انھوں نے چند معیاروں کو ہمیشہ بلند رکھا۔ مجھے صرف اس پر حیرت ہوتی تھی کہ واجد علی شاہ بھی ان کے ممدوحین میں سے تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ واقعی بعض لوگوں نے بڑی ناانصافی کی ہے اور بہت سی غلط باتیں ان سے منسوب کردی ہیں۔ وہ بڑی صلاحیت کے مالک تھے اور رقص و موسیقی، اسٹیج اور شاعری میں ان کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ کسی طرح ہیرو نہیں کہے جاسکتے۔ انھوں نے جس طرح اپنی سادہ لوحی میں انگریزوں کے ہر وعدے پر اعتبار کرلیا اور چپ چاپ سلطنت ان کے حوالے کرکے کلکتہ سدھار گئے وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔

جب دستور کے خلاف مجھے ہٹا کر یوسف حسین موسوی صاحب کو وائس چانسلر رادھا کمل مکرجی نے شعبہ کا صدر بنایا اور میں نے اس زیادتی پر استعفا دیا تو مسعود صاحب ہی نہیں بلکہ وائس چانسلر کے حواریوں کو چھوڑ کر پوری یونیورسٹی اس زیادتی پر میری ہمنوا تھی۔ بالآخر ایگزیکیٹو کاؤنسل نے میرا استعفا منظور کرنے کے بجائے وائس چانسلر سے کہا کہ وہ مجھ سے استعفا واپس لینے کو کہیں۔ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ یا تو شعبہ اردو کو الگ کردیا جائے گا یا مجھے سینئر استاد کی حیثیت سے صدر شعبہ بنایا جائے گا۔ اس میں کچھ دیر ہوئی اور ذاکر صاحب کے اصرار پر پھر میں علی گڑھ چلا آیا۔ میرے علی گڑھ آنے کے بعد جب آرڈی ننس میں تبدیلی ہوئی اور یہ اعلان ہوا کہ سینئر استاد صدر شعبہ ہوگا۔ تو مسعود صاحب نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ میں لکھنؤ آکر چارج لے لوں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا یہ شعر پڑھا۔

یوں تو بیٹھے رہے اس در پہ ہم اک عمر سر در
جب چلے آئے تو پھر منہ نہ ادھر ہم نے کیا

گرچہ لکھنؤ میں جس جگہ پر میرا تقرر ہوا۔ اس پر احتشام حسین بھی امیدوار تھے اور یقیناً ان کو ریڈر نہ ہونے پر مایوسی ہوئی ہوگی لیکن میرے چارج لینے کے بعد انھوں نے ہر معاملے میں تعاون کیا اور بہت جلد ان سے خوب ربط ضبط ہوگیا۔ احتشام حسین الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھے ایک شاندار ریکارڈ کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی آئے تھے اور جب میں لکھنؤ پہنچا ہوں تو اردو کے ایک ممتاز نقاد اور ادب کے ایک چوٹی کے استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت ہو چکی تھی ترقی پسند تحریک کے وہ پرجوش علمبردار تھے۔ بعض ترقی پسند نقادوں کی طرح نہ تو ان کے یہاں کلاسیکی ادب سے بیزاری تھی نہ ماضی سے بیزاری۔ ان کی تحریروں میں ایک علمیت اور گہرائی اور لہجے میں سنجیدگی ہوتی تھی۔ وہ ہندی بھی اچھی جانتے

تھے اور انھوں نے اردو ادب کی ایک تاریخ ہندی میں بھی لکھی ہے۔ احتشام کی بحیثیت مقرر کے بھی شہرت تھی۔ وہ اپنی بات مدلّل اور دل نشین انداز میں پیش کرتے تھے۔ عام صحبتوں میں ان کے یہاں ایک اداسی کی لہر کا احساس ہوتا تھا لیکن بے تکلف نشستوں میں وہ خاصے دلچسپ ہو جاتے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور چونکہ ان کی آواز میں ایک قدرتی لحن تھا اس لئے جب وہ اپنا کلام سناتے تھے تو لطف آتا تھا۔ ان کا یہ شعر تو اکثر یاد آتا ہے۔

کل تو غیر ان کی یاد آئی تھی — آج کیوں ہے فضا اداس اداس

جس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اچاریہ جگل کشور تھے تو ان کی الٹی سیدھی باتوں پر اسٹاف کلب کی نشستوں میں اکثر تبصرہ ہوتا تھا۔ ہری کشن اوستھی (جو اس زمانے میں ہندی کے شعبے میں ریڈر تھے اور بعد میں وائس چانسلر بھی ہوئے) ان کو جگلو کہتے تھے۔ انھوں نے ایک مصرعہ دیا اور اس پر طبع آزمائی کے لئے کہا۔ ع

''اس واسطے جگلو کو بھی اُلّو نہیں کہتے''

میں نے یہ مصرعہ لگایا۔ ع (اوستھی کے خلاف ایک کمیشن بیٹھ چکا تھا۔)

اس پر بھی نہ بیٹھے کہیں اک اور کمیشن
اس واسطے جگلو کو بھی الّو نہیں کہتے

مگر احتشام حسین کا مصرعہ زیادہ مزے کا تھا۔ ع

الّو بھی نہ کر دے کہیں توہین کا دعویٰ
اس واسطے جگلو کو بھی الّو نہیں کہتے

احتشام حسین پیچش کے مریض تھے جب اعجاز حسین صاحب کے سبکدوش ہونے پر الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو اس پر احتشام حسین صاحب کا تقرر ہوا۔ سیلیکشن کمیٹی میں میں بھی تھا اور میں نے ان کی پرجوش تائید کی تھی۔ وہ ابھی ساٹھ سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ دسمبر ۷۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اردو ادب اپنے اس بلند پایہ نقاد کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

نورالحسن ہاشمی لکھنؤ سے انگریزی میں ایم اے کرتے علی گڑھ آئے تھے علی گڑھ میں، میں نے ان کو پڑھایا بھی تھا۔ پھر انھوں نے میری ہی نگرانی میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''دہلی کا دبستان شاعری''۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے تھے۔ جب ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کا اشتہار ہوا تو انھوں نے مجھے فارم بھیجا اور اصرار کیا کہ میں درخواست دے دوں۔ ہاشمی صاحب نے کچھ عرصے کے بعد فارسی میں بھی ایم اے کر لیا۔ ہاشمی صاحب نے کلیات ولی، کلیات جعفر علی حسرت مرتب کی ہیں اور مسعود حسین خاں کے ساتھ بکٹ کہانی بھی ایڈٹ کی ہے۔ غالباً ۵۴ء میں جب مسعود صاحب سبکدوش ہو چکے تھے اور میں عارضی طور پر صدر شعبہ تھا تو رالف رسل کی شاگرد ایک سوئس لڑکی جس کا نام مس ویس تھا اردو میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لئے لکھنؤ آئی تھی۔ وہ خاص طور پر عروض سیکھنا چاہتی تھی۔ اتفاق سے میری اور احتشام صاحب کی عروض سے واقفیت یوں ہی سی تھی۔ لہٰذا اس کی تعلیم کی نگرانی ہاشمی صاحب کے سپرد کی گئی اور انھوں نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ہاشمی صاحب شعر بھی کہتے ہیں اور جب میں لکھنؤ یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو انھوں نے ایک نہایت پرسوز نظم لکھی تھی۔ کبھی کبھی ہم لوگ شعبے میں خالی وقت میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ کر لیا کرتے تھے جس میں میں، احتشام، ہاشمی اور خلیل چاروں کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ کلاس سے فارغ ہو کر ہم لوگ عام طور پر اسٹاف کلب جایا کرتے تھے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹیبل ٹینس یا ایک کھیل چینی چکر کھیل کر گھر چلے جاتے تھے۔ ہاشمی صاحب ریٹائر ہیں اور خدا کے فضل سے ابھی تک ان کا تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ شوقیہ ہومیوپیتھی کا علاج بھی کرتے ہیں اور ہم لوگوں نے ان کی مسیحائی کی وجہ سے اکثر نزلے زکام سے جلد نجات حاصل کی ہے۔

ہاشمی صاحب جامعہ کی جوبلی میں شرکت کے لئے میرے اور علیم صاحب کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ جاتے ہی بخار میں مبتلا ہوئے۔ کشمیر کی ایک سیلیکشن کمیٹی میں سری نگر گئے۔ وہاں اتفاق سے مئی کے مہینے میں بارش ہو گئی یہ گرمی کی یونیفارم میں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ برا حال ہو گیا اور جلد سے جلد ہوائی جہاز سے سری نگر کی جنت سے لکھنؤ کے آتش خانے میں پہنچ کر دم لیا۔

جب کے ایم منشی اتر پردیش کے گورنر ہوئے تو پہلے انھوں نے ریاست کے انتظامات میں دخل دینا شروع کیا لیکن پنڈت گووند بلبھ پنت نے جو اس زمانے میں وزیر اعلیٰ تھے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مجبور ہو کر انھوں نے یونیورسٹیوں میں شرمدان کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ سے بھی خطاب کیا۔ اور لوگ تو خاموش بیٹھے رہے لیکن اودھ کشور سرن نے جو سوشیالوجی کے لکچرر تھے کہا کہ ہم لوگ اپنا سب کام خود ہی کرتے ہیں۔ ایک

استاد کی حیثیت سے ہمارا کام پڑھانا پڑھانا ہے یہ شرم دان کی بات کہیں اور جاکر کہیے. گور صاحب اتنے خفا ہوئے کہ صدر شعبہ پروفیسر ڈی پی مکرجی کو جاکر کہا کہ ایسے بد تمیز آدمی کو آپ کو سخت تنبیہ کرنی چاہیے. ڈی پی مکرجی نے جواب دیا کہ اس نے بالکل درست کہا. تنبیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. یہ بات تو مجھے کہنی چاہیے تھی. یونیورسٹیوں کے سلسلے میں ان کے مختلف اقدامات کی وجہ سے اساتذہ اور طلبہ سب بدظن ہو گئے. نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۳ء میں کچھ طلبہ نے اسٹرائک کی. چندر بھان گپتا نے جو اس وقت وزیر تھے اور یونیورسٹی کے ٹریزرار بھی تھے اساتذہ کو اپنے گھر یا ان دریے بلایا. ایک دن پروفیسروں سے، دوسرے دن ریڈروں سے اور تیسرے دن لکچرروں سے خطاب کیا اور ان پر زور دیا کہ طالب علموں کی بھوک ہڑتال ختم کرائیں. پہلے دن تو کسی نے کچھ نہیں کہا دوسرے دن گپتا جی کی تقریر کے بعد میں نے بھی جواب میں تقریر کی اور کہا کہ اساتذہ حکومت کے آلۂ کار نہیں ہوتے. یہ جو حالات ہیں ان میں راج ہٹ اور بال ہٹ کا تصادم ہے. آپ چاہتے ہیں کہ ہم طلبہ کی بھوک ہڑتال ختم کرادیں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر ہمیں ان کے مطالبات جائز معلوم ہوں تو ان کو ماننے کا بھی اختیار ہو. آپ ہمیں یہ اختیار دے دیجئے تو ہمیں یقین ہے کہ طلبہ کی بھوک ہڑتال چند گھنٹوں میں ختم ہو سکتی ہے. ہماری بات ان لوگوں نے نہیں مانی اور معاملہ اتنا آگے بڑھا کہ چند روز کے بعد طلبہ اور پولیس میں منکی برج پر باقاعدہ جھگڑا ہوا اور بعد میں امین آباد میں فائرنگ کے نتیجہ میں تین افراد مارے گئے جن میں ایک جونیر ڈاکٹر تھا. اس زمانے میں شہر میں ایک نعرہ بہت عام تھا. لکھنؤ کے تین چور، منشی، گپتا، جگل کشور.

منشی نولکشور کی گرانقدر خدمات سب پر روشن ہیں. مولانا آزاد نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو اگر نولکشور کے ادارہ کی سو اہم مطبوعات Every men's Library کے نہج پر دوبارہ شائع کی جائیں. اگر نول کشور کے ورثاء وزارت تعلیم کو اس کے لئے ایک اسکیم پیش کریں تو حکومت ہند کی طرف سے انھیں ایک لاکھ روپے کام کا آغاز کرنے کے لئے گرانٹ کے طور پر دئے جائیں گے شرط صرف یہ ہوگی کہ اس کی مجلس ادارت میں اردو کے چند ممتاز نقاد اور یونیورسٹی کے پروفیسر ہوں گے. میں نے لکھنؤ واپس آکر راجہ رام کمار بھارگو سے بات کی اور ان سے کہا کہ اس اسکیم کے مرتب کرنے میں جو مدد میں کر سکتا ہوں وہ کروں گا. مگر راجہ صاحب نے کہا کہ اب اردو کی کتابوں کی نکاسی کی امید بہت کم ہے اور وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی درسی کتابیں بھی شائع کرنا زیادہ مفید سمجھتے ہیں. میں نے مولانا کو اس کی اطلاع دی. کئی سال بعد جب میں علی گڑھ سے کسی ادبی اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے لکھنؤ گیا تو راجہ صاحب کا بیٹا مجھ سے ملا اور اس نے کہا کہ مجھے کاغذات میں آپ سے اس سلسلے کی خط و کتابت ملی ہے کیا اس اسکیم کو اب عمل میں لایا جا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بھائی اب کیا ہو سکتا ہے. "وہ پانی تو ملتان بہہ گیا!" (دیکھو آب حیات)

ڈاکٹر عبدالعلیم جامعہ ملیہ سے علی گڑھ ہوتے ہوئے ۳۸ء میں لکھنؤ پہنچے. یونیورسٹی میں اور شہر کی علمی و ادبی محفلوں میں ان کا ایک نمایاں رول ہوتا تھا. لکھنؤ میں پہلے وہ لال باغ کے قریب اصغر حسین ایڈوکیٹ کے ایک مکان میں کرایہ پر رہے. پھر بندریا باغ کے ڈیلی گیسٹ سینٹر میں وارڈن رہے. وہ مارکسزم کے علمبردار اور شہر کی کمیونسٹ اور ترقی پسند انجمنوں کے روح رواں تھے. جب دسمبر ۴۷ء میں ہم لوگ ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا اردو کانفرنس کر رہے تھے تو کچھ کارکنوں نے جوش میں آکر گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک جگہ یہ بینر لگایا "مارکسزم ہی صحیح ترقی پسندی ہے" علیم صاحب نے دیکھا تو اس بینر کو ہٹوا دیا. جب ہم لوگوں نے ان سے پوچھا یہ کیا؟ تو کہنے لگے بات تو صحیح ہے لیکن اس سے غلط فہمی پھیل سکتی ہے اس لئے کہ ترقی پسند تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مارکسی نہیں ہیں اور ان لوگوں کو شکایت ہو سکتی ہے.

علیم صاحب جامعہ میں مولانا سورتی جیسے عالم کے شاگرد تھے. اس زمانے میں عربی کے استادوں میں مولانا یمن اور مولانا سورتی کے پایے کا کوئی دوسرا نہ تھا. جامعہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی گئے وہاں عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ پر پی ایچ ڈی کیا. واپس آکر چند سال جامعہ میں استاد رہے. علی گڑھ میں ۳۴ء میں نواب اسماعیل خاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں عربی کے لکچرر مقرر ہوئے. بڑا مرتب ذہن پایا تھا اور تقریر بہت اچھی کرتے تھے. علی گڑھ میں وہ زیادہ تر پرانے اسٹاف کلب کے ایک کمرے میں رہے (اب یہاں پر اکثر آفس ہے)

۱۹۵۰ء میں یمن صاحب کے سبکدوش ہونے پر علی گڑھ آگئے تھے ۵۴ء میں وہ علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر ہوئے اور ۶۸ء میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر. ۷۶ء کے شروع میں ان کا انتقال ہوا. اس وقت وہ ترقی اردو بیورو حکومت ہند کے چیرمین تھے. علیم صاحب نے لکھا بہت کم ہے. اُن کا پی

ایچ ڈی کا مقالہ اور چند خطبے ہی ان کی یادگار ہیں۔ وہ تحریر کے نہیں تقریر کے مرد میدان تھے۔ نہایت پابندی سے آ کر یمی آئے یا ینمو کافی ہاؤس ضرور جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی ان کا مداح یا دوست انھیں کافی پینے پر دعوت دے دیتا تھا۔ وہ سنی تھے یعنی سنتے زیادہ تھے بولتے کم تھے۔ ان کے شعبے کے صدر پروفیسر وحید مرزا بھی بہت کم سخن تھے بلکہ ان پر تو اقبال کا یہ شعر صادق آتا تھا

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

وحید مرزا صاحب عربی کے بہت اچھے استاد تھے۔ امیر خسرو پر ان کی کتاب جو ہندوستان اکیڈمی سے چھپی تھی اور اسی طرح امیر خسرو کی مثنوی۔ نہ سپہر۔ کا، ان کا مرتب کیا ہوا اڈیشن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وحید مرزا صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ یا طلبہ یا شہر کی تہذیبی اور ادبی زندگی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم خواہ اساتذہ کی انجمن ہو یا انجمن ترقی پسند مصنفین یا یونیورسٹی یونین سب کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ لکھنؤ میں علیم صاحب کے بہت سے معرکے رہے ہیں مگر وحید مرزا سے لکھنؤ کے صرف خواص ہی واقف تھے عوام سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علیم صاحب ہمیشہ شیروانی اور کرتے پاجامے میں نظر آئے۔ وحید مرزا صاحب کو ہمیشہ سوٹ اور ٹائی میں مقطع دیکھا گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک قابل ذکر شخصیت احسن فاروقی کی تھی لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں ان کا تقرر ۱۹۶۴ء میں میرے جوائن کرنے کے کچھ دن بعد ہی ہوا تھا۔ قریب ہی چوکھی میں ان کا مکان تھا۔ باپ دادا تو شیخوپور بدایوں کے تھے مگر ایک عرصہ سے ان کے والد محمود آباد اور بھیرہ کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ناول۔ شام اودھ۔ میں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ احسن فاروقی نے اردو میں لکھنا دیر میں شروع کیا پہلی کتاب انھوں نے نورالحسن ہاشمی کے ساتھ لکھی تھی جس میں ان کی اکھڑی اکھڑی زبان کو ہاشمی نے صاف ستھری نثر بنا دیا تھا۔ وہ خاصے زود نویس تھے۔ نگار میں انیس کے مراثی پر ان کے مضامین اختلافی ثابت ہوئے۔ اثر لکھنوی نے ان کا جواب بھی دیا تھا۔ پھر اردو ادب میں میں نے ان کے نذیر احمد کے تمثیل مضمون پر مضامین شائع کئے۔ ان کا ناول شام اودھ۔ چند سال بعد نکلا۔ غالباً ۱۹۵۳ء میں وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں اور تیز ہو گیا تھا۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ترقی پسند تحریک کے سخت مخالف تھے اور جب بھی ان کو موقع ملتا تھا وہ اس کی مخالفت میں تقریر کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ایک دفعہ کیفی اعظمی میرے گھر آئے ہوئے تھے فاروقی بھی آ نکلے تھوڑی دیر میں دونوں میں بہت تلخ بحث شروع ہو گئی۔ نہ کیفی کوئی اعتراض سن سکتے تھے اور نہ فاروقی چوکنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے گفتگو کا رخ کسی اور موضوع کی طرف موڑا۔ احسن فاروقی بہت اچھے دوست تھے اور ساتھیوں اور دوستوں کی ہر معاملے میں مدد کے لئے تیار رہتے ایک دفعہ امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج والوں نے فرحت اللہ بیگ کا۔ اردو کا ایک یادگار مشاعرہ اسٹیج کیا۔ کالج کے ان طلبہ کی تعداد دو درجن کے قریب تھی منتظمین نے ان لوگوں کی واپسی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ مشاعرہ کے بعد جب کسی بھان کی گاڑی ہاتھ نہ آئی۔ وائس چانسلر بھی جا چکے تھے تو بیچارے احسن فاروقی کو پکڑا گیا اور انھوں نے رات کے بارہ بجے پانچ چھ پھیروں میں یونیورسٹی سے ان طلبا کو امین آباد پہنچایا۔ مشہور نظم ساز مظفر علی انھیں احسن فاروقی کے بھانجے ہیں۔ میں جب ۷۷ء میں پاکستان گیا تھا تو کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جنوری ۷۸ء میں کوئٹے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نیا دور۔ کراچی کی ادارت میں انھوں نے جمیل جالبی کی بہت مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ شاہد احمد دہلوی نے جب کراچی سے۔ ساقی۔ دوبارہ نکالنا شروع کیا تو احسن فاروقی نے ان کے رسالے میں بہت سے مضامین لکھے۔ انھوں نے۔ شام اودھ۔ کے علاوہ ناولوں اور کہانیوں کا بھی ایک خاصہ گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اردو ناول اور اردو تنقید پر بھی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

جب میں سینٹ جانسن کالج آگرہ میں سکنڈ ایر سائنس میں پڑھتا تھا تو اسرار الحق مجاز اور معین احسن ملال (بعد میں جذبی) فرسٹ ایر سائنس میں داخل ہوئے۔ دونوں کو سائنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ انٹرمیڈیٹ میں دونوں فیل ہو گئے۔ مجاز علی گڑھ آ گئے اور جذبی اینگلو عربک کالج دہلی پہنچ گئے۔ جب میں ۳۲ء میں انگریزی میں ایم اے کرنے آیا تو مجاز بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اور اسی سال آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں یہ ریڈیو کے رسالے۔ آہنگ۔ کے ایڈیٹر تھے شاید ڈیڑھ سال بعد بطرس بخاری نے ان کو ریڈیو سے چلتا کر دیا۔ اس کے بعد ان کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا اور اس زمانے میں وہ جوش سے خاصے قریب تھے

عرصہ ہارڈنگ پبلک لائبریری میں ایک اسسٹنٹ کی حیثیت سے انھوں نے کام کیا۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے لیکن بروقت علاج کی وجہ سے بڑی حد تک ٹھیک ہو گئے۔ جب ۴۹ء میں لکھنؤ پہنچا تو مجازؔ کی شاعری، بذلہ سنجی اور شراب نوشی تینوں کی شہرت تھی۔ مشاعروں میں وہ عام طور پر بہت مقبول رہتے تھے۔ لیکن ۵۰ء کے بعد ان کی شراب نوشی کی کثرت گل کھلانے لگی تھی۔ ایک دفعہ مجازؔ اور جذبیؔ دونوں میرے یہاں آئے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے اسی وقت روشؔ صدیقی بھی آ گئے۔ ان کے متعلق یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ جوالاپور میں ۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ شہید کر دیے گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے کسی طرح جان بچا کر مرادآباد پہونچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس وقت وہیں مقیم تھے۔ روشؔ صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ اب جبکہ میرا قیام مستقل طور پر مرادآباد میں ہے تو سوچتا ہوں کہ شادی کر لوں اور کسی بیوہ سے کروں، آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے مجازؔ صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ مجازؔ روشؔ صاحب شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور کسی بیوہ سے عقد کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مجازؔ نے چھوٹتے ہی کہا روشؔ صاحب آپ سوچیے مت، کسی سے بھی شادی کر لیجئے۔ بیوہ تو آپ سے شادی کے بعد ہو ہی جائے گی۔ ہم لوگوں کے قہقہے میں روشؔ صاحب بھی شریک تھے۔ لکھنؤ ریڈیو والوں نے ایک دفعہ بقرعید کے موقع پر ایک شعری نشست رکھی جس میں مجازؔ اور میں دونوں مدعو تھے۔ بقرعید سے ایک دن پہلے جب کافی ہاؤس میں مجازؔ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ پرسوں ریڈیو پر تمہاری قربانی ہے۔ بے ساختہ کہنے لگے سرورؔ صاحب قربانی نہیں جھٹکا ہے۔ کافی ہاؤس میں اکثر نظر آتے تھے۔ ایک دفعہ جب میں گیا تو کسی دوسری میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں اپنی میز پر بلایا اور کافی کا آرڈر دیا۔ کہنے لگے آپ تکلیف نہ کیجیے مجھے کافی سوٹ نہیں کرتی۔ ۵۰ء کی گرمیوں میں پٹنے میں ایک اردو کانفرنس تھی جس میں شرکت کے لئے ڈاکٹر عبدالعلیم، مجازؔ اور میں لکھنؤ سے گئے تھے۔ کانفرنس کے بعد مشاعرہ بھی تھا۔ اس زمانے میں مجازؔ کی شراب نوشی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً سہیلؔ عظیم آبادی سے تاکید کر دی کہ وہ ان کے ساتھ رہیں اور مشاعرہ کے اختتام پر پہنچیں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہونے پائے۔ مشاعرہ کے بعد کوئی ایک بجے کے قریب شعرا اور مندوبین اپنی قیام گاہ پہنچے جہاں ہر ایک کے لئے الگ الگ کمرہ تھا۔ مشہور محقق پنڈت برج موہن کیفی کانفرنس و مشاعرہ دونوں میں شریک تھے۔ قیام گاہ پہنچ کر ہم دونوں اپنے اپنے کمروں میں سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک طرف سے یہ شور اٹھا۔ بچاؤ بچاؤ یہ مارے ڈالتا ہے۔ شور سن کر جب کچھ لوگ کیفیؔ صاحب کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ مجازؔ نشے میں وحشت زور زور سے ان کے پیر دبا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں آپ بزرگ ہیں اور آپکے پیر دبانا میرے لئے سعادت ہے۔ بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے مجازؔ کو علیحدہ کیا اور کیفیؔ صاحب کہنے لگے اگر آپ لوگ نہ آتے تو یہ مارے محبت کے میری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ مجازؔ کی فطرت میں ایک معصومیت تھی۔ ان کا اپنے کسی ہم عصر سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ جب جوشؔ نے ”پند نامہ بنام مجازؔ“ کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور شراب کے معاملہ میں احتیاط برتنے کی تلقین کی تو مجازؔ نے صرف یہ کیا کہ شیخ عبداللہ کی تعریف میں جوشؔ نے جو نظم لکھی تھی اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا انتقام اس طرح لیا۔

رند برباد کو نصیحت ہے شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

کچھ عرصہ بعد جب ان کی صحت گرنے لگی تو کسی طرح ان کو رانچی کے اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ چند ماہ وہاں کے قیام کے بعد خاصے صحتمند ہو کر آئے۔ کچھ عرصہ تک شراب بھی چھوڑ دی تھی لیکن پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ نومبر ۵۵ء میں ایک دوست کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے سنا ہے میری نظم ”نذر علی گڑھ“ کو ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کا ترانہ قرار دیا ہے۔ شروع دسمبر میں ایک کانفرنس ہے اس کے بعد میرا ارادہ بھی علی گڑھ آنے کا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کانفرنس کے مشاعرہ میں شرکت کے بعد ہی وہ لال باغ کے ایک مکان کی چھت پر بیہوش پائے گئے جہاں سے انھیں اسپتال منتقل کرایا گیا مگر کچھ گھنٹے کی بیہوشی کے بعد انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ عصمت نے مجازؔ کے خاکے میں ان کے مزاج اور ان کی شاعری دونوں کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ مگر صرف ظالم سماج کو مجازؔ کی بربادی کا ذمہ دار قرار دینا غلط ہوگا۔ وہ دراصل اپنے مذاق طرز آگیں کا شکار ہو گئے۔

کافی ہاؤس میں اکثر مجازؔ اور سلامؔ مچھلی شہری ساتھ ساتھ نظر آتے تھے سلامؔ مچھلی شہری اس زمانے میں مختلف لوگوں کو لمبے لمبے منظوم خط لکھا کرتے تھے۔ کبھی سجاد ظہیر کے نام، کبھی جوشؔ کے نام۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس میں ان سے ہندی کے ایک ادیب نے جو چھوٹے قد کے تھے پوچھا کہ تم میرے نام خط

لب لکھ رہے ہو پاس ہی مجاز بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے کہ یہ تمہارے نام خط کیا لکھیں گے پوسٹ کارڈ ڈال دیں گے۔ سلام کے گیتوں اور نظموں کا اس وقت بھی خاصا شہرہ تھا اور ان کے ریڈیو کے ایک ساتھی نے ان کی چند نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ایک دفعہ میں کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا اور میری میز پر یونیورسٹی کے دو ایک رفیقوں کے علاوہ ایک خاتون بھی تھیں جن کے حسن کا سارے لکھنؤ میں شہرہ تھا۔ سلام آئے اور اسی میز پر بیٹھ گئے مگر بالکل خاموش تھے نگاہیں خاتون کے چہرے پر تھیں۔ انھوں نے از راہ ہمدردی ان سے پوچھا سلام صاحب خیریت تو ہے آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟ میں نے یوں ہی مذاق میں کہہ دیا کہ محترمہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ان کی صورت ہی ایسی ہے میز پر جتنے لوگ تھے سب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر بعد جب لوگ منتشر ہونے لگے تو سلام نے آکر مجھ سے شکوہ کیا کہ سرور صاحب مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے۔ آپ نے ایک خاتون کے سامنے میرا مذاق اڑایا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ اور میرا آپکی سبکی کا کوئی ارادہ نہیں تھا شکر ہے کہ انھوں نے میری بات مان لی اور اس کے بعد اسی خلوص سے ملنے لگے۔

لکھنؤ کا گنگا پرشاد میموریل ہال میرے زمانے میں اچھا خاصہ ادبی مرکز تھا۔ عام طور پر ہر ادبی کانفرنس یا مشاعرہ یہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں کئی یادگار مشاعرے ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی کئی اچھے مشاعرے کئے۔ مشاعرے یونیورسٹی میں بھی ہوتے تھے مگر یہاں بعض اوقات اردو سے ناواقف ہونے کی وجہ سے طلبہ شور بھی بہت مچاتے تھے۔ لیکن گنگا پرشاد میموریل ہال میں جو مشاعرے ہوتے تھے یا سنی وقف بورڈ کے مشاعرے جو محبوب عالم صاحب کی طرف سے ہوتے تھے ادب اور تہذیب کے گہوارے تھے اور ان میں کبھی کبھار جوش اور جگر اور اثر لکھنوی، آنند نرائن مُلّا، سراج لکھنوی، قدیر، ہزار لکھنوی باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

آنند نرائن مُلّا ہمارے چوٹی کے شعراء میں ہیں مگر ان کے پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ شوکت تھانوی نے بشیش محل۔ میں اس کا بڑے پر لطف انداز سے ذکر کیا ہے۔ میں نے ایک دفعہ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکے شور نہ مچائیں ان سے مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست کی اور ان کا کلام سب نے نہایت احترام سے سُنا لیکن جب میں نے دوبارہ ان کو دیگر شعراء کے ساتھ زحمت سخن دی تو یار لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے بیشتر مشاعرے آجکل کے بیشتر مشاعروں کی طرح گلے بازی یا شاعرات کے نور و نغمے کی نمائش نہیں ہوتے تھے بزرگوں کو احترام سے سُنا جاتا تھا اور نوجوانوں کو موقع دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے کمال فن کا ثبوت دیں۔ مصرع طرح کا رواج بھی باقی تھا۔

میں نے ۱۹۷۷ء میں لاہور میں ایک ادبی استقبالیہ میں جو ادارہ نقوش کی طرف سے دیا گیا تھا کہا تھا کہ برصغیر میں تین شہر ہیں باقی سب گاؤں ہیں۔ ہندستان میں لکھنؤ اور حیدرآباد اور پاکستان میں لاہور۔ لکھنؤ اگرچہ اب بہت بدل گیا ہے مگر یہ تو اب بھی کہا ہی جا سکتا ہے۔ ؎

"کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست"

□□



اودھ کا نیا جنم

صفحہ ۳۵۹ کا بقیہ

اور حدیث کی روشنی میں پیش کیجیے۔

لکھنؤ میں پردے کا ایسا زور تھا کہ لڑکیاں برقع میں یونیورسٹی نہیں جا سکتی تھیں یعنی ان کے لیے علم کا راستہ بند تھا لیکن مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد پردے کا زور ٹوٹنے لگا اور لڑکیاں برقع میں کالج جانے لگیں پھر رفتہ رفتہ کالج کے اندر بلا برقع کے کلاسوں میں جانے لگیں۔

چند برسوں کے بعد لڑکیوں کا برقع بالکل اتر گیا اور مزید چند برسوں کے بعد اس حد تک برقع اتر گیا کہ خواتین بازاروں میں خریداری کے لیے جانے لگیں۔ مسلم لیگ اور جناح صاحب کی یہ دین ایسی ہے جس کا میں بھی معترف ہوں۔ اب بیگم حضرت محل پارک میں جو جلسے ہوتے ہیں وہ سیاست کی گزشتہ ترقیوں اور تبدیلیوں کا البم ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ ہے موجودہ دور کا اودھ!!

□□

علی جواد زیدی

یادوں کی رہگزر

قدیم لکھنؤ میں واقع گورنمنٹ جوبلی کالج میں دو سال گزارنے کے بعد میں نے لکھنؤ کے جدید علاقے میں واقع لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔اے کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کی ابتدا کا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت محدود اختیارات کی جمہوری حکومت قائم ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ کانگریس نے برطانوی حکومت سے یہ وضاحت چاہی تھی کہ گورنر حکومت کے عام معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ طویل گفتگو کے بعد معاملات طے ہوئے اور کانگریس نے محدود خود مختاری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہی وہ منزل تھی جب میں یونیورسٹی کے حدود میں داخل ہوا۔

داخل تو ہم پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اس وقت طلبہ کی عام ہڑتالوں میں یونیورسٹی کے طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اب فضا بدل چکی تھی پھر بھی ہم آزادی کی منزل سے دور تھے اس لئے حکومت سے ٹکراؤ کی صورت کبھی پیدا ہو جاتی تھی اور جدوجہد کا وہ تسلسل قائم رہتا جو ہم کالج کے زمانے سے پہلے ہی اپنا چکے تھے۔ ابھی ایک سال پہلے ہی تو ہم نے اسی لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما ہال میں پہلی آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس کا افتتاح جوانوں کے ہر دلعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور صدارت محمد علی جناح نے۔ یہ آخری موقع تھا جب یہ دونوں ہستیاں ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں اور دونوں نے متحدہ قومیت کا پیغام دیا۔ ۱۹۳۶ء کی اس کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ طلبا کی ایک کل ہند جماعت بنائی جائے اور اگلے سال لاہور اجلاس میں اس کا نام آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن طے پایا اور اس طرح طلبہ کی منظم تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل بھی پڑی۔ پہلا اجلاس گنگا پرشاد ورما ہال میں ہوا۔ صدارت منشی پریم چند نے کی

اور سجاد ظہیر اور مولانا حسرت موہانی ممتاز شرکا میں تھے۔ میں ان دونوں ہی تاریخی اجتماعات میں شریک تھا اور دونوں سے علمی دلچسپی کا آغاز اسی وقت سے ہوا جب میں ابھی جوبلی کالج کا طالب علم تھا۔ اسی نئی بیداری اور گہما گہمی کا کوئی خاموش تماشائی کیسے بنا رہ سکتا تھا۔

پہلی طلبہ کانفرنس کے انعقاد میں خاص کردار ادا کرنے والوں میں پریم نرائن بھارگو اور آئی ایم بدرالدین تھے۔ کانفرنس کے بعد بھارگو نے اپنے مکان میں ایک کمرہ الگ کر دیا تھا جو کئی برس تک طلبہ کی سیاست کا اہم مرکز بنا رہا۔ یہ امین آباد میں واقع تھا۔

..یونیورسٹی کا علاقہ اودھ کے شاہی زمانہ میں "بادشاہ باغ" کہلاتا تھا۔ سن ستاون کے ہنگاموں میں اس پر بھی تباہی آئی اور آس پاس کے علاقوں کی بربادی کا اثر اس پر بھی پڑا کیونکہ یہ سکندر باغ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں لکھنؤ کے آزادی پسندوں نے برطانوی فوجوں سے زبردست مورچہ لیا تھا۔ بادشاہی نام کی یادگار کے طور پر ایک سرخ رنگ کی بارہ دری اب بھی موجود تھی جس میں یونیورسٹی ریسٹوراں اور اساتذہ کا کلب تھا۔ کھیل کود کے وارڈن کا چھوٹا سا دفتر بھی اسی کے ایک گوشے میں تھا۔ بارہ دری کی شکل و صورت مسخ ہو چکی تھی۔ ایک خشک آبشار اور پشت پر ایک سوکھی نہر ایک اجڑے ہوئے دور کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ آج یہ نشانات بھی باقی نہیں ہیں۔

۔یونیورسٹی کے قیام سے پہلے اس اس عمارت میں کیننگ کالج تھا جو الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ تھا۔ جب لکھنؤ کو اترپردیش کا دارالحکومت بنایا گیا تو کالج کو بھی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اجڑی ہوئی اختر نگری میں سچا اقتدار حکومت نہ سہی، لیکن اس کی کچھ بو باس تو ملی۔ تعلقداران اودھ خوش ہوئے، وہ بھی مسرور ہوئے جو اودھ سے جذباتی وابستگی

اودھ
آئینہ ایام میں

رکھتے تھے۔ یہ سب الٰہ آباد کے خسارے پر ہوا اور انھیں فطری طور سے گراں گزرا۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور الٰہ آباد کی اہمیت پر ثقافتی حلقوں میں کچھ نوک جھونک بھی چلی۔ اس سلسلے میں مشہور رباعی گو شاعر منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الٰہ آبادی نے بہتوں کی دل لگتی بات کہی کہ لوگ لکھنؤ کو لاکھ بڑھائیں مگر ع

وہ گومتی کو تو گنگا بنا نہیں سکتے!

لیکن بنانا بھی کون چاہتا تھا۔ صفی جیسے لکھنوی نے کیا خوبصورت نظم الٰہ آباد پر لکھی ہے، جس میں انھوں نے گنگا ہی کیا 'تربینی' پر ناز کیا ہے ؎

اے الٰہ آباد اے جولاں گہہ گنگ و جمن

تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن!

لکھنؤ دارالحکومت بن گیا لیکن قانون و انصاف کا مرکز الٰہ آباد ہی رہا۔ لکھنؤ کے حصے میں صرف چیف کورٹ آیا، ہائی کورٹ الٰہ آباد ہی میں برقرار رہا۔ الٰہ آباد محکمۂ تعلیم، پبلک سروس کمیشن، اکاؤنٹنٹ جنرل وغیرہ کا بھی صدر دفتر بنا رہا۔ الٰہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو (محسن اردو) سر شاہ محمد سلیمان (جو ادب و قانون کا سنگم تھے)، پنڈت موتی لال نہرو، سر وزیر حسن (جو بعد میں لکھنؤ میں چیف جج ہوئے) جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ اور پھر وہ سیاست کا اہم مرکز بھی یہیں الٰہ آباد میں تھا جو آنند بھون اور سوراج بھون کے نام سے سارے ہندوستان کی توجہات کا محور بنا رہا۔

لکھنؤ کو صوبے کا صدر مرکز بنانے میں گورنر ہارکورٹ بٹلر نے خاص کد و کاوش کی تھی۔ انھیں اودھ سے ثقافتی سطح پر لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی نجی زندگی میں کبھی کبھی انگرکھا اور دو پلی ٹوپی زیب تن کر لیتے اور سگار کی طرح پیچوان سے بھی لطف لیتے۔ (یہ روایت صرف سنی سنائی ہے، پتا نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک تھی) اتنا یقینی ہے کہ سن ستاون کی تلخیوں کی یادیں کم کرنے کی بٹلر نے کوشش ضرور کی اور لکھنؤ کے تعلقہ داروں نے اس کا بدلہ کئی طرح سے دیا۔ بٹلر روڈ، بٹلر پارک (جہاں ان کا اسپ سوار مجسمہ بھی نصب تھا)، بٹلر پیلس (جو دراصل محمود آباد پیلس تھا، لیکن مرحوم راجہ محمود آباد کی ہجرت کے بعد بحق سرکار ضبط ہو کر سرکاری افسروں کی رہائش گاہ کے طور پر خوبصورت کمپلکس بن گیا ہے) انھیں کی یادگاریں تھیں۔ یونیورسٹی میں ان کے نام پر بٹلر ہوسٹل تھا۔

آزادی کے بعد جب برطانوی یادگاریں ہٹائی گئیں تو یہ نام مٹا دیے گئے اور مجسمہ عجائب گھر کے ایک گوشے میں پہنچا دیا گیا۔ بٹلر ہوسٹل کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ نام بدستور باقی ہے یا وہ بھی بدل دیا گیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر جوبلی کالج کے ساتھی کیلاش ورما سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینیر تھے اور ایک سال پہلے ہی یونیورسٹی پہنچ چکے تھے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر اچاریہ نریندر دیو کے بھتیجے تھے۔ میری ہی طرح طلبہ کی تحریک کے سرگرم رکن تھے، ان سے میری خاصی دوستی تھی افسوس کہ ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

(خوب چمکے مگر جلد بجھ جانے والا شعلہ ثابت ہوئے) کسی شدید بیماری میں ابدی جدائی کا داغ دے گئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوست بھی ساتھ آئے۔ ان میں ایک تعلقہ دار خاندان کے سیٹھ برادران بھی تھے۔ یہ توام تھے اور جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔ ان میں مکمل مشابہت تھی۔ کپڑے بھی یکساں اور ایک ہی رنگ کے پہنتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ دونوں الگ الگ سکشن میں تھے مگر ایک ساتھ تھے۔ اکثر شناخت کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک بار میرے کلاس نوٹ دوسرے دن واپس کرنے کا وعدہ کر کے لے گئے ——— دو دن تک نظر نہیں آئے۔ تیسرے دن ملے تو میں نے انھیں یاد دلایا۔ کہنے لگے "میں نے تو آپ سے نوٹ نہیں لیے۔" میں حیران، میں نے پھر یاد دلانے کی کوشش کی تو بولے "غالباً آپ نے میرے بھائی کو دیے ہوں گے"۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھائی صاحب ملے اور وہ نوٹ مجھے واپس کر دیے!! ایسے کئی دلچسپ واقعات آئے دن ہوا کرتے تھے! جوبلی کالج میں دو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، عبادت بریلوی اور میرے ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد (سابق مدیر نیا دور) یہ دونوں مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ سال بھر بعد یونیورسٹی آئے، برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، کیونکہ ہم تینوں قریب قریب رہتے تھے۔

طلبہ کے علاوہ اساتذہ میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولوی سید محمد حسین سے پہلے سے ملاقات تھی۔ مسعود صاحب اس وقت صدر شعبہ بگر ہی تھے۔ کیونکہ شعبۂ فارسی و اردو میں پروفیسر کی جگہ ہی نہیں تھی

اردو کی راجدھانی کا حال تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دھائی کے آغاز میں عربی میں ... ! اور سنسکرت کے شعبوں میں پروفیسر موجود تھے عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا اور سنسکرت میں ڈاکٹر ایر۔ سبب یہ تھا کہ ان دونوں کلاسیکی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا، اردو کو نہیں! فارسی کے شعبے میں مسعود صاحب کے علاوہ یوسف حسین موسوی صاحب اور مولوی عبد القوی فانی تھے۔ وہ فارسی میں شعر بلکہ قصائد بھی لکھتے تھے۔ موسوی صاحب عرفی کے پرستاروں میں تھے۔ تنہا مسعود صاحب کو فارسی جدید پر عبور تھا اور وہی تحقیق کے مردِ میدان بھی تھے۔ اردو میں پہلے احتشام حسین صاحب اور بعد میں آل احمد سرور کی شمولیت سے شہر کے اردو داں حلقوں میں نئی چہل پہل دیکھی گئی۔ عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر عبد العلیم اور انگریزی میں احمد علی صاحب کا اپنا مقام تھا لیکن وہ بھی اردو حلقے ہی میں شامل سمجھے جاتے تھے اور اس میں کیا شک ہے کہ یہاں بھی اُن کا اپنا مقام تھا۔

ہماری یونیورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت اس کا بین صوبائی کردار تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر پرانجپے ریاضی کے ماہر تھے، ان کے علاوہ جنوبی ہند کے ڈاکٹر رام سیاسیات کے شعبے کے صدر تھے ______ اسی شعبے میں ڈاکٹر مینن بھی تھے جن کی اہلیہ مسز لکشمی مینن بعد میں حکومتِ ہند کی وزارت خارجہ میں وزیر ہوئیں۔ سنسکرت کے صدر شعبہ آگے چل کر وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے۔ ریڈر راسیر دادم کا تعلق بھی جنوبی ہند سے تھا۔ اہل بنگال میں مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی اور مشہور ترقی پسند استاد ڈی، پی مکرجی کے علاوہ بی بی مکرجی تھے۔ صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر این، این سین گپتا تھے۔ انگریزی کے صدر ڈاکٹر سدھانت صاحب تھے جو آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم، اے (انگریزی) تھے۔ شعبۂ کامرس کے صدر داس گپتا صاحب بھی بنگالی تھے۔ تاریخ ہند قدیم کے پروفیسر ڈاکٹر کمد مکرجی تھے جو اس موضوع پر استناد درجہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر مجمدار اینتھراپالوجی میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ پنجابیوں میں پالیو باٹنی میں عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر بیربل ساہنی تھے، جن کی یاد میں اب ایک پالیو باٹنی انسٹی ٹیوٹ کھل گیا ہے۔ اس کے علاوہ فزکس میں ڈاکٹر ولی محمد تھے۔ دلی والوں میں احمد علی صاحب (مشہور ترقی پسند ادیب) انگریزی میں ریڈر ہوتے تھے۔ یوپی والے عربی، فارسی، اردو، ہندی شعبوں میں بھرے پڑے تھے، دوسرے اہم شعبوں میں اہم عہدے پر سرور زبرحسن کے صاحبزادے ڈاکٹر حبیب ظفر کرمسٹری میں اور پروفیسر سلطان (سیاسیات) کا نام بھی یاد آتا ہے لیکن ان میں سے کوئی صدر شعبہ نہیں تھا۔ عربی میں صدر شعبہ بے ریش و بروت ڈاکٹر وحید مرزا تھے۔ ان کے علاوہ ریڈر ڈاکٹر عبد العلیم اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ سلطان صاحب اور علیم صاحب بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ اور علیم صاحب تو وہاں وائس چانسلر بھی ہو گئے۔ غرض لکھنو یونیورسٹی کل ہند ادارہ تھی۔ یہی صورت الہ آباد، علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں کی بھی تھی، لیکن رفتہ رفتہ علاقائی تصورات غالب آتے گئے۔ اب مشکل ہی سے صلاحیتوں اور مہارت فن کا ایسا بین صوبائی اجتماع کہیں نظر آئے گا۔ معلوم نہیں اور حضرات کیا سوچیں گے لیکن میں علم کی حد بندی اور علاقہ بندی کو پسند نہیں کرتا۔ پھر سوچتا ہوں حافظ شیرازی کی طرح کہ میاں زیدی تم ٹھہرے گدائے گوشہ نشین خواہ مخواہ شور کیوں کرتے ہو؟ نقار خانے میں کون سُنے گا؟

پروفیسر سلطان سیاسیات کے علاوہ کھیلوں کے بھی رسیا بلکہ خود ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں کھیلوں اور ان. سی. سی کے انچارج تھے۔ سلطان صاحب تعلقہ دار تھے اور بڑے خوش سلیقہ اور خوش اخلاق اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ یونیورسٹی پہنچ کر، ٹینس کے بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی غوث محمد سے ملاقات ہوئی۔ نام تو انھیں تو پہلے سے تھی، لیکن ملنے کے بعد میں اس مشہور کھلاڑی کی اخلاقی بلندیوں سے واقف ہوا۔ اس پرخلوص، ملنسار، خوش مزاج ملیح آبادی پٹھان بلکہ تعلقہ دار سے مل کر یہ محسوس ہوا کہ پھل دار شاخیں کیوں جھکی رہتی ہیں۔ ع

نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں!

اُسے نہ اپنے پٹھان ہونے کا گھمنڈ تھا نہ تعلقہ داری اور شہرت کا غرور! وہ تو اس طرح دوستوں میں گھُل مل جاتا کہ بعض وقت ملنے والا سوچنے لگتا کہ یہ واقعتًہ غوث محمد ہی ہیں یا کوئی اور۔ ایک دن اپنے ساتھ ملیح آباد لے گئے اور اِن کے دولت کدے پر ان کی میزبانی سے ہم لطف اندوز ہوئے۔ کبھی کبھی احمد حسین قدوائی، ٹینس کے دوسرے مشہور کھلاڑی بھی اُدھر آنکلتے۔ یہ ہر قدم اس انداز سے اٹھاتے

گویا یہ کھلاڑی نہیں بلکہ حکمراں نہیں تو حکمراں جماعت کے افراد اعلیٰ ضرور ہیں۔ دیر میں کھلے اور جب کھلے تو خوشبو کی طرح گھل مل بھی گئے۔ پھر بھی خوش بجز سے دیگر تھا! یونیورسٹی سے کچھ اور کھلاڑی بھی ابھرے۔ ان میں آفری انور جیسے تھے، لیکن وہ صحافت کی طرف نکل پڑے۔ یا تحریر میں کھیل کود کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ آخر میں شاید پاکستان چلے گئے۔ کے ڈی سنگھ ہاکی کے مشہور کھلاڑی اسی یونیورسٹی کی دین تھے۔ اب ان کے نام پر ایک اسٹیڈیم بنا دیا گیا ہے۔ میری ان سب سے یاد اللہ تھی اگرچہ کھیل کود سے مجھے کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا۔

اساتذہ ہی کی طرح یونیورسٹی میں طلبہ کا مجمع بھی کل ہند تھا۔ پنجاب، کشمیر، کوالا، تامل ناڈو وغیرہ علاقوں سے طالب علموں کی بڑی تعداد ہر سال ہماری یونیورسٹی میں آجاتی تھی۔ ان سے ہمارے ہوسٹلوں میں بڑی رونق رہتی۔ اساتذہ اور طلبہ کے اس رنگا رنگ مجمع نے ہماری یونیورسٹی کو ایک چھوٹا موٹا ہندوستان بنا دیا تھا جس میں صوبوں اور زبانوں کی تفریق مٹ گئی تھی۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ باہر کے طالب علم تو درکنار اساتذہ بھی مل جائیں تو ہم اسے خوش قسمتی سمجھیں گے۔ بیرونی طلبہ کی بڑی تعداد اس لیے بھی آتی تھی کہ یہاں ایم اے اور ایل ایل بی دونوں امتحانات ایک ساتھ یعنی دو سال کے اندر پاس کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری یونیورسٹیوں میں یہ رعایت حاصل نہیں تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم (Co-Education) عام تھی۔ یہ بڑی بات تھی، کیونکہ واجد علی شاہ کے لکھنؤ کی مسخ شدہ تصویر پیش کیے جانے کے باوجود لکھنؤ ایک صاف ستھرا، سنجیدہ اور خوش اخلاق معاشرہ تھا۔ یہاں انٹرمیڈیٹ تک لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ کالج تھے۔ لڑکیوں کے مخصوص کالج مہیلا ودیالیہ امین آباد میں، کرامت حسین گرلز کالج گومتی پار اور آئی ٹی کالج یونیورسٹی کے آس پاس اہم کالج تھے۔ لڑکوں کے بہت سے کالج تھے۔ آئی ٹی کالج اور بقیہ دو کالجوں میں بی اے کی سہولت بھی تھی لیکن اگر لڑکیاں چاہتیں تو یونیورسٹی میں اسی سطح پر داخل ہو سکتی تھیں۔ ایم اے کی تعلیم صرف یونیورسٹی میں ہوتی تھی، اس طرح یونیورسٹی میں طالبات کی بھی معقول تعداد تھی۔ ان میں مسلمان، کرسچین، ہندو سبھی فرقوں کی لڑکیاں تھیں۔ باہر سے آنے والی لڑکیوں کا قیام لیڈی کیلاش ہوسٹل میں ہوتا تھا۔

کچھ لڑکیاں میری ہم جماعت بھی تھیں۔ بعض طلبہ کی سیاسیات میں حصہ بھی لیتی تھیں۔ ان میں بھی کئی صوبوں اور تمام مذاہب کی نمائندگی تھی۔ اکثریت یوپی بلکہ اودھ کی رہنے والیوں کی تھی۔ مسلم طالبات میں زیادہ تر تعلقہ داروں اور اعلیٰ عہدہ داروں یا بڑے زمینداروں کی لڑکیاں تھیں۔ کچھ کا تعلق کھاتے پیتے خاندانوں سے تھا۔ دو ایک کا تعلق متوسط طبقے کے خاندانوں سے تھا۔ یہ تانگے سے یونیورسٹی آتی تھیں۔ صرف ایک طالبہ ایسی تھیں جو یونیورسٹی تک یکہ سے آیا کرتی تھیں۔ ان کے ضعیف باپ بھی ساتھ ہی یونیورسٹی تک پہنچانے آتے اور پھر ساتھ ہی واپس لے جاتے۔ ان خاتون کو سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ سنجیدہ اور کم آمیز تھیں۔ کسی کو بے ضرورت بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ برقعہ پوش لڑکیاں بہت کم نظر آتی تھیں۔ پانچ چھ برس کے قیام میں میں نے مشکل سے چار پانچ پردہ پوش طالبات کو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے دیکھا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیوں کی کمی کا ایک سبب شہر میں طالبات کے ان خصوصی کالجوں کی موجودگی تھی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

ان میں آئی۔ٹی کالج سب سے اچھا کالج سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کی لڑکیاں خاصی تیز، طرار، ذہین مشہور تھیں، لیکن تیزی اور ذہانت کسی خاص کالج کی اجارہ داری نہیں تھی، اچھی اور تیز لڑکیاں دوسرے کالجوں میں بھی تھیں اور ان کی ذہانت امتحانات کے نتائج میں ظاہر ہوتی تھی۔ آئی ٹی کالج کی لڑکیاں یونیورسٹی سے قربت کی وجہ سے ادھر بھی آنکلتی تھیں بالخصوص کیلاش ہوسٹل میں تو ان کا آنا جانا برابر ہوتا رہتا تھا۔ دوسرے کالج کی لڑکیوں سے بھی ان کی دوستی تھی۔ اور وہ سیاسی یا عام ثقافتی دلچسپیوں میں شریک ہو جایا کرتی تھیں۔ کیلاش ہوسٹل میں تو کبھی کبھی مختصر اور محدود مشاعرے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ہوسٹل میں لڑکے بھی کبھی کبھی چلے جاتے۔ یونین کے الکشن کے دنوں میں تو ایسا ہونا تعجب خیز نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ طلبا اور طالبات کے درمیان وہ نفسیاتی دیواریں دھیرے دھیرے ٹوٹ کر گرنے لگی تھیں جو چھوٹے شہروں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ یونیورسٹی میں آئے دن سیاسی ہنگامے یا ثقافتی پروگرام مثلاً مشاعرے، کوی سمیلن، [illegible] مفکرین اور سیاست دانوں کی تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ان میں لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد شرکت کرتی تھی۔ سیاسی جلوسوں میں بھی چند

شامل ہوتیں اور آگے آگے رہتیں۔

لڑکیوں کی باتوں نے کچھ طول پکڑ لیا۔ لطفِ حکایت دراز تر ہو گئی لیکن ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے جس کے بغیر اس دور کی یونیورسٹی کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ تھوڑی دیر رک کے ذرا ڈے اسکالروں کی باتیں کر لی جائے جو ہوسٹلوں کے باہر رہتے تھے اور شہر کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں خود بھی "ڈے" اسکالر یعنی ہوسٹل کے باہر مقیم طالب علم تھا پرانے شہر میں سٹی اسٹیشن کے قریب کمرہ، پھر فلیٹ، پھر مکان کرائے پر لیتا رہا۔ میرے دو ماموں زاد بھائی سید ابوجعفر اور سید خورشید احمد (مدیر نیا دور) اور دو چھوٹے بھائی سید علی بنیاد اور سید علی اعتماد ساتھ رہتے تھے۔ یہ احساس برابر دل میں نشتر چبھوتا رہتا ہے کہ اب ان ساتھ رہنے والے چاروں بھائیوں نے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا صرف ان کی وہ یادیں رہ گئی ہیں جو اکثر دبیز پلکوں کو بھگوتی رہتی ہیں۔ میرے حقیقی بھائی تو دونوں ہی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور چونکہ ہم سب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ہم نے ساتھ ساتھ بہت تکلیفیں جھیلی تھیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے شریک و سہیم رہے تھے۔ آج اس ضعیفی میں وہ میرے قوت بازو ہوتے اور دکھ سکھ بانٹتے۔ لیکن وہ بھی بچارے مجبور تھے رضاً بقضائہٖ و تسلیماً لامرہٖ!

ہاں تو ہم لوگ اکثر مکانات بدلتے رہتے۔ آج کل کا سا حال نہیں تھا۔ پہلے چودھری کی گڑھیا، پھر آغا میر کی ڈیوڑھی، پھر گولہ گنج پھر سٹی اسٹیشن کے سامنے حامد پارک میں قیام رہا۔ اس دور میں کرائے کے مکان آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دو چار تختیاں "مکان برائے کرایہ خالی ہے" کا اشتہار کرتی رہتی تھیں۔ مکان بدلنے سے پہلے ہم لوگ دو چار مکان دیکھ کر کرایہ وغیرہ طے کرتے۔ پرانے لکھنؤ میں دس پندرہ روپے تک خاصا مکان مل جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد خورشید بھائی اور ابوجعفر بھائی ہیوٹ ہوسٹل میں منتقل ہو گئے اور ہم تینوں بھائی کرائے کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ایک باورچی ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد ہمارے عزیز اور موجودہ دور کے مشہور ترقی پسند نقاد ممتاز حسین بھی ہماری طرف نکلے اور پھر ہم نے انھیں مہمان بنا لیا اور انھیں کہیں اور نہیں جانے دیا۔ انھوں نے تعلقہ دار کالج میں ملازمت کر لی تھی اور مکان کی تلاش میں تھے۔

ہمارے ہر مکان سے یونیورسٹی کا فاصلہ تین میل سے زیادہ ہی ہوگا، کم نہیں۔ اس وقت شہر میں بسیں نہیں چلتی تھیں۔ بسیں تھیں لیکن صرف مضافات تک جاتی تھیں، مثلاً سیتاپور، محمود آباد، کرسی وغیرہ۔ ٹیکسیاں معدوم تھیں، کاریں چند تھیں لیکن تعلقہ داروں یا لکھ پتیوں کے یہاں۔ تانگے اور یکے ("تلفظ" اِکّے) کی سواریاں عام تھیں۔ بہت سے طالب علم سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ اس جاگیردارانہ ماحول میں یکّے کی سواری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن عام طالب علم تانگہ، یکہ یا سائیکل کی سواریوں ہی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور تھا اور اسی میں سرور تھا۔ میرے پاس بھی ایک پرانی سی سائیکل تھی جو برسوں بعد مرمت کرا کے اور پرزے بدلوا کے قابل استعمال بنائی گئی تھی۔ میری شاعرانہ بے توجہیوں کے باعث اس کا حال بُرا ہی رہتا۔ کبھی گھنٹی نہیں تو کبھی بریک ندارد۔ کبھی مڈگارڈ غائب تو کبھی چین کور۔ شام کے بعد اگلے پہیے کے بالائی حصہ میں ایک لیمپ لگا کے چلنا پڑتا تھا جس میں مٹی کا تیل جلتا تھا۔ اگر یہ نہ ہو تو چالان ہو جاتا تھا۔ بعض نفاست پسند بیٹری سے چلنے والا لیمپ لگا لیتے تھے۔ لیکن ان کی حیثیت استثنائی تھی۔ جب میری موسموں کی ماری سائیکل کی حالت سقیم ہوتی، اور ایسا اکثر ہوتا تو میں تانگے سے یونیورسٹی جانے لگتا۔ تانگے والوں سے خاصے مراسم ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں کرائے کم ہونے کے باوجود صرف کھاتے پیتے لوگ ہی علی العموم تانگے پر چلتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جیب میں پیسے کم ہوتے یا بالکل نہ ہوتے تو ایک خاص تانگے والے کو نوازتا تھا۔ نام اب بھول رہا ہوں اُن سے مراسم اتنے بڑھ گئے تھے کہ کرائے کا حساب ماہانہ ہونے لگا تھا۔ یہ صاحب گھوڑ دوڑ کے شائقین میں تھے۔ سٹی اسٹیشن، وزیر گنج، گولہ گنج، ڈیوڑھی آغا میر کے آس پاس نوابوں کی خاصی آبادی تھی اور یہ حضرات اسٹیشن کے سامنے حامد پارک والی دکانوں میں ایک ایرانی چائے خانے میں بیٹھ کر گھوڑوں کی باتیں کرتے اور بازیاں لگاتے تھے، انھیں میں ہمارے تانگے والے بھی تھے۔ ہمارے معزز تانگے والے بھی گھوڑ دوڑ (ریس) کے بڑے شوقین اور بٹیر بازی کے رسیا تھے۔ غالباً نوابوں کے کسی لٹے ہوئے خاندان کے متوسلین میں تھے۔ میرے بار بار احتجاج کرنے کے باوجود مجھے ہمیشہ "نواب صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے اور فرشی سلام سے نوازتے تھے۔ راستے بھر نوابوں کے گزرے

دنوں کی باتیں کرتے۔ دل پھینک بھی واقع ہوئے تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ کرایہ نقد لینے پر اصرار نہ تھا۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے سائیکل میں ذرا بھی نقص ہوتا تو میں تانگے پر یونیورسٹی چلا جاتا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ تانگے کا ماہانہ بل خاصا بھاری بھرکم ہو جاتا۔ گھر سے جو بندھی ہوئی رقم آتی تھی اُس میں بجٹ کو متوازن رکھنا مشکل ہوتا تب بجٹ بڑھانے کے لیے لکھنا پڑتا اور "قہر درویش بر جانِ درویش" والے انداز میں منظوری بھی مل جاتی!

اُدھار کا سلسلہ یونیورسٹی رسٹوراں میں بھی چلتا تھا۔ رسٹوراں کے کشمیری مالک بقایا صاحب تھے اور جیسا نام ویسا کام! ان کے تعلقات سیاسی کارکن قسم کے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ طلبہ کی سیاست میں حصہ لینے والوں کا خاص مرکز یہی رسٹوراں تھا اور اِن کی بدولت بقایا صاحب کی آمدنی خاصی بڑھ گئی تھی۔ یہ سب ماہانہ حساب رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک ریاست کی شان تھی کہ پیسے ہوں یا نہ ہوں، دوستوں کی خاطر تواضع ہوتی۔ کشمیر اور پنجاب وغیرہ سے جو طلبہ آتے وہ عام طور سے اچھے گھرانوں کے افراد ہوتے ان کو اچھی خاصی جیبی رقم (پاکٹ منی) ملتی تھی اور وہ خوب خرچ بھی کرتے۔ بعض تو حضرت گنج کے ہوٹلوں میں شراب نوشی بھی کر لیا کرتے تھے کہ یہ تہذیب جدید کی بھی نشانی سمجھی جاتی تھی اور ریاست کی بھی۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ مطعون واجد علی شاہی ریاستوں میں کئی راجہ نواب ایسے بھی تھے جو کسی عیاشی کے قریب نہیں جاتے تھے۔ ان میں محمود آباد، پیر پور، سلیم پور کی ریاستیں نمایاں تھیں!

ہم جیسے متوسط طبقے کے طالب علموں کا حال یہ تھا کہ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں، بقایا صاحب کے طریق کار کی بدولت، دوست احباب اور سیاسی رفقائے کار کی مدارات ہوتی رہتی تھی۔ ایک کی جگہ چار خرچ ہوتے تھے۔ مَیں اس زمانے میں سگریٹ بھی بہت پیتا تھا۔ رسٹوراں کے سامنے ہی سگریٹ والے کی دکان تھی اور بغل میں پھلوں کی دکان تھی، ہر جگہ حساب چلتا تھا، کیونکہ قرض جاگیرداروں کی ایک شناخت بھی تھا! گھر والے میری فضول خرچیوں سے عاجز تھے لیکن خدا بخشے والدہ مرحومہ کو کہ ان کا دامن شفقت و کرم میری ساری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر لیا کرتا تھا۔ میں کتابوں کے نام پر پیسے منگواتا مگر کتاب نہ خریدتا اور ماہانہ بجٹ کے اُتار چڑھاؤ سے نپٹتا رہتا، فیس اور جرمانے کے نام پر مزید رقم کی فرمائش کرتا، دوا علاج کے بہانے سے بھی پیسے منگوا لیتا۔ مشاعروں سے اور جب ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کُھل گیا تو وہاں کے پروگراموں سے بھی کچھ پیسے ملنے لگے۔ لیکن اخراجات کی ایک نئی شکل کافی ہاؤس کی شکل میں اُبھر آئی تھی۔ غرض اخراجات بڑھتے جاتے اور جو کچھ بھی ملتا وہ انھیں دائروں میں خرچ ہو جاتا تھا۔

لکھنؤ کا فی ہاؤس خاصے کی چیز تھا۔ یہاں بڑے بڑے اخبار نویس جیسے راما راؤ، چیلاپتی راؤ، ایس' این گھوش، بڑے بڑے سیاستداں جیسے اچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، کیشو دیو مالویہ، ترلوکی سنگھ، پی سی جوشی، سجاد ظہیر آیا کرتے۔ دانشوروں میں احمد علی آل احمد سرور، ڈی' پی مکرجی اور احتشام حسین، خبر نگاروں میں امین سلونوی، انصار ہروانی، جوالا سنگھ بھٹاچاریہ وغیرہ اور طالب علموں کی سیاست میں حصہ لینے والوں میں سبط حسن، ڈی' پی' در (درگا پرساد در) کاشی ناتھ بامزئی، بلرام سنگھ، صدیق احمد صدیقی، دانچو جگدیش کشت، سید محمد جعفر، راجہ بخشی، شفیق نقوی، نریش تیواری، انور جمال قدوائی، خوجہ جمیل الدین اور بہت سے نام ہیں سب جمع ہو جاتے تھے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب علی سردار جعفری، مجازؔ (اسرار الحق ردولوی) اور قاضی جلیل عباسی اپنی ترقی پسندی کی بدولت علی گڑھ سے نکالے گئے اور ہماری یونیورسٹی میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ لوگ بھی آجاتے۔ سلام مچھلی شہری بھی شامل ہو جاتے۔ اتنے شاعر جمع ہوں اور شعر خوانی کا دَور نہ چلے یہ ناممکن تھا۔ غرض وہاں اکثر و بیشتر چھوٹا موٹا مشاعرہ ہو جاتا۔ ہندی کے مشہور شاعر گرجا کمار ماتھر خاص دوستوں میں تھے وہ بھی آجاتے تو مِلے جُلے مشاعرے اور کوی سمیلن کا سماں بندھ جاتا۔ بیچ بیچ میں سیاسی حالات پر تبصرے اور نظریاتی بحثیں بھی چھڑ جاتیں۔ انجمن در انجمن کی فضا ہوتی، لیکن شور و غل نہیں۔ دھیمے لہجوں میں گفتگو ہوتی اور اسی انداز سے شعر بھی سُنائے جاتے۔ یہ لکھنوی تہذیب کا کرشمہ تھا۔ اس تہذیب میں شور و غل کو ناپسند کرتے تھے اس کی جگہ شریں تھی یا سیاسی اجتماعات!

میرے اور میری طرح کے دوسرے دوستوں کے اخراجات کے

زیادتی کا سبب ثقافت و سیاست سے اس طرح کی دلچسپیاں بھی تھیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن، کانگریس، سوشلسٹ پارٹی (جس میں کمیونسٹ بھی شامل تھے کیونکہ ۱۹۳۹ء تک سی پی آئی شجر ممنوعہ تھی)، انجمن ترقی پسند مصنفین، کلبوں اور یونیورسٹی کی یونینیں۔ سبھی کے نمائندے جمع ہوتے، چائے، کافی، بلکہ ڈوسے اور سینڈوچ تک میں ہمسفر اور ہم قلم بھی شریک ہو جاتے۔ میہمانی اور میزبانی کا سلسلہ روز کا تھا اور ہم سب کے یہاں حاتم دوستاں و درد دل والا معاملہ تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست اور عزیز تھے اور بہت سے کام! مختصر یہ کہ اخراجات کی کثرت سے ہم اکثر پریشان رہتے ہیں اس کا قطعی حل اُس زمانے میں کیا آج تک ڈھونڈ نہیں پایا ہوں، لیکن شکر ہے کہ قدرت نے ہر حال میں مست رہنے والی طبیعت عطا کی ہے۔ اور چاہیے بھی کیا!

لباس کے معاملے میں یونیورسٹی میں کافی آزادی تھی۔ زیادہ تر لڑکے سوٹ پہنتے تھے لیکن شیروانی اور تنگ موری کے پائجامے کا رواج بھی خاصا تھا۔ کچھ لوگ جواہر بنڈی، کرتے اور پاجامے بھی استعمال کرتے تھے۔ میں کھدر ہی کے کپڑے بنواتا تھا کیونکہ یہ سیاسی کارکنوں اور آزادی پسندوں کی نشانی تھی اور میں بھی اپنے کو اسی گروہ میں شامل سمجھنے لگا تھا۔ شیروانی شرفا کا شعار تھی۔ ہندو مسلم، شہری دیہاتی ذات پات کی تفریق نہیں تھی۔ ایسے پرستاروں میں وکیل، بیرسٹر، تعلقہ دار، جاگیردار، مولوی پنڈت سب تھے۔ انگرکھے کا رواج کم ہو چلا تھا اور یونیورسٹی میں تو اس کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہی حال دھوتی کا تھا۔

یونیورسٹی کے طلبہ کے بہت سے نام آگئے۔ لیکن طالبات کی بات بیچ ہی میں رہ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی طالبات نے بیداری نسواں میں بڑا حصہ لیا ہے اور اس کا سرسری ذکر بھی نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ طالبات میں منہاج خواہران، مسز سروپ رانی بخشی، تزئین حبیب اللہ، اور رتنا سدھانت وغیرہ کا رجحان سیاست کی طرف شروع ہی سے تھا۔ منہاج خواہران میں سلطانہ نے (جو اب علی سردار جعفری کی شریک حیات ہیں) طلبہ کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور یہی حال تزئین حبیب اللہ کا بھی تھا۔ فرق یہ تھا کہ سلطانہ منہاج شروع سے قوم پرور اور ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں لیکن تزئین بعد میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہو کر عام دھارے سے کٹ گئیں۔ طالبات کو طلبا کی تحریک سے قریب تر لانے کے لیے میری ہی تحریک پر کل ہند طالبات کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی۔ سلطانہ کو اس میں صدر مجلس استقبالیہ بنایا گیا۔ بعد میں سلطانہ سی پی آئی سے وابستہ ہو گئیں۔ انھوں نے دلّی اسٹوڈنٹس کانفرنس میں دوسری طالبات کے ساتھ شرکت کی اور لکھنؤ یونیورسٹی کا نام بلند کیا۔ آمنہ اور خدیجہ اپنی بڑی بہن سے مختلف تھیں۔ ان کی دلچسپیاں ثقافتی زیادہ اور سیاسی کم تھیں۔ ان تینوں بہنوں کا ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی سے آراستہ ہونا ان کے والد منہاج الدین صاحب مرحوم کی مآل اندیشی، وسیع النظری اور حسنِ تربیت کا نتیجہ تھا۔

تزئین حبیب اللہ فلسفہ کی طالبہ ہونے کی وجہ سے میری ہم جماعت تھیں۔ شیخ حبیب اللہ کی دختر تھیں۔ شیخ صاحب تعلقہ دار تھے، ڈپٹی کلکٹری بھی کی تھی اور ریاست محمود آباد کی مدار المہامی بھی۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ بیگم حبیب اللہ بھی اوسط درجے کی تعلیم یافتہ تھیں۔ سیاست میں حصہ لیتی تھیں، لیکن ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ فلسفہ کی جماعت میں تھوڑے سے طالب علم ہوتے تھے۔ جن میں طالبات تو اور بھی کم ہوتی تھیں۔ اس مختصر سی کلاس میں اپنی ذہانت اور ہنس مکھ طبیعت کے باعث تزئین نمایاں تھیں۔ ہم جماعت ہونے کی وجہ سے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کلاس کے اندر اور کلاس کے باہر بھی ان سے باتیں ہوتیں۔ بحثیں ہوتیں ان کی ذکاوت سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ ترقی پسندانہ خیالات بھی رکھتی تھیں لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اُن کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ بہت جلد اپنی ماں کے سیاسی دباؤ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو گئیں اور ناگپور کے اجلاس کی صدارت بھی کر آئیں۔ اس طرح یہ سلطانہ سے مختلف مزاج کی مالک تھیں اور بہت جلد ترقی پسندی سے ہٹ کر لیگی سیاست میں الجھ گئیں۔ پھر وہ بیگم تزئین فریدی ہو گئیں۔ (ہماری یونیورسٹی میں لیگ کا زور نہیں تھا۔ بس علی رضا مرحوم اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد علی رضا مرحوم کے خیالات میں تبدیلی آگئی۔) تزئین کے شوہر نے چند دن لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی بھی پڑھائی تھی لیکن

جلد ہی انھیں ایک اور اچھی ملازمت مل گئی اور اُس علاقے میں تعینات ہوگئے، جو بعد میں پاکستان بننے والا تھا۔ تزئین بھی وہیں پہنچ گئیں۔ وہاں بھی نچلی نہ بیٹھیں اور اَپوا (آل پاکستان ویمنز آرگنائزیشن) کی صدر بن گئیں۔ بعد میں سُنا کہ سندھ حکومت میں وزارت بھی مل گئی۔ ان کے بھائی جنرل حبیب اللہ ہندوستان ہی میں رہے۔ ان کی بیگم حامدہ حبیب اللہ کانگریس کی سرگرم رُکن ہیں۔ وزیر بھی رہ چکی ہیں۔ انھیں کے دورِ وزارت میں اتر پردیش اردو اکیڈیمی قائم ہوئی۔ ان کے صاحبزادے وجاہت حبیب اللہ آئی۔ اے۔ ایس افسر ہیں اور تزئین حبیب اللہ کی صاحبزادی ان کو منسوب ہیں۔ صورت شکل میں تزئین سے بہت مشابہ ہیں۔ پہلی بار ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ملاقات ہوئی تو میں چونک پڑا کہ تزئین کہاں سے آگئیں۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ انھیں کی صاحبزادی ہیں۔

ان فریدی صاحب کے بڑے بھائی ڈاکٹر فریدی شہر کے ممتاز ماہرِ امراضِ سینہ تھے۔ سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے لیکن اچھے نماز گزار مسلمان تھے۔ آخر دم تک سوشلسٹ بھی رہے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان سیاسی اعتبار سے پراگندہ خیال ہوگئے تھے۔ ان کو صحیح رہنمائی فراہم کرنے کے خیال سے جو مجلسِ مشاورت بنی، اس میں بھی عملی حصہ لیا۔ ان کو عزیزوں، یار دوستوں نے بہت پاکستان کھینچنا چاہا لیکن یہ ہندوستان کے باہر جانے پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ ع وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے! بیحد کامیاب ڈاکٹر تھے اور دستِ شفا کے لیے مشہور تھے۔ بہت سے مریضوں کا مفت علاج کر دیا کرتے تھے۔ میرے مستقل معالج تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ وہاں چندر بھان گپتا کی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ یہ مخالفت میڈیکل کالج کے معاملات سے شروع ہوئی اور پھر سیاست میں اس نے بڑے بڑے رنگ دکھائے۔ گپتا جی دو بار وزیرِ اعلیٰ رہ چکے تھے لیکن ایک بار فریدی صاحب نے الکشن میں ان کی مخالفت پر کمر باندھی تو پھر ان کے سیاسی حریف ترلوکی سنگھ کو حمایت پر آمادہ کیا اور اپنی ہر دلعزیزی کی بنا پر گپتا جی کو ہرا کے ہی دم لیا۔ اتفاق کی بات کہ ایک مرتبہ فریدی اور گپتا ایک ہی کمپارٹمنٹ میں دلّی جا رہے تھے۔ راستے میں گپتا پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ فریدی بھی دل کے مریض تھے اس لیے دوائیں اور انجکشن وغیرہ ساتھ رکھتے تھے۔ فوراً علاج کیا اور اس قابل ہوئے کہ دلّی تک بخیر پہنچ جائیں۔ اسٹیشن ٹیلیفون کرا کے کار کا انتظام کر لیا اور باقاعدہ اسپتال پہنچا کے ہی دم لیا۔ کیسی دشمنیاں ایک آن میں دوستیوں میں بدل جاتی ہیں اور ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

طالبات ہی میں ٹینس کے مشہور کھلاڑی باب کی صاحبزادی ہیزل باب بھی تھیں، بیحد خوش طبع اور خوش اخلاق۔ انھوں نے ایک دن علی سردار جعفری کو نئے سال کی مبارک باد دی تو ان کی وہ نظم وجود میں آئی:

یہ کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو
تصوّر رقص کرتا ہے، تخیّل گنگناتا ہے

سیاست سے دلچسپی لینے والوں میں نشاط حسن اور رتنا سدھانت کا بھی نام لیا جاسکتا ہے لیکن ان کی دلچسپی سطحی تھی ہاں طلبہ کانفرنسوں کے انعقاد میں ان سے اکثر مدد ملتی تھی۔ مسز وجے لکشمی پنڈت کی صاحبزادیاں یونیورسٹی میں تو نہیں پڑھتی تھیں لیکن لکھنؤ میں موجود ہونے کی وجہ سے نین تارا اور چندر لیکھا طلبہ کی سیاست میں بھی کبھی کبھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ انھیں کی طرح آنند نرائن مُلاّ کی صاحبزادی چترا مُلاّ کو بھی دلچسپی تھی۔ انھیں ہندوستانی کلاسیکی رقص سے دلچسپی تھی۔ ایک بار ہماری استدعا پر انھوں نے کانفرنس کے موقع پر اپنے رقص کا ایک مظاہرہ بھی کیا تھا۔

یہ فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے لیکن فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں۔ اتنے ہی تذکرے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ بیداریِ نسواں کے سلسلے میں یونیورسٹی کے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور ہماری طالبات نے بھی تحریکِ آزادی اور اس کے متعلق خدمات میں عملی دلچسپی لی ہے۔ اُس زمانے میں ترقی کے ہر شعبے میں ہماری یونیورسٹی پیش پیش تھی اور صوبے ہی میں نہیں بلکہ دُور دُور تک اس کی قیادت سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔

طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں صرف جلسے جلوس [illegible]

ہی نہیں تھے بلکہ طلبہ برابر سختیاں جھیلتے تھے۔ انور جمال قدوائی، شفیق نقوی اور بلرام سنگھ کو دو سال کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح میرے چھوٹے بھائی سید علی اعتماد مرحوم کو جوبلی کالج سے برطانوی جھنڈا اُتار کر قومی پرچم لہرانے کے جرم میں دو سال کے اخراج کی سزا ملی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے والوں نے بعد میں انعام بھی پایا۔ یہ بہت ہی غلط تصور ہے، یونیورسٹی کے طلبہ میں کسی کو کیا ملا؟ علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، سید محمد جعفر، قاضی جلیل عباسی، رامیشور پرشاد مصر، بلرام سنگھ تو جیل بھی گئے، لیکن انھوں نے حکومت سے اس کا کوئی بدلہ نہ چاہا خود کنواں کھودا تو پانی پیا۔ اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سیاست دانوں میں سجاد ظہیر، پی۔ سی۔ جوشی بھی تھے۔ اگر جگدیش چندر دکشت صدر لیجس لیٹو کونسل ہو بھی گئے تو کیا ہوا۔؟ ہاں یہ مقام فخر ہے کہ یونیورسٹی نے ایسے نوجوانوں کی ترتیب کی جو ملک کے لیے باعثِ افتخار ہوئے۔ انھیں میں موجودہ صدر شنکر دیال شرما بھی ہیں، جو میرے ہی زمانے میں زیرِ تعلیم تھے۔ آزادی اور ترقی پسندی کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو یونیورسٹی کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باقی تفصیلات حسبِ موقع دوسرے ابواب میں سامنے آئیں گی — یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

□□

حواشی:

۱ گنگا پرشاد ورما، جن کی یادگار یہ ہال تھا، کانگریس کے بنیادی ممبروں میں تھے اور اردو کے صحافی بھی تھے۔

۲ واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا اس مناسبت سے اسے اختر نگر بھی کہا گیا ہے۔ ۳ اسے کرامت حسین نے قائم کیا تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کا احساس انھوں نے دلایا۔ یہاں پردے کا بھی اہتمام تھا۔ خصوصیت سے پردہ دار اور متوسط طبقے کی لڑکیاں یہیں تعلیم پاتی تھیں۔ اب اس کی ایک شاخ پرانے لکھنؤ میں نخاس کے قریب بھی کھل گئی ہے۔ شیعہ کالج میں بھی بچیوں کے لئے صبح کو علیحدہ تعلیم کا انتظام ہو گیا ہے۔

۴ میں اس اردو لفظ کو کسی قیمت پر بھی کسی اور لفظ سے بدلنے یا ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

۵ "شرفا" سے خاص طبقہ نہیں بلکہ عام تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد مراد ہیں جو روایت دوست بھی تھے۔



"اہلِ لکھنؤ کی زبان اِس قدر شائستہ اور شُستہ و رُفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے جُہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعرا و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں اور جو شائستگی اور تمیز داری ان سے ظاہر ہوجاتی ہے کسی اور مقام کے قابل اور ذی علم لوگوں سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔"

گذشتہ لکھنؤ: عبدالحلیم شرر ص ۳۲۷

قرۃ العین حیدر

شہرِ آرزو

اردو کی کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہی اساطیری حیثیت حاصل کرلی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ بھی ہمارے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہیں۔

لکھنؤ اُن کا شہرِ آرزو تھا اور ہے۔ ان کی برہمی اور اُن کا غصہ اُسی بے پایاں اُلفت کا مظہر تھا جو انھیں اُردو سے ہے۔ پہلے وہ مجھ پر خفا ہوئیں۔ ازراہِ شفقت انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نذرِ قارئین ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنؤ کے بارے میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا انھوں نے ایک ہی جواب میں سب کا احاطہ کرلیا ہے۔

الف ح ——

میں نے لکھنؤ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں دو ناول لکھے ہیں جن میں ایک ناول "گردشِ رنگِ چمن" ہے جس کا نام اگر انگریزی میں رکھا جائے تو وہ The Death of a City ہوگا۔ میں نے دوسرے ناول "چاندنی بیگم" میں لکھنؤ کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کو پیش کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت خاص طور پر رویّہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی تہذیبی سرمائے کو برباد کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سرمایہ سجا کے، سنوار کے، بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ بنا دیا۔ لہٰذا کتب خانے، آرٹ کے ذخیرے، تاریخی عمارتیں، ادبی اور تہذیبی روایات — ان سب کو ڈھونڈ کے برباد کیا جا رہا ہے۔ جب تاج محل کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے تو لکھنؤ کے امام باڑے کا کیا ذکر کیا جائے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں چند سال قبل لکھا تھا کہ پیرس (Paris) کا پرانا شہر قانوناً اس طرح محفوظ ہے کہ اس کی ایک اینٹ کو بھی نہیں ہٹایا گیا ہے۔ لکھنؤ میں تاریخی عمارتیں باضابطہ طور پر منہدم کی گئی ہیں بشال کے طور پر روشن الدولہ کی کچہری۔ جو عمارتیں باقی ہیں ان میں نیلے اور پیلے رنگ پوت دیئے گئے ہیں جس طرح پرانی عمارات کو نئی عمارتوں کے ساتھ طرزِ تعمیر کی مناسبت سے (Blend) کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں انتہائی بھدّی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ کسی نے اس صورتِ حال پر توجہ نہ کی۔ شاید کسی نے بھی نہیں۔ اس شہر کو جو اہلِ ذوق کے لیے جنت نگاہ تھا کس بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ ایک وقت تھا کہ منشی نول کشور خود بیل گاڑی پر جگہ جگہ دوسرے شہروں میں جاتے تھے اور اپنی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اردو کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ایک وقت یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے اردو والوں سے کہا کہ ان کے گودام میں جو کتابیں ہیں لے لو اور انھیں محفوظ کرلو۔ لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔

آج سے قریب دس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اردو اکادمی کے اربابِ اقتدار سے بار بار درخواست کی کہ وہ اس نایاب ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کرلیں۔ مجھے جو جواب ملا، میں سناٹے میں آگئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں پرانے لکھنؤ کی کچھ یادیں تازہ کروں...

میں موجودہ لکھنؤ کے بارے میں اتنی غم و غصہ میں بھری بیٹھی ہوں کہ میں پرانے لکھنؤ کے بارے میں کیا لکھوں ؟ کیا میں یہ بتاؤں کہ میرے بچپن کے لکھنؤ میں پرانے شہر کی گلیاں کتنی صاف ستھری تھیں۔ فرقہ وارانہ تاثرات ناپید تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم بہت اچھا تھا، پڑھائی ہوتی تھی۔ غنڈہ گردی، امتحان میں نقل کرنا اور نگرانوں کو چاقو دکھا کر بھگا دینا اس قسم کے خواب و خیال کسی کے دماغ میں نہ آسکتے تھے۔

ابھی کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ شیعہ کالج میں صبح کے امتحان کے سنٹر میں نگرانی کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ان کو چاقو دکھا کر بھگا دیا وہ اس وقت وہیں سے پریشان حال چلے آرہے تھے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار پورا عرانی اور اقتصادی انقلاب ہے جس میں بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے لگام اور بے کار راج نیتی (سیاست) کی وجہ سے ابھی سُدھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نسل نے وہ گزشتہ تہذیب یا ماحول نہیں دیکھا ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اب کتنے دُکھی اور شاکی ہیں۔ آخر اس زمانے کی ایسی کیا بات تھی؟

مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے جب حال ہی میں ایک خاتون نقاد کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے (Generation gaps) کے باوجود میرے لیے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ جو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بزرگ ادیب کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔ انھوں نے بڑے استہزا کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میں تہذیب وغیرہ کے بارے میں لکھتے لکھتے نہیں تھکتی۔ ان کے الفاظ کچھ اسی قسم کے تھے۔ تو بی بی اس طرح تو میں برابر لکھتی رہوں گی اور نہ تھکوں گی۔

ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق لکھے اور قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے مسترد کر دے۔ مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی مرحوم (ایڈیٹر عزائم) نے لکھا تھا کہ اب ہم لوگ جس زبان میں بات کرتے ہیں اس کو سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے جیسے امیر الدولہ لائبریری میں نایاب کتابیں باہر پڑی دیکھیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ پر کچھ زیادہ ہی آفت آئی ہے۔ ان حالات میں یہ کون بیٹھ کر سوچے اور تجویز کرے کہ فلاں فلاں مکان اور کوچے ان کی ادبی اہمیت کی وجہ سے محفوظ کر دیئے جائیں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چوک میں پرانی سبزی منڈی کا وہ حصہ جہاں سے کوچہ میر انیس شروع ہوتا ہے شاید یہی مثنوی زہرِ عشق کی جائے وقوع تھی یا بھیم کا اکھاڑہ سنہٹی وغیرہ کا علاقہ وہی ہے جس کا تذکرہ حسن شاہ کے قصۂ رنگیں میں کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ نشتر کے نام سے سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا ہے۔

گولہ گنج اور بارود خانے میں نواب آصف الدولہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی پہلی چھاؤنی چھائی تھی اور بحیثیت (Camp Followers) خانم جان کا کنبہ وہیں اترا۔ انگریزوں کا قدیم فوجی قبرستان بھی اسی علاقے میں ہے جو اب گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور کلن کی لاٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آس پاس لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں کمپنی باغ بھی اسی طرف ہے یعنی میڈیکل کالج کے آس پاس تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاں جہاں تسلط ہوتا تھا، عوام کے لئے ایک باغ لگاتی تھی جو کمپنی باغ کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں گومتی کے کنارے جو صنعتی نمائش (Industrial Exibition) ہوتی تھی اور غالباً کمپنی باغ تک پھیلی تھی اس میں ایک پرستان تھیٹر (Paristan Theatre) تھا اس میں سہگل (Sehgal) اور اختری بائی فیض آبادی نے پارٹ (Part) ادا کیا تھا۔ اس نمائش کے انچارج لکھنؤ کی مشہور شاعرہ محترمہ داراب بانو وفا کے دادا تھے۔

دوسری نمائش جو ۱۹۳۸ء میں لگی تھی وہ بھی گومتی کے کنارے تھی اس زمانے میں لکھنؤ میں پان کی گلوریوں میں کیلیں لگائی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پان دان تھا مگر میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ میں اپنی والدہ بھائی اور چند رشتہ داروں کے ساتھ نمائش میں گھوم رہی تھی تو پان کی دکان پر مجھے کسی نے دو بیڑے پان دیئے جن میں لونگ کی جگہ چھوٹی کیلیں لگائی گئی تھیں میں وہ دونوں کھا گئی۔ وہ کیلیں جا کر میری آنتوں میں چبھیں، جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً میڈیکل کالج پہونچایا گیا۔

میں لکھنؤ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی یعنی ماسٹر صاحب کا

ٹٹر والا اسکول: میں اپنے ناولوں اور کہانیوں میں اس کا ذکر کرتے نہیں تھکتی۔

پٹرول راشنگ (Rationing) شروع ہو گئی تھی میں گھوڑا گاڑی پر ماسٹر صاحب کے اسکول جایا کرتی تھی۔ ماسٹر صاحب یعنی پردی سنگھ سریواستوا بفضلِ خدا حیات ہیں اور لکھنؤ میں ان کا وہ اسکول اب مہاتما گاندھی گرلس کالج کہلاتا ہے۔

میرا ایک مضمون موسیقی بھی تھا تو میں گھوڑا گاڑی پر طنبورہ سامنے رکھے اسکول جاتی تھی اور شام کو جھٹ پٹے وقت گھوڑا گاڑی موتی محل برج پر پہونچتی تھی۔ میں نے یہ سارا منظر "آگ کا دریا" میں پیش کیا طلعت گھوڑا گاڑی پر طنبورہ لیے اسکول آتی اور جاتی ہے۔ یہ ناول عرصہ ہوا ہندی میں بھی چھپ چکا ہے اور بڑا تواردیہ ہوا ہے کہ ہندی کے ایک مشہور ادیب کا ناول جو ابھی حال ہی میں چھپا ہے اس کی ہیروئن بھی طنبورہ لیے گھوڑا گاڑی پر میوزک (Music) سیکھنے جاتی ہے اور پھر موتی محل برج پر گاڑی واپس پہونچتی ہے اور وہاں سے دریا کنارے کوٹھی میں جاتی ہے۔ جس طرح "آگ کا دریا" میں طلعت سنگھاڑے والی کوٹھی جاتی تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ شہر کے اندر پالکیاں اور چوپہلے چلتے تھے میری والدہ اپنے چند رشتہ داروں کے یہاں مجالس محرم میں کٹرہ ابوتراب خاں (لکھنؤ) وغیرہ جاتی تھیں۔ کار باہر چھوڑ کر ایک چوپہلے پر بیٹھتی تھیں، اور میں بھی بڑے شوق سے چوپہلے کی سواری کرتے ہوئے قدیم حویلیوں میں جاتی تھی جہاں میراثنیں نوحہ و ماتم کرتی تھیں۔

اَب جبکہ مجھے اکثر لندن میں مجالسِ محرم میں شرکت کا اتفاق ہوا تو میں نے انقلابِ زمانہ پر عش عش کیا۔ اب لکھنؤ اور کراچی وغیرہ کے ذاکر اور مرثیہ خوان لندن اور شکاگو میں مجلسیں پڑھ رہے ہیں۔

یہ عالمی سیاست اور عالمی اقتصادیات کے نئے منظر نامے کا ایک پہلو ہے جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ برمنگھم میں محرم کے جلوس نکلتے ہیں اور شکاگو میں گھوڑے جوڑے کی شادیاں ہوتی ہیں۔ لکھنؤ کی میراثنیں لندن میں بڑی مقبول آرٹسٹ بن چکی ہیں اور مرسیڈیز گاڑی پر گھومتی ہیں لیکن غالباً کسی NRI کو یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ تاریخی عمارتوں اور آثار کی تھوڑی بہت مرمت ہی کرا دیں۔

□□

کُتُب خانہ

"اُن کے (آصفُ الدولہ کے) کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سَو کتابوں پر ایک گماشتہ مقرر تھا۔ مختلف فنون و اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں۔ تاریخیں اور دَواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوش نما قطعات جو اوّلین و آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور زنگ کے مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے .....

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تخریب سلطنت کے بعد سلاطینِ تیموریہ کا کتب خانہ جس کے ہاتھ بھی لگا ہوگا اس کے خزائن اور دفائن اور سامان طلاء و جواہر اس کتب خانہ کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا۔"

—— عبدُاللطیف شوستری

"تحفۃُ العالم"

رُسوا کا لکھنؤ

لکھنؤ کا ایک دیہات

"میری پھوپی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضہ تھا۔ میری پھوپی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے بیل بھینس بندھتی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کناروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

غدر کا ہنگامہ

دیکھئے پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر

سر بسر وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملک کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے بھرائیوں میں میرا بھی نام ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ میں بہ لحاظِ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارکباد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا۔ کل وہ گرفتار ہوا پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین ماں ایک صاحب افسران فوج میں تھے۔ ان کا تعین در دولت پر تھا میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرتِ مہتاب ہے برجیس قدر گوہرِ نایاب ہے برجیس قدر

رسوا:۔ بھلا کچھ یاد ہے کہ کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں ؟

امراؤ:۔ دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن

رسوا:۔ ہاں تمہیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی بھلا فصل کون سی تھی ؟

امراؤ:۔ اخیر جاڑے تھے نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

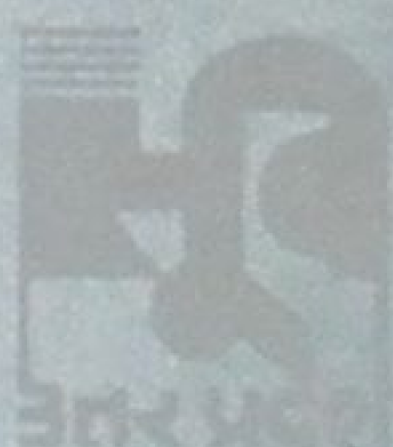
رسوا:۔ بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراؤ:۔ جی ہاں اونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں "تو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا انتظام تو درست ہوتا"! تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے تھے جو تھے اپنی جان کو رو رہے تھے کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے اس میں سید قطب الدین مارے گئے بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔"

□□

مرزا رُسوا کے کردار "امراؤ جان ادا" کی ایک جھلک


MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برّ صغیر



محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش، لکھنؤ